

علم الانسان ما لم یعلم
کتبخانہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
شعبہ
شمارہ
عدد داخلہ ۲۲۱۳۹
A H Faruq

رجسٹرڈ ایل نمبر
۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر
۳۵۲۵
۶۴۰۹۱

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شوکت نمبر

۹۹
ستمبر ۱۹۶۳ء

مدیر

محمد طفیل

سالانہ چندہ بیس روپے
غیر ممالک سے پچیس روپے

فی پرچہ
سات روپے

ادارۂ فروغ اردو، لاہور

ترتیب

(۴)

بہ حیثیت مدیر

(۵)

منظومات

مزاحیہ نظمیں

مرثیہ

(۶)

شخصیت

آرٹسٹ : اسلم کمال

محمد طفیل پرنٹر پبلشر ، ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر نقوش ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا





شوکت تھانوی

سوات اپنی بیگمات کے ساتھ



سعید عمر



[illegible] شوکت



خورشید عمر



فوزیہ شوکت





مرحوم صدر و گورنر کے ساتھ



عکس تحریر

[illegible]

قطعۂ تاریخ

وہ بزم کو جگمگانے والا نہ رہا — وہ غم میں بھی مسکرانے والا نہ رہا
یادِ شوکت میں عید کے دن روئیں — ہنسنے والا ہنسانے والا نہ رہا

۱۹۶۳ء

حفیظ ہوشیارپوری

طلوع

دیکھئے، وہ صاحب بھی مر گئے۔ جو مجسم زندگی تھے۔

شوکت صاحب کی شخصیت میں کچھ ایسی موہنی تھی کہ انھیں دیکھ کر اکتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ زندگی کی ساعتیں طویل تر ہو جائیں۔

گھر کی کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے تو اس کا بھی ہفتوں قلق رہتا ہے۔ پھر یہ تو شوکت تھانوی تھے ایک ایسی بھرپور ہستی: جسے میں اس دکھی دنیا کیلیے خدا کی طرف سے عطیہ سمجھتا رہا۔ انھوں نے ہزاروں کو زندگی سے پیار کرنے کا درس دیا مگر جب ان سے پیار کرنے والوں کی تعداد بڑھی تو یہ چپکے سے موت کی انگلی پکڑے دور نکل گئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ شوکت صاحب صرف میرے دوست تھے۔ نہ ہی یہ دعویٰ کروں گا کہ انھیں جتنا میں جانتا تھا اتنا کوئی اور واقف نہ تھا۔ اتنی بے تعلقی پر بھی میرا ان سے جتنا بھی ربط ضبط رہا۔ اس کی بنا پر مجھ سے اداس ہونے کا حق کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔

بیماری کے دنوں میں شوکت صاحب اپنے دوستوں کو دیکھ کر رو دیا کرتے تھے۔ زندگی بھر ہنسنے ہنسانے والا انسان یوں ٹپ ٹپ آنسو بہائے اچھا نہ لگتا تھا۔ مگر انسانی زندگی پر شوکت صاحب کا یہ خاموش طنز بھی بھولنے والی بات نہیں۔

ہم سب کتنے عاجز ہیں کہ زندگی رونے کی آواز سے شروع ہو کر درد کی آواز پر ختم ہو جاتی ہے۔

شوکت صاحب کی عمر ۵۹ برس کی تھی۔ مگر عمروں کو برسوں کے اعتبار سے ناپنا نہیں چاہیے۔ عمر اُن کی زیادہ ہوتی ہے جو کام زیادہ کرتے ہیں۔ آپ اُن لوگوں کے بارے میں سوچیں، جو دفن ہونے سے پہلے مر جاتے ہیں اور ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔ جو دفن ہونے کے بعد بھی نہیں مرتے۔

محمد طفیل

میری سرگزشت

شوکت تھانوی

دس منٹ میں کوئی اپنی سرگزشت آخر کیا بیان کرے گا۔ البتہ سرسری سرگزشت بیان کرنا قدرے سہل بات ہے۔ لہٰذا میں بھی اس صحرا کو ذرّے میں سمیٹنے اور اس سمندر کو قطرے میں جذب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس اختصار کی بدولت اور کچھ نہ سہی لوگ مجھ کو کم عمر تو سمجھ ہی لیں گے کہ کیا ننھی سی عمر کی ننھی سی تفصیل ہے۔

یہ حادثہ ۲ فروری ۱۹۰۴ء کو بندرابن ضلع متھرا میں پیش آیا کہ میں نے بھی کرشن جی کی جنم بھومی کو اپنی جنم بھومی بنا لیا۔ کوئی مناسبت نہ سہی لیکن ایک عجیب و غریب نسبت تو ہے ہی، اور اگر کوئی اس کو گستاخی کہے تو میں اس بے ساختہ گستاخی کا بھی ذمہ دار نہیں ہوں۔ ہوش سے پہلے کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بعض وہ باتیں جو میں نے اپنے متعلق سنی ہیں خود مجھ کو یاد نہیں ہیں کہ میں بچپن میں بے حد بیمار رہا کرتا تھا۔ علاوہ دوسری وقتی بیماریوں کے ضعف معدہ کی شکایت نہایت تسلسل کے ساتھ جاری تھی اور اسی کی وجہ سے نہایت سخت پرہیز ہوتا تھا۔ اتنا سخت پرہیز کہ میں والد صاحب کو کھاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اور اس کی وجہ سے خوش ہو جاتا تھا کہ میں نہ سہی میرا باپ تو کھانا کھاتا ہے اور اگر وہ کبھی شوربے میں ڈوبی ہوئی انگلی چٹا دیتے تو دیر تک چٹخارے لیتا تھا۔ سنا ہے کہ اسی زمانے میں سب سے پہلا شعر میں نے کہا تھا جس کا مطلع تھا کہ ؎

نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں
ارے میرے اللہ میں کیا کروں

اس وقت میری عمر پانچ سال کی تھی اور یہ واقعہ میں نے نہایت تواتر کے ساتھ کئی مرتبہ والد محترم اور والدہ محترمہ سے سنا اور کچھ سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ شعر مجھ سے کیونکر سرزد ہو گیا۔

میں نے اپنے ہوش کی آنکھیں بھوپال میں کھولیں جہاں والد محترم یو۔پی پولیس سے مانگ لیے گئے تھے اور انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ یہیں اس اسکول میں دو سال ہی رہنے پایا تھا کہ والد صاحب لکھنؤ آگئے۔ لکھنؤ میں میرا داخلہ چرچ مشن ہائی اسکول میں ہو گیا اور پھر گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں آگیا۔ جہاں میٹرک فیل ہونے تک رہا۔ اس لیے کہ اس زمانے میں لکھنؤ میں فیل ہونے والے کلکتہ جا کر پاس ہوا کرتے تھے لہٰذا مجھ کو بھی کلکتہ جانا پڑا اور پھر لکھنؤ آگیا

اس زمانے میں میں نے شاعر ہونا شروع کر دیا تھا اور والد صاحب سے چھپ کر سگریٹ پیتا اور شعر کہتا رہتا تھا۔ یہ
ے تھا کہ اگر ان دونوں مشاغل میں سے کسی کی اطلاع والد صاحب کو ہو گئی تو طبیعت صاف کر دیں گے۔ مجھ کو اپنے
اس زمانے کے اشعار میں سے صرف ایک شاہکار یاد ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تمہارا شربت دیدار ہی ان کو شفا دے گا
جو عشق مرض مہلک کے بیمار ہو جائیں

"مرض" کی "ر" کو اگر ساکن کی بجائے متحرک کر لیا تو بھی اس شعر پر کوئی آنچ نہ آتی۔ ایسا شعر اب باوجود کوشش کے بھی نہیں کہہ سکتا۔ تمنا تھی تو صرف یہ کہ میرا کلام کسی رسالے میں چھپ جائے۔ آخر یہ حسرت بھی پوری ہو گئی اور لکھنؤ کے ایک رسالے میں جس کے نام ہی سے اس کا معیار ظاہر ہے یعنی "ترچھی نظر" میری ایک غزل چھپ گئی۔ کچھ نہ پوچھیے میری خوشی کا عالم۔ میں نے وہ رسالہ کھول کر ایک میز پر رکھ دیا تھا کہ ہر آنے جانے والے کی نظر اس غزل پر پڑ سکے مگر شامت اعمال کہ سب سے پہلے نظر والد صاحب کی پڑی اور انھوں نے یہ غزل پڑھتے ہی ایسا شور مچایا کہ گویا چور پکڑ لیا ہو۔ والدہ محترمہ کو بلا کر کہا، "آپ کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ جاتے ہی کیوں ہیں۔ کس سے پوچھ کر جاتے ہیں۔ والدہ بیچاری سہم کر رہ گئیں اور خوفزدہ آواز میں بولیں "وہ غلطی سے چلا گیا ہو گا"۔ مختصر یہ کہ اب میں شوکت تھانوی بن چکا تھا اور اب کوئی طاقت مجھ کو شوکت تھانوی سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ اسی زمانے میں علی گڑھ جا کر جھانکنے کا موقع بھی ملا۔ مگر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ والد محترم کا انتقال ہو گیا اور مجھ کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر فکر معاش میں مصروف ہو جانا پڑا۔ روزنامہ "ہمدم" اس دور کا بہت بڑا اخبار سمجھا جاتا تھا (رہا ہائے صاحب سید جالب دہلوی اس کے ایڈیٹر تھے اور مجھ کو بحیثیت مترجم کے انہی کی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا) سید جالب نے میرا سب سے پہلا مزاحیہ مضمون "میٹھے چاول" ایک رسالہ میں پڑھا اور دوسرے ہی دن مجھ کو حکم دیا کہ "ہمدم" کا فکاہیہ کالم "دو دو باتیں" لکھنے کی کوشش کرو۔ لہٰذا میں نے یہ مشق شروع کر دی۔ کچھ دن اور گزرنے کے بعد شذرات لکھوانا شروع کر دیے اور اب میں شعبۂ ترجمہ سے مستقلاً عملۂ ادارت میں آ گیا یہاں تک کہ پانچ سال بعد جب جالب دہلوی "ہمدم" سے رخصت ہوئے تو مجھ ہی کو ان کا چارج لینا پڑا۔ چند ہی دن بعد ملک نصر اللہ خاں سے آ کر چارج لے لیا اور میں روزانہ اودھ اخبار کی جو منشی نولکشور آنجہانی کا اخبار تھا ادارت پر آ گیا۔ اودھ اخبار کے بعد روزنامہ ہند کا ایڈیٹر رہا۔ خود اپنا روزنامہ طوفان کے نام سے جاری کیا۔ جب انقلابی حکومت نے راولپنڈی کو عبوری دار الحکومت بنایا تو جنگ نے بھی کراچی کے علاوہ راولپنڈی کو اپنا مرکز بنایا اور میں جنگ راولپنڈی کی ادارتی ذمہ داریاں لے کر راولپنڈی آ گیا۔ جہاں اب تک موجود ہوں۔ اس تمام مدت میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ بچے تو خیر چند ہی ہیں مگر کتابیں تمتر ہو چکی ہیں سو اس امت تو صرف ان کے نام گنانے کے لیے درکار ہیں جواب ختم ہو چکے ہیں۔

(ریڈیو کی ایک تقریر)

———



ہمعصروں کی نظر میں

(بہ حیثیت فن کار)



ڈاکٹر سر محمد اقبال

جناب من

آپ کے مجموعہ اشعار کے چند مقام میں نے دیکھے ہیں
اکثر جگہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اسلوب بیان میں
جدت کی ہے اور لطف یہ کہ بہت خوب کی ہے
زیادہ لکھنے سے قاصر ہوں کئی ماہ سے علیل
ہوں - والسلام

محمد اقبال ۲۴ اگست ۳۶ء

[illegible]

[illegible]

دیباچے

(ا)

مرزا فرحت اللہ بیگ

عدالتی مقدمات کی دو قسمیں ہیں، دیوانی اور فوجداری۔ اسی طرح کتابوں کے مقدمات بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، تعریفی اور تعارفی۔ تعریفی مقدمات صرف گذشتہ اہلِ قلم کی کتابوں پر لکھے جاتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خود اپنی تعریف کی جائے اور لوگوں کو سنایا جائے کہ

منم زدہ راہ بشنو دستاں

وگرنہ بیٹ جور و رسیدہ تاں

اس قسم کا مقدمہ لکھنے والے اللہ کے فضل سے ہندوستان میں بہت موجود ہیں۔ تعارفی مقدمہ اس لیے لکھا جاتا ہے کہ پبلک سے مصنف کا تعارف کرا دیا جائے اور اس کی تحریر کی خوبیاں ظاہر کرکے لوگوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالا جائے۔

"طوفانِ تبسم" پر مقدمہ تعریفی لکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ بفضلِ خدا اس کے مصنف ابھی تک بقیدِ حیات ہیں اور خبر نہیں کہ کب تک زندہ رہیں۔ اب رہا دوسرے قسم کا مقدمہ یعنی مقدمہ تعارفی تو مجھے کیا کسی کو بھی اس کتاب پر ایسی کوئی تحریر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان کا کون پڑھا لکھا شخص ہے جو شوکت تھانوی کو نہ جانتا ہو اور ان کی تحریر کی خوبی سے واقف نہ ہو۔ ایسی صورت میں ان کے مجموعۂ مضامین پر کچھ لکھنا بجلی کے قمقمے کے سامنے پیسہ کی دو والی موم بتیاں جلانا ہے۔ ہاں اگر کچھ لکھا جا سکتا ہے تو اس پر لکھا جا سکتا ہے کہ آخر آج کل کے اہلِ قلم "کھاتا اوڑھے دوڑی" کیوں بنے ہوئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ زمانہ کے ہاتھوں اس میں سب پریشان ہیں خاص کر اہلِ قلم کی تو یہ حالت ہے کہ:

ہاتھ پلے نہ مٹھی ہلبلانی اٹھی

بیچارے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں جب رزق کا دروازہ کسی طرح نہیں کھلتا تو سوچتے ہیں کہ لاؤ پبلک کو ہم نے اپنی تحریر کا گرویدہ تو کر ہی لیا ہے، کچھ انھیں سے ٹکے کمائیں، بس ان کی وہی کیفیت ہے کہ مداری پہلے تو ڈگڈگی بجا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیتا ہے اس کے بعد اپنے کمال دکھا کر ان کو خوش کرتا ہے اور پھر جھولی ہاتھ میں لے کر

ہر ایک سے کہتا پھرتا ہے کہ "روپیہ" اور "جو" ہے کہ بچایا جائے ، ابھی اس طرح تذکرہ ہو رہا تھا جس کے مزاحیہ مضامین
کے پاس سے ہوکر ، اگر کوئی کام آ پڑتا ہے تو وہ اس پادلے سے ۔ اس واقعہ کو ، علاوہ وہ صفحہ اپنی ملک کے پہلے
مضمون مانگنے کے لیے دو خط پر خط ، تار پر تار بھیجے جاتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں ہوتا کہ کسی شے کے ساتھ منی آرڈر بھی آ پہنچے
اور اس طرح بچایا ہے کہ تقاضے ہی وزن کے لیے ، وہ دوسری طرف سے اطمینان ہو جائے ۔ جب یہ صورت ہو تو مضامین
کے مجموعے کیوں نہ چھپیں اور کیوں نہ پبلک پر ظلم کیا جائے کہ اس کو خریدے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل اس قسم کی کتابوں کا
بڑا زور ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض اہل قلم تو اپنی کتابوں میں ... بلا شوق خاص ، اعلیٰ علمی کمک کر لیتے ہیں
اور بعضوں کی کتابیں واقعی ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے خریدنے کو دل چاہتا ہے : "طوفانِ تبسم" بھی ایک ایسی کتاب ہے
جس کو پڑھ کر شاید ہزاروں میں سے ایک بھی نہ کہے گا کہ "ہائے ۔ پیسے ڈوب گئے"

طوفانِ تبسم ! واللہ کیا عجیب و غریب نام ہے ۔ طوفانِ نوح کے متعلق تو سنتے آئے ہیں کہ ایک بڑھیا کے تنور
سے نکلا تھا لیکن یہ "طوفانِ تبسم" آخر کہاں سے اٹھا ۔ بڑی دیر تک سوچتا رہا ۔ سوچتا رہا ۔ آخر سمجھ میں آیا کہ منہ بھی تنور
کی شکل ہے اور "تبسم" ہمیشہ ہونٹوں ہی پر آتا ہے ۔ شاید اسی مناسبت سے یہ نام تجویز کیا ہے ۔ اگر یہ بات ہے
تو "واللہ بڑی دور کی سوجھی"

اس مجموعے کے سارے مضامین خوش مذاقی میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ اس طرح کے
مضامین لکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے ۔ شعر کی تعریف کی گئی ہے جب وہ پڑھا جائے تو یہ شعر کہے کہ میں بھی ایسا شعر
کہہ سکتا ہوں لیکن جب لکھنے بیٹھیں تو بڑے بڑے معجز نگار ہزار دفعہ قلم دوات میں ڈبوئیں اور ویسا ایک شعر نہ لکھ
سکیں ، بس یہی حال خوش مذاقی کا ہے ۔ ہر شخص پڑھتے وقت سمجھتا ہے کہ "یہی میرے دل میں ہے" لیکن دل کی اسی بات
کو زبانِ قلم پر لانے والے ڈھونڈنے ہی سے کچھ ملیں تو ملیں ، دور کیوں جاؤ ، خود اپنے ملک کی حالت ہی دیکھ لیجیے ۔ یہاں
ہزاروں اخبارات اور سینکڑوں رسالے چھپتے اور بکتے ہیں اور شاید ہی کوئی پرچہ ہوگا جس میں خوش مذاقی کا ایک آدھ
مضمون نہ ہوتا ہو لیکن بس پڑھنے ہی دیجیے ۔

ہے اب شرط منہ نہ کھلوائیں

یہ تو سب جانتے ہیں کہ تبسم دو طرح پیدا کیا جاتا ہے ، ایک تو شخصیت "کیرکٹر" پیدا کرنے سے ، دوسرے
واقعات کو اس طرح بیان کرنے سے کہ خواہ مخواہ پڑھ کر ہنسی آئے ۔ پہلی صورت کی زندہ مثال چارلی چیپلن اور دوسری
کی ہیرلڈ لائیڈ موجود ہے ۔ ہر انسان میں ایسے پہلو موجود ہیں جن کا سلیقے سے بیان کرنا لطف سے خالی نہیں ہوتا اور
ہر واقعہ میں کوئی نہ کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے کہ اس کو خوش مذاقی کا رنگ دیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً کسی کا بیچ بازار میں
گرنا کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے فطرت کا تقاضا ہے کہ گرنے والے کی مصیبت پر اظہارِ ہمدردی کیا جائے لیکن اگر کوئی
کالے صاحب سوٹ بوٹ سے آراستہ عینک لگائے ، سگریٹ پیتے ، سیٹی بجاتے ، بید ہلاتے اور راہ بازار والوں
کو اپنا زر خرید غلام سمجھتے ہوئے جا رہے ہوں اور ایک دفعہ ہی بیچ سڑک میں ان کا پاؤں آم کی گٹھلی پر سے رپٹ

بنانے اور وچاروں خانے چت آ پڑیں تو دیکھئے کہ یہی جذبۂ ہمدردی کس طرح جلد ہنسی کی صورت اختیار کر لیتا ہے
غرض ہر واقعہ میں تبسم کا یہ پہلو موجود ہے شاید انہی کا ایک شعر ہے ؎

ہجوم یاس میں بھی کچھ نہ کچھ امید تو ہے
بھلا کہ غم میں بھی ہے اک نہ اک پہلو مسرت کا

اسی مسرت کے پہلو پر شوکت صاحب نے اپنے مضامین کی بنیاد رکھی ہے۔ اب وہی کیمیا بن کر حضرت مٹی سے سونا اور پتھر سے ہیرے پیدا کرتا ہے جیسے اہل علم کا کام ہے۔ ورنہ ہوتا تو یہ ہے کہ بعض احباب تو مٹی کو سونا اور شیشے کو ہیرا سمجھ کر پبلک کے سامنے پیش کرتے اور داد کے طالب رہتے ہیں لیکن پبلک کچھ ایسی اندھی تو ہے نہیں کہ مٹی اور سونے میں یا شیشے اور ہیرے میں تمیز نہ کر سکے۔ وہ ان چیزوں کو دیکھتی اور ہنس کر خاموش ہو جاتی ہے۔ ہاں واقعی جو اہل کمال ہوتے ہیں ان کی قدر مرنے کے بعد ضرور کی جاتی ہے۔ شوکت صاحب بڑے خوش نصیب ہیں کہ ان کی زندگی ہی میں پبلک ان کی تحریروں کی دلدادہ اور ان کی خوش مذاقی کی مداح ہے ورنہ عام طور پر تو زمانہ کی یہ حالت ہے کہ ؎

کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی

اس لیے میری یہ رائے ہے کہ شوکت صاحب مقدمات کے ذریعہ سے اپنا تعارف کرانا چھوڑ دیں اور محض اپنی تحریر کے جال میں لوگوں کو پھنسائے رکھیں ورنہ خدانخواستہ کہیں یہ صورت پیدا نہ ہو جائے کہ

پرانے پڑتے کھیلا ہوا
آج نہ ہوا کل ہوا

(۲)

خواجہ حسن نظامی

خدا رکھے منشی جی چالیس کے لگ بھگ ہیں مگر شیخ سعدیؒ کا سا زمانہ نہ ملا۔ ان کو معلوم ہے شیخ سعدیؒ بھی چالیس برس کی عمر میں کریما پڑھتے تھے اور کہتے تھے۔

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاج تو از حال طفلی نگشت

تو چالیس برس کے ہونے کو آئے مگر بچپن نہ گیا۔

پھر اگر منشی جی چالیس سال کی عمر میں بسم اللہ پڑھنے بیٹھے اور ان کی بیوی نے دلی سے پیر جی کو بلایا اور اس طرح بلایا کہ خط لکھے۔ ٹیلیفون دیئے، تار بھیجے، ریڈیو میں دہائی دلوائی۔ تب کہیں پیر جی نے لکھنؤ کی تیاری کی۔ گرمی کا موسم تھا، لو چل رہی تھی، لکھنؤ کے خربوزوں کی بہار تھی۔ پیر جی ریل سے اترے اور سیدھے منشی جی کے گھر پہنچے۔ دروازہ پر آواز دی۔ اے میاں منشی جی ہم دلی سے آ گئے۔ منشی جی نے اندر بیوی سے کہا۔ لے بی منشیانی وہ پیر جی آ گئے تم نے تو اب تک بلاوا بھی نہیں بھیجا نہ کاغذ والے آئے، نہ کاپی نویس آئے، نہ چھاپے خانے والے آئے۔ تم کہتی تھیں کہ ان سب کو بلاؤں گی۔ گھر میں شادی رچاؤں گی۔ دھوم دھام سے پیر جی سے بسم اللہ پڑھواؤں گی۔

بیوی نے کہا تو باہر جاؤ، ایک کرسی دروازے پر ڈال دو، پیر جی بیٹھ جائیں، پوچھو حقہ پیتے ہیں، پیتے ہوں تو اپنا حقہ لے جا کر سامنے رکھ دو، میں ابھی پان بنا کے دیتی ہوں۔ اتنے وہ حقہ پئیں، پان کھائیں، اتنے میں تم جا کر کاپی نویسوں کو بلا لاؤ جتنے بھی لکھنؤ میں مل سکیں۔ کاغذ والے بھی جہاں جہاں ملتے جائیں بلاوا دیتے جانا، اور چھاپے خانے بھی جتنے رستہ میں ملیں سب کو آواز دے دینا کہ بھئی آؤ ہماری بسم اللہ ہے۔ پیر جی دلی سے آئے ہیں، ہماری بیوی نے بلایا ہے، دروازہ کے باہر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں، پان کھا رہے ہیں، جلدی سے آ جاؤ تو ہم سب کے سامنے بسم اللہ پڑھ لیں۔

منشی جی گھبرا کر اٹھے۔ کرسی باہر بچھائی، حقہ تازہ کر کے چلم بھری، باہر لے جا کر پیر جی کے سامنے حقہ رکھا، پانوں کا خاصدان بھی پیر جی کی گود میں رکھ دیا اور کہہ دیا کہ پان کی پیک دیوار پر نہ تھوکئے گا وہ جو سامنے موری جاتی

ہے اس میں جاکر سوئے گا۔

منشی جی اس کام سے فارغ ہو کر بلاوا دینے چلے تو بیوی نے کہا، اے ہے میں تو بھول گئی، ایک بڑا ضروری بلاوا تو باقی رہ گیا، وہ جو ریڈیو والے ہیں ان کے ہاں بھی جانا، اور کہہ دینا کہ ہم دونوں میاں بیوی مخلصانہ ان آپس میں باتیں کیا کرتے تھے، اور ہماری باتوں سے خوش ہو کر روش کیو نزنت جایا کرتے تھے اس وقت ہمارا نام سکوتی تھا کیونکہ ہم نے کیا نام اپنا غلط بنایا تھا، کچھ بات ہی ایسی تھی، یہ کہنا ٹھیک نہ تھا کہ ہمارا نام شوکت تھانوی ہے کیونکہ ہم کو ڈر تھا کہ ریڈیو والوں کی یا ریڈیو سننے والوں کی ہم کو نظر نہ لگ جائے، اس واسطے ہم نے ایسا نام بنایا جو پیر جی کے لکھے ہوئے سکورے کا ہم نام سکوتی تھا۔ اب ہم آئے ہیں اور آپ سب کو بلاوا دیتے ہیں اپنے اصلی نام سے کہ ہمارا نام حضرت مولانا شوکت صاحب تھانوی ہے۔ ہم مرزی بھی ہیں، ایڈیٹر بھی ہیں اور منشی بھی ہیں اور جی بھی ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم کو ہماری بیوی نے بہت اللہ آمین کے ساتھ پالا پوسا ہے اور اب جبکہ ہم بیس اور بیس پورے چالیس برس کے ہو گئے ہیں تو ہماری بیوی نے ہم کو بسم اللہ پڑھانے کی شادی رچائی ہے اور دلی سے ایک پیر جی کو بلایا ہے۔ ہم تم کو بھی بلاوا دینے آئے ہیں، اور ہماری بیوی نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ریڈیو والوں سے پوچھ بھی لینا کہ جو باتیں ہم دونوں نے ریڈیو میں سنائی تھیں وہ ہم کاپی نویس سے لکھوائیں گے اور چھاپے خانوں میں کاغذ پر چھپوائیں گے اور وہ سب گیارہ رات کی باتیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ منشی جی نے کہانی کہی، دوسرے یہ کہ منشی جی نے چائے بنائی، تیسرے یہ کہ منشی جی نے خط لکھا، چوتھے یہ کہ منشی جی نے دوا پی، پانچویں یہ کہ منشی جی نے صفائی کی، اپنی داڑھی کی نہیں، اپنے گھر کی، چھٹے یہ کہ منشی جی نے اپنی تصویر کھنچوائی، جرمنی کے بنے ہوئے فوٹو میں، ساتویں یہ کہ منشی جی خود بازار سے سودا سلف لائے، آٹھویں یہ کہ منشی جی نے بسم اللہ پڑھنے سے پہلے دوسروں کو سبق پڑھایا، نویں یہ منشی جی لکھنؤ سے خبر نہیں کہاں کہاں کا سفر کیا، دسویں یہ کہ ایسی بے روزگاری کے زمانے میں منشی جی کو خدا نے نوکری دی اور وہ نوکر ہو گئے، گیارہویں یہ کہ منشی جی نے پرانا مکان بدل دیا، پس گیارھویں شریف کی یاد میں پیر جی آئے ہیں تو یہ گیارہ راتوں کی بات چیت ہم چھاپ دینا چاہتے ہیں اور شائع بھی کر دینی چاہتے ہیں آپ سب لوگوں کی اجازت سے اور مہربانی سے جس کو ہندی زبان میں کرپا کرنا بھی کہتے ہیں۔ مگر دیکھنا جب تم کرپا کا لفظ بولو تو کرپا نہ کہہ دینا، نہیں تو بسم اللہ کے وقت بدشگونی ہو جائیگی کہہ دینا کہ اس شادی میں چاچا بھی آئیں، بدھو بھی آئیں، ماموں جان بھی آئیں، اور بھی جو وہاں بیٹھے ہوں، سوتے ہوں، جاگتے ہوں، چائے پی رہے ہوں، سگرٹ پی رہے ہوں، مونچھوں والے ہوں، مونچھ منڈے ہوں، سبھی کو بلاوا دے دینا، گھر بدل ہی لیا ہے، جگہ کم سہی۔ بیٹھیں گے نہیں، کھڑے رہیں گے۔

آخر منشی جی سب کو بلا لائے اور لکھنؤ کے خربوزے بھی گیارہ ٹوکرے بھروا کر ساتھ لیتے ہوئے۔ بیوی نے سنا تھا کہ اگلے زمانہ میں بادشاہوں اور پیروں کے لیے سوا لاکھ روپے کا چبوترا بنایا جاتا تھا آج انھوں نے خربوزوں کا چبوترا بنایا اور اس پر پیر جی کو بٹھایا۔ پیر جی نے منشی جی کو پاس بٹھا کر یوں بسم اللہ پڑھائی۔

— پڑھو میاں بڑے طوطے بسم اللہ۔ الرحمٰن۔ الرحیم، اللہ کا نام لے کر شروع کرتا ہوں چالیس برس کی عمر میں

خدا پہنچا، اس اللہ کا نام لے کر جو بڑی رحمت والا ہے اور جو بڑی بندہ نوازی کرتا رہتا ہے۔ وہ اللہ جس نے تم میں پنڈت، مولوی، ہندو مسلمان بنوائے، بم بنوائے، ہوائی جہاز بنوائے، ٹینک بنوائے اور پھر اس نے شیطان کو بھی پیدا کیا اور اس سے کہا تو سب آدمی کی دشمنی پر کمر باندھ لے تو نے ہم پر چھپا ہوا تیر چلایا ہے، اس سے آدمیوں کو گمراہ کر۔

پھر منشی جی اپنے خدا کا نام لے کر جس نے آدمی کو علم دیا اور قلم دیا۔ جب پیر جی نے کہا "قلم دو" تو سب جلدی جلدی جیب ٹٹولنے لگے۔ پیر جی منشی جی کو پڑھا رہے ہیں یا منشی جی کی بیوی کو۔ یوں لکھو کہ "قلم دیا" پیر جی بولے "ہاں جی قلم دیا۔" سرکنڈے کا بھی، اور لوہے کا بھی، اور وہ بھی جس کو جیبی قلم کہتے ہیں اور وہ بھی جو اردو قلم کہلاتا ہے اور وہ بھی جس کو خسرو، میر، غالب قلم، اور شوکت قلم، دہلوی قلم، اور لکھنوی قلم بھی کہتے ہیں اور یہ سب آداب کے ساتھ ہم جیسے منسوب ہیں۔

اس کے بعد پیر جی نے کہا۔ لو بھئی بسم اللہ پڑھا دی۔ اب منشی جی کی بیوی کو ہماری طرف سے مبارکباد دینا۔ منشی جی بولے ابھی بسم اللہ کہاں ہوئی، جو آپ مبارک سلامت کہنے لگے ابھی جناب میری اور میری بیوی کی گیارہ رات کی بات چیت جو میں ریڈیو والوں سے چھاپنے اور شائع کرنے کے لیے زبانی خود بلطف خود مانگ کر لایا ہوں تاکہ سند رہے اور ضرورت کے وقت کام آئے وہ بھی تو پڑھا دیجئے۔ پیر جی نے کہا اچھی بات ہے اور اس کے بعد پیر جی نے خربوزوں کے چھوٹے سے بستے پر بیٹھے بیٹھے یوں زبان کھولی۔

منشی جی اور ان کی بیوی اور ریڈیو والوں اور رسالے نویسوں اور کاغذیوں اور چھاپے خانے والوں سے اگر مسلمان ہوں تو سلام اور ہندو ہوں تو رام رام کے بعد ہم یہ لکھنا چاہتے ہیں کہ ہم دلی سے لکھنؤ آئے ہیں اور لکھنؤ سے یہ خربوزے کھانے اور لٹانے کے بعد ہم دلی براستہ کانپور طوفان میل میں واپس جانے والے ہیں۔ آج وہ دن ہے کہ یورپ میں لڑائی ہو رہی ہے، انگریز، فرانس، اٹلی اور جرمنی نہیں کون کون آپس میں لڑ رہے ہیں بہت گرمی ہے۔ بہت خاک ہے اور ہم کو بہت غصہ بھی آ رہا ہے۔ کیونکہ ہم اکہ والے کو کرایہ دینے کے لیے پانچ روپے کا نوٹ بازار میں بھنانے گئے تو کسی نے روپے ہم کو نہیں دیئے اور ہم نے غصے کے مارے پورا کا پورا نوٹ بیچنے والے کے منہ پر کھینچ مارا یعنی اس کو کچا ہی نوٹ دے دیا کیونکہ وہ کسی سے بھن نہ سکا۔

بہنو اور بھائیو! ہم مولانا شوکت صاحب تھانوی کو جانتے ہیں اور ہم اس سے بھی آگاہ ہیں کہ انہوں نے لکھنؤ ریڈیو میں گیارہ رات تک سکونی کے نام سے جو باتیں اپنی بیوی سے کی تھیں وہ ہم نے اور سب بھارت ماتا کے سپوتوں نے اپنے اپنے گھروں اور دکانوں اور ہوٹلوں میں سنی تھیں اور وہ باتیں ہم کو بحیثیت گھر سدھار کا کام کرنے کے گھر سدھار کے لیے بہت ہی اچھی معلوم ہوئی تھیں۔ ہم کو ان کے سننے سے ہنسی بھی آئی تھی اور ہمارا مع آل اولاد و امجاد کے جی خوش بھی ہوا تھا اور ہم نے ان سے سبق بھی لیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب منشی جی کی بیوی نے ہم کو دلی سے بسم اللہ پڑھانے کے لیے بلایا تو ہم نے خود اپنے کان میں کہا کہ بھئی یہ الٹی گنگا کیوں بہنے لگی۔ ہم نے تو خود منشی جی سے گیارہ رات تک سبق پڑھا ہے، وہ ہم سے بسم اللہ کیا پڑھیں گے مگر خیر ہم کو عورت ذات کا کہنا ماننا ضروری تھا، اس واسطے ہم آ گئے اور اب ہم بسم اللہ پڑھانے کے بعد یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں اپنے عقل و حواس کی سلامتی کی حالت میں اس یقین کے ساتھ کہ اب ہم

کو ہاتھ و چہ کاوٹ نہ جسے کا خطرہ نہیں ہے اور ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ کے ساتھ ہم یہ سب کچھ عرض کر رہے ہیں اور دعا ہو رہے ہیں کہ جب یہ گیارہ کی گیارہ کہانیاں کتاب کی صورت میں چھپ کر تیار ہوں تو پہلے محترمہ بیگم اس کو پڑھیں اور اپنے سب بچوں کو پڑھائیں۔ ان کے بعد گاندھی جی اور ان کی دھرم پتنی اور ان کے بچے اور پھر جواہر اور ان کی بہنیں و بہنوئی پڑھیں صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب اور سندھ اور مدراس اور بمبئی اور سی پی اور یو پی اور بہار اور بنگال اور آسام اور ہند کے سب لوگ اور اخبار اور روزنامے اور سکولوں اور کالجوں اور پاٹھ شالاؤں اور مکتبوں کے پڑھنے والے اور پڑھانے والے اور وہ سب جن کو اپنے اور اپنے بچوں کے اور اپنی بیویوں کے خوش کرنے کی ضرورت ہو اور سلطنتِ ہند اور سکھ راج بنانے کی ضرورت ہو وہ سب ان گیارہ کہانیوں کو لفظاً پڑھیں، معناً پڑھیں، اشارتاً پڑھیں، کنایتہً پڑھیں اور چھاپہ خانے کے مشہور کانے قانون سے لگائے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس کو پڑھیں پڑھائیں اور مولانا شوکت تھانوی سکونی و حقانی و شہری کے حق میں دعائے خیر کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو یہ بسم اللہ پڑھنی ایسا مبارک کرے کہ یہ ہمیشہ چالیس ہی برس کے رہیں کیونکہ ہم جس کو بسم اللہ پڑھاتے ہیں تو صراطِ مستقیم بھی پڑھاتے ہیں اور مستقیم راستہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے راستہ میں ثابت قدم رہے یعنی نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے بس ایک جگہ پاؤں جمائے کھڑا رہے۔ لہٰذا مولانا شوکت بھی جیسا کہ ہم سب نے ابھی خوشی خوشی کے روپ میں دیکھا ہے اور جن کی عمر مبارک چالیس سال ہے وہ نہ کبھی ۳۹ سال کی طرف جائیں اور نہ کبھی اکتالیس کی طرف قدم بڑھائیں۔ کہیں سب حاضرین! اے خدا، اے گاڈ، اے پرمیشر ایسا ہی کر۔

---

(۴)

مرزا عظیم بیگ چغتائی

ایک وکیل کو مقدموں سے کہاں تک دلچسپی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ شاید کوئی وکیل ہی لگا سکے پھر انھیں تو یہ نہیں دیکھنا کہ مقدمہ فوجداری کا ہے یا دیوانی کا یا کسی منقولات جیسے کا انھیں مقدمے سے مطلب۔ لہٰذا مجھے چنداں ضرورت نہیں کہ اس "مقدمہ بازی" کے لیے کوئی معذرت خواہ ہوں۔ جبکہ شاید میرے لیے یہ ناممکن ہو گا کہ اس نوعیت کے کسی "ادبی مقدمہ" کا وجود تو بڑی چیز ہے ذکر بھی اپنے رجسٹر مقدمات سے نکال کر پیش کر سکوں۔

جی ہاں، مجھے فخر ہے کہ میں حضرت شوکت تھانوی جیسے مسلمہ ادیب اور مزاحیہ نگار کی ایک بہترین کتاب پر مقدمہ لکھ رہا ہوں کسی کتاب یا تحریر کا لطف خاص طور پر جب حاصل ہو سکتا ہے جب مصنف کے ہم عصروں کے مضامین بھی پیشِ نظر ہوں۔ دراصل موازنہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے سے مضامین کا حسن لطف حاصل ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور کے مزاحیہ نگاروں کی اگر فہرست تیار کی جائے تو حضرت ملا رموزی سے لے کر ہر وہ شخص مزاحیہ نگار ثابت ہو جائے گا جس نے کوئی مزاحیہ مضمون دیکھا یا سنا ہے لیکن اگر واقعی دیکھا جائے تو چوٹی کے مزاحیہ نگار صرف تین چار ہیں۔ آغا فرحت، حضرت پطرس، مسٹر رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی اور بعد اس کے تو اللہ کے فضل سے سب ہیں چنانچہ ہم خود بھی کہتے ہیں کہ "ہم بھی ہیں پانچوں سواروں میں" یعنی اگر میرا نام یا حضرت ملا رموزی کا نام اس میں اور جوڑ دیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں خود اپنی ذات سے تنقید شروع کرتا ہوں بہ محض اس وجہ سے کہ پستی سے بلندی کی طرف چلنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

قصہ کو مختصر تر دو لفظوں میں اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ شوکت مجھ سے نہ صرف اچھا لکھتے ہیں بلکہ بہت اچھا لکھتے ہیں، بہت ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لوگ خیال کریں گے کہ میں یہ بات دل سے نہیں لکھ رہا ہوں محض اس لیے کہ شیطان ہر مزاحیہ نگار کے کان میں یہی پھونک گیا ہے کہ "بیٹا! تجھ سے اچھا کوئی نہیں لکھ سکتا"، مگر واقعہ یہ ہے کہ مزاحیہ نگاری میں شوکت کی میں گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اگر افسانہ نویسی اور مزاحیہ نگاری میں کوئی فرق ہے اور آپ اس کو محسوس کرنا چاہتے ہیں تو میرے افسانے اور شوکت کے مضامین دیکھئے پھر میرے مضامین مزاح کی یک چاشنی اور

زبان کی لطافت اور شگفتگی سے خالی نظر آئیں گے۔ سچ ہے کہ میری تمام مزاحیہ نگاری کا دار و مدار محض اس افسانویت " یعنی پلاٹ پر ہے۔ پلاٹ نکال دیجئے تو پھر کچھ نہیں رہ جاتا۔ لیکن شوکت بغیر پلاٹ کے ایسا مضمون لکھتے ہیں کہ جملے بہتر ہیں۔ سب سے بہتر ہو پلاٹ اس کے آگے کچھ نہیں۔ بطور نمونہ زیر نظر مجموعہ میں "بیوی کا پروپگینڈا" دیکھئے ملاحظہ ہو دوست کی حماقت کہ جورو تو دوستوں کے خلاف جزئی پہ دھار" رکھے ہوئے ہے اور شوہر صاحب ہیں کہ خواہ مخواہ کا پروپگینڈا کرتے پھر رہے ہیں۔ کس قدر واہیات آم کھلاتے ہیں پھر شوکت ہی کا حصہ ہے اور کس خوبصورتی سے آموں کی تعریف کرتے ہیں " دیکھو یہ آم چھوٹے ضرور ہیں اور ان کا ریشہ بھی بہت بڑا ہے لیکن عجب پرکیف آم ہیں تم ان کی گٹھلی پہ نہ جاؤ۔ سبحان اللہ، ورنہ اس کی کمی پر غور کرو ۔ " مزاحیہ نگاری اس کو کہتے ہیں۔

دراصل مزاحیہ نگاری کا یہاں کمال نظر آتا ہے اور یہی شوکت کا اصل رنگ ہے پھر لطف یہ کہ آخری جملہ اس کا "اور اتنے سے آم میں گٹھلی تو دیکھو، ماشاء اللہ کتنی بڑی ہے . . ." بخدا میں تو دس جنم لوں جب بھی یہ بات ہرگز نہیں پیدا کر سکتا جو اس جملہ میں ہے بالفرض کوشش کروں یا کرتا تو لفظ "ماشاء اللہ" کا یہ استعمال و بخدا میری دانست میں شوکت اس سے بڑھ کر مزاحیہ نگاری کی خود اپنے یہاں سے بھی کوئی مثال مشکل سے پیش کر سکیں گے مضمون کی پوری کوھبڈی اس لفظ "ماشاء اللہ" میں بند کر دی ہے ساتھ ہی لطف یہ ہے کہ گو ان کے مضامین کا محض پلاٹ پر دار و مدار نہیں ہوتا لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ شوکت کے یہاں پلاٹ کی خوبی ہی نہیں ملے گی بلکہ "شامت" کو ملاحظہ فرمائیے تو اس میں ایک معمولی سے واقعہ کے ساتھ قصہ کو کتنا عمدہ پلاٹ دیا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ "بیوی کا پروپگینڈا" بھی کسی طرح پلاٹ سے خالی نہیں۔ مضمون کے آخری حصہ میں بہترین "ٹریجڈی" پیش ہے۔

قصہ مختصر یہاں تک میرا اور شوکت کا تقابل یا موازنہ ہو سکتا ہے میں ایک افسانہ نویس یا ناول نویس ہی کہ شوکت کے پایہ کو چھونے کی کوشش کر سکتا ہوں مگر بحیثیت مزاحیہ نگار کے شوکت کا رنگ میرے لیے قابلِ تقلید ہے نہ کہ قابلِ تنقید۔ دراصل مزاحیہ نگاری اور چیز ہے اور افسانوں میں عشقیہ معاملات اور شوخی و شرارت سے جان ڈالنا اور بات ہے۔ قصہ مختصر میری مزاحیہ نگاری میں عشق و محبت کی داستان زائد ہے اور اس چیز کو دوسرے مزاحیہ نگاروں نے بالخصوص نہیں چھوا ہے۔

اس کے بعد میں چوٹی کے ادیب کو لیتا ہوں یعنی آغا فرحت۔ لوگ کہتے ہیں کہ اردو ان کے گھر کی لونڈی ہے اور میں کہتا ہوں کہ ادب کے تمام صیغے اور تمام محکمے ان کے غلام ہیں۔ آغا فرحت کس گھر بند ہیں۔ مزاحیہ نگاری افسانہ نویسی اور حد ہو گئی شاعری بھی۔ لہٰذا ان کا شوکت کا مقابلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ شوکت ایک خاص فلک ادب کے مالک ہیں مگر آغا فرحت کے یہاں تو وہ چنگیزی پر عملدرآمد ہے۔ مگر ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ آغا فرحت کو زبان کی بڑی بھاری جیت ہے۔ جی میں آتا ہے پلاٹ سے مزاحیہ نگاری پیدا کر دیتے ہیں اور جی میں آتا ہے زبان سے۔ اور جی میں آتا ہے "یونہی" آغا فرحت کی زبانی مزاحیہ نگاری کا کمال "اصلاحِ سخن پر میرے خیالات" میں آتا ہے مضامین فرحت حصہ سوم دیکھئے۔ اور اس ادب کے شاہکار اور زبان کی زبردستی کو دیکھئے کہ کس غضب کی مزاحیہ نگاری ہے۔ آغا فرحت کا مقابلہ شوکت

اپنے رنگ میں ضرور یکتا ہیں اور جب تک اپنے رنگ کا پایا جانا ہر مضامین کے لیے لازمی ہے شوکت بھی ان سے کم نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آغا فرحت یہ پڑھ کر ایک پھریری لیں اور ہر گستاخی پر مجھ سے خفا ہو جاویں۔

حضرت پطرس کو لیجئے جو کچھ بھی چند مضامین ان کے موجود ہیں وہ مضمون نہیں بلکہ ادبی ہیرے ہیں۔ میں بعض شوکت اور ان کے مضامین کا موازنہ کرنے سے قاصر ہوں۔ ایک عجیب ناقابل بیان خوبی پطرس کے جملوں میں ہے۔ شوکت کے یہاں اتنی ہی خوبصورت چیزیں ہیں مگر جنس اور ہے۔ دونوں کی مزاحیہ نگاری اپنے اپنے رنگ میں خوب ہے اور دونوں اپنے اپنے رنگ کے بادشاہ ہیں۔

حضرت ملا رموزی کسی زمانہ میں ملک کے واحد مزاحیہ نگار رہ چکے ہیں اور اپنا نیا اور نرالا رنگ لے کر آئے اور بعض چیزیں پیش کیں اور جو ان کی قدر ہوئی وہ اس کے مستحق تھے مگر ان کے یہاں ان کی چیز پرانی ہو کر رہ گئی۔ ان کی جدت قابلِ تعریف ہے مگر بار بار ایک ہی بات کا دہرانا ان کی محبوبیت کے لیے سم ہوگیا۔ "ننھے میاں کی والدہ" ایک ایسا جملہ تھا کہ دنیا کی جدت اور مزاحیہ نگاری اس میں موجود تھی لیکن یہ جملہ خود حضرت ملا رموزی نے مع مبالغہ ہر مضمون میں کوئی سو دفعہ استعمال کیا۔ حتیٰ کہ اس کا استعمال بدمذاقی کا ثبوت ہو کر رہ گیا ہے۔ جانے جنس کے سبب اس جملہ کو پڑھ کر رونا آتا ہے۔ قصہ مختصر ملا رموزی کی تمام مزاحیہ نگاری کا دارومدار چند جملوں پر تھا جو بار بار دہرائے جا چکے اور اب ان میں کچھ نہیں رہ گیا۔ پھر خیر سے ملا صاحب از خود مزاحیہ نگاری کو چھوڑ کر لیڈری کے چکر میں پڑ گئے اور اپنی قسمت انھوں نے جمعیۃ العلماء سے وابستہ کرکے کچھ اور ہی کرنا شروع کر دیا۔ یعنی فی الحال بقول مسٹر رشید احمد صدیقی، ملا صاحب اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ پھر اس سلسلہ میں انھوں نے غصہ کا اتنا زیادہ استعمال شروع کر دیا ہے کہ کوئی شائستہ ادبی پرچہ ان کے اس سب و شتم کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے جو وہ علی گڑھ کالج کے خلاف بالخصوص اور مہذب اور انگریزی تعلیم یافتہ جماعت کے خلاف بالعموم اپنی قدامت پرستی کے رنگ میں کر جاتے ہیں، اور پھر لطف یہ کہ مزاحیہ نگاری اور تجارت دونوں مقاصد کو انھوں نے مدغم کرکے یکجا کر دیا اور ساتھ ہی اپنے ذاتی پروپیگنڈے اور کتابوں کی اشاعت کا بار بھی مزاحیہ نگاری کی نازک کمر پر لاد دیا۔ نتیجہ یہ کہ "بدھیا کیچڑ میں بیٹھ گئی" اور ملا صاحب کو "لاٹھی اور بھینس" کی فکر پڑی۔ مزاحیہ نگاری اور مزاحیہ نگار دونوں ملا صاحب کے ہمیشہ ہمیشہ اگر شکر گزار اور مداح رہیں گے تو ان وجوہات کی بنا پر شاکی بھی رہیں گے۔ انھوں نے مزاحیہ نگاروں کی اگر توہین کی تو مزاحیہ نگاری کی تذلیل کی۔ شوکت تھانوی کو ملا صاحب سے کوئی مناسبت نہیں۔ ملا صاحب کے مقابلہ میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ شوکت ادیب اور مزاحیہ نگار ہیں اور ملا صاحب محض ایک "غور طلب مصلح" نہ کہ مزاحیہ نگار۔

حضرت رشید احمد صدیقی کی اور شوکت کی مزاحیہ نگاری میں عجیب و دلچسپ مناسبت بھی ہے اور فرق بھی۔ فرق یہ کہ اگر مسٹر صدیقی بلاغت کے ساتھ مزاحیہ نگاری کے عجیب و غریب نمونے پیش کر سکتے ہیں تو شوکت اپنی فصاحت اور شگفتگی میں جواب نہیں رکھتے۔ مسٹر صدیقی کے ریمارک غضب کے ہوتے ہیں پھر طنز کی شاید مزاحیہ نگاری میں ان کے برابر کوئی نظیر پیش ہی نہیں کر سکتا۔ ایک جگہ جامعہ ملیہ کی "کھدر نگاری" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "کچھ پتہ ہی یہاں

جامعہ ملیہ میں نہیں جانا کہ یہ پروفیسر کون ہے اور چپڑاسی کون ہے۔ دراصل یہ تعریفی جملہ ہی ہے کیونکہ وہاں پروفیسر بھی اسی [illegible] دکھاتے ہیں بعض اوقات [illegible] کرتے ہیں۔ مناسبت دونوں میں یہ ہے کہ [illegible] حضرات کے یہاں روزمرہ کے واقعات سے [illegible]۔ میری طرح کسی غیر معمولی واقعہ یا حادثے کے قطعی محتاج نہیں۔ شوکت اور [illegible] لطافت کے [illegible] مزاحیہ نگاری کا انداز [illegible] اور حقائق نگاری اور مزاحیہ نگاری کو ملا کر ظرافت نگاری کا کمال دکھانا خاص [illegible] رنگ ہے اور [illegible] شوکت [illegible] اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔

قصہ مختصر زیر نظر مجموعہ میں دیکھئے تو شوکت اپنے بہترین رنگ میں موجود ہے۔ ہر فقرہ اور ہر مضمون دیکھئے کوئی کسر اس [illegible] نہیں رکھی۔ ہر فقرہ [illegible] وہ پول کھولا ہے کہ خدا کی پناہ [illegible] لطف [illegible] حضرت نہایت ہی خوبصورتی سے [illegible] مضمون [illegible] کے ساتھ موجود ہے۔ "جالینوس" دیکھئے کس عجیب غریب رنگ میں شروع ہوا ہے [illegible] لکھنے والا [illegible] نوعیت کا سارا مضمون ہے [illegible] اعتراض کہ [illegible] حضرت معترض نے ایک بہت عمدہ افسانہ لکھ کر دیکھ لیا بھی یہی لکھنا پڑا اور نہ معلوم [illegible] کتنے افسانے [illegible] اعتراض وارد ہو چکے ہوں گے۔

شوکت کے یہاں معمولی واقعات [illegible] بعض جگہ عجیب و غریب اسپیڈی موجود ہے۔ مضمون "گھاگرا پارٹی" دیکھئے۔ ریل کے [illegible] جس طرح [illegible] جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک کی ایڑی ایک [illegible] پنجہ اور [illegible] ایڑی [illegible]" یا پھر اسی مضمون میں صفحہ ۶۳ پر نسیم صاحب کے غزل پڑھنے کی مشق کا بیان [illegible] اس کی نظیر ملنا مشکل ہے اور یہی شوکت کا کمال ہے جو آپ کو کسی دوسرے مصنف کے یہاں [illegible] مزاح نگاری ہے جس نے شوکت کو شوکت بنا دیا ہے اور اردو اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

قصہ مختصر شوکت کا یہ مجموعہ مضامین اس قابل ہے کہ اس کی قدر کی جائے اور مجھے امید ہے کہ جس طرح ان کی پہلی دو کتابیں مقبول ہوئیں یہ مجموعہ بھی مقبول ہوگا۔

اس مختصر مقدمہ میں ہندوستان کے سب کے سب مزاحیہ نگاروں کی فہرست دینا میرا مقصد ہرگز نہیں اور اسی وجہ سے میں نے ان مزاحیہ نگاروں کو نہیں لیا ہے جن کی مزاحیہ نگاری سے کہیں زیادہ بہتر خود ان کی سنجیدہ تحریریں ہیں اور ان کا اصل رنگ ہی اور ہے۔ ان کا ذکر نہ ہونے سے خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کسی طرح بھی مجھ سے کسی طرح کم ہیں یا میں نے محض تفریحاً ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

سب کچھ تو میں نے لکھ دیا مگر آپ کہیں گے کہ شوکت کی خامیاں اور کمزوریاں بھی ہوں گی وہ آخر کہاں گئیں؟ تو عرض یہ ہے کہ کوئی ایسا لکھنے والا نہیں جس میں خامیاں نہ ہوں اور یقیناً شوکت کوئی دیوتا یا فرشتہ نہیں۔ مجھ میں

آپ بیتی، شوکت میں سب ہی میں خامیاں بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ زیر نظر مجموعہ میں ان خامیوں یا غلطیوں سے خالی نہ ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بجائے ان خامیوں کا [illegible] چلانا درست ہے لیکن [illegible] ہے کہ جو کچھ بھی خامیاں ہیں وہ کہیں چھپا کر نہیں رکھی گئی ہیں اور اس مجموعہ میں ان کو تلاش کیجئے۔ [illegible] وقت ضرورت ہوگی [illegible] شرط ہے۔ خود شوکت تھانوی صاحب بھی پیری کی اس منزل میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ [illegible] بلکہ یہ مجموعہ [illegible] ہر وقت عیب جوئی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ عیب زیادہ ہیں یا خوبیاں، اور اس معیار پر آپ اس مجموعہ کو یقیناً کھرا پائیں گے۔

نقد

(۴)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پچھلی سطروں میں شوکت صاحب نے فرمائش کی کہ میں ان کے زیرِ نظر مضامین (دو نئے قسم) پر کچھ لکھوں میں فوراً رضامند ہو گیا لیکن تعطیل میں کام کرنے کا جو وعدہ کر لیا جاتا ہے اسے تعطیل ہی میں پورا کر دینا نہ میرے بس کی بات ہے اور نہ میں اسے پسند کرتا ہوں، تعطیل میں وہ کام کرے جسے کام کرنے کا سلیقہ نہ ہو، یا جو کام نہ کرنے کے فن سے ناواقف ہو۔ میں نے اس میں یہ بڑا راز معلوم کیا ہے اوّل تو یہ کہ یہ بڑی کم ظرفی ہے کہ ادھر کام آیا، ادھر لگے اسے کرنے۔ میں پہلے تو ہر قسم کا کام اکٹھا کرتا جاتا ہوں۔ دوسرے جب سمجھ لیتا ہوں کہ کاموں کی اچھی خاصی مقدار جمع ہو گئی ہے تو پھر ان کی کھتونی شروع کرتا ہوں بڑے کام، اوسط کام، چھوٹے کام اس کے بعد اوسط کاموں کو چھوٹے کاموں سے ٹکراتا ہوں۔ اس میں سارے چھوٹے کام پاش پاش ہو کر ختم ہو جاتے ہیں اور اوسط کام بھی اچھی خاصی تعداد میں مجروح ہو جاتے ہیں، اب اوسط کو بڑے کاموں سے ٹکراتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ سارے اوسط کام، آ جاتے ہیں اور بڑوں میں بھی مقتولین و مجروحین کی تعداد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جو جانچ پڑتال کی جاتی ہے، تو صرف بعض سخت جان باقی بچتے ہیں۔ ان کو اپنی سہل انگاری، حیلہ پرولزی، ناکسی و نااہلی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی زد میں جن کا اعلان نامناسب ہے، ملاتا ہوں۔ نتیجہ اکثر خاطر خواہ نکلتا ہے۔ میرا کچھ نہیں بگڑتا لیکن کاموں کا مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ وقت کے معاملہ میں بھی یہی اصول بعض جزئی ترمیم کے ساتھ کام میں لاتا ہوں۔ لیکن میں کم سے کم یہاں خواہ مخواہ غیر متعلق مسائل چھیڑنا نہیں چاہتا۔

چنانچہ شوکت صاحب کی فرمائش رفتہ رفتہ فہمائش کی حد تک پہنچی اور آزردگی پر ختم ہونے والی ہی تھی کہ میں چونکا تو پانی سر سے گذر چکا، تعطیلیں ختم ہو چکی ہیں اور کچھ لکھنا تو درکنار پڑھنا اور سوچنا بھی ناممکن ہو گیا ہے لیکن ان باتوں کو خاطر میں کون لاتا ہے۔ شوکت صاحب میرے بڑے عزیز دوست سہی، لیکن میرے ہاتھوں ان کی دوستی کا جو حال ہوا ہے، اس سے میں یہ کیسے مان لوں کہ وہ مجھے معاف کر دیں گے اور اب تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ لکھوں گا اسے بھی وہ معاف نہ کریں گے۔

قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کروں ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے جس کا اظہار کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں اوّل تو یہ کہ میرے اکثر دوستوں بزرگوں اور عزیزوں نے میرے ساتھ تصویریں کھنچوائیں لیکن خود مجھے وہ تصویریں کبھی دیکھنے کو

دیکھیں۔ میں نے اس دفعہ کی نقوش کی تو معلوم ہوا کہ ... ابھی نہیں آئی تھی ... شوکت سے پہلے
تھی۔ پاس والوں کی تصویر خراب کر دی تھی۔ ... کر دیا گیا۔ ...
... پر مقدمے ہی ... خوب خوب ... کچھ دنوں بعد ... تو
معلوم ہوا کہ میرا مقدمہ پیچھے رہ گیا ... مقدمہ شائع کرنا مناسب
نہیں سمجھا۔ ... معلوم کہ اس مضمون کا ... ہے ... مانگنا ... ہے

شوکت صاحب کے مضامین کے دو مجموعے شائع اور مقبول ہو چکے ہیں "... تبسم"۔ "برجستہ"۔
"سیلاب تبسم" "طوفان تبسم" ... ایک بات ... شوکت صاحب ... مجموعہ کا کوئی نام
... تجویز کر دو۔ ... سے اسی زمانے میں ... چاندنی چوک دہلی ... ہنسی چھوٹی چھٹی ہی چھٹی
اچھل پڑا۔ چھٹی کا لفظ اتنا قریب ہو کہ اچھل پڑنے کے محل استعمال ... لاحول ولا قوۃ
... شوکت صاحب کو ... "تبسم ہی تبسم" ... شوکت صاحب نے
"تبسم" ہی موزوں سمجھا ... اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"چھٹی ہی چھٹی" اور "تبسم ہی تبسم" کے بعد اپنا سا منہ لے کر رہ جانے کا محاورہ بھی یہاں کچھ نامناسب ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن کیا کیا جائے اب تو یہ چیز بندھ ہی گئی۔ آخر ہمارے اردو شعرا بھی ایسے مواقع پر یہی کرتے آئے ہیں، ان کا ... نے کیا کر لیا۔

میرا خیال ہے کہ ناموں کے انتخاب میں شوکت صاحب نے اپنی فطری کسر نفسی سے کام لیا ہے، ان کے ننگ ملک تخلص تبسم سے نہیں ہوتی اور ممکن ہے یہی سبب ہو کہ انھوں نے غیر شعوری طور پر تبسم کے ساتھ "سیلاب" اور "طوفان" کی ترکیبیں بنا رکھیں، حالانکہ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبسم کا سیلاب طوفان بالکل متضاد ... خلاف آہنگ ضرور ہے
اتنا لکھنے کے بعد مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ میں بعض باتیں قبل از وقت کہنے لگا ہوں اس لیے اسے ذہن میں فی الحال یہاں ختم کرتا ہوں اور دو چار دوسری باتیں عرض کرتا ہوں۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ طنز و ظرافت کی ابتدا ایک طرح کی سب و شتم یا پھکڑ اور جگت سے ہوئی ہے جیسا کہ پچھلے روم اور یونان کی رسوم و عبادات کی تاریخ کے اوراق میں جہاں تہاں ملتے ہیں۔ لیکن مشکل اور مصیبت یہ ہے کہ ہمارے شاعر اور ادیب آج بھی طنز و ظرافت میں تاریخ کے انھیں ابتدائی اوراق سے سبق لیتے ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہمارا تمدن ترقی کرتے کرتے وہیں پہنچ گیا؟ جہاں اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ لیکن یہاں میں تاریخی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ہم اس حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے اور شاید عمل کر بھی نہیں سکتے کہ ظرافت نگاری کا مقصود بالذات صرف ہنسانا ہی نہیں ہوتا بھی نہیں بعض مسخرے تو ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو ہنسانے سے پہلے خود قہقہے لگانے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں سننے والے کو رونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ یا پھر کوئی ایسا منچلا بھی نکل آتا ہے جو اس قسم کی حرکت پر ہنسانے والے کو زد و کوب کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ

بعض ظرافت نگار ہم میں ایسے بھی موجود ہیں جو تلخ یا کھری بات کو ہنسی ہنسی میں بنا دیتے ہیں اور سننے یا پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس نے کیا سنا اور کیونکر متاثر ہوا۔ اس قسم کے کہنے والے بالعموم طنز بات سے لگاؤ رکھتے ہیں جن کے اُردو شاعری میں اکبر مرحوم امام تھے۔ ان کے بارے میں اقبال نے آخری بات کہہ دی ہے۔

گہے گریۂ او چو ابر بہارے
گہے خندۂ او چو تیغ اصیلے

ہر قوم اپنے تمدنی عروج کے اعتبار سے مختلف مدارج پر فائز ہوتی ہے اور ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا ہے۔ کہ تمام خال کے ایک اعتبار سے وہ نہایت درجہ متمدن ہو اور دوسرے اعتبار سے غیر متمدن، یہ ستم ظریفی بھی ہم ہندوستانیوں ہی کے حصہ میں آئی ہے۔ شخصی اور جماعتی اعتبار سے ہماری قوم خاصی متمدن قوم ہے۔ لیکن شعروادب کی وادی میں پہنچ کر ہم اکثر گمراہ وہ نہ وا ماندہ راہ ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا شعروادب ابھی پورے طور پر مکمل نہیں ہوا ہے طنز و ظرافت کا فن نہایت مشکل ہے۔ نہایت خطرناک بھی۔ معمولی یا گھٹیا ظرافت ایسا حربہ ہے جس سے اس شخص کو کم نقصان پہنچتا ہے جس پر حملہ کیا جائے بلکہ اس کی سب سے کاری ضرب خود اس شخص پر پڑتی ہے جو اس حربہ سے کام لیتا ہے۔ سب سے کاری اور سب سے مکمل وہ طنز یا ظرافت ہوتی ہے جو غیر شعوری طور پر بر سرکار آجائے اور یہ تمیز کرنا دشوار ہو جائے کہ مقصود طنز یا ظرافت تھی یا تلقین حقیقت، یہ بات بڑی دیر میں آئی ہے اور بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے۔ لیکن بجائے خود یہ بات جتنی مشکل ہے اتنی ہی دلکش ہے اور اس فن کی شاید یہ آخری منزل ہے۔ اس کی مثال اُردو میں قاضی عبدالغفار کے ہاں ملتی ہے۔ ان کے لیلیٰ کے خطوط میں تھوڑی بہت۔ نقشِ فرنگ میں بدرجۂ اتم اور مجنوں کی ڈائری میں بالکل نہیں۔

طنز نگاروں میں بھی کئی گروہ ہیں اور ان کے مسالک بھی جداگانہ ہیں۔ بعض میں جوش و ہیجان و طغیانی ہے بعض میں تلخی و زہرناکی۔ بعض میں شگفتگی و دلربائی۔ ادبیات قدیم میں ان کے علمبردار ہو گئے ہیں۔ جو ذٹل اور پرسی اسر تھے۔ ہمارے شعروادب میں ابوالکلام، عبدالماجد اور اکبر مرحوم ہیں۔ اس موضوع پر بالتفصیل میں نے علیحدہ بحث کی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ شوکت صاحب کی دنیائے تبسم کو اس قسم کی بحث سے گرانبار کروں۔

شوکت صاحب کو ممکن ہے یاد ہو کہ میں نے ایک بار ان سے عرض کیا تھا اور غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب میں میڈیکل کالج لکھنؤ میں صاحب فراش تھا اور شوکت صاحب مجھے اکثر دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ان کی مہربانی و مروت میرے دل میں اب تک تازہ ہے۔ میں نے کہا تھا کہ شوکت صاحب آپ نے تحریر کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ روزمرہ کی دنیا میں جو چاہے دیکھئے، سنئے لیکن کتنے وقت اس دنیا میں چلے جایا کیجئے جو تماشا اور تماشائی دونوں سے الگ ہو اور تنہا ہو۔ حالات و حوادث آپس میں اور دوسری چیزوں سے بھی اتنے ملے جلے یا گڈمڈ ہوتے ہیں کہ ان کو جوں کا توں بیان کر دینے سے نہ تو وہ اپنے اصلی خدوخال میں نمایاں ہوتے ہیں اور نہ ان میں کوئی لطافت یا جاذبیت ہوتی ہے سننے یا پڑھنے والے اسی وقت مسرور یا متاثر ہوتے ہیں جب آپ ان کو حالات اور واقعات کی سیر اس طور پر کرائیں کہ وہ ہر چیز کو اس کے اسی رنگ و آہنگ

ہیں وہ کچھ باتیں یکجا ہیں۔ مثلاً رنگ یا رنگ کہہ لیجیے، میں سمجھتا ہوں رنگ یا رنگ سے [illegible] ہو۔ [illegible] پورا کرتا ہو رہا ہے یا کر سکتا ہی ہے، رنگ رنگ کی ناقص تعبیر ہے۔ اصل چیز رنگ رمز ہے [illegible] کے معنی میں ظاہر وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ باتیں شوکت صاحب کو سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ وہ کہیں گے کہ یہ فلسفہ [illegible] تصوف کی [illegible] کاری ہیں۔ میں بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ رجحانوں سے اس قسم کی باتیں نہ کی جائیں۔ لیکن اس سے ساتھ شوکت صاحب بھی اتفاق کر لیں گے کہ یہ فلسفی باتیں بڑی گراں باری سے ادا ہوتی ہیں اور اس کو ادا [illegible] جیسی ہے اور نہ عمر اور یہی سبب ہے کہ اس کے مزاج کے مطابق یہ باتیں ہیں [illegible] سمجھ [illegible] بلند پایہ زریں پرواز تخیل سے سمجھنا چاہ رہا ہوں [illegible] وہ حرف کا ثبات ہے [illegible] زمان و مکان سے طور [illegible] زیادہ [illegible] سچ ہے لیکن یہ بات بھی کچھ تو سمجھ میں [illegible] بھی آپ فلسفہ اور تصوف والی بحث میں شوکت صاحب کو کچھ رکھنا چاہتا تھا۔

خیر اسے جانے ہی دیجئے۔ جہاں زمین شعری [illegible] شدم [illegible] جو وہاں تو [illegible] ہی سہی۔ شوکت صاحب ہم [illegible] کے بڑے دلدادہ ہیں، اس لیے ماہر بھی۔ یہاں [illegible] مروت [illegible] قسم کی باتوں سے [illegible] میری مراد خانگی زندگی سے ہے۔ شوکت صاحب اپنے قریبی رشتہ دار مثلاً [illegible] جانی [illegible] بے تکلف ملنے والے دوستوں اور ساتھیوں پر [illegible] جڑی ہیں ان کی خوب خوب خبر لی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس [illegible] میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں شوکت صاحب کے حریف چغتائی اور ملا رموزی ہی ہیں۔ یہ بات اچھی بھی ہے اور بری بھی اور بڑھ جانے پر بہت ہی بری جس کا نمونہ ملا رموزی ہیں۔ ان کی ہر قسم کی ظرافت یا اس قسم کی تحریر [illegible] سے ملوث ہو کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہیں۔

میں نے ابھی ابھی کہیں ذکر کیا تھا کہ ظرافت اور طنز کو کائناتی پس منظر میں رکھنا بہت ضروری ہے چہ جائیکہ پس منظر ذاتی حالات و حوادث کی زد میں آ جائے۔ ملا رموزی جن حالات و حوادث کو اپنی طنز و ظرافت کا ہدف بناتے ہیں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہدفِ ملامت محض اس لیے بنائے گئے ہیں کہ خود ملا رموزی ان میں مبتلا ہیں ورنہ وہ حالات و حوادث کبھی اس قابل نہ تھے کہ ان کے خلاف طنز و ظرافت کا حربہ استعمال کیا جاتا۔ وہ غربت فلاکت ناکسی و کس مپرسی وغیرہ وغیرہ کے اس لیے شاکی ہیں کہ وہ خود ان میں مبتلا ہیں ورنہ ان کے عقیدے میں یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان کو ہدفِ ملامت بنایا جائے اس قسم کی کمزوریوں کا شمار طنز و ظرافت کی شریعت میں کبائر میں ہوتا ہے۔ جو شخص اپنی اور زمانہ کی حرمت نہ قائم رکھ سکے اس کو طنز و ظرافت کی وادی میں قدم نہ رکھنا چاہیئے۔ شوکت صاحب کو سوجھتی بہت اچھی ہے لیکن سوجھنے اور سجھانے میں فرق ہے۔ ممکن ہے کسی کو سوجھتی اچھی ہو لیکن سوجھانے میں وہ قطعاً ناکامیاب رہے۔ سودیشی ریل گاڑی میں شوکت صاحب نے سوجھنے سوجھانے دونوں میں کمال کر دیا اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شوکت صاحب کی سودیشی ریل گاڑی نے انھیں جس منزل اور منزلت پر پہنچا دیا ہے اس پر بڑے بڑوں کی بھی نظر رشک سے پڑے گی۔ "کانگریس" کا بھی یہی درجہ ہے، ہماری زندگی، ہمارے تمدن، ہمارے سیاسی رجحانات، ہمارا عزم و عمل لکھنؤ کی فضا، ہندوستان کی ذہنیت کا ایسا بدیع نقشہ

کھینچا ہے کہ شوکت صاحب کا سخت سے سخت ناقد بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شوکت صاحب کی زبان اچھی ہے اور بیان بہت اچھا۔ اس موقع پر بعض لوگ کوثر و تسنیم کا لفظ استعمال کیے بغیر نہ رہتے لیکن محض اس ڈر سے کہ آجکل ہماری انشاپردازی پر سب سے بڑا جرم یہ لگایا جاتا ہے کہ ہم عرب و فارس و ترکستان وغیرہ سے لائے ہوئے تشبیہہ و استعاروں کے بڑے دلدادہ ہیں میں کوثر و تسنیم کے الفاظ سے ہاتھ دھوتا ہوں اور اپنے دوستوں کی خاطر یہ کہوں گا کہ شوکت صاحب کی زبان و بیان میں وہی لطف ہے جو لکھنؤ کی بالائی اور گلوریوں میں ہے!

شوکت صاحب نے لکھنؤ کی زبان میں پورب کے بعض خاص الفاظ اور لہجے بڑے لطف و لطافت سے سموئے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے فقرے شعر و ادب کا مزا دے جاتے ہیں۔ ان کے مضامین میں لکھنؤ کے تمدن اور وہاں کی روزانہ زندگی کے بعض بڑے مزے دار نمونے ملتے ہیں ایسے نمونے جو کسی اور تھانوی کو مشکل نصیب ہو سکتے ہیں، بے موقع نہ ہوگا اگر ان میں سے بعض بعض کا تذکرہ یہاں کر دیا جائے مثلاً:

۱۔ کانگریس کی صدارت لکھنؤ کے ایک نواب صاحب کر رہے ہیں۔ بہت کچھ تکلف و تعظیم کے بعد جناب صدر صاحب خطبۂ صدارت پڑھنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ شوکت صاحب فرماتے ہیں۔

"آپ نے سب سے پہلے ذرا اپنا بٹیر اپنے خدمتگار کو دیا!"

۲۔ ایک مقام پر تکیہ کا غلاف بنانے کا مسئلہ درپیش ہے۔ بھائی اور بھاوج میں حجت ہو رہی ہے شوکت صاحب فرماتے ہیں: "یہی غلاف باعث موازنہ انیس و دبیر بن جاتا"

۳۔ لکھنؤ اور لاہور کے موازنہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم کو طائرانہ نظر سے مقابلہ کرنے کے لیے پہلے عمارتوں پر منڈلانا چاہیے اس کے بعد شہر کی گلی کوچوں پر اڑنا چاہیے، پھر دونوں شہروں کے باشندوں کا ترکیب نحوی کرنا چاہیے اور آخر میں دونوں کی عام حالت لکھ کر یہ کہہ دینا چاہیے کہ یہ بھی جیتے اور وہ بھی جیتے، جیسے ان دونوں کے دن پھرے خدا سب کے پھیرے۔"

۴۔ ایک ڈاکٹر کی خستہ حال موٹر کا خاکہ کھینچا ہے: "وہ موٹر ضرور تھا اور اگر اس میں پٹرول ڈال دیا جاتا تھا تو چلتا بھی تھا، یہ اور بات ہے کہ آواز و رفتار کے اعتبار سے وہ کسی لاری اور چھکڑے کی سول میرج کی زندہ یادگار نظر آتا تھا۔"
انہیں ڈاکٹر صاحب اور مالک مکان کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کے مکان میں ڈاکٹر صاحب کرایہ ادا کر کے رہتے تھے۔ مالک مکان کے باب میں لکھتے ہیں "مکان دار نے کچھ نامناسب طریقہ پر دروازہ پر کچھ غیر طبی کلمات کہے۔"

۵۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی کے درمیان گفتگو ہوتی ہے۔ بیوی سمجھتی تھیں کہ ڈاکٹری میں بڑی آمدنی ہوتی ہے انہوں نے اپنے اس خیال کا ثبوت یہ دیا کہ ڈاکٹر آخر دن رات موٹر میں کہاں کہاں پھرا کرتے ہیں۔ شوکت صاحب (بزبان ڈاکٹر صاحب) جواب دیتے ہیں، "یہ لوگ فضول بھی اپنے موٹر کو ادھر ادھر دوڑاتے رہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ڈاکٹری چل رہی ہے حالانکہ محض موٹر چلتا ہے۔"

۶۔ ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب بہت زچ ہوئے ہیں۔ شوکت صاحب نے ان کا برزخ یوں پیش کیا ہے: "ڈاکٹر صاحب نے اپنے

چھو پھولوں کی زنجیر شگفتہ ہو کے کہا؟

یہ چند مثالیں میں نے جہاں تہاں سے اخذ کی ہیں ورنہ دیوانِ تبسم میں اس کے جگہ جگہ بے دلچسپ اور بقول بعض مشہور عالموں کے، بھرپور مصرعے کافی تعداد میں ملتے ہیں۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ ایک رات میں شوکت صاحب کی وہ تقریر سن رہا تھا جو لاہور سے ایک افیونی کے جنت کے تخیل پر کی تھی۔ ایک افیونی اپنے کسی مرحوم دوست سے جنت میں ملتا ہے اور جنت کے عجائبات و غرائب کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ جہاں تک ریڈیو کا تعلق ہے ان کی تقریر یقیناً کامیاب تھی اور غالباً یہ بیان یا مجبوری کا سے خود ایک ایسی چیز ہے جس کو مدِنظر رکھ کر اس تقریر پر کسی رنگ زنی بے سود اور بے محل دونوں ہے لیکن شوکت صاحب میرے چھوٹے ہیں۔ فنی حیثیت یا رتبے کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس اصول کے ماتحت جو مشرق میں خوردوں بزرگوں کے باہمی تعلقات پر حاوی ہوتا ہے۔ اس تقریر کے بارہ میں شوکت صاحب سے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صاحبِ فن اس بحث پر ایک دوسرے زاویے سے اظہارِ خیال کرتا۔ افیونی کو ممکن ہے بہشت میں گنگے، دودھ، شہد، سو ہی حلوا ہی نظر آتا ہو یا ملتا ہو لیکن افیونی اور افیونی کے وکیل کے نقطۂ نظر میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ جنت میں واقعات سے نہیں نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہیئے افیونی کی مرغوبِ خاطر نعمتیں اور چیز ہے اور افیونی کی شریعت دوسری چیز ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہے بصیرت افروز اور دلچسپ بھی لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے ورنہ اس

دردِ یک ساغر ہے جو دنیا و جو دین

پھر کیا کچھ نہیں جا سکتا

ہاں شوکت صاحب ایک بات اور سن لیجئے اور گو یہ کان میں کہنے کی ہے لیکن خیر کوئی حرج نہیں کیونکہ ہم دیوار ہم آواز ہماری یہ کائنات ظرافت کی تاریخ کا اولین اور سب سے اہم باب ہے ملائک کی تخلیق سے جب یہ ——— بھولی بھالی، فرسودہ اور بے مزہ ہونے لگی تو مشیتِ الٰہی نے اس میں طنز کا عنصر بھی شامل کر دیا اور اُن بزرگ کو عالمِ وجود میں لایا گیا جن کو ہمارے بزرگ شیطان کہتے ہیں۔ چنانچہ بقول امیر مینائی مرحوم جن کا پورا شعر مجھے یاد تو ہے لیکن ممکن ہے موزوں یاد نہ ہو اور میں نے بعض بڑی جان جوکھوں قسم کے استادوں کو بھی اسے ایسا ہی پڑھتے ہوئے سنا ہے جیسے کہ یہ شعر ناموزوں ہی موزوں ہو گیا تھا۔ پانی کی چند بوندیں جو کبھی انگور میں تھیں کھنچیں تو تلواریں گئیں اور ظرافت ستم ظریفی میں تبدیل ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہماری کائنات وہ چیز بن گئی ہے جس پر میں آسانی سے اظہارِ خیال کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے آپ اسی آسانی کے ساتھ اسے شائع نہ کر سکیں گے۔ اس لیے میں اس بحث کو یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں لیکن مجھے امید ہے اس کی بصیرتوں سے آپ کبھی نہ کبھی ضرور فیضیاب ہوں گے۔

اچھا شوکت صاحب خدا حافظ میری دعا ہے کہ آپ پر وہ مصیبت نازل نہ ہو جس نے اقتشا آپ سے بے پناہ کو بھی بدحواس کر دیا تھا۔ ہر روز ایک نیا لطیفہ دریافت کرنا ممکن ہے آپ کے نزدیک اتنا دشوار نہ ہو جتنا میں سمجھتا ہوں لیکن احتیاط شرط ہے۔ دنیائے تبسم میں سرپنچ کے ایڈیٹر کو کہاں جگہ ملے گی مجھے نہیں معلوم۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جیتے جی تو بھی اسی وادیٔ پرخار سے گزرے تھے ان کے دامن سے تو کانٹوں ہی کو گزند پہنچا۔ خدا کرے آپ کے دامن کو کانٹے گزند نہ پہنچائیں۔

(۵)

نیاز فتح پوری

دنیا مصائب و آلام کی جگہ ہے یا لطف و مسرت کی، اس کا فیصلہ آج تک نہ ہو سکا۔ جو لوگ حور و قصور، کوثر و سلسبیل کے قائل ہیں وہ دنیا کو دارالمحن کہہ کر آخرت کی امید پر ہر تکلیف جھیل رہے ہیں اور اس کے دور کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے کہ مبادا یہاں کا ذرا سا آرام وہاں کے لذائذ میں کمی کر دے۔ جو زندگی کو صرف اسی دنیا کی چیز سمجھتے ہیں وہ یہاں کے ہر ہر لمحہ کو "شاہد و شعر، مست و شراب و شکر" میں بسر کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اگر جنت کے وجود کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا۔

بہ فردوس روزن بدیوار کو   نظر بازی و ذوق دیدار کو

صبوحی خورم گشتہ از بے طہور   کجا زہرۂ صبح و جام بلور

ایک زاہد شب زندہ دار کہتا ہے کہ اگر واقعی مرنے کے بعد حیات بعد الممات اور حور و قصور کا وجود ثابت ہوا تو پھر دنیا میں گناہ کرنے والے کیا کریں گے۔ ایک رندِ شراب خوار بھی یہی کہتا ہے کہ اگر یہ سب کسی کا "وعدۂ فردا" نکلا تو پوچھیے تباہیٔ موادِ زندگی کس نے دی اور کون خسارہ میں رہا۔ بہرحال یہ جھگڑا نہ کبھی طے ہوا نہ آئندہ طے ہوگا۔ مرنے کے بعد خدا ہی کو معلوم ہے کہ کیا ہوگا اور کیا نہیں، اس لیے میرے نزدیک اس سے زیادہ حماقت کوئی نہیں کہ "شے حاصل" اور "امید موہوم" میں کوئی فرق نہ کیا جائے اور موجودہ زندگی کو صرف اس لیے رو رو کر گزار دیا جائے کہ کہیں اور جا کر ہنسنا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "خوش باش دمے" کیا چیز ہے؟ وہ لوگ جو اپنی تمام تمناؤں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جن کے یہاں کسی ارادہ کا پیدا ہو جانا اس کی تکمیل کا مترادف ہے، ان کے یہاں حقیقی لطف و مسرت کا وجود کبھی نہیں پایا جا سکتا، ان کے لیے تو پہلے ضرورت اس کی ہے کہ

خارم کن دور رہ گزر چارہ گرم ریز

اس لیے نشاط کا مفہوم حقیقتاً الم سے پیدا ہوتا ہے اور اس شخص کو ہم مسرت کا جستجو کرنے والا پائیں گے جس کو یہ چیز حاصل نہیں ہے یا ہاتھ سے کھو چکا ہے۔ غالباً یہی وہ فلسفہ ہے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ "وہ شخص جو تمہیں ہنساتا ہے بسا اوقات تم سے زیادہ مغموم ہوتا ہے۔" ہر چند یہ کلیہ نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن اس میں کلام نہیں کہ اگر کوئی شخص ایسا ہے

جس کا ہی مرے صاحب کے دیکھو تو [illegible] ان سے ملنا چاہئے [illegible] سے زیادہ
[illegible] نہیں ہوتی جیسا [illegible] جاتا ہے [illegible] بھی ہو جبر
[illegible] طول و شگفتگی ہوئی ہیں [illegible] کچھ [illegible]
[illegible] چشم [illegible] نہیں [illegible] وقت پر
[illegible] نہیں ہو جاتا لیکن [illegible] حالات لکھے ہیں [illegible] ہیں۔

جب مجھ سے جناب [illegible] صاحب [illegible] نے [illegible] خواہش کی [illegible] یہ خیال
[illegible] کہ آیا شوکت صاحب کی مزاح نگاری [illegible] ایسی ہے [illegible]
[illegible] بالکل [illegible] جاتے ہیں [illegible] لکھے
[illegible] حالات [illegible] حقیقت کو [illegible]
[illegible] جیسا کہ [illegible]
میری توجہ اس طرف منعطف ہوئی اور مصنف سے قبل مصنف کی [illegible] کے حالات میرے سامنے آئے
[illegible] تک ظاہری خد و خال [illegible] نہیں، کا تعلق ہے [illegible] ان کی تصویر [illegible] ہوتی ہے جو اس
مجموعہ کے ساتھ شامل ہے۔ لیکن [illegible] شوکت صاحب کو مختلف [illegible] میں نہیں دیکھ [illegible] سمجھ سکتے ہیں کہ جب
شوکت صاحب صرف تصویر کھنچوانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو ان کے چہرہ میں کسی [illegible] مصنوعی سنجیدگی پیدا ہو جاتی
ہے جو [illegible] "دربانی" [illegible] کہہ سکتے ہیں لیکن "دلکشی" سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔

شوکت صاحب ایک جوان شاعر، ادیب ہیں، نوجوان ہیں۔ اس سے نہیں کہتا کہ ان کی شادی بھی ہو چکی ہے اور وہ ایک بچہ کے باپ بھی ہیں نوجوانی کے مفہوم میں جو اجتماع پایا جاتا ہے وہ ان کے حالات پر منطبق نہیں ہوتا، اور بعض خصوصیات ایسی بھی ایک ہیں جن کے متعلق یہ فیصلہ دشوار ہے کہ آیا وہ مرد کے لیے زیادہ موزوں ہیں یا عورت کے لیے بہرحال فی الجملہ ان کی دلکشی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کیفیات صرف اسی وقت تک ظاہر ہوتی ہیں جب تک شوکت صاحب اپنے آپ کو نوجوان سمجھ کر کافی طور پر بنے رہتے ہیں، ورنہ اس کے بعد مختلف اوقات میں جو بے ساختہ کیفیات ان کے چہرے سے ظاہر ہوتی ہیں وہ البتہ ایسی حقیقتیں ہیں جن کا علم ان کے مجموعہ پر تنقید کرنے والے کے لیے ضروری ہے۔ افسوس کہ تفصیل سے کام لینے کے لیے اوراق مقدمہ بہت تنگ نظر آتے ہیں ورنہ شاید میں اپنی معلومات کو زیادہ بسط کے ساتھ بیان کرتا۔ تاہم اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ شوکت صاحب ہمیشہ وہ نہیں رہتے جو اپنے مضامین میں نظر آتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ "حقیقی شوکت صاحب" شاید وہی ہیں جب وہ خستہ و پریشان اپنے دفتر سے دوپہر کی گرمی میں گھبرائے ہوئے نسیم صاحب کی جستجو میں آتے ہیں اور یہ حضرت جو "با ما شراب خوردہ و زاہد نماز کردہ" کی بہترین تفسیر ہیں یا تو ...... صاحب کے حجرہ میں ہوتے ہیں یا انعامی بسکٹ فیکٹری کی دکان پر۔ اس وقت شوکت صاحب کے نتھنوں کی کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، مدعا یہ ہے کہ شوکت صاحب کو غصہ بھی آتا

ہے اور بہت کافی۔ وہ زود رنج بھی ہیں اور خطرناک حد تک۔ وہ افکار و آلام سے بھی مغلوب ہو جاتے ہیں اور پھر شدت کے ساتھ ۔۔۔ اس لیے میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ان کی مزاح نگاری محض ایک پستول کی شکل کی ہے اور اس سے انشراح زحم کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ بات میں بات نکلتی جا رہی ہے حالانکہ مقصد نہیں لیکن دراصل ذرا ترچھی جا رہی ہے مجھے اظہار رائے کرنا تھا اس مجموعے کے متعلق اور گفتگو شروع ہو گئی نفسیات مزاح نگاری پر۔ شوکت صاحب کی ذاتی خصوصیات پر بہر حال میں اس کو یہیں ختم کر کے بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس حد تک ایک مصنف کی خصوصیات کا اس کی تصنیف سے تعلق ہوتا ہے اس مجموعہ میں اس کی کافی جھلک پائی جاتی ہے مگر میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کے ہر مضمون میں وہ اپنے کردار اپنی فطری کیفیات کو تکمیل کے ساتھ نمایاں کر سکے ہیں۔

شوکت فطرت کی طرف سے اس قسم کی حس لے کر آئے ہیں جو ہر چیز کا شیریں حصہ حاصل کر کے تلخ حصہ کو دوسروں کے لیے چھوڑ دینا پسند کرتی ہے اور اس لیے قدرتاً ان میں ایک لطیف قسم کی بے اعتنائی یا بے رحمی پیدا ہو جانا چاہیے چنانچہ آپ اس مجموعہ میں بعض مضامین ایسے پائیں گے جس میں یہ پر لطف ایذا رسانی پوری طور پر نمایاں ہے۔

شوکت ایک فطری ادیب و شاعر کی طرح جزئیات کے مطالعہ کے بہت شائق ہیں اور ان کے اظہار پر بھی قدرت رکھتے ہیں، لیکن کھلنڈرے پن کے ساتھ اور یہی وہ چیز ہے جس نے انھیں "مزاح نگار" بنا دیا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو انھیں ملک کے دوسرے مزاح نگاروں سے جدا کرتی ہے۔ اس رنگ کے لکھنے والوں میں اس وقت، پطرس، رشید اور عظیم چغتائی بہت مشہور ہیں۔ لیکن جس طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے سے ممیز ہے اسی طرح شوکت ان سب سے علیحدہ ہیں، چغتائی صاحب کی مزاح نگاری اکثر و بیشتر منحصر ہوتی ہے پلاٹ یا واقعات پر یعنی وہ حالات ایسے پیش کرتے ہیں جو مشاہدے کے بعد یوں بھی ہر شخص کو ہنسا سکتے ہیں۔ رشید کی مزاح نگاری منحصر ہے اس امر پر کہ وہ الفاظ و فقروں کا استعمال ان کے عام متبادر معنی سے ہٹ کر کرتے ہیں، رشید صاحب کی مزاح نگاری دور اولین فلسفیانہ مزاح نگاری کا بہترین نمونہ تھا۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا دماغ زیادہ تھک گیا ہے۔ اور وہ غور و تامل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی اور کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں، تاہم کوئی نہ کوئی سنجیدہ نتیجہ ان کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا ہے۔ پطرس کی مزاح نگاری بڑی حد تک مغربی رنگ کی ہے جس میں واقعہ و انداز بیان دونوں سے مضحک کیفیات پیدا کی جاتی ہیں، لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ہمارے لیے یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اس میں واقعی کسی تلخ حقیقت (GRIM REALITY) کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایک مزاح نگار کا حقیقی کمال یہی ہے۔ شوکت کی مزاح نگاری بھی اس خصوصیت سے معرا ہے اور وہ بھی سطحی طور پر اپنے موضوع سے گزرنا چاہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان کے یہاں زبان کا لطف، مشاہدۂ جزئیات اور لطافت خیالی یہ سب اس قدر خوبی کے ساتھ ملے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی فضا خاص پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی مزاح نگاری ہوا کا وہ ہلکا جھونکا ہے جو پانی کی سطح پر ننھی ننھی موجوں کا جال بچھا کر قلب و نگاہ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور پھر سطح کو ساکن چھوڑ کر گزر جاتا ہے ان کے یہاں کبھی کوئی ایسی طوفانی ہوا نہیں پائی جاتی جو پانی کو تہ و بالا کر کے بھنور پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا مقصود ایک غم آلود شخص کو ہنسا دینا ہے لیکن وہ غم کو

[illegible] سے پڑھنا نہیں چاہتے۔ مگر خود وہ مصنف کے [illegible] جب ہوں۔ [illegible] نہیں [illegible] اس لیے تاثرات برداشت [illegible] حاصل کر سکتے۔ [illegible] نہیں کرتے [illegible] کیفیت ہی پیدا ہو جاتی ہے جو کسی حد تک [illegible] تعلق رکھتی ہے۔

میں نے شوکت صاحب کے اکثر مضامین پڑھے ہیں [illegible] اور [illegible] میں نے محسوس کیا [illegible] کا مستقبل شاید [illegible] کی طرف [illegible] میں پنہاں ہے۔ [illegible] کے خلاف کسی اور رنگ کی طرف مائل نہ ہو گئے [illegible] مطالعہ کر [illegible] بنا سکتے ہیں [illegible] کا کوئی مواد حاصل نہیں کر سکتے [illegible] کسی حقیقی واقعہ [illegible] اچھی طرح کر سکتے ہیں لیکن کسی [illegible] طرح تنقید پیدا نہیں کر سکتے [illegible] مثلاً ہم کوئی ناگوار [illegible] وہ اس کے [illegible] کرنے کی فکر میں [illegible] کو جاری نہیں رکھ سکتے [illegible] اس ناگواری کو بڑھا دینے والا ہے [illegible] آتے ہیں۔

چونکہ شوکت صاحب ابھی نوعمر اور جوان ہیں اس لیے زمانے کے ساتھ ساتھ [illegible] ان کے رنگ میں بہت کچھ [illegible] یقینی ہے [illegible] یہ پیشین گوئی تو کر نہیں سکتے کہ وہ کسی وقت اس مخصوص رنگ سے بالکل علیحدہ ہو کر کوئی جداگانہ [illegible] اختیار کریں گے اور اگر انھوں نے کبھی ایسا کیا تو [illegible] لیکن یہ ضروری ہے کہ یا تو ان کی موجودہ مزاح نگاری کا معیار [illegible] ہو جائے گا یا اعلیٰ۔ یہ سطح قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر انھوں نے ہر سال ایک مجموعہ شائع کرنے [illegible] کیا یا محض فرمائش پوری کرنے یا ہر رسالہ میں نظر آنے کی غرض سے لکھنا شروع کیا تو یقیناً وہ اپنے معیار سے نیچے آجائیں گے۔ لیکن اگر انھوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا کہ جس طرح بغیر کسی جذبہ محبت کے غزل گوئی کوئی معنی نہیں رکھتی اسی طرح مزاح نگاری بھی بے روح ہے اگر وہ واقعی کسی کیفیت ابتہاج کا نتیجہ نہیں تو ان کے موجودہ رنگ کا اور زیادہ نکھر جانا یقینی ہے۔ لیکن میں مشورہ ضرور یہ دوں گا اور وہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو جارحانہ پہلو سے احتراز کریں اور ضرورت سے زیادہ "ذاتی چیز" پیش نہ کریں۔ اس کے ساتھ یہ بھی عرض ہے کہ جب ان کی عمر چالیس سال سے زیادہ متجاوز ہو جائے تو وہ اس رنگ میں کبھی کبھی کچھ چھینٹیں خون کی بھی ملا دیا کریں تو زیادہ مناسب ہے جس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ اپنی نقاشی کے لیے جو بیک گراؤنڈ متعین کریں وہ "مشائم و حزین" ہو۔ اس سے جو وزن ان کی مزاح نگاری میں پیدا ہو جائے گا، وہ بہت کچھ ہمارے "سوشل مسائل" کی چیز بن جائے گا اور بڑی حد تک غیر فانی۔

مزاح و مذاق کا فلسفہ یہ ہے کہ جب اس سلسلے میں کسی خاص شخص کا ذکر کیا جائے تو سچی بات کوئی نہ کہی جائے۔ ورنہ اس کا کسی وقت سنجیدگی میں تبدیل ہو کر "بات کا بتنگڑ" بن جانا بعید نہیں۔ نسیم صاحب لاکھ ان کے بے تکلف دوست ہوں لیکن غالباً ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ ان کی "چہرہ نمائی" میں اس قدر صحت و سچائی سے کام لیتے اور خواہ مخواہ

دوسروں کو یہ رشک کرنے کا موقع دیتے ہیں کہ "شوکت صاحب نسیم صاحب کیوں اس قدر بے تکلف ہیں"۔ اسی طرح آگرہ کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے سالگرہ صاحب کے متعلق اظہار جذبات ہیں وہ زیادہ بہک گئے ہیں مگر اس رشک اور احساس لغزش" میں خود میرے جذبات کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ کہنے کا امکان ضرور ہے کہ

ایں نشۂ بمن ہست اگر با دگرے ہست

بعض بعض مضامین اس مجموعہ کے خصوصاً شوکت کے بہت بلند شاہکار ہیں جیسے کہ "بے کا سفر"... "بیکاری" "سودیشی عدالت" وغیرہ۔ ایک مضمون ان کا "منھو بھتے" ایسا ہے جس کو شوکت صاحب کے سوا اور کوئی مزاح نگار، یوپی بلکہ لکھنؤ سے، ہرگز نہیں لکھ سکتا۔

بہرحال ملک کو شوکت صاحب اور ان سے زیادہ نسیم صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ پے در پے دو مجموعے ایسے دلچسپ مضامین کے ان کی وجہ سے شائع ہو گئے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور مشورہ دوں گا کہ تیسرا مجموعہ اب دو سال سے پہلے شائع نہ کیا جائے ورنہ "جہاں پیلزم" پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

"نیاز"

---

(۶)

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

ذہین شخص جو کام کرتا ہے اُس میں ولطافت کے ساتھ [illegible] پن ہوتا ہے۔ شوکت [illegible] جیسے [illegible] بانکپن [illegible] صفات سے مالا مال ہے۔ اُن کی طبیعت [illegible] ہوتی [illegible] ہے [illegible] مضمون نکلتے [illegible] خیال [illegible] پیچیدگی ہوتی ہے۔ شوکت نے [illegible] مضامین کہے ہیں۔ [illegible] معیار لیا ہونا چاہیے [illegible] اس میں [illegible] پیدا ہوتی ہے۔ اُن کے تخیل [illegible] اسلوب ادا دونوں میں تازگی و ندرت پائی جاتی ہے۔ گفتگو [illegible]

شعر اگر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست

عشق کرنے سے پہلے۔ اُن کے نزدیک معشوق سے طالب دیدار ہونا بھی ہوس ہے اور ایسی ہوس کی وجہ یہ ہے کہ انسان محویتِ خیال کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے ؎

ہوس جس کو سکھا دے طالب دیدار ہو جانا
اُسے کیا آئے محوِ حسنِ یار ہو جانا

بزم شراب میں شور و شرابا، نیز رندان خرابات کی زاہدان ریائی سے نوک جھونک مشہور ہے مگر شوکت لکھتے ہیں ؎

خمارِ تشنہ لبی کو اثر دکھانا تھا
پہنچ کے ہاتھ میں ساغر کو ٹوٹ جانا تھا

یہ ایسی کیفیتیں ہیں جنھیں غیر شاعر یا متشاعر محسوس ہی نہیں کر سکتا نظم کرنا تو در کنار۔ وہ سطحی خیالات سے حتی الوسع اجتناب کرتے ہیں اور سامنے کی بات بھی اس طرح کہتے ہیں کہ گہرائی اور بانکپن پیدا ہو جائے ؎

وہ کس خطا پہ ہوئے دشمنی کو آمادہ
انھیں تو ہم نے کبھی دوست بھی نہ جانا تھا۔

دوسرے مصرع کے انوکھے انداز نے شوخیوں میں بجلیاں پیس کر ملا دی ہیں معشوق سے جلی کٹی ہو تو اس لطف سے ہو۔

اس شعر نے اُن کو مومن سے بہت قریب کر دیا ہے ؎

جان دے دیں گے ہم اے ہمتِ دشوار پسند

مرضِ عشق اگر قابلِ درماں نکلا

صریح سطالب کی گنجائش نہیں۔ اسی غزل کا یہ شعر بھی عجیب آن رکھتا ہے ؎

موت برحق ہے مگر کاش نہ آتی شبِ غم

یہ تو کہنے کو نہ ہو گا کہ اک ارماں نکلا

رفتہ رفتہ اس انداز بیان نے بداعت اختیار کر لی ہے ؎

درد کیا جانا وہ آخر تسلی سے مگر

زندگانی میں سکونِ موت شامل ہو گیا

غزل اسی کا نام ہے اور مجھے بے حد مسرت ہے کہ باوصف نوجوان ہونے کے شوکت نے وہ غلط راستہ اختیار نہیں کیا جس کو بعض حضرات "رقص الفاظ" اور "رندی و مستی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر اہلِ نظر محض اس کو ڈھکوسلا سمجھتے ہیں۔ موسیقی اور شعر بے شک ہیں سو کسی آج کل کے بہترین خوش گلو اور خوش گو نہ پڑھ جائیے گا، شاعروں کو مات کر سکتے ہیں۔ بیان و شاعر پہلے ہیں سو مزہ پیدا کرنے کی چیز صفت اضافی ہے۔ اُن کے شعر کی بنیاد کوئی خیال ہوتا ہے جس کے اظہار کو الفاظ لاتے ہیں نہ کہ الفاظ اور ردیف و قافیہ کی مدد سے کسی مبہم اور نامعلوم خیال کی تشکیل ہوتی۔ اسے طبلہ کی تھاپ پر جو بجا گیا، اگر پورا اترا تو شعر ہے۔ تخیل کی ناداری، جذبات کی بے مائگی کچھ تو مستعار یا مسروقہ ترکیبوں میں کچھ لفظی بازی میں دب گئی۔ مشاعرہ میں واہ واہ ہو گئی، یہی اُن کی شاعری کا مآل اور یہی جانی ماحصل ہے۔ مسیلمۂ کذاب کی طرح اُن کے متبعین بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ پروپیگنڈا مہمل اشعار کو الہام کا درجہ دے دیتا ہے یا فلسفہ و تصوف کے سر تھوپتا ہے۔ زبان سے اُن کی بلا واقف ہو اگر کسی نے اس بنا پر گرفت کی تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شعر میں اصل شے تخیل ہے۔ الفاظ چنداں اہمیت نہیں رکھتے بس اتنا ہو کہ خیال کی ایک جھلک نظر آ جائے۔ جو کچھ بھی ہے الفاظ کا رقص و موسیقی اور ترکیبوں کی خوبصورتی ہے۔ ممکن ہے کہ مجذوب کی طرح شاعر غیر ارادی طور پر غیب کی باتیں نظم کر گیا ہو۔ غرضکہ اس فرقہ کے نزدیک جو شعر جس قدر مہمل ہے اُسی قدر عمدہ ہے کیونکہ قیاس آرائی کی پوری آزادی ہے۔ شعر میں جو معنی چاہے پہنا دے۔ اگر کسی نے اعتراض کیا کہ الفاظ تو اس مفہوم کے متحمل نہیں تو ارشاد ہوا کہ اگر شعر کا یہی مطلب نہ ہوتا تو میرا ذہن اُدھر منتقل کیوں ہوتا! چلیے جھگڑا چکا! ـــ

ایک گروہ مغرب زدہ ذہنیت والوں کا ایسا ہے جو غزل کو ایک سرے سے ناقابلِ التفات سمجھتا ہے اور "نظمیات" کا دلدادہ ہے جن میں جو چاہے بکتے چلے جاؤ کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ملے گا۔ اور اگر کوئی شامت کا مارا الجھ پڑا تو اس کو یہ جواب دے دیا گیا کہ حضرت مسلسل نظموں میں ایسی جزئیات سے بحث اصولاً غلط ہے اس کی "تعمیری" خوبیوں اور "تخلیقی" رعنائیوں پر غور کیجیے اور داد دیجیے، الغرض ہرزہ سرائی و بے راہ روی کا ہنگامہ برپا ہے۔ لیکن

برتنے کی تمیز اٹھ گئی ہے۔ زبان سے مبتذل داخل ہو رہی جاتی ہے۔ ناقدوں کا طول کلام [illegible] ہے۔ بعض حضرات جدید عصر کا الزام لگا کر سر سے بلا ٹال دی ہے۔ غزل کی قدامت پرستی [illegible] یہ نہیں جانتے کہ [illegible] کی بہترین مستوری نے [illegible] وہیں یہی صنف موزوں ہے۔ علاوہ بریں زبان کو وسعت دینے والے، اس کے [illegible] والے وہی شعر ہوتے ہیں جو زبانوں پر چڑھ کر ضرب الامثال کا درجہ حاصل کر لیں۔ [illegible] میں بھی ہے اور اگر [illegible] ہے۔ چنانچہ سر اقبال نے بہت کچھ لکھا اور خوب لکھا۔ مگر [illegible] شہرت کا سنگِ بنیاد ایک غزل کا مطلع ہے۔ اگر کسی سے فرمائش کی جائے [illegible] کا کوئی شعر سنائیے تو مطلع پڑھے گا ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

غزل کا ایک ایک شعر بشرطیکہ دل سے نکلا ہوا ہو ایک طویل نظم پر بھاری ہوتا ہے۔ پوری نظم کا جو [illegible] غزل کے [illegible] ہوتا ہے۔ شوکت کا یہ مطلع ؎

سچ ہے آپ کو مجھ سے کیا اور میرے افسانے سے کیا
رو دیا لو [illegible] کام [illegible] سے کیا

[illegible] کا حاصل کیا ہے۔ شاید ہی کوئی شخص ہو جس کی زندگی کے کسی نہ کسی تجربے سے اس شعر کے مضمون کا تعلق نہ ہو۔ جو اس کی سرگزشت کی ترجمانی نہ کرتا ہو۔

ہوشمندوں کی ایک اور جماعت غزل کو اس وجہ سے مردود قرار دیتی ہے کہ اس میں خیالی باتیں ہوتی ہیں کوئی ایسا پیغام نہیں ہوتا جو ان کے مردہ دلوں اور مضمحل بلکہ معطل قوتوں میں عمل کی روح پھونک دے۔ [illegible] ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا ؎

اگر [illegible] اشعار سے [illegible]
کام کرتا ہے جنہیں کام کیا کرتے ہیں
مکتبِ شعر میں یاد [illegible] لیا کرتے ہیں

غالباً ایسے ہی لوگ شوکت کے ذہن میں تھے جس وقت انھوں نے یہ شعر کہا ؎

جس طرح گزری ہے اب تک اب بھی گزرے گی یونہی
ہم نہیں بدلے تو دنیا کے بدل جانے سے کیا!

غزل میں کیا کچھ نہیں ہوتا اور کیا کچھ نہیں ہو سکتا مگر مزدوروں اور سرمایہ داروں کو لڑا کر پیٹ ڈالنے والوں کے لیے نہیں، نہ جاہلوں اور نااہلوں کے لیے، بلکہ اہلِ ذوق اور اہلِ نظر کے لیے۔ ایسی غزل کی تمثیلی شاعری میں جسے بے درد گل و بلبل کی شاعری کہہ کے ہنسی اڑاتے ہیں، ایک سچا شاعر سیاسی و اقتصادی گتھیاں سلجھا دیتا ہے اور طبائع کو غور و فکر اور حقیقی نفع و ضرر سمجھنے پر آمادہ کرتا ہے، سنیئے ؎

یہ سچ ہے ایک حالت پر کبھی دنیا نہیں رہتی
قفس کر آج ہیں سرچشمہ دنیا ہوں گلستاں پر

مسلمانوں کی تاریخ عروج و زوال پڑھ جائیے اس شعر کی شرح ثابت ہوگی۔

مادہ پرست یورپ کی تہذیب انسان کے سیدھے جسمانی عیش و راحت کے حریص اور روح کی تربیت سے غافل ہو کے وجود کے منکر اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ مغربی ممالک کی معاشی اقتصادی و تباہ کاری شورش پسندی و پریشاں حالی سے ہم ورس عبرت نہیں لیتے اور نہیں سمجھتے کہ روحانیت کو چھوڑ کر مادیت کی طرف بڑھنا بہیمیت و درندگی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ صحیح مفہوم آزادی سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ ہمارا ہاں بیٹا ہاں میں سونے کی ہوس یا تو ہے کی شوکت ساری دنیا کو بیدار کرتے ہیں اور متنبہ کرتے ہیں۔ یہیں وعظ و خطابت سے الگ ہو کر شعر پڑھ رول لبھانے والے مضمون ہیں کہ

محبت ہو گئی ہے چور دیوار قفس سے
اسیر آب وگل عاشق ہوئے ہیں اپنے زنداں پر

مادیت سے روحانیت کی طرف رجحان کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ شوکت کی یہ پیشین گوئی مستقبل قریب میں پوری ہو کر رہے۔۔۔

ان سجدہ ریزیوں کا وہ دور آ رہا ہے
جب سنگ در ترے کی سجدے کرے گی جبیں پر

خیر یہ تو طنز الگ نہ رہا جانے، آپ اب محض روحانی انبساط حاصل کریں، ادب کا اصل منشا اور صحیح مفاد یہی ہے۔

زمانے کے نشیب و فراز طے کرنے کے بعد انسان کو امید ہوتی ہے کہ اب اطمینان نصیب ہوگا مگر تقدیر ہنستی ہے اور کہتی ہے کہ اپنی سرنوشت کی تکمیل کی مشیت ایزدی کو نہ سمجھے ہو نہ سمجھو گے۔ اگر شعور ہے تو آرام کی خواہش کے بدلے اور محنت و جانکاہی کے صلے کا متوقع ہونے کے بجائے راضی برضا ہو اور سرتسلیم جھکا دو، اپنی سعی و جد و جہد پہ نازاں ہو کر اصل مقصد کو نہ بھول جاؤ ؎

میری قسمت کے پیچ و خم نکلے   میرے دامن میں نشیب و فراز

خالص تغزل بے پناہ شعریت اور اثر انگیزی میں یہ شعر آپ اپنی نظیر ہے ؎

تاثیر ہی بیاں میں نہ ہو جب تو کیا کروں
کیا اپنا حال ان کو سناتا نہیں ہوں میں

صرف انداز بیان کی لطافت نے اس شعر میں کیا کیا مزہ بھرا ہے اور کس قدر معنوی اضافہ کیا ہے ؎

توبہ کرونگا واعظ، لیکن ذرا میں سن لوں
کچھ مجھ سے کہہ رہی ہیں امڈی ہوئی گھٹائیں

واقعات حسن و عشق کی مصوری کس دلکش پیرایہ میں ہوئی ہے ؎

[illegible]

[illegible]

[illegible] خدا کی پناہ —

[illegible]

[illegible]

[illegible] —

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] —

[illegible]

[illegible]

شعر کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔

شوکت کا مجموعۂ غزلیات، جس کے نام کا بھی مجھے علم نہیں، غزل [illegible] گنجینہ ہے۔

ہر صفحہ پر [illegible]

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست"

دعا ہے کہ اہلِ نظر میں شرفِ قبول پائے اور ان کی محنت ٹھکانے لگے۔ آمین۔

شیش محل

(۵)

مولانا عبدالماجد دریابادی

مزاح نگاری و ظرافت دوسروں کے لیے بطرس، ملا رموزی، رشید صدیقی تک کے لیے ایک مشغلۂ تفریح رہی ہے۔ شوکت نے اسے اپنا مستقل فن بنا لیا ہے اور قدرتاً ان کی نگاہ ایک فن کارانہ نگاہ ہوگئی ہے۔ ان کا قلم ایک فن کار کا قلم ہے۔

یہ شیش محل ان کے مصورانہ تصویر کشی کا مرقع ہے۔ اپنے ملنے والوں میں سے ۱۲ کے چہرے حروفِ تہجی کی ترتیب سے مصور نے اس قلمی آئینہ میں دکھا دیئے ہیں۔ سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے ادب ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ افراطِ نازک خیالی سے بعض صرف کتب فروشی کو بھی اس تعلق کے لیے کافی سمجھ لیا گیا ہے۔

یہ قلمی نگار خانہ، یوں کہیے کہ ایک عجائب خانہ ہے، بعض ان میں مشاہیر ہیں اتنے مشہور کہ ان کا تعارف بھی ان کی توہین۔ بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف و تعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، بعض ایسے ہیں جو سب کچھ ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں۔ ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی، ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں۔ غرض ریاض خیرآبادی، ڈاکٹر عبدالحق، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی سے لے کر فقر موہانی، امید امیٹھوی اور صدیق بک ڈپو تک، ہر ردیف، ہر قافیہ، ہر وزن، ہر بحر کے نمونے اس دیوان میں شامل، کہیں تو خالی مصرعِ طرح پڑھ کر چپ ہوگیا ہے اور کہیں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ چھیڑ دیا ہے۔ نگار خانہ ظریف کا ہے، مزاح و شوخی ہر چیز پر مقدم ہے لیکن حقیقت و صداقت عموماً دوش بدوش۔ "عموماً" کا لفظ خیال میں رہے۔ ظرافت کی گلکاریاں، شوخ نگاری کی رنگ آمیزیاں، مورخ کے کیمرے اور فوٹوگرافی کی قائم مقام نہیں ہو سکتیں۔ چہرے یقیناً دلچسپ و دلکش سجے ہیں اور یہی فن کار کا کمال ہے۔ البتہ کوئی چہرہ اترا ہوا، کوئی ذرا لٹکا ہوا، کسی پر رعنائی و زیبائی کا نقاب پڑا ہوا۔ کسی پر روغنِ حسن افزا کا غازہ پھرا ہوا، کسی کی پیشانی پر شکن، کسی کے چشم و ابرو پر غضب کا بانکپن۔

ظریف نے ہنسنے ہنسانے کا سامان قدم قدم پر کیا ہے، لیکن کہیں کہیں اندازہ کرنے میں خود بھی دھوکا کھا گیا ہے۔ نازک خیال اور پھر لکھنؤ و جوارِ لکھنؤ کے نازک خیال، نازک مزاج بھی کچھ کم ہوتے ہیں۔

حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم

خوب کیا شوکت صاحب نے دیباچہ ہی میں سے معافی مانگ لی ورنہ محتسب [illegible] ہی [illegible] ہوتا

[illegible] یک اور

بات [illegible] کے [illegible] ہیں

[illegible] شاعروں حقیقت [illegible] اسد اللہ خاں غالب میں [illegible]

حاصل کئے ہوئے ہیں

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

[illegible] رنگ [illegible] بقین ہے [illegible]

لکھا ہے ــــ [illegible] اس کے بعد کچھ بھی [illegible] رہ جاتا ہے :

یہ چیز محض تفریح اور دل لگی کی نہیں [illegible] اس سے بڑے بڑے [illegible] خوشہ چینی کر سکے [illegible]

[illegible] مغرب و مشرق کے بڑے بڑے [illegible] ہیں [illegible]

ساحر [illegible] کے [illegible] سے بھی کے گئے ہیں۔

کی اور [illegible] کی اس کتاب میں [illegible] ہے ــــ [illegible]

کے [illegible] بقلم خود [illegible] ظرافت کی [illegible]:

شخصیت نگار شوکت

(۸)

وقار عظیم

شوکت تھانوی دنیا سے رخصت ہو گئے اور دوستوں کی محفلیں سونی ہو گئیں۔ شوکت کی اکیلی ذات ایک انجمن تھی، اور جب یہ چلتی پھرتی انجمن احباب کی محفلوں میں پہنچ جاتی تو ایک محفل میں کئی محفلوں کی چہل پہل شروع ہو جاتی تھی۔ بات بات پر فقرے اور لطیفے، ہر فقرے اور لطیفے میں ذہانت، شگفتگی، تازگی اور بھرپور زندگی، اور ان فقروں سے پیدا ہونے والی تبسم اور قہقہے کی پیہم اٹھتی ہوئی اور گرد و پیش پر چھا جانے والی لہریں — یہ سب کچھ شوکت کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنے قلم کی شگفتگی و تازگی سے فقروں اور لطیفوں کی بے شمار ایسی محفلیں آباد کی ہیں کہ آدمی ان میں داخل ہو جائے تو نکلنے کو جی نہ چاہے۔ یہ محفلیں اُن کے ناولوں میں ہیں، مضامین میں ہیں اور اُن خاکوں میں ہیں جنھیں یکجا کر کے شوکت نے شخصیتوں کا آئینہ خانہ یا شیش محل تعمیر کیا ہے اور جنھیں اپنے 'بے قاعدہ قاعدے' کی زینت بنایا ہے۔

انسان کو معاشرتی حیوان کہا گیا ہے اور اس کے اس وصف کو اس کا ایسا امتیاز قرار دیا گیا ہے جس کی بدولت اس کی جملہ خارجی اور داخلی صلاحیتیں ابھرتی، پرورش پاتی اور ارتقا کے مرحلوں سے گزر کر بامِ عروج تک پہنچتی ہیں۔ لیکن ہم میں سے اکثر کا یہ حال ہے کہ 'معاشرتی حیوان' ہونا ہم پر ایک بڑی تہمت ہے۔ ہم معاشرتی ہیں لیکن معاشرتی ہونے کا حق ہم میں سے بہت کم ادا کرتے ہیں۔ یہ حق زندگی میں جس جس طرح ادا کیا جاتا ہے، اُس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی لوگوں میں مل کر بیٹھے تو اس کا شریکِ محفل ہونا سب کو بھلا معلوم ہو، لوگ اس بات کی آرزو کریں کہ یہ 'معاشرتی حیوان' اکثر ان کی بزموں میں آتا اور بزموں میں زندگی کا رنگ اور زندگی کا نور بھرتا رہے۔ شوکت تھانوی اسی قسم کے برگزیدہ 'معاشرتی حیوانوں' کی صف میں آتے ہیں۔ انھوں نے زندگی زندگی کی طرح بسر کی اور دوسروں کو یہ سبق دے گئے کہ ہزار الجھنوں میں پھنس کر بھی آدمی ہنستے ہنساتے رہنے کو اپنی عادت اور معمول بنا سکتا ہے۔ شوکت کی زندگی میں اور شوکت کے ادب میں ہمارے لیے یہی بہت بڑا سبق ہے۔

شوکت کی زندگی کے مختلف رُخ ہیں لیکن زندگی کے ہر رُخ میں اُن کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو یہی ہے کہ انھوں نے زندگی خوش دلی اور خوش مزاجی کے ساتھ بسر کی۔ خود ہنسے، دوسروں کو ہنسایا اور اس طرح زندگی بسر کرنے میں ان کی نظر ہمیشہ ایسی چیزوں پر پڑی جن کے مشاہدے اور بیان، دونوں میں لطفِ حیات کا سامان موجود ہے۔ گھریلو ماحول سے الگ ہٹ کر شوکت کی زندگی کے اُس پہلو پر نظر ڈالیے جسے میں نے زندگی کا معاشرتی رُخ کہا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شوکت کو ابتدائے شباب ہی سے ایسے مشاغل اپنانے اور اختیار

سے پہلے چھپ چکی تھیں تقریباً نصف صدی ایک ہندوستانی [illegible] کے ساتھ [illegible] ۔ [illegible] ان کی شخصیت سے [illegible] ۔ [illegible] ان کی زندگی میں [illegible] اور کتابوں میں چھپ کر [illegible] ۔ [illegible] قریباً [illegible] ۔ [illegible] مرقعے ہیں جن میں شوکت [illegible] ۔ [illegible] حیثیت [illegible] شوکت کی [illegible]

کے حصار میں لے لیتے ہیں۔ ان خاکوں [illegible] اچھوتے [illegible] شوکت [illegible]

[illegible] کو پیدا کیا ہے [illegible] ۔

ان خاکوں کی [illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ہے جو شخصیت کے نقش [illegible] ۔ [illegible] خوبی سے [illegible] شخصیت [illegible] کے راستے میں حائل ہوتی ہے [illegible] ۔ [illegible] ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ شخصیت نگاری کے [illegible] ۔ [illegible] حقیقت یہ ہے کہ [illegible] شوکت تھانوی کی اپنی شخصیت اور مزاج کا اثر [illegible] ہے [illegible] طرح طرح سے پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ بنا دی ہے۔

شوکت بہ حیثیت انسان [illegible] ایک خوش مزاج اور خوش فکر انسان تھے اور بہ حیثیت ادیب شگفتگی اور مزاح ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ شگفتگی کبھی واقعات کے بیان کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی شخص کے اوصاف کے ذکر میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ کبھی بے ساختہ کوئی دل کی گلی کو کھلا دینے والا فقرہ بن کر زبان پر آتی ہے۔ اور کبھی ایسے لطیفے کا روپ دھارتی ہے کہ محفل قہقہوں سے گونج اٹھتی ہے۔

شوکت نے ان شخصی خاکوں میں کس طرح بہ یک وقت شخصیت کی تصویر کا حق ادا کیا ہے اور منصب بھی ادا کیا ہے، اور پڑھنے والوں کے لیے اسلوب خاص کا سرمایہ بھی مہیا کیا ہے۔ اس کے لیے "قیصر باغ" اور "قاعدہ بے قاعدہ" کے چند خاکوں کی تھوڑی سی مثالیں ملاحظہ فرمائیے :۔

اقبال کا مصرعہ "کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں"

ایک زمانے میں زبان زد خلائق تھا۔ لکھنؤ میں ایک مشاعرے میں یہی مصرعہ طرح کے لیے دیا گیا۔ اس مشاعرے میں شوکت بھی شریک ہوئے اور غزل پڑھی۔ اس کا ذکر آرزو لکھنوی کے خاکے میں اس طرح کیا ہے "چھوٹی چھوٹی بحروں میں مصرعوں کے وزن کا سنبھالنا دوبھر تھا۔ یہ تو اچھی خاصی تندرست قسم کی بحر تھی۔"

ایک زمانے میں لکھنؤ سے "ترچھی نظر" نام کا ایک رسالہ نکلتا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"کیا تاریخی اسم مبارک تھا"

اصغر خاں کے حلیے میں ڈاڑھی کے دو معنی نکلتے ہیں، وہ ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کر دیتا ہے:

"ڈاڑھی اور پیٹ اور منہ میں پان، آپ نظیر"

—

"تجارت بحت، شعر فرماتے ہیں اور شعر ترنم سے پڑھتے ہیں۔"

شفقت لکھنوی کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"کیا مجال کہ انگرکھے کے بند اور چوڑی دار پاجامے کی چوڑیوں میں ذرا بھی شکن پیدا ہو جائے۔"

حفیظ حسین کا نسخۂ ادب کے سنسار میں جو مرتبہ ہے اس کے پیش نظر اپنی اور ان کی بے تکلفی کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

"لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ میاں اور میرا ادب تھوڑی دیر کے لیے درمیان سے اٹھ جاتا تھا۔"

ایک دعوت میں مولانا احسن مارہروی کو صافہ باندھے دیکھا تو ان پر یوں پھبتی کہی،

"خدا کی قسم مولانا شبلی کے استفسار معلوم ہوتے ہیں آپ"

رفیع احمد خاں کے ہاں ان دوستوں کی محفل کی آبادی اور ویرانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"پکے گانے گائے جا رہے ہیں، کچے شعر پڑھے جا رہے ہیں"

کوئی سنجیدہ بزرگ آئے تو ان سے بھی مسائل پر تبادلۂ خیال ہونے لگا، مگر:

"ان کے جاتے ہی پھر منہ سے پھول اور چہرے سے ٹھیکرے برسنے لگے۔"

شوکت نے ان خاکوں میں لفظوں کی مدد سے جو جادو جگایا ہے اس کی یہ تھوڑی سی مثالیں ہیں۔ ان مثالوں میں الفاظ کو کسی ایسے سیاق میں استعمال کر کے جہاں وہ عام طور پر استعمال نہیں ہوتا، کہیں انھیں آس پاس کے لفظوں کی مناسبت سے ایک نئے معنی اور نیا مفہوم دے کر، کہیں لفظ کے ایک مفہوم سے زیادہ دوسرے پر زور دے کر یا اس کے دو مفہوموں میں سے دوسرے مفہوم میں برت کر، کہیں لفظ کو پھبتی بنا کر، کہیں اضداد کو نگینوں کی طرح جملوں میں سجا کر، اور کہیں محاورے سے سیدھے سادے لفظ کا کام لے کر شوکت نے لطیف مزاح بھی پیدا کیا ہے اور موقع اور محل کے مطابق کوئی مؤثر بات بھی کہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظوں کے استعمال کی یہ مثالیں الفاظ پر ان کی قدرت اور اس قدرت سے بے ساختہ مزاح پیدا کرنے کی صلاحیت کی بڑی سیدھی سادی مثالیں ہیں۔ ان کی مزاح نگاری کے زیادہ شگفتہ، زیادہ بلیغ اور زیادہ مؤثر نمونے اس وقت سامنے آتے ہیں، جب شوکت کی ذہانت ان کی رنگینیٔ تخیل اور تازگیٔ فکر کو ابھارتی اور ان کے میل جول سے لفظوں کا طلسم خانہ آباد کرتی ہے۔ لفظوں کے اس میل ملاپ کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک ہی جملہ اتنی بڑی بات کہہ جاتا ہے کہ پوری شخصیت کا پھیلاؤ اس میں سما جاتا ہے۔ اس طرح کے چند جملے سن لیجئے:

"طبعاً نیشنلسٹ اور وضع قطع میں پیرس کا ڈھلا ہوا اکھڈر واقع ہوئے ہیں۔" (یہ ہیں ساغر نظامی)

—

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"سرتیج بہادر سپرو سے ملاقات ہونے کی دو چار ہی صورتیں ممکن ہیں۔ مثلاً آدمی وسنے ہو یا ماگا ندھی یا شاعر یا کم سے کم جرائم پیشہ۔"

"حضرت بہزاد لکھنوی کے کلام کو ہندوستان میں صرف دو ہستیوں نے چمکایا ہے۔ اختری بائی فیض آبادی نے گاکر اور شاہد احمد صاحب نے چھاپ کر۔" (شاہد احمد۔ شیش محل)

"سر میں دماغ اور پاؤں میں سینچر۔ دماغ بھی چل رہا ہے اور خود بھی چل رہے ہیں۔ نہ وہ تھکتا ہے، نہ یہ تھکتے ہیں۔" (حکیم خواجہ شمس الدین۔ شیش محل)

"جوش صاحب کا پٹھان ہونا شاعر ہونے سے بھی زیادہ یقینی ہے، چنانچہ ان کے کلام میں بھی تندرستی، مردانگی، جنگ جوئی، خونخوارت اور غیظ و غضب نظر آتا ہے جس کو لوگ انقلاب پسندی کہتے ہیں اور یہی جوش کی شاعری کی روح ہے۔"

"کلام سن کر غصہ آتا اور صورت دیکھ کر شفقت کو دل چاہتا ہے۔ کلام نہایت ورزنی اور خود نہایت ہلکے پھلکے۔ سناتے اس طرح ہیں گویا پھونک رہے ہیں۔ کلام کے زور میں اکثر خود اڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آواز نرم ہے، گلے میں نرمی ہے مگر جوش میں آکر جیسے نعرے ہوتے ہیں اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خلافت فنڈ سے اپیل کرتے کرتے بالشتیوں کے مولانا شوکت علی کو غصہ آگیا ہے۔"

(روش صدیقی ۔ شیش محل)

"ظریف صاحب کے کلام میں لطیفے اور تازیانے کچھ اس طرح جمے نظر آتے ہیں کہ آدمی ہنس ہنس کر تازیانے کھاتا اور تازیانے کھا کھا کر ہنستا ہے۔" (ظریف لکھنوی ۔ شیش محل)

اب خالص ظریفانہ انداز کے تبصرے ملاحظہ کیجئے:۔

"اگر یہ کلام سمجھ میں آجائے تو دماغ کا علاج کراؤ اور اگر نہ سمجھ سکو تو اس دماغ کی قدر کرو۔ یہ ضرور کسی دن تمہارے کام آئے گا۔" (میراجی ۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"یہ پٹھان شاعر خدا سے بھی اکڑتا ہے۔" (جوش ملیح آبادی ۔ قاعدہ بے قاعدہ)

اُن کا اسلوب اُن کی سگی بہن حاجرہ مسرور کے اسلوب کا سگا بھائی معلوم ہوتا ہے اور بس!"

(خدیجہ مستور ۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"بچو! ان ..... کا کلام اگر پڑھنا ہے تو ان کی غزلیں ڈھونڈو۔ نئی شاعری میں یہ پتا نہ چلے گا کہ تم کو شکل سے ملے گا، اور ان کا کلام بھی سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔" (ن۔م۔ راشد ۔ قاعدہ بے قاعدہ)

ادیبوں کے فن پر یہ ماہرانہ تبصرے اُس وقت اور بھی مؤثر معلوم ہوتے ہیں، جب اس کا مقصد ادبی مرتبے کے یقین کے بجائے شاعر یا ادیب کی شخصیت کا تعارف ہو۔ یہ تعارف عموماً واقعات کے بیان کی صورت اختیار کرتا ہے اور واقعات کا بیان اپنی تصویری خصوصیات کی بنا پر کسی شاعر یا ادیب کی زندگی کے ایک یا کئی پہلوؤں کو اس طرح اُجاگر کر دیتا ہے کہ اس کی شخصیت کا نقش ہمارے دل میں گہری اور دائمی جگہ بنا لیتا ہے۔ چند چھوٹے چھوٹے تعارفی جملے سن لیجئے:۔

"موٹے تازے لمبے تڑنگے آدمی ہیں۔ داڑھی قد سے کچھ ہی چھوٹی ہوگی۔" (خلیل احمد ۔ شیش محل)

"اقبال بہت ہی قسمت والے ہیں۔ [illegible] (صلاۃ [illegible])

شوکت تھانوی کے مزاح کی یہ خاص بات ہے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] :

"شاعر دوں کی نہ بچے کی فکر [illegible]" ([illegible])

"شاعری میں جوش کا اور [illegible] کی زندگی میں بیوی کا اضطراب نمایاں ہے۔" (جوش ملیح آبادی۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"روش ان کا تخلص نہ کہیے۔ یہ تو ان کے نام کی [illegible] ہے۔" ([illegible]۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"وہ خطوط جو مقدمہ چلوانے کے لیے افسانہ لکھتے ہیں۔" ([illegible]۔ قاعدہ بے قاعدہ)

"جب مزاحیہ کلام سناتے ہیں تو لوگ عبرت پکڑتے ہیں۔ حالانکہ خود ان کو [illegible]"

"اور آزادی ملنے کے بعد سے اگر غزل نہ بھی کہہ سکیں تو قومی ترانے کہتے رہتے ہیں۔" (ن۔م۔ راشد۔ قاعدہ بے قاعدہ)

یہ مختصر جملے کبھی کبھی بڑے چٹپٹے ہیں، معصومانہ رنگ میں ادیبوں اور شاعروں کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت پر تبصرہ فرماتے ہیں اور سننے والا سوچتا رہ جاتا ہے کہ ایک مزاح نگار کے چلتے ہوئے فقروں میں بھی کتنی معنویت اور گہرائی ہو سکتی ہے۔ ان معصومانہ اور بے تکلفانہ فقروں کو حقیقت کی گہرائی اور فکر کی سنجیدگی اور اس گہرائی اور سنجیدگی کے پردے میں چھپی ہوئی لطافت اور شگفتگی نے ہمیشہ زندہ رہنے والی تنقید کا ہم مرتبہ بنایا ہے۔ اس طرح کے چند جملے دیکھیے جن کی تنقیدی بصیرت ہر نقاد کے لیے قابلِ رشک ہونی چاہیے۔

اصغر گونڈوی کے متعلق لکھتے ہیں :-

"جس شعر کے اعمال خداوندِ کریم کے نزدیک صالح ہوتے ہیں، اُس کو اصغر سے کہلوا دیتا ہے۔ مقام نشاطِ روح اسی قسم کے خوش اعمال اشعار کی جنت ہے۔"

"دونوں کو چھڑی ہاتھ میں ہے اور پیروں میں اس طرح مزے سے پہنا ہے ہاں تو۔ چھڑی کو بالکل بچہ کر فرما رہے ہیں" (جلیل حسن اداس۔ شیش محل)

"جب سے کبھی نہیں سنا۔ شعر کے مصرعہ ثانی کا قافیہ اور ردیف نہیں سُنا۔ شعر کے آخر تک پہنچتے پہنچتے آواز تو چبا کر دوہرا کرنے لگتے تھے۔ لوگ ہنستے تھے اور اس میں شعر کی خوبی بھی گم ہو جاتی تھی۔"

(صفدر مرزا پوری۔ شیش محل)

"صرف زبان سے ... شعر پڑھتے ہیں۔ نہ ہونے کا ہوش ہوتا ہے نہ داد کی رسید دینے کا۔ خود ہی حسن شعر کو تاڑ جاتے ہیں بجائے اس کے دو دفعہ پڑھ جاتے ہیں اور جس شعر کو بھی چاہتا ہے ایک ہی مرتبہ پڑھ کر رہ جاتے ہیں۔" (مجذوب۔ شیش محل)

"آج کل جب سے تندرستی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ جسامت بڑھ رہی ہے اور خوراک گھٹتی جاتی ہے۔ ورزش کی ہمت نہیں۔ لہٰذا بے زبان گدھے کو نمش اٹھی کھا کر خود ورزش سیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ ورزش کرتے رہے تو سر چڑھی اور کامیاب ہو گئے تو مہاتما گاندھی بن کر رہیں گے۔" (ملک حبیب احمد۔ شیش محل)

"انگریزی لباس کبھی نہیں پہنا مگر ہندوستانی لباس میں بھی تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں۔" (نند نرائن ملا۔ شیش محل)

"شعر خواہ کسی بحر کا ہو پڑھتے مثنوی کے انداز سے ہیں جو سمجھ میں آجاتی ہے۔ الفاظ سمجھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی گفتگو سمجھ لیتا ہے تو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر شفقت میں ڈوبے ہوئے الفاظ فرما رہے ہیں۔ ورنہ عام طور پر گفتگو صرف یہ سمجھ میں آتی ہے کہ گویا کوئی بُق بُق بُق کر کے کسی حوض میں ڈوب رہا ہے۔" (اُمید امیٹھوی۔ شیش محل)

"پڑھنے کا انداز عدم تشدد کے منافی ہے، آواز بلند ہے مگر اس کو بھی انتہائی بلندی پر پہنچانے کی کوشش فرماتے ہیں۔ بیٹھ کر پڑھ رہے ہوں تو ہر وقت کھڑے ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسپرنگ پر تشریف فرما ہیں۔ پڑھتے ترنم سے ہیں، مگر کچھ الفاظ دانتوں میں اور کچھ ناک میں آکر اپنی ساخت بدل دیتے ہیں۔ مثلاً آپ کا مصرع ہے ؎

موت اک کے الٹ دیتی ہے نقاب ہستی

اس کو آپ پڑھیں گے ؎

مونت اک کے وولٹ دیں گی نقابنیں ہستی (بسمل الہ آبادی۔ شیش محل)

[illegible] (قاعدہ بے قاعدہ)

[illegible]
[illegible] (قاعدہ بے قاعدہ)

ابھی میں نے کہا تھا کہ شوکت تھانوی [illegible] [illegible]

احسان دانش کے متعلق لکھتے ہیں :-

" جب میں [illegible] "

اکبر حیدری کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

" سیماب صاحب اور اکبر حیدری صاحب میں [illegible] ۔ حضرت [illegible] دونوں خاموش تماشائی تھے اس لیے کہ کھانا [illegible] "

تاج صاحب کے متعلق لکھا ہے :-

" امتیاز علی ان کا نام ہے اور تاج تخلص مگر شعر نہیں کہتے تاکہ تخلص حرج نہ ہو جائے اور تخلص اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ دنیا کا کیا بھروسا، جانے کب شعر کہنا پڑ جائیں " (قاعدہ بے قاعدہ)

پطرس کے متعلق لکھا ہے :-

" یہ اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں مگر مزاح نگاری نہیں کرتے تاکہ لوگ ترسیں اور اردو زبان خدانخواستہ ترقی نہ کر جائے کہ وہ انگریزی زبان بھی منہ دیکھتی رہ جائے جس کے وہ ملنے جلنے والے [illegible] "

(قاعدہ بے قاعدہ)

کرشن چندر سالہا سال سے واجبی سے آدمی ہیں کہ وہ :-

" لکھتے زیادہ ہیں اور رش کم کرتے ہیں "

ن ۔ م ۔ راشد پہلے بہت اچھی غزلیں کہتے تھے :-

"مگر جب اُن کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اور شاعر بھی اچھی غزلیں نہ لکھنے لگیں تو باقی شاعروں کو بہکانے کے سبب کچھ آزاد نظمیں بھی کہہ ڈالیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب آزاد نظمیں کہنے لگے۔" (قاعدہ سبب تا ہوا)

شوکت تھانوی کے لکھے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے یہ خاکے شوکت تھانوی کے اسلوبِ مزاح کی چند خصوصیتوں کے حامل ہونے کی وجہ سے پڑھنے والے کی تفریح اور انبساط کے بے شمار سامان مہیا کرتے ہیں۔ تفریح اور انبساط کا سرمایہ ایک طرف تو سیدھی سادی با محاورہ سلیس اور صاف و شستہ نثر کی وجہ سے مہیا ہوتا ہے، دوسرے الفاظ کی اس بازی گری سے جس میں شوکت کو مدرجے کی مہارت حاصل ہے اور جس کی مثالیں اُن کے خاکوں کے متن سے نمونے بھی پیش کئے گئے۔ لیکن زبان و بیان کے لطف کے علاوہ ان خاکوں کی ایک تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی اہمیت بھی ہے۔ ان خاکوں سے بہ حیثیت مجموعی ہمارے معاشرے کے ایک خاص دور کا تہذیبی کردار ابھرتا ہے، اور ادیبوں اور شاعروں کے متعلق ہم جو کچھ پڑھتے ہیں اُس میں ایسی بہت سی اخلاقی اور معاشرتی قدروں کا رچاؤ نظر آتا ہے، جو رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے۔ شاعروں کے لطائف و ظرائف کے یہ مرقعے حقیقت میں ان شاعروں کے تہذیبی طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے دلکش مرقعے ہیں، جن کی تکمیل ایک طرف تو ان تمام ادیبوں اور شاعروں کے ذکر سے ہوئی ہے جو ان خاکوں کا موضوع ہیں اور دوسری طرف ان کے مصنف کے رنگِ طبیعت سے جس نے ان کرداروں کے تہذیبی مزاج کو اپنے مزاج میں جذب کرکے یہ زندہ رہنے والی تصویریں بنائی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان تصویروں میں سے بعض ادھوری، ورنا مکمل ہیں اور بعض رنگ اور نقش یا بہت ہلکے ہیں یا بہت تیز اور شوخ، اور رنگوں کا یہ فرق مصنف کے ذاتی مراسم کے رنگ کا پیدا کیا ہوا ہے۔

میرے نزدیک ان خاکوں کی ایک اہم خصوصیت اُن کا وہ خلوص اور دیانت داری ہے جس کی بنا پر انھیں ترتیب دیا گیا ہے، اس لیے ان میں کہیں کہیں تقصیب اور ہجو کا جو رنگ پیدا ہو گیا ہے اُس سے قطع نظر ان کے مطالعے سے ادیبوں اور شاعروں کی عظمت کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور ان کی بعض کمزوریوں کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اچھائیوں اور برائیوں کا یہ امتزاج انھیں مافوق الفطرت ہونے سے بچا لیتا ہے ——— وہ شاعر اور ادیب ہوتے ہوئے بھی انسان ہیں، جو اشرف المخلوقات ہو کر بھی خطا و نسیان کا مرکب اور مجموعہ ہے۔



منتخب مضامین



اپنے مضامین اپنی نظر میں

شوکت تھانوی

اپنے مضامین کو اپنے مختلف حیثیتوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ مثلاً ذہنی، فنی، [illegible] معاشی اور [illegible] مضامین [illegible]
تمہید یہ ہے کہ جب تک میں خود ان پر روشنی نہ ڈالوں ان کی حیثیت [illegible] ہے کثرت [illegible] ہے [illegible] دیتے وہ ظاہر
ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ میں اپنی اصطلاحات کا مفہوم خود بیان کروں۔

ذہانتی مضامین سے میری مراد ان مضامین سے ہے جو کسی عنوان سے [illegible] کسی مضمون سے [illegible] موضوع بھی دے دیا جائے اور بعض
اوقات مضمون کا نہایت تفصیلی خاکہ دے کر لکھوانے جاتے ہیں۔ [illegible] یہ مضمون [illegible] اس طرح [illegible] لکھ دیجئے۔ مگر مضمون تو لکھا
ہوا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہوتی ہے کہ اس صاف گوئی کو اس طرح قبول کر کے اس مضمون کو [illegible] دوں۔ [illegible] خود کشی کیا
نہ کروں۔ اب مثلاً میں نے ایک مضمون لکھا سودیشی ریل جو کسی رسالہ میں چھپ گیا [illegible] نظر [illegible] کسی [illegible] کے ایڈیٹر صاحب
کی۔ اب یا تو ان کا نہایت تفصیلی خط آئے گا یا اگر ملاقات نصیب ہوا تو وہ خود نہایت تفصیلی طور پر تشریف لے آئیں گے کہ صاحب ایسا مضمون
آپ پھر کبھی لکھ دیں۔ مثلاً دیکھئے نا کتنا اچھا موضوع ہے سودیشی ڈاکخانہ۔ اس مضمون کو اگر آپ اس طرح لکھیں کہ مثلاً آپ کوئی پارسل لے کر
ڈاکخانے گئے ہیں اور وہاں پارسل کلرک آپ سے کہہ رہا ہے کہ وزن تو اس کا اتنا ہے مگر لیجئے تو رعایت کر دیں اور جب آپ اس پارسل کے پیسے
ادا کرنے [illegible] ہیں تو [illegible] کلرک [illegible] تول کرتا ہے اور پھر بالکل تمام آپ کو بارہ آنے کا ٹکٹ مل جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بڑی گنجائش ہے اس
موضوع میں عرض کیا ان سے کہ "بندہ نواز آخر آپ خود ہی کیوں نہیں لکھ لیتے" اپنے نزدیک وہ اس کو بھی لطیفہ سمجھ کر کھل کھلا کر خوب ہنسے پھر
جب اس لطیفے سے لطف اندوز ہو چکے تو بڑی کسر نفسی سے فرمایا کہ میں لکھ سکتا تو آپ سے کیوں عرض کرتا۔

اب ان کو بتانا پڑا کہ وہ لکھ چکے ہیں ان کو سمجھاتے ہوئے عرض کیا۔

"دیکھئے نا جو کچھ آپ نے تجویز کی صورت میں اس مضمون کا خاکہ بنایا ہے۔ وہی دراصل مضمون ہے۔ بس اسی کو آپ لکھ دیجئے۔ میں
اس لیے قاصر ہوں کہ میں اب آخر اس میں کیا لکھوں گا۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی اور یہاں مصیبت یہ کہ گھر اپنا اخلاق کے حدود سے
بھی نہ گذر سکتے تھے۔ مگر جب عاجز ہی آ گئے تو کہنا پڑا حضور والا آپ تو مضمون کا موضوع اس طرح لے کر آ گئے ہیں۔ جیسے کسی درزی کے
یہاں کوئی شخص اپنا کپڑا اور اپنی جسامت لے کر پہنچ جاتا ہے کہ یہ کپڑا اس جسم کے لیے سی دو۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ پہلے گھر تشریف
لے جائیے اور اطمینان سے بیٹھ کر درزی اور انشا پرداز میں جو لطیف سا فرق ہے۔ اس کو محسوس کرنے کی کوشش کیجئے۔

اس فرمائشی مضمون سے بظاہر یوں نجات مل گئی مگر دوسرے دن معلوم ہوا، اس نے فہمائشی صورت اختیار کر لی ہے یعنی یہی حضرت ایک ایسے بزرگ محترم کے ذریعے کر پہنچ گئے جن کے اختیار میں اور کچھ نہ سہی تو یہ تو تھا ہی کہ اگر ناراض ہو جائیں تو والد صاحب کو لکھ بھیجیں کہ آپ کے صاحبزادے سخت نالائق ہیں اور ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ میں اپنی لڑکی کی قسمت ان سے جوڑ دوں حالانکہ بزرگ سے پیار سے خود کہا گیا تھا اور بڑی شفقت برس رہی تھی۔ اس خط کے بعد وہ فرشتے اور بہر کرشمہ۔ مگر اس محبت اور اس شفقت کا نتیجہ ہوتا کہ انجام بھی تو نظر کے سامنے تھا کہ اب انکار کر کے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ہوتا کیا! ہوا یہی کہ ان حضرات کے لکھائے ہوئے مضمون پر گویا اپنا نام لکھ دیا اور اب قدم قدم پر یہ جواب دہی کرتے پھر رہے ہیں کہ یہ آخر کیا، مجبوری تھی کہ سودیشی ریل سے جلد یہ حماقت کر بیٹھے، ظاہر ہے کہ ہر ایک کو تو نہیں سمجھایا جا سکتا کہ یہ حماقت کن راستوں سے گذر کر اپنے پاس آئی تھی۔ اور وہ اب سب سمجھے کہ اس کو لکھنا ہی تھا۔

اس قسم کے فہمائشی مضامین اکثر لکھنا پڑتے ہیں۔ اس لیے کہ عزت آبرو بڑی چیز ہے۔ ورنہ لکھنے کی صورت میں یہ چیز خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ تعلقات کے انقطاع کی دھمکی دی جاتی ہے۔ دوستی کے دشمنی میں تبدیل ہو جانے کا خطرہ سامنے لا کر پیش کیا جاتا ہے کہ اپنا نام اگر نہ چھپوانا ہے تو ٹوپی اچھلوانے کی اجازت دیجیے۔ مگر اس فہمائشی سلسلہ کی سب سے خطرناک مثال حال ہی میں ایک دوست نے پیدا کی ہے کہ پہلے تو وہ نہایت شرافت اور انسانیت کے ساتھ فرمائشی خطوط لکھتے رہے مگر جب کامیاب نہ ہوئے تو ایک فہمائشی خط اس مضمون کا لکھ بھیجا کہ حضرت اگر آپ نے اب بھی مضمون نہ بھیجا تو میں ایک ایسا مضمون لکھ کر آپ کے نام سے چھاپ دوں گا جس میں وہ تمام کمزوریاں ہوں گی جن کے آپ متحمل نہ ہو سکیں گے۔ کوشش کروں گا کہ املا کی بھی غلطیاں ہوں، انشا کی بھی ہوں، مذاق اور بدمذاقی کا امتیاز اٹھ جائے اور جس کو آپ مزاح لطیف کہتے ہیں وہ پھکڑ بن کر آپ کے نام سے اس طرح مرتب ہو جائے کہ آپ کو مزاح نگار سمجھنے والے پھکڑ نگار تسلیم کرکے فاتحہ پڑھ دیں۔ ظاہر ہے کہ اس فہمائش کے بعد کچھ نہ لکھنا خواہ مخواہ اپنے کو خطرے میں ڈالنا تھا لہٰذا لکھا ان کے لیے اور جو کچھ لکھا اس کو آج کل فہمائشی مضامین کے ذیل میں لکھے ہوئے ہیں۔

نمائشی مضامین سے مراد ان مضامین سے ہے جو رسائل اور اخبارات کے نمائشی نمبروں کے لیے لکھنا پڑتے ہیں۔ یہ مضامین بنیادی طور پر فرمائشی اور ردِ عمل طور پر معاشی ہوتے ہیں۔ یعنی ان کی فرمائش بھی کی جاتی ہے اور اگر وہ رسالہ یا اخبار کا خاص نمبر نکلنے کے سلسلہ میں جانبر ہو جائے تو کچھ نہ کچھ معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔ جب کہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ ہمارے رسائل اور اخبارات عام نمبر نکالنے سے گھبراتے ہیں اور خاص نمبر نکالنے کے بہانے ڈھونڈا کرتے ہیں۔ پہلے یہ جریدے اپنے سالانہ نمبر نکالا کرتے تھے۔ یا ایسا ہی کوئی اولوالعزم رسالہ ہوا، تو اس نے اپنا سالگرہ نمبر نکالنے کے علاوہ ایک نصف سالگرہ نمبر بھی نکال دیا۔ مگر اب عام نمبر خاص خاص موقعوں پر نکلتے ہیں۔ خاص نمبر تو نکلتے ہی رہتے ہیں۔ مثلاً اقبال نمبر، آزادی نمبر، قائدِ اعظم نمبر، عید نمبر، بقر عید نمبر، میلاد نمبر، اردو نمبر اور خدا جانے کون کون نمبر۔ ان نمبروں کے لیے اگر آدمی لکھنے بیٹھے تو زندگی کی مہلتیں اس کو نہایت مختصر محسوس ہوں، مگر پھر بھی لکھنا ہی پڑتا ہے۔ سب اخباروں اور سب رسالوں کے لیے تو خیر ناممکن ہے لکھنا مگر چند کے لیے تو لکھنا ہی پڑتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اخبارات اور رسائل کی تعداد حدود و شمار سے باہر ہے۔ اور یہ سب بے شمار اخبار اور رسالے بے شمار خاص نمبر نکالتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ تین عزیز قریب ایک قسم کے رسالے یعنی اقبال نمبر نکال رہے تھے، اس لیے تینوں کے لیے مضامین لکھنا ازبس ضروری تھا۔ ایسا ضروری کہ زندگی اور موت کی قسم کا سوال آ پڑا تھا یعنی لکھیں تو خود مریں اور نہ لکھیں تو یقین یہ دلایا گیا تھا کہ لکھوانے والے خودکشی کر لیں گے لہٰذا

[illegible]

[illegible]

[illegible] یہ لکھتے ہیں کہ ـــ

کیا خوب سودا نقد ہے [illegible] اگر ان مضامین [illegible] تو یہ آپ کی [illegible] ہوگی۔ جو مضامین اس معاملت پر لکھے جائیں کہ جتنا گڑ ڈالیے اتنا ہی میٹھا ہوگا۔ ان مضامین کو ادبی معیار پر جانچا [illegible] تو دیکھیے آپ کو کیا معلوم کہ ان مضامین کے لکھتے وقت [illegible] ضرورت کی [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] مضمون [illegible] سو [illegible] کہ جب اس کا [illegible] تو ایک [illegible] قسم کا سگریٹ کیس اور اس پر [illegible] اپنا [illegible] کا رعب [illegible] کے سامنے سگریٹ نکال کر پیش کریں۔ تو وہ بھی مرعوب ہو جائے۔ اس قسم کی چیزیں آدمی کو خواہ مخواہ جاری [illegible] ہیں۔ سگریٹ [illegible] ایک ہی ہو مگر سگریٹ کیس اگر شاندار ہے تو رعب پڑے بغیر نہیں رہتا۔ قلم چل رہا ہے اور دماغ میں ایک دوسرا خیال ہے [illegible] کہ سگریٹ کیس زیادہ ضروری ہے یا گھڑی۔ دوسرے سے وقت پوچھنا بڑی شرم کی بات ہے۔ [illegible] اوقات خود اپنے پاس ہونا چاہیئے۔ زیور کا زیور [illegible] وقت ایک خود بھی کام کی چیز ہے۔ قلم چل رہا ہے اور دماغ میں ایک تیسرا خیال آیا کہ اس مضمون کا معاوضہ ملتے ہی سب سے پہلے دھوبی کا حساب چکانا چاہیئے ورنہ یہ ساری سفید پوشی کسی دن دھری رہ جائے گی۔ راستے بھر [illegible] وہ نہایت بے ادبی کے ساتھ تقاضے بھی کرنے لگتا ہے کسی دن پکڑ ہی نہ مارے۔ انہی خیالات میں مضمون مکمل ہو جاتا ہے اور معاوضہ مل جاتا ہے۔ مگر قیامت یہ ہے کہ ان مضامین کو بھی لوگ تنقیدی نظر سے پڑھتے ہیں۔ اب ان کو کیسے سمجھایا جائے کہ صاحب! اس قسم کی تنقید آخر آپ ترکاریوں پر کیوں نہیں کرتے جو بازار میں بکنے کے لیے ڈھیر ہوتی ہے۔ اس قسم کی تنقید آخر آپ کسی کباڑیے کے نیلامی فرنیچر پر کیوں نہیں کرتے۔ آخر یہ بھی تو بکاؤ مال ہے۔

فرمائشی، فہمائشی، نمائشی اور معاشی کے علاوہ مضامین کی ایک اور بھی قسم ہے یعنی آزمائشی! اس قسم کا میں نے اس لیے ذکر نہیں کیا ہے کہ ان مضامین سے میں ہمیشہ بچا رہا ہوں اور اب تک خدا نے مجھ کو مضامین کی اس قسم سے بچایا ہے۔ یہ وہ مقابلے کے مضامین ہوتے ہیں جن کے اعلان کبھی سرکاری طور پر اور کبھی نجی طور پر اخبارات میں چھپتے ہیں کہ اس موضوع پر بہترین مضمون لکھنے والے کو پہلا انعام اتنا اور دوسرا

اتنا اور تیسرا اتنا دیا جائے گا۔ اور یہ کچھ نہیں لکھا جاتا کہ چوتھے نمبر پر آنے والے کو اور اس سے بھی بدتر پوزیشن حاصل کرنے والوں کو کیا کیا سزائیں دی جائیں گی۔ بس اعلان یہ ہوتا ہے کہ مضمون آٹھ صفحات کا ہو خواہ وہ چاول پر قل ھو اللہ لکھنے والے ہوں یا آپ سائن بورڈ کے خطاط وہ آٹھ صفحے بھر دیں۔ فیصلہ کرنے والوں کی ٹیم کا اعلان ہوتا ہے اور آخری تاریخ کا بھی۔

پھر دوسری احتیاطیں یہ کہ کاغذ کے صرف ایک طرف لکھئے۔ بائیں ہاتھ میں قلم پکڑ کر نہ لکھئے اور اگر آپ کا بایاں ہاتھ دایاں ہو تو دائیں ہاتھ سے جو آپ کا بایاں ہو گا قطعی پرہیز کریں۔ میں اس جھگڑے میں قطعی نہیں پڑا اور یہ بھی اتفاق ہے کہ انعام کی بڑی سے بڑی رقم بھی مجھ کو اس طرف متوجہ نہ کر سکی۔ اس لیے کہ میرا ہاتھ دیکھ کر فراست الہند کا ایک ماہر بہت پہلے ہی بتا چکا ہے کہ تم کو کسی لاٹری، کسی معمہ اور اس قسم کے کسی مقابلے کا انعام کبھی نہ ملے گا۔ رہ گئی اب ایک آخری قسم یعنی پیدائشی مضامین کی۔ یہ مضامین وہ ہیں جن کے متعلق مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

یہ مضامین وہ ہیں جن میں خود اپنے لیے لکھتا ہوں اور آپ سے زیادہ خود ہی خوش ہوتا ہوں، خود لکھتا ہوں اور خود ہی اپنے کو سناتا ہوں خود ہی اپنے کو داد دیتا ہوں اور خود ہی کسر نفسی سے اس داد کو وصول کرتا ہوں۔ کہ میں کس قابل ہوں۔ مگر اس قسم کے مضامین بہت کم ہوتے ہیں۔ لوگ میرے مضمون "سودیشی ریل" کو لے اڑے اور میں محض اس خیال سے چپ ہو رہا کہ خبیث نہ کہلانے لگوں۔ اب اپنا مضمون شاہین بچے مجھ کو سودیشی ریل سے کہیں زیادہ پسند ہے اس لیے کہ اقبال نے تو لکھ کر مجھ کو وہ مسرت اور اطمینان حاصل نہیں ہوا جو خوشی شاہین بچے لکھ کر حاصل ہوئی۔ اسی طرح بے شمار ایسے مضامین ہیں جن کو دوسرے پسند کرتے ہیں، مگر میں ان کو اتنا پسند نہیں کرتا۔

اب اگر مجھ کو فکر روزگار اور فکر معاش دونوں سے آزاد کر کے خود اپنے مضامین پر نظر ڈالنے کا موقع دیا جائے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت ہی کم سخت جان مضامین ایسے نکلیں گے جن کو میں باقی چھوڑ دوں۔ باقی سب ردی کی ٹوکری میں نظر آئیں گے۔ لہٰذا خیریت اسی میں ہے کہ مجھ کو اس طرف متوجہ نہ کیجئے اور میرے مضامین کو میری نظر بد سے بچائیے۔

سودیشی ریل

دن بھر کے تھکے ماندے بھی تھے اور رات کو سفر بھی درپیش تھا مگر جیسے ہی ہم نے نعروں پر کان کھڑے کر لیے تو ہمیشہ کی عادت ہے اور ان نعروں کو سن کر بیٹھے رہنا چاہتے ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے جلسہ کسی مظاہرے کی کاروائی یا جلوس ہے جس پر کوئی مجبوری ہو مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے اور اپنی طرف بڑی کشش کھینچ کر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ حقہ کا نیچہ اور مزاحیان ایک دکان پر رکھ کر کہہ دینے کو کہ بھاگ ابھی آتے ہیں اور سیدھے میدان میں گھس گئے جہاں ایک صاحب جو صورت سے بڈھے معلوم ہوتے تھے یعنی سر پر گاڑھے کی گاندھی کیپ داڑھی مونچھ سے صاف البتہ ایک لمبا سا کھدر کا کرتا ٹانگوں میں بھی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے ہوئے تھے، ایک ہاتھ کو اپنی پشت پر رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بید کو حرکت دیتا ہے۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا اس لیے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے کبھی مغرب کی طرف اور کبھی کبھی ایک دم سے پیچھے کو مڑ جاتے تھے۔ بہرحال فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف تھے یا سامنے اس لیے مشکل تھا کہ ان کو خود قرار نہیں تھا۔ وہ تخت پر کھڑے ہوئے وہ گھوم رہے تھے مجمع کے وسط میں تھا اور تمام مجمع کا رخ تخت کی طرف، کبھی کسی کی طرف نہ کبھی کسی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا اور اسی طرح ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف کبھی دور کی آواز کی طرح اور کبھی بالکل ہی نہیں ہمارے کانوں میں آ رہے تھے۔ ہاں ایک بات یہ تھی کہ ہماری طرف کے لوگ غل مچانے میں اتر دکھن اور پچھم کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے اس لیے ہم تقریر سننے کے معاملہ میں ذرا گھاٹے میں تھے۔ پھر بھی جو کچھ سنا وہ بہت کافی تھا اس لیے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں کبھی اردو میں، کبھی نثر میں، کبھی نظم میں، کبھی ہنس کر، کبھی چیخ کر، کبھی ادھر مڑ کر، کبھی ادھر گھوم کر وہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم سن رہے تھے :-

بھائیو! اب وہ وقت نہیں ہے کہ ریزولیوشن پاس ہوں اور رہ جائیں ......
تجاویز منظور ہوں اور شرمندۂ عمل نہ ہوں ...... سرگرمیاں ...... اب بیدار
ہو جاؤ ...... ہوشیار رہو ...... کہ تم کو ...... ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے
بعد اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے ...... اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے

. . دوسری طرف گھوم گئے) خواب غفلت سے بیداری کا وقت . . ہے

ہے . . . . اور وہاں تم . . . . برٹش گورنمنٹ . . . . سوراج سو رہی

مرغ . لمڈر . . . (پھر پڑ کے لیٹ کر سو گئے)

دو گھنٹے میں ہم نے صرف یہی سنا اور سمجھا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا۔ غالباً اس سے زیادہ انھوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی ہو تو ہم کیا کریں۔ ہمارے سب ہی بہت خاک ۳۱ دسمبر کو سوراج ملے گا۔ ہم کو خیال ہوا کہ مجمع کو دھکیلتے خود دھکے کھاتے کسی طرح باہر نکل آئے۔ وہاں پر ست حقہ کا کش لیا مگر جان ایسے پر ہو رہی تھی کہ بھاگے گئے اسباب باندھا کھانا کھایا۔ حقہ پیا آرام کرسی پر بیٹھ کر شوق فرمانے لگے گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے اس لیے اطمینان بھی نصیب تھا مگر اضطراب طبیعت والی نہیں اتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے گا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

فکر کا خیال اور ۳۱ دسمبر کے بعد سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کے لیے ۳۱ دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے۔ اگر آج ۳۱ دسمبر ہوتی تو ہم اپنی ریل پر سفر کرتے نہ مدنی گارڈ نہ انگریز ملازم نہ بنگلو بندی کا سیدھا روپیہ ہوتا۔ ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے جہاں جی چاہتا بیٹھتے جی چاہے فرسٹ میں ہم سے کوئی کچھ کہنے والا نہ ہوتا۔ ہم خود فرسٹ میں بیٹھے اور انگریزوں کو تھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوئے سفر کرتے ہم یہ سوچ رہے تھے کہ یکایک سے کان میں پھریری "بندے ماترم" کی آواز آئی اور ہم ایسے کچھ ہوگئے کہ فوراً باہر نکلے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک لمبا جلوس جھنڈیوں، جھنڈیوں اور تختیوں سے سجا ہوا "بندے ماترم" کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی یہ کیا ہے؟ جواب ملا کہ کیا سو رہے تھے خبر نہیں کہ سوراج مل گیا؟ ہم نے بڑا سا منہ کھول کر کہا: "سوراج؟" جواب ملا "ہاں سوراج"۔ "سوراج!" ہم نے اپنے دل میں کہا کہ واہ بھئی واہ! دعا تو قبول ہوئی۔ اور سوراج مل گیا ان لوگوں کو ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی۔ پھر سوچا کہ ہم اور یہ لوگ کچھ غیر تھوڑی ہیں۔ ان کو ملا یا ہم کو ایک ہی بات ہے۔ شکر و اللہ کا ل ہوا کہ سوراج مل گیا۔ دل کو کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سوراج مل گیا ہوگا حالانکہ ابھی تک جلوس نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جب جلوس کی طرف نظر پڑ جاتی تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا اور جب سوراج ملنے پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے۔ لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج ملنے کی خوشخبری سنائی تو شک دور ہوا اور ایک آزادانہ و خود مختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا۔ ابھی ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹہ نے ٹن ٹن کر کے دس بجا دیے یعنی ہم کو فوراً اسٹیشن چلے جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لیے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہنچ کر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"بابو جی! کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجیے۔"

بابو صاحب نے اس سے ٹکٹ لے لیے تو بڑا گھر [illegible] بڑے اطمینان سے [illegible]۔

"ٹھیک بات کہ دی اصل [illegible]"

"تم کہاں کی مذاق کرتے ہو اور یہ جس بات سے [illegible] روپیے [illegible]"

"جناب سے کہہ دو پیسے [illegible] روپیہ اور ٹکٹ لے لیجئے"

اب [illegible] بنا دو [illegible] روپیہ لو۔

"جناب [illegible] دو [illegible] ہوتے ٹکٹ ۔ روپیہ [illegible] ۔ اگر آپ [illegible] ہے تو آپ لے [illegible] روپے [illegible] کا پہلا ٹکٹ چاہئے تو [illegible] کا پہلا سیکنڈ کلاس:

بابو جی [illegible] زور [illegible]

صاحب والا! یہ جو [illegible] سمجھا ہے کہ آپ لوگ اپنا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہئے مگر [illegible] روپے سے کوئی [illegible] کم نہ ہوگا ۔ جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجئے۔

ٹکٹ ۔ کیا بابو صاحب ! جی پہلے تک تو ایک روپیہ [illegible] آج یہ ہو گیا ۔ ایک روپیہ [illegible]۔

بابو :۔ کل کی بات کل کے ساتھ گئی [illegible] ہے ہم کو [illegible] گیا ہے ۔

ٹکٹ ۔ پہلے کہہ رہا تھا کہ [illegible] ۔ جب پیر ٹکٹ ملتے ہیں [illegible] چھوٹ [illegible]۔

بابو ۔ صاحب روپیہ ۔ اچھا آپ کی بات [illegible] ۔ [illegible] روپیہ دے دیجئے اور ٹکٹ لے لیجئے ۔

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آ رہا تھا ۔ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے ۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی ۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا ۔ آخرکار ہم نے طے کر لیا کہ بے ٹکٹ ہی سفر کریں گے اور یہ سوچ کر ہم بکنگ آفس سے چلنے لگے ۔ ہم کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی ۔

"سنئے تو جناب ! ٹھہریئے تو جناب : دیکھئے تو جناب : اچھا دو روپے دے دیجئے ۔ آپ بھی ایک روپیہ مروت میں ۲۰ دے دیجئے گا ؛ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے ۔ لیجئے ڈیڑھ روپیہ ۔ اب اس سے زیادہ کم نہیں کر سکتے ۔ ہمارا نقصان ہو رہا ہے

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ہم نے ایک فیصلہ [illegible] کر کے دو ہی سے کہہ دیا ۔" ایک روپیہ دیں گے ۔ ایک روپیہ کو دینا ہو تو دے دو "

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے مگر واللہ کہاں کیا انہوں نے گرگٹ [illegible] کر کے ذرا بھی آنا کانی نہ کی لگے ۔

"لیجئے صاحب لائیے ۔ بوہنی کا وقت ہے ۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنی ہے "

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا لیکن وہ ٹکٹ ریل کا معلوم نہیں ہوتا تھا ۔ نہ اس پر تاریخ پڑی ہوئی تھی اور نہ اس پر کچھ چھپا ہوا تھا ۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر " دربہ دوم کا نمبر" لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی جو غالباً ان کے دستخط تھے ۔ ہم نے ٹکٹ کو ادھر سے دیکھا ادھر سے دیکھا اور دو تین مرتبہ غور سے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے ۔ بابو صاحب بھی غالباً قیافہ شناس تھے ۔ ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسم ہو کر کہنے لگے "جناب والا ! رات کو سوز چھپ گئی ہے"

ابھی نے ٹکٹ نہیں بیچا ہے وہ دو منٹوں میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب۔ آپ تو سفر کیجئے اب آپ سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھئے۔"

بابو صاحب نے تسلی تو دے دی مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ تھی نہ کرایہ نہ فاصلہ اور فاصلہ جاتا کہاں سے انہوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ سمجھ کر کہ بارہ روپیہ گیا یا یہ تیرہ آنے کے نفع میں رہے اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے اور شاید نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی وہی گھڑیاں مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ اسباب کے ٹھیلے پر پان والا اپنی دکان سمیٹے بیٹھا تھا۔ قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچائیں۔ پلیٹ فارم پر ایک قلی تھا لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اٹھانے کو کہا فوراً خفا ہو کر جواب دیا۔

"اندھے ہو گئے ہو؟ دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر؟"

"معاف کیجئے گا غلطی ہوئی" کہہ کر ہم پورے پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ یا اللہ! یہ کیا انقلاب ہے۔ پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے۔ اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو پھر قلی کس صورت کا ہوگا؟ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اٹھایا اور دو مرتبہ کر کے سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ اسباب قرینے سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہئے کہ یہی گاڑی کانپور جانے کی ہوگی یا کوئی اور۔ سب سے پہلے تو ہم نے انہی حضرت سے پوچھا جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے لیکن انہوں نے صرف یہ جواب دیا: "ہاں بھیا ہم کا نا ہیں مالوم"۔ یہ خالص سودیشی ریل کے سیکنڈ کلاس کے معزز پیسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائے گی۔ اسی لیے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف۔" ہم نے گھبرا کر پوچھا۔

"لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا؟"

جواب ملا کہ "جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے۔"

ہم نے پھر پوچھا: "لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا؟"

جواب ملا کہ "ہو جایا کرے جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے؟ کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟"

اب ہم بالکل راضی برضا ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس انتظام کو برا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دنیا تھی۔ اچھا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا جس کی اب کوئی امید بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ غرضیکہ کبھی اپنے ڈبہ میں بیٹھ کر، کبھی لوٹے میں پانی لا کر، کبھی پلیٹ فارم پر ٹہل کر، کبھی انجن کو مشرق اور مغرب کی سمت حدِ نظر تک ڈھونڈھ کر کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹتے تھے۔

[illegible] وہ ایک ایک سے دو ہوگا۔ گاڑی کی سیٹ پر بیٹھ کر اپنی جگہ سے [illegible] دیکھتے رہے۔ [illegible]
اب اول سے آخر تک انتظار شروع ہوگا۔

تھکے ماندے مسافروں سے گاڑی بھری تھی۔

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف [illegible] ہمیں بتایا کہ [illegible] گاڑی [illegible] نہیں تھا مگر ہم اسسٹنٹ اسٹیشن [illegible] صاحب [illegible] بیٹھ گئے۔ [illegible] جانی پہچانی [illegible] سفر کا [illegible] فرسٹ کلاس [illegible] ہم نے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر سے [illegible] انہوں نے اپنی سوراجی شان سے [illegible] سب بھائی بھائی ہیں۔ [illegible] فرق کو بھول جانا چاہیے۔ سب برابر ہوگئے۔ [illegible] اپنے ڈبے میں آگئے جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور [illegible] جھگڑے کی بجائے اپنا ٹرنک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

مگر کیبن بیٹھے ہی ایک گھنٹہ کے قریب ہوگیا۔ گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ پھر [illegible] پلیٹ فارم پر آئے۔ دیکھ کر بھی گاڑی میں شور مچا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کانپور ہی کی طرف لیے جا رہی ہے یعنی بجلی لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے۔ وہ کانپور جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آجائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی لینے کے لیے گیا ہوا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا نہیں۔ وہیں سے صبر کر کے ارادہ ملتوی کر دیں۔ کام اشد ضروری تھا اس لیے جانا ضروری تھا۔ گاڑی چھوڑنی نہ تھی اس لیے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کشمکش میں جان تھی۔ معلوم نہیں وہ کونسا وقت تھا جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی۔ اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا اس لیے کہ کفرانِ نعمت کا الزام بھی تو ہم پر لگا دیا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے بندے ماترم کے فلک شگاف نعروں سے اچھل پڑے۔ معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے۔ ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دیئے جنہوں نے رات کو تقریر کر کے سوراج دلوا دیا تھا اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سیکرٹری ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرض ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی شوں شوں کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش زیب پا بزرگوار لال اور سبز گارڈ کی جھنڈیاں لیے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر یہ سمجھا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے

غلطی سے شروع جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف چلے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ "گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں مگر تمہارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔"

ڈرائیور نے بھی ان کے سے جا غصہ کا جواب کڑک کر دیا "جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں۔ میرا کیا قصور ہے دو گھنٹے سے مسافروں کو دیکھنے گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا کہ ایک کر جلدی سے لے آؤ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لانا۔ دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتلائیے میرا کیا قصور ہے۔" گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کے بے قصور ہونے پر چپ ہو گئے اور کوئلے کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن میں یہ بڑی بری بات ہے کہ وہ بغیر کوئلے کے چل ہی نہیں سکتا۔ جس طرح گھوڑے کے پیٹ میں دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو تھوڑی دیر بھوکا بھی چل سکتا ہے مگر یہ اتنا بھی کام نہیں دے سکتا۔ اب بتائیے کہ ریل بھی تھی، انجن بھی، مسافر بھی تھے، گارڈ بھی، سیکرٹری صاحب تھا قدن کا شکریہ بھی آ گئے تھے اور رضا شیو بھی تھا مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کال ڈیڑھ گھنٹہ بعد قلی کوئلہ کی گٹھری لیے ہانپتا ہوا آ پہنچا۔

"آدھی رات کو کوئلہ ملتا ہے بھلا۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ نو آنے میں ملا ہے۔ ہانپتا ہوا آ رہا ہوں۔ راستہ بھر گرمی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے۔ کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔"

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا، ادھر سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چل ہی تھی کہ ایک شور ہوا "روکو۔ روکو گارڈ صاحب رہ گئے۔" گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہوگی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلا چلا کر پوچھنا شروع کیا "ارے لالٹین کیوں نہیں لے لیا تھا۔" — "لالٹین کیا" ڈرائیور نے بھی چلا کر جواب دیا "لے لیا تھا۔" گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا "اچھا تو چھوڑو گاڑی میں سیٹی بجاتا ہوں۔" گاڑی پھر چلی۔ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ پسنجر ہے یا ایکسپریس۔ اس لیے کہ اس کی رفتار سے زیادہ تیز شاید ہم خود چل لیتے اور اگر ابھی شرط بد کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک شریک سفر سے پوچھا "کیوں صاحب یہ پسنجر ہے یا ایکسپریس۔" وہ پہلے ہی کچھ خفا بیٹھے تھے غالباً گاڑی پر بور ہو گئے تھے، غصہ ہم پر اتارا اور جھڑک کر فرمانے لگے "میاں خدا کا شکر بھیجو کہ یہ گاڑی ہی ہے ورنہ تم میل ایکسپریس لیے پھر رہے ہو۔" ان کا جواب سن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی مگر سیر سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے سنٹے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے جاتے تھے اور گاڑی چھک چھک چل رہی تھی۔ اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پر رکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ:۔

"جب تک میں نے سگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن میں گاڑی لانے کا حق کون تھا؟"

ڈرائیور:۔ جب آپ نے گاڑی آتے دیکھ لی تھی تو سگنل کیوں نہیں دیا؟

اسٹیشن ماسٹر:۔ ایک تو گاڑی لے آیا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا، دوسرا ڈرائیور رکھ لوں گا جو مجھ سے

گستاخی کی۔ اگر گاڑی وقت پر آجاتی تو تماشا نہ ہوتا۔ آدمی سب مر جاتی۔

مسافر ۔ دیکھیے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے بات کیجیے گا۔ تو کیوں بیٹھے ہو سب بیکار ہے۔ جیسے زیادہ سے زیادہ روپے کھانے والے ہیں جیسے ہم ان ہی کے نوکر ہیں۔ چاچا گاڑی والے تو سب پاگل ہو گئے۔ اب اس مدیر نے ساتھ والوں نے۔ دیکھیے یہ گاڑی کیا کرتی ہے۔

اسٹیشن ماسٹر ۔ دیکھیے گارڈ صاحب منع کر چکے ہیں کہ کوئی نیچے ہی نہ اترے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ گاڑی پہلے کبھی نہیں ہوتا ہے۔

گارڈ ۔ جب سے بھی دو دن اس جانب بھی رہ۔ ابھی آتی ہے کیا سب ہو۔ اس سب ہی ہٹ جاؤ۔ صاف تو یہی سب سا رہ ہے اسے پھر شروع کی اسٹیشن۔ تو تم ہی اسے بند کرو۔

اسٹیشن ماسٹر نے شدید غصہ کیا اور ڈرائیور سے اسٹیشن ماسٹر کہنے لگے۔ جب ہوتے۔ سب کے سب شروع کر دیے اور تمام مسافر چلا کر دیکھنے کو جلے ہوئے۔ جنگل تمام گھوڑے کے بچے بچا اور کسی کو زور کو اٹھا لیا۔ ابھی بچا ہی تھا کہ کسی نے آگ لگا دی۔ گھبرا کر بولی آوازیں نکلنا شروع ہو گیا۔

گارڈ صاحب! اے گارڈ صاحب! ایک دم گاڑی چلنے لگی ہے۔ خدا کے لیے بند کرو جلدی جلدی ہو گئے۔

گارڈ یہ سنتے ہی بدحواس ہو گیا اور سیٹی بجانا شروع کر دیا۔

— مسافرو جلدی اترو۔ گاڑی چلتی ہے۔ گاڑی چلتی ہے جلدی اترو۔

سب مسافر گھبرا کر اپنا اسباب لے کر کے چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس گاڑی سے اس بری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے سر پر آپڑا۔ میں ایک دم سے چونک پڑا۔ کھڑکی سے میرے سر پر آکر گری تھی۔ حقہ جل چکا تھا۔ کمرہ کرسی بھی شبنم سے تر ہو گئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے کے قریب تھے۔ میں کرسی سے اٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا، اس لیے کہ اب گاڑی تو سونے کی وجہ سے چھوٹ چکی تھی۔ اب بھی کیا سکتا تھا سوائے آرام سے سونے کے۔

———

شاہین بچے

یہ ہے یہاں مدد کے فضل سے تین شاہین بچے ہیں جو آپ کی دعا سے خاکساری تعلیم حاصل کرنے میں شب و روز مصروف ہیں اور اگر سچ پوچھئے تو میں خداوندانِ مکتب کا ممنونِ احسان ہوں ہر دو شاہین بچوں کو بھی یقین دلائے ہوئے ہیں کہ وہ موئے ہیں جس طرح اللہ آمین سے۔ ان کو یہ دان چڑھا کر مکتب جانے کے قابل ہیں۔ کیا ہے اس پورے مکتب ہی ان نے یہ بسم اللہ کا گنبد بنا ہوا ہے۔ جہاں ان کو خود اڑنا نہیں سکھایا جاتا۔ بلکہ پروں کی گیند اچھالنا سکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ تینوں شاہین بچے جب سکول سے لوٹ آتے ہیں۔ تو ایک صاف مکان کے دن بھر گھنٹے تک بیڈمنٹن کھیلا کرتے ہیں۔ اور وہ پروں والی گیند ان کے درمیان اچھلا کرتی ہے۔ جب تمام نسل کا خواب ہو جاتے ہیں۔ تو ان شاہین بچوں کی ماں مجھ سے کہتی ہے کہ ــــ

جو ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

اور میں تو اسی دن ایک درجن شٹل کاک بازار جا کر خرید لاتا ہوں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ شاہین بچے نہایت محفوظ قسم کا کھیل کھیلتے ہیں۔ جس میں نہ کوئی جان جوکھم کا معاملہ ہے۔ نہ منہ ٹوٹنے اور سر پھوٹنے کا کوئی اندیشہ۔ اگر بارش ہوئی۔ اور پروں والی گیند کی پرواز میں کوتاہی واقع ہوئی۔ تو یہ شاہین بچے ایک بڑی سی میز پر جال تان کر چھوٹی چھوٹی تھاپیوں سے سیلولائیڈ کی ہلکی پھلکی گیند سے ٹیبل ٹینس کھیلتے ہیں۔ جس کو وہ پنگ پانگ کہتے ہیں۔ یہ کھیل بھی کچھ خطرناک نہیں ہے۔ کہ چوٹ چپیٹ کا اندیشہ ہو۔ یا مثلاً کیرم ہے۔ یہ بھی محفوظ قسم کا کھیل ہے کہ انگلی ذرا بچا کر اسٹرائکر چلایا جائے۔ تو کسی قسم کے گزند کا امکان نہیں۔ بڑا شاہین بچہ چونکہ کالج میں پڑھتا ہے لہذا وہ کبھی کبھی ہیرو کھیلنے بھی چلا جاتا ہے۔ یا اپنے احباب کو ملا کر جو اتفاق سے سب کے سب شاہین بچے ہیں۔ تاش وغیرہ کھیل لیتا ہے۔ اس میں نقصانِ مایہ تو ہے۔ بلکہ شماتتِ ہمسایہ بھی ہے۔ مگر یہی کیا کم ہے۔ کہ زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جان کا صدقہ مال ہے۔ لہذا میں اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ وہ برج اور پوکر وغیرہ کھیل کر کچھ ہار جاتا ہے مگر ہاکی اور کرکٹ قسم کے خطرناک کھیل تو نہیں کھیلتا۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ قمار بازی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہی کیا کم ہے۔ کہ کوئی جان کی بازی نہ لگائے۔ جب تک میں

[illegible] کی قدر [illegible] ہوا ہے۔ اس کے بعد خود [illegible] جانے کے مطابق [illegible]
[illegible] کی [illegible]۔

میں [illegible] زمانے کی عام [illegible] شاہین بچوں کے [illegible]
[illegible] والی [illegible] کر [illegible]
[illegible] جیسے [illegible] پھر [illegible] جب [illegible]
[illegible] کر دی ہے۔ میں ان شاہین بچوں کے [illegible]
[illegible] سے بھی کہتا ہوں [illegible]

[illegible] شاہین بچے [illegible]

[illegible] کرتے [illegible] محنت [illegible] ہوں [illegible]
[illegible] اگر وہ کہتے بھی ہیں تو آپ نہیں جھیں گے [illegible] کہ میں [illegible] شاہین [illegible]
[illegible] کرگس [illegible] ہو۔

میرے یہ شاہین بچے [illegible] نہیں ہیں۔ [illegible] شاہین
[illegible] کے دشمنوں کی حالت خراب ہو [illegible]
[illegible] جماہیاں اور انگڑائیاں لینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بھی چائے [illegible] اگر وہ [illegible] کے بعد بھی چائے
میسر نہ آئے [illegible] حرارت کے بعد بخار اور پھر بخار [illegible] جاتے ہی ہیں [illegible] کا ہوتا ہے۔ لہٰذا
[illegible] کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر ان کو وقت پر چائے ضرور ملنا چاہیے۔ چائے بھی [illegible] قسم
[illegible] چلنے [illegible] ساتھ [illegible] بھی چاہیے۔ اور اس [illegible]
کے ذیل میں کیک، پیسٹری، بسکٹ، مختلف قسم کے پھل سب ہی کچھ آتے ہیں۔ وہ کہا تھا کہ اگر ان شاہین
بچوں کو اچھا نہ ملے گا تو یہ نازو نعم میں پلے ہوئے اپنی صحت کیونکر برقرار رکھ سکیں گے۔ صحت تو خیر روٹی دال
سے بھی برقرار رہتی ہے۔ مگر دل کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ محسوس کر کے کہ یہ غریبوں کا کھانا ہے۔ اور امیروں کے دسترخوان
پر انواع و اقسام کی چیزیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان شاہین بچوں کو ضعفِ قلب سے بچانے کے لیے کھانے کا بھی معقول
ہی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ ان کو باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیمی کا احساس نہ پیدا ہو۔ اور باپ کے گھر کو وہ یتیم خانہ
سمجھ کر دل شکستہ نہ ہو جائیں۔

یہ قاعدے کی بات ہے کہ اچھا کھانے والے اچھا پہننا بھی چاہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے
لباس میں ہر طرح کا تکلف برتتے ہیں۔ مگر اولاد کو کچھ اس طرح پہناتے اوڑھاتے ہیں کہ وہ کچھ یا کٹ یا سوتیلی
سی اولاد نظر آتی ہے۔ اس قسم کے بچے ابتدا ہی احساسِ کمتری کا شکار ہو کر کرگس زادے تو خیر بن جاتے ہیں مگر
شاہین بچے نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے شاہین بچوں کو اپنی اوقات سے زیادہ شاندار لباس بھی مہیا

کرتا ہوں۔ اور وہ بھی ایسے تمیز دار ہیں۔ کہ کیا مجال کہ نیلے سوٹ پر براؤن جوتا یا کریم رنگ کے پتلون پر سیاہ بوٹ تو پہن لیں۔ میری آنکھوں میں خاک ایسے جامہ زیب بچے آپ کو مشکل ہی نظر آئیں گے۔ میری آنکھوں میں خاک میں نے اس لیے عرض کیا کہ ماں باپ کی نظر سب سے زیادہ اولاد کو لگتی ہے۔ پھر یہ کہ میرے شاہین بچے اس قدر نفاست پسند ہیں۔ کہ اگر آپ ان میں سے کسی کی ڈریسنگ ٹیبل دیکھ لیں تو دنگ رہ جائیں۔ کنگھا تو میز پر کیا معنی وہ جیب میں بھی رکھتے ہیں آئینے اور کنگھے کے علاوہ بے شمار شیشیاں ڈبے اور ڈبیاں آپ کو ان کی ڈریسنگ ٹیبل پر سجی ہوئی نظر آئیں گی۔ رات کو لگانے کی کریم الگ ہے۔ صبح کو لگانے کی اسنو الگ، ناخن تیز کرنے کے اوزار۔ بالوں میں چھلے بنانے کے کل پرزے۔ بھنوؤں کا تناسب قائم رکھنے کے لیے بال کی کھال نکالنے والی قینچیاں۔ بھوں پر لگانے کے لیے خاص قسم کے موم روغن مختصر یہ کہ ایک دکان سی سجی ہوئی نظر آئے گی۔ اور یہ تمام چیزیں محض اس لیے مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ کہ شجرہ تو ان کے گلے میں لٹکایا نہیں جا سکتا۔ صورت ہی سے شرافت برسائی جا سکتی ہے۔ کہ دیکھنے والے ایک ہی نظر میں بھانپ لیں کہ ہاں یہ ہیں نجیب الطرفین شاہین بچے۔

اس طرح تو صاحب ان شاہین بچوں کو پروان چڑھایا گیا ہے اور مرزا صاحب سے جو پوچھا کہ بڑے بچے کو آخر کس کام سے لگایا جائے کالج سے نکلنے والا ہے۔ تو عقلمندی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ۔

قبلہ میری تو یہ رائے ہے کہ ایر فورس میں بھیج دیجئے۔

ایر فورس کا نام سن کر ہوش اڑ گئے۔ یعنی ہوائی جہاز کی نوکری چہ خوش۔ عرض کیا۔ مرزا صاحب میں نے تو یہ سمجھ کر آپ کی رائے طلب کی تھی۔ کہ آپ ماشاء اللہ خود صاحب اولاد ہیں۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر مشورہ دینگے۔ مگر آپنے تو عجیب بات فرمائی ہے۔"

مرزا صاحب نے اسی استغنا سے فرمایا۔ میں نے تو اپنے نزدیک بہترین مشورہ دیا ہے۔ صاحبزادے کی ماشاء اللہ صحت بھی اچھی ہے۔ چشم بد دور ہاتھ پیر کے بھی اچھے ہیں۔ ان کے لیے ایر فورس میں ترقی کے بڑے امکانات ہیں۔ اور اگر سچ پوچھئے تو ہمارے ایر فورس میں ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے۔

عرض کیا۔ ترقی گئی بھاڑ میں مرزا صاحب ذرا غور تو فرمائیے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کو بھلا کیونکر ایئر فورس میں جھونک سکتا ہوں کہ جاؤ بیٹا اپنی جان سے دور اڑ جاؤ۔ ہے ہے تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں طرح طرح کے ہول آنے لگتے ہیں۔ یہ آپنے کیا مشورہ دیا ہے"

مرزا صاحب نے فرمایا۔ لاحول ولا قوۃ۔ کس قدر فرسودہ تخیل ہے۔ آپ کا بھی۔ اے جناب اب وہ زمانہ گیا۔ جب ان لاڈلوں کو روئی کے گالوں میں پٹاری کے انگوروں کی طرح سینت سینت کر رکھا جاتا تھا۔ اب آپ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے ذمہ دار شہری ہیں۔

گھبرا کر عرض کیا۔ دیکھو بھئی مرزا۔ اولاد کے معاملہ میں تو یہ سیاسی باتیں مجھ سے کرو نہیں۔ مجھے ہوتی ہے الجھن۔ میں سیاست کا بس اتنا ہی قائل ہوں کہ جتنا چاہو مجھ سے چندہ لے لو۔ کوئی مر جائے کالی شیروانی پہنا دو۔

کہہ کر کوئی سیاسی جشن ہو گھر پہ چراغاں کرنے کو میں موجود ہوں۔ مگر چندے میں اولاد نہیں دے سکتا۔ یہ آپ نے بڑا منہ بھر کر کہہ دیا۔ کہ ایئر فورس میں بھیج دوں۔

مرزا صاحب پھر بھی قائل نہ ہوئے۔ جو قومیت اسکولوں میں گھس کر رہ گئی۔ بندہ نواز اب بے خود نگری اور خود شناسی کا دور ہے۔ اب قوم کا ہر فرد سپاہی ہے۔ ملت کا ہر نوجوان ملت کے مقدر کا ستارہ ہے۔ مگر جب اسی طرح شاہین بچوں کو ممولا بنائے رکھیں گے۔ اور شہباز بننے سے روکیں گے۔ تو پھر مستقبل کیا ہوگا۔

آخر کو عرض کیا۔ خیر میں آپ سے بحث تو کرنا نہیں چاہتا میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ ان کے لیے وکالت اچھی رہے گی۔ یا ڈاکٹری۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔ ڈاکٹری بھی اچھی ہے۔ اس وقت ہم کو ڈاکٹروں کی بے حد ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کو پورا کرنا ان بزرگوں کا فرض ہے۔ جو اپنے بچوں کو ڈاکٹری کی تعلیم دلوانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔

عرض کیا۔ ڈاکٹری کے فوائد تو میں خود جانتا ہوں۔ نہایت شریف پیشہ ہے۔ اور اگر چل نکلی ڈاکٹری تو دولت قدم بھی چومے گی۔ مگر قباحت یہ ہے کہ صاحبزادے واقع ہوئے ہیں۔ نہایت کمزور دل کے ایک مرتبہ مرغا ذبح ہوتے دیکھ لیا۔ اس سے ڈر ایک ہفتہ تک بخار آتا رہا۔ سوتے میں اچھل اچھل پڑتا تھا۔ ڈاکٹری میں چیر پھاڑ کیسے کریں گے۔ اور میں نے سنا ہے۔ کہ لاشوں کو چیرنا پھاڑنا پڑتا ہے۔"

مرزا صاحب نے فرمایا۔ جی ہاں یہ تو ہے۔ مگر اس میں مضائقہ کیا ہے۔

عرض کیا۔ جو مضائقہ ہے۔ اس کا افسوس یہ ہے۔ کہ تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ بہرحال ڈاکٹری سے تو باز آیا میں رہ گئی وکالت ویسے تو اس پیشے میں کوئی خرابی نہیں۔ مگر ایک بات سے ذرا ڈر لگتا ہے۔ کہ اگر خدانخواستہ وکالت نہ چلی اور صاحبزادے بن گئے کچھ لیڈر وڈر تو میں کیا کروں گا۔"

مرزا صاحب عقل کے ذرا واجبی ہی سے لوگ ہیں۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ تو اور کیا چاہیے آپ کو۔ اگر صاحبزادے لیڈر بن جائیں۔ اور ان کو عوام اپنا رہنما تسلیم کر لیں تو اس سے زیادہ آپ کے لیے باعثِ فخر اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔

سمجھاتے ہوئے عرض کیا۔ میاں بات سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ لیڈر کوئی یونہی نہیں بن جاتا۔ اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ صرف زندہ باد ہی کے نعرے بلند نہیں ہوتے مردہ باد کے نعرے بھی ہم نے سنے ہیں۔ صرف پھول ہی نچھاور نہیں کیے جاتے۔ جوتے بھی اچھالے جاتے ہیں۔ خوش آمدید ہی نہیں کہا جاتا۔ واپس جاؤ بھی کہا جاتا ہے۔ جلوس ہی نہیں نکلتا۔ کالی جھنڈیاں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ خیر یہ سب کچھ بھی سہی مگر لیڈر رہنے کے لیے پولیس کے ڈنڈے بھی کھانا پڑتے ہیں کبھی کبھی، اور شیطان کے کان بہرے جیل میں چکی بھی پیسنا پڑتی ہے۔ بس میں ان ہی باتوں سے ذرا ڈرتا ہوں۔ اور چونکہ میں نے وکیلوں بیرسٹروں ہی کو زیادہ تر لیڈر بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ لہٰذا وکالت سے کچھ دل کھٹا سا ہو گیا ہے۔"

مرزا صاحب نے گرما گرم ہو کر فرمایا۔ اس قسم کے اندیشے تو کم و بیش ہر شغلے میں موجود ہیں۔ اور یہ نشیب و فراز تو عملی زندگی میں ہر ایک کے لیے موجود ہیں۔ زیادہ محتاط طریقہ تو یہ تھا۔ کہ اس زمانہ میں ان صاحبزادوں کو پیدا ہی نہ کیا جاتا ؟

عرض کیا جبرا۔ تو پیدا ہو ہی گئے ہیں۔ لہذا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ میں کہتا ہوں کسی مقابلے کے امتحان میں کیوں نہ بٹھا دوں۔

مرزا صاحب نے کہا۔ بڑا اچھا خیال ہے۔ مگر ان امتحانوں میں بھی اس قسم کی خطرناک وادیوں سے گزرنا ہی پڑے گا۔ مثلاً پولیس کی ملازمت کو آپ کیا سمجھتے ہیں۔

کانوں پہ ہاتھ رکھ کر عرض کیا۔ اجی توبہ کیجئے مرزا صاحب ہتھیلی پر جان لیے پھرتے ہیں۔ یہ بیچارے پولیس والے ایسی بھی سرفروشی کیا کہ انسان واقعی سر کاٹ کر بیچنا شروع کر دے۔ ہر ایک سے ایک خونخوار بدمعاش سے آئے دن سابقہ پڑتا ہے۔ پھر یہ کہ ایسی سخت ڈیوٹی کہ نہ دن کو دن سمجھو نہ رات کو رات۔ صاحب آدھی آدھی رات تک تو یہ پولیس والے گشت لگاتے پھرتے ہیں۔ بلوہ ہو جائے تو گولیوں کی بارش میں سینہ تان کر جاؤ۔ ان صاحبزادے نے تو آج تک شب برات کی آتش بازی بھی اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑائی۔ یہ پستول کیونکر چلائیں گے۔ اور اس قسم کی بے شمار باتیں ہیں۔ جن کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ مثلاً گھوڑے کی سواری کو میں نہایت غلط سمجھتا ہوں۔ یا گھوڑے کی جگہ پر وہ جو موٹر سائیکل آجکل نکلی ہے۔ وہ اور بھی خطرناک۔

مرزا صاحب نے پھر پھبتیوں پر اڑایا۔ اگر پولیس آفیسر ڈولی میں بیٹھا کریں۔ اور وردی میں چوڑیاں بھی ہوں۔ تو غالباً کوئی مضائقہ نہ ہو گا۔"

جل کر عرض کیا۔ بندہ پرور آپ تو خیر مذاق فرما رہے ہیں۔ یہ تو اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ میرا دل ایسا مضبوط نہیں ہے۔ کہ اس بچے کے لیے میں ایسی ملازمت کو موزوں سمجھوں جس میں بس بدمعاشوں ہی سے واسطہ پڑے خواہ وہ بدمعاش انسان ہوں یا بدمعاش گھوڑے۔ مجھ کو تو اس کے لیے ایسے مشغلہ کی ضرورت ہے جس میں امن و امان کے ساتھ زیادہ نہیں تو بس اتنا پیسہ مل جائے کہ جس طرح کی زندگی میں نے اس کو بسر کرائی ہے۔ وہ خود بھی بسر کر سکے۔

مرزا صاحب بولے۔ بندہ پرور آپ نے تو بچوں کو مرزا پھویا بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ مردوں کو مرد بن کر رہنا پڑے گا۔ وہ گہواروں میں جھولنے کا زمانہ گیا۔ اب آپ ایک آزاد قوم کے فرد ہیں۔ اور قوم کی یہ آزادی اسی وقت تک برقرار رہ سکتی ہے۔ جب تک قوم کے ہر فرد میں اس آزادی کے تحفظ کا صرف جذبہ ہی نہیں۔ بلکہ بل بوتا بھی موجود ہے۔ ہر شخص ملت کا جانباز سپاہی بن کر رہے گا۔ اب ملت کے افراد موت سے ٹکرا ٹکرا کر زندگی کے حقوق حاصل کریں گے۔ یہ عمل پیہم کا زمانہ ہے۔ یہ جدوجہد کا دور ہے۔ یہ ہم کو تلافی مافات کا موقع ملا ہے۔ اور اگر اس وقت بھی ہمارا یہی عالم رہا۔ جو آپ کا میں دیکھ رہا ہوں تو پھر خدا ہی حافظ ہے ہمارا۔

عرض کیا۔ بھائی جان آپ تو یہ باتیں کچھ کتابوں کی دنیا کی کر رہے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کتابوں میں تو خیر پڑھی جا

کہ ہم یہ گمان رکھیں اور اس مشکل سے بچ سکتے ہیں۔

مرزا صاحب اللہ کا شکر ہے۔ یہ کیوں نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ کے سامنے ہی مثال موجود ہے۔ بڑی مدت سے اپنے دو بیٹے بچوں کو نوجوانی ہی میں رہا ہے۔ وہ پھر شروع سے ایئر فورس کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ آخر ان بچوں کو بھی کسی سے آنکھ ملانا نہیں آتا تھا۔ اللہ ہی تو ہے۔ ہم اپنی اولاد کے ساتھ جو بہتر سے بہتر سلوک کر سکتے تھے۔ وہ ہی ہم نے کیا۔

حرج کیا ہے یہ سلوک کیا۔ کہ اس کو جان بوجھ کر ایسے محکمے میں بھیج دیا کہ خدا ہی ان کا محافظ ہے۔ اصل میں یہ بڑی غلطی تھی کہ میں آپ سے مشورہ کرنے بیٹھ گیا جس نے خود اپنے بچوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو۔ وہ دوسرے کی اولاد کے لیے دل میں کیا درد رکھ سکتا ہے؟

مرزا صاحب نے پھر ہنسنے کی کوشش کی۔ میری رائے میں تو آپ صاحبزادوں کو ایک ایک دو دو کی شیشی خرید کر ایک ایک کھلونے کے سپرد کر دیں۔ کہ ان کو دربار شاہی رہا ہے کہ ان ہی کو پاکستان میں منع ہے۔ اور یہی اس آزادی کے محافظ ہوں گے۔

مرزا صاحب تو اس قسم کی بھی گفتگو کر کے تشریف لے گئے۔ عجیب پتھر دل پایا ہے۔ اس شخص نے بھی مگر اب ہر ایک تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھلا غور تو کیجیے وہ بچے دھوپ میں کہہ جائیں۔ جو ٹھنڈی ہوا میں جھپکیں لینے لگیں ان کے لیے آپ تجویز فرماتے ہیں۔ ایئر فورس۔ پولیس کی نوکری۔ فوج اور سپہ گری۔ سبحان اللہ! دروازہ زور سے بند ہو جاتا ہے تو وہ اچھل پڑتے ہیں۔ ننھا سا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بھلا وہ پستول اور بندوق سے کیونکر کھیل سکیں گے۔ مرزا صاحب سو باتوں کی ایک بات تو یہ کہ اپنے جیتے جی تو یہ ہو نہیں سکتا کہ ان کو آنکھ بند کر کے جھونک دیا جائے کسی ایسے محکمہ میں بلکہ اگر وہ خود اس قسم کا ارادہ کریں بھی تو میں یہی کہوں گا کہ ؎

اللہ آمین سے ہم تو یوں پالیں
آپ آفت میں جان کو ڈالیں

یہاں زندگی کے لالے پڑے ہیں جی۔ بچپن میں یہی بہت ہے۔ اگر یہی روزگار رہ گئے ہیں۔ تو ان کے لیے بیکاری بھلی۔

———

تعزیت

ریاض کے والد بزرگوار نے انتقال فرما کر ایک عجیب سوال پیدا کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد کا غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو والدین کا غم؟ ماشاء اللہ ایک سو پانچ یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا لیکن ریاض کا یہ حال تھا کہ بچوں کی طرح بلکتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ جوان اولاد کا داغ کھایا ہے۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تل جائے تو والدین کا داغ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے مرنے سے والدین یتیم نہیں ہوتے لیکن باپ کے مرنے سے اولاد یتیم خانے میں داخل کر دی جاتی ہے۔ اولاد کے مرنے کے بعد انسان اپنی دوسری اولادوں کو دیکھ کر صبر کر لیتا ہے ورنہ کم سے کم یہ امکان تو ضرور رہتا ہے کہ خداوند کریم اور دے گا لیکن سوال تو یہ ہے کہ ریاض بیچارے اپنے لیے والد کا انتظام کیونکر کرتے۔ ان کو تو یہی غم تھا کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑے گا۔ ماں کے غم سے وہ واقف نہ تھے۔ اس لیے کہ وہ غریب ان ہی حضرت کی پیدائش کے سلسلے میں دنیا سے کوچ کر چکی تھیں اور ان کو ان ہی ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا لہٰذا ان کی ماں تھے تو وہی اور باپ تھے تو وہی جن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لیے ان سے جدا کر دیا تھا۔

ریاض کے والد ماجد کا انتقال خود ان کے لیے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنے کے برابر تھا لیکن اس سلسلے میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہ تھے اس لیے کہ بحیثیت دوست کے ہم کو ریاض کے پاس تعزیت کے لیے جانا تھا۔ ان سے اظہار ہمدردی کرنا تھا۔ جنازے میں عدم شرکت کے عذر کرنا تھے وغیرہ وغیرہ لیکن ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے کہ ہم کو اس سلسلے میں کیا کیا کرنا ہوگا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی تھی اور وقت اتنا تھا نہیں کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق کر لیں۔ بہرحال ہم کو اطمینان تو تھا ہی کہ ہم بالکل کورے ثابت نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ متعدد مرتبہ لوگ ہمارے پاس تعزیت کے لیے آ چکے تھے اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسرے لوگوں کو آپس میں یہی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر کچھ ہم کو جھجک تھی تو صرف اس لیے کہ خود ہم نے بنفس نفیس آج تک یہ رسم ادا نہ کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ جانا اور تعزیت کرنا تقریباً ناگزیر تھا لہٰذا ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنے ارادے کو پختہ کر لیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے ذہن پر زور دے کر یکجا کرنا شروع کر دیے۔

"مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے ۔۔۔۔ صبر کیجیے ۔۔۔۔ جس کی چیز تھی اس نے لے لی ۔۔۔۔ دنیا کا یہی دستور ہے ۔۔۔

[illegible] ہے۔ کیا ملیں [illegible] ایک دن [illegible] جاتا ہے ——— [illegible] کل [illegible] ہے —
[illegible] نہیں [illegible] بھی [illegible] ہے [illegible]
[illegible] ——— اب [illegible] ہے۔ [illegible] ایک [illegible] دن [illegible] ——— [illegible] ہے۔ کیا اخلاق تھا
[illegible] ——— کبھی [illegible] نہیں کی۔ ——— [illegible] ——— اچھے دل [illegible] ——— [illegible]
[illegible] ——— [illegible] ——— بہت آگے [illegible] ——— [illegible]
[illegible] ——— [illegible] ——— [illegible] وقت [illegible] ہیں:

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی [illegible] ہے اس کے لیے [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] الفاظ [illegible] کرنے کے بعد [illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible]۔ تمام راستہ ہم تعزیتی الفاظ [illegible] تعزیتی تقریر [illegible] ہو گئی۔

ہمارا [illegible] کر لیتی نہیں آتا۔ عجیب [illegible] عجیب حادثہ ہے۔ خداوند کریم آپ کو صبر [illegible]
[illegible] ہیں۔ کیا [illegible] ہر ایک خوش اخلاق [illegible] ——— بہت آگے [illegible] تیار بیٹھے ہیں۔ صبر
[illegible] کیا اخلاق تھا مرحوم کا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آپ کی قسمت میں یہ غم لکھا تھا۔ ——— [illegible]
[illegible] ——— [illegible] ——— صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ [illegible] ہم
جو یاد [illegible] ابھی تو [illegible] مرنے کے دن [illegible]۔ وہ جنت کا ایک پھول تھے۔ [illegible]
[illegible] ملنسار، پرہیزگار، خوش وضع، خوش اخلاق، دوست نواز، غریب پرور، نیک بچے، فرشتہ صفت، محبت کرنے
والے، پڑھے لکھے، [illegible] کہ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے۔ خدا آپ کو [illegible] خدا آپ کا [illegible] کرے
[illegible] کر اطلاع ہوتی تو شاید کچھ کام آتا۔ [illegible] میں شرکت کرتا۔ نماز جنازہ میں شریک ہوتا مگر افسوس کہ آج وہ کل [illegible] ہے۔ جیتے
اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ السلام علیکم۔"

ریاض کے مکان پر پہنچ کر ارادہ ہوا کہ "خدا کے حافظ" کی آواز دیں لیکن یاد آیا کہ غم کا موقع ہے۔ فوراً اپنا چہرہ [illegible] کر
[illegible] آواز کے ساتھ پکارا۔ "ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" آواز کے ساتھ ہی ملازم باہر آیا اور ہم کو اپنے ہمراہ
گھر میں لے گیا جہاں ایک کمرے میں ریاض اوندھے لیٹے پڑے تھے ہم نے مغموم آواز میں کہا۔

"السلام علیکم!"

انہوں نے اس کے جواب میں سوائے کہ۔ "اس سلام" کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہمارا بھی دل بھر آیا لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا۔ ہم تعزیت کے لیے آئے تھے لہٰذا ہم کو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھی۔ ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر دہرانا شروع کی لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے [illegible] دیتا تھا کہ ہم اپنی تقریر بھولے جا رہے تھے۔ [illegible] یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس کی ہچکی [illegible] خیالات منتشر کر دیتی تھی اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرتے [illegible] تھے۔ جب اسی میں بڑی دیر ہو گئی تو ہم نے

اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بُری بات ہے کہ وہ روتے روتے جان دیئے دیتا ہے اور ہم چپ بیٹھے ہیں۔ مجھ کو ہم نے طے کیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہئے جو اس خاموشی سے بہتر ہوگا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں، کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے تھے۔ بس ابتدا شروع ہونے کی دیر تھی، لہٰذا یہی سوچ رہے تھے کہ شروع کس طرح کریں۔ چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا لہٰذا اس پر غور کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی گھڑی کی چال پر آدھ گھنٹے کے قریب ہوتا تھا۔ اب ہم نے سوچا کہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تعزیت کے لیے آتے ہیں اور آدھ گھنٹے سے بت بنے بیٹھے ہیں لہٰذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو از سر نو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ کے والد ——— پھر سوچا کہ اب کیا کہیں، کچھ یاد آگیا تو عرض کیا۔

"آپ کے والد ——— ہم کو خود یاد نہیں رہا کہ ہم کو کیا یاد آیا تھا مگر ٹھیک ہے وہ بات یہ تھی کہ۔

"آپ کے والد ——— آپ کے والد ——— آپ کے والد ——— " خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے، دماغ میں عجیب گڑبڑ ہو رہا تھا۔ آخر دماغ نے کام نہ دیا لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ نہ کچھ لہٰذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد ——— آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔"

ریاض نے یہ سنتے ہی پھر ایک چیخ اس طرح ماری گویا اس کو انتقال کی خبر ہم ہی نے سنائی ہے۔ میں پھر خاموش ہوگیا لیکن ساتھ ہی مجھ کو یاد آیا کہ مجھ کو خاموش نہ ہونا چاہیے لہٰذا میں نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز نہیں قضا ہوئی۔ زندگی بھر روزے رکھتے رہے آپ کے والد مرحوم، مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ صبر کیجئے، اب رونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ کے والد ——— آپ کے والد ——— آپ کے والد تھے ——— جس پر گزرتی ہے وہی جانے مگر اب نہ روئیے ——— جانے بھی دیجئے ——— ہٹائیے بھی اس قصہ کو ——— آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی، وہ روتے روتے خاموش ہوگیا تھا اور گردن جھکائے خاموشی کے ساتھ میری باتیں سن رہا تھا۔ کبھی کبھی میرے بعض زوردار الفاظ پر گردن اٹھا کر میرا منہ بھی دیکھ لیتا تھا۔ اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"باپ بھی دنیا میں عجب نعمت ہیں، بہت سے بیچارے اس ارمان میں مر جاتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی کا دے نہیں تو اس سے نہ ہونا ہی اچھا ہے۔"

ریاض برابر میرا منہ دیکھے جا رہا تھا لیکن میرے اس جملہ کا اس پر خاص اثر ہوا۔ اس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرے پر جما دیں۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکار کر پھر کہنا شروع کیا۔

"اب وہ واپس تو نہیں آسکتے۔ مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ ہم کو بھی ایک دن اسی طرح تصویر کھنچا تا یعنی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے۔ خدا بخشے عجیب انسان تھے۔ دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہوگئے۔ مجھ کو تو کل خبر ہوئی۔ آج وہ کل ہماری باری ہے ورنہ مجھ کو اطلاع ہوتی تو میں کچھ کام آتا اور بفرضِ محال یعنی یہ کہ مٹی میں شرکت ہو جاتی۔ نمازِ جنازہ تو ضرور ہوئی ہوگی۔"

ریاض سے مخاطب ہو کر جناب صدیقی صاحب نے ان کا تعارف کرایا اور مجھ سے پوچھا کہ:

شب :- تمہاری بھی جان پہچان تھی آپ کے ان سے پہلے، اور تعارف کیا ہوا ہے۔

ریاض :- جی ہاں! ان سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔

شب :- ان صاحب کو تم پہچانتے ہو، یہ کہتے تھے کہ ان کو بھی جانتا ہوں، ایک مدت سے ملاقات نہیں ہوئی، یہ سب یاد ہے؟

ریاض :- اب تو بیماری کی حالت میں فرمایا کہ شکل یاد ہے۔

میں :- ان صاحب کو میں ایک زمانے سے جانتا ہوں، صاحب مرحوم کے بیٹے ہیں۔ آپ کے بھائی صاحب کا انتقال ہو گیا، یہ خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔ ہم اب تو ملاقات ہوتی ہے، مگر آپ اپنے بھائی کی بابت کچھ بتائیے۔ اور مرحوم کی شادی ہو گئی تھی؟

ریاض :- ایک بیوی بھی ہیں۔

میں :- اچھا! تم نے ان کی بیوی کو دیکھا ہے، کیا شادی کو بہت دن ہوئے۔ ارے ان کیا تمہیں ہے؟

ریاض :- جی ہاں دو بچے اور ایک بیوہ ہے۔

میں :- وہ ان کے بچے کیا، اور ان کی بیوی کا کچھ ان سے تعلق ہے؟

ریاض :- جی ہاں ان کی والدہ تو مرحوم کی پیدائش ہی کے وقت انتقال کر گئی تھیں اور دوسری والدہ بھی کچھ سال ہوئے رحلت فرما گئیں۔ ان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔

میں :- ان کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہوا مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ۔ صبر کیجئے! اور تو بچے والے جوان ماشاء اللہ کیا عمر ہے؟

ریاض :- سب سے بڑا پانچ چھ سال اور چھوٹے۔

میں :- افسوس صد افسوس! یہ مصیبت ان بچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

ریاض نے مجھ کو اس نظر سے دیکھا گویا میں دنیا داری کر رہا ہوں اور یہ سب تصنع ہے۔ مگر میں نے سلسلہ جاری رکھا۔

"خدا گواہ ہے کہ چچا جان مرحوم مجھ کو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے اور محبت کرتے تھے۔"

ریاض :- جی ہاں! ان کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا۔

میں :- ارے بھائی میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں خدا ایسا وقت باپ سا سب دنیا کو دے۔ ہر ایک خوش تھی نماز قضا نہیں کی۔ ابھی تو زندہ تھے ان کے مرنے کے دن، خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔ تو سب سے بڑے آپ ہیں؟

ریاض :- جی ہاں اب تمام ذمہ داری میرے ہی سر ہے۔

میں :- گھبرائیے نہیں۔ جس خدا نے ان کو اٹھایا ہے وہی آپ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے گا۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ عجب ذات شریف تھے مرحوم۔ کبھی نماز قضا نہیں کی، آخر ان ہی کی قضا آگئی۔

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

دنیا کا یہی دستور ہے۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے! اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے؟

ریاض :- جی ابھی تو نہیں ہوئی۔

میں :- بزرگانہ اور بزرگانہ انداز سے، بھائی تو اس سلسلہ میں اس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ۔

ریاض :- اس کا یہ کون موقع ہے بھلا؟

میں :- تو پھر اور کون سا موقع آئے گا؟

ریاض :- جب خوش ہونے والا کون ہے؟ جو تھے وہ ہی نہیں رہے تو اب کیا ہوگی شادی؟

میں :- ہاں یہ تو ٹھیک کہتے ہو کہ بھاجان مرحوم کو چاہیے تھا کہ اس خوشی کو دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونے والے ہم لوگ موجود ہیں۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے جن کی چہیتی تھی اس نے سعادت مگر ساری شادی میں اس بات کا پتہ ہے کہ آنہ کمی [illegible]

[illegible]

نہ جانے کل کیا ہو جس وقت ... یہ تو بچہ ہے کہ ع

سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

اب دیکھو! بھیا میاں روز دو روز ہی سے آخر کیا بیمار تھے۔ یہی کہ بس وقت آگیا وہ نہ کہیں رہنے کے آثار تھے، کسی کو شبہ بھی ہوتا تھا کہ مرجائیں گے، مگر خدا کی مصلحت۔ وہ ہم پر تو وہ جان دیتے تھے۔ اب تو کون اس طرح چاہے گا۔ تم سا محبت کرنے والا اٹھ گیا۔ تم یتیم ہو گئے تمہارے سر سے وہ محسن کا سایہ اٹھ گیا۔ ع

دل سے ... انصاف طلب ہے

ریاض نے پھر ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا اور میں گھبرایا۔ اب کس طرح سمجھاؤں۔ تمام الفاظ ختم ہو چکے۔ کیا ان ہی کو پھر سے شروع کر دوں، لیکن اگر انہوں نے بعد میں پھر رونا شروع کیا تو کیا ہوگا۔ آخرکار دل نے کہا بس اب جاؤ ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا مگر پھر دل نے دوسری بات کہی کہ اس طرح روتے ہوئے دوست کو چھوڑ دینا بھی ہے کیا۔

"بھائی رونے کے لیے تو تمام عمر پڑی ہے اور واللہ انشاءاللہ تم سینکڑوں برس تک زندہ رہ کر روتے رہو گے مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے۔ تم کو سمجھ سے کام لینا چاہیے۔"

ریاض کی ہچکیاں سسکیوں میں بدل گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہوگئیں تو میں نے سب سے پہلی بات یہی کہی کہ "اچھا بھائی اجازت دو۔"

ریاض نے کہا "جاؤ گے؟"

میں نے کہا "ہاں! السلام علیکم!"

ریاض کے یہاں سے آکر مجھ کو پورا اطمینان تھا اور اب میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے یہاں کہئے تعزیت کے لیے روز چلا جایا کروں۔

لکھنؤ کانگریس سیشن

لکھنؤ میں [illegible] کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ [illegible] [illegible] تھی۔ [illegible] [illegible] ہی تھے [illegible]
[illegible] [illegible] کر دیا گیا۔ نمائش بھی تھی اور [illegible] [illegible] ہوا اور [illegible] [illegible] کی [illegible]
[illegible] اس موقع پر [illegible] [illegible] خیال آتا تھا [illegible] کانگریس [illegible] [illegible] اس وقت موجود ہوتے
اس [illegible] کی [illegible] [illegible] گئیں اور [illegible] نے اس کو [illegible] بنا دیا۔ [illegible] وہ شاہی [illegible] [illegible] جب یہاں کا [illegible]
[illegible] اور [illegible] شب برات ہوا کرتی تھی۔ [illegible] [illegible] [illegible] مگر اس وقت کانگریس سیشن ہو تو معلوم ہی ہو کر [illegible]
لکھنؤ میں بھی کانگریس ہوئی تھی تو جس طرح احمد آباد [illegible] اجلاس ہوتے اسی طرح لکھنؤ میں بھی اس قسم [illegible] [illegible] کیا
تھا۔ اس وقت یعنی جب لکھنؤ میں یہاں سیشن ہوا تو اخبارات وہ [illegible] نہ کرتے جو آج پیش کی جا رہی ہے [illegible] آپ
ر [illegible] عالم تصور کی سیر کرنا چاہیں تو اپنے کو لکھنؤ کے شاہی دور میں فرض کر لیجئے [illegible] اس شاہی دور کے کانگریس سیشن
کی روداد۔

لکھنؤ کے [illegible] کا صدر دروازہ جامہ دار کا بنا ہوا تھا اور اوپر ایک [illegible] چھتر لگا تھا۔ اس [illegible] نیچے [illegible] [illegible]
رنگی ہوئی تھی جس کے سہانے نظارے فضا میں ایک وجد کی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ اس دروازہ پر مجلس استقبالیہ کے صدر
اور چند ارکین مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھے اور نہایت گرم جوشی کے ساتھ بڑھ بڑھ کر اور [illegible] [illegible]
کر کر کے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب بہار نظر آتی تھی۔ سرخی کی [illegible] سڑکوں
پر کیوڑہ اور گلاب کا چھڑکاؤ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہو رہا تھا اور سڑکوں کے دو رویہ ریشمی جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ چنبیلی اور
بیلے کے پھولوں کی لڑیاں عطر میں بسی ہوئی [illegible] [illegible] [illegible] ہوتی تھیں اور شامیانے بھی۔ ان ہی سڑکوں پر جا بجا ساقی [illegible] لیے ہوئے
اور [illegible] پر ہار [illegible] ہوئے [illegible] رہے تھے جن کے [illegible] کی خوشبو اور بھی قیامت تھی۔ جو سڑک صدر دروازہ سے عام اجلاس کے
پنڈال تک گئی تھی اس کے دونوں طرف دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی پان کی دوکان تھی تو کوئی [illegible] کی۔ کہیں گنڈیریاں برف میں
[illegible] پھولوں میں بسائی جا رہی تھیں تو کہیں دوکان پر انواع و اقسام کے کھلونے اور ہر قسم کی ڈوریں بھی ہوتی تھیں۔ کوئی جامدانی کی دوکان
تھی تو کسی دوکان میں لکھنؤ کی مشہور و معروف زردوزی کے نمونے نظر آتے تھے۔ مختصر یہ کہ دور دور تک یہ خاص سڑک اسی طرح

بارونق بنائی گئی تھی کہ گویا چوک کی تمام چہل پہل اس جگہ نے حاصل کر لی ہے۔ وہی پھبتے اور وہی ٹھٹھے۔

دو فرلانگ تک اس خوبصورت اور بارونق منظر اور متعدد سڑک پر چلنے کے بعد کانگریس کے عام اجلاس کا وہ پنڈال تھا جس کو لکھنؤ کے نفاست پسندوں کا ایک جامع نمونہ کہنا چاہیے۔ پنڈال جس کا بنایا گیا تھا کہ ہوادار بھی ہے اور خوشنما بھی۔ پنڈال کے تمام ستون چاندی کے تھے اور شرکائے اجلاس کو شبنم سے بچانے کے لیے پنڈال کے اوپر ایک قسم کا شامیانہ لگایا گیا تھا جس کے چاروں طرف جس کے پردے اس صنعت کے ساتھ لٹکائے گئے تھے کہ اگر رات کا اجلاس ہو تو ان پردوں کو آدہ دیا جائے اور جالی سے چھن چھن کر تازہ ہوا آ سکے اور اگر دن کا اجلاس ہو تو دھوپ سے حاضرین کو بچانے اور پنڈال کو خنک رکھنے کے لیے یہ پردے کھول دیئے جائیں۔ پنڈال میں ہر طرف رومی قالین اور مخمل کے گاؤ تکیے نظر آتے تھے۔ صرف صدر منتخب کے لیے اس پنڈال کے اندر کارچوبی شامیانہ لگایا گیا تھا جس کے نیچے زرتار مسند اور تکیہ تھا اور سامنے ہی قد آدم ایک سونے کا پیچوان اور سونے کے خاصدان کے قریب سونے ہی کا اگالدان رکھا ہوا تھا۔ صدر کے علاوہ تمام حاضرین اور شرکائے اجلاس کے لیے چاروں طرف چاندی کے خاصدان اور پیچوان لگے گئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دور اگالدان نہایت سلیقے اور قرینے سے سجائے گئے تھے۔ وسط میں گلدانوں کی قطار اس طرح تھی کہ ہر گلدان کے بعد اگر کی بتیاں اور دیگر اقسام کی خوشبو جلانے کے لیے چلمچیاں رکھے ہوئے تھے اور چلمچی کے بعد ایک گلدان تھا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر موم بتیوں کے لالے روشن تھے اور پنڈال کو موم بتیوں کے ہزاروں جھاڑوں اور قندیلوں سے منور کر دیا گیا تھا۔

اجلاس کا وقت ۸ بجے شب مقرر ہوا تھا مگر ۵ بجے شرکا نے آنا شروع کیا اور دس بجے کے قریب تمام پنڈال معزز حاضرین سے بھر گیا اور ٹھیک ساڑھے دس بجے پہلا گولہ چھوٹا۔ پھر روشن چوکی نے ایک ترانہ گایا اور آخر میں نقیب نے بیچ پنڈال میں آ کر آواز لگائی ـــ

نگہ دار ہوشیار آتے ہیں
صدر عالی وقار آتے ہیں

یہ سنتے ہی تمام حاضرین بزم کھڑے ہو گئے اور پنڈال کے صدر دروازے سے زرق برق لباس پہنے ہوئے پہلے تو چوبدار داخل ہوئے اور درمیان میں صدر محترم تاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح خراماں خراماں تشریف لاتے۔ ہر طرف سے لوگوں نے جھک جھک کر سلام کیے اور خود صدر محترم نے سب کے سلاموں کا جواب جھک جھک کر، آداب بجا لا کر اور تسلیمات عرض کر کے، ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور مسکرا مسکرا کر دیا۔ اس کے بعد صدر محترم اپنی جگہ پر رونق افروز ہوئے اور آپ کے تشریف فرما ہوتے ہی تمام حاضرین بزم قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر دو زانو بیٹھ گئے اس کے بعد اجلاس کی باضابطہ کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی مجرا شروع کر دیا گیا۔ کچھ دیر تک لکھنؤ کی مشہور مغنیہ عشو جان نے موسیقی کے کمالات دکھا کر حاضرین محفل کو مسحور کیا۔ اس کے بعد عباسی اور ساگر کی دو چرکیاں چلیں۔ آخر میں میاں مصطفیٰ حسین کا مردانہ طائفہ آیا جس نے دور دور سے آئے ہوئے مندوبین کانگریس کو لکھنؤ کے بھانڈوں کا گرویدہ بنا دیا۔ اس لطف و رقص کا سلسلہ دو گھنٹے تک جاری رہا اور اس کے بعد کانگریس کے اجلاس کی باقاعدہ کارروائی اس طرح شروع کی گئی کہ صدر مجلس استقبالیہ نے حاضرین بزم میں سے ایک ایک سے اجازت طلب کرنے کے لیے

دہاں پر صدر محترم صاحب نے اجازت طلب کرکے اپنا خطبہ اس شعر سے شروع کیا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس شعر کو پڑھتے ہی تمام پنڈال ماشاء اللہ، واہ وا، کی صدا سے گونج اٹھا۔ اس شعر کے ختم ہونے سے کوئی اطلاع سامعین کو نہ تھا یا علم جو کسی کے دل میں ایسی بات تھی کہ صدر محترم اپنا خطبہ شروع کر رہے ہیں اور ادھر ادھر شاعر کی غزل ختم ہوئی، اس شعر کو پھر پڑھا اور شعر کے بعد اپنا خطبہ پڑھنا اسلامی تحریکات شروع کیا۔ اس خطبے نے ایک ایک حصہ پر صدر محترم نے واہ واہ کی داد پائی تھی اور صدر مجلس سے مخاطب ہو کر سلام کرنے کی کوشش داد تحسین بنا ہوا تھا جو خود کو بہت محترم ثابت کرتا۔ شاعر کے تقاضوں اور خطبے کے سلام کرنے اور داد وصول کرنے کے دوران ایک وجہ سے ایک گھنٹہ ختم ہوا اور خطبے کے ختم ہونے کے بعد بھی تحسین و آفرین کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ اس کے بعد صدر محترم کھڑے ہوئے اور آپ کے کھڑے ہوتے ہی حاضرین بھی کھڑے ہو گئے اور تعظیم کا سلسلہ صدر محترم کے اشارے سے بیٹھ گئے۔ اب صدر محترم نے حاضرین سے ہاتھ جوڑ کر اپنا خطبہ شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جس کا جواب سب نے داد جو دیا۔ بسم اللہ، اور سب اپنی اپنی جگہ پر خاموش ہو گئے۔ آخر تین چار مرتبہ تکلفاً اور شکر سے سوالات کرنے کے بعد صدر محترم نے فرمایا۔

آسمان بار امانت نتوانست کشید

اور اے حضور!

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اس شعر کا پڑھنا تھا کہ "اے سبحان اللہ" کا وہ فلک شگاف نعرہ بلند ہوا ہے کہ خود صدر محترم بھی تشریف رکھنے اپنی جگہ سے اور پھر زمانہ سنبھل کر آپ نے سلام کرنے شروع کر دیے۔ تین چار مرتبہ حاضرین مجلس کے اصرار سے اسی شعر کو پڑھنا پڑا۔ پھر بھی حاضرین نے یہی کہا کہ حضور سیر ہی نہیں ہوتی ایک مرتبہ اور مرحمت فرما دیجئے۔ آخر صدر محترم نے پھر یہی شعر پڑھا اور شعر پڑھنے کے بعد آپ نے خطبہ شروع کیا۔

"ہرچند کہ یہ خاکسار فرائض صدارت سے ناچار تھا۔ خود بھی علیل تھا اور رفیقہ بھی اس بیماری کا شکار تھا مگر آپ حضرات کا اصرار، اور پھر اس پر اصرار کی تکرار، مجبوراً مزید انکار سے قاصر تھا اور افتاں و خیزاں تعمیل حکم کے لیے حاضر ہوا۔"

حاضرین نے "کیا سلاست ہے اور کیا روانی ہے" کا نعرہ بلند کیا اور صدر محترم نے جھک جھک کر کلام کا تمام سلام وصول کرنے کے بعد پھر فرمایا۔

"آپ کے سر عزیز کی قسم کھاتا ہوں بلکہ ماما جان مرحوم کی روح پاک کو درمیان میں لاتا ہوں کہ میں ہرگز اس اعزاز کے قابل نہ تھا اور انکار میرا کسر نفسی میں شامل نہ تھا مگر آپ حضرات نے اس کو عذر لنگ جانا اور میرا کوئی حیلہ نہ مانا۔ مختصر یہ کہ اپنی تمام مجبوریوں کو بالائے طاق

"وہ کشاں کشاں جانب بزم کانگریس آنا پڑا۔"

حاضرین نے پھر "مصر۔ واقعہ ہے کہ سرق پر دے ہیں اور جواہرات جڑے ہیں" کی صدائیں بلند کیں اور صدرِ محترم نے شکریہ کو جوڑ کر "آپ عزت بڑھاتے ہیں" کہہ کر فرمایا:

"آج ہمارے پیشِ نظر جو سوال ہے وہ کوشش کے بعد آسان اور بغیر کوشش کے محال ہے۔"

حاضرین نے ہم آواز ہو کر کہا۔

"کیا کلیہ بیان فرمایا ہے حضور نے۔"

صدرِ محترم نے پھر مجمع کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

"باہمی اتفاق یعنی سدِ باب نفاق و شقاق ازبس ضروری ہے اور بغیر اس کے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں سخت دشواری ہے۔ ہماری راہ پُرخطر اور دشوار ہے۔ منزل دور ہے اور راستہ نا ہموار ہے۔ مگر کچھ بھی ہو اب ٹوٹنا ہے اور رشتا ہے یعنی ہر صورت مقدر کو آزمانا ہے۔ اگر ہمارے ارادوں میں استقلال ہے تو سمجھ لیجئے کہ درخشاں تیرا اقبال ہے۔"

"آمین! آپ کے منہ میں گھی شکر" کے نعروں سے پنڈال گونج اٹھا۔ صدر نے پھر فرمایا۔

"ہم کو آج یہ طے کرنا ہے کہ اب ہم کو زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے۔ ذلتوں کی انتہا ہو گئی۔ تحقیر حد سے سوا ہو گئی۔ ہم شہزادے ہو کر بات بات کا محصول اور لگان ادا کریں۔ ہم سے محصول اور لگان مانگنے والے خدا غارت کریں۔ کہا جاتا ہے کہ پیٹ کاٹ کر اور بچوں کی پائیاں بند کر کے مالیہ کی ادائیگی کا انتظام کریں گویا ہم اپنی جان سے جائیں۔ جان دے دیں اور جزیہ نصیبِ اعداء ہو۔"

حاضرین نے "دور باش جان بچی سو مدعی" کا نعرہ بلند کیا اور صدرِ محترم نے پھر اپنا خطبہ شروع کیا۔ اس خطبہ میں شروع سے آخر تک اس قسم کی شکایتیں تھیں کہ جب حکومت ہماری ہے اور ہم خود شاہزادے ہیں تو ہم مرغ کی پائیوں کا ٹیکس، جھریانی اور کنکوے بازی وغیرہ کے محاصل کیوں ادا کریں۔

یہ خطبۂ صدارت تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہوا اور آخر میں جناب صدر بندہ ہائے تحسین و آفرین کے درمیان سلام کرتے ہوئے تھک کر اور خستہ ہو کر پسینہ پسینہ ہو کر بیٹھ گئے۔ چوبداروں نے پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ کوئی برف آب لے کر دوڑا تو کسی نے خاصدان پیش کیا۔ آخر دس پندرہ منٹ کے بعد صدرِ محترم کے حواس بجا ہوئے اور اس کے بعد اجلاس کی ایجنڈے کے مطابق کارروائی شروع ہوئی۔

سب سے پہلے دربارِ شاہی میں نیابت کا مسئلہ تھا۔ شاہی خاندان کے دیگر نواب زادگانِ وقت کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کو بھی دربار میں کرسی نشینی کے ۲۴ فیصدی حقوق دیے جائیں۔ چنانچہ نواب زادگانِ اودھ کی طرف سے جس وقت اس سوال کو لے کر نواب ولایت مرزا صاحب کھڑے ہوتے ہیں اور حاضرینِ محفل کو جھک جھک کر سلام کیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی وقت سے ایک عجیب سماں بندھ گیا تھا۔ آپ نے سب سے پہلے تو اپنا جیرا اپنے خدمتگار کو دیا۔ اس کے بعد اب مدلل، مقفیٰ اور مسجع تقریر جب دربارِ شاہی میں اپنے ۲۴ فی صدی حقوق پر زور دیا اور آدھ گھنٹے تک تقریر کرنے کے بعد شہزادہ والاتبار، برہان الدولہ نواب فلک رفعت بہادر

[illegible] آپ [illegible] پیش کریں۔ آپ [illegible] اور مدت [illegible]
[illegible] ہے " [illegible] " اور [illegible]
[illegible]
[illegible] کے بعد فرمایا۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کا حال ہے [illegible]
[illegible]
[illegible] تشریف [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] یہ تسلیم کرتے ہیں۔
[illegible] اتفاقاً یہ ہو رہا ہے [illegible] کہ تجویز متفقہ طور پر منظور ہو گئی مگر
ایجنڈا میں اب آزادی کامل کی تجویز تھی۔ امید تھی کہ اس پر بہت [illegible]
سوال یہ تھا کہ آخر اس تجویز کو کس صورت میں کون سی جماعت پیش کرے۔ نواب زادگان نے شہزادوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"حضرت پہلے آپ آزادی حاصل کریں"

شہزادوں نے کہا "نہیں پہلے آپ"

نواب زادوں نے کہا "پہلے آپ"

شہزادوں نے کہا "یہ واقعی نہ ہوگا، پہلے آپ" آخر اسی پہلے آپ اور نہیں حضرت پہلے آپ میں صبح ہو گئی اور جلسہ ختم ہو گیا۔

اس طلسم خیال کو توڑیے اور بتائیے کہ ایسی بھیڑ کانگریس کے مقابلہ میں جس کا نازک تصور جو دماغ میں محدود تخیل رہ گیا ہے ہم کو باوجود تمام تیاریوں اور رونقوں کے یہ کہنا [illegible] قسم کی کانگریس کیونکر پسند آسکتی تھی یا کسی ایسے شخص کو اس قسم کی کانگریس سے کیونکر پسند آسکتا ہے جس کا دماغ حیدرآباد کے تصور سے معطر ہو رہا ہو۔

—— ——

پرابلم

جس کا وطن غریب الوطنی ہو وہ اپنے کندھے پر اپنا مکان تلاش نہیں کرتا بلکہ خانہ بدوشی پر ایسا اتراتا ہے گویا اسی سے وطن کے تمام حقوق حاصل کرکے رہے گا۔ معلوم نہیں یہ بات ہم نے انگریزوں سے سیکھی ہے یا ہر انسان فطرتاً مگر غیر محسوس طریقہ پر انگریز ہوتا ہے۔ بہرصورت کچھ بھی ہو حال یہ ہے کہ اٹھائیس سال تک لکھنؤ میں مہمان رہے۔ وطن پردیس اور پردیس وطن بنتا رہا۔ بیگانگی یگانگت بن گئی۔ نام کے ساتھ لکھنوی لکھ لکھ کر لکھنوی بنتے رہے۔ و مسافرخانہ میں پڑے رہے۔ اسی سرائے میں شادی بیاہ سے فارغ ہوئے۔ اسی ڈاک بنگلہ میں بچوں کے باپ تک ہوگئے۔ اور عین اس وقت جبکہ لکھنؤ قریب قریب وطن بن چکا تھا۔ ازلی خانہ بدوشی نے پھر کروٹ لی۔ پیروں کے سنیچر نے دشتِ غربت کی راہ لی اور اب جو آنکھ کھلی تو ہم لاہور میں تھے۔

لاہور آکر نیا دانہ نیا پانی نئے آدمی نئے جانور۔ یہاں تک کہ ادب بھی نیا ملا۔ مگر طے تھا کہ اس نئی نویلی غربت کو پرانے بال بچوں کے ساتھ گھر بنا کر رہنا ہے۔ فکرِ آشیانہ کیجئے یا اندازہ نے دولت خانہ۔ مختصر یہ کہ سر چھپانے کی جگہ درکار تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک پردیسی اس قسم کے وانق کارانہ کام نہیں کرسکتا۔ لہٰذا نئے ہمدردوں اور پرانے دوستوں سے اس کارِ خیر میں امداد کی مہم لے کر روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے جن بزرگِ محترم کے دروازہ پر دستک دی تھی ان سے مراسم کچھ ایسے ویسے نہ تھے ہم دونوں تو ہم دونوں ہمارے والد بھی آپس میں دوست تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی "اخاہ" کا نعرہ بلند کرکے لپٹ گئے۔ پہلے کرسیاں نکلیں۔ پھر شکنجبین کی بارش شروع ہوئی۔ پھر سگریٹ کی ژالہ باری ہوئی۔ مختصر یہ کہ عجیب خوشگوار ملاقات تھی۔ دل خوش ہوگیا۔ پردیس میں ایسے ہمدم و ہمدرد کا ملنا واقعی مسیحا اور خضر کی ملاقات سے بہتر ہے۔ مکان تو مکان اس سے تو اگر ہم جان تک مانگیں تو یہ عذر نہیں کرسکتے۔ ہوٹل میں ٹھہرنے ہی پر ایسے خفا ہوئے کہ مشکل راضی ہوسکے۔ کہنے لگے "اچھا کھانا کل ساتھ کھاؤ"

عرض کیا "بھائی جان میں مہمان بن کر نہیں آیا ہوں، وبالِ جان بن کر حاضر ہوا ہوں" یہ کہہ کر تمام حالات سنا دیئے کہ اب مستقل طور پر یہیں رہنا ہے اور جب ٹیپ کا بند عرض کیا کہ فوراً مکان دلوائیے ڈھونڈھ کر تو ایک دم رخِ روشن کی تمام روشنی غائب۔ دیر تک آسمان کی طرف دیکھتے رہے گویا جاتے ہیں عالمِ بالا میں مکان تلاش ہو رہا ہے

جن والے ہوٹل والے گائڈ سے مکان کا پتہ پوچھ لے۔ مگر ان کا چہرہ کچھ متغیر سا ہو گیا۔ ایک ہلکی سی ہنسی ہنس کر شگفتہ انداز سے بولے "مکان؟"

عرض کیا۔ "جی ہاں مکان۔ یہی جو مکان ہوتا ہے نا۔ رہنے کے لیے کرایہ کا مکان۔ یہی جائے سکونت کے لیے ہو؟"

اُس عالم جوش میں فرمایا: "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ سوچ لیجیے کہ مکان تو آج کل بڑا پرابلم ہے۔ جناب؟"

ہم نے عرض کیا۔ "یہ حال؟"

ہوشیار ہو کر: "مطلب یہ کہ غور کر لیجیے گا؟"

ہم نے حیرت سے گزارش کی۔ "غور کس بات پر کروں۔ یعنی یہ کہ مکان ہونا چاہیے یا نہیں۔ ان حضرات کی کوشش تو یہ ہے کہ مکان ضرور چاہیے؟"

نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد فرمایا: "بڑا پرابلم ہے صاحب بڑا پرابلم۔ بہر حال اور لوگوں سے بھی بہت زیادہ میں بھی کوشش کرتا ہوں؟"

ان حضرت کے وعدے میں جو کرو وعدہ کا اور اخلاق کا وہ ہم آ رہا تھا۔ ہم نے دفعہ دوسرے لوگوں سے بھی مکان کی ایمانداری کے ساتھ بات کی مگر مصیبت یہ ہے کہ جیسے لوگ ہمیں ملتے جاتے ہیں اُن سے ہم کو مکان ڈھونڈ ... مگر وہ جو شخص مشہور ہے جو زندہ یا بندہ "ایک بڑے ہوٹل کے گائیڈ" یہ گائیڈ قسم کے حضرات مسعود اور ہمدرد آدمی ہیں خصوصاً ہمارے ساتھ تو اسٹیشن پر اس اخلاق سے پیش آتے تھے کہ ان کا بس چلتا تو ہمارے ضروری اسباب اٹھا لیتے۔ جب ہمارے برابر خیریت پوچھ لیا کرتے تھے اور خدمات کا فقرہ بار بار دہرایا کرتے تھے۔ آخر ہم نے اُن سے عرض کر دیا کہ "بھائی صاحب سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ مکان دلوا دیجیے کوئی؟" پہلے تو وہ منہ کھول کر اس طرح رہ گئے گویا اس وقت ہم کو آنکھوں کے بجائے منہ سے گھور رہے ہیں۔ پھر تعجب سے بولے "مکان یعنی مکان آخر کیوں؟"

ہم نے اپنا مفہوم واضح کرتے ہوئے کہا۔ "یعنی رہنا ہے نا۔ تو اس لیے مکان چاہیے ہے ہم کو؟"

کچھ ڈرے ہوئے انداز سے فرمایا۔ "آخر آپ کو ہوٹل سے کیا شکایت ہے؟"

ہم نے سمجھ کر بڑے تدبر سے کہا "او ہو، آپ غلط سمجھے، ہوٹل کی بات نہیں ہے بلکہ اب مستقل طور پر لاہور میں رہنا ہے۔ بال بچوں کو بلانا ہے۔ اس لیے کرایہ کا مکان چاہتا ہوں؟"

گائڈ صاحب نے اب پھر سے اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "ہوں۔ ہوں تو گویا مکان۔ مگر صاحب مکان ——— ہے ———"

ہمارے دل نے باقی جملہ پورا کر دیا ——— بڑا پرابلم ——— ہے

گائڈ صاحب کہہ رہے تھے۔ "مگر خیر یہ جلدی کا کام نہیں ہے۔ فی الحال آپ ہوٹل ہی میں رہیے۔ ہم برابر مکان

کی فکر کروں گا۔"

ظاہر ہے کہ ان حضرت نے محض اپنے ہوٹل کی وجہ سے یہ بات کہی تھی۔ ان کو بجائے مکان کے زیادہ ہوٹل کی فکر ہونا چاہیے۔ ان سے ہمارا مطالبہ ہی غلط تھا مگر اس طرح اندھے تو ہوتے ہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بیوقوف بھی ہونے کی سعی بلیغ فرماتے ہیں۔ خیر یہی غنیمت ہے کہ اس حماقت کا اس قدر جلد احساس ہو گیا۔ چنانچہ اب کی مرتبہ ہم نے سمجھ بوجھ کر ایک ایسے شخص سے مکان کے متعلق کہا جس کے انتخاب پر خود ہم کو ناز ہے۔ چشمہ لگا کر آنکھوں کی کمزوری کا علاج کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نظرِ انتخاب بھی کمزور ہے۔ ہوا یہ کہ حضرت جوابی تار آیا تھا۔ اسی ہوٹل کے پتہ پر فوراً خیریت لکھو۔ طریقہ یہ ہے کہ تار والے کو کچھ نہ کچھ اس بات کا انعام دیا جاتا ہے کہ وہ ان کے مرنے کا تار نہیں لایا۔ چنانچہ ہم نے بھی بزرگوں کی اس رسم کو قائم رکھا۔ تار والا تھا شریف آدمی، نہایت اخلاق سے "اس کی کیا ضرورت ہے صاحب جی" کہہ کر انعام پھیر دیا۔ ہم نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔ یہ تو خیر یوں ہی ہے البتہ اگر مکان دلوا دو کہیں سے ہم کو تو پھر انعام دیں گے۔ اس نے چشمہ کی اوٹ سے ہم کو اس طرح دیکھا گویا ہمارے متعلق یہ غور کر رہا ہے کہ اس شخص کے متعلق مکان میں رہنے کا ٹھیک کہا جا سکتا ہے یا پنجرہ میں رہنا۔ بالتفصیل طور پر غور کرنے کے بعد تار کی زبان میں ارشاد فرمایا "مکان اچھا جی" تار کی عبارت غیر متعلق لوگ ذرا کم سمجھتے ہیں مگر ہم ٹھہرے اہل معاملہ فوراً سمجھ گئے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ وہ بے چارہ سلام کر کے رخصت ہوا اور ہم پھر ان لوگوں کی تلاش میں نکل گئے جن کے متعلق مکان کی تلاش کے سلسلہ میں ذرا بھی شبہ ہو سکتا تھا۔ تفصیلات سے نہ آپ کو دلچسپی ہوگی نہ میں اپنی نجی باتیں بتانے کا شوقین ہوں۔ البتہ اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ایک لسّی والے سے مکان کے بارے کہا اور محض یہ کہنے کے لیے لسّی کا ایک گلاس پینا پڑا۔ ایک ہیر کٹنگ سیلون میں تفصیلات سے مکان کی اپیل کرنے کے لیے بال بنوا ڈالے۔ ایک تانگہ والے کے چہرے پر "ٹو لیٹ" کا سائن بورڈ نظر آیا لہٰذا ایک گھنٹہ کا کرایہ اس کو دے دیا۔ ایک دن۔ دو دن۔ تین دن یہاں تک کہ اسی جستجو میں صبح ہونے لگی اور شام ہونے لگی مگر مکان نہ آج ملنا ہے نہ کل۔ ملی ملائی اچھی خاصی ملازمت کو چھوڑ کر بھاگنے کی ٹھانی۔ اپنے آقائے نامدار سے بھی مکان کی مشکل کے مقابلہ میں ملازمت سے دست برداری کے آسان ہونے کا اظہار کر دیا۔ مگر اس سلسلہ میں اس کثرت سے "پرابلم" کا لفظ سنا ہے کہ اب تو یہ شبہ ہونے لگا ہے کہ کہیں پنجابی زبان میں انگریزی کے اس لفظ کے معنی مکان ہی کے تو نہیں ہیں۔

جستجو پر ایک وقت وہ بھی گزرتا ہے جب جستجو کرنے والا تھک کر بیٹھ رہے اور منزل خود اُسے ڈھونڈنے نکلے۔ چنانچہ ہم اس کمال کو بھی آخر پہنچ ہی گئے۔ گھر خط لکھ دیا کہ نوکری مل گئی ہے مگر تم سب کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس لیے کہ مکان نہیں ملتا۔ ارادہ کر لیا کہ کسی ہوٹل ہی کو اپنا یتیم خانہ بنا لیں گے۔ ایک ہوٹل سے بات چیت بھی کر لی۔ اب خدا کی دین ملاحظہ ہو کہ مکان ملنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے کمانڈر صاحب نے ایک مکان کا مژدہ سنایا ہم نے بے اختیار ان کو کلیجہ سے لگاتے ہوئے عرض کیا کہ یوں نہیں جناب پہلے آپ یہ کہیے کہ کل صبح ہی میرے ساتھ زحمت فرمائیے۔ اس کے بعد ہم دونوں چلیں گے مکان دیکھنے۔ وہ فرشتۂ رحمت تو تھے ہی ہماری محبت کو بھلا کیسے

[illegible] چھوڑ کر چلے گئے۔ [illegible] [illegible] ایک [illegible] [illegible] پر [illegible] [illegible] ایک کمرہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہونا چاہئے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

ہم نے سوچا کہ چلیں مکان [illegible] دیکھیں۔ [illegible] صاحب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس بیچارے نے بھی محبت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مکانات کیسے [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ناشناس ہے۔ [illegible] [illegible] ہم اس کے تانگہ پر روانہ ہوئے۔ چلا چل۔ چلا چل۔ شہر کے تمام محلّے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ یہاں تک کہ [illegible] کی تمام آبادی وہاں ختم ہو گئی۔ مگر ہمارے مجوزہ دولت خانے کا کہیں پتہ نہیں۔ تانگہ ہے کہ چلا جاتا ہے۔ ادھر ہم ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ اس سے پوچھیں تو سہی کہ آخر ارادہ کیا ہے۔ مگر پھر خود ہی اپنے [illegible] [illegible] کر رہ گئے۔ کہ اس بیچارے نے تو ہماری محبت میں اتنی دور تک خاک چھان کر جا کے یہ مکان ڈھونڈا ہے۔ ادھر ہم اس کے جذبہ کی یہ قدر کر رہے ہیں کہ ذرا سے فاصلہ ہی کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ غالباً اس غریب کو پتا تھا "کمانہ آبادی" لہٰذا وہ بخطِ مستقیم چلا جا رہا تھا۔ لاہور میں اس کو مکان نہ مل سکا تو اس نے کسی اور شہر میں سہی۔ بہرحال مکان ڈھونڈھا۔ آخر خدا خدا کر کے اب اس نے مڑ کر گویا گلیاں دریافت کیں۔ ایک گلی سے دوسری میں، دوسری سے تیسری میں اور تیسری سے چوتھی میں جا کر ایک جگہ تانگہ روک کر کہا: "یہ ہے سامنے والا مکان"

ہم نے چاروں طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا: "کون سا مکان؟"

اطمینان سے کہنے لگا: "وہ جو ٹاٹ کا پردہ سامنے پڑا ہے نا، بس اسی کے اندر ایک طرف کو مکان ہے"

ہم نے اس ٹاٹ کے پردے کو دیکھا جو ایک آبنائے پر اس طرح پڑا ہوا تھا گویا جہاز ڈوب چکا ہے صرف اس کا پھریرا باقی رہ گیا ہے۔ ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ اور یہاں ہیرا کی سے قطعاً ناواقف۔ مرتے کھپتے۔ دیوار سے چپکے ہوئے اس ٹاٹ کے پردے تک پہنچے اور اندر جو جھانک کر دیکھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مالکۂ مکان ایک بڑی جماہی بکری سے کان میں کچھ باتیں کر رہی تھیں تاکہ ان کی مرغیاں نہ سننے پائیں۔ ہم کو دیکھتے ہی اندر بلا لیا اور مکان دیکھنے کی غرض

معلوم کہنے کے بعد بولیں:

"یہی ہے بیٹا مکان دیکھ لو۔ میرا کیا ہے میں ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔"

وہاں سے جو بھاگے ہیں تو ہوٹل کے پاس پہنچ کر اس وقت ہوش بجا ہوئے جب تانگہ والے کو ساڑھے تین روپے مکان کی رونمائی کے سلسلے میں دینا پڑے مگر اطمینان تھا کہ یہ مکان تو نظر بھاؤ بھا ہے۔ اصل میں تو صبح دیکھیں گے گائڈ صاحب کے ساتھ۔

صبح گائڈ صاحب نے بیدار ہو کر جب المکلف الخدمت کو رہینِ منت فرمایا تو مکان دکھانے لے چلے۔ یہ مکان یقیناً کسی زمانے میں مکان تھا۔ غالباً نانا : زمین کے زمانہ میں اس کی پہلی مرتبہ مرمت ہوئی تھی۔ آسانی صرف یہ تھی کہ اس میں رہ کر انسان اپنی اس نخوت کو بھول سکتا تھا جو باوجود اشرف المخلوقات سمجھ سمجھ کر اپنے اوپر طاری رکھتا ہے۔ گائڈ صاحب نے نام کے ساتھ "تھانوی" دیکھ کر غالباً یہ سمجھ لیا تھا کہ ان حضرت کو اصطبل درکار ہے۔ آفتاب کی روشنی سے آنکھوں کو جو تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے پورے بچاؤ کا انتظام تھا۔ ہوا لگ جانے سے جو بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کا بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہر کمرہ غسل خانہ اور ہر غسل خانہ آسانی سے کمرہ بن سکتا تھا۔ نمی اس قدر تھی کہ خس کی ٹٹیوں کا خرچ آسانی سے بچایا جا سکتا تھا۔ ہر کمرے کا فرش ایسا کہ چاہے کھیتی باڑی شروع کر دیجئے، چاہے پھول دار چمن بنا لیجئے۔ مختصر یہ کہ ہم نے مکان دیکھنے کے بعد گائڈ صاحب کا منہ جو دیکھا تو دونوں میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ وہ بھی عجیب آثارِ قدیمہ بنے ہوئے کھڑے تھے۔ مزہ یہ کہ ہم کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا:

"کیا رائے ہے؟"

ہم نے کہا "مکان کے متعلق تو بعد میں عرض کروں گا پہلے تو مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ آپ کی کیا رائے ہے میرے متعلق؟"

صاف گوئی تو دیکھئے کہنے لگے "آپ اچھے رہیں گے اس میں۔"

ہم اپنے کو سنبھالتے ہوئے اس مکان سے نکل آئے اور اس کے بعد سے گائڈ صاحب کی صورت سے وہ نفرت ہوئی ہے کہ اگر مکان فوراً مل نہ جاتا تو عدمِ تشدد پر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ جیل میں رہنے کا انتظام ہو ہی جاتا۔ مگر شکر ہے کہ سب سے پہلے دوست نے آخر ایک جگہ تلاش کر دی اور ہم سے دوستی کے نام پر اپیل کی کہ ہم اس جگہ کو مکان سمجھیں۔ اس میں کمرے بھی ہیں، دروازے بھی، چھت بھی ہے اور غسل خانے بھی۔ کوٹھڑیاں بھی ہیں اور باورچی خانے بھی مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس کو مکان نہیں کہا جا سکتا البتہ کہیے تو "پرابلم" کہہ دیا کریں۔

اب سنیئے دیگر پرابلموں کی ریل پیل:۔

"مکان تو مل گیا ہے اب ملازم دلوائیے۔"

"جی کیا کہا۔ ملازم؟ ملازم تو بڑا پرابلم ہے۔"

"مکان اور نوکر تو آپ کی دعا سے مل گئے ہیں البتہ ضرورت کی بعض چیزیں نہیں ملتیں مثلاً گھی۔"

• مجھے ——— مجھے تو جانا پڑتا ہے :
• اچھا صاحب والسلام۔ ہم بنا پیتی ہو کر رہ گئے۔ مگر شکریہ :
• شکریہ ... چاہئے ہے کہ ——— صاحب یہی تو بڑا پرابلم ہے :
مجھ سے کہا۔ السلام علیکم۔ جیسے کہے ہیں جانے کا۔ تو حاصل کرتے ہیں ... بالکل کس سے ... ہے :
• خدا جانتا ہے اس فکر میں ابھی تک ہوں کہ ... کا مسئلہ بڑا پرابلم ہے :

مختصر یہ کہ وہ اللہ والا نہ جو جیتے ہیں پرابلم ہو ان سے پرابلم ... اس پر جھک... ہونے کی وجہ سے عجیب اب وہ ہر بات پر پرابلم چسپاں کرنے کی مصیبت تو اس پرابلم ... سب سے حل ہو جاتے تو پرابلم نہ حل ہو تو پرابلم۔ پہلے تو صبر کر لیا تھا کہ شاید صرف مکان کی کہانی ہی پرابلم کہتے ہیں مگر اب تو معلوم ہوا ہے کہ یہ سب ہی کو پرابلم کہا جاتا ہے کا جہاں ان پرابلموں کے مارے ہم خود ہی حل ہوتے جاتے ہیں۔

کچھ یادیں، کچھ باتیں

اودھ اخبار صحافت کی وہ اونچی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی ادارت مل جانے کو ہی اردو صحافتی معراج سمجھا جاتا تھا۔ اس کی کرسی پر ایسے ایسے نامور لوگ رہ چکے تھے جن کے ڈنکے ہمارے ادب میں آج تک بجتے ہیں۔ مگر اودھ اخبار کا حکمران دور ختم ہونے کے بعد پتہ چلا کہ اب تو یہ روزنامہ محض ایک روزگار بن چکا ہے۔ مطبع نولکشور کے مالکوں کو اس سے کوئی بحث ہے کہ اس کی اشاعت کیا ہے نہ اس سے کوئی بحث ہے کہ یہ کتنے نقصان پر چل رہا ہے وہ تو بس اس کو نولکشور کی پرانی یادگار کے طور پر نکالے جا رہے تھے نہ اس کی کہیں کوئی ایجنسی تھی نہ خود لکھنؤ کے کسی بازار میں فروخت ہوتا تھا بس چار پانچ سو پرچے وضعداری کے طور پر چھاپے جاتے تھے، ورنہ خدا جانے کہاں چھپا دیئے جاتے تھے نہ اس کے کسی شہر قصبہ یا گاؤں میں نامہ نگار تھے نہ کسی اور ہی ذریعے سے خبریں فراہم ہوتی تھیں۔ ہوتا صرف یہ تھا کہ صبح تڑکے لکھنؤ میں شائع ہونے والے انگریزی اخبارات آ جاتے تھے اور ان کی تھوڑی بہت خبریں الٹا سیدھا ترجمہ کر کے نہایت آسان کتابت کے ساتھ شائع کر دی جاتی تھیں۔ چند مراسلہ نگار جن کے مراسلے دوسرے اخبارات شائع نہ کرتے تھے اپنے مراسلے بھیج دیا کرتے تھے۔ ایک ایڈیٹر ہوتا تھا اور دوسرا اس کا نائب۔ یہ دونوں مل کر ہی ان خبروں کا ترجمہ کیا کرتے تھے اس کے بعد ایڈیٹر صاحب اداریہ لکھنے بیٹھ جاتے تھے اور نائب صاحب قینچی ہاتھ میں لے کر ڈاک میں آئے ہوئے تبادلے کے اخبارات کی قطع و برید درج کرتے تھے لیکن اگر سچ پوچھئے تو اس سارے عملے میں کام کے صرف ایک ہی بزرگ تھے جو اپنے منصب کے اعتبار سے تو کاتب تھے مگر تھے ہر مرض کی دوا۔ اسم مبارک تھا منشی ہزاری لعل اور تخلص تھا شوخ۔ کتابت اور شاعری تو یہ خیر کرتے ہی تھے مگر اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ مثلاً ایڈیٹر صاحب کی طبیعت موزوں نہیں ہے یا وہ اپنے نائب کے ساتھ تاش کھیل رہے ہیں تو منشی ہزاری لعل شوخ ہی ایڈیٹوریل بھی لکھ دیا کرتے تھے اور اس ایڈیٹوریل کا کوئی جداگانہ مسودہ نہ ہوتا تھا بلکہ وہ براہ راست کتابت ہی کرتے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دفتر میں اگر کسی کا دبدبہ تھا تو منشی ہزاری لعل شوخ کا، جو نہ ایڈیٹر کو خاطر میں لاتے تھے نہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کو بلکہ ان کو یہ بھی اختیار حاصل تھا کہ وہ ایڈیٹر صاحب کے لکھے ہوئے اداریہ میں جہاں چاہیں اصلاح کر دیں اور ایڈیٹر کو بتا دیں کہ یہ بات تم نے غلط لکھی تھی جس کو میں نے یوں صحیح کر دیا ہے اور بیچارے ایڈیٹر کو صرف مسکرانا پڑتا تھا ورنہ منشی ہزاری لعل شوخ اس کو آٹھ آٹھ آنسو رُلانا بھی جانتے تھے۔

اور [illegible] کے بعد جب [illegible] میں نے [illegible]۔ جب [illegible] میں نے [illegible]
[illegible] میں پھنسا ہوں اور ان حالات میں [illegible] کام ہو سکے گا۔ منشی پریم چند [illegible]
[illegible] تصنیف [illegible] اخبار [illegible]
[illegible] کی تفصیلیں ان کو بتا کر ان سے مشورہ لیا۔ [illegible]
[illegible] صاحب [illegible]
[illegible]
کا جو تصور [illegible] دائرہ میں [illegible] منشی نول کشور [illegible]
[illegible] اخبار کی [illegible] نہیں [illegible]
بنا چاہیے اس لیے کہ اس سے اس [illegible] منشی نول کشور [illegible] کے علاوہ [illegible]
[illegible] نہیں ہے۔ میں نے منشی پریم چند سے [illegible]
[illegible] گا اور یہ حرام کی [illegible] مجھے کیسے ہضم ہوگی [illegible] خندہ پیشانی سے [illegible]
[illegible] اور آپ یہ دعوے [illegible] کرتے ہیں [illegible] اور آپ اس کے لیے ایک اسکیم [illegible]
بنائیے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ وہ اسکیم آپ [illegible] منشی بشن نرائن بھارگو کے سامنے پیش کر دوں گا۔ [illegible]
کہا یا جا سکتا ہے [illegible] گا۔ منشی پریم چند کے اس [illegible] ایک [illegible] اسکیم [illegible]
ہے۔ میں اس طرح اس کی [illegible] چاہتا ہوں۔ [illegible] کی [illegible] چاہتا ہوں۔ [illegible]
کے علاوہ اپنے مقالے [illegible] چاہتا ہوں۔ اخبار کی ترتیب، کتابت، اور طباعت میں یہ انقلاب چاہتا ہوں اور سب سے بڑی
بات یہ کہ منشی بنواری لعل کو یا تو بالکل ہی نہیں چاہتا یا صرف ایک کاتب کی حیثیت سے چاہتا ہوں جس کا اور کسی بات میں
کوئی دخل نہ ہو سکے۔ منشی پریم چند نے پوری اسکیم نہایت توجہ سے سنی۔ منشی بنواری لعل والے حصے میں یہ ترمیم کی کہ ان کا نام
نہ لکھو بلکہ یہ لکھو کہ دفتر کا نظم و ضبط صرف اسی صورت سے قائم رہ سکتا ہے کہ عملے کے لیے ایڈیٹر کے احکامات اور ہدایات
کو قطعی سمجھا جائے اور اس میں کسی کو مداخلت کا مجاز نہ سمجھا جائے۔ ایڈیٹر کو اپنے عملے کے تقرر اور برخاستگی کے کل اختیار
حاصل ہوں۔ میں نے اس ترمیم کو اپنے اختیارات کے لیے اور بھی مستحکم سمجھ کر قبول کر لیا چنانچہ منشی پریم چند کی معیت میں منشی
بشن نرائن بھارگو مالک مطبع کے سامنے میری پیشی ہوئی جہاں سب سے پہلے منشی پریم چند نے ایک نہایت مختصر سی تمہیدی
تقریر کی۔ اس کے بعد میری اسکیم ان کے سامنے پیش کر دی گئی۔ بدقسمتی سے اس وقت بھارگو صاحب ولایت جانے کی
تیاریاں کر رہے تھے اور ان کے ذہن میں گھوڑ دوڑ کا اصطبل کھلا ہوا تھا انہوں نے اسکیم لے کر کہہ دیا کہ میں اس پر غور
کر دوں گا۔

میں نے منشی پریم چند کے مشورے سے منشی بنواری لعل شوخ سے نہایت روادارانہ تعلقات قائم رکھے یہاں تک
میرے فرائض میں یہ بھی شامل ہو گیا کہ روزانہ ان کی ایک تازہ غزل سنا کروں اور اس کی بے حد داد دیا کروں۔ ایک

دیوان ایک نہایت خوب صورت فریم میں ایک نہایت طویل فارسی کا قصیدہ سے آئے جو شاہ نادر شاہ والئی افغانستان کی شان میں تھا اور منشی ہزاری لعل شوخ نے جشن تخت نشینی کے موقع پر بھیجا تھا۔ شان منعم دہلی کے قونصل سے ملنا چاہتے تھے۔ نہایت زبردست فارسی تھی اور قصیدہ کی بلاغت کی آبیاری کا اس سے بڑا نمونہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا مگر جب منشی ہزاری لعل شوخ نے وہ قصیدہ بھیجا تو کچھ ہی دن بعد ان کو ایک [illegible] وصول ہوا جس میں دربار افغانستان کی طرف سے ایک پروانہ خوشنودی تھا، ایک پارچہ قلم اور ایک سونے کی گھڑی۔ اب یک تھا ہے تو منشی ہزاری لعل شوخ بہت خوش ہوئے تھے کہ ان کی شان میں ہم سب قصیدے کہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ منشی ہزاری لعل شوخ کی شاعری نے مجھ کو اب عاجز کیا کہ میں نے منشی پریم چند سے تقریباً [illegible] سب گزشتہ کہ جب تک بھارگو صاحب اس سکیم پر غور کر رہے ہیں تم سے کہ مجھ کو منشی ہزاری لعل شوخ کی شاعری سے نجات دلا دو۔ مجھے چنانچہ منشی پریم چند نے اردو جو اتنا ہے [illegible] کا معائنہ کیا۔ اسی وقت [illegible] کا کمرہ میرے کمرے سے ملا ہوا ہونا چاہئے۔ اور اس طرح میں منشی ہزاری لعل شوخ کی دسترس سے نکل جاؤں گا۔

میں منشی پریم چند سے زیادہ سے زیادہ قریب پہنچ گیا تھا اتنا قریب کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہی بیٹھے پوچھا کیا کرتے تھے کہ کبھی شوکت صاحب حضرت آدم کی [illegible] دریافت کر لیا کرتا تھا کہ رکشا بندھن کی تاریخ کیا ہے۔ اور وہ کبھی میرے کمرے میں آکر اور کبھی مجھ کو اپنے پاس بلا کر بڑی تفصیل کے ساتھ اس قسم کی معلومات فراہم کرتے رہتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگ خیال کے مدیر حکیم یوسف حسن صاحب نے مجھ کو ایک خط لکھا کہ میرا ایک کام کر دو۔ منشی پریم چند سے ایک افسانہ کر میرے نام وی۔ پی کرا دو۔ چنانچہ مجھ کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ افسانے اور مضامین بھی وی۔ پی کئے جاتے ہیں۔ میں نے منشی پریم چند سے کہا تو وہ کچھ جھینپ سے گئے اور بڑی دیر کے بعد کچھ عجیب شرماتے ہوئے انداز سے کہا کہ [illegible] دشوار مرحلہ ہوتا ہے کہ مثلاً آپ کے ذریعہ سے فرمائش آئی ہے تو میں کیونکر وی۔ پی بھیجوں اور بھیجوں بھی تو کس رقم کا۔ بہرحال میں افسانہ لکھے دیتا ہوں پھر دیکھا جائے گا۔ اور دیکھا یہ گیا کہ بہت شرماتے ہوئے ایک دن منشی پریم چند نے پچاس روپے کا وی۔ پی بھیجا جو فوراً وصول کر لیا گیا۔ اس زمانہ میں ناول و مضامین کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور معاوضہ بھی اتنا کہ شرماتے ہوئے بھی گویا بڑی رعایت کے ساتھ پچاس روپے۔

سچی بات یہ ہے کہ مجھ کو تو منشی پریم چند پر بہت ہی رشک آیا اور ادبی رسائل سے مضامین کا معاوضہ لینے کی راہ منشی پریم چند ہی نے مجھ کو سجھائی تھی مگر ایک افسانہ کا معاوضہ پچاس روپے دینے والے تو آج بھی شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

وہ اسکیم جو میں نے منشی پریم چند کے ساتھ جا کر بھارگو صاحب کو دی تھی اس کا کچھ نتیجہ بعد میں پتہ چلا کہ وہ بھارگو صاحب نے اپنے نہایت قریبی دوست رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف ہسٹری آف اردو لٹریچر کو غور کرنے کے لیے دے رکھی تھی چنانچہ منشی پریم چند نے ایک دن مجھ کو یہ پیغام دیا کہ تم کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے طلب کیا ہے جو اصلاً تو ڈپٹی کلکٹر ہیں مگر آج کل حکومت صوبجات متحدہ کے محکمہ اطلاعات کے افسر اعلیٰ لگے ہوئے ہیں اور پھر ان کے متعلق مجھ کو چند موٹی موٹی باتیں سمجھا دیں کہ وہ آدمی نہایت علامہ قسم کے ہیں چنانچہ تم پر فرض ہے کہ تم ان کو علامہ سمجھو اور ان کو یقین دلا دو کہ اگر

[illegible] اردو کا یہ تذکرہ انگریزی میں لکھا ہے [illegible] اردو شعرا [illegible] میں داخل ہو [illegible] کے متعلق انتخاب
[illegible] آپ ہی کی ذات والا صفات [illegible] تیار ہو کر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی
[illegible] ایک [illegible] اردو کے [illegible] سے منتخب ہے [illegible]
[illegible] ڈاکٹر [illegible] کر [illegible]
[illegible] انگریزی [illegible] اردو [illegible]
[illegible] تب [illegible]
[illegible] اس کے بعد [illegible] سوال [illegible] کہ آپ نے [illegible] اردو [illegible]
[illegible] قصیدہ شروع [illegible] منشی پریم چند [illegible]
[illegible] قصیدہ [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] قصیدہ [illegible]
[illegible] چنانچہ قصیدہ ختم [illegible]
[illegible] چنانچہ [illegible] آپ نے [illegible] پھر مجھ سے [illegible]
[illegible] تیار کر [illegible] وقت کے [illegible] کا ذکر ہو [illegible]
[illegible] گروپ [illegible] گروپ [illegible] معلوم [illegible] گروپ [illegible]
[illegible] کانفرنس کا گروپ تھا ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے [illegible]
کہا "ان کو پہچانتے ہیں آپ" "میں بھلا اس بے چارے کو کیا پہچانوں" [illegible] کہ آپ [illegible]
[illegible] ہوں [illegible] کانفرنس میں [illegible] لوگ بھی یاد کریں گے [illegible] کانفرنس
میں [illegible] کر لیا تھا [illegible] ان کی مرضی کے مطابق اس گروپ کو دیکھ کر ان سے [illegible] بعد میں [illegible]
آپ کی [illegible] اور سرکاری ذمہ داریاں کاش آپ [illegible] اردو کی حق [illegible] تو آج [illegible] کے سر پر [illegible]
[illegible] کر [illegible] کی [illegible] میری طرف [illegible] کہا [illegible]

ایک ہفتہ کے بعد منشی پریم چند نے مجھ کو چند کاغذات دیتے ہوئے کہا کہ تمہاری اسکیم بڑی حد تک منظور کر لی گئی ہے
معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو خاصا شیشہ میں اتار چکے ہو [illegible] اب مجھ کو بتانا پڑا کہ اس سلسلہ میں کتنی [illegible] ہو چکی
ہیں اور [illegible] قصیدہ بھی سنا چکا ہوں بہرحال میں اس کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ منشی [illegible] کے بجائے مجھ کو ڈاکٹر
رام بابو سکسینہ کی دربارداریاں کرنا پڑ رہی ہیں اور ان کا یہ صلہ بھی مل گیا ہے کہ میری اسکیم بڑی حد تک منظور ہو گئی ہے۔

ابھی اس اسکیم پر عملدرآمد شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نولکشور اسٹیٹ معہ روزنامہ اودھ اخبار کے کورٹ آف
وارڈس میں چلی گئی اور سارے کئے دھرے پر پانی پھر گیا۔ منشی پریم چند کچھ دن پہلے ہی بنارس جا چکے تھے میرے لئے بھی
اب اودھ اخبار میں رہنا ممکن نہ رہا۔

(۲)

[illegible] صاحب کا ذکر ختم ہو تو کسی اور کا بھی ذکر شروع کیا جائے مگر یہ ذکر نہ اتنا مختصر ہے کہ اتنی جلدی ختم ہو جائے

نہ اتنا محدود کہ اس میں کسی اور کے ذکر کی گنجائش ہی نہ نکلے ہیں تو جس کسی کا ذکر چھیڑنا چاہتا ہوں، وصل صاحب کو ہر ذکر میں موجود پاتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ گو بلگھورے سے لکھنؤ آجانے کے بعد وصل صاحب ایک انسان نہیں بلکہ ایک انجمن بن کر رہ گئے تھے۔ اور لکھنؤ نے تمام شعری اور ادبی حلقہ لی نشیں بنا لیا۔ یہاں تک کہ ان کے متعلق یہ کہی گئی تھی۔ کہ لکھنؤ کی ادبی محفلیں تو درکنار، لکھنؤ سے باہر بھی اگر کوئی مشاعرہ ہوتا تھا۔ تو بانیانِ مشاعرہ لکھنؤ کے شعرا کو مدعو کرنے۔ و فرداً فرداً ہر شاعر کے گھر پر جانے کے بجائے سیدھے وصل صاحب کی خدمت میں پہنچتے تھے اور وصل صاحب ہی سب کی طرف سے وعدہ کر کے بانیانِ مشاعرہ کی طرف سے خود میزبان بن جایا کرتے تھے۔ اور اب یہ ان کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ کہ وہ لکھنؤ کے شعرا کو دعوت نامے پہنچائیں۔ ان کو مشاعرے کی شرکت کے لیے راضی کریں۔ اور وہ اگر شرافت سے مان جائیں تو سمجھا بجھا کر ورنہ ڈرا کر، دھمکا کر، ڈانٹ کر، ڈپٹ کر، بہر حال کسی نہ کسی طرح راضی کریں۔ اور اپنی قیادت میں ان کا قافلہ لے کر روانہ ہوں۔ راستے میں وہ ہر شاعر سے فرداً فرداً اس کی طرحی غزل سنتے تھے۔ کسی سے کہتے تھے کہ اپنا ساتواں شعر کاٹ دیجئے یا کسی کو حکم ملتا تھا کہ اپنا دوسرا مطلع غزل سے خارج کر دیجئے۔ کسی کو زیرِ غزل شعر کے پڑھنے کی ممانعت ہوتی تھی کسی کو کسی خاص شعر کے نہ پڑھنے کی تاکید کی جاتی تھی اور اگر اس کی وجہ پوچھی جاتی تو نہایت سادہ سا جواب دیا جاتا تھا کہ یہ میں پڑھوں گا۔ حالانکہ خود ان کے پڑھنے کے لیے ایک نہیں کئی غزلیں ان کی جیب میں ہوتی تھیں۔ جن کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کہاں سے آئیں بس یہی سمجھ کر رہ جانا پڑتا تھا کہ۔ ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

مشاعرے سے کچھ دیر پہلے وصل صاحب ان سینکڑوں اشعار میں سے چھے چھے سات سات شعر کی غزل تیار کر لیتے جو خود ہی کہ مجموعہ کی قسم کی ہوتی تھی اور حاصلِ مشاعرہ سمجھی جانے کی مستحق ہوتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وصل صاحب اس کو پڑھ کر غارت کر دیں۔ اس لیے کہ وہ غزل پڑھتے نہیں بلکہ "غزل ڈانٹتے" تھے۔ چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں سے خون چھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں۔ منہ سے جھاگ اڑتا تھا اور وہ زانو پیٹ پیٹ کر اس طرح ایک ایک شعر پڑھتے تھے۔ گویا ہر شعر کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے ہیں اور کہے دیتے ہیں کہ آج یہ شعر نہیں یا ہم نہیں۔ ان کی شعر خوانی کا انداز شمشیر بازی کے دورے سے بہت ملتا جلتا تھا مگر کچھ دن کے بعد ان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی اچھی سے اچھی غزل ان کی اس خونخوار شعر خوانی سے ذبح ہو کر رہ جاتی ہے لہٰذا انھوں نے خود پڑھنا ترک کر دیا تھا اور ہر مشاعرے کے لیے کسی نہ کسی خوش آواز شاعر کو پہلے سے طے کر لیا کرتے تھے کہ وہی ان کی غزل پڑھے گا۔ اور وہ صرف داد کی رسید کے طور پر سلام کریں گے۔

وصل صاحب جب سے شاعروں کے ٹھوک فروش تاجر یا ٹھیکہ دار بنے تھے ان ہی کے درِ دولت پر ہر چھوٹے بڑے شاعر سے ملاقات ہوتی رہتی تھی کہ آج ان کے یہاں حضرت ریاض خیر آبادی تشریف لائے ہوئے ہیں تو کل حضرت جگر مراد آبادی ان کے یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے پر پھڑپھڑا رہے ہیں۔ مگر راہِ فرار نہیں ملتی۔ ایک دن دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے حضرت جوش ملیح آبادی ان کی حراست میں آئے ہوئے ہیں ہر چند کہ جوش صاحب سے رفیع احمد خاں مرحوم کے ساتھ بارہا ملاقاتیں ہو چکی تھیں

.. ملاقات کے دوران ایک کام کر رہی تھیں جو وصل صاحب کے گھر میں رکھی بوتلوں کا جو تماشہ ہوتے گزرا تھا سے منظر آیا تھا۔ وصل صاحب ان کو اپنے بیاض اشعار میں سنانے کے لیے بلا رہے تھے، اور جوش صاحب ان سے حرکتیں کہہ رہے تھے کہ وہ کس طرح ان کو اپنی رباعیات سنانے سے کام چلا رہے جوش صاحب چشمہ اور تا کا اخلاص کی کہ جب صاحب اس شعر سے کی تڑپ کے لیے آ اولی کو ایک منٹ بھی نہیں، چشمہ نہیں پاتا ہے اندازہ ہے :

وصل صاحب کو ان کی رباعیات [illegible] چشمے کی ہونٹوں کی جنبش کے بعد حال کہ صاحب جو یہ لقمہ دانت کانے ہی تو جوش صاحب ایک جھرجھری لے کر آنکھیں بند کئے ہوئے کہا

اف۔ اف۔ جان لیا صاحب ستایا ہوں اف۔ او۔ جان لیا صاحب :

اور جلی وصل صاحب نے اپنے یہ دانت ضبط کئے جوش صاحب پھر رستہ ان تڑپنا شروع کر دیں۔ مگر وہ بیچارہ باز رہے کہیں ان کو وصل صاحب سے اب حاصل ہو سکتی تھی۔ غرض یہ کہ خوش ہی ہو رہے تھے کا پھر جانے والی ٹرین میں وصل صاحب اور جوش صاحب ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تو، جسے مقابل ہی وصل صاحب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے دانت باہر نکال کر ہلاتے تھے، جوش صاحب جھرجھری لے کر اف اف کر کے آنکھیں بند کر لیتے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد وصل صاحب کچھ کہنے لگے، وصل صاحب ہو لیتے تھے۔ پھر جوش صاحب پیار کر لیتے تھے کہ بس صاحب بس اور وصل صاحب پھر دانت نکال کر ہلا پڑتے تھے۔ یہ سلسلہ ختم ہوا کانپور کے اسٹیشن پہنچے جوش صاحب ٹرین سے اترے ہی تو وقت سب انتظار ہے تھے کہ بار است بھی وہ کچھ پسپائی گئی جو منشور تحریر بغیر دخل ختم ہو گیا۔ لیکن صبح ہوتے ہی جوش صاحب اور احباب کو لے کر دریا کی سیر کو گئے اور گنگا کے کنارے پہنچ کر کشتی کی سیر کے لیے چل گئے۔ آخر ایک کشتی کرایہ پر لی گئی اور اس میں ہم سب بیٹھ کر اس پار سے اس پار جانے کے لیے روانہ ہوئے گنگا اور دونوں باڑھ پر تھی۔ نہایت خوفناک بھنور پڑ رہے تھے اور ملاح کا دل ہی جانتا ہو گا کہ وہ دھارے میں پہنچ کر جوش صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ ایک دم کشتی میں کھڑے ہو گئے اور پہلے تو ایک مختصر سی مگر نہایت درد انگیز تقریر کی جس کے مدعی وصل صاحب تھے کہ اس شخص نے کل سے آج تک مجھ پر نہایت اذیت سوز مظالم کئے ہیں اور مجھ کو زندگی سے اس حد تک بیزار کر دیا ہے کہ اب میں خودکشی کی جرأت آزمائی کے لیے آمادہ ہو چکا ہوں اور یہ کہہ کر انھوں نے کشتی کے ایک کنارے پر ایک پیر اور دوسرے کنارے پر دوسرا پیر رکھ کر ایک پوربی گیت چھیڑ دیا کہ :-

اب نہ لکھو سیاں چٹھیاں گوں کی ——— اب نہ لکھو
چٹھیاں پڑھت موہے انسوا بہت ہیں
انسوا بہت جیسے ندیاں ساون کی
اب نہ لکھو سیاں چٹھیاں گوں کی ——— اب نہ لکھو

وہ شوق سے گاتے کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر انھوں نے ساتھ ہی ساتھ رقص بھی شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ

ظاہر ہے کہ ناؤ ڈگمگانے لگی اور ملاح نے چیخ کر کہا کہ ڈوب جانے کی نازو صاحب یہ نہ کرو۔ مگر جوش صاحب کا حکم یہی تھا کہ ہم ناؤ ڈبونے ہی کے لیے بیٹھے ہیں اور پھر جو نہی دونوں پیروں کو جنبش دی ہے تو ہم سب کو موت کا ایک ایسا جھونکا آیا ہے کہ ہر زبان پر کلمۂ شہادت تھا۔ مولانا آسی نے سنجیدگی سے برا مان کر کہا۔

"۔ بیٹھ جائیے جوش صاحب یہ نہایت مہلک مذاق ہے۔"

جوش صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "غالب کا شارح اور سنجیدگی کو مذاق کہہ رہا ہے۔"

مولانا آسی کی شرح دیوانِ غالب اسی زمانہ میں نکلی تھی۔ نشتر سندیلوی نے گھبرا کر کہا: "یہ کیا بیہودگی ہے؟" اور جوش صاحب نے بڑے رعبِ سلطانی کے ساتھ کہا: "یہ کس گستاخ کی آواز ہے۔ میں حکم دیتا ہوں کہ وہ میرے قدموں پر جھک جائے ورنہ یہ لو۔"

اور اب جو ایک ہچکولا کشتی کو دیتے ہیں تو نشتر سندیلوی "خدا کے لیے جوش بس کرو" کہتے ہوئے واقعی ان کے قدموں پر جھکے ہوئے تھے۔ اب وصل صاحب کی باری تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ "میں کہتا ہوں جوش۔"

کہ جوش صاحب نے کڑک کر کہا: "خاموش! خبردار جو ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔ نکالو اپنے دانت۔ بالکل ٹال دو۔ اپنی ہتھیلی پر رو رندے کے اس مصنوعی جبڑے کو رکھ لو۔ کیوں ان کو دریا برد۔ ان ملتجی نظروں سے دیکھتے ہو تو ان دانتوں کو صرف گنگا اشنان کراؤ۔ اب رکھ لو ان کو جیب میں۔"

اور وصل صاحب ان کے ایک ایک حکم کی تعمیل کرتے رہے۔ اس کے بعد جوش صاحب دوسروں کی طرف مخاطب ہوئے۔

"۔ اے موت سے ڈرنے والے بزدل شوکت تھانوی اپنی ناک سے کشتی کے تختہ پر دستخط کرو۔"

میں ایک طرف سہما ہوا بیٹھا تھا اور واقعی اختلاجِ قلب میں مبتلا تھا۔ طرح طرح کے خیال دل میں آ رہے تھے کہ جب اس غرقابی کی خبر گھر پہنچے گی تو گھر میں کیسا کہرام مچے گا۔ میری دکھیاری ماں کیسی پچھاڑیں کھائے گی۔ اس غم کے پہاڑ کو میرا بوڑھا باپ کیسے کر برداشت کرے گا۔ میری چاہنے والی بہن اپنا کیا حال کرے گی۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جان بچنے کی صرف یہی صورت نظر آئی کہ کشتی کے تختہ پر ناک سے لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔ امین سلونوی جو خاموش بیٹھے ہوئے تھے اپنی مونچھوں کا سامان تاؤ جتول چکے تھے اور اس دنیائے فانی کو بڑی حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ اپنا نام سن کر چونکے۔ جوش صاحب نے ان کو للکار کر کہا: "اپنا شجرہ بیان کرو۔"

اور جب ان کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی تو جوش صاحب نے کشتی کو ایک مرتبہ ڈگمگا کر نادری حکم دیا کہ "بیان کرو اپنا شجرہ۔"

امین سلونوی نے اس وقت اور اس عاجزی سے "یاد نہیں آتا جوش صاحب" کہا ہے کہ جوش صاحب کی ساری اداکاری ختم ہو گئی اور وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔ بات یہ تھوڑی ہی دیر کی تھی مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہم سب پر مصیبتوں اور آزمائشوں کی صدیاں بیت گئی ہیں۔ گنگا کی خوفناک طغیانی کیفیت ملاح تک کا بار بار یہ کہنا کہ بس اب ڈوبتی ہے ناؤ مگر اس کے باوجود جوش صاحب کا یہ ہولناک کھیل ایسا نہیں تھا جس نے کسی کے حواس بجا رکھے ہوں۔ یوں تو سب

مولانا جوش سے قبل بھی مل چکے تھے مگر اب تو کچھ زیادہ ہی کیفیت طاری ہے لہٰذا یہ کہہ چکا تھا کہ اس مشاعرے میں ہماری موجودگی کو کھٹکا کرتی تھی اور یہ حضرت تک اصلاح کی بات کہہ جوش پر آمادہ ہی تھے جب کشتی سے اُترنے کے بعد پہنچ کر جوش بہانہ ہو چکے اور یقینی شکوک سا محسوس ہوتا رہا کہ اس گروپ بلا سے زندہ سلامت نکل آئے ہیں تعمیر شوق و پیک تو ایک مکمل سکوت کا عالم تھا۔ [illegible] مولانا عبد الباری آسی نے بھیجا اور جن کو تابوت نشتر سندیلوی نے کی کہ حضرت ندوی مجھ شاہ صاحب مولانا آسی اول پڑھے ہی ہوں مصرع کا عادی ہوں اس قسم کے مذاق کو پسند آتا ہوں اور یہ سارا کیا دھرا جوش صاحب آپ کا ہے میں اس پہلو سے بھی شرکت کرنا نہیں چاہتا تھا مگر آپ کی اقتدا نے مجھ کو اس حماقت میں مبتلا کیا ہے۔ [illegible] کے بیان آخر سے ماسوا کچھ کہتا ہوں کہا گیا تھا:

یہی صاحب نے جوش صاحب کو مخاطب کیا جو نہایت غیر معقول سے چلے جا رہے تھے کہ یہ سوجھی کیا تھی آخر؟ جوش صاحب نے شہ مشکوک انداز میں جواب دیا: "— — [illegible] وہ مریضِ عمر دو کرنا تھا بھی ہے احساس والا جوش اقوام مسلم نے آج اسی سے زخم کا بیٹھے ہی طرح سلطان سے جب اس وقت بھی کر وہ چارہ ہے خیر یا زندہ صحبت باقی ہے نشتر سندیلوی نے اس کے جواب میں بھی کچھ کہہ دیا ہو کہ [illegible] نہ صرف اس وقت انھوں نے اس بحث میں کوئی حصہ لینا نہ چاہا بلکہ اس دن وہ پہرے کہ سے میں جب جوش صاحب نے ان کی طرف مرغ کا ٹانگ بڑھایا ہے تو انھوں نے نہایت خشمگیں نگاہوں سے جوش صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جی خیر اور مرغا تک ان کے ہاتھ سے کھانا گوارا نہیں کیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مولانا آسی اس واقعہ کو برسوں تک بھولے تھے اور آسی صاحب نہایت ناگوار یک ساتھ اس واقعہ کو دوہراتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ واقعہ ان کے ذہن میں ایسا بھی تازہ ہوتا تھا کہ مولانا آسی کی اس یادداشت پر غصہ آنے لگتا ہے۔ مثلاً جوش صاحب کی ایک نظم "حسنِ ظالم" کے سلسلہ میں مجھ کو میں پھڑک اُٹھا اور وہ نظم مجھ کو اس قدر پسند آئی کہ جو کوئی بھی مجھ کو ملتا تھا اس کو میں اس نظم کا ایک آدھ بند سناتا ضرور تھا۔ چنانچہ مولانا آسی کو بھی میں نے اس نظم کے کچھ حصے سنائے۔ مولانا بڑے غور سے نظم سنتے اور جھومتے رہے اور جب نظم سُن چکے تو کہنے لگے:۔

" ہاں صاحب بہت بڑا فنکار ہے یہ شخص۔ الفاظ کا ایسا جادوگر بڑی مشکل سے پیدا ہوگا مگر وہ یاد ہے آپ کو کاپور والا واقعہ۔ زندگی ہی تھی جناب جو ہم لوگ بچ گئے۔ اس دن میرے خیال میں وہ کوئی مراق کا دورہ اُٹھا تھا جوش صاحب کو۔"
میں نے جل کر کہا کہ چھوڑئیے مولانا اس قصہ کو۔ دیکھئے تو سہی کیا کہتا ہے ظالم کہ ؎

ہاتھ اس نے ناز کے اُٹھائے جو ناز سے
آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے
دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے

پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئے
اک پھر گئے تو ٹوٹ کے تسبیح گر گئی

مولانا نے بڑی فراخ دلی سے داد دی مگر داد دیتے وقت ہر ایک دم سے کہنے لگے: ہم سمجھے تھے کہ اصول جوش کو پرا کیا تھا۔ صاحب، زندگی کیسی بے کسی کی موت مرنے ہم سب!

عرض تو کیا کہ مولانا آپ مرتے دم تک اس نہ ہو سکنے والے حادثہ کا یوں رو نہ رہے تھے مگر اس حادثہ کے سلسلے میں ایک صدمہ جوش صاحب کو بھی تھا۔ "ہائے آج رفیع احمد خان نہ ہوا۔ زندگی بھر کے بدلے آج چکا لیتا۔" اتفاقاً وہیں موجود تھا ہوتے تو اس موقع پر کیا کہتے۔ مگر جوش صاحب کا یہ جذبہ انتقام بھی بے جا نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ واقعہ ہے کہ رفیع احمد خان نے جوش صاحب کے ساتھ بعض ایسے سلوک کیے تھے کہ ان کا بدلہ لینے کے لیے جوش ترستے ہی رہ گئے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ جس کا میں خود بھی گواہ ہوں۔ اس حقیقت پر تھوڑی بہت روشنی تو ڈال ہی دے گا۔ دیوہ شریف میں حاجی وارث علی شاہ کا عرس تھا۔ اس عرس کے موقع پر دیوہ شریف میں خاصی چہل پہل ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے جوش صاحب، رفیع احمد خاں مرحوم اور میں غالباً کچھ اور لوگ بھی ساتھ تھے دیوہ شریف پہنچے۔ وہاں سماع خانہ میں بیدم شاہ صاحب وارثی کی نظر جوش صاحب پر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا جوش جوش۔ جوش کا ایک شور برپا ہو گیا اور جوش صاحب ہاتھوں ہاتھ اس بے پناہ ہجوم سے اٹھا کر بیدم شاہ صاحب کے پاس پہنچا دیے گئے اور ہم لوگوں کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ رفیع احمد خاں مرحوم کو کسی اور پر تو نہیں البتہ جوش صاحب پر بے حد غصہ تھا کہ یہ عزت ملی ہم لوگوں کو بھول گئے۔ جوش صاحب بڑی دیر کے بعد جب اس میلے میں پسینے ٹھنڈے پڑا کر سماع خانے سے باہر آئے تو رفیع احمد خاں نے ان سے کچھ نہ کہا اور بڑی محبت سے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھومنے لگے کہ ناگاہ ایک نہایت دخترِ ابوالہول قسم کی دیہاتی عورت جوش صاحب کے قریب سے گزری تو رفیع احمد خاں نے اپنے اسی ہاتھ سے جو جوش صاحب کی کمر میں تھا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس "افوہ" قسم کی عورت کے بازو میں چٹکی لے لی۔ عورت نے دیکھا آؤ نہ تاؤ جوش صاحب کے وہ دوہتڑ رسید کیا ہے کہ وہ چونک پڑے اور اب لگی وہ بکارنے۔ جوش صاحب کا دل ہی جانتا ہو گا کہ وہ کس طرح اپنے کو بچا کر وہاں سے نکلے ہیں۔ رفیع احمد خاں نے یہ انتقام لینے کے بعد صرف اتنا کہا کہ "بڑی عزت افزائیاں ہو رہی تھیں جناب کی سماع خانہ میں اور ہم نیازمندانِ قدیم پیچھے دھکے کھا رہے تھے۔ اس وقت ہم عالی مرتبت کو یاد نہ آئے۔ اب جو اس پہلوان عورت نے ایک ہی ہاتھ دکھایا ہے تو ہماری آڑ لے رہے ہو۔ جاتے کیوں نہیں اپنے بیدم شاہ وارثی کے پاس۔" جوش صاحب سمجھ چکے تھے کہ یہ ایک پٹھان نے ایک دوسرے پٹھان سے بدلہ لیا ہے لہٰذا کہتے تو کیا کہتے۔ صرف یہی شکر ادا کرتے رہے کہ جس میلہ میں ابھی جوش کے آنے کی دھوم تھی۔ اس میں شکر ہے جوش کی اس عزت افزائی کے چرچے نہیں ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ جوش کی پھڑکتی ہوئی جوڑ اگر تھا تو رفیع احمد خاں ہی تھا جس کے تذکرے میں ایسے ایسے نہ جانے کتنے اور واقعات سامنے آئیں گے۔ ابھی تو اس یگانہ روزگار کا ذکر ہی نہیں چھڑا ہے۔

شیش محل
(چند اسکیچ)

انیس احمد عباسی

لکھنؤ سے روزنامہ حقیقت کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ میونسپل کمشنر بھی ہیں۔ اور لکھنؤ میں بھی خاصی ذی عزت اور
حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں یا یہ زندگی آپ کو بسر کر رہی ہے۔
پڑھے لکھے آدمی ہیں جب ہی جانتا ہے صاحب ذوق بلند فہم ہے۔ بڑے بڑے جاننے والوں میں بھی کبھی کبھی مقابلت صاحب سے سیاسی
کی گفتگو میں آجاتی ہے مجبوری کی بات دوسری ہے ورنہ فطرتاً ان کی سب سے بڑی دوست اردو ہوا کرتی ہے۔ صحافت کے
تھوڑا تو یہ جانتے ہیں۔ سید جالب نے بھی بانیٔ صحافت کے حبیب شاگرد رہے ہیں۔ دیکھیں کبھی آپ کی تحریر میں اسلوب
مرحوم کا رنگ جھوٹ نکلتا ہے۔ مدت سے روزنامہ حقیقت کو اپنے ہی سہارے سے قطعاً توکل پر چلا رہے ہیں آج اخبار نکل
جاتا ہے اور کل کی کبھی فکر نہیں ہوتی مگر اس بے سروسامانی کے باوجود آپ کو خالی کا جشن منے ہوئے بھی نہیں دیکھا گیا۔
سادگی اور وضع داری یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے قائل آپ کے مخالفین بھی ہو گئے۔ آپ جوٹ ہیں مگر سادگی کے بدولت
ڈبل پاس بھی مشکل ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ سر کی ٹوپی اور کبھی کبھی گاندھی کیپ بہ حسن ہو تو ٹوپی ہی جو سر پر منڈھ کر رہ جاتی
ہے پھر کیا مجال کہ سر سے کبھی اتر جائے۔ جاڑے میں اسی ٹوپی پر ایک کلا بند باندھ سا جاتا ہے۔ چھڑی کا سہارا لے کر میلوں
کا سفر کر جاتے ہیں دفتر تنہا گھر گئے یا سسرال ہو آئے۔ بارشوں میں شرکت کی لارڈ کی میٹنگ میں حاضری دی اور سب جگہ
ہو آئے اور اسی چھڑی کے سہارے رات کو دس بجے گھڑی کی سوئی کے ساتھ ہی بہادر شیخ احمد علی عرف دولہن صاحب کے
یہاں موجود ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں۔ ہنس بول رہے ہیں۔ دوسروں کے ذکر سن رہے ہیں اپنا ذکر کسی کو نہیں سناتے۔
صورت سے یتیم نظر آتے ہیں مگر چپکے چپکے سینکڑوں یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتے رہتے ہیں کوئی ضرورت مند
آپ کے پاس پہنچ جائے تو اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم سمجھیں گے پھر خواہ چاہے قرضے بجانے پڑیں مگر خوش
ہوتے ہیں کہ ضرورت مند کی ضرورت پوری ہو گئی۔ کئی بار کہا کہ انیس بھائی یا تو فقیری سے بچئے یا انسانوں کی صورت بنائیے
لکھتے ہیں کہ تم مزاح نگار ہو مذاق کرتے ہو۔ کاش کوئی سنجیدگی سے انیس بھائی کو سمجھا دیتا۔

انصار ناصری

سید انصار علی ناصری۔ ریڈیو اسٹیشن دہلی کے دور میں سب سے پہلے ملاقات ہوئی۔ افسانے اور مضامین اس سے بھی پہلے دیکھ چکے تھے۔ ملے تو ان کو اپنے سے کم عمر اور اپنے سے کم، باوجود اس کے ہر مرتبہ وہیں کہ سفر میں ملاقات ہوتی رہی کبھی ریڈیو اسٹیشن پر کبھی شاہد صاحب کے یہاں مگر یہ ملاقاتیں وہی آداب عرض تسلیمات عرض۔ مزاج تو اچھا رہا۔ آپ کا کیا حال ہے۔ بس وہ مضمون خوب تھا قسم کی رسمی ملاقاتیں تھیں۔

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر ہم تو خیر تھے ہی یکایک دیکھتے کیا ہیں کہ آپ بھی بسلسلہ ملازمت چلے آ رہے ہیں پھر کیا تھا تقریباً تین چار سال دن رات کا ساتھ رہا۔ ساتھ ساتھ اچھے رات ساتھ ساتھ کاٹے۔ الجھے بگڑے۔ روٹھے منے جھگڑا دھما۔ ہاہا ہو ہو۔

انصار پہلے کافی لکھتے تھے۔ ریڈیو میں کیا آئے ایسے ادب کے قبرستان میں آ گئے ہر قسم کھانے کو بھی کچھ نہ لکھا البتہ ایک اچھے پروڈیوسر بن گئے۔ ڈرامہ آپ کی خاص لائن ہے اور ڈائرکشن عبادت کے سے انہماک کے ساتھ فرماتے ہیں الفاظ کے مد و جزر کے ساتھ ان کے جسم میں بھی جوار بھاٹے کی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ پس منظر موسیقی کے ساتھ غیر ارادی طور پر متحرک رہتے ہیں غیر محسوس طور پر ناچ رہے ہیں۔ جب کوشش کامیاب رہی تو تالیاں بجا رہے ہیں تمام اداکاروں پر سے صدقے ہوتے جاتے ہیں۔ ناکام رہی تو پیشانی پر رو رو کر ہاتھ مارتے ہیں اور ایسا گہرا اثر لیتے ہیں گویا کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔

ایک اچھے ادیب تھے مگر بہت اچھے پروڈیوسر بن گئے ہیں۔ ریڈیو کے لیے موزوں ترین شخصیت ہیں اپنے کو ماحول کے مطابق ڈھال لینے میں کمال حاصل ہے۔ ان تمام خوبیوں میں ایک برائی بھی ہے کہ خلوص پر اعتماد نہیں کرتے۔ چوکنا رہتے ہیں اس خوبصورت ہرن کو اپنے باغ میں ہر طرف شکاری نظر آتے ہیں معلوم نہیں یہ وحشت کیوں ہے؟

بہزاد لکھنوی

سردار حسین بہزاد لکھنوی کو میں بہزاد کے علاوہ سردار حسین کی حیثیت سے بھی اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ بہزاد کم اور سردار حسین زیادہ تھے۔ طالب علم کی حیثیت سے ان کو اس معاملہ میں شہرت حاصل تھی کہ بنتے بہت ہیں۔ زمین کی باتیں بہت کم کرتے تھے ہر بات آسمان سے کم بلندی کی نہ ہوتی تھی۔

"بھئی سردار حسین یہ شیروانی کا کپڑا تو خوب ہے"

"ہاں۔ مگر اب تو مل ہی نہیں سکتا۔ دو شیروانیوں کا بنا تھا ایک شیروانی ڈیوک آف کناٹ کی بن گئی دوسری یہ ہے" یہ آواز میں بھی تصنع ہوا کرتا تھا۔ بات کرتے ہوئے چہرہ بھی بڑے آدمیوں کی طرح کا بن جاتا تھا۔ ایک دور وہ آیا کہ آپ نامی لکھنوی کے شاگرد کی حیثیت سے مشاعروں میں داد لیتے نظر آئے۔ پھر جو دیکھا تو ایسٹ انڈین ریلوے میں

[illegible] بیٹھے [illegible] طرف سے [illegible] ہیں۔ [illegible] اختر [illegible]
[illegible] پیدا کر دیا۔ [illegible] اور [illegible] دونوں [illegible]
[illegible] یہاں تک [illegible] صحبت [illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ کی شہرت [illegible] کے علاوہ [illegible] خوش [illegible]
[illegible] ہیں [illegible]
چھپا سکتے ہیں۔ [illegible]

حسرت موہانی

[illegible] حسرت موہانی

شعر کا شعور پیدا ہونے کے بعد سے حسرت کا [illegible] پڑھنے [illegible] حسرت [illegible]
کی سیاسی سرگرمیوں کو اخباروں میں دیکھا کرتے تھے زیادہ [illegible] پڑھتے [illegible] حسرت [illegible]
آج اس جیل میں ہیں کل اس جیل میں ہیں۔ گویا آپ کا صدر مقام جیل خانہ ہے۔

ایک مرتبہ [illegible] میں ایک [illegible] لکھنؤ سے [illegible] ہے
[illegible] صورت۔ عینک میں ایک طرف [illegible] بندھی ہوئی۔ [illegible]
[illegible] ڈھالی اچکن۔ پیروں میں میلا سا کرتا [illegible] جوتا۔ جب چپ کر [illegible] ہوئی آواز اور عجیب [illegible]
تعارف کرایا کہ آپ مولانا حسرت موہانی ہیں۔ میں تو سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ [illegible] حسرت موہانی
زمانے میں دوستی ہوگئی۔ اس لیے کہ دوستی کرنے کی اہلیت [illegible] وہ [illegible] وقت نظر آنے لگے۔
حالانکہ باتیں بھی یوں ہی سی کرتے تھے کچھ عجیب کھوئی کھوئی سی اور [illegible] کی کوئی وجہ نظر آتی تھی [illegible] سے بھی انکار
نہیں کہ وہ وقیع نظر آتے تھے۔

ایک مرتبہ ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے حسرت صاحب کی خدمت میں کانپور حاضر ہوا۔ دیکھا کہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک
پانی سے بھرا ہوا گھڑا اٹھائے گھر میں جا رہے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر بھی اپنے اس کام میں مشغول رہے جب فارغ ہوئے تو ایک سکری
چار پائی پر بیٹھ کر چند باتیں کیں اور جب میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا بہت اچھا ہوا گویا نہ تمہارے آنے کی خوشی تھی نہ جانے کا غم۔
مدت تک کوشش کرتے رہے کہ مولانا حسرت اپنا کلام براڈکاسٹ کرنے پر تیار ہو جائیں مگر کسی طرح قابو ہی میں نہ آتے تھے۔
مسٹر سومنانتھ چب اسٹیشن ڈائرکٹر لکھنؤ کی بڑی خواہش تھی کہ حسرت صاحب سے ان کا کلام براڈکاسٹ کرائیں۔ آخر ایک
مرتبہ لکھنؤ میں مل گئے۔ میں نے ان کو تو ایک ریستوران میں بٹھا کر چائے میں مصروف کر دیا اور چپکے سے مسٹر چب کو فون کیا کہ مولانا

حسرت کو پکڑ لائیے اور اُوپر بٹھائیے۔ تھوڑی دیر میں مولانا حسرت جب صاحب کے بنگلہ پہنچے اور ان سے پاکستان کے متعلق اپنے نئے فارمولا پر بحث کر رہے تھے۔ اصرار یہ تھا کہ یہ فارمولا براڈ کاسٹ کر دیا جائے۔ جب کسی طرح مولانا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ آپ ریڈیو اسٹیشن چلیں ہم آپ سے دو ایک غزلیں پڑھوا کر رکھ لیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں معلوم نہیں کیوں مولانا نے کہا بہت اچھا پھر ترنم کے ساتھ غزلیں پڑھیں اور پھر جب وہ ریکارڈ سنا تو بہت خوش ہوئے۔ فرمایا: ارے! یہ تو بالکل میری ہی آواز ہے۔ خیر ——— اب میں سٹیشن جاتا ہوں تو اسٹیشن تک پہنچا دیجئے۔ میاں لطیف الرحمٰن بھی ساتھ تھے۔ حسرت صاحب کچھ رنگین اور رومانی افسانے بھی سنانے بیٹھے اپنے ذاتی رومانی افسانے اور چھیڑ چھاڑ کا کلام بھی سنایا۔

مولانا کا سیاسی مسلک خواہ کچھ بھی ہو مگر ان کے شدید سے شدید مخالف کو بھی اس بات کا یقین ہے کہ ان کی رائے ایماندارانہ اور آزاد ہوا کرتی ہے۔ ساری خدائی ایک طرف ہو جائے اور مولانا اپنی تنہا آواز بلند کئے بغیر نہیں مان سکتے۔ نہ ان کو ہوٹنگ کی پرواہ نہ مخالفت کے طوفان سے کبھی مرعوب ہوئے جو اپنا عقیدہ ہے وہ ظاہر کریں گے اور برملا ظاہر کریں گے خواہ کچھ ہو جائے۔ وہ شاعر کی حیثیت سے بلند ہیں یا لیڈر کی حیثیت سے۔ اس سلسلہ میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں اور لیڈری ان کی ثانوی حیثیت ہو سکتی ہے۔

روش صدیقی

علامہ ہیں کہ عظمت کا یہ صورت دیکھ کر شفقت کو دل چاہتا ہے۔ کلام نہایت وزنی اور خود نہایت ہلکے پھلکے سنانے اس طرح ہیں گویا پھدک رہے ہیں۔ کلام کے زور میں اکثر خود اڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آواز اچھی ہے اور گلے میں سُر بھی ہے مگر جوش میں آ کر جب بلے تو سر سے رہتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خلافت فنڈ کے لیے اپیل کرتے کرتے یا شتیوں کے مولانا شوکت علی کو غصہ آگیا ہے۔ نتھنے پھول جاتے ہیں گھونسہ تان لیتے ہیں اور پھر اسی گھونسے سے تعریف کرنے والوں کو سلام بھی کر لیتے ہیں۔ مشاعروں کی شرکت عبادت کی طرح پابندی سے کرتے ہیں آج آگرہ میں ہیں تو کل گوالیار میں۔ کبھی بنارس میں ہیں تو کبھی کسی غیر معروف مقام پر مشاعرے میں نظر آ رہے ہیں۔ نیشنلسٹ شاعر ہونے کا دعوی ہے۔ وردی کے طور پر کبھی کبھی کھدر بھی پہن لیتے ہیں۔ ورنہ دراصل آپ کو سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ نظم کے علمبرداروں میں اس طرح شامل ہیں جس طرح راجہ پورس کی فوج میں ہاتھی شامل تھے۔ یعنی بوقت ضرورت غزل بھی اس طرح پڑھ دیتے ہیں کہ نظم کی تمام علمبرداری سرنگوں ہو کر رہ جاتی ہے۔

فطرتاً بہت معصوم، صورتاً نہایت خام مگر اقتصادی معاملات میں نہ معصوم نہ خام بلکہ نہایت پکے بزنس مین "یک سخن" کی قسم کے ضدی بھی اور تو نقد نہ تیرا اُدھار کی قسم کے منہ پھٹ بھی۔

مجنوں گورکھپوری

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری۔ معلوم نہیں یہ تخلص شعر کہنے کے لیے رکھا ہے یا اپنا تعارف کرانے

کے لیے آپ کی پوری شخصیت آپ کے تخلص میں سما کر رہ گئی ہے۔ اس جماعت سے یہی تخلص اور اسی تخلص کے لیے یہی جماعت ہونا چاہیے تھی۔ [illegible] کہ پورے اپنے انسان ہیں۔ وہ بالطبع و شرافت [illegible] مشتاق کا اضافہ کر [illegible] میں فقط مگر باقی تمام حیثیتوں سے [illegible]۔ ادیب۔ نقاد، شاعر، افسانہ نگار۔ غالب عمر بھر سب کی [illegible] اور بات یہ کہ مجنوں کو شہرت بحیثیت ایک افسانہ نگار کے حاصل ہوئی حالانکہ [illegible] صرف ایک ابتدا ہی ہے۔ وہ شعر کہتے اور خطرناک حد تک کہتے ہیں۔ گویا شعر و شاعری کے معاملہ میں [illegible] خطرناک [illegible] ہیں چھوڑو پہ کہ منہ [illegible] ہیں۔ [illegible] آپ کا شعر سنیں گے [illegible] معانی سے [illegible] کہ آپ منہ دیکھ کر رہ جائیں۔ کسی سے مرعوب ہونا تو جانتے ہی نہیں۔ [illegible] مرعوب ہوتے ہم نے خود دیکھا ہے۔

مجنوں میں دوستوں کے لیے خلوص ہی خلوص ہے۔ مگر بہت [illegible]۔ شروع شروع میں لوگ ان کو [illegible] سمجھتے ہیں مگر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ [illegible] اور دروغ بافانہ [illegible] مجلس سکھاتا ہے۔ مجنوں کا دوست بننا [illegible] آدمی کا کام ہے۔ [illegible] جو کوئی دوست بن جاتا ہے وہ اس چھوٹے سے آدمی کی بڑی بڑی باتوں میں [illegible] معلوم کرتا ہے۔

مجنوں صاحب پہلے ہمارے بھی بزرگ [illegible] تھے۔ مگر رفتہ رفتہ دوست ہو گئے۔ اب جب کبھی ملاقات ہو جاتی ہے تو کم سے کم ہمارا دل تو خوش ہی ہو جاتا ہے ان کو خواہ کیسی ہی کدورت کیوں نہ ہوتی ہو۔

بارِ خاطر

(چند خطوط)

سید امتیاز علی تاج کے نام

لاہور

۲ فروری ۴۱ء

سیدنا

اس وقت آپ بے طرح یاد آ رہے ہیں۔ لکھنؤ سے ایک عزیز آ گئے ہیں مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ بیسنی پانوں کی ڈھولیاں بھی لائے ہیں اور وہ چکنی ڈلی بھی جو کبھی "صاحب" کے کفِ دست پر ہوا کرتی تھی۔

دوپہر کا وقت ہے صحن میں دھوپ کھانے نکلا تھا بیٹھ گیا پان کھانے۔ جب پُر تکلف پاندان میرے سامنے کھل جاتا ہے تو ذہن کا وہ دریچہ بھی کھل جاتا ہے جس میں سے آپ کو جھانکا جا سکتا ہے۔ آج میرا پاندان ایک ایسی دلہن کی طرح سجا ہوا ہے جو بیوگی کی خبر پا کر عدت کے دن گزار رہی ہو کہ یکایک اس کا دولہا پردیس سے آ جائے اور اس کو غیر متوقع طور پر اس کا سہاگ واپس مل جائے۔ کب امید ہو سکتی تھی کہ اس پاندان میں لکھنؤ کے بیسنی پان پھر نظر آئیں گے مگر آج اس پاندان میں بیسنی پان بھی ہیں۔ کیوڑے میں بسا ہوا دودھیا کتھا بھی۔ چھالیہ بھی وہ جس کو اہلِ ذوق "باجرہ" کہتے ہیں۔ چونا اس قدر شفاف کہ دھوپ بھی اس کو اپنا آئینہ سمجھے اور کہسارِ مری کی برف بھی اس کے سامنے پانی پانی ہو جائے۔ سفید سڈول الائچیاں بھی ہیں اور مشکی دانے کا تمباکو بھی۔ پھر قوام کی شیشیاں تو آپ جانتے ہی ہیں میری جان کے ساتھ ہیں۔

اس اہتمام سے پان کھا رہا ہوں اور جھوم جھوم کر گنگنا رہا ہوں ؎

پان اے عنوانِ رنگینیِ لبِ لعلینِ یار
اے ذرا سے سبز پتے غازۂ لوٹے بہار
اے کہ تیرا رنگِ رعنا جاذبِ جذبات ہے
اے کہ تجھ سے سرخرو صبحِ تجلیات ہے

۔ پر اس بیچارے "تمت" فقرہ لئے ہمارے ہاں آپ نے دیکھا ہی ہو گا مگر کیا خوب ہے تکلفات میں آپ نے دیکھا ہے وغیرہ کے پان پر بھی لکھا ہے کہ ساتھ ہی چونے میں نہ ہو کہ جس طرح تمباکو کا ۔ پان سپاری وغیرہ کو کتابوں میں دیکھا ہے ان سب کا کبھی نقصان نہیں ہوا کہ وہ پان کا ہوتا ہے جس کے متعلق جوش نے ایسے شاعرانہ ہی کہہ دیا ہے کہ تمہید نہ رکھئے ۔ م

اگر دستور نہ ہوتا تو پان کا فرق ہی

مدت میں کبھی ایسا غالب کو رہا ہوں تو یہ شعر صنعت کے کہ —

بات گزری نہ دل کا ٹکڑا ہو

ہوشیار اس کل کا لکھا ہوا

غالب علی کے زمانے میں بھی میں خاکسار کے یہاں تمباکو کا تذکرہ کبھی نہ کسی سے ہی نہ ہوا۔ غالب علی کے بعد شاعر مشرقی کے اس مصرع کا خاصہ بھی کہہ کر کہا کہ —

کس قدر ذوق پہ گرا رہا ہے کی بیداری ہے

ہے کسی پیار ہے ان جنگ میں سپاہی

کاش وہ موجود ہوتے اور میں ان کو بتا سکتا کہ غنچہ نہیں ۔ نہیں بلکہ غنچہ کو ہم پان سے ہی جانتے ہیں۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ آخر ایسی بھی کیا ضد داری، دو کسی دن ادھر سے گزرتا ہوں تو دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے گھڑی بھی اور رکا کر سنے مگر معلوم نہیں وہ الاہ کس کس کھلاڑی میں جا دوڑے ہیں گا بہر حال ہم کو بھی اس شاہد کے مرتبے نہ مل سکا مجبوراً ایک سبب بات کی بات چھوڑ کر موضوع بحث اس وقت صرف پان ہے جس کے متعلق شاعر کہتا ہے ۔ م

لے ذرا سے سبز پتے کا نہ شئے ہوئے

مگر صاحب "ذرا سا سبز پتا" تو آج اتفاق سے آ گیا ہے ورنہ یہاں تو بہت سا سبز پتا" ملتا جس پر کچھ کہوں نہیں آتا کہ کتنا چونہ کوئی پیسا کیونکر لگائے تاوقتیکہ یا عینک پہ جھک کر یہ فرض پورا نہ کیا جائے اور پھر اس بہت سے سبز پتے کو کھانے کے لئے بھی بڑے ڈیل ڈول کے آدمی کی ضرورت ہے۔ گلوری اس کی بن ہی نہیں سکتی۔ پھر تو پورا منہ پھاڑ کر کھانا پڑتا ہے اور کھانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ منہ نہیں ہے بلکہ مال گودام ہے اور تو اور یہاں پان مانگنے والوں سے عموماً یہ سوال کرتے ہیں کہ میٹھا یا الائچی سپاری کا؟ اب بتائیے کوئی خوش مذاق انسان کیا جواب دے اور جواب نہ دے تو کھانا پڑے وہ پان جس پر سونف بھی ہوتی ہے اور مصری کا سفوف بھی معلوم ہوتا ہے کہ پورا زردہ خانہ اٹھا کر رکھ گئے۔

آپ تو خیر تمباکو کے پان میں الائچی کے شریک کے بھی قائل نہیں ہیں مگر میں اس باب میں مشرک واقع ہوا ہوں، تمباکو بھی کھاتا ہوں اور الائچی بھی یعنی گرنڈ بھی کھاتا ہوں اور گلگلوں سے بھی پرہیز نہیں کرتا ہیں پان کے معاملے میں آپ کی بندی کا قائل ہوں کہ تمباکو بھی خوشبودار پسند نہیں کرتے۔ آپ مراد آبادی تمباکو کے خلوص سے انکار نہیں مگر خشک دانہ دار تمباکو کا تصور اور قوام یا قوام کی گولیوں کا سوداء افزا خوشبو جو گل کھلاتی ہے اس کا بھی دیوانہ ہوں خالص تمباکو خالص شکر کی شامی ہے مگر غالب مرحوم گلاب میں شراب یا شراب میں گلاب ملا کر پیتے تھے۔ آپ زیادہ سے زیادہ پان کے معاملہ میں اپنے کو سادہ او مجھ کو

بدکار تو کہہ سکتے ہیں مگر اپنے کو بے گناہ اور مجھ کو بدکار نہیں کہہ سکتے۔ آپ کا مراد آبادی تمباکو سب کچھ کر سکتا ہے مگر یہ مطلب کیسے تیار کرے گا جو قوام تیار کرتا ہے کہ وہ لعاب منہ میں لیے بیٹھے ہیں اور تر گرم شکل، گرنہ گرم شکل کی تفسیر فرمائیے۔ دیکھئے تاج صاحب یہاں پان کی تائید میں ایک نکتہ اور سُوجھ گیا کہ پان انسان کو نہایت کم سخن بھی بنا دیتا ہے یعنی انسان ایک ایک بات کو پہلے سو سو مرتبہ منہ میں تولتا ہے پھر اگالدان سے مشورہ کرتا ہے اس کے بعد کہیں بات کرتا ہے بجائے اس کے زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور یاوہ گوئی کے گُل کتر رہی ہے۔

پان کے سلسلے میں آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ چھوٹا کھایا جائے اور کثرت سے کھایا جائے۔ مگر اس عقیدے کے پیش نظر میں غالباً وہی پان ہے جس کو میں چھپر کھٹا کہتا ہوں اور جس کے آٹھ آٹھ اور دس دس گٹھے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس وقت میرے سامنے وہ پستئی پان ہیں جن سے غالباً "دھان پان" کا محاورہ نکلا ہے۔ نازک نازک۔ چھوٹے چھوٹے پتے۔ گلوری بنا کر منہ میں رکھیے تو گھل جائیں۔ ان چھوٹے چھوٹے پانوں کی خوب صورت گلوریاں جھومر میں پرو کر خاصدان میں اگر آپ کے سامنے آ جائیں تو کثرت سے کھانے کے عقیدے کے باوجود آپ اس خوف سے قائل نہیں رہ سکتے کہ یہ خاصدان ختم ہو جائے گا تو کیا ہو گا۔ میرے پاس اس وقت پستئی پانوں کی دو ڈھولیاں ہیں یعنی ایک دو نہیں بلکہ پورے چار سو پان مگر دل دھڑک رہا ہے اس وقت کے خیال سے جب یہ نہ ہوں گے اور میں پھر اپنے بنڑے پر قناعت کروں گا۔

میں بھی تو یہ پان کھا سکتا ہوں ورنہ اپنے کو لنڈورا ہی بھلا سمجھتا ہوں کہ چھالیہ، خشک کتھا، الائچی، زردہ، تمباکو اور قوام کھا کر چونا چاٹ لوں مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جوٹ اور پٹ سن کی برادری کے پان کھاؤں جو منہ سے رسیاں بٹواتے ہیں اور جن میں لوگ مسلم الائچی ڈال کر جبڑوں کی ورزش کرتے ہیں۔

تقسیم ملک سے پہلے پستئی نہ سہی مگر بنارس کے سفید پان لاہور میں مل جاتے تھے۔ وہ ذرا تیز ضرور ہوتے تھے مگر یہ تیزی چنداں ناگوار نہ ہوتی تھی اور چرپری تیز زبان کی تیزی کو رام کر لیتی تھی۔ تاج صاحب ملاحظہ فرمایا آپ نے بنارس کا ذکر تھا تو بے ساختہ رام کرنے کا محاورہ قلم سے نکل گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ شعر بھی یاد آ گیا کہ ؎

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

معاف کیجئے گا اس شعر کا یہاں کوئی محل تو نہ تھا مگر اچھا شعر اگر بے محل بھی ہو تو رنگ دے جاتا ہے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ تقسیم ملک کے بعد وہ بنارسی سفید پان بھی سفید فام قوم کی طرح عنقا ہو گئے اور رہ گئے یہ پان جن کو پان کی حیثیت سے کھانا تو سمجھ میں آتا نہیں البتہ روٹی کی صورت سے کھایا جائے تو دوسری بات ہے۔

کس طرح میں آپ کو یہ پستئی پان کھلاؤں۔ گردھی شاہو سے ایبٹ روڈ زیادہ دور نہیں مگر یہ نازک گلوریاں وہاں پہنچتے پہنچتے مرجھا جائیں گی کملا جائیں گی اور پان کا خون ہو جائے گا جس کو شاید آپ بھی گوارا نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا آپ کے حصے کے پان بھی میں خود ہی کھا رہا ہوں اور کھا کھا کر آپ کو یاد کر رہا ہوں معطر، لطیف اور خنک گلوریاں۔ محسوس ایسا ہوتا ہے گویا پان نہیں بلکہ پان کا تصور چبا رہا ہوں گلوری منہ میں جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ سد رہی

...رہے ہوتے کا پتہ نہیں۔ آپ ان کے پیچھے بہت [illegible] میں [illegible] اس کے قائل ہوں گے [illegible] کے معاملہ میں
ساتھ ہی مجھے [illegible] کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

شوکت تھانوی

حضرت جگر مرادآبادی کے نام

آدھی رات ۔ لاہور
۱۵ جون [illegible]

صدیق مکرم

ابھی ابھی میں آپ کے ساتھ دو [illegible] راتیں [illegible] خواب [illegible] پہنچا ہوں [illegible] گزشتگی باقی ہے اور پھر آپ سے مخاطب ہوں۔ مرض میں [illegible] کا سلسلہ جاری [illegible] کثرت سے جاری رہا [illegible] پر [illegible] اعصابی [illegible] کا گمان کر رہا ہے۔ اگر آپ یاد کریں تو [illegible] تک ہر فرد پر تاش کے پتوں کا شبہ ہوتا تھا۔ ہر [illegible] جو نعرے لگا رہی [illegible] کے عالم یا حکم کے بادشاہ کا گمان گزرا۔ غضب خدا کا [illegible] راتیں [illegible] بسر کر دیں [illegible] ایسی ایسی خدا جانے کتنی راتیں بسر کی ہیں اور ایک سے ایک [illegible] واسطہ پڑا ہے مگر آپ کے انہماک کا جواب نہیں۔ اس موقع پر آپ ہی کا ایک شعر آپ کو سناتا ہوں جو آپ کے لیے آپ کی ایک معقول دعا کی حیثیت رکھتا ہے ۔

عشق ہے قید تصور شوق بے قید نظر
مجھ کو جو کچھ چاہیے بے حد و پایاں چاہیے

بے شک جو شغل بھی اختیار کیا انتہا پر پہنچ کر اور انتہا تک پہنچا کر اختیار کیا۔ رندی اور بدمستی کا وہ زمانہ جب ہر طرح جام و سبو اور سر بغض میخانہ تھا ابھی کل کی بات ہے۔ رندِ بلانوش بن کر حاضر ہوا تھا مگر ۱۹۲۶ء کی ایک رات میں لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں دیکھ بھی لیا جب ایک اجاڑ سی صورت کا شاعر جیسے بیٹھے بیٹھے پڑھی ہوئی خیام کی تصویر مشاعرے کے ایک گوشے سے اٹھا اور اس نے مخصوص انداز میں جھوم کر پڑھا ۔

نظر کو مست مئے حسن کر جناب اٹھا
جگر شراب نہ پی تہمت شراب اٹھا

اور میں چونک پڑا کہ کیا یہی ہیں جگر۔ اور فوراً ہی جگر نے یہ شعر پڑھ کر تصدیق کر دی ۔

کدھر ہے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

۱۹۲۶ء کی وہ رات اور آج کا دن۔ تعلقات کے اٹھائیس سال۔ اور ہم دونوں ایسے سخت جان کہ دونوں کے تعلقات کی

یہ مدت نہ مار سکی۔ اس عمر کے نہ دوست ملتے ہیں نہ دشمن۔ اس مدت میں دوستیاں دشمنی بن جاتی ہیں اور اتنی طویل دشمنی بھی وفا نہیں کر سکی۔ آنے کو تو بہت سے انقلاب آئے۔ ایک رند نے توبہ کی۔ ایک خانہ بدوش صاحبِ خانہ بنا جس کا کوئی نہ خانہ کسی کا ہو گیا اس کے علاوہ اور بھی بہت سی گتھیاں سلجھیں۔ بڑے بڑے سلجھاؤ الجھے۔ ملکوں کی تقسیم ہوئی نئے نئے ممالک کرۂ ارض پر ابھرے اور ہنگامے ایسے ایسے ہوئے کہ آخر ہم بھی بٹ گئے آپ اُدھر ہم اِدھر اور بیچ میں آگ اور خون کے سمندر۔ مگر یہ تعلقات قائم رہے رند کی توبہ ان کو ختم نہ کر سکی۔ خانہ بدوش کی خانہ آبادی ان پر اثر انداز نہ ہوئی نہ کسی الجھن نے ان کو سلجھایا نہ کسی سلجھاؤ نے ان کو الجھایا۔ وہ بھیانک آگ اور خون کے سمندر دیکھ دیکھ کر بھی یہ تعلقات یہی کہتے رہے کہ:

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اور یہ تعلقات صرف مجھ ہی سے نہیں ہیں۔ آپ کہتے ضرور ہیں کہ آپ کو مجھ سے ایک خصوصیت ہے مگر آپ کی یہ خصوصیت اتنی عام ہے کہ ؎

اللہ رے چشمِ یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

میں نے تو آپ کی اس خصوصیت کا مرکز ان کو بھی دیکھا ہے جن سے گلے ملنے کے بعد جن کو نہایت خلوص سے پہلو میں جگہ دینے کے بعد آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ:۔

"آپ مجھ سے یہ تقاضا نہ کیجئے گا کہ میں آپ کو آپ کا نام بھی بتاؤں نام اصل چیز نہیں ہے شخصیت اصل شے ہے۔ دماغ میں نام محفوظ نہیں تو نہ ہو مگر وہ جو ایک تعلق ہوتا ہے روح کا روح سے جی ہاں۔ وہ بہرحال موجود ہے۔ فاصلہ اور وقت نام دماغ کو محو کر سکتا ہے مگر اس تعلق کو ختم نہیں کر سکتا۔"

بلکہ میں نے آپ کی اس خصوصیت کا مرکز ان ناجنسوں کو بھی دیکھا ہے جو محض ایک جذبۂ پرستاری لے کر اس وقت آ جاتے ہیں جب آپ تاش کھیل رہے ہوں مارے اخلاق کے آپ تمام حرف و حکایت اور تمام دیدہ و دل بن جانا چاہتے ہیں مگر اس اہتمام کے باوجود شرحِ عاشقی اس لیے نہیں ہو سکتی کہ توجہ ہوتی ہے آپ کی تاش کے پتوں کی طرف اور دل دہی کرنا چاہتے ہیں آپ مہمان کی بھی آپ کی وہ کیفیت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ ہاتھ میں رمی کے بارہ پتے ہیں جن کو آپ گھبرا گھبرا کر مرتب کر رہے ہیں اور باتیں آں حضرت سے بھی کرتے جاتے ہیں۔

"خلوص کا سوائے خلوص کے کوئی نام نہیں ہوتا اہلِ خلوص کا تعارف ایک مخلص دل خود ہی کرا دیتا ہے" اور وہ حضرت اپنی ہانک رہے ہیں "صاحب میں تو ادھر آ کر مسلسل پریشانیوں میں مبتلا ہوں"

"آپ اپنے تیرہ پتوں میں گم اُن کی بات کا جواب بھی دیئے جاتے ہیں اور اپنے کھیل کے ساتھیوں سے بھی مخاطب رہتے ہیں نتیجہ یہ کہ مکالمہ کچھ اس طرح کا بن جاتا ہے۔

جی ہاں وہ پریشانیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ صاحب گن لیجئے تیرہ پتے ہیں نا ؟"

- کیا ملازمت ابھی اب تک نہیں مل سکی؟
- [illegible] امتحان میں [illegible] کے بعد والد صاحب؟
- بچوں کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں؟
- [illegible] آپ [illegible] کر [illegible] دکھائی دیتے ہیں؟
- [illegible] بھائی صاحب کا بھی انتقال ہو گیا؟
- [illegible] تو ہو ہی جاتا ہے؟

اور پھر یکدم چونک کر [illegible] والد صاحب کا انتقال؟
[illegible] یہ جملے جو کہتے ہیں جو سے
اس کے بعد آپ تاش کے پتے رکھ کر دھیں فرمائیں کہ ناچاہتے ہیں [illegible] آب تاکہ
آپ قادر کی اپنے بیچارے پر شرمندہ ہو جانا چاہیے۔ مگر جو کہ وہ صرف فقیر نہیں [illegible] جو ہے لہذا آپ
کے پیسے ساتھ اکٹھا ہیں اور جو کچھ ہاتھ میں تاش بھی ہوتے ہیں لہذا آپ گاڑی سے پتا کھیلتے ہوئے ہیں

- آپ کے والد مرحوم ——— جو کرتے
اور آپ کو جو کر بکنے پر جائے ان حضرت کے آپ کے کھیل کے ساتھ ہم بھی کرتے جاتے ہیں اور بات شروع کرتے

باتوں میں جیت لیتے ہیں۔ اس خصوصیت کی یہ خصوصیت مجھ کو
خیر یہ تو ایک تمثیلی منظر خواہ مخواہ بیچ میں آگیا ورنہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آپ کی اس خصوصیت کے جواب
اس لیے ناگوار نہیں ہے کہ مجھے آپ سے نہیں خود اپنے سے غرض ہے اور مجھے جو خصوصیت ہے وہ خصوصیت
میں خصوصیت بھی نہیں چاہتی اس لیے کہ خصوصیت نہ کوئی تجارتی لین دین ہے نہ جوابی پوسٹ کارڈ آپ کے پاس مجبوراً بھی صرف
اس شعر کی تفسیر بن جاتا ہوں

تیری محفل میں ہے اک ننگِ محبت بھی ترا
دیکھتا ہو کے پشیمان نہ جانے پائے

اور یہی غیرت ہے کہ میں اس محفل سے کبھی پشیمان ہو کے نہیں اٹھتا۔ ممکن ہے آپ کو اپنی اداؤں کا اندازہ نہ ہو اور اندازہ ہو بھی
کیسے سکتا ہے جب کہ نہ تو ان میں منافقت ہے نہ سیاست نہ مصلحت بلکہ یہ ادائیں آپ کی بے ساختگی ہو چکی ہیں میں نے یہ
مناظر دانستہ اس لیے پیش کر دیئے ہیں کہ

وہ کیا دیکھ سکتے ہیں اپنی ادائیں
ہمیں دیکھتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

آپ کے پاندان کی یاد میں ایک تازہ پان اپنے خاصدان سے نکال کر کھا رہا ہوں اور اس وقت آپ کا وہ تصور نگاہوں
کے سامنے ہے جب آپ بہت ہی خلوص کے ساتھ میرے لیے پان بنا کر اس میں اپنا نہایت نفیس دانہ دار تمباکو ڈال کر اور گلوری
بنانے کی کوشش میں سنبوسہ بنا کر بجائے مجھ کو دینے کے خود کھا جاتے ہیں اور پھر چونک کر لاحول پڑھتے ہوئے دوسرا پان بنا کر

مجھ کو دیتے ہیں۔ پان سے آپ کو وہی شوق ہے جو ہر شریف آدمی کو ہونا چاہیے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب رکھنے میں اگر شعر و شاعری کا ایک ہاتھ ہے تو دوسرا ہاتھ آپ کے پاندان کا ہے۔ اگر آپ اس جرم سے واقف نہ ہوتے تو معلوم نہیں آپ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرنے کے بجائے مجھ کو کتنے دن لگ جاتے۔ میں نے آپ کی سرمستی کے زمانے میں بھی آپ کی خود فراموشی دیکھی ہے۔ اور موجودہ عالم ہوش کی ہوشیاری بھی نظر کے سامنے ہیں مگر ان دونوں حالتوں میں اپنے پاندان سے آپ کبھی غافل نہ رہے۔ ؎

پاؤں ہٹ سکتے نہیں مرضیِ جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

جس وقت آپ کے سامنے پاندان کھل جاتا ہے اس وقت میری طرح آپ کا بھی یہی عالم ہوتا ہے کہ ؎

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے بہانے ہیں
خلد بیٹھے ہیں ہے فردوس سے پہلے ہیں

جگر صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ جو پان آپ ادھر آ کر کھاتے ہیں یا جس پان کو ہم پان سمجھ بیٹھے ہیں اس کا بھلا پان سے کیا تعلق۔ پان تو نہیں پان کا دھوکہ کھا رہے ہیں۔ کھاتے ہیں یہ پان اور تصور کرتے ہیں اس پان کا جو میسر نہیں ؎

اس پردۂ رنگین پہ نظر آتا ہے جو کچھ
جیسے کہ یہ اک خواب ہے معلوم نہیں کیوں

شکر ہے کہ دین کی ایک غنیمت قسم لاہور میں ملنے لگی ہے جس کو بیچنے والے میٹھا پان کہہ کر بیچتے ہیں اور ہم اس کو صبر کے پھل والے درخت کا پتا سمجھ کر کھا لیتے ہیں۔ اس پان کو طبیعت نے گوارا کر لیا ہے مجبوری کا صبر ہے اور صبر نے عادت کی صورت اختیار کر لی ہے لہٰذا اسی پان کی ایک گلوری کے لیے پھر ایک نعرہ بڑھاتا ہوں اور یہ خط ختم کرتا ہوں۔

شوکت

مولانا عبدالمجید سالک کے نام

گڑھی شاہو۔ لاہور

آقائی و مولائی

اگر ظلمی بغض کوئی چیز ہے تو ظلمی حب کے وجود سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہم کو بعض افراد سے خواہ مخواہ کا تنفر سا ہوتا ہے خواہ اس نفرت کی کوئی وجہ ہو یا نہ ہو بس ان کی صورت دیکھی اور طبیعت میں اشتعال پیدا ہوا۔ اسی طرح بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی طرف خواہ مخواہ دل کھنچتا ہے۔ میرے لیے آپ کی شخصیت کچھ اسی قسم کی ہے۔ اب سے چھبیس ستائیس برس پہلے جب میں لکھنؤ کے روزنامہ ہمدم کا مدیر معاون اور پھر مدیر تھا ہمدم کے معاصرین میں سے صرف انقلاب ہی ایک ایسا روزنامہ تھا جس کو میں نے اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھا اور اگر سچ پوچھیے تو اس کا بہروپ "حوادث و افکار" ہی تھا جس نے

وہ مزاج کچھ ایسا ہو گیا کہ اب کالم ... دو باتیں میری مزاج نگاری کی کشش پہلے ہی سے تھا۔ آپ نے جس یہ راہ دکھائی کی تھی شرف اس پر بے حد فخر کرتا ہوں آپ سے ملنے جاؤ اور دیکھو کہ آپ کے اور نیاز حضرت نے ایک صحبت اختیار کی۔ یہ آپ ہی کا منشا ہے کہ جب وہ ہوں یا یکھنے کو شائع ہو گیا۔ یہی جانا تھا مگر اس ... سب ہی آپ کی شہرت کی بات بازوں کا ہوا حلقہ ہوگی ؎

شفق نے چھوڑ لی جیسے غروب کی وادی ہے
جو ... مشرق کو ... زار کی

ایک پھول سی چاندنی کو ڈھالا ہی ... دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا کہ یہاں ... حیف اور ... ایک سلسلہ جو ... کہ مسرت ہوئی کہ کیا تو حاصل ہو جاتا مگر جست ابھی ہی ہے۔ فرض کیجئے کہ ے سامنے ہیں سالک صاحب ہیں۔ ... "نہیں بلکہ" یہ ... سمجھئے ذہن کیا تو لینا مگر اس معاملے میں بھی آپ کا بیا م شرب پا کر معلوم ہوا کہ منہ مانگی مراد مل گئی۔

مولانا آپ نے خود فرمایا۔ ہاں کے لیے منہ مانگی مراد کس قدر برجستہ آیا ہے۔ لیکن یہ ... بڑا قصہ ہے پچھلی بیٹھ ب وہ دن کہاں۔ وہ وقت کہاں وہ زمانہ کہاں۔ ماضی کی یہ یادیں کب تک ؎

گزر رہا ہے جو اس کے دن کی بات کرو

آخر کار تقسیم ملک نے اسی لاہور کو وطن بنا دیا جہاں ۱۹۲۳ء میں صرف ایک مرتبہ آنے کی تمنا تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ لاہور آکر مکان بھی آپ ہی کے محلے میں ملا۔ اللہ جانے یہ آپ کی کشش تھی یا میری طلب کا خلوص۔ غالباً دونوں ہی کا اس میں ہاتھ تھا۔ بہرحال یہ قرب اور یہ اتصال عارضی اور وقتی سہی مگر غنیمت ہے غنیمت۔ جو تو پاکستان بن جانے کے بعد محکمہ بحالیات کے انتظامات نے یہ صورت حال پیدا کر دی کہ ؎

دشتِ جنوں میں ہو گئی منزل ہماری بے سراغ
قافلہ کس طرف گیا بانگِ درا کو کیا ہوا

مگر شکر ہے کہ صرف محلہ ہی بدلا شہر نہیں بدلا اور تقویت کے لیے یہی غنیمت نظر آنے لگا کہ بہرحال آپ اسی شہر لاہور میں ہیں حالانکہ فاصلے نے صورت یہ پیدا کر دی کہ ؎

میسر جس سے آ جاتی تھی ساقی کی قدم بوسی
مقدر میں نہیں وہ لغزشِ مستانہ برسوں سے

یہ لغزش مستانہ ہی تو تھی کہ پنچولی اسٹینڈ سے گھر چلے ہیں کہ آپ کی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر قدم ڈگمگائے۔ سمت بدلی اور پہنچ گئے آپ کے پاس۔ گھر سے اسٹینڈ پر جاتے ہوئے آپ نظر آ گئے اور اسٹینڈ پر پہنچنا کچھ غیر ضروری سا نظر آنے لگا۔ اب تو کراچی شاہ ہوئے مسلم ٹاؤن جانا ایک ایسا سفر معلوم ہوتا ہے جسے انگریزی کا SUFFER کہنا چاہیے۔ حالانکہ اب بھی کہہ کہہ ... جی چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضری دی جائے اور آپ سے پوچھا جائے کہ جس ناز و نعم سے آپ نے

اپنے پان کھانے کے ذوق کو پہلے سے بڑھایا تھا وہ ذوق آجکل کس عالم میں ہے۔ یہ بہشت سی نژاد میاں آپ کا کہنا ہے کہ گلیوں گے اور انھیں کھا کر ستہ میں رستیاں بٹنے کا کارخانہ آپ سے کیسے کھل رہا ہوگا۔ میں نے تو بغیر پان کا تکلیف کے دل سے گلے پر گذر اوقات ہو رہی ہے۔ اگر کبھی دیسی پان مل جاتا ہے تو اسے چومتا ہوں۔ آنکھوں سے لگاتا ہوں اور اس کی خوشبو سونگھ کر اس طرح خوش ہوتا ہوں جس طرح عید بقر عید کو پان کھا کر خوش ہوا کرتے تھے۔ مگر جب یہ پان میسر نہیں آتا تو مہیا شدہ ملنے والے پان کے جو ملتے ہیں "تیمم" کا قائل ہو جاتا ہوں اور اب اس گلے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔

علت سی ہے نشہ ہے نہ شراب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

تو کیا آپ اب تک پان کھاتے ہیں۔ یعنی یہ کثیف پان؟ کاش آجکل آپ حوادث و افکار لکھ رہے ہوتے اور اس نام نہاد پان کو اپنا موضوع بنا کر اس کی قلعی کھولتے۔ حوادث و افکار پر یاد آیا کہ خدا کرے حوادث و افکار کی ایک مجموعہ کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت کا آپ کو بھی احساس پیدا ہو چکا ہو۔ کام آسان نہیں ہے ایک انبار ہوگا جس میں سے انتخاب کرنا پڑے گا مگر یہ کام ہو جانا چاہیے یہ ایک بڑا قیمتی ادبی سرمایہ ہے جسے بہر حال محفوظ کر لینا چاہیے۔ آپ کو سواد شہر لکھنؤ کی یاد میں گلے کی ایک تازہ خوراک بنا کر بھیجتا ہوں۔ آپ بھی پان کے بجائے جو دھوکہ آجکل کھا رہے ہیں کھائیے۔

شوکت تھانوی

لتا منگیشکر کے نام

گوالمنڈی شاہرہ - لاہور

عالمہ محترمہ،

آپ کے نام یہ خط اس ذیل میں ہرگز نہیں آتا کہ ؎
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

اس لیے کہ جس حد تک ملاقات ضروری ہے وہ ہوتی ہی رہتی ہے۔

تو نہیں تو کیا ہوا کونسی کمی رہی
ہم ترے بغیر بھی تجھ سے ہم کلام ہیں

آپ کی نواؤں سے جو دنیا آج گونجی ہوئی ہے اسی دنیا کے بسنے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ آپ کی یہ دنیا صرف بھارت یا پاکستان تک محدود نہیں بلکہ آپ کے نغموں کی گونج میں تو افغانستان، سیلون، ایران، برما، انڈونیشیا بھی بستے ہیں انگلستان اور امریکہ کی نشرگاہیں بھی آپ کی آواز فضا میں منتشر کرتی ہیں اور یہ آفت ہوش و ایمان آواز تو در در اور گھر گھر پہنچی ہوئی ہے۔ کون سا خطہ ہے جہاں یہ شراب نہ برستی ہو۔ ان نغموں کی زبان کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر یہ گیت گنگنانے والے وہاں بھی مل جاتے ہیں جہاں اردو ابھی تک نہیں پہنچی ہے۔ میں نے اردو کے سب سے بڑے محسن مولانا عبدالحق کے نام جو خط لکھا ہے

آپ کی شخصیت ہندوستان کے [illegible] کی علامت ہے۔ [illegible] جس کے سائے اس ہندوستان کے [illegible] اپنا اس بہانے [illegible] اردو [illegible] کا روپ ہے [illegible] اور ان کے جیسی [illegible] ملک میں پہنچ چکی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کو ابھی تک [illegible] آپ نے کی ہے اردو کے کسی [illegible] یا اردو کے کسی [illegible] ادارے سے نہیں ہو سکی ہندوستان کے غیر اردو لوگوں [illegible] ہیں تو ہندوستان [illegible] پاکستان سے باہر بھی [illegible] گئے ہیں کہ

شمع پہ اگر گرے تو کیسا جل جل کے پروانے
مر کر جینا ہی رمز ہے تو کیا جانے

بجا ہے

آپ کی آواز کی ایک ہی صدا سے [illegible] حضرت رنگین کو [illegible] ہیں اور مصرعہ پڑھ کر [illegible] آتی [illegible] اقبالیات سے [illegible] ہو جائیں وہ [illegible] ہیں اور جو رفتہ کو آواز دیتے ہوئے گاتے ہیں ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

آواز کا یہ جادو اور موسیقی کا یہ تاثر ہی تو ہے کہ ہندوستان سے اردو کو نکالا جا رہا ہے مگر آپ کے گانوں میں جو اردو سنائی ہوتی ہے وہ سر آنکھوں پر قبول ہے۔ اردو کے لیے بھارت کے دل کو جتنا تنگ کیا جا رہا ہے آپ کی آواز اتنا ہی کشادہ کرتی جاتی ہے حالانکہ یہ بھی درست ہے کہ ؎

کون روتا ہے منزل کے ہم دو زیست دل
نہ رہا زندہ دیا بیس تو کیا دل کی کشود

مگر جب تک آپ کے لفظوں کی گونج باقی ہے کم سے کم اس وقت تک اردو آپ کے ملک میں زندہ رہے گی۔ یوں تو آپ کے پردھان منتری بھی اردو کا دم بھرتے رہتے ہیں اور ان کے ملک میں اردو کا جو خون ناحق ہو رہا ہے اس سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر یہ خون ان کے دامن پر نہ سہی ان کی حکومت کے دامن پر بہرحال نظر آ رہا ہے ؎

لہو بسمل کا مقتل کی زمیں پہ
نہ دامن پہ نہ ان کی آستیں پہ

بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے گیتوں کی شکل میں جو اردو ہندوستان میں اب تک قابل قبول بنی ہوئی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کی قدیم روایتوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گانے سے جانور تک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے پھر یہ تو اردو کے لاکھ دشمن سہی مگر انسان تو ہیں ہی۔ کرشن جی کی بانسری کی لے پر اگر گئو ماتا چرنا چھوڑ دیتی تھیں تو تنگ

نغموں کی دھن میں اس امتیاز کا ہوش کس کو ہو سکتا ہے کہ اس آواز کے پردے میں اردو ہے جو روح میں سمائی چلی جاتی ہے۔ مگر یہی ہوش آجائے تو وہ ہیچ آتشیں کرے

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

بہر صورت اردو کی جو نشر و اشاعت آپ کی حسین آواز کے ساتھ ہوئی ہے اس نے اردو کو ہندوستان بھر میں عام بنا دیا ہے۔ کوشش کی گئی تھی اردو کے باب میں ایک ہندوستانی گرستانا پیدا کرنے کی مگر آپ کے نغموں نے اردو کی ایسی گونج پیدا کی ہے کہ اس نقار خانۂ اردو میں ہندی کے طوطی کی آواز مشکل سنی جا سکتی ہے۔ مانگی جا رہی تھی اردو کے لیے علاقائی حیثیت مگر آپ کے گانوں نے اس کو ملک گیر حیثیت خود بخود دے دی۔

مکتوب یہیں تک پہنچا تھا کہ ریڈیو سے آپ کا نغمہ ابھر کر فضا پر چھا گیا۔ لہٰذا اب میں بھی ایک تازہ پان کھا کر آپ سے باتیں کرنے کے بجائے آپ کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں آپ پان کھاتی ہیں یا نہیں مگر میں بغیر پان کھائے آپ کا گانا سننا ایک قسم کی گستاخی سمجھتا ہوں۔ ایک معطر گلوری منہ میں ہو اور کانوں میں آپ کی آواز کا رس گھل رہا ہو تو اس دو آتشہ کا کیف مجھ کو واقعی گم کر دیتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ کو نہ ڈھونڈے۔

شوکت تھانوی

قاضی جی

(دروازہ پر دستک)

اجمل: جناب قاضی صاحب۔ قاضی جی تشریف رکھتے ہیں؟

بیوی: کون اجمل بھائی؟ جی آ رہی ہوں۔ دروازہ کھولتے ہوئے

اجمل: (داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض بھابی۔ بیٹے کیسے یاد فرمایا تھا۔ دراصل قاضی جی کہاں تشریف لے گئے؟

بیوی: کیا بتاؤں میں اجمل بھائی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیسے سمجھاؤں کس طرح۔ اب یہ دھن سوار ہے کہ کسی فلم کمپنی پر قبضہ مل جائے۔

اجمل: فلم کمپنی پر قبضہ؟ ان کو کیا معلوم کہ فلم کا سر کدھر ہوتا ہے اور دُم کدھر۔

بیوی: یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ فلم کمپنی تو دوسری چیز ہے زندگی بھر ایک مشکل سے دو تین تماشے دیکھے ہوں گے مگر دھن یہ ہے کہ فلم کمپنی اگر مل گئی تو جیسے دنیا ہی ترا لے گئے۔

اجمل: مگر یہ فلم کمپنی کی سوجھی کیسے؟

بیوی: اللہ جانے فلم کمپنی بخار کا دورہ کیسے پڑ گیا ہے۔ دو دن سے نہ جانے کیا کیا خرافات لکھ رہے ہیں۔ اب یہ رٹ ہے کہ فلم کمپنی لے کر چھوڑوں گا۔ خدا جانے کیا کیا خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں۔

اجمل: اور تشریف کہاں لے گئے ہیں؟

بیوی: جانے کہاں اندر کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ آؤ تم ہی کچھ سمجھاؤ خدا کرے تمہاری ہی بات سمجھ میں آ جائے۔

(دونوں جاتے ہیں)

قاضی جی: اخاہ۔ اجمل صاحب ہیں۔ بھئی خوب آئے۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو نہایت ضروری مشورہ کرنا ہے۔ بلکہ اب یہ طے ہے کہ یا تو ہم دونوں بن گئے ورنہ جہاں ستیاناس وہاں ساڑھے ستیاناس سہی مگر دوست پھڑک اٹھو گے وہ ترکیب تمہارے اس ہیچمدان کے ذہن میں آئی ہے۔ قسم خدا کی سونے کی کان سمجھو سونے کی کان۔

اجمل: اللہ مبارک کرے مگر کچھ معلوم تو ہو کہ واقعہ کیا ہے؟

بیوی :- فلم کمپنی کھل رہی ہے ؟

قاضی جی :- کھل رہی ہے بلکہ کھل گئی۔ خدا چاہتا ہے تو اس سے زیادہ نفع کسی کاروبار میں نہیں ہے۔ مٹی سے سونا بناؤ۔ دیکھ لینا یہ دلدر دھل جائیں گے دن پلٹ جائیں گے۔ موٹریں اڑاتے پھرو گے موٹریں۔ اماں میں تو یہ کہتا ہوں اجمل صاحب کہ زندگی کو ناحق میں نے برباد کر دی اور یہ ترکیب اب ذہن میں آئی ہے جب قبر میں پیر لٹک چلے۔ مگر خیر دیر آید درست آید۔

اجمل :- یہ تو درست ہے مگر قبلہ آپ سے اور فلم کمپنی سے کیا تعلق۔ آپ کو اس کا کیا تجربہ ؟

قاضی جی :- بھئی پھر وہی بچوں کی سی بات کی تم نے۔ عزیزمن بہت سی صلاحیتیں انسان میں ایسی ہوا کرتی ہیں جن کا اس کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر مجھ کمبخت کو اپنی اس صلاحیت کا پہلے سے علم ہوتا تو آج بھلا میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ مگر اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میری تو جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ اور اب مجھ کو معلوم ہوا ہے میں دراصل کیا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو حیرت ہو کہ دو ہی دن میں کتنا بڑا کام میں نے کر لیا ہے۔ کہانی مکمل۔ گانے ختم۔

اجمل :- یعنی آپ نے لکھے ہیں گانے اور کہانی وغیرہ ؟

قاضی جی :- میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم کو حیرت ہوگی۔ ارے صاحب مجھ کو خود یقین نہیں آتا کہ میں ایسا قابل ہو سکتا ہوں مگر یہ تو مجھ کو کچھ خدا کا فضل نظر آرہا ہے۔ ہماری کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا۔ استغفراللہ۔

اجمل :- استغفراللہ ؟

قاضی جی :- نہیں صاحب یہ تو میں بیگم صاحبہ کے رُخِ روشن کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں کہ میں تو فلم کمپنی کی باتیں کر رہا ہوں اور وہ اس طرح منہ بنائے ہوئے ہیں گویا میں گھاس کھا گیا ہوں۔ میں چغد ہوں میں پاگل ہو گیا ہوں۔ ارے صاحب اب تک تو خیر میرے متعلق جو کچھ یہ کہتیں وہ ایک حد تک ٹھیک تھا مگر اب تو ان کو بجا فخر کرنا چاہیے کہ کیسی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک گویا ان کا شوہر ہے ؟

بیوی :- میں تو کہتی ہوں کہ خدا جانے میری قسمت میں لکھا کیا ہے۔ تم روز بروز بہکتے ہی جاتے ہو۔ بھلا بتاؤ یہ باتیں میرے ڈرنے کی ہیں یا نہیں کہ تم نے فلم کے لیے کہانی لکھ لی ہے تم نے گانے لکھ ڈالے ہیں۔ میں تو سچ مچ تمہاری طرف سے بے حد پریشان ہو گئی ہوں کہ خدا جانے میرے مقدر میں کیا لکھا ہے !

قاضی جی :- ملاحظہ فرمائیے آپ کی حماقت ؟ خیر تم مجھ کو پاگل ہی سمجھو مگر جس وقت لوگ تم کو میری بیوی سمجھ کر سر آنکھوں پر جگہ دینے لگے اس وقت تم کو اس پاگل اس خبطی اس نامعقول شوہر کی قدر و منزلت کا پتہ چلے گا۔ تو خیر۔ ہاں تو اجمل بھائی ہماری فلم کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا اتفاق ؟

اجمل :- اتفاق۔ اتفاق سے آپ کا مطلب اتحاد سے ہے ؟

قاضی جی :- یہی تو خوبی ہے اس نام میں کہ یہ مطلب بھی ہے اور وہ مطلب بھی جو تم نہیں سمجھے۔ کہانی میں نے اس طرح شروع کی ہے کہ ایک ربڑ ٹائر ٹانگہ ہے جس پہ پردہ بندھا ہوا ہے گویا اس میں زنانی سواریاں ہیں اور وہ

گلا صاف کر کے بھنبھناتی آواز سے گا رہا ہے اور تانگے والا گا رہا ہے ـــ

میری چھوٹی سی لاگیں ہیں - اُن پر - اُن پر - میرا تانگہ اُڑا جائے

میرا تانگہ اُڑا جائے   یہ گھوڑا بڑا نٹ کھٹ

تو لے سرپٹ   چال دکھائے

میں موڑی سی سڑکوں پر - اُن پر - اُن پر میرا تانگہ اُڑا جائے

جتنا ہی بھی جل سواری   تین سواری

بیوی: (ہنس کر) بھئی واہ - بس خدا ہی تم پر رحم کرے!

قاضی جی: ہاں ہوں، واہ واہ، اگر اس بات سے کوئی گانا چھپ جاتا ہے۔ مجھے تو تیرے غصے اور ہنسی نے دو دلی کی تشریح کر دیا۔ تم کہنا چاہو تو کہو کہ میں نے ہی مزہ پہنچا دیا ہے۔ بیگم صاحب دھوئیں کے ساتھ چلتی ہوئی دھوئیں کی شکل میں آ گئی تو دیکھنا کیسی قیامت ہوتی ہے!

اجمل - بھائی ذرا ٹھہریئے دیکھئے مجھے تو بڑے مزے کا لطف آ رہا ہے۔ قاضی جی کے یہ کمالات تو آج [illegible] مجھ پر روشن ہوئے ہیں!

قاضی جی: ارے صاحب ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ سوم جو رہ جاتے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا جانے دو اس کا لطف تو سارا اسی میں آئے گا کہ دل تھام کر بیٹھئے۔ صاحب وہ تانگے والا اسی طرح گاتا جا رہا ہے کہ ایک موڑ پر ایک موٹر سے ٹکر ہو جاتی ہے اور تانگے کی سواری نکل کر سڑک پر گر پڑتی ہے۔ قسمت کا کھیل ہے۔ موٹر چلانے والا نوجوان اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اور اس کو اسی بے ہوشی کی حالت میں موٹر پر ڈال کر چل دیتا ہے اور اپنی عالی شان کوٹھی میں لے آتا ہے اور علاج کرتا ہے وہاں سے ایک واقعہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کو ہوش آجاتا ہے"

بیوی: (ہنس کر) ذرا اور سنو۔ یہ واقعہ ہوتا ہے!

قاضی جی: خیر خیر۔ تم کو تو نکتہ چینی سے مطلب ہے۔ مگر خدا کے لیے کہانی کے لطف کو غارت نہ کرو یہ بڑا پُر لطف موقع ہے تو جناب وہ ہوش میں آتے ہی کہتی ہے۔ میں کہاں۔ وہ جواب دیتا ہے۔ آپ یہاں۔ وہ کہتی ہے الٰہی یہ بیداری ہے یا خواب۔ وہ کہتا ہے۔ جو کچھ بھی سمجھیں جناب۔ وہ کہتی ہے۔ میں تانگے پر جا رہی تھی۔ وہ کہتا ہے۔ میں موٹر پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ تانگے والا گا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ یہ بھی اتفاق کہ میں سیٹی بجا رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ پھر تانگہ لڑا۔ وہ کہتا ہے آپ کو بالکل ٹھیک یاد پڑا"

بیوی: تو کیا پوری کہانی سناؤ گے اس وقت"

قاضی جی: لیجئے یہ ہوئی ہے قدر افزائی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب تم پر میری قابلیت کا سکہ جمنا شروع ہو گیا ہوگا۔ مگر وہ مثل کہ بھینس کے آگے بین بجائی بھینس نے کہا بھینس بولی۔ گویا بھینس نے کوئی عمل سا جواب دے دیا۔

خیر تم سے تو مجھ کو اسی قسم کی توقع تھی۔ مگر ان میاں اجمل سے پوچھو کہ ایمانداری سے ساتھ لے دو ہی کہ کس قیامت کی روانی ہے۔ اس قدر۔ تالیاں بجیں گی اس مکالمہ پر کہ ہم ہی صدقہ اتاروں گی مجھ پہ سے کہ صاحبہ کو نظر بد سے بچائے رکھے۔"

اجمل: "یہ تو ٹھیک ہے قاضی جی مجھ کو نہ تو اس کہانی پر کوئی اعتراض ہے نہ ہی گانے کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مگر فلم کمپنی ان ہی دو چیزوں پر تو ختم نہیں ہو جاتی۔ سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی ایسا کام یا اس سے ملتا جلتا کوئی کام شروع سے کیا ہی نہیں ہے۔"

قاضی جی: "نہ ہی۔ اسے بھی نہیں کیا ہے تو نہ سہی۔ اب کریں گے۔ اور دیکھ لینا یہ سارے کریں گے اس کام کو کہ دنیا تشدد دیکھ کر رہ جائے گی اور فرض کر لو کہ نصیب دشمناں شیطان کے کان بہرے۔ نہ چلی یہ کمپنی تو بھی اپنی گرہ سے کیا گیا۔"

بیوی: "ہاں اور کیا تماشے ہی تو ایک تماشہ ہو گیا اور جو لوگ اس کام کو کر سکتے تھے۔ ایک تو ان کا حق مارا گیا دوسرے تماشہ اس شوق کے پیچھے اپنے پاکستان کی ایک صنعت یوں غارت ہوئی۔"

قاضی جی: "لیجئے لے آئیں وہ گھما پھرا کر اپنے پاکستان کو اس ذکر میں بھی۔ کوئی پوچھے ان عقلمند سے کہ بھلا اس میں پاکستان کا کیا ذکر تھا مگر معلوم نہیں یہ پاکستان ان کی زبان پر کیوں اس قدر رچ گیا ہے یہ بات پاکستان وہ بات پاکستان۔ پاکستان نہ ہوا جناب کا تکیہ کلام ہو گیا۔ اور اگر پاکستان کو آپ میرے سلسلہ کوئی طعنہ سمجھتی ہیں تو کان کھول کر سن لیجئے کہ میں بھی کوئی انگلستان کا رہنے والا نہیں ہوں۔ پاکستان اگر تمہارا ہے تو میرا بھی ہے۔"

اجمل: "پاکستان زندہ باد۔ آج تو شکر ہے کہ پاکستان کو آپ نے بھی اپنا لیا۔ اچھا اب جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔"

قاضی جی: "فرمایئے۔ فرمایئے۔ آپ کے لیے تو ضروری ہے۔ کہ اپنی بھاوج کی طرفداری کریں۔ اس غرض سے بھلا آپ غافل ہو سکتے ہیں۔ بہرحال آپ کو جو کچھ فرمانا ہے ارشاد فرمایئے ۔۔۔ میں سننے کے لیے پیدا ہوا ہوں ۔۔۔ وہ۔ وہ۔ ہائے ہائے کتنا لاجواب شعر تھا اس وقت بالکل یاد نہیں آ رہا ہے۔"

اجمل: "قاضی جی بھائی کا اور میرا مطلب یہ ہے کہ یہ فلم کمپنی آپ کے بس کا روگ نہیں ہے آپ کو اگر کچھ کرنا ہی ہے تو ایسا کام کیجئے جس کا آپ کو کچھ تجربہ ہو جس کی کامیابی کا آپ کو یقین ہو۔"

بیوی: "اور کیا۔ کرنا ہی چاہیئے وہ کام جس سے خود اپنے کو بھی فائدہ پہنچے اور ملک اور قوم کو بھی فائدہ پہنچنے کی امید ہو۔"

قاضی جی: "خدا کے لیے کبھی تو مجھ نامراد سے اس طرح باتیں کیا کرو۔ جس سے مجھ کو یقین آ سکے کہ یہ میری بیوی گفتگو کر رہی ہے میں تو کانپ جاتا ہوں تمہاری زبان سے ملک اور قوم قسم کے الفاظ سن کر۔ ارے صاحب آپ میری اہلیہ ہیں میری رفیقۂ حیات ہیں۔ میری شریک غم ہیں مگر اس قسم کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا بیوی کے بجائے یا تو آپ اخبار بن گئی ہیں یا کوئی بہت بڑی لیڈر واقع ہوئی ہیں۔ اور پھر یہ کہ بات جو کہتی ہیں وہ نہایت مہمل جس کام کا مجھ کو تجربہ ہے وہ کیا خاک کر سکتا ہوں۔ تھانیداری کی ہے زندگی بھر اب بتلایئے میں تھانیداری کیسے

کر سکتا ہوں؟

بیوی: اصل سوال یہ ہے کہ تم ڈاکٹری کیوں نہیں کرتے؟

قاضی جی: ڈاکٹری (مسکرا کر) اس کا حق کہاں ہے بیوی جی مجھے ہو کر جی۔ میں ڈاکٹری بھلا کیسے کر سکتا ہوں جب کہ میں تمیز نہ کر سکوں کہ انسان کی کون سی رگ ہوتی ہے اور کس میں کس کا حساب ہوتا ہے ...

بیوی: بس ٹھیک ہے اسی طرح کرو۔ میں نہیں جانتی کہ تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو۔ تم ڈاکٹری کے تجربوں سے ڈرتے ہو؟

قاضی جی: یہ تو صاحب ڈاکٹر بننے کا مطلب ہے یہ بے ہودہ طریقہ ہے کہ انسان کو مار ڈالا جائے۔ بلکہ خود ہی دیکھ لو کہ تم میں سے کون ڈاکٹر ہے یا نہیں۔ مجھے لگتا ہے نہیں؟

بیوی: خدا کے لیے یہ کہنا چھوڑو اب تم نے کسی کو سنا ہی نہیں لوگ مذاق اڑاتے ہیں گے؟

قاضی جی: کیا مطلب ہیں! اس قدر بیزار ہیں اس قدر مصروف ہیں۔ جب ذرا تو حساب بیٹھتی ہے مطلب یہ ہے کہ میں ایک ہو کر ایسی باتیں کہہ رہی ہو کہ کوئی اور ہے کیا نہ لکھے ہو سکتا ہے۔ یہ سعدی والی بات ہوتی کہ سعدی اپنے — — — وہ تو فارسی میں ہے۔ سعدی یا دوست خوشتن و یاد۔ خدا نہ کرے کوئی شخص اپنے گھر ہی میں ذلیل سمجھا جائے۔ میرا کیا ہے سب کچھ سن رہا ہے کہ کسی نا قدرے کی بات کا ذکر بھی کروں تو سمجھو میری اوقات ہے؟

(غصے میں چلے جاتے ہیں)

——————

منشی جی

(منشی جی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں کچھ ہانپ رہے ہیں گویا دوڑتے ہوئے آئے ہوں اور بیوی کو آواز دیتے ہیں۔)

منشی جی: "میں نے کہا منتی ہو اجی کہاں گئیں؟ لاحول ولا قوۃ ہمیشہ کام کے وقت ندارد"

بیوی: "آئی۔ رہی ہوں۔ تم تو گھبرا دیتے ہو ابھی گری ہوتی موئے دوپٹے میں اُلجھ کے"

منشی جی: "اجی میں نے کہا وہ آیا ہے تصویر والا۔ تصویر کھینچنے والا۔ اُس کے ڈبّہ پر لکھا ہوا ہے ...... اونہہ...... کچھ بھلی سی بات لکھی ہوئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ کبھی جو یاد آجائے"

بیوی: "تو مطلب کیا ہے تمہارا۔ کھنچوا لو نا تصویر۔ کیا اچھے معلوم ہوں گے بیچارے اس بڑھاپے میں تصویر کھنچواتے ہوئے"

منشی جی: "کیا مطلب اس کا یعنی بڑھاپے میں تصویر ہی نہیں کھنچوائی جاتی۔ تمہاری اسی بات کا کچھ جواب اسی تصویر کھینچنے کے ڈبّہ پر لکھا ہوا ہے۔ ذرا تم جھانک کے دیکھو تو باہر"

بیوی: "میں کیا کروں گی دیکھ کر تم کو تصویر کھنچوانا ہے تو کھنچوا لو نا میرا سر کیوں کھا رہے ہو"

منشی جی: "میرا مطلب یہ تھا کہ تم بھی کھنچوا لیتیں تصویر"

بیوی: "لو اور سنو میں تصویر کھنچواؤں گی؟"

منشی جی: "تم بیٹھنا کرسی پر اور میں پیچھے کھڑا ہو جاؤں گا معلوم ہوگا جیسے میاں بیوی ہیں ہم تم"

بیوی: "خیر آپ مجھے تو معاف رکھیے اپنی ہی تصویر کھنچوا لیجئے۔ خدا نہ کرے کہ میں اس بڑھاپے میں ایسی سٹھیا جاؤں کہ موئی تصویر کھنچواتی پھروں"

منشی جی: "میرا کیا ہے میں نے تمہاری ہی بھلائی کے لیے کہا تھا کہ تمہاری بھی یادگار رہ جاتی . . . ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے یہی لکھا ہے اس ڈبّہ پر کہ . . . . کہ . . . . . لو پھر بھول گیا۔ تم تو تم نے حواس کھو دیتی ہو اپنی بک بک میں ......"

[illegible] کو دیکھ کر بہت شرمندگی ہوتی ہے :

بیوی : بس تم ہی ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہو جواب بہت سے ہی جاؤں گی۔ مگر ضرور تمہیں [illegible] رہو گے :

منشی جی : بیگم آج یہ دوبارہ کی بحث تم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیا ترکیب ہے (دونوں جاتے ہیں مگر باتیں کرتے جاتے ہیں) میں نے کہا تھا کہ تصویر ہی آرام کی جگہ ہے — وہ دیکھو سنو بیگم [illegible] ہے نا :

بیوی : ہاں دیکھ رہی ہوں کیسے ہو :

منشی جی : تو کہتا ہے کہ انسان کی ...... اصل یادگار ...... کیا ہے ؟ تصویر۔ یعنی کہ میں تو میری یادگار رہ جائے گا جاتا ہوں اپنی اور تمھاری تصویر :

بیوی : اپنی یادگار کے لیے کیا اوکھی [illegible] یادگار کیا ہوگی ؟

منشی جی : یادگار کیا ہوگی وہ بھی سخت جاہل ہو۔ خیر جانے دو تم تو خیر [illegible] بھی ہو، ارے صاحب یادگار کے معنی یہ ہیں کہ اگر والد صاحب کی تصویر میرے پاس نہ ہوتی تو بھلا میں ان کو یاد رکھ سکتا تھا ؟ بیات تک تو یاد نہ رکھتا۔ والدہ صاحبہ کی تصویر نہیں ہے تو یقین جانو کہ کس مردود کو یہ بھی یاد ہو کہ ان کی صورت کیسی تھی :

بیوی : اور صورت یاد ہی رہتی تو تم کیا کر لیتے ؟

منشی جی : کیا کر لیتے ؟ یہ کیا بات ہوئی ؟ ارے صاحب خوش ہوتے دیکھ دیکھ کر۔ اب والد صاحب کی تصویر دیکھ کر کم سے کم یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے والد صاحب بھی تھے :

بیوی : اے جب انسان ہی کو دنیا میں رہنا نہیں ہے تو تصویر موئی رہ کر کیا کرے گی ؟

منشی جی : لا حول ولا قوۃ۔ وہ تصویر والا باہر کھڑا ہوا شور کر رہا ہے اور تم بحث کر رہی ہو مجھ عزیز من ...... یعنی ...... یعنی بیگم صاحب اگر انسان کو دنیا میں رہنا ہوتا تو تصویر کی کیا ضرورت تھی ؟ مگر تصویر تو اسی لیے ضروری ہے کہ انسان کو رہنا نہیں ہے یہاں تمہارا قسم ایسی بات کر رہا ہے [illegible] کہ اب تم کو چپ ہو جانا چاہیے۔ ایں ؟

بیوی : تو میں کچھ کہہ بھی رہی ہوں تم کو کس نے روکا ہے البتہ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں تصویر نہیں کھنچواؤں گی :

منشی جی : شبن جب میری عمر کو پہنچے گا تو میری تصویر دیکھ دیکھ کر کیسا خوش ہوگا کہ میرے [illegible] والد تھے ہائے بیچارہ تم کو یاد بھی نہیں رکھے گا۔ میرا کیا ہے :

بیوی : اس موئی بڑھاپے کی تصویروں والی ڈراؤنی صورت کو یاد رکھنے سے نہ یاد رکھنا ہی اچھا ہے تم کو شوق چرایا ہے، تم کھنچواؤ :

منشی جی : اچھا بھائی اب کون تم سے بحث کرے مگر میں تو کھنچواؤں گا۔ ذرا منہ ہاتھ دھونے کا پانی صابن اور [illegible] آئینہ کنگا

شرم و ڈھو تو رکھو حد :

بیوی : شرم تو نہیں آتی کہ بڑھاپے میں یہ سولہ سنگار کر کے تصویر کھنچواتے ہو ایسے جیسے ہمارے ابا سسرال
تو بیاہ رہے ہیں :

منشی جی : خیر خیر یہ وقت مذاق کا نہیں ہے کہیں وہ انتظار کرتے کرتے باہر ہی سے چل دئیے ذرا انہیں [illegible]
کہہ دوں۔ تم پانی وانی رکھ دو۔ پھر ذرا میرے کپڑے نکال دو۔ (جاتے جاتے ہوئے) وہ جامہ وار کی اچکن اور
اور میرا نیا جوتا۔ (دروازہ کھول کر) بھائی ذرا ٹھہر جانا میں بس تیار ہی ہو رہا ہوں :

تصویر والا : (دور کی آواز) جلدی کیجئے صاحب دھوپ جا رہی ہے۔ پھر وقت نہیں رہے گا :

منشی جی : (واپس آتے ہوئے) ابھی لو۔۔۔ ابھی لو۔۔۔ (بیوی کے پاس آ کر) اجی بیگم جلدی ہو وہ کہہ رہا
ہے کہ دھوپ جا رہی ہے۔ اور تم ہو کہ بیٹھی ہو ؟

بیوی : تم جب تک منہ دھو لو اور وہ اچکن کونسی کہی تھی ؟

منشی جی : تو یہ ہے ارے صاحب وہی شادی والی اچکن جامہ وار کی اور نیا جوتا۔ لاؤ یہ ڈبا ادھر کھسکا دو۔ یہ دیکھو
منجن ادھر کدھر گیا۔۔۔۔ وہی۔۔۔۔ ارے صاحب۔ وہ وہ۔۔۔۔ صابن دان :

بیوی : سامنے رکھا ہے اندھے دکھائی نہیں دیتا۔ اور کچھ چاہئے ہے کہ میں جاؤں بس کپڑے نکالنے :

منشی جی : نہیں بس تم کپڑے لاؤ جلدی سے۔ شاباش :

(بیوی جاتی ہے۔ منشی جی منہ دھوتے ہیں منہ دھونے کی آواز
کے ساتھ ہی منشی جی بڑی زور سے کہتے ہیں۔)

منشی جی : لاحول ولا قوۃ۔ آخ تھو۔۔۔۔ تھو۔۔۔ تھو۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ :

(بیوی دوڑی ہوئی آتی ہیں۔ منشی جی برابر تھوک رہے ہیں)

بیوی : یہ کیا ہے آخر۔۔۔ یہ کیا ہوا ؟

منشی جی : آخ تھو۔۔۔۔ ہوا کیا۔۔۔۔ آخ تھو۔۔۔۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ منجن کے بجائے صابن لگا
لیا دانتوں پہ۔۔۔۔ تھو۔۔۔۔ آخ تھو :

بیوی : (ہنسی سے دوہری ہو کر) منجن سے منہ دھو لو نا اب اور اسی طرح تصویر کھنچوا لو :

منشی جی : اب مذاق ہی کرو گی یا آئینہ کنگھا بھی دو گی مجھے ؟

بیوی : رکھا تو ہے آئینہ کنگھا دیکھا بھی تو کرو :

منشی جی : ٹھیک ہے۔ اب ذرا ازار بند تو ڈال دو پاجامہ میں۔ بھئی خط بہت بڑھا ہوا ہے اب کیا ہو ؟

بیوی : اب میں اس کا کیا جواب دوں میرے ہاتھ کا کام تو یہ ہے نہیں کہ میں خط بھی بنا دوں ؟

منشی جی : خیر ہو گا بھی۔ ذرا سا گوند تو نہیں ہے گھر میں ؟

بیوی: گندہ! گندہ کیا ہوتا ہے؟
منشی جی: ارے بیگم صاحب یہ تو تعلیم ہی ختم کرنے لگی ہو۔ بات بات پہ۔ مطلب یہ کہ ذرا مونچھوں پہ تاؤ دے
رہو تو تصویر رعب دار ہو جاتی ہے۔
بیوی: تو کہتے مری مونچھیں چھپا لی جائیں گی؟ ویسے دیکھو مونچھیں کدھر ہیں۔
(بیوی جاتی ہے)
منشی جی: دیکھا ادھر دوڑو یہ شال کر بیٹا بڑا نیچے کے پاس ہے ارے صاحب ابھی بچہ ہو؟
بیوی: اگر یہ بیچ اتر کر بیٹھے بیٹھے ہو۔ خود تو لڑکا تھا کہ زندہ بیٹھے گا گود ارا؟
منشی جی: ہا ہا صاحب۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے یہ بیٹا ہوا جیسے ابھی کیچے کی میری تصویر؟
بیوی: ارے صاحب میں نے دیکھا بھی نہیں تو اس کا کیا ہے یہ تو کہتے ہو، ابھی کوئی بچہ ہے گا؟
منشی جی: بچہ ہے گا؟ ارے صاحب نیچے کے پاس سے بیٹا بڑا ہے نیچے کے پاس سے۔
بیوی: تو کیا نیچے گھٹنوں پہ رہتا ہے تمہارے یہاں؟
منشی جی: وہ تو اس حسن کے انداز سے ٹھیک ہے یہ تو اوپر ہی رہے گا۔ اچھا لاؤ ذرہ گوند۔ ہاں یہیں اب ٹھیک
ہے مطلب یہ کہ تصویر کھنچوائی جائے تو ذرا ڈھنگ کی تو ہو۔
بیوی: لے یہ کیسی ڈاڑھی ہو گئیں مری مونچھیں معلوم ہوتا ہے جیسے چوہا دم اٹھائے ہوئے ناک پہ بیٹھا ہے۔
منشی جی: ایں ... ہاں واقعی۔ ذرا قینچی نکالنا اپنی پٹی سے۔
بیوی: کیا اب کاٹی جائیں گی مونچھیں اس وقت؟
منشی جی: یہیں دیکھ رہی ہو کہ ایک تو ہے بس نتھنوں تک اور دوسری تو دیکھو کہاں جا رہی ہے۔
بیوی: تو یہ چھوٹی بڑی کیسے ہو گئیں؟
منشی جی: اب میں کیا جانوں کیسے ہو گئیں۔ تم قینچی لاؤ بحث بعد میں کر لینا۔
بیوی: اب مونچھوں کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔ لو یہ قینچی۔
منشی جی: ادھر آؤ ذرا یہ آئینہ پکڑ کر مونچھوں کی سیدھ میں کھڑی ہو جاؤ۔
بیوی: لو بس ٹھیک ہے نا۔
منشی جی: ایں۔ ٹھیک ہے۔ مگر نہیں یہ تو بھویں ہیں، ذرا نیچے رکھو آئینہ۔ اور نیچے۔ بس بس اب ٹھیک ہے
یونہی رہنا۔
بیوی: کہیں زیادہ نہ کٹ جائے مونچھ۔
منشی جی: زیادہ کیسے کٹ جائے گی۔ تم ڈر کر تو نہیں لے (مونچھ کاٹ کر) یہ لو۔
بیوی: کٹ گئی نا زیادہ۔ کیا برا منہ ہو گیا۔

منشی جی :- زیادہ کٹ گئی؟ یہ کیسے کٹ گئی؟ اب یہ اُدھر والی بڑی معلوم ہونے لگی :
بیوی جی :- اب کہیں اسے بھی نہ کاٹ دینا :
منشی جی :- تو کیا تمھارا مطلب یہ ہے کہ میں اس ڈیڑھ مونچھ کی تصویر کھنچواؤں ؟
بیوی جی :- میرا کیا ہے تم اپنی گت بنائے جاؤ ذرا آئینہ تو دیکھو۔ کیسی موئی جوجو کی سی صورت ہو گئی ہے۔ بکھر کر رہ گئیں مونچھیں :
منشی جی :- تو پھر اب کیا کروں میں بغیر دوسری طرف کی مونچھ کترے کام نہیں ہو سکتا۔ اب کی بہت خیال سے کاٹوں گا :
بیوی :- دیکھو دیکھو دیکھو۔ پھر زیادہ کٹ جاتی :
منشی جی :- میرا ہاتھ کانپ گیا تھا تم اس وقت منہ میں قینچی بھی بھونکوا دوگی :
بیوی :- میرا کیا ہے تم میری طرف سے بالکل صاف کر دو مونچھیں :
منشی جی :- بالکل کیسے دیکھتی تو رہو۔ ذرا آئینہ برابر رکھو۔ ہاں یوں۔ (مونچھ پر قینچی چلتی ہے) یہ لو اب تو ٹھیک ہے :
بیوی :- خاک ٹھیک ہے۔ اچھی خاصی مونچھوں کا ناس مار لیا ابھی اِدھر کی ذرا بڑی ہے :
منشی جی :- اُٹھانا ذرا آئینہ ...... ہاں بڑی ہے بہت بڑی ہے ابھی منہ ٹیڑھا معلوم ہو رہا ہے :
بیوی :- اسے نائی سے ٹھیک کراؤ نہیں تو اور خراب ہو جائیں گی مونچھیں :
منشی جی :- اب اس وقت نائی کی تلاش میں نکلوں۔ توبہ ہے تمام بال پسینہ میں اور بھی چپک رہے ہیں :
بیوی :- پھر ان میں لگا ہوا ہے گوند :
منشی جی :- توبہ۔ توبہ۔ بس یونہی دکھو آئینہ۔ (قینچی چلاتے ہیں) ارے استغفراللہ :
بیوی :- بس اب تو طبیعت خوش ہوئی بالکل ہی غائب کر دی ایک طرف کی مونچھ۔ بھئی واللہ مجھ سے تو تمھاری صورت بھی نہیں دیکھی جاتی :
منشی جی :- ایسی صورت کو ڈالو جہنم میں تصویر کا کیا ہوگا اب۔ مونچھ تو اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے اس طرف کی کچھ کچھ البتہ ٹھیک ہے۔ اچھا سنو۔ ٹھیک ہے بس تم شبّن کی دوات لاؤ دوڑ کے :
بیوی :- دوات ؟ ...... دوات سے کیا ہوگا ؟
منشی جی :- اچھا صاحب نہ لاؤ مگر اس وقت حجت نہ کرو میں خود لیے آتا ہوں۔ مجھے خود ہی غصہ آ رہا ہے اس پر تمھاری بحث۔ ناطقہ بند کر دیا ہے تم نے :
بیوی :- بھئی تو یونہی پوچھا تھا۔ میں لا کے دیتی ہوں ابھی :

(بیوی جاتی ہے منشی جی بڑبڑا رہے ہیں)

منشی جی :- توبہ ہے۔ اِدھر کی ٹھیک کی اُدھر کی غائب۔ اُدھر کی ٹھیک کی اِدھر کی غائب اور دھوپ الگ جا رہی

۔۔۔۔۔۔ لے آئی ؟ دیکھو جی آئینہ بھی لے آؤ اور اب ذرا خاموشی کے ساتھ کرسی پر جا کر آئینہ لے کر :

بیوی: جلدی کرنے کا ارادہ ہے اب تو آپ کا چہرہ بھر جائے گا قند لگا لو کہ کے :

منشی جی: دیکھو تو میرا بیوی پر منشی لکھوا آئینہ ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ اب ذرا تھوڑا ہٹ کر دیکھو کیا معلوم ہو کہ بالکل مونچھیں معلوم ہوتی ہیں نا ؟

بیوی: کہیں بھی نہیں صاف مکان سے رہا ہے کہ روشنائی کی لکیر ہے۔ اچھا خاصہ گیسو معلوم ہوتا پر دھرا ہے

منشی جی: ایں ؟ ۔۔۔ گیسو ؟ ۔۔۔ روشنائی ذرا ہلکی رہی۔ اچھا اور بس بس ہیں لکھنا شیشہ ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ اب ٹھیک ہے ۔ دیکھو تو ذرا دور ہٹ کر :

بیوی: میں نہیں دیکھتی تمہارا تو دماغ چل گیا ہے اور ساتھ ساتھ مجھ کو بھی پاگل بنائے ہوئے ہو :

منشی جی: اچھا خیر۔ خدا کے لیے یہ بتاؤ گالوں میں جو گڑھے پڑے ہوئے ہیں ان کو اب کیا کروں، تصویر بڑا بد ہو جائیگی ان سے :

بیوی: مونچھوں کی گت ہی بگڑی اب گالوں میں روشنائی بھر لو :

منشی جی: پھر وہی ۔ ارے صاحب عقل سے کام لو تو سب باتیں سمجھ میں آ جائیں مگر عقل تمہارے پاس کہاں جلدی سے دو گولیاں بنا دو یہ گڑھے بھی ابھر آئیں گے :

بیوی: گولیاں کہاں سے بنا دوں گی سو بیسے باتوں کے لیے چیز ڈری ہوں مگر تم سنتے بھی ہو ؟

منشی جی: اچھا اچھا خیر ۔۔۔ وہ ۔۔۔۔ کیا چیز ہونا چاہیئے ۔۔۔۔ ٹھیک ہے وہ لاؤ جلدی سے وہ ۔۔

بیوی: وہ کیا اس موئے وہ کا کچھ نام بھی ہے یا بس وہ ہی وہ کیے جاؤ گے ؟

منشی جی: وہی میرا مطلب ہے یعنی وہ ۔۔۔۔ کیا کہتے ہیں اسے ۔ مستم ڈلی کے دو ٹکڑے :

بیوی: لاتی ہوں ۔ گھن چکر بنا کے رکھ دیا ہے :

(جاتی ہے)

منشی جی: (خود ہی بڑبڑا رہے ہیں) مونچھیں تو اب ٹھیک ہیں ۔ کنگھی بھی خوب ہو گئی ہے اس وقت (زور سے) بیمنے کہا لائیں وہ ڈلی کے ٹکڑے :

بیوی: لا رہی ہوں ۔ لا رہی ہوں ۔ لاتے ہی لاتے تو لاؤں گی ۔ لو یہ ڈلی کے ٹکڑے :

منشی جی: ایک ایک گال میں ایک ایک ڈلی کا ٹکڑا ٹھیک رہے گا (گالوں میں ڈلی رکھ کر بدلی ہوئی آواز میں) اب دیکھو اب تو ٹھیک ہے ؟

بیوی: ہاں ٹھیک ہے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دونوں گالوں میں بتوڑیاں نکل آئی ہیں :

منشی جی: بتوڑیاں ؟ ۔۔۔۔ لانا تو آئینہ ۔ (آئینہ لے کر) بتوڑیاں تو کیا البتہ کچھ ٹھیک نہیں رہا یہ ۔۔۔۔

اچھا اگر دونوں گالوں میں ایک ایک نوالہ رکھ لوں روٹی کا تو ...."

بیوی :- "مگر تصویر ضرور کھنچواؤ گے اس گت کے ساتھ چاہے کچھ بھی ہو جائے"

منشی جی :- "کیا مطلب ہے تمہارا؟ بغیر تصویر کھنچوائے مر جاؤں میں کمبخت تاکہ اولاد کو یہ بھی پتہ نہ چلے کہ باپ بھی تھا؟"

بیوی :- "نہیں نہیں تم برا نہ مانو ضرور تصویر کھنچواؤ تاکہ اولاد کو یہ معلوم ہو کہ باپ بہروپیہ تھا"

منشی جی :- "بھئی تم سخت دل شکنی کرتی ہو میری۔ اس میں بہروپیہ ہونے کی کون سی بات ہے۔ تصویر میں ان امور کا پتہ بھی نہ چلے گا اور تصویر ہی نہ ہوئی تو پھر یہ کون کہے گا کہ .... کہ .... وہی حسینوں کے خطوط اور تصویر بتاں .... ارے وہ کیا ہے شعر .... مگر مجھے یاد نہیں تو تمہیں کیا یاد ہوگا۔ تو پھر دو نوالے رکھ لوں منہ میں؟"

بیوی :- "جو تمہارا جی چاہے وہ کرو۔ مگر ...." (دروازہ پر دستک)

منشی جی :- "آیا بھئی آیا ابھی آیا بس تیار ہی سمجھو (چپکے سے) چھوڑو نوالہ دیوانہ کر لاؤ اچکن اٹھاؤ جلدی سے"

بیوی :- "اس گرمی میں یہ جو موٹی جامہ وار لادی جائے گی تو مزا ہی آ جائے گا"

منشی جی :- "(شیروانی پہنتے ہوئے) خیر۔ ہوگا تم ٹوپی تو لاؤ میری ...... وہ دیکھو وہ رکھی ہے کھونٹی پر۔"

بیوی :- "یہ اچکن اور اس پر یہ موٹی چیتا شاہی ٹوپی"

منشی جی :- "اچھا تو جانے دو اپنا کوئی دوپٹہ ہی دے دو صافہ باندھ لوں گا"

بیوی :- "تیل تو چڑھا ہوا ہے تمہارے سر پر"

منشی جی :- "چاہے میری تصویر کمبخت خراب ہو جائے مگر تمہارا دوپٹہ خراب نہ ہو .... اف وہ سخت گرمی ہے .... اچکن تو آگ لگنے دیتی ہے"

بیوی :- "تو یہی دوپٹہ لے لو نا"

منشی جی :- "لاؤ یہی لاؤ۔ سخت پسینہ ہے .... توبہ ہے .... لاؤ دوپٹہ۔ مگر اب اسے باندھے گا کون؟ بیوی بھی ایسی ملی ہیں جن کو صافہ تک باندھنے کا ڈھنگ نہیں"

بیوی :- "لے اور کیا یہ تو عورتوں کے کام ہی ہیں کہ ...." (دروازہ پر دستک اور آواز)

تصویر والا :- "ارے صاحب اب تکلیف نہ کیجئے وقت نکل گیا"

منشی جی :- "تو میں بھی اب تیار ہوں بھئی۔ (بیوی سے) بھئی دوصافہ میں ننگے سر ہی کھنچواؤں گا"

بیوی :- "لے ہے۔ یہ سارا منہ کالا ہو گیا۔ روشنائی پسینہ میں خوب منہ بھر پھیلی ہے"

منشی جی :- "ایں .... لانا تو آئینہ .... لاحول ولا قوۃ"

تصویر والا :- "اچھا صاحب میں جا رہا ہوں"

منشی جی :- "ارے یار ذرا دم تو لو .... توبہ ہے یہ تو شیروانی پر بھی ٹپک رہی ہے۔ بھئی ذرا لوٹا لاؤ جلدی"

بیوی :- "لو لوٹا" (منشی جی منہ دھوتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں)

پہاڑ تلے

(۱)

چند روز سے یہ کالم غائب تھا۔ اس لیے کہ کالم نویس راولپنڈی سے غائب تھا۔ اس کالم کے قارئین سے اپنی اس غیر حاضری کے سلسلے میں معذرت خواہ ہونے کے بجائے عرض کرتا ہوں کہ جب سے کراچی مشاعرہ ہو گیا تھا آپ نے اخبارات میں تو یہ خبر پڑھی ہوں گی کہ کراچی میں چیچک پھیلی ہوئی ہے مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہاں چیچک سے کہیں زیادہ مشاعرے پھیلے ہوئے ہیں سنو دیکھے ہیں۔ جہاں تک چیچک کا تعلق ہے اس کو زیادہ پھیلنے نہ دینے کے لیے وہاں ٹیکے لگانے کی مہم شروع ہو چکی ہے مگر چونکہ اب تک کوئی دافع مشاعرہ ٹیکہ ایجاد نہیں ہوا ہے لہذا شاعروں سے تحفظ کے ٹیکے نہیں لگے اور اگر کسی جگہ کوئی مشاعرے کا کیس ہو جاتا ہے تو ایسا متعدی مرض ہے کہ ہر طرف مشاعرے ہی مشاعرے پھوٹ پڑتے ہیں چنانچہ جب مجلس یادگار جگر کا مشاعرہ ہوا ہے مشاعروں کی وبا کراچی میں پھیل گئی ہے اور کراچی کے گوشے گوشے میں ایک نہ ایک مشاعرے کی قیامت برپا نظر آ رہی ہے۔

کہا جاتا ہے اور کہا ہی نہیں جاتا بلکہ واقعہ بھی یہی ہے کہ مجلس یادگارِ جگر کا جو مشاعرہ ۹ جنوری کو ہوا تھا وہ کراچی کی ہی نہیں بلکہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا کامیاب ترین مشاعرہ تھا جو سات گھنٹے تک بیس بائیس ہزار سامعین نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ سنا نہ کوئی ہنگامہ ہوا نہ ہوٹنگ کے ذریعے مشاعرے کو چلانے کی ضرورت محسوس کی گئی نہ سیٹیاں بجیں نہ جانوروں کی بولیاں سنائی دیں۔ حد یہ ہے کہ داد تک کو بیہودہ نہ بننے دیا گیا ورنہ آج کل تو مشاعروں میں جتنا کلام شاعر سامعین کو سناتے ہیں اس سے زیادہ بدکلامی سامعین کی طرف سے ان کو سننا پڑتی ہے، لاٹھی چارج ہوتے ہیں کرسیاں چلتی ہیں۔ شامیانے گرائے جاتے ہیں اور لوگ ایک دوسرے پر گرتے ہیں۔ مگر یہ پہلا مشاعرہ تھا جو اس عظیم اجتماع کے باوجود چشم بد دور ایسا مہذب، پرسکون اور شریفانہ ثابت ہوا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے سخن فہم کیونکر اس مشاعرے کو نصیب ہو گئے۔

یہ اصل مشاعرہ تو خیر بحمد للہ خیریت سے گزر گیا مگر اس کے بعد جو مشاعرے کراچی میں پھیلے ہیں تو جان بچانا دوبھر ہو گیا ایک ایک رات میں کئی کئی مشاعرے اور ہر مشاعرے کی طرف سے شاعروں کی کھینچا تانی کوئی شاعر کو ادھر گھسیٹ رہا ہے کوئی ادھر اور شاعر کی حیثیت اس کٹی ہوئی پتنگ کی سی ہے جس کو لوٹنے والے لڑکے پیسے گرا کے حاصل کر پاتا تو یہ پتنگ بچا کر لوٹنے

پھٹ جائے اور کسی کے ہاتھ نہ آئے اور ہر شاعر کا یہ حال کہ وہ کہہ رہا ہے کہ ــــ

مر گیا ں تھے شاعر سلنے

ہم بھی یا رب کئی بٹے ہوتے

نتیجہ یہ کہ اس نے وعدہ کسی سے کیا شعر کسی اور محفل میں پڑھے۔ داد کسی اور محفل میں حاصل کی چائے کسی عمارت میں کھایا ہو، کسی اور دسترخوان پر۔ پان کسی تیسری جگہ اور رنگ سے ہاتھ جائے قیام پر دھوئے۔

مجلس یادگار جگر والے اصل مشاعرے کے دوسرے روز کا دن بیت الغزل میں فضلی صاحب کا ہم طلوع ہوتے ہی تمام بیرونجاتی اور کچھ مقامی شعرا کو گرفتار کرچکے تھے لہٰذا مشاعرے کے ناظم اقبال صفی پوری صاحب کو اپنی صفی پور ہاؤس والی محفل کھاؤ اور گاؤ " کو تیسرے دن کے لیے ملتوی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور ۹ جنوری کو تو شاعروں کا یہ حال تھا کہ وہ چھپتے پھرتے تھے اور ان کو ڈھونڈنے والے ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے سوکھتے پھرتے تھے اور ان کا شانہ لگتے پھرتے تھے اس لیے کہ اس ایک ہی دن میں کئی نشستیں منعقد ہو رہی تھیں حضرت جوش ملیح آبادی کے یہاں کی نشست مولانا ماہر القادری کے یہاں کی محفل طعام و کلام۔ کراچی یونیورسٹی کا مشاعرہ جونا گڑھ پیلس کی " محفل پان و گاؤ " اسنادہ " آخر بیچارے شاعر اپنے کو چار ٹکڑے میں کیونکر تقسیم کر دیتے نتیجہ یہ کہ کچھ کو جوش صاحب لے اُڑے کچھ مولانا ماہر کے ہاتھ آ گئے کچھ یونیورسٹی پہنچے اور کچھ جونا گڑھ پیلس میں نظر آئے۔ بعض ایسے جانباز بھی تھے جو یونیورسٹی کی محفل میں بھی نظر آئے اور جونا گڑھ یا مولانا ماہر کے دسترخوان پر بھی اس میں دراصل شعرائے کرام کی " ہر جائیت " کا کمال نہ تھا بلکہ ان محفلوں کے بانی ہی ان کو اس طرح بٹورتے پھرتے تھے جس طرح الیکشن کے ورکر ووٹروں کو بٹورتے پھرتے ہیں۔

واضح رہے کہ مجلس یادگار جگر کا مشاعرہ صبح چار بجے ختم ہوا بیت الغزل میں فضلی صاحب کا مشاعرہ رات کو دو بجے تک ختم ہوا۔

صفی پور ہاؤس میں اقبال صفی پوری کا مشاعرہ ڈھائی بجے رات کو ختم ہوا۔

جونا گڑھ پیلس کا مشاعرہ رات کو ایک بجے ختم ہوا۔

ان مشاعروں کے علاوہ باہر سے آنے والے شعرائے کرام سفر میں بھی جاگے ہوئے تھے اور ان پے بہ پے مشاعروں میں مبتلا ہو کر تو ان لوگوں کی نیند ہی ان پر حرام ہو چکی تھی۔ دن کو آٹو گراف لینے والے یا ان کے دوسرے قدر دان یوں بھی سونے نہ دیتے تھے لہٰذا کیفیت ان کی یہ تھی کہ نیند میں ایک مصرع ایک غزل کا پڑھ جاتے تو دوسرا کسی اور غزل کا اور پھر معذرت خواہ ہوتے تھے کہ حضور معاف کیجئے گا ہم چار پانچ دن کے جاگے ہوئے ہیں لہٰذا عفو و بخشش کے مستحق ہیں " دوسروں کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہوگا خود اپنا تو یہ حال ہو گیا تھا کہ اگر کسی وقت آنکھ لگ بھی گئی تو خواب میں مشاعرہ دیکھ کر پھر اُچھل پڑے۔

ممکن تھا کہ کراچی میں ایک آدھ دن اور قیام ہوتا مگر جب مشاعروں کی یہ کثرت دیکھی اور دعوت دینے والوں کے گھوں گھوں بالکل ہی پیچھا کر دیا تو ۱۰ جنوری کو جبکہ اس وقت جبکہ سرسید گرلس کالج میں مشاعرہ برپا تھا میں اپنے سامان کے علاوہ کچھ اپنے اوپر لادے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا اور اسٹیشن پہنچ کر ٹرین میں اگر دم لیا ورنہ کراچی میں تو اب تک مشاعرے ہوا رہے ہیں شاعر

مس بھلے ہی وہ گائے ہو چاہے بھینس تو پھر مجھے جلتے تھے۔ ان پر [illegible] گئی ہوں اور آپ کی خدمت میں عرض ہے سب [illegible] کہ مجھ کو ابھی [illegible] تو مستورات کا شکریہ ادا کر کے بھاگ جاؤں گا ورنہ آپ جانتے ہیں کہ جان ہے تو جہان ہے۔

(۲)

لندن میں ایک صاحب کہتے تھے کہ زیادہ تعجب اس بات پر ہوا کہ [illegible] جیسے ہی کہیں [illegible] انگریزی بولنے والے معلوم ہوتا تھا کہ پتہ نہ [illegible] اور لوگ پیٹ بھرتے تھے ان انگریزی بولنے والوں کو دیکھ کر ان صاحب کو معلوم ہوا کہ ہم سمجھتے تھے کہ ہم انگریزوں کے ملک میں [illegible] نہیں جانتے اور [illegible] اس قسم کے [illegible] انگریزی ہی [illegible] کہ سب ہی زبان سمجھ سکتے ہیں [illegible] لوگوں کی طرح اشارے سے اپنا مفہوم سمجھانا پڑتا ہے نہ کسی کی بات سمجھ سکتے ہیں نہ اپنی بات کسی کو سمجھا سکتے ہیں۔ [illegible] انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اور بھی ہنسی آتی ہے کہ کسی عورت سے "مس" کہہ دیا تو وہ چونک پڑی اور کسی مرد کو نہایت ادب سے "میڈم" کہہ دیا تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جیسے "[illegible]" کی جگہ "و" اور "ز" کی جگہ "س" کہتے ہیں۔ [illegible] کے [illegible] کہتے ہیں [illegible] کچھ زمین کی ہیں اور کچھ جاتی ہے آسمان کی بات۔ جانا چاہتے ہیں آکسفورڈ اسٹریٹ اور ٹیکسی والا پہنچا دیتا ہے [illegible] اسٹاک [illegible] اور وہ [illegible] دیتا ہے سوال کھانا کھا کر [illegible] مرغی اور [illegible]۔ نہ کسی سے کسی جگہ کا پتہ پوچھ سکتے ہیں نہ کسی کا بتایا ہوا پتہ سمجھ سکتے ہیں سوائے اس کے کہ سب کچھ سن کر جان چھڑانے کے لیے بس "یس" کہہ کر خود ہی سرگرداں رہیں۔

سنا ہے کہ اسی قسم کے ایک منشی فاضل صاحب انگریزی کی دو تین ریڈریں پڑھ کر انگلستان جا پہنچے اور وہاں پہنچ کر ان کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ جتنی انگریزی وہ جانتے ہیں وہ تو یہاں کے لیے اس قدر ناکافی ہے کہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ وہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گئے اور خدا جانے کس طرح ڈاکٹر تک پہنچا مگر اب ڈاکٹر کو اپنی تکلیف سمجھائیں تو کس طرح؟ خیال یہ تھا کہ ہمارے ناتجربہ کار طبیبوں کی طرح کے وہ ڈاکٹر بھی ہوں گے جو نبض دیکھ کر سب کچھ خود سمجھ لیتے ہیں اور مریض کو کچھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر وہاں ڈاکٹر اپنی زبان میں سوال کرتا تھا کہ تم کو کیا شکایت ہے اور اب جو منشی صاحب نے اردو میں انگریزی بولنا شروع کی ہے تو ڈاکٹر بھی چکرا کر رہ گیا کہ اس مریض کو آخر کس مرض کی [illegible] کہنے لگے کہ "سر [illegible] ہیڈ [illegible] اسٹامک شروع ہوا پھر [illegible] اور اس کے بعد [illegible] محسوس ہوا آفٹر [illegible] فیور ہو گیا۔"

ڈاکٹر کے پلے جب کچھ نہ پڑا تو اس نے ان کو بمشکل سمجھایا کہ علاج کرانا ہے تو اپنے کسی انگریزی جاننے والے ہم وطن کو لے کر آؤ ورنہ ایسا نہ ہو کہ اختلاج قلب کی شکایت ہو اور مراق کی دوائیں تمہارے لیے تجویز کر دی جائیں۔"

ایسے تو خدا جانے کتنے لوگ وہاں پہنچ جاتے ہیں جو ہوٹلوں میں مرغی مانگنے کے لیے انڈا دکھا کر سمجھاتے ہیں کہ اس کی ماں چاہیے۔ تصویریں دکھا دکھا کر مطلوبہ اشیاء دکانداروں سے طلب کرتے ہیں آمد و رفت کا [illegible] ہوتا ہے [illegible] دکھا کر [illegible] گردش [illegible]

کہ اس کا یوں پڑھا چاہیئے "یہ انگریزی تقریباً اسی قسم کی ہوتی ہے جیسی ہمارے یہاں کے خوانچہ فروش انگریزوں کے دور میں گوروں سے انگریزی بولا کرتے تھے کہ "صاحب بہادر گڈ ون آنے کا خوشی ٹیک خوشی ٹیک" مگر اس قسم کی انگریزی بولنے والوں کو یہی جواب ملتا ہے کہ تم جو کچھ مانگتے ہو اس کو ہم اتنا ہی سمجھتے ہیں خوشی ٹیک خوشی ٹیک۔"

صورت حال یہ ہے کہ برطانیہ کے متعلق ہمارے یہاں کے لوگ جب یہ سنتے ہیں کہ وہاں نہایت آسانی سے روزگار مل جاتا ہے اور معاوضہ نہایت معقول ملتا ہے تو وہ بغیر سوچے کہ انگریزی زبان جانتے ہیں یا نہیں کسی نہ کسی طرح انگلستان پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر صرف ہوٹلوں میں پلیٹیں ہی صاف کرنے کا کام مل گیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے مگر جب وہاں پہنچ جاتے ہیں تو اپنے کو ایسا گونگا اور بہرا محسوس کرتے ہیں کہ خود بھی پریشان ہوتے ہیں۔ اور وہاں کے لوگوں کے لیے بھی مصیبت ثابت ہوتے ہیں کہ آخر ان کو کس طرح سمیٹا جائے ان کو کس طرح سمجھا جائے اور کس طرح سمجھایا جائے، آخر کار ایک آخری ترکیب اس قسم کے نو وارد اہلِ برطانیہ کے لیے سمجھ میں آئی ہے کہ ان کو پہلے انگریزی پڑھائی جائے اس کے بعد ان سے پوچھا جائے کہ بھئی کیوں آئے ہیں۔ اور کیا چاہتے ہیں۔ برطانیہ کے صنعتی شہر بریڈفورڈ میں ان غیر ملکی اور انگریزی نہ جاننے والے افراد کو انگریزی پڑھنے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں تاکہ وہ یہاں آئے ہیں تو یہاں آنے کا مقصد بھی بیان کر سکیں ملازمتیں چاہتے ہیں تو ملازمتیں حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ محنت مزدوری کرنا چاہتے ہیں تو اس پر روشنی ڈالیں۔ ان اشارہ بازیوں سے آخر کب تک کام چل سکتا ہے۔

انگریزی نہ جاننے والے ان پردیسیوں کو انگریزی میں شُد بُد حاصل کرنے کی تحریک دراصل ایک ڈاکٹر کی اپیل پر شروع کی گئی ہے جس کا ایک ایسے پاکستانی مریض سے سابقہ پڑ گیا تھا جو بیمار تو یقیناً تھا مگر یہ بتانے سے قاصر تھا کہ اس کو بیماری کیا ہے اور وہ کن تکالیف میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے اشاروں پر بھروسہ کر کے اوٹ پٹانگ علاج کو خطرناک سمجھ کر یہ اپیل کی ہے کہ ان نو واردوں کو کم از کم اتنی انگریزی تو آنا ہی چاہیئے کہ وہ اپنے مرض کی علامات بیان کر سکیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ مبتلا ہوں ہیضے میں اور علاج شروع ہو جائے بواسیر کا۔ تکلیف ہو جوی کی اور آپریشن کر دیا جائے خواہ ان کا۔

اب دفتر روزگار والے ان انگریزی نہ جاننے والوں سے پوچھتے پھر رہے ہیں کہ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس قسم کی کلاسوں میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ پوچھنا ان سے یہ چاہیئے کہ بندہ نواز جب آپ انگریزی جانتے ہی نہ تھے تو انگریزوں کے ملک میں آخر کیا سمجھ کر آ پہنچے ہیں۔ اب یہ تو ہونے سے رہا کہ آپ سے سر کھپانے کے لیے اہلِ برطانیہ اُردو پڑھنا شروع کر دیں یہ زحمت تو آپ ہی کو کرنا پڑے گی مگر ایسا نہ ہو کہ اس کے جواب میں وہ یہ کہیں کہ انگریزی جانتے ہوتے اور انگریزی ہی پڑھنا ہوتی تو اپنا دیس چھوڑ کر پردیس کا کیوں رُخ کرتے انگریزی جاننے والوں کے لیے روزگار کی خود ہمارے یہاں کون سی کمی تھی ہم تو یہ سمجھ کر یہاں آ نکلے تھے کہ یہاں پڑھے نہ لکھے بھی محمد فاضل ہوتے ہیں۔

[illegible] اور کروڑ ڈالر کا ۔۔ ٹرک وہ ٹرک ان کی جھولی میں آ گرا ۔۔ سفر ۔۔ نکلا تھا۔ یہ ٹرک اسے ایک خاص تقریب منعقد کر کے دیا گیا جس میں بشیر نے شکریہ کی تقریر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان مانا اور دوستی کا ادا کیا جو انہوں نے ایک اونٹ والے سے ۔۔ ایک ٹرک ۔۔ معلوم ہوا کہ بشیر نہایت شوق سے ٹرک چلانے کی تربیت حاصل کر رہے ہیں اور توقع ہے کہ وہ بہت جلد ۔۔ ٹرک کا لائسنس حاصل کر لیں گے گر ۔۔ ان کا احسان فراموش نہیں ہوں کہ اپنے اونٹ کو بھول جاؤں ۔۔ بشیر کا خیال ہے کہ ۔۔ ان کا اونٹ ہی کے دم قدم سے حاصل ہوا ہے اور ۔۔ اونٹ سے ۔۔ اونٹ ۔۔ کیسے جا سکیں گے؟ ان کا خیال ہے کہ ان کے اونٹ کی ۔۔ ہے ۔۔ اور ۔۔ وہ سفر ۔۔ اپنے اونٹ کو ساتھ لے کر گر زندگی کے سفر میں وہ اونٹ کو ہمیشہ ساتھ رکھیں گے انہوں نے ایک شتربان کی خدمات حاصل کر لی ہیں کہ جب وہ ٹرک چلانا شروع کریں تو شتربان ان کا اونٹ چلاتا ہے۔ وہ یہ اونٹ کسی کو نہ دیں گے البتہ اگر مسٹر لنڈن جانسن مانگیں تو دوسری بات ہے۔

بشیر نے اپنی تقریر میں بڑی سادگی سے یہ بھی بات کہہ دی کہ یہ امریکی ٹرک تو مجھ کو مل گیا ہے لیکن اسے میرے پاس گیراج نہیں ہے اس لیے کہ میں تو جھونپڑی میں رہتا ہوں اس ٹرک کے لیے دولت خانہ کہاں سے لاؤں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ٹرک نہایت قیمتی ہے اور کراچی میں اس قسم کے ٹرک کی قیمت آج کل پچیس ہزار روپے کے قریب ہے اس ٹرک کے علاوہ بشیر کو فاضل پرزہ جات اور اوزاروں کے دو صندوق بھی دیئے گئے ہیں جن کی قیمت ڈیڑھ ہزار کے قریب ہے مگر اس ٹرک اور ان دونوں صندوقوں کو رکھنے کا کہاں اس کا فی الحال کوئی انتظام نہیں ہے مگر مسبب الاسباب نے کہ امریکی سفیر ولیم راونٹری بشیر کی اس پریشانی کی خبر بھی مسٹر لنڈن جانسن کو کر دیں اور حق دوستی ادا کرتے ہوئے گیراج کا بھی بندوبست کر دیں۔

فی الحال تو بشیر پر وہ قصہ صادق آ رہا ہے کہ ایک راجہ صاحب نے ایک منت سے خوش ہو کر اپنا ایک ہاتھی اس کو انعام میں دے دیا تھا ظاہر ہے کہ اتنا بڑا انعام پا کر وہ خوش نصیب منت کتنا خوش ہوا ہو گا ساری ریاست میں اس کی دھوم ہو گئی کہ مہاراج نے ایک غریب منت کو اتنا بڑا انعام دے ڈالا ہر طرف سے لوگ اس ہاتھی کو دیکھنے آنے لگے جو منت کے دروازے پر کھڑا جھوم رہا تھا اور منت کو مبارکباد دیتے تھے مگر جب یہ مبارک سلامت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اس غریب منت کو اس ہاتھی کی خوراک کا بندوبست کرنا پڑا۔ تو چند ہی دن میں اس منت کا حال ایسا پتلا ہوا کہ دن کو تارے نظر آنے لگے اور اب پتہ چلا کہ مہاراج نے اس کو یہ انعام نہیں دیا ہے بلکہ ایسی سزا دی ہے کہ ہاتھی کے بوجھ تلے وہ دبتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اس انعام سے وہ مالا مال ہوتا ہاتھی کا پیٹ بھرنے کے لیے اس کو خود اپنا پیٹ کاٹنا پڑا۔ بال بچوں کا پیٹ کاٹنا پڑا اور آخرکار جب گھر کا سامان نیلام کرنے کی نوبت آ گئی تو وہ دست بستہ مہاراج کی خدمت میں حاضر ہوا کہ کم از کم اس کو وہ خطا تو بتا دی جائے جس کی اتنی بڑی سزا اس کو دی گئی ہے بمشکل تمام مہاراج کو یہ سمجھایا جا سکا کہ یہ ہاتھی اس منت پہ کتنا بڑا بوجھ ہو گیا ہے لہٰذا دوسرا انعام مہاراج نے یہ دیا کہ اپنا عطیہ واپس لے کر اس ناقابلِ برداشت بوجھ سے منت کو

بیکنڈ وش کر دیا۔

فورڈ کمپنی والوں کو کیا معلوم کہ مسٹر فیڈرن جانسن کا یہ دوست اس قابل بھی نہیں کہ اس تحفہ کو سنبھال سکے اگر ان کو جھونپڑے کی خبر ہوتی تو پہلے وہ خود بشیر کے لیے ایک گیراج کا بندوبست کرتے جس میں یہ بے چارہ رہ سکے اس کے بعد اس ٹرک کا کیریر فراہم کرتے پھر ٹرک دیتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بشیر اس ٹرک کو اپنے جھونپڑے کے سامنے کھڑا کر کے اس میں رہنا شروع کر دے اور اس کو ٹرک سے زیادہ اپنے گھر کے طور پر استعمال کرے۔ یہ خیال ہے کہ جب وہ ڈرائیونگ کا لائسنس حاصل کر لیں گے۔ ٹرک چلانا شروع کریں گے اور اس سے پیسہ کمائیں گے تو یہ آمدنی خود ہی گیراج کا بندوبست کر دے گی مگر اس آمدنی سے پہلے تو اخراجات ہی اخراجات ہیں کہ اونٹ کے لیے ایک شتربان رکھنا پڑا ہے۔ ڈرائیونگ سیکھنے کی فیس ادا کرتے ہوں گے۔ ٹرک تو آ گیا ہے اب پٹرول بھی پھونکنا پڑے گا۔ اس کو رجسٹر کرانے کے اخراجات کا بار الگ ہوگا۔ ڈرائیونگ لائسنس بھی ظاہر ہے کہ مفت تو ملتا نہیں پھر یہ ٹرک چلانا شروع کریں گے تو نئے نئے ڈرائیور کی حیثیت سے جانے کتنے چالان کرائیں گے اور کتنے جرمانے ادا کریں گے۔ اور ان تمام منزلوں سے گزرنے کے بعد کہیں آمدنی کی شکل نظر آنے کی توقع ہے کہ بجائے اونٹ کے مکان کو اس ٹرک ہی سے پوچھنا پڑے گا کہ "ٹرک رے ٹرک تیری کونسی کل سیدھی"

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بشیر کو اگر خدا عقل دیتا تو وہ اس ٹرک کو شکریہ کے ساتھ قبول کر کے اس کی قیمت نقد لے لیتے اور پچیس چھبیس ہزار میں اس ٹرک اور اس کے سامان کو فروخت کر کے اس رقم سے کچھ اونٹ اور کچھ گاڑیاں خرید لیتے اور اپنے اسی پیشہ کو ترقی دیتے جس کا ان کو تجربہ بھی ہے اور جس سے ان کو یہ عزت حاصل ہوا ہے بجائے ایک اونٹ گاڑی کے اونٹ گاڑیوں کے ایک قافلہ کے مالک بن کر چین سے زندگی بسر کرتے۔ مگر جانسن صاحب کی دوستی نے ان کو سارباں سے ڈرائیور بنا کر رکھ دیا ہے تو اب وہ بھلا ہماری یہ بات کیوں مانیں گے وہ اپنی لائن شوق سے بدلیں مگر خدا کرے اونٹ گاڑی اور ٹرک میں جو فرق ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر نہ رہیں۔ اور اس ٹرک کو اس طرح استعمال نہ کریں کہ چند دن کے بعد اسی میں اونٹ جوڑنے کی نوبت آ جائے اور اونٹ ہی اس کو کھینچ کر گیراج تک نہ پہنچایا کرے

(۴)

شبدی گرس کچھ بھی سہی مگر یہی کیا کم ہے کہ وہ اپنے کو گرلس تو کہتی اور سمجھتی ہیں مگر آپ ان "مردانہ عورتوں" کو کیا کہیں گے جو عورت پیدا ہو کر مرد بننے کے ارمان میں گھلی جاتی ہیں اور ایسی مردانہ وضع قطع اختیار کئے رہتی ہیں کہ عجیب خام خان قسم کی نظر آتی ہیں وہ نہ صرف مردوں کی طرح کے بال ترشوا کر گیسوئے تابدار کو مردانہ وار بنوا لیتی ہیں بلکہ اچھا خاصہ زنانہ شلوار ساڑھی وغیرہ چھوڑ کر سلیکس پہننا شروع کر دیتی ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ گویا بہت حسین نظر آتی ہوں گی حالانکہ اس لباس اور اس وضع قطع کے ساتھ ان کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر یا سگریٹ کے کش لگاتی ہوئی دیکھ کر پہلے غور کرنا پڑتا ہے کہ یہ مسماۃ غفورن ہیں یا مسٹر اے غفور یہ بیوی بننے کے قابل ہیں یا ان کو شوہر بنا لینا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ عورتوں کے لیے زیادہ جاذب نظر ہیں یا مردوں کے لیے بلکہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو اگر مس کہہ کر مخاطب کر لیا گیا تو ناراض تو نہ ہوں گی اور

[illegible] بات اس کو مخفی رکھا کہ خلقت پر واضح کی اقتصر بلکہ وہ اپنی جنس کو ایسا مترتب بنانے پر تلے ہوئے ہیں جو نسبتاً کم ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مرد نہ دار حسن کو وہ مرد پسند کرتے ہیں جو خود نسائیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ انھیں [illegible] [illegible] کو آپ کی مطلب کا کوئی نہیں ہے یہ وہ مرد ہوتے ہیں جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ آئینہ کے سامنے [illegible] کے آئینہ خانے میں گزارتے ہیں بال بنانے میں، پوڈر تھوپتے ہیں اور آرائش جمال میں بہت مصروف رہتے ہیں کہ بار بار بیٹھا ہو، اور گھر سے باہر نکلتے ہیں تو اس کے بعد خوشبو پھر [illegible] کا سلسلہ جاری رہتا ہے یہ کریم لگاتے ہیں تو کبھی وہ [illegible] پسند ہیں کیا آپ اس بات کا یقین کریں گے کہ ہم نے تو بڑے اور عمر رسیدہ لوگوں کو دیکھا ہے جو ایسے ایسے ناز و انداز [illegible] [illegible] پوچھتے ہیں کہ [illegible] پر [illegible] کی کاریگری نظر آتی ہے [illegible] ہیں [illegible] نانے کی کرتے وہ اس طرح پھرتے ہیں کہ جیسے ان سے پہلے کوئی چاہتا ہے [illegible]

لے ہیں [illegible] میں ہوں گے۔ [illegible]

سمجھتے ہیں کہ جو بھی ان کو دیکھے گا خوش ہو گا کر کرتے ہیں کی حالانکہ عورتیں یا تو ان کو اپنی سوت سمجھتی ہیں یا اس کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ان کو خود پر بدل بھی بتا ہیں یا ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ اپنے نام نہاد مرد کو بہ نسائیت زیب نہیں دیتی۔

اس قسم کے "لیڈیز مرد" ممکن ہے کہ ان جنسیں عورتوں کو پسند کرتے ہوں ورنہ جو اصل نسل کے مرد ہیں وہ تو ایسے ہم جنس نظر آنے والی ان عورتوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے بلکہ اگر کسی شوہر کی بیوی یکایک اس طرح تبدیلی شروع کر دیتی ہے تو وہ بیچارہ سخت پریشان ہو جاتا ہے کہ بھی شوہر اور بیوی شوہر تو آخر بیوی کون ہے۔ ہم آپ تو پھر بھی مشرقی ہیں یہ وضع قطع جس مغرب سے آتی ہے خود وہاں کے اس قسم کے مردوں کا حال یہ ہے کہ جس بیوی کو عورت سمجھ کر بیاہ کر لائے اسکی اس مصنوعی جنسی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے چنانچہ فرانس ایسے فیشن ایبل ملک میں ایک شوہر نے اپنی بیوی سے طلاق حاصل کرنے کی محض اس لیے درخواست دی کہ کامیاب حاصل کر لی کہ بیگم صاحبہ کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ انھوں نے سکرٹ چھوڑ کر سلیکس پہننا شروع کر دی۔ اپنے تمام زنانہ لباس اپنی سہیلیوں میں تقسیم کر دیئے اپنے بال بھی مردوں جیسے کٹوا لیے اور پائپ پینا شروع کر دیا۔ پہلے تو شوہر نے بیوی کو سمجھایا کہ دیکھو نیک بخت میں نے مرد سے نہیں بلکہ ایک عورت سے شادی کی ہے اور تم کو ہمیشہ عورت ہی بن کر رہنا چاہیے۔ تو میرا برادر عزیز بننے کی کوشش نہ کرو ہم کو گھر والی درکار ہے گھر والا نہیں مگر جب ان مسمات نے اس کی ایک نہ سنی تو اس نے طلاق کی درخواست دے دی کہ چونکہ میری بیوی وضع قطع کے اعتبار سے مرد بن چکی ہے لہٰذا میں اس مرد نظر آنے والی عورت کو اپنی بیوی نہیں سمجھ سکتا۔ عدالت نے اس کو طلاق کا حق دے دیا اور محض اس مردانہ پن نے اس عورت کو اپنے شوہر سے علیحدہ کرا دیا۔

عدالت نے اس مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ یہ بیوی کی سراسر زیادتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اس بات پر مجبور کرے کہ وہ ایک مرد نظر آنے والی جنس کو بیوی سمجھے۔ یہ عورت نہایت آسانی سے اس وضع کو ترک کر سکتی تھی اور عورت بن کر رہ سکتی تھی مگر اس نے شوہر کے جذبات کا خیال نہ کیا حالانکہ اس کو غور کرنا چاہیے تھا کہ اگر اس کا شوہر اسکرٹ پہننا شروع کر دیتا تو اس کو

طرح کے بال چھٹے ہوتے، اونچی ایڑی کا جوتا پہننے لگتا۔ میک اپ کا پابند ہو جاتا تو خود اس کے لیے کس حد تک ناقابلِ برداشت ہو جاتا اسی طرح وہ مردانہ وضع اختیار کر کے اپنے شوہر کے لیے ناقابلِ برداشت بن چکی ہے اور اسی پر مُصر ہے کہ اس وضع کو ترک نہ کرے گی تو سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کے شوہر کی درخواست منظور کر کے اس کو طلاق کا حق عطا کیا جائے اور اس کے مطالبہ کو حق بجانب سمجھا جائے۔ وہ عورت یہ فیصلہ سن کر پتلون پہنے سگریٹ کے کش لیتی ہوئی عدالت سے چلی گئی اور وہ مرد بھی ایک مرد بیوی سے نجات حاصل کر کے سبکدوش ہو گیا۔

یہ حالات اس ملک کے ہیں جہاں عورتوں اور مردوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا مگر ہمارے یہاں تو عورت صحیح معنوں میں عورت اور مرد صحیح معنوں میں مرد ہوتا ہے۔ یہاں یہ مغربی فضا بھلا کیونکر چل سکتی ہے مگر کورانہ تقلید کا یہ حال ہے کہ یہاں بھی کبھی نہ کبھی جب کوئی "پتلون آرا بیگم" نظر آجاتی ہیں تو مرد یہ غور کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اب ہم کیا پہنیں اور کیونکر اس فرق کو قائم رکھیں جو عورت اور مرد کے درمیان ہونا چاہیے۔

(۵)

متعدی امراض سے احتیاط برتنا اور اپنے کو بچائے رکھنا بے حد ضروری ہے اور اس احتیاط کے ہم خود قائل ہیں مگر اس قدر خوش خیال اہلِ برطانیہ کی طرح نہیں جو اس وہم میں مبتلا ہیں کہ پاکستان والے بذریعہ ڈاک ان کو چیچک ارسال کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اس کو نہایت خود غرضی سمجھتے ہیں کہ اکیلے اکیلے چیچک کے مزے خود ہی لوٹیں اور قدر دان اہلِ برطانیہ کو اس سے محروم رکھیں۔ چنانچہ ان برطانوی عقلمندوں کا خیال یہ ہے کہ یہ پاکستان والے نہ صرف تحفہ کے طور پر ان کے لیے چیچک لے کر جاتے ہیں بلکہ خطوط تک میں چیچک کے جراثیم بھر بھر کر بھیجے جا رہے ہیں لہٰذا وہاں کے اکثر عقلمند یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ؎

خط میں لکھے ہوئے چیچک کے پیام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے مرے نام آتے ہیں

لندن وغیرہ میں کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ جہاں کوئی پاکستانی راستہ میں نظر آیا اور بھاگے یہ انگریز سر پہ پیر رکھ کر چلاتے ہوئے کہ ؎

آیا آیا پاکستانی بھاگیں سارے لوگ
اوپر اوپر اچھا خاصہ اندر چیچک روگ

ریڈیو اور ٹیلی ویژن والے اور بھی اس وہم کو ہوا دے رہے ہیں چنانچہ ابھی پچھلے دنوں ایک ڈاکٹر صاحب ٹیلی ویژن پر عوام کو بتا رہے تھے کہ چیچک کے جراثیم خطوط، اخبارات اور کپڑوں کے ذریعے منتقل ہو سکتے ہیں اس خبر کو وہاں کا ایک اخبار ایوننگ سٹینڈرڈ بھی لے اُڑا۔ نتیجہ یہ کہ ڈاکخانوں کے ملازمین نے پاکستانی ڈاک کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا اور پوسٹ مینوں نے صاف کہہ دیا کہ صاحب جان ہے تو جہان ہے ہم یہ پاکستانی چیچک میں مبتلا ڈاک تو ہرگز تقسیم نہ کریں گے ان خطوط میں محبت نامے نہیں چیچک نامے بھرے ہوئے ہیں ان پاکستانی اخبارات میں خبریں نہیں چیچک بھری ہوئی ہے اور چونکہ یہ خطوط اور پاکستانی تجارات

[illegible] لیکن تمام تر اس کے قریب ہی دبا دیئے گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانی ڈاک تقسیم نہ ہو سکی اور اس کے ڈاک خانوں میں ڈھیر لگ گئے ہیں۔

اب لندن کے جی۔ پی۔ او نے اعلان کیا ہے کہ پاکستانی ڈاک کی تقسیم شروع کر دی گئی ہے اس لیے کہ اس کا پورا معائنہ ہو چکا ہے اور یہ کہ اس میں چیچک کے جراثیم نہیں ملے اس لیے کسی جبری ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ یہ برطانوی افراد و ممالک چاہتے ہیں کہ ہر پاکستانی خط یا اخبار کے ساتھ اس کے متعلق ایک طبی سرٹیفکیٹ بھی آنا چاہیے کہ اس خط یا اس اخبار کا باقاعدہ معائنہ کیا جا چکا ہے اور اس بات کی تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ خط یا یہ اخبار چیچک میں ہرگز مبتلا نہیں ہے احتیاطاً اس خط یا اس اخبار کے چیچک کا ٹیکہ بھی لگا دیا گیا ہے اور اس کے اندر بھی ایک ٹیکہ ملفوف ہے تاکہ اس خط یا اخبار کو وصول کرنے والا یہ ٹیکہ اپنے لگا لے اس کے بعد خط یا اخبار پڑھے اور ہر خط یا اخبار کے لفافہ پر یہ بھی لکھا ہونا چاہیے کہ ——

نامہ کو کھولیے گا ذرا دیکھ بھال کے
چیچک کا ٹیکہ رکھا ہے اس میں سنبھال کے

کراچی میں چیچک کے پھیلتے ہی برطانیہ میں پاکستانیوں سے اس قدر نفرت ہو گئی ہے کہ وہ بیچارے سخت پریشان ہیں کہ کریں تو کیا کریں۔ وہاں کے عام ہوٹلوں میں ان کو گھسنے نہیں دیا جاتا ہے۔ ریسٹورانوں کے مالکوں نے پاکستانیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا ہے۔ انگریز دوستوں تک نے ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے اور اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ ان پاکستانیوں سے صاحب سلامت دور ہی کی اچھی۔ بسوں میں ان کو جگہ نہیں دی جاتی۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی ان کو ٹیکسی میں بٹھانے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اب وہ لاکھ کہیں کہ بھائی ہمارا چیچک سے جائز یا ناجائز کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تو مدت سے ولایت میں ہیں مدت سے یہاں رہتے ہیں مگر ان کو جواب یہی دیا جاتا ہے کہ تم کو خود چیچک نہ سہی مگر تم دوسروں کو چیچک میں ضرور مبتلا کر دو گے۔ تم چیچک خود نہیں لاتے مگر تم کو تمہارے عزیز پاکستان سے ہاتھ کے ہاتھ چیچک بھیج دیتے ہیں۔ لہذا بحیثیت پاکستانی کے تمہارا کوئی اعتبار نہیں۔ کیونکہ کب ہمارے لیے چیچک آگیں بن جاؤ۔ اس چیچک نے برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی چیچک ایسی الجھائی ہے جو کسی طرح سلجھائے نہیں سلجھتی۔

چیچک کے ٹیکے تو مدت ہوئی ایجاد ہو چکے ہیں مگر وہم کے ٹیکے چونکہ اب تک ایجاد نہیں ہوئے ہیں لہذا برطانیہ میں چیچک کے بجائے وہم کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ وہم کا علاج تو بیچارے لقمان کے پاس بھی نہ نکلا چنانچہ یہ وہمی برطانوی آج کل عجیب و غریب حرکتیں کر رہے ہیں کہ پاکستان سے جو خطوط اور اخبارات جاتے ہیں ان کو اصل پتہ پر پہنچانے سے پہلے ہسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے اور بستر علالت پر لٹا دیا جاتا ہے اس کے بعد ان کا ایکسرے وغیرہ ہوتا ہے ان کے خون کا معائنہ کیا جاتا ہے ان کو دو ایک دن ہسپتال میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے کہ ان کے چیچک تو نہیں نکلتی اس کے بعد اگر وہ صحت یاب ثابت ہوتے ہیں تو ہسپتال سے نکال کر ان کو پوسٹ مین کے حوالے کر دیا جاتا ہے ورنہ وہ چیچک میں مبتلا ہو کر دو تین گھڑی میں وفات ہو جاتے ہیں یا ڈیڈ لیٹر آفس کے قبرستان میں ان کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کر دیا جاتا ہے۔

اس قسم کے توہم پرستوں کی ہمارے یہاں بھی کوئی کمی نہیں ہے نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جو صاحب [illegible] کو آسیب زدہ سمجھتے

بہت ... ہوتے ہیں اور جب تک صابن لگا کر ہاتھ نہ دھو لیں ان کو چین نہیں آتا۔ ایک بزرگ محترم ... بے ساختگی ... تھا کہ جہاں ان کے سامنے کسی کو چھینک آگئی وہ اس طرح اچھلے جیسے گر گر جاتے تھے ... گھن ہے اور ان کو پورا یقین ہو جاتا تھا کہ اب ان کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ وہ ضرور ملیریا میں مبتلا ہوں گے۔ اور یہ ظاہر ہے جادو ثابت ہوا یہاں تک کہ جب ان کی ایک عزیزہ کا ملیریا میں انتقال ہوا تو انہوں نے میت کو کندھا تک نہ دیا کہ مبادا ... تو بے شک مر چکی ہے مگر ممکن ہے کہ اس کے جراثیم زندہ ہوں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ احتیاط نہ کرنا چاہیے مگر اب یہی کیا احتیاط کہ احتیاط اور وہم میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے۔

(۶)

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ انگریز بہادر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم وغیرہ سے بھی اتنا نہیں ڈرتے جتنی ان کی روح چیچک سے فنا ہوتی ہے چنانچہ آج کل برطانیہ میں کیفیت یہ ہے کہ جہاں ان کو کوئی پاکستانی یا بھارتی نظر آیا وہ مجسم تصویر سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کہ یہ شخص قریب آیا اور وہ چیچک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ برطانیہ میں رہنے والے پاکستانیوں کو سخت پریشانی ہے کہ وہ آخر ان انگریزوں کو کس طرح یقین دلائیں کہ ہم ٹیکہ لگوا چکے ہیں جب تک وہ اپنا بازو دکھا لیں تب تک یہ لوگ بھی رفو چکر ہو جاتے ہیں پہلے تو ان کا ارادہ ہوا کہ اپنے ٹیکے کو نمایاں کرنے کے لیے وہ اپنے بازو کے بجائے پیشانی پر ٹیکہ لگوانا شروع کر دیں تاکہ ان کی صورت دیکھنے والے اس ٹیکہ کو بھی پہلی ہی نظر میں دیکھ کر مطمئن ہو جایا کریں مگر اپنے چہرے کو مستقلاً داغدار بنانا اور کلنک کے ٹیکے کی طرح پیشانی پر چیچک کا ٹیکہ لگوانا جب ان کی سمجھ میں نہ آسکا تو اب انہوں نے یہ ترکیب کی ہے کہ اپنے خلاف اس نفرت اور بدگمانی کو دور کرنے کے لیے وہ ٹیکہ لگوا کر اپنے کالروں پر ایک بلا آویزاں کر لیتے ہیں جس پر لکھا ہوتا ہے کہ "مجھے ٹیکہ لگ چکا ہے" یہ بلے لنکا شائر کامن ویلتھ سوسائٹی نے تیار کرائے ہیں جن کی سبز زمین پر پاکستان کا ہلال اور لنکا شائر کا سرخ گلاب بنا ہوا ہے اور یہ عبارت لکھی ہوئی ہے کہ "مجھے ٹیکہ لگ چکا ہے" دیکھنا یہ ہے کہ ان بلوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔

برطانیہ تو برطانیہ انگریز جہاں کہیں بھی ہیں پاکستانیوں کو چیچک کے جراثیم سمجھ کر ان سے بدکتے نظر آ رہے ہیں مثلاً ایم سی سی کی جو ٹیم پاکستان کا دورہ کر رہی ہے اس کے کھلاڑی اب اس خیال سے لرزہ براندام نظر آتے ہیں کہ اب ان کو کراچی میں پہنچنا ہے جو چیچک کا مرکز ہے حالانکہ اب کراچی میں چیچک پر قابو حاصل کیا جا چکا ہے اور اس کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے کہ ڈھاکہ سے یہ کھلاڑی چیچک کے ٹیکے لگوا کر مغربی پاکستان بھیجے جائیں گے مگر وہ اس کے باوجود مطمئن نہیں ہیں اور طرح طرح کی شرطیں ان کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں کہ ہم کراچی کی آبادی سے دور کسی جگہ قیام کریں گے۔ ہم وہاں کسی سے ہاتھ نہ ملائیں گے ہمارے پاس وہاں کوئی آٹوگراف لینے اور چیچک دینے نہ آئے ہم کو کراچی کے عوام اپنے نرغہ میں لینے کی کوشش نہ کریں ہم نہ ان کی آٹوگراف بکس کو ہاتھ لگائیں گے نہ اس بات کے دستخط دیں گے کہ ہم نے چیچک وصول پائی۔ لہٰذا ان کے لیے اسی قسم کے انتظامات کئے جا رہے ہیں کہ ان کو آبادی واقع ہوٹلوں میں ٹھہرانے کے بجائے ہوائی اڈے کے باہر ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرایا جائے گا۔ اس بات کا بھی احتیاط برتی جائے گی کہ ان سے آٹوگراف لینے کوئی ان کے قریب نہ آئے اور ان کو "چھوئی موئی" سمجھ کر سب ان سے ...

ان میں سے بہت سے ناجائز ہیں۔
وشدید ہے ... ہم ... قصہ سمجھتے ہیں کہ غالب کراچی کی شکست ہو چکی ہے ان کے کھیل کی نوعیت عجیب
ٹھیک ہے یہ ایم سی سی والے اس قصہ سمجھتے ہیں وہ احتیاط برتیں گے کہ اس گیند کو پاکستانی کھلاڑیوں کے ہاتھ نہ
لگنے دیں ... پاکستانی کھلاڑی ... دیکھتے ہیں وہ احتیاط برتیں گے کہ اس گیند کو ... ہاتھ
... کہ اس ہیٹ میں چھپے ہوئے چیک کے جراثیم اس گیند سے بھی چپک گئے ہوں لہٰذا اس گیند کو ہاتھ لگانا
... ہے بہت ہی خطرناک قسم کے کھلاڑی پاکستانی پلیئروں کے گیند پھینکنے سے ... بھی نامناسب ہیں
... ہے کہ اس گیند کے ساتھ انھوں نے چیک کے جراثیم چپکے ہوں لہٰذا احتیاط ضروری ہے
... ہے کہ ... اس گیند کے ساتھ ... کیا گیا کہ یہ بھی استعمال ہونے والے تمام گیندوں اور
... معلوم نہیں ... کی طرف سے یہ مطالبہ کیوں نہیں کیا گیا کہ ... اور معلوم نہیں ... کرنے والے یہ
بلے وغیرہ کے ہمراہ چیک کے ٹیکے لگا دیئے جائیں تاکہ وہ ... اور معلوم نہیں ... جاتے ہیں جہاں کراچی
شہر ... کی کہ صرف آبادی سے دور شہر نا ہی نہیں چاہتے بلکہ ... آبادی سے ... جاتے ہیں جہاں کراچی
کی آبادی بھی ہو ... اس کا آسان ترکیب ہوتی کہ ڈھاکہ ... ٹیسٹ بھی کھیل لیتے اور قصہ ختم کرتے۔
... چیک سے ... کہ اس ... اپنے حریفوں پر ... کر لیا ہے کہ وہ
... کس چیز سے ہیں اور چیک کے خوف سے ان کے ... کر جاتے ہیں۔ وہ کیا چیز ہے لہٰذا اب ان کے لیے نہ صرف ...
... کی ... ایٹم بم ... ہائیڈروجن بم وغیرہ ... چند ... میں چیک کے جراثیم بھر کر
چھوڑ دیئے جائیں ... دشمن ان ... پر حملہ آور ہونے کے بجائے
ان پر ... جائیں۔ وہ بھاگ کھڑے ہوں گے اور پھر ... کی ... ان پر ... کے لیے
فوج بھیجنے کی بھی ضرورت نہیں۔ چیک میں مبتلا چند مریض ... سے ان کی ... دیئے جائیں۔ وہ ...
چھوڑ کر بھاگیں گے اور ایسے غائب ہوں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ... ان کے قدم اکھاڑنے کے لیے ایسا
حربہ ... کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا کیا عجب ہے کہ اب روس کی اسلحہ ساز فیکٹریوں میں ایٹم بم اور میگاٹن بم
وغیرہ بنانے کے بجائے چیک بم بنانا شروع کر دیئے جائیں۔ اور ان تیاریوں ہی سے وہ لرزہ براندام نظر آنے لگیں۔
بعض حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اہل برطانیہ چیک سے اتنا ڈرتے نہیں جتنا وہ ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ وہ اس
بہانا ... کا ... کرانا چاہتے ہیں۔ تاکہ نہ صرف پاکستانیوں سے بلکہ دولت مشترکہ کی تمام سیاہ فام اقوام سے
ان کو نجات مل جائے۔ مگر اس مقصد کے لیے جس طرح ساری قوم کو ... جا رہا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس ساری قوم
میں چیک سے انتہائی خوف موجود ہے لہٰذا اس خوف سے برطانیہ کے حریف یقیناً فائدہ اٹھائیں گے اور اس پر بجائے اس کے
کہ خود حملہ کریں چیک سے حملہ کرائیں گے۔ اہل برطانیہ کو چاہیئے تھا کہ وہ اپنے شیر کو چیک کے سامنے ... دیتے۔ اگر
یہ خوف تھا بھی تو اس کو اپنے حریفوں سے چھپائے رکھتے۔ اور اپنے ہاتھوں یہ حربہ اپنے دشمنوں کو نہ دیتے۔ اب تو اس کا راز افشا
ہو نا بڑے سے بڑے جنگی راز کے افشا ہو جانے سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور اس کمزوری کے کھل جانے سے فائدہ
اٹھانے والے یقیناً فائدہ اٹھائیں گے۔
چیک سے ان صاحب بہادروں کا یہ عالم ہے کہ خود ایم سی سی کے پاکستان آئے ہوئے کھلاڑیوں تک کو یہ شکایت ہے

کردہ جو خطوط اپنے احباب و اعزہ کو بھیج رہے ہیں وہ ان تک نہیں پہنچتے اس لیے کہ وہ خطوط کو [illegible] کے حوالے انگریزوں ہی کے نام ہوتے ہیں مگر چونکہ پاکستان سے جاتے ہیں لہذا ان کو پہلے جعلی معائنے کے لیے [illegible] داخل کر دیا جاتا ہے کہ کہیں پاکستان سے آئے ہوئے یہ خطوط بھی چیچک میں مبتلا تو نہیں ہیں۔ [illegible] سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اور جب تک ان میں سے ہر خط کو صحت کا سرٹیفکیٹ نہ دے دیا جائے وہ اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ ابھی تو یہ صرف خطوط ہی کا قصہ ہے مزہ تو اس وقت آئے گا جب یہ ایم سی سی ٹیم پاکستان سے اپنے وطن واپس جائے گی اور وہاں ان کھلاڑیوں کے احباب و اعزہ بھی کہیں گے کہ دوستی اور قرابت دوسری چیز ہے لیکن پہلے اسپتال تشریف لے جائیے۔ اس کے بعد گھر کے دروازے آپ پر کھل سکتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ تحفے کے طور پر چیچک لے کر ہو لیے

(۷)

بھارت کے جوتشیوں نے جب سے یہ حساب لگایا ہے کہ ۴ فروری کو جبکہ آٹھ ستارے ایک ہی برج میں جمع ہو جائیں گے ساری دنیا تہس نہس ہو جائے گی بھارت کے توہم پرست جو ان جوتشیوں پر اعتقاد رکھتے ہیں سخت بدحواس ہیں کہ۔ ؎

جائیں تو جائیں کہاں

وہ تو کہتے ہیں کہ ان جوتشیوں نے یہ بتایا ہے کہ صرف بنارس ایک ایسا مقام ہے جو ان تباہیوں سے بچ جائے گا لہذا اب جس کو دیکھیے وہ منہ اٹھائے بنارس کی طرف چلا آ رہا ہے چنانچہ اب بنارس کا یہ حال ہے کہ وہاں نہ کسی ہوٹل میں تل دھرنے کی جگہ باقی رہی ہے نہ کوئی مکان کرایہ پر ملتا ہے نہ کسی سرائے میں کسی کی سمائی ممکن ہے۔ یعنی اور کہیں یہ قیامت آئے یا نہ آئے بنارس میں تو میدانِ حشر کا سا منظر ابھی سے شروع ہو گیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ بنارس آنے والے چاہے اس قیامت سے بچ جائیں مگر خود بنارس کا بچنا مشکل ہے۔

بنارس کے علاوہ ان لال بجھکڑ جوتشیوں میں سے بعض کی "دور نظری" یہ بتاتی ہے کہ بھارت کے دوسرے چند مقامات بھی بچ جائیں گے خصوصاً وہ تمام مقامات بچ جائیں گے جو تیرتھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہاں اول تو لوگ مریں گے کم اور اگر مر بھی گئے تو ان کو نروان حاصل ہو جائے گا۔ ان جوتشیوں نے بتایا ہے کہ بھارت بھی اس تباہی کے نرغے میں آ ہی جاتا اگر اس کا نام انڈیا کے بجائے بھارت نہ رکھ دیا جاتا بلکہ اب بھی بھارت کے صرف وہی لوگ بچیں گے جو اس کو انڈیا نہیں کہتے۔ رہ گئے وہ لوگ جو اب بھی مارے انگریزیت کے اس کو انڈیا ہی کہتے اور سمجھتے ہیں ان کو تو چاہیے کہ وہ اپنا کہا سنا معاف کرائیں اور اپنے کریا کرم کا بندوبست کر رکھیں اس لیے کہ ان کے بچنے کی کوئی صورت نہیں اور وہ سب کے سب ۴ فروری کو "رام نام ست ہے" کے مستحق بن کر رہ جائیں گے اور سارا ملک ایک عظیم الشان مرگھٹ بن کر رہ جائے گا۔

اس توہم پرستی میں صرف ہندو جہلا ہی مبتلا نہیں ہیں بلکہ بڑے بڑے پڑھے لکھے اس جہالت کے فارغ التحصیل ثابت ہو رہے ہیں مثلاً اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنا نند جن کو لوگ پڑھا لکھا آدمی سمجھتے تھے باوجود صورت سے پڑھے لکھے نظر آنے کے بعض معتبر لوگوں کا بیان یہ ہے کہ وہ اتنے جاہل بھی نہیں ہیں جتنے صورت سے نظر آتے ہیں اپنی جہالت اور

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ چونکہ وہ ۴ فروری کو نہایت خوفناک دن بتا رہے ہیں ان کی جوتش میں بڑا دخل [illegible] ہندوستان [illegible] قائل [illegible] سے تعلیم یافتہ [illegible] ہے کہ [illegible] ہے تو [illegible] ہوگی لیکن [illegible] کے [illegible] ہوں گے اور [illegible] ہمارے [illegible] نہیں ہے۔

بھارت کے یہ جوتشی ہی ہیں جو [illegible] قسم کے [illegible] مثال ہیں [illegible] پنڈت نہرو [illegible] ہیں [illegible] ہیں۔ [illegible] کہ پنڈت نہرو بھی [illegible] پنڈت [illegible] ہیں [illegible] ہے کہ یہ تمام پیش گوئیاں غلط ہیں اور جوتشی [illegible] عوام [illegible] کے قائل ہو جائیں گے۔ [illegible] اگر جوتشیوں [illegible] اشارہ کرتے ہیں تو پنڈت نہرو [illegible] پنڈت نہرو [illegible] جوتشیوں [illegible] میں مصروف ہوں گے [illegible] پنڈت نہرو [illegible] دی ہے کہ اگر خیریت رہی تو وہ [illegible] جائیں گے۔ اور اگر خیریت نہ رہی تو [illegible] ان کی [illegible] گی۔

ان جوتشیوں نے بتایا ہے کہ اب سے چار ہزار نو سو چھتر برس قبل آٹھ سیارے ایک ہی برج میں جمع ہو گئے تھے تو دنیا میں کلجگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ اور مہابھارت جیسی خوفناک جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ مہابھارت کی تاریخ کے طالب علموں کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کورو اور پانڈو [illegible] کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ خاندانوں کی ایسی جنگ تھی جس میں دونوں طرف سے کچھ تیر وغیرہ چلے تھے۔ اگر یہ ایسی ہی ہولناک جنگ ہوتی اور چار ہزار نو سو چھتر برس پہلے واقعی قیامت برپا ہوئی ہوتی۔ تو آج اس نئی قیامت کی پیش گوئی کرنے والے موجود نہ ہوتے۔ ان کی ساری نسل اسی وقت ختم ہو گئی ہوتی اور ان کو تباہ کرنے کے لیے اب ان آٹھ سیاروں کو ایک ہی برج میں آنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔

بھارت میں دراصل کشمکش یہ جاری ہے کہ عام انتخابات کے پیش نظر کانگریس ایسی شورشیں برپا کر رہی ہے۔ کہ بھارتی عوام اس کی دیرینہ کوتاہیوں اور نااہلیوں کے بجائے اس شورش کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اور وہ اس طرح عوام کی توجہ ہٹا کر الیکشن کی بازی جیت لے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مخالف پارٹیوں نے کانگریس کی اس ترکیب کا توڑ یہ سوچا ہے کہ عوام کی توجہ ان شورشوں سے ہٹا کر ۴ فروری والی قیامت کی طرف مبذول کر دیں اور ۴ فروری گزر جانے کے بعد یہ کہہ دیں کہ فروری غلط کہا گیا تھا یہ تاریخ دراصل ۴ مارچ ہے اور جب مارچ بھی خیریت سے گزر جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد اپریل اور مئی وغیرہ بھی آتی ہے۔

تو دیکھیے گا کہ جب فروری کو کچھ نہ ہوگا تو یہ جوتشی اور یہ سمپورنانند سب یہی کہیں گے کہ یہ آفت تو آ ہی گئی تھی مگر ہم نے پوجا پاٹ اور گیان دھیان سے اس کو ٹال دیا ہے لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس پوجا پاٹ اور گیان دھیان کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ورنہ اگر اس سے ذرا بھی غافل ہوئے تو ایک ہی برج میں بیٹھے ہوئے یہ آٹھ سیارے قیامت ڈھا دیں گے۔ معلوم ہوا

کہ ۱۵ جنوری کو وہاں ایک عظیم الشان یگیہ بھی شروع ہوا ہے جس کا افتتاح بنارس کے سابق مہاراجہ نے کیا [illegible] خیریت سے گزر گئی تو اس کو اس یگیہ بند کی کرامت کہا جائے گا۔ مختصر یہ کہ اس سارے جال اور اس منتر جنتر کا [illegible] کسی طرح تسلیم نہ کیا جائے گا۔

(۸)

اس خبر سے ہمارے رندانِ بادہ نوش کا اضطراب شدید تر ہو گیا ہے کہ حکومت مغربی پاکستان مکمل طور پر شراب نوشی اور مے خوری پر پابندی عائد کرنے کے سوال پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ صوبہ بھر میں اب تک جاری شدہ پرمٹوں کا از سر نو جائزہ لیا جائے گا۔ اس لیے کہ اب صرف ان ہی لوگوں کو پرمٹ دیے جائیں گے جن کو واقعی طبی طور پر شراب نوشی کی ضرورت ہے۔ باقی جتنے لوگ شوقیہ طور پر یہ شغل فرماتے ہیں اور محض غم غلط کرنے اور آپے سے باہر ہونے کے لیے شراب پیتے ہیں ان سے کہا جائے گا کہ وہ بھلے مانس بننے کی کوشش کریں بجائے شراب کے دودھ پیا کریں۔ شراب خور بجائے اپنے کو شیرخوار بنائیں تاکہ ان کو معصوم سمجھا جا سکے لیکن اگر وہ دودھ پیتے بچے بننا نہیں چاہتے تو بھی ان کے پینے کے لیے بہت سی چیزیں ہیں کوکاکولا پئیں۔ لیمن اسکواش پئیں۔ گنے کا رس پئیں۔ کافی پئیں۔ رہ گئی شراب اس کو اب مشروب کی نہیں صرف دوا کی حیثیت ہی حاصل ہوگی اور ڈاکٹر جس کو نسخہ میں شراب لکھے گا وہ بیمار شراب پی سکے گا۔

اس پابندی کے عائد ہونے کے بعد ہمارے رندانِ بادہ نوش یقیناً صدقِ دل سے اس مرض پر قربان ہوتے نظر آنے لگیں گے جس کی دوا شراب ہو وہ ان بیماروں کو رشک سے دیکھیں گے جن کو وہ مبارک مرض ہو جو ڈاکٹروں سے نسخہ میں شراب لکھوا سکے اور اس کے بعد وہ ڈاکٹروں کے پاس محض یہ دریافت کرنے جایا کریں گے کہ وہ کیا تدابیر ہیں جن پر عمل کر کے ہم اس بیماری میں اپنے کو مبتلا کر لیں جس کے علاج کے طور پر ہم کو شراب کا پرمٹ حاصل ہو سکے۔ ڈاکٹروں سے اس سلسلہ میں دوستیاں پیدا کی جائیں گی سفارشیں پہنچوائی جائیں گی کہ کسی طرح ان کو مریض بنا دیا جائے اور وہ بیماری پیدا کر دیں جو ان کو شراب کا حقدار بنا دے۔ اب تک ڈاکٹر کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ بیماریوں سے مریض کو نجات دلائے مگر اب ڈاکٹروں سے ایسی بیماریاں پیدا کرنے کی فرمائش ہوگی جن میں مبتلا ہو کر شراب پینے کی اجازت مل سکے۔ ڈاکٹر تو ڈاکٹر اب تو وہ مریض بھی بے حد ہر دلعزیز بن جائیں گے جن کے پاس شراب کے پرمٹ ہوں گے تاکہ ان سے مراسم بڑھا کر اس کا موقع مل جائے کہ ان کے شریکِ جام ہو سکیں اور یہ شغل جاری رہ سکے۔ ان سے اس قسم کے معاملات طے ہوا کریں گے کہ پرمٹ تمہارا پیسے ہمارے۔ مرض تمہارا علاج ہمارا۔ بیمار تم ہو دعا ہم دیں اور فائدہ دونوں کو پہنچے یعنی تم کو صحت کی شراب ہم کو بے مرض کے دوا۔

پرمٹ تو خیر اب بھی رائج ہیں مگر جب ان کی از سر نو جانچ پڑتال ہوگی تو بہت سے منسوخ کیے جائیں گے اور بہت سے پرمٹ بند ہوں گے اس لیے کہ آج کل تو حال یہ ہے کہ کسی کے پاس اثر و رسوخ کے تحت پرمٹ موجود ہے تو کسی نے بصرفِ کثیر پرمٹ حاصل کر رکھا ہے۔ کسی کے پرمٹ کرایہ پر چلتے ہیں تو کسی کے پرمٹ ادھر ادھر مہمان جاتے رہتے ہیں اور ہر پینے والے نے کسی نہ کسی طرح پرمٹ حاصل کر رکھا ہے اور سب خوش ہیں کہ ان کو اتنی شراب حاصل ہے کہ گھڑیالوں کی طرح اس میں اپنے کو تیرتا ہوا

[illegible] ہے یہ بات [illegible] ہوں کہ جب ان جلد باز شعبدہ بازوں کا ذکر ہو تو [illegible]
[illegible] ہوتے ہیں [illegible] سال سے [illegible] گا [illegible] نمایاں [illegible]
[illegible] ہیں گے کہ —

اف یہ ساقی تری یہ بے نیازی

کس طرح دیکھیں کسی انجام بیاں

شراب اور شراب کے دور، افیون اور چرس کی پابندی [illegible] ضرورت [illegible]
ہو جاتی ہے کہ [illegible] افیون [illegible] کیفیت رکھتی ہے [illegible] دنیا کے [illegible]
نہیں بلکہ افیون کو [illegible] سلسلہ [illegible] ہے جس کے بغیر [illegible] ہیں۔ ان کا [illegible] ہے کہ [illegible]
دنیا اپنی ان ہی دوستوں کے ساتھ [illegible] جانے [illegible] ہوتے [illegible] ہوئے [illegible]
[illegible] جو حلوؤں کے [illegible] ہوتے [illegible] چائے ہوتیں [illegible] لشکر تیار ہوتے [illegible]
[illegible] ایک عالم [illegible] دنیا [illegible] آتی [illegible] تو یہ ہے کہ اگر [illegible]
حروف اس ہی [illegible] ہوتا نہ یہ اہل پینک جگر [illegible] نوبت آتی اور نہ کبھی جنگ [illegible]
[illegible] رکاب میں چلتے نظر آتے۔
کی نوبت نہ آتی ایک وجہ یہ ہے [illegible]

ان افیونیوں کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں سارے ہنگامے وہی لوگ برپا کئے ہوئے ہیں [illegible]
ہوا ہے جو افیون سے شغل نہیں کرتے اگر یہ سب [illegible] ہوتے تو وہ [illegible]
حصہ جو اپنی اپنی پینک میں مبتلا رہتے [illegible] وہی کیفیت ہوتی جو ان دو افیونیوں کی ہوئی تھی جو ایک کنوئیں کی جگت پر بیٹھے
افیون پی رہے تھے اور آخر پینک میں آ کر ان میں سے ایک صاحب کنوئیں میں جا گرے۔ کنوئیں میں گرنے کے بعد جب ان کا نشہ
ہوا تو انھوں نے اپنے ساتھی کو آواز دی کہ بھائی خدا بخش بچاؤ۔ اور جب بھائی خدا بخش نے کنوئیں میں جھانک کر ان کو دیکھا تو
بڑے اطمینان سے کہا کہ اچھا تو گویا آپ وہاں تشریف رکھتے ہیں یہاں ہم تو یہ کہتے ہیں کہ جہاں رہو خوش رہو۔ اس قسم کے لوگ
کسی دوسرے کے معاملے میں بھلا کیسے پڑ سکتے ہیں اس عالم میں اگر ہوتے تو مسٹر خروشیف بھی بجائے دھمکیاں دینے کے مسٹر کینیڈی
سے یہی کہتے کہ جہاں رہو خوش رہو۔

دنیا میں آج جو ہنگامے برپا ہیں اور عالمگیر جنگ کے جو بادل ہر طرف منڈلاتے نظر آتے ہیں ان کے متعلق اہل افیون کا
خیال یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض اس لیے ہو رہا ہے کہ لوگ افیون سے شغل نہیں کرتے اور پینک کے فوائد سے بے بہرہ ہیں ورنہ اگر
افیون پر بھروسہ کرتے تو ان واہیات باتوں میں پڑنے کا ان کو ہوش ہی نہ ہوتا ان سارے جھگڑوں بکھیڑوں سے بے نیاز خود اپنی
ہی زندگی بسر ہوتی اور بغیر ہوائی جہازوں میں پٹرول بھرنے کے بیٹھے بٹھائے فضاؤں میں دن رات اڑتے رہتے اس کا مطلب
یہ نہیں ہے کہ افیون ان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ وہ بزدل ہرگز نہیں ہوتے بلکہ بڑے جرأت مندانہ حوصلے بھی رکھتے ہیں چنانچہ
جنگ جرمنی کی جب ان کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے مردانہ وار اپنا جنگی نعرہ بھی بلند کیا تھا جس نے ہٹلر کے چھکے چھڑا دیے

کرے

ہم لوگ ہیں افیونی اک رنگ جما دیں گے
جو من تری تو پڑیاں ہیں ہم بانس چلا دیں گے

وہ تو کہیے کہ اس نعرے کے بعد ہی ان کو پینک آگئی تھی اور وہ اونگھ گئے تھے ورنہ ہینڈ کا تو اس سے بھی زیادہ عبرت انگیز حشر ہوتا جتنا آخر کار ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اب ان کی افیون پر بھی پابندی عائد ہونے والی ہے اور ان کو بھی مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے اپنے گوشۂ امن سے نکل کر اس عالم ہوش میں آجائیں جو سراپا انتشار بنا ہوا ہے۔

(۹)

"گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خاں نے سرکاری افسروں کو ایک غیر رسمی گفتگو میں کہا کہ انتظامیہ کی تنظیم نو کے لیے اقدام کئے جا رہے ہیں لیکن سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہر کام پر صحیح آدمی مقرر کیا جائے۔" اس معیار پر اگر سرکاری ملازمین کو پرکھا جائے تو عجیب عجیب منصبوں پر عجیب عجیب کارکن نظر آئیں گے۔ مثلاً ماہر ہیں وہ فن طبقات الارض کے اور خدمت سپرد ہے ان کے یہ کہ مرغبانی کو ملک میں فروغ دینے کی کوشش کریں۔ تعلیم حاصل کی ہے انھوں نے بینکنگ کی اور بیٹھے ہوئے بغل میں سرخ اور سبز جھنڈیاں دبائے اور منہ میں سیٹی لیے ہوئے ریلوے کے گارڈ۔ تربیت حاصل کی ہے انھوں نے محتسب بننے کے لیے اور نوکری کر رہے ہیں ٹریفک پولیس میں۔

اس قسم کا ایک واقعہ آخر کس طرح بھلا دیا جائے کہ حضرت جگر مراد آبادی مرحوم ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جب لاہور تشریف لائے تو ان سے ایک ڈاکٹر صاحب جو ایم اے پی ایچ ڈی تھے ملنے آگئے۔ جگر صاحب نے مزاج پرسی وغیرہ کے بعد ان سے کرسی وغیرہ کی بات بھی چھیڑ دی کہ آج کل آپ کس یونیورسٹی میں ہیں تو ان ڈاکٹر صاحب نے سر جھکا کر خاموش رہ جانا ہی مناسب سمجھا مگر جب جگر صاحب نے اپنے سوال کے جواب کے لیے اصرار شروع کر دیا تو آخر بیچارے کو کہنا پڑا کہ میں کسی یونیورسٹی میں پروفیسر! لیکچرار وغیرہ نہیں ہوں بلکہ محکمۂ آبادکاری میں ملازم ہوں ظاہر ہے کہ اس جواب پر صرف جگر صاحب ہی نہیں بلکہ ان کا ہر ہمنشیں حیران ہو کر اور منہ کھول کر رہ گیا کہ آخر ایک پی ایچ ڈی کا محکمۂ آبادکاری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ جگر صاحب پہلے تو دیر تک ان ہی ڈاکٹر صاحب کے سر رہے کہ صاحب آپ کیوں ہیں محکمۂ آبادکاری میں اور اپنی بربادکاری کیوں کر رہے ہیں مگر جب وہ سوائے مجبوری کے اور کوئی معقول وجہ نہ بتا سکے تو جگر صاحب نے اس نیازمند کی خبر لینا شروع کر دی کہ یہ کیوں ہیں محکمۂ آبادکاری میں گویا اس بے چارے کا ذمہ دار میں ہی تھا آخر مجھ کو حکم دیا کہ گورنر صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری سے میرے لیے وقت لیجیے۔ ابھی ٹیلیفون کیجیے میں ان ڈاکٹر صاحب کو اور آپ کو لے کر وہاں جاؤں گا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے گورنر تھے۔ لہٰذا جگر صاحب ان سے ملے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کیا اور جب تک ان سے وعدہ نہ لے لیا کہ وہ خود اس معاملہ کی طرف متوجہ ہوں گے اس وقت تک وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیا۔

تقسیم ملک سے قبل دیسی ریاستوں میں تو اس قسم کی باتیں بہت عام تھیں کہ جس کو جس کام پر چاہا لگا دیا چنانچہ ایک لطیفہ

سب جانتے ہیں کہ محکمہ بننا چاہیں تو ہم آپ کا کیا کر سکتے ہیں بہر حال قصہ یہ ہوا کہ ایک چپڑاسی کو جب تبادلے کا حکم ملا تو اس نے
اس کے مرد بیمار پڑ گئے کہ حضور ضرور کے بچے کو اس تبادلے سے بچائیے۔ فیصلہ یہ ہے آنکھیں دکھائیں کہ آخر تبادلے کے لیے کیا
اور کا بیان یہ تھا کہ تبادلات قابلیت کی وجہ سے نہیں ہوتے بلکہ اس محکمے نے شروع کر رکھا ہے چپڑاسی کو ضرورت ہی
جب قابلیت تبادلے کے کیس میں عمر قید ہوا تھا کچھ دن کے بعد یہ تبادلہ منسوخ ہو کر کا حکم ملا
ہوا اشتہار چھپے کسی کا تبادلہ ہو کر کچھ دن بعد ان کا انجینئر کے عہدے پر تبادلہ ہوا وہ گو حال تک انجینئری تو کیا بالکل ہی نہ جانتا تھا
مگر ایک سال انجینئری کرتا رہا اس کے بعد ایک لیڈی ڈاکٹر کی جگہ بھیج دیا گیا جو ایک اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا تھا۔
کہ جب یہ تبادلہ ہوا اور میں آپ کی خدمت میں آگیا ہوں کسی تبادلے سے انکار نہیں کیا مگر اب
کو جو تبادلہ ہوا ہے اس سے مجھ کو بچا لیجیے۔ افسر نے پوچھا کہ جب تم اب تک کسی تبادلے سے نہیں گھبرائے تو اب کیوں اس قدر پریشان
ہو۔ چپڑاسی نے کہا کہ وہ بیچارہ مریض افسر ان سے نہ اس نے کہا کہ حضور اب کی بار لیڈی ڈاکٹر بنا کر ایک نامی ہسپتال
میں بھیجا جا رہا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد ہمیں مختلف ماہر بھی اسی طرح کے ملے ہیں یہ کہ آج تک جاری ہے کہ شوگر کے صاحب ہجرت
کر کے یہاں آ گئے اور ہر چند کہ وہ صاحب ماہر زردوزی تھے مگر بجائے اس کے کہ وہ پیشہ اس فن کو یہاں فروغ دیتے ان کو
ایک دکان پر آسانی سے قبضہ مل گیا تو بیٹھ گئے وہ افروش بن کر کوئی کمیشن صاحب بعد میں پہنچے اور انہوں نے دیکھا کہ
ایک ریستوران خالی پڑا ہے لہٰذا بجائے دوا فروشی کے چائے فروشی شروع کر دی۔ کوئی صاحب نہایت ماہر حجام تھے مگر کوئی
ہیئر کٹنگ سیلون تو جلدی میں ان کو مل نہ سکا البتہ ایک دندان ساز کی دکان خالی تھی لہٰذا اسی کو اپنا لیا کسی کی دکان کا جو
کر آیا تھا اور یہاں پرنٹنگ پریس کا مالک بن بیٹھا کوئی نانبائی کا وعدہ کرتا تھا مگر یہاں کتابوں کی دکان سے بیٹھا۔ ظاہر ہے کہ
اس طرح ان لوگوں نے دو فنوں کو بیک وقت نقصان پہنچایا ایک فن وہ جس کو وہ جانتے تھے اور جس کے ماہر تھے اس کو چھوڑ کر
اور دوسرا وہ فن جس کو وہ نہیں جانتے مگر اختیار کر لیے اب آپ ہی بتائیے کہ ایک حجام سے جو کوئی بھی اپنے دانت نکلوانے جائے گا
وہ اپنے مسوڑھوں کی حجامت نہ کرائے گا تو کیا کرے گا۔ یا اگر کوئی شخص کسی دندان ساز سے حجامت کرانے بیٹھ جائے گا۔ تو اس کے
بال تو بہر سے نہ نوچے جائیں گے۔ تو کس چیز سے نوچے جائیں گے۔

افرادی قوت کے کمیشن نے اپنی رپورٹ تو پیش کر دی ہے مگر معلوم نہیں اس رپورٹ میں اس گوشہ پر بھی روشنی ڈالی
ہے یا نہیں کہ اپنے سے غیر متعلق پیشہ اپنائے ہوئے کتنے لوگ ہمارے ملک میں کام کر رہے ہیں حالانکہ یہ بات اتنی ہی خطرناک ہے کہ
کوئی وکیل ڈاکٹری شروع کر کے قبرستان بسا تا اور کوئی ڈاکٹر وکالت شروع کر کے جیلیں بھرنا شروع کر دے اگر کوئی تجہیز و تکفین کا
دھندا کرنے والا کسی ریستوران کو چلانے بیٹھ جائے تو اس ریستوران میں جانے والوں سے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے
کہ۔ ع

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

مختصر یہ کہ سرکاری محکموں میں اس کی جانچ پڑتال بے حد ضروری ہے کہ کس کام پر کون لگا ہوا ہے اور جو کام جس آدمی
کے سپرد ہے وہ اس کا ماہر بھی ہے یا ہم یوں ہی بے نتائج کے امیدوار بنے بیٹھے ہیں اگر انتظامیہ کی تنظیم نو کے سلسلہ میں یہ مہم بھی شروع کی گئی تو یہ بڑا

کام ہوگا خدا کرے ملک امیر محمد خان کی یہ کوشش کامیاب ہو جائے اس لیے کہ جب تک ہر ہر شعبہ ہر کام کے [illegible] [illegible] بہتر نتائج کی امید کیونکر کی جا سکتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ۔ ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ہمارے یہاں اہلِ صلاحیت کی کمی نہیں ہے مگر گڑبڑ تو یہی ہے کہ صحیح کام پر غلط آدمی اور غلط کام پر صحیح آدمی اگر [illegible] تو کام کیونکر بنے۔

(۱۰)

خدا خدا کرکے ہم کو اب اس بات کا خیال پیدا ہوا ہے کہ ہمارے اُردو دشمن جو انگریزی زبان انگریز دُلا گئے ہیں یہ کچھ چھری کانٹے سے کھچڑی کھانے والی بات ہے اور اس سے صرف یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز تو چلا گیا مگر انگریزی کو ہم سے چپکا گیا ہے کہ یہ سوتیلی زبان ہمارے لیے خدا جانے کیوں مادری زبان بنی ہوئی ہے کہ ضرورت اور بے ضرورت ہمارے بے شمار افراد انگریزی جھاڑتے نظر آتے ہیں وہ نہ صرف انگریزی جاننے والوں سے انگریزی بولتے ہیں بلکہ جو انگریزی نہیں جانتے ان سے بھی انگریزی ہی بولنا چاہتے ہیں اور بدرجۂ مجبوری اگر ان سے اُردو بولنا پڑتی ہے تو اس تکلف سے چبا چبا کر اُردو بولتے ہیں گویا لوہے کے چنے چبا رہے ہوں اور سخت تکلیف میں مبتلا ہوں۔ بلکہ ہمارے یہاں ایک طبقہ وہ بھی ہے جو عام طور پر انگریزی نہ جاننے والوں ہی سے انگریزی بولتا ہے اور اگر کوئی انگریزی جاننے والا ان پر نازل ہو جائے تو ان کی انگریزی فوراً ختم ہو جاتی ہے اور بھلے مانسوں کی طرح جھٹ اُردو بولنا شروع کر دیتے ہیں۔

اصولاً اب انگریزی زبان کا صرف یہ مصرف ہونا چاہیے کہ اگر کسی بیرونی ملک کے کسی مہمان سے تبادلۂ خیال کرنا ہو جو اُردو نہ جانتا ہو اور جس کی زبان آپ نہ جانتے ہوں تو اس قسم کے موقعوں پر آپ اس سے انگریزی بول لیجیے اس لیے کہ اگر ایک جاپانی کی زبان آپ نہیں سمجھ سکتے اور اپنی زبان اس کو نہیں سمجھا سکتے تو اس مشکل کا حل انگریزی زبان ہی ہو سکتی ہے لہٰذا ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے انگریزی پڑھنا ضروری ہے مگر ہم ایسے انگریزی پڑھنے کے قائل نہیں ہو سکتے کہ کوا ہنس کی چال چل کر اپنی چال ہی بھول جائے یعنی انگریزی پڑھتا جائے اور اُردو بھولتا جائے اور جب پڑھ لکھ کر کالج سے گھر آئے تو اپنی بوڑھی ماں سے بھی انگریزی بولے اور نوکروں پر بھی انگریزی ہی جھاڑے اور جب کسی کے پلے کچھ نہ پڑے تو بھولی بسری اُردو اس طرح ٹٹولنا شروع کرے کہ:۔

"او آئی سی۔ آپ نہیں سمجھا۔ ہم آلو نہیں۔ وہ مانگتا ہے اس کو آپ
کیا بولتا ہے وہ جو مرغی کا بابا بننے سے پہلے کی چیز ہوتا ہے"

اور اگر ماں نے یہ پہیلی بوجھ کر کہہ دیا کہ:۔

"اے بیٹا تم انڈا تو نہیں کہہ رہے ہو"

تو وہ ایک دم اچھل پڑتے ہیں "یہ ہیر لو آر۔ انڈا۔ بالکل انڈا ٹھیک ہے اس کو انڈا بولتے ہیں۔ ہم اتنی دیر سے انڈا ہی مانگ

ہے۔

یہ تو انگریزی کے نفسیات ہی ہیں جب یہ رہ گیا کہ ہمیں اب بعض اوقات اسکولوں اور کالجوں میں بھی [illegible]
نہیں سمجھا جاتا کہ [illegible] نسل کو اردو بنانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اگر خدا نخواستہ اردو کا سیدھا سادہ جملہ بھی [illegible]
جاتا ہے کہ یہ تو بڑی بات ہے پڑھا لکھا شخص ہے ہم تو ان لوگوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو محض اس انگریزی کے بعض
رٹے ہوئے جملے جہاں کہیں بھی مل جائیں انگریزی جملہ [illegible] کرتے ہیں اور اردو میں گفتگو کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ
کیا اگر کسی نے اردو بولتے سن لیا تو خدا جانے لوگ اپنے بارے کیا قائم کریں گے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض حالات میں انگریزی بولنا
بھی ضرورت ہو سکتی ہے۔ مثلاً کوئی ایسی بات کرنا ہے جو شریف آدمی کسی کے سامنے کرنا چاہیے تو وہ بات اچھا ہے
اردو میں نہ کی جائے یعنی یا تو وہ بات ہی نہ کی جائے اور اگر کسی طرح ہضم نہ ہو رہی ہو تو انگریزی میں کہہ دی جائے بشرطیکہ
وہاں بیٹھا ہوا کوئی انگریزی نہ جانتا ہو۔ یا اگر کسی پر غصہ آگیا ہے اور پھر یہ ہے کہ وہ غصہ انگریزی ہی میں کیا جائے
اس لیے کہ انگریزی زبان کی گالیاں اتنی زیادہ ہضم ہونے کے باوجود بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں لیکن اگر یہ صاحب ان گالیوں کا
ترجمہ اتنا اچھا اردو کی گالیوں میں [illegible] ہو سکتا ہے اور ہمارا یہ جواب ہے کہ [illegible] کی کوشش کرنا ہے سو تو
[illegible] ہو جائے گا کہ گالی دینے کے لیے انگریزی زبان اتنی خطرناک نہیں ہے جتنی کہ گالی کی اردو ہے۔ لہٰذا بہتر
یہ ہے کہ غصہ آتے ہی انگریزی شروع کر دی جائے تاکہ حرمت اردو کا سوال ذرا کم ہی پیدا ہو۔ اور گر پڑے جو ہو تو ایک
غیر زبان میں پیدا ہو۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے راولپنڈی میں بھی بعض ممتاز شخصیتوں نے محسوس کیا ہے کہ انگریزی زبان کی بیساکھی کوئی
ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو دیکھے بغیر انگریزی چھوڑ رہا ہے یہ لوگ انگریزی کی بے ضرورت گٹ پٹ سے عاجز آچکے ہیں اور
اردو بولنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ ان میں شہر کے بعض سربر آوردہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے طے کیا ہے کہ
حتی الامکان اردو بولنے کی کوشش کریں گے۔ کس قدر حیرت انگیز بات ہے یہ بھی اردو بولنے کی گویا کوشش کرنا پڑے گی۔
اور اردو ماحول پیدا کرنے کی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ اردو ماحول سے مراد یہ ہے کہ وہ کوشش کریں گے کہ جہاں دکانداروں نے
کاہکوں کو انگریز سمجھ چھوڑا ہے اور اپنا سائن بورڈ اردو میں لکھوائیں۔ دکانداروں کی کیفیت تو یہ ہے کہ جس گھر کو دیکھئے
نام کی تختی انگریزی میں لکھی ہوئی آویزاں ہے خواہ گھر والا گھر کے اندر بیٹھا انگلی سے کھیر چاٹ رہا ہو اور گھر کی چار پائی پر بیٹھا
حقہ پی رہا ہو مگر دروازے پر انگریزی میں لکھا سائن بورڈ اس طرح آویزاں ہے کہ گویا یہ گھر نہیں انگلستان ہے اور اس میں
صرف ان ہی لوگوں کو آنے کی اجازت ہے جو انگریزی میں ان کا نام پڑھ سکیں۔

دکانوں کے سائن بورڈ مشرف بہ اردو کرنے کی نہایت منظم تحریک لاہور میں شروع کی گئی ہے اور اب راولپنڈی والے
بھی دکانداروں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ اس اردو ملک میں انگریزی کے سائن بورڈ آخر کیوں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ جن کی وجہ سے
بے شمار لوگوں کو جو انگریزی نہیں جانتے دکاندار سے پہلا سوال یہی کرنا پڑتا ہے کہ آپ آخر بیچتے کیا ہیں۔ اور یہ کس چیز کی دکان ہے
مثلاً ایک خاصی لڈو پیڑے امرتی اور بالو شاہی کی دکان ہے جس کا کوئی تعلق ہم کیبٹ۔ ٹرفی یا کسی اور انگریزی مٹھائی سے نہیں

مگر سائن بورڈ انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ واقع ہوئے ہیں آپ خوارہ اور شوار پہننے والے۔ زنانہ مگر سائن بورڈ انگریزی [illegible] معلوم یہ ہو کہ صرف اسکرٹ اور بلیبس وغیرہ پہنتے ہیں مکان سے اردو کتابوں کی اور سائن بورڈ انگریزی کا ہے [illegible] جس کا انگریزوں سے وعدہ کا بھی تعلق نہیں مگر سائن بورڈ انگریزی کا لگ رہا ہے۔ ہر کی ہے خالص دیسی کھانا [illegible] کھائیں تو ہوٹل سے نکل کر سپتال میں داخل ہو جائیں مگر سائن بورڈ انگریزی کا ہے۔ یہ انگریزی کو ہضم نہیں ترا [illegible] علاج آخر کب تک نہ لیا جائے گا۔

(۱۱)

عورتوں کو گھر والی کہنے والے مرد جب طبقہ نسواں میں یہ بیداری دیکھتے ہیں کہ ؎

قومی ترقیوں کی زمانہ میں دھوم ہے

مردانے سے زیادہ زنانہ میں دھوم ہے

تو بجائے اس کے کہ وہ اس کو عورتوں کا قومی فرض سمجھیں طرح طرح کے اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہاں عورتوں نے چولہا ہانڈی چھوڑ کر لیڈری شروع کر رکھی ہے اور بجائے شوہر کی اطاعت کے ملک و قوم کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ان مردوں کا خیال یہ ہے کہ عورتیں صرف اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ بچوں کے ساتھ ساتھ شوہر کو بھی پالتی رہیں اور تیمارداری کے انداز سے اپنے کو اس کی خدمت کے لیے وقف رکھیں وہ جب سیر و تفریح سے تھک کر آدھی رات کو گھر آئے تو ٹھنڈا کھانا اس کے لیے گرم کریں اور جب وہ کھانا کھا کر لیٹے تو اس کے سر میں تیل ڈالیں اور وہ باتیں کہ میاں تاش کھیل کر آئے ہیں اور اس کھیل میں اپنا دماغ تھکا چکے ہیں جس کو آرام پہنچانے کی ضرورت ہے اور جب میاں خدا خدا کر کے سو جائیں تو وہ بھی اس نیت کے ساتھ ذرا سی جھپکی لے لے کہ صبح میاں سے پہلے بیدار ہو کر بیٹھی ان کو آنکھ کھولتے ہی سلگتا ہوا حقہ بھی مل جائے اور اس کے فوراً بعد چائے بھی بغیر مانگے مل جائے اور اس کے بعد ہی جب میاں ضروریات سے فارغ ہونے میں مصروف ہو جائے تو وہ اس کے لیے ناشتہ تیار کرنے کو باہر پان بنانے، دفتر جانے کے لیے کپڑے ٹھیک کرنے وغیرہ میں مصروف ہو جائے اور جب وہ خیر سے دفتر سدھاریں تو وہ باورچی خانہ کی ہو کر رہ جائے کہ دفتر کھانا بھیجنا ہے۔ اور دفتر کھانا بھیج کر وہ پھر میاں کی واپسی کے انتظامات میں مصروف ہو جائے کہ ان کا اپنا کمرہ صاف ملنا چاہیے وقت پر سہ پہر کا ناشتہ ملنا چاہیے، حقہ تیار ملنا چاہیے گلوریاں ملنا چاہئیں اور اگر وہ اپنی میں چند دوستوں کو ساتھ لے آئیں تو ان کی مدارت کا بھی بندوبست ہونا چاہیے پھر میاں کی واپسی کے بعد منٹ منٹ پر باہر پان بھیجنا ہیں۔ بار بار چائے پہنچانا ہے کبھی خشک میوہ مانگا جا رہا ہے تو کبھی تر حلوہ اور سالن بھی ساتھ رات کے کھانے کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال گویا ان سب کے علاوہ ہے۔

اس قسم کی خدمت گزار بیویوں کے بے بہا شوہر قوم کے افراد بھلا یہ کیونکر برداشت کر سکتے ہیں کہ وہ قومی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیں اس لیے ظاہر ہے کہ اگر وہ قومی کارکن بن گئیں تو ان شوہروں کا اس زنانہ نعم سے کٹ جائے گا پھر تو یہی ہو گا کہ دفتر سے آ کر پوچھا کہ وہ کہاں گئیں تو معلوم ہوا کہ فلاں گرلس کالج میں آج ان کو تقریر کرنا تھی وہاں گئی ہوئی ہیں اور کہہ گئی ہیں کہ بے بی کو ٹھیک چیچک کا ٹیکہ لگوا دیجیے گا، فلاں جلسہ تقسیم انعامات میں ان کو انعام تقسیم کرنا تھے لہٰذا کہہ گئی ہیں کہ ننھے میاں کے بال بہت بڑھ گئے ہیں

[illegible] اکثر [illegible] کوئی نہیں [illegible] جب [illegible]
[illegible] ہوں [illegible]
[illegible] ہیں [illegible]
[illegible] کی جاسکتی ہے [illegible] تو ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اس قسم کی آزادی کا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] بیگم صاحبہ کے پاس
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] نہیں ہیں۔

اس قسم کے شوہر پرست بیویوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں زیادہ تعداد میں نہیں ہیں۔ زیادہ تر تو ان شوہروں کی [illegible]۔ زندگی
اس بیداری پر بیگمات [illegible] جو بیداری کی اس لہر کو خواتین کے [illegible]
شوہروں کا بیشتر خواتین ہیں اس [illegible] عمل قطعاً [illegible] ہے اور اس قسم کے [illegible] نہیں لیکن۔
یہ وہ لوگ ہیں جن کو مخاطب کرتے ہوئے بیگم لیاقت علی خاں نے نیویارک میں [illegible] جنگ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا
کہ ان ناقدوں کی یہ باتیں سن سن کر تنگ آچکی ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ اپوا بیگموں کا ایک ادارہ ہے جو [illegible] میں شریک ہوتی ہیں اور
جو صرف سماجی تتلیاں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اپوا پر یہ نکتہ چینی کرنے والوں نے عوام کی [illegible] خدمات
انجام دی ہیں۔ اس کے بعد بیگم لیاقت علی خاں نے بڑی تفصیل سے اپوا کی ان خدمات کا تفصیلی تذکرہ کیا جو یہ خواتین کا ادارہ [illegible]
کی حالت سدھارنے کے لیے انجام دے رہا ہے۔

بیگم صاحبہ لیاقت علی خاں کو اپوا کے ان نکتہ چینیوں سے بددل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر قوم میں اس قسم کے لوگ ہوتے
ہیں جو اپنے اقتدار کو متزلزل دیکھ کر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ان کو اس قسم کی باتیں بنانے کا بہانہ اس لیے مل جاتا ہے کہ
اپوا میں سب ہی ملک و قوم کا درد رکھنے والی اور تعمیری انہماک سے خلوص رکھنے والی خواتین شامل نہیں ہیں۔ بلکہ اس قسم کی
بیگمات بھی ہیں جو سمدھنوں کے سے ٹھسوں کے ساتھ اور ہجوم ریشم و کمخواب بن کر ان قومی جلسوں میں جاتی ہیں اور ان جلسوں کو نمائش گاہ
بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ شروع شروع میں تو واقعی ان کی بڑی تعداد اپوا میں نظر آتی تھی مگر رفتہ رفتہ انجمن خواتین پاکستان میں ایسی خواتین
کی اکثریت ہو گئی جو محض اپنے کو دکھانا نہیں بلکہ کچھ کام کر دکھانا چاہتی ہیں۔ اور جن کو نام سے زیادہ کام سے غرض ہے۔ مثلاً

پہنے تک ہی محدود ہوتا ہے اور پنجاب کے دیہاتوں میں خصوصاً ان کے پاس جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا سوائے ناانصافی کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ادھر یہ کار کی خواتین اپنے گھر اور اپنے بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتیں۔ اور ان تمام سرگرمیوں میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اور دونوں کا انسانی ربط قائم کر لیتا ہے کہ اب صرف وہی مرد شاکی نظر آتے ہیں جو عورتوں کو قوم کا نصف حصہ نہیں بلکہ خدمت گزار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور شوہرانہ اقتدار کے ایسے مریض ہیں کہ بیوی کو صرف اپنا ہی تابعدار بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

(۱۲)

ہمارے شاعروں کا معیارِ حسن بھی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے اگر محبوب کا قدِ بالا ان کے نزدیک حسن کا معیار ہے تو پستہ قد کو اصولاً اس معیار سے گرا ہوا ہونا چاہیئے۔ مگر اہلِ حسن شناسوں کو یہ بھی پسند آجاتا ہے اور وہ بھی محبوب اگر طویل القامت ہے تو اس کو بڑے پیار سے سرو قد کہہ کر اس کی تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں۔ اگر محبوب ٹھگنا ہے تو اس کے قد کو چھوٹا سا قد کہہ کر زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی کس بات کا اعتبار کیا جائے۔ اور حسن کا معیار قدِ بالا کو سمجھا جائے یا بقول ان کے بوٹے سے قد کو۔ حالانکہ اگر سچ پوچھئے تو ان دونوں قدوں کے درمیان ایک اور قد بھی ہوتا ہے جس کو "قدِ موزوں" کہتے ہیں کہ نہ بہت ہی اونچا نظر آئے محبوب نہ نہایت ہی پدی مگر ان شاعروں نے اس قدِ موزوں کی بہت ہی کم تعریف کی ہے البتہ اگر محبوب نازک اندام ہے تو وہ اس کے متعلق نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں کہ یہ تو وہ سوا نیزہ ہے جس پر رخِ روشن کی حقیقت آفتاب قیامت کی ہے۔ یہ تو وہ سرو قامت ہے جس نے قسامِ ازل سے انگڑائی کے بہانے ہاتھ بڑھا کر سارا حسن اپنے ہی لیے لے لیا تھا ؎

حسن قسامِ ازل بانٹ رہا تھا جس روز
لے لیا ہاتھ بڑھا کر تری انگڑائی نے

حالانکہ ان بلند قامت حسینوں کا دیدار ان کے پرستار اسی طرح کرتے ہیں جس طرح ہم آپ گھنٹہ گھر بیں وقت دیکھتے ہیں کہ آنکھیں تو جلوہ یار دیکھ رہی ہیں مگر ٹوپی سر سے گرے بغیر نہ رہ سکے ظریف لکھنوی نے اپنے رنگ میں اسی قدِ بالا کے متعلق کہا ہے کہ ؎

اور تو کیا میں کہوں اس قدِ بالا کی قسم
اونٹ کی شکل دکھا دی تری انگڑائی نے

اور اس طرح سرو قدی کا لطف تو اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب ان کا شیدائی پستہ قد واقع ہوا ہو۔ ان دونوں طالب و مطلوب کو دیکھ کر کچھ ڈھنگ سے کی ایسی کیفیت نظر آتی ہے کہ مثنوی زہرِ عشق کی قسم کی مثنوی "شتر گربہ" لکھنے کو جی چاہنے لگتا ہے مگر اب کیا کیا جائے کہ دلِ ناداں اکثر اسی قسم کی حبت لگا جاتا ہے اور اہلِ دل اپنا دل اسی قسم کی بلندی پر اچھال دیتے ہیں۔ کہ گویا دل کو اسپوٹنک میں رکھ کر چاند کی طرف روانہ کیا ہے۔

مگر اس قدِ بالا کا ایک نمونہ نیو یارک کی ایک خبر کے مطابق لوسانا میں پیش کیا گیا ہے۔ جن صاحبزادی کا یہ قد ہے ان کا اسمِ شریف ڈولرلیس ہے۔ نسلاً یہ کافر ماجرا حبشن ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ سرو قدی میں ان کا کوئی جواب اب تک تو پیدا

نہیں۔ اتنے لمبے کی خیر خدا جانے۔ اس بیت آ جزوں کی عرف "الف" والی عمر یا جائی ہے جو ابھی صرف چودہ سال ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی اس کا قد بڑھنا ختم نہیں ہوا ہے ابھی اس کا قد اور بھی بڑھ سکتا ہے گویا اس چودہ سال کی عمر میں بھی اس طول طویل وجود کا قد خدا معلوم کہاں تک جائے گا۔ اس وقت وہ بے چاری بھی ہلکی ہے کہ یہ جوان اور بڑھے گا۔ ابھی تو بچپن ہے اور ان کے قد سے اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ جب یہ چار سال کی بچی تھی اس وقت بھی دس برس کی لڑکی کا قد رکھتی تھی۔ سات سال کی عمر میں قد جوان لڑکی کا تھا۔ اللہ جانے ابھی ان کا سلسلہ کہاں تک طول کھینچے گا۔ اللہ جانے وہ صاحب جو ان کی قسمت میں لکھے ہیں وہ کیسے کی مٹی پلید ہوگی۔ یا ان بیوی کی ہستی سے قطب مینار دب جاتا ہے۔ بہرصورت یہ لڑکی ابھی اگر ایک قسم کی ڈبل ڈیکر بس نظر آنے لگی ہے تو چھجے پر بیٹھ کر تو گلا پھاڑ کر غیبت ہوگی۔ ان سے گفتگو کرنے کے لیے تو کسی جگہ پر کھڑے ہو کر جانا پڑے گا اور سرگوشی کے لیے تو ان کا قد کانوں کے قریب جا سکے۔

محبوب کے قد بالا کی تعریف کرتے وقت یہ شعرا تو اس کو قابل کرتے ہیں کہ اس کا قد سرو ہے، سرو قد ہو جائے گا۔ ان شعرا کو اس قد بالا کو دیکھ کر اس کی سیڑھیاں لگا لگا کر زیارت اور اونٹ پر سوار ہو کر حاصل کرنی پڑے شرف پہاڑی یا ہوائی جہاز پر تو ادراک حاصل کر وہاں کی رسائی اس زمانے میں بھی لوگ قد بالا کی تعریف کریں اور ان کی شان میں طول طویل رکھتے طول طویل قصیدے کہیں۔ اگر یہ حسین ان شعرا کے بیچ میں آ جائے تو منظر یہی ہو جیسے کوئی دیو لاٹ یا ستونوں کے جنگل کی سیر کو نکلی ہو اور پھر جب وہ ایک ایک شعر کو اٹھا اٹھا کر اپنی جیب میں رکھنا شروع کرے تو ان کی سرو قدی کی ساری حقیقت دھری رہ جائے گی۔ مگر صاحب لعنت اللہ چودہ برس کی عمر دیکھئے اور اس قد کا "خوف" سے نکلا ہوا اور دیکھئے جسم کہ یہ قد ابھی بڑھ رہا ہے۔ اللہ جانے کس حد پر پہنچ کر اس کا عالم کیا ہوگا۔ اور وہ کون شامت زدہ انسان ہوگا جو ان کو اپنی زوجیت میں لے کر اونٹ کے منہ میں زیرہ بنے گا۔ اور چلتے پھرتے بالاخانے کو اپنی زوجیت میں لے کر کمال دکھائے گا۔

دیکھنے کو تو ہم نے بھی بڑے بڑے قد آور انسان دیکھے ہیں بلکہ بعض لوگ تو ایسے ہی نظر آتے ہیں جن کو دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اصولاً ان کے سر پر برف جمی ہوئی ہونا چاہیے۔ مگر اس قسم کا قد مردوں کے لیے تو پھر بھی گوارا ہو جاتا ہے مگر خدا نہ کرے کہ کوئی خاتون اس قد و قامت کی واقع ہوں۔ کہ اچھا خاصا شوہر ان کو ملا کر برابر کا چھوکرا محسوس ہو اور جب منظر عام پر آئیں۔ دیکھنے والے بھی عجیب الخلقی اور اس کا پیچھا کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً رسالہ کی یہ طویل القامت لڑکی تو خاتون بنتے بنتے اچھی خاصی جنتِ قطب مینار ہی کر رہ جائے گی۔ اور اس کو اپنی بلندی سے ہم ساکنانِ خطۂ خاک خدا جانے نظر بھی آئیں گے یا نہیں۔ کہیں ان صاحب کا واقعہ صادق نہ آ جائے جو سیب خریدنے بازار پہنچے تھے اور پھل فروش سے سیب کا بھاؤ دریافت کرکے کہہ اٹھے تھے کہ اتنے اتنے سے سیب اور ان کے اتنے دام مگر سیب والا بھی حاضر جواب تھا کہنے لگا حضور ذرا بیٹھ کر دیکھیں اس بلندی سے تو یہ واقعی اتنے اتنے سے نظر آ رہے ہوں گے۔

شعرائے کرام خواہ برا مانیں مگر سچی بات تو یہ ہے کہ نہ معلوم کتنے برس سے کسی کلام کی چیز بنے نہ حسن ذہن محدود قابلِ ستائش ہے آخر یہ لوگ آدمیوں کی سی بات کیوں نہیں کرتے۔ کہ محبوب کا قد بس واجبی سا ہونا چاہیے۔ نہ اتنا لمبا کہ عاشق ناشاد حسرتِ دیدار کے معاملہ میں بس ناشاد ہی رہ جائے۔ نہ اتنا پستہ کہ اس کو طاق پر بٹھا کر دیکھا جا سکے۔ یہ باتیں شعر و شاعری

ابھرم کھونے والے ہیں اور صرف ایک قدم پر کیا منحصر ہے یہ شاعر آنکھ پر تل کرنے پر آئیں گے تو اس کو غائب ہی کر دیں گے۔ نزاکت کا ذکر کریں گے تو اس کی حد یہ کر دیں گے کہ ۔۔۔

بُرا ہو نزاکت کا سو کر جب اٹھے
تو بستر پہ انگڑائیاں چھوڑ آئے

معلوم نہیں یہ لوگ اعتدال میں کیوں نہیں آتے۔ اگر ان کو سراپنے کے لیے قضا و قدر کوئی ایسا ہی پیکر بنا کر بھیجے جیسا وہ اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ تو بخدا یہ شاعر صاحب چھوڑ چھاڑ کر بھاگتے نظر آئیں۔ اور چیخ نکل جائے ڈر کے مارے کہ بالوں کی جگہ سانپ جھول رہے ہیں ابرو کی جگہ خنجر لٹکے ہوئے ہیں، آنکھوں کی جگہ ترکش ہے جس سے تیر نکل رہے ہیں۔ مگر وہ کمر جو بجائے صراحی دار ہونے کے ویران ہے مگر غائب ہے۔ اور اپنے جسم کے دو علیحدہ علیحدہ ٹکڑے لیے محبوب چلا آ رہا ہے جو ہوش گم ہو جائیں بھاگیں سر پہ پیر رکھ کر یا گر پڑیں غش کھا کر مع تخلص کے۔

(۱۳)

راولپنڈی میں گرمی اور مری میں رونق بے حد بڑھ گئی ہے اور راولپنڈی کی گرمی سے بوکھلائے ہوئے لوگوں کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آتا تو وہ بھاگتے ہیں سر پر پیر رکھ کر مری کی طرف نتیجہ یہ کہ راولپنڈی کی ساری رونقیں مری منتقل ہو گئی ہیں اور مری کی آبادی یکایک اتنی بڑھ گئی ہے کہ مری کے سب ڈویژنل کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ مری سب ڈویژن کے اسٹیشن ایریا کے اندر اب کسی قسم کے جانور لانے یا ان کو چرنے کے لیے چھوڑ دینے کی قطعاً اجازت نہیں ہے ان جانوروں میں گائیں، بھینسیں، بکریاں، گدھے اور گھوڑے وغیرہ شامل ہیں۔ البتہ جو گھوڑے اور گدھے سواری کے لیے مری میں رکھے گئے ہیں۔ ان پر یہ پابندی نہ ہوگی۔ وہ انسان جو جانوروں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں وہ تو خود ہی مری جانے کی ہمت نہیں کر سکتے خواہ گرمی سے مر ہی کیوں نہ جائیں البتہ بھینس کی جسامت کی خواتین و حضرات اور بکریوں کی قسم کی چاند شرٹ پہننے والیوں پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے اور ان کو اس کی بھی اجازت ہے کہ وہ مال روڈ پر کلب اور پیسٹریاں وغیرہ نہایت آزادی سے چرتی پھریں۔ وہ گدھے بھی وہاں جا سکتے ہیں جو شوہر واقع ہوئے ہیں اور خواہ کتنے ہی زیر بار کیوں نہ ہو جائیں مگر سکہ بیگم ہرگز مفاجات کے قائل ہیں اور عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اس موسم میں بیگم کے دماغ پر گرمی نہ چڑھنے دیں بلکہ بیگم کے ساتھ پہاڑ پر چڑھ جائیں اور خود اپنے اوپر قرض چڑھا لیں۔

واضح رہے کہ جانوروں میں کتا شامل نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ بہت سے لوگ اپنے لیے یا اپنے بال بچوں کے لیے سرد مقامات پر جانا اتنا ضروری نہیں سمجھتے جتنا اپنے کتے کے لیے پہاڑ پر جانا ضروری سمجھتے ہیں اس لیے کہ ان کا عزیز از جان کتا گرمی کی شدت برداشت نہیں کر سکتا اور ہو سکتا ہے کہ اس کی جان پر بن آئے۔ اس قسم کے کتوں کو جانور کیا ہی آدمی کہہ سکتا ہے جس کو کتے نے کاٹا ہو ورنہ ان کی زندگی پر تو بے شمار انسانوں کو رشک آتا ہے کہ وہ ریشم و کمخواب کے ملبوس پہنتے ہیں معطر آغوشوں میں بیٹھتے ہیں۔ بہترین قسم کے ... اور اعلیٰ درجہ کا گوشت کھاتے ہیں اور پھر مری کی مال روڈ پر ہوا خوری کو نکلتے ہیں۔ ان میں سے خدا جانے کتنے کتے ایسے ہوتے ہیں جو مالک کے ساتھ آئے ہوئے ہوتے ہیں اور کتنے مالک ایسے ہوتے ہیں

ذہن کے ساتھ تشنہ ہونے لگتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں اگلے کو بادل نخواستہ پابندی لگانی پڑتی ہے تو ہمارا زندہ رہنا بھلے تنہا ہماری کمر پہ اتفاق ہے کہ آج دیر ہے۔

ویسے کل ملا کر آج بھی ویسے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا کمرہ اچھا خاصا ہوتا ہے۔ در پر بادل رہتا ہے اور موسم بدلنے کی کیفیت یہ ہوتی ہے جو سلسلہ جاری ہے بالکل اس بدلی آسمان کے لیے آتی ہے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر عالم کی وسعت کا سامان تو آپ اڑا دیں کبھی کبھی کاٹ دیں۔

تیری گلی کے موسم پہ

شوہر بیوی کے تعلق میں کبھی ادھر سے ادھر جاتے ہیں کبھی وہ ادھر سے ادھر آتے ہیں۔ یہ بات سب سے ہر ایک شوہر اور ایک سے بچا سو ہر تجربہ ہوتا ہے اور ہم نے کچھ شادی شدہ جوڑے دیکھے ہیں جو کئی برس مختلف شہروں میں رہتے ہیں۔ وہ بات شوہر بیوی کو چلا سکنا ہوا نظر آتا ہے یا بیوی ہی شوہر کو بدل دینے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے۔ کچھ پیچیدہ رشتے شادی کا فیصلہ کرتے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان کی نگاہیں اس ازدحام حسن و جمال میں کسی قابل خوبصورتی کی جستجو میں نظر آتی ہے اور وہ کسی کو پانے کے لیے اپنے گھر کو یا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ کسی کا ساتھ تو مطلب ہے شوہر کو کسی کے ساتھ تو جانا چاہیے مثلاً گرما میں بچے تو دونوں ہی کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ اور بہت سے ایسے خوش نصیب بھی ہوتے ہیں کہ ان کو پیار کرنا فضول ہی جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ خود حضرت کو نظر انداز کریں۔

اس احتجاج میں ایسے سعادت مند شوہروں کی بیویاں بھی ہوتی ہیں جو خود کسی ملازمت یا کاروبار کی وجہ سے گرمیاں بسر کرنے یہاں نہیں آ سکتے البتہ بیوی کو ٹھنڈی ہوا کھانے کے لیے پہاڑ پر بھیج دیتے ہیں اور خود بھاڑ جھونکتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی تو شرافت بلکہ سعادت ہے مگر حیرت ہے ان بیویوں پر جو اپنے کو ٹھنڈی سہاگن بنائے خود تو موسم کی دلفریبی کے مزے اڑاتی ہیں اور شوہر کو اس قابل سمجھتی ہیں کہ وہ دوست ہوتا رہے اور میدانی گرمی میں جھلستا رہے۔ شوہر کو جہنم واصل کر کے خود جنتی موسم میں اللہ جانے ان وفا کی پتلیوں سے رہا کیسے جاتا ہے۔ مگر شوہر بھی ایسے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر آپ ان سے قیامت خیز میدانی گرمی کا ذکر کریں تو وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہیں گے کہ جی ہاں گرمی تو بے شک ہے مگر یہ کیا کم ہے کہ بیوی نہیں ہے چنانچہ محسوس یہ ہو رہا ہے جیسے انگریز چلا گیا ہو اور آزادی مل گئی ہو۔ اپنی زندگی اب واقعی اپنی محسوس ہو رہی ہے۔

ہم چمن میں چاہے جہاں رہیں ہمارا حق ہے فصل بہار پر

مری لاکھ سرد اور پُر فضا مقام سہی راولپنڈی جہنم سہی اور مری اس کے مقابلہ میں جنت سہی مگر یہ بڑی وحشت ناک بات ہے کہ وہاں جس کو دیکھئے وہ نکما ہی نظر آتا ہے کسی کو کسی قسم کا کوئی کام نہیں ہوتا جس کو دیکھئے منہ اٹھائے سڑک ناپتا پھر رہا ہے اور وقت کاٹنے کے بہانے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ یہی مال روڈ پر ٹہلنا شروع کیا تو ٹہلتا ہی چلا جاتا ہے گویا زندگی کا مقصد ہی صرف یہ ہے کہ بس مال روڈ کے چکر کاٹتے رہو۔ تاش کھیلنے بیٹھے تو معلوم ہوتا ہے کہ بس تاش ہی کھیلنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ کسی ریستوران میں بیٹھ گئے ہیں تو بس بیٹھے ہوئے ہیں اور اس انداز سے بیٹھے ہیں کہ —

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں ریستوران میں ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

بہانہ یہ ہے کہ صحت بنا رہے ہیں خواہ علاوہ ازیں کتنی ہی کیوں نہ بگڑ جائیں اور سوال یہ ہے کہ صحت ایسی کونسی خراب ہے جو آپ بنا رہے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ یہ قبری دوری ہے کچھ اور نہیں جا سکتے تو صحت ہی بنا لیں مطلب یہ ہے کہ یہ بیکاری سخت پریشان کر دینے کی چیز ہے بلکہ اس تصور سے جنت تک سے جی گھبرانے لگتا ہے کہ سنا ہے کہ وہاں کوئی کام ہی نہ ہوگا۔
مری میں مستقل طور پر رہنے کی نہ تو فرصت ہے نہ توفیق البتہ ایک آدھ ہفتہ اُدھر بتانا بھی ہو جاتا ہے مگر یہ ہفتہ تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں جا کر جتنی راحت نہیں ملتی اس سے کہیں زیادہ واپسی میں تکلیف ہوتی ہے کہ جیسے جنت نصیب ہو جانے کے بعد پھر جہنم میں جھونک دیئے گئے ہوں، مری کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھانے کے بعد جب لُوؤں کے تھپیڑے کھانا پڑتے ہیں تو طبیعت صاف ہو جاتی ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ مردانہ وار اسی موسم کا مقابلہ کریں اور اس عارضی جنت کے لیے اپنے مستقل جہنم کو شدید سے شدید تر نہ بنائیں ؛

رعنا

(غیر مطبوعہ ناول کے دو باب)

کچھ روز وکیل صاحب کے ہاں جانا ترک رہا، اس سے شیخ صاحب ناراض تھے کہ ان کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ چاہتے کہ وہ اپنی جگہ پر قطعی فیصلہ کر چکے ہیں کہ لڑکی کے لیے اب لڑکا وہ اپنی مرضی سے ڈھونڈنا چاہتے اور وکیل صاحب کی طرف سے ہونے والی گفتگو کا مناسب جواب یہ دیا جائے کہ اب اگر وہ ناک سے ناک رگڑیں تب بھی نہیں ان کے یہاں شادی ہونے۔ بیگم صاحبہ البتہ یہ چاہتی تھیں کہ لڑکی کا نکاح بہت کسی طرح گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں شیخ صاحب کے ہاں مستقل طور پر خانہ جنگی جاری تھی۔ بیگم صاحبہ کا قول یہ تھا کہ ڈھنگ کے لڑکے اس زمانے میں مشکل ہی سے ملتے ہیں اور شیخ صاحب دعویٰ کر چکے تھے کہ میں ایک سے ایک ڈھنگ کا لڑکا مہیا کر کے دکھا سکتا ہوں۔ بیگم صاحبہ کو چونکہ شیخ صاحب کے متعلق یہ معلوم تھا کہ یہ حضرت اعلیٰ درجے کے ضدی واقع ہوئے ہیں لہٰذا وہ ان کا چیلنج قبول کر چکی تھیں اور شیخ صاحب اس مہم کو سر کرنے پر کمر باندھ چکے تھے کہ وہ اپنی نظرِ انتخاب کی سبیل بہتر ثابت کر دیں۔ چنانچہ وہ واقعی اسی تگ و دو میں ہمہ تن مصروف ہو چکے تھے اور اپنی بیماری کو ایک طرف رکھ کر جو بار بار اس کام میں ایسی منہمک دکھائی دیتے تھے کہ بیگم صاحبہ بھی حیران تھیں کہ یہ چستی اور مستعدی ان بڑے میاں میں یک دم کیسے پیدا ہو گئی ہے۔ شیخ صاحب اس جستجو میں جس رفتار سے ناکام ہو رہے تھے اسی رفتار سے ان کا جوش بڑھتا جاتا تھا مگر جوش کے ساتھ ہی ساتھ مزاج کا چڑچڑاپن بھی ترقی کر رہا تھا چنانچہ آج جو دنیا زمانے کی خاک چھان کر تشریف لائے تو ان کے تیور دیکھ کر اندازہ لگائے بغیر بیگم صاحبہ پوچھ بیٹھیں،

"کچھ پتہ چلا اکرم کے متعلق؟"

شیخ صاحب نے شیروانی ایک طرف اور ٹوپی دوسری طرف اچھالتے ہوئے کہا "گولی مارو، آیا بڑا اس نالائق [illegible] کو"

بیگم صاحبہ نے بڑے اطمینان سے کہا: "جلا بھنی بیٹھی ہوں [illegible] کچھ معلوم تو ہو کہ کس سلسلہ میں گولی ماری گئی ہے"

شیخ صاحب نے کہا "اس کا باپ اعلیٰ درجہ کا لفنگا ہے جس گرمجوشی سے نسبت طے کرتا تھا اسی سرد مہری سے میرے ساتھ پیش آیا کہ صاحب اب تو جب تک اکرم میاں چار پیسے کمانے کے لائق نہ ہو جائیں میں تو ان کی شادی کر نہیں سکتا"

بیگم صاحبہ نے کہا: "یہ بات نسبت دینے سے پہلے ان کو نہ سوجھی تھی؟"

شیخ صاحب نے کہا: "گولی مارو اس مردود کو، پہلے کے حالات اس کے کچھ اور تھے اب تو حالت بہت پتلی ہے اتنی کہ بس اب خشک تنخواہ رہ گئی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح پوری پڑے گی اوپر کی ساری آمدنی ایک دم سے ختم ہو گئی ہے۔ سختی کم نظر آ رہی تھی اُس کی۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "اوپر کی آمدنی؟ تو کیا وہ کمبخت مارا رشوت لیتا تھا؟"

شیخ صاحب نے کہا: "رشوت ہی کو بیچارے اوپر کی اور بالائی آمدنی وغیرہ کہتے ہیں۔ میں خود حیران تھا کہ دوا کی نوکری بڑی ہے نہیں جتنے ٹھاٹ ہیں مگر اب تو آثار یہی ہیں کہ سارا ٹھاٹ باٹ اٹھانا پڑے گا۔ تعجب نہیں کہ تبدیلی آب و ہوا کے لیے جیل بھی جانا پڑے ممدوح کو۔ آج بڑی پراگندہ نظر آ رہی تھیں اور بھائی مری ہوئی مونچھیں اور وہ اینٹھی ہوئی گردن بھی آج سیدھی دکھائی دے رہی تھی۔ کہنے لگے کہ دعا کیجیے کہ یہ وقت عزت آبرو کے ساتھ ٹل جائے۔ سنا آپ نے یعنی حرام خوری آپ کریں اور دعا کریں ہم ان کی رسّی کی درازی کے لیے۔ مختصر یہ کہ میں نے تو گولی مار دی۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہ قصہ کیا ہے کہ جو ملتا ہے ٹھک کرا ایسا ہی ملتا ہے۔ بڑے دھوم سے لائے تھے اس سوداگر کے لڑکے کی نسبت کیا نام ہے اس کا ——"

شیخ صاحب نے کہا: "جی ہاں بڑا ملک التجار بنا پھرتا تھا۔ چور کہیں کا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہم کو بچا لیا۔ کچھ دنوں بعد اگر وہ حضرت چور بازاری کے سلسلے میں دھرے جاتے تو کیا ہوتا۔ صورت سے نہایت شریف بلکہ نہایت بھلا مانس۔ اچھی خاصی دواؤں کی دکان کا مالک مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ دواؤں کی چور بازاری کرتا ہے ورنہ میں پہلے ہی گولی مار دیتا۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "دیکھو میں پھر کہتی ہوں کہ مسلمان ہیں کوئی بات نہیں ہے سمجھا بوجھا لڑکا ہے۔ ہم کو اس کے باپ سے کیا مطلب خود لڑکا تو اپنی ذات سے برا نہیں ہے۔"

شیخ صاحب نے بگڑ کر کہا: "پھر تم نے اس کا نام لیا۔ جب میں اس کو گولی مار چکا ہوں تو تم بار بار اس کا نام کیوں لیتی ہو؟"

بیگم صاحبہ نے کہا: "تمہارے گولی مارنے میں یہی تو خوبی ہے کہ گولی مارنے سے قصہ ختم نہیں ہوتا کسی کا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو کہ آخر خود اس لڑکے میں کیا عیب ہے؟"

شیخ صاحب نے نہایت جوش میں آ کر کہا: "سو عیبوں کا ایک عیب یہی کیا کم ہے کہ وہ ایک ایسے باپ کا بیٹا ہے۔ تم خود سن چکی ہو کہ اس کے ٹھگ باپ نے ملک و قوم کو کس کس طرح سے ٹھگا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "وہ تو جو کچھ کیا ہے اس کے باپ نے کیا ہے۔"

شیخ صاحب اُبل پڑے: "غلط۔ سراسر غلط۔ باپ کو تو خیر گولی مارو مگر صاحبزادے بھی تو آخر اسی طرح کی کمائی میں ہمیشہ مصروف رہے ہیں۔ یہ کام جو وہ کر رہے ہیں کیا تم اس کو ڈکیتی سے کچھ کم سمجھتی ہو؟ چاہے کاغذ پہ مجھ سے لکھوا لو

[illegible] صاحب کے ساتھ [illegible] طلبہ اقبال بھی کرفت میں آ گئے بعد [illegible] ہی گئے تھا [illegible] کر رہے ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "چھا تو اس میں تمہارا [illegible] نظر [illegible] ہے [illegible] تم کو لیب [illegible] رہا ہے۔"

شیخ صاحب نے بلبلا کر کہا: "[illegible]"

بیگم صاحبہ نے احتجاج کیا: "[illegible] جلانے مجھے بھی [illegible] چلے ہیں۔"

شیخ صاحب نے [illegible] کہ جب آپ بیٹے سا اللہ گرفتار ہو جائیں گے [illegible] کر [illegible] سے [illegible] سے [illegible] کر سکتا۔"

بیگم صاحبہ [illegible] صاحب کی بہن [illegible] صاحب [illegible] مذہب کوئی [illegible] کی طرح [illegible] سلمان [illegible] نے [illegible] ہو گئے [illegible] رہے ہیں [illegible] ہو ہی نہیں سکتی اس لیے کہ [illegible] سلیں گے [illegible] رقیب نکلنے [illegible] گھوم پھر کر [illegible] کی طرف آ کر [illegible] بھی [illegible] ملا سے [illegible] تھا [illegible] نسبتوں کا [illegible] کو خوف تھا [illegible] شیخ صاحب [illegible] حسن سے وہ خائف نہیں کہ کہیں شیخ صاحب [illegible] کے لیے [illegible] ہو جائیں [illegible] نہیں [illegible] بڑی چوٹی کا [illegible] تھیں کہ [illegible] جائیں وہ [illegible] کہ خود احسن ہی کے [illegible] رہے تھے کہ شیخ صاحب اس کا نام [illegible] کر ہمیشہ [illegible] مانتے رہتے [illegible] کو منظور نہ کر سکے مگر جب سے احسن کی والدہ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ وکیل صاحب نے [illegible] غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دی ہے ان کی توجہ بہت بڑھ گئی تھی یا تو یہ حال تھا کہ بھائی کی صورت تک دیکھنے کی [illegible] شادی میں شرکت ہی سے انکار کر چکی تھیں یا اب ایک دم سے بھائی کی محبت ایسی عود کر آئی تھی کہ ہر دوسرے تیسرے دن دھری ہوتی ہیں اور میاں احسن کی آمد و رفت بھی ان دنوں خلاف معمول بہت بڑھی ہوئی تھی حالانکہ اس گھر میں ان سے کوئی سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا تھا مگر ممدوح عجیب مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ رعنا کا ہر [illegible] کو گوارا [illegible] شیخ صاحب اپنے مصنوعی دانت باہر نکال نکال ان کو دیکھتے ہی پیسنا شروع کر دیتے تھے بیگم صاحبہ ان کے سامنے قطعاً [illegible] نہ تھیں مگر آپ تھے کہ نہایت پابندی سے حاضری بھی دیتے رہتے تھے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر کسی نہ کسی خدمت کا موقع بھی حاصل کرتے رہتے تھے کچھ نہیں تو رعنا کے کتے کے لیے راتب ہی لیے چلے آ رہے ہیں اس لیے کہ گھر بھر میں وہی ایک

تھا جو ان کو دیکھ کر دوہرا ہلا ہلا کرتا تھا۔ رعنا کے چھوٹے بھائی اسلم ہی کو پڑھنے کے بہانے سے جب میکے موجود ہیں سلمان سے بیگم صاحبہ کو سخت وحشت ہو رہی تھی دیکھیں ان کی رعنا زمندیاں شیخ صاحب کو دے رہی ہیں۔

رعنا کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی وہ بظاہر جس قدر شوخ اور شریر تھی اس سے کہیں زیادہ گہری بھی تھی، بیگم صاحبہ تو اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ جانتی تھیں کہ اس کو سلمان سے ایک قلبی لگاؤ ضرور ہے اور سلمان کی وہ طرفدار بھی محض اسی وجہ سے ہیں مگر اس قلبی لگاؤ کی اصل حقیقت سے اگر کوئی واقف تھا تو وہ رعنا کی واحد سہیلی ندرت تھی کہ باوجود اس قلبی لگاؤ کے آج دونوں کے درمیان کس قدر وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔ وہ اب رعنا کا یہ حال ہے کہ وہ سلمان سے اپنے اس قلبی لگاؤ کو بھلا کر اور بے تعلقی سے برداشت کر سکتی ہے اپنے دل کو مار سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک مجرمانہ نسبت کے احساس سے اپنی وابستگی کو قائم رکھے۔ البتہ اس کو بھی اگر حیرت تھی تو صرف یہ کہ سلمان کی طرف سے اتنا بڑا دھچکہ پہنچنے کے بعد بھی جو اثر اس پر ہونا چاہئے تھا وہ کیوں نہیں ہے وہ بدستور اپنی شگفتگی کو کیونکر قائم کئے ہوئے ہے اور اس کے ہر انداز سے یہ کیوں ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے اس نے کچھ کھویا ہی نہیں ہے شروع شروع میں تو اس کو یہ شبہ رہا کہ رعنا دراصل شگفتہ نہیں ہے بلکہ شگفتگی کی اداکاری کر رہی ہے مگر رفتہ رفتہ اس کو اندازہ ہو گیا کہ یہ بناوٹی شگفتگی نہیں بلکہ سلمان کی اس نقاب کشائی کی اس کو واقعی کوئی پروا نہیں ہے اور اس یقین کے بعد آخر اس نے ایک دن یہ ذکر چھیڑ ہی دیا۔

"رعنا ایک بات پوچھوں مگر پہلے مجھ کو یہ یقین دلا دو کہ تم مجھ سے اس سچائی کو چھپانے کی کوشش کر کے میرا دل نہ توڑو گی۔"

رعنا نے غور سے ندرت کو دیکھتے ہوئے کہا "یہ بات تم مجھ سے کہہ رہی ہو یا پرویز بھائی سے باتیں کرنے کا گویا ریہرسل کرنا چاہتی ہو۔"

ندرت نے پرویز کے نام پر شرمائے بغیر نہایت سنجیدگی سے کہا "دیکھو رعنا میں اس وقت بے حد سنجیدہ ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ تم بھی سنجیدہ ہو جاؤ۔"

رعنا نے اپنا دوپٹہ درست کر کے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا "لو ہو گئی سنجیدہ۔ مگر یہ تم پر سنجیدگی کا دورہ کیوں پڑا ہے اس وقت۔ خیریت تو ہے۔"

ندرت نے کہا "میری خیریت کو تو جانے دو مگر مجھ کو تمہاری خیریت نظر نہیں آتی اگر تم نے اپنا یہ انداز تبدیل نہ کیا اور میری بات کو اسی طرح مذاق میں ٹالتی رہیں۔ یا صاف صاف یہی کہہ دو کہ مجھ کو تمہارے ہر راز سے آگاہ ہونے کا کوئی حق نہیں ہے اور بعض راز ایسے بھی ہیں جو مجھ سے بھی چھپائے جا سکتے ہیں۔"

اب رعنا نے بھی سنجیدگی سے کہا "دماغ ٹھکانے ہے یا نہیں۔ میں نے کونسی بات تم سے کب چھپائی ہے؟"

ندرت نے کہا: "پچھلے [illegible] سے مجھے شبہ ہو رہا ہے اور مجھے اب یقین ہے کہ سلمان بھائی سے [illegible] ہونے کا تم پر کوئی اثر نہیں ہے۔"

رعنا نے سوال کیا: "تو کیا تم یہ سمجھ رہی ہو میں خود اپنے سے [illegible] منافقت کر رہی ہوں؟"

ندرت نے کہا: "تمہارا رویہ [illegible] منافقت کر رہی ہو۔"

رعنا نے کہا: "خوب [illegible] ندرت [illegible] منافقت کر سکتی ہوں۔ یہ خیال [illegible]"

ندرت نے کہا: "جی [illegible] میرے ذہن میں [illegible] خیال [illegible] حد تک وابستہ نہیں۔"

رعنا نے کہا: "غلط ہے میں واقعی اس سلسلہ میں اس حد تک [illegible] کر جذبات کی رو میں بہہ جانے والی ہے۔ [illegible] ایسی بات نہیں [illegible] ہو سکتی ہیں کہ وہ منجدھار سے صحیح سلامت نکل آئے [illegible] میں بے حد خوش ہوں۔ مجھ [illegible] یا اور میں اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھ کر بے حد خوش ہوں۔"

ندرت نے کہا: "تو کیا یہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ تم نے کچھ کھو دیا ہے؟"

رعنا نے کہا: "برعکس اس کے مجھ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ کھو چکی تھی وہ اب میں نے پا لیا ہے [illegible] باتیں کر رہی ہو ندرت کیا خود تم یہ گوارا کر سکتی ہو کہ خدانخواستہ [illegible] پڑ جائے تمہاری محبت نامکمل رہ [illegible] شروع کر دیں۔"

ندرت نے تعجب سے کہا: "محبت کس طرح نامکمل ہو سکتی ہے؟"

رعنا نے کہا: "ہو سکتی ہے۔ بلکہ ہوتی ہے۔ نہ جانے کتنے دنوں تک خود میری محبت نامکمل ہوتی رہی ہے کاش تم اس باریک بات کو سمجھ سکو کہ محبت اس ایمانداری کا نام ہے جو کسی ایسے دل میں نہیں ہو سکتی جس میں بے ایمانی بھی رچ بس رہی ہو۔ ایک جرائم پیشہ آدمی اور خواہ کچھ کر سکتا ہو مگر محبت ہرگز نہیں کر سکتا۔ محبت کے ساتھ بے ایمانی ضرور کر سکتا ہے جو میرے ساتھ کی گئی۔"

ندرت نے کہا: "مگر اس کا افسوس تو ہونا ہے کہ جس کو تم اپنی محبت کا مرکز بنائے ہوئے تھے وہ سراسر دھوکا نکلا۔"

رعنا نے کہا: "مگر مجھ پر تو اس کے برعکس یہ اثر ہوا ہے کہ گویا میں کسی نہایت مہلک مرض سے یکایک صحت یاب ہو گئی ہوں اور میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے وقت سے پہلے ہی مجھ کو ایک ایسے خطرے سے بچا لیا جو میرے لئے واقعی جان لیوا ثابت ہوتا۔ سلمان تو اس لیے ناقابلِ علاج ہیں کہ وہ اپنے مرض کو مرض ہی نہیں سمجھتے۔"

ندرت نے کہا: "محبت تو اندھی مشہور ہے مگر تمہاری محبت تو بڑی دور بین نکلی۔"

رعنا نے مسکرا کر کہا: "جی ہاں اندھوں کی محبت اندھی ہی ہوتی ہوگی مگر میں تو اپنی عقل ہوتے آنکھوں سے دغابازی کر محبت دیکھ نہیں سکتی مجھ کو یقین ہے کہ سلمان مجھ کو دھوکہ دیتے رہے ہیں اور اس یقین کے بعد ان کو کھونے کا غم ہونے کے

بجائے میں تو حسن کو [illegible] پاک کیا کرتی ہوں۔"

قدرت نے کہا: "مگر اب کیا ہوگا؟"

رعنا نے کہا: "نیلام ہوگا اور کیا ہونا۔ ہم لوگوں میں لڑکیوں کا نیلام ہی تو ہوتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کو جُوا کہہ لو۔ مگر میرے دل کو یہ اطمینان ہے کہ جس خدا نے مجھ کو اس گرداب سے بچایا ہے جو سلمان نے میرے لیے کیا تھا وہ بیڑہ ڈوبے گا نہیں پار ہی لگائے گا۔"

قدرت نے کہا: "سنا ہے کہ آجکل تمہاری پھوپھی جان اپنے نور نظر میاں حسن سلمہٗ کے لیے پھر مرید ہو گئے ہیں۔"

رعنا نے قہقہہ لگا کر کہا: "یہ ہم تو اس قدر عجیب ہے کہ سچ پوچھو تو میرے بے دل کے بہلانے کا اس سے بہتر انتظام اور کوئی ہو ہی نہ سکتا تھا۔ کاش میں تم کو یہ تماشے دکھا سکتی۔ وہ عزیزی قمر میاں احسن سلمہٗ تو تم آجکل دیکھ سکتیں کہ وہ کس حد تک حکم کے غلام بنے ہوئے ہیں۔"

قدرت نے ہنس کر کہا: "اچھا اب گویا ترقی کر کے حکم کے غلام بن گئے ہیں۔ پیٹ کے غلام تو وہ ہمیشہ ہی سے تھے کہ عقل پر پتھر برسا کرتے تھے۔"

رعنا نے کہا: "خیر وہ پتھر تو آپ کی دعا سے اب بھی برس رہے ہیں مگر اب دیکھو گی تو مشکل ہی سے آنکھ ٹھہر سکے گی۔ مزاج یار کی طرح اس قدر جلد جلد سوٹ کو بدلتے رہتے ہیں کہ گرگٹ بھی کیا رنگ بدلے گا۔ صبح سوٹ میں ہیں تو دوپہر کو شیروانی میں اور شام کو شکاری لباس میں ہیں تو رات کو ڈریس سوٹ تک میں جلوہ دکھاتے ہیں۔"

قدرت نے ہنس کر کہا: "سچ مچ ڈریس سوٹ میں تو اچھے خاصے بینڈ ماسٹر نظر آتے ہوں گے۔"

رعنا نے کہا: "اس سے ان کو کوئی بحث نہیں کہ وہ کیا نظر آتے ہیں وہ تو صرف اس جستجو میں ہیں کہ میرے نقطۂ نظر سے ان کو کیا نظر آنا چاہیے۔"

قدرت نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "بھئی یہ تو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ اس نے تم کو ایک ایسا کھلونا عطا کر دیا ہے مگر تم اس سے پوری دلچسپی شاید ہی لیتی ہو۔"

رعنا نے تردید کرتے ہوئے کہا: "جی نہیں میں ایسی بدمذاق نہیں ہوں کہ ایسی خداداد دلچسپی کی بھی ناقدری کروں۔ اچھا تم یہ کرو کہ کل آجاؤ نا یہ تماشہ دیکھنے کے لیے۔"

قدرت نے کہا: "لو بھلا اب بھی نہ آؤں گی۔ میں تو صبح سے شام تک کے لیے آؤں گی۔"

یہ پروگرام طے ہو جانے کے بعد رعنا قدرت سے رخصت ہو گئی۔

دُردانہ

ایک جدید مثنوی سے ریڈیائی اوپیرا

ترتیب شوکت تھانوی
عشرت رحمانی

یہ اوپیرا آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے لیے ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔ حضرت جگر مراد آبادی سے ایک مثنوی لکھوائی گئی، جس کی اساس پر شوکت تھانوی، جو۔ اور عشرت رحمانی نے ریڈیائی اوپیرا مرتب کیا۔ گیت اور غزلیں عشرت رحمانی نے لکھیں۔ حضرت جگر کے بعض اشعار اس میں استعمال ہوئے ہیں۔ باقی تحریر شوکت تھانوی اور عشرت رحمانی کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے ——— اور سید انصار ناصری حال ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان نے ہدایت کاری کے فرائض انجام دینے تھے جہاں آرا کجن مرحومہ مشہور فلم و اسٹیج اداکارہ اور گلوکار طلعت محمود نے ہیروئن اور ہیرو کے کردار انجام دیئے تھے۔ (مدیر)

(نغمہ)

ایک مترنم آواز:
بزم فطرت عجب فسانہ ہے — حسن و الفت کا کارخانہ ہے
شمع غم خانۂ حیات ہے عشق — زندگی کی اجالی رات ہے عشق
ایسے ہی عشق کا اِک افسانہ — سنیئے اب سرگذشتِ دُردانہ

(موسیقی)

راوی: ———
قصۂ دل پذیر، روپ نگر — عشق کی سیرگاہ کا تھا وہ گھر
اُمرا جس میں شان کے مالک — غربا آن بان کے مالک
ان میں سب سے زیادہ باوقعت — ایک نواب تھے فلک رفعت
تھے کنیز و غلام و دولت و زر — گوہرِ بے بہا حسین دختر

خوش رہو شاد کام نیک نہاد ‏ ‏ باپ ماں کے دلوں کی بند مراد
نام زردار چہرہ مہ طلعت ‏ ‏ تو ہے سب جہاں خوش قسمت
سولھویں تھی جو نیک فال گرہ
ہوا تجویز جشن سال گرہ

(شہنائی کی آواز)

(باجوں اور مجمع کا شور)

نیت : مبارک ہو یہ رنگ و بو کی کہانی
بہاروں پہ آئی کلی کی جوانی ‏ ‏ مبارک ہو یہ دورۂ شادمانی
مبارک ہو یہ رنگ و بو کی کہانی
یہ نغمہ یہ عشرت یہ رنگیں نظارے ‏ ‏ بہر سو نگاہیں بہ ہر سو بہارے
سنانے چلے ہیں گل سولھویں کی کہانی
ہیں ناہید و زہرہ بھی رقصاں خوشی سے ‏ ‏ ستارے نہ کیوں جھوم اٹھیں بے خودی سے
یہ ہے بربط ماہ کی نغمہ خوانی
مبارک ہو یہ رنگ و بو کی کہانی

راوی : بزم عیش و نشاط برپا ہے ‏ ‏ رقص ہے زمزمے ہے نغمہ ہے
جشن گہ ہے کہ آنکھ کی پتلی ‏ ‏ سمٹ آئی ہے جس میں کل بستی
آمد آمد ہے مہمانوں کی ‏ ‏ دھوم ہر سمت شادیانوں کی
شادماں آج ہیں فلک رفعت ‏ ‏ کرتے ہیں ہر ایک کی آؤ بھگت

(دور سے آوازیں قریب آتی ہیں)

آواز ۱ : آداب عرض!
آواز ۲ : تسلیمات عرض!
آواز ۳ : تشریف لائیے قبلہ۔
آواز ۱ : آداب۔ آداب
آواز ۲ : ادھر تشریف رکھیئے
فلک رفعت :— غریب خانہ میں بھائی قمر کو دیکھتے ہیں
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

آواز ملے: کیا خوب نواب صاحب۔ واہ واہ۔

آواز ملے: واہ کیا خوب فرمایا ہے۔

آواز ملے: گویا [illegible]

فلک رفعت: قدر دانی [illegible] حضرات تشریف [illegible] ارشاد فرمائیے۔

نشتر: ؎ [illegible]

[illegible] ؎ [illegible]

[illegible] نواب: ؎ [illegible]

خسرو: ؎ [illegible]

فلک رفعت: ؎ [illegible]

آواز ملے: آپ بھی تشریف لائیے۔

آواز ملے: [illegible]

ارجمند: حاضر، حاضر [illegible]۔

فلک رفعت: ؎ [illegible]   [illegible]

ارجمند: [illegible] حاضر ہوا۔

فلک رفعت: ؎ اے جنوں خاصہ [illegible] لائے کوئی   [illegible] لائے کوئی

آواز: حاضر سرکار، حاضر۔

ارجمند: ؎ جنوں کی لاجواب [illegible] ہے   [illegible] جس سے حیرت ہے

فلک رفعت: ؎ ہے تمہارے ہی دم سے [illegible]   ارے جنوں [illegible] کیوں [illegible]

آواز: بہت خوب سرکار۔

(گانا)

——— (جشن) ———

کورس: یہ نغمہ پُر کیف یہ رنگین نظارے   دھرتی پہ اتر آئے ہیں آکاش کے تارے
اور ہیں مہر و انجم ہیں محبت سے اشارے
رنگین نظارے ہیں یہ رنگین نظارے
مستی کا چھلکتا ہوا پیمانہ جہاں ہے   یا نور محبت کا پری خانہ جہاں ہے
کیفیتوں میں غرق ہیں آکاش پہ تارے
رنگین نظارے ہیں یہ رنگین نظارے

ہیں بادۂ عشرت سے یہ بہکی ہوئی راہیں   مسرور جوانی کی یہ شوخی بھری بانہیں
نغموں کی جوانی کہیں بانسے میں پکارے
رنگین نظارے ہیں یہ رنگین نظارے
منظر: زنانخانہ

راوی:
تھی محل میں بھی گرم اک محفل   پردہ پردہ میں دیکھنے قابل
عورتوں کا بپا تھا ہنگامہ   دھوم تھی پھر رہی تھی ہر ماما
آ رہی تھیں سواریاں پیہم   کر رہی تھیں پیشوائی خود بیگم

(ڈومنیوں کا گانا)

شادیاں رے آج ہے جھاجھم
لاری مالن سہرا بنی کا!
اس سہرے پہ تارے ہوں جھم جھم

بنّا باوا کو خوشیاں مبارک
خوشیاں رہیں یہ جم جم
شادیاں رے آج ہے جھاجھم

(موسیقی)

راوی:
تھا محل میں جو آئینہ خانہ   اس میں تھی محو حسن دُردانہ
ملنے وہ سوز ساز کی تصویر   حسن کا خواب عشق کی تعبیر
آرزوئے طرب کا پیمانہ   زندگی کا حسین افسانہ
بال اپنے بناتی جاتی تھی   زیر لب گنگناتی جاتی تھی

دُردانہ: (گاتی ہے) بے زبانی اگر زباں ہو جائے   داستانِ دل کی جاوداں ہو جائے
ہے محبت سکوت میں سب کچھ   کچھ نہیں ہے اگر بیاں ہو جائے

(ستارہ کا آنا)

ستارہ: (کھلکھلا کر) یہ رہیں دُردانہ آخر پا لیا
دُردانہ: نا بہن نا مت کرو یوں گدگدی
ستارہ: دیکھ تیری گت بناتی ہوں ابھی

پروانہ: ابھی ستارہ بھی کہاں ہے [illegible]
ستارہ: ڈھونڈ لی پھرتی ہے [illegible]
[illegible]: ابھی کہاں تھی [illegible]
ستارہ: [illegible] اُدھر [illegible]
[illegible]: کیا خبر [illegible]
ستارہ: تمہاری [illegible] آتی ہوں — [illegible] آتی ہوں
ارجمند [illegible] — [illegible]

[illegible]: بس ستارہ [illegible]
ستارہ: [illegible]
پروانہ: [illegible]
ستارہ: [illegible] — [illegible]
ارجمند [illegible] آپ کا [illegible] — [illegible]
قدردانہ: مجھ کو [illegible] ہے چھوڑ کر — [illegible]
ہیں وہ دولت مند، وہ دولت پسند — [illegible] ارجمند
ارجمند اکبر ہی دولت کے سر — [illegible] خوبی ہے کیا

ستارہ: اے [illegible] ذکر چھوڑو بھی — اس طرح سے [illegible]
پھر [illegible] میں آؤ — ذرا محفل سے دل [illegible]
ہنسو بولو ہے نیک فال گرہ — آج خوشبو بھری ہے سالگرہ

قدردانہ: سب ہیں سامان کہ جس سے ال مانوس — پھر بھی ہوتی ہے اک کمی محسوس
ستارہ: کیا ہوا خیر ہے، کمی کیسی؟
قدردانہ: سنو! آئے نہیں ہیں ناصر آج؟
ستارہ: پر نہ آنے کا کچھ سبب بھی کھلا؟
قدردانہ: بے بلائے وہ کیسے آتے بھلا؟
سمجھے شرکت ہیں اپنی وہ تحقیر — ہوئی خودداری ان کی دامنگیر

ستارہ: ہاں جی وہ بھی تھے کبھی خوشحال
دُردانہ: مجھ سے پوشیدہ کب ہے یہ احوال
جب سے پردہ میں بٹھائی گئی   خاص کر اُن سے جب چھپائی گئی
اور بزرگوں کے دیکھے بدلے طور   اُن کا انداز ہو گیا کچھ اور
ستارہ: بچپنے کی منگی ہوئی تھیں تم   اُن کے دل میں بسی ہوئی تھیں تم
اُن پہ افلاس کا جو آیا دور   بدلے ماں باپ کے تمہارے طور
دُردانہ: ہے عجب اس زمانہ کا معیار   وہی سب کچھ ہے بس جو ہے زردار

(آہٹ)

ستارہ: کون؟ گلشن ہیں!
دُردانہ: (سنبھل کر) آؤ آؤ بوا!
گلشن: بہو جم جم نصیب ہو اچھا۔
دُردانہ: ادھر بیٹھو برسوں میں دکھلائی صورت
گلشن: مرے چاند کو سولہویں ہو مبارک
میں خود دیکھنے کے لیے تھی پریشاں   کیا آج ناصر میاں نے یہ ساماں
انہیں نے یہ خط دے کے بھیجا ہے مجھ کو   کہا ہے کہ جلدی جواب اس کا لاؤ
ستارہ: پڑھو خط کو دُردانہ کیا مدعا ہے   نہ آنے کا شاید سبب کچھ لکھا ہے

—: خط :—

مردانہ آواز: میری بیداریوں کے خواب سلام   ذرہ کہتا ہے آفتاب سلام
ہو مبارک تمہیں یہ سولھواں سال   مہ کامل بنا ہے آج ہلال
گو بظاہر میں باریاب نہیں   کیا تصور بھی کامیاب نہیں
وہی معصوم چاندنی راتیں   بھولی بھولی سی سب وہی باتیں
تم تصور میں گنگناتی ہو   گو بظاہر چھپائی جاتی ہو
ہے یہ پردہ فقط مرا افلاس   ہے خطا یہ نہیں ہے دولت پاس
وہی محفل میں آج ہیں مہماں   خاندانی تھے جو کہ دشمنِ جاں
خیر اس ذکر ہی کو رہنے دو   تہنیت جشن کی قبول کرو
ٹوٹے دل کی دعائیں بھی لے لو   آرزوؤں کے پھول بن کے رہو
تا ابد یہ بہار دیکھو تم   ایسی خوشیاں ہزار دیکھو تم

ستارہ : آئینے کی صورت [illegible] میں ہوتی — وہ تو [illegible] ہیں — [illegible]

گلشن : [illegible] آئی ہوں اب مجھ کو اجازت دو۔

ستارہ : [illegible] ہیں پوچھو تم مجھ سے [illegible] دو

[illegible] : [illegible] کیا کہوں کچھ [illegible]

ستارہ : ہاں میری سمجھ میں بھی [illegible]

[illegible] : [illegible] تو [illegible] ہے —

بے زباں اگر زباں ہوتے [illegible] دل کی جو [illegible] ہوتے

ستارہ : [illegible] بے [illegible] — [illegible] نہیں دے دینا۔

[illegible] ہے!

گلشن : [illegible] خوش رہو [illegible]

ستارہ : [illegible] دل [illegible] ہوتے

(موسیقی)

دونوں :

[illegible] جو بچھڑے تھے اِدھر — حال [illegible] کا بُرا
[illegible] ستارہ نے [illegible] کیا — [illegible]
[illegible] — حال ناسور تھا [illegible] حال
[illegible] قدرت کے [illegible] — [illegible] دونوں [illegible]
ہو گئی رنجگی سے نسبت — [illegible] کی جست
[illegible] مصیبت میں جو سہارا تھی — دونوں کے حق میں [illegible]
تھی اک دوست تھی بھی دمساز — تھی مونس بھی [illegible] ہمراز
دونوں کے درد سے تھی وہ آگاہ — سوچ کر اس نے اک نکالی راہ

ستارہ :

لاؤں تدبیر پہ بڑے کار — کر لیں یہ دونوں آخری دیدار
ورد اک [illegible] کا کرشن لیں — ورنہ پھر بعد میں ملیں نہ ملیں

راوی :

کی ستارہ نے یہ مسیحائی — اُجڑے گلشن میں پھر بہار آئی
اُس کی تدبیر سے کھلا یہ گل — باغ میں مل گئے گل و بلبل!
معرکہ تھا عجیب اک درپیش — ہوش میں تھے کہاں محبت کیش

اس طرف شرم اور ادائے ناز — اس طرف بے قرارئ ذوقِ نیاز
آنکھیں پرنم گنگ تھی زباں — دونوں جانب دبے دبے طوفاں
بے زبانی زباں تھی گویا! — خامشی داستاں تھی گویا!
ناصر اک دلفگار پروانہ — شمع بے قرار و دیوانہ!
تمتمائے ہوئے سے وہ رخسار — جیسے خوش رنگ میں شفق کی بہار
تھی مجسم وہ کھوئی کھوئی سی — جاگی جاگی سی سوئی سوئی سی
غم سے دُردانہ بے قرار ہوئی — بس اُمنڈ آیا اشکبار ہوئی

(سسکیاں)

ناصر : دُردانہ ——— دُردانہ
خدا کے واسطے دُردانہ اشکبار نہ ہو!

دُردانہ : خزاں نصیب ہوں کیونکر مجھے بہار نہ ہو!

ناصر : نگارِ خوبی و رعنائی بہار ہو تم — کسی کی قسمتِ بیدار کا سنگار ہو تم

دُردانہ : نہ ایسی باتیں سنا کے دل دکھاؤ تم — میں خود ہوں سوختہ ساماں اب نہ جلاؤ تم

ناصر : یہ دل جلانے کی باتیں ہیں کیسی دُردانہ! — عجب نہیں ہے کہ بھر جائے دل کا آج پیمانہ

دُردانہ : کہاں گیا وہ مسرت کا دور یاد کرو — وہ اپنا صحنِ چمن اور وہ چاندنی راتیں

ناصر : ورق الٹ بھی دو بھولے ہوئے فسانے کے — انہیں نہ یاد کرو خواب کی سی ہیں باتیں

دُردانہ : ملے تھے آج مقدر سے اب ملیں نہ ملیں — خدا ہی جانے کہ اس عمر میں جئیں نہ جئیں

ناصر : یہ بدشگونی ہے ایسی نہ اس طرح ہو اداس — تمہاری یاس بڑھاتی ہے مرے دل کا ہراس

دُردانہ : بس اب تو موت ہی ناصر ہے میری چارہ ساز

(قدموں کی چاپ)

ناصر : ادھر ہی آتا ہے شاید کوئی سنو آواز

ستارہ : شش شش تمہارے گھر سے بلانے کو آگئی ماما

دُردانہ : میں جا رہی ہوں بپا ہو نہ کوئی ہنگامہ!

(جاتی ہے)

ناصر : دُردانہ ——— دُردانہ

راوی : یوں اچانک وہ ہوگئی رخصت — ٹوٹی ناصر کے دل پہ اک آفت

درد پہلو میں یہیں چمک اٹھا — شعلۂ زندگی بھڑک اٹھا
دل میں بارہا ضبط ہی نہ رہا — ہوش و تمکیں سے ربط ہی نہ رہا
اس کو رہ رہ کے تھی یہی وحشت

ناصر : کر رہے ہیں یہ کیا ملک رفعت
ہر چند ایک رند مشرب ہے — اس کو رنگینیوں سے مطلب ہے
ہر گھڑی ہے فصلِ نشہ سرشاری — ہے یہی اس کا شغل بیکاری
اس کو دردانہ سے ہے کیا نسبت — اس کی کچھ اور اس کی کچھ فطرت

ناصر : کہیں شادی کا ہو نہ یہ انجام — کر دے اس کی محبت کو بدنام
کہہ رہے خود ہیں ہوں حاضر خدمت — دیکھوں سنتے ہیں کیا ملک رفعت
کیا عجب ہے جو کچھ سمجھ جائیں — عقل کو اب بھی کام میں لائیں

نواب : آپ اور میرے ہاں آئیں خدا کی قدرت — آج کیوں جیسی کی ہے مجھے ایسی عزت
راستہ بھول کے کیا آپ ادھر آ نکلے — میرے لائق کیا ہے کہئے کوئی خدمت

ناصر : رسم نے طور پہ آنے سے رہا گو معذور — میری حالت نے مجھے کر دیا ایسا مجبور
بندہ مطلب کے لیے اب بھی نہیں آیا

نواب : حال پہ میرے کرم کس لیے فرمایا ہے

ناصر : میں نے دردانہ کی نسبت کا سنا جب سے حال

نواب : دیکھ کر آپ کو جو مجھ کو ہوا تھا یہ خیال — آشکارا تھا جناب آپ کی صورت سے سوال

ناصر : میں قسم کھاتا ہوں اپنے سے سروکار نہیں — ہر چند اچھا ہے مجھ سے مجھے انکار نہیں

نواب : مگر اس باب میں اب کچھ بھی نہ فرمائیں جناب — بے سنے آپ کی ہر بات کا ہے بس یہ جواب

ناصر : اس کی دولت سے وجاہت سے تو انکار نہیں — پھر بھی دردانہ کے لائق تو وہ زنہار نہیں

نواب : کون سا عیب ہے اس میں جو ہوا انگشت نما — ہے رئیس ابنِ رئیس اس میں خرابی ہے کیا؟

ناصر : رنگ رلیاں ہیں وہاں آٹھ پہر اور شراب

نواب : سن چکا اب میں بہت آپ کی مہمل بکواس — وقت اس کے لیے بیکار نہیں میرے پاس
تم جلے دل کے پھپھولوں سے ہو اپنے مجبور — تم کو تو اس میں نظر آئیں گے لاکھوں ہی قصور

ناصر : قبلہ و کعبہ یہ الزام ہے مجھ پر بے سود — ہے فقط آپ کی مجھ کو تو بھلائی مقصود

نواب : اپنی اولاد کی ہے تم سے زیادہ مجھے فکر   ختم فرمائیں براہِ کرم اب آپ یہ ذکر

راوی : جب یہ کوشش بھی ہو گئی بیکار   مرحلہ اور بن گیا دشوار
تھی ہر اک سمت اب یاس ہی یاس   گم ہوئے جاتے تھے ہوش و حواس
تھک کے بیٹھا مگر نہ جاتا تھا   کسی پہلو نہ چین آتا تھا!
تھا خیالات کا عجب ہجوم   اور نتیجہ ہر ایک کا معلوم
یک بیک اس کو یہ خیال ہوا :-

ناصر : ارجمند مجھ سے گو ہے لاکھ خفا
پھر بھی خود اس کے گھر اگر جاؤں   کیا عجب ہے کہ راہ پر لاؤں

راوی : ایک امید کے سہارے پر   بہہ چلا حسرتوں کے دھارے پر
پہنچا وہ ارجمند کے ایواں   تھا جہاں عیش کا بپا طوفاں

(ارجمند کی محفل - رقص و نغمہ)

ارجمند : کیا خوب رقص و نغمہ ہے
دوست ۱ : مے ہے سرور ہے
دوست ۲ : یہ جلوہ گاہِ ناز ہے
دوست ۳ : یا بزمِ نور ہے
دوست ۱ : اپنے نشے سے مے بھی یہاں چور چور ہے
ارجمند : عشرت کا ہے وفور
ساقی : مسرت مزید ہے
دوست ۱ : ہر شب شبِ برات ہے
دوست ۲ : ہر روز عید ہے
ارجمند : چھلکے جام چلے پیمانہ   لب پر نام ہے ڈُردانہ
سب دوست : ڈُردانہ ——— ڈُردانہ ——— ڈُردانہ
ناصر : ہے اجازت کہ اندر آ جاؤں ؟
ارجمند : کون ہے ؟
ناصر : میں آپ سے ملنے آیا ہوں -

ارجمند : تو آؤ ناچ کا ماسٹر

ناصر : جی - جی نہیں - جی

ارجمند : شرماتے ہو کیا میری پریوں کے سامنے ؟ رہنے دو ،

ناصر : تنہائی میں گفتگو ضروری ہے التجا !

ارجمند : کچھ تخلیہ کی بات ہے ؟ اچھا تو تخلیہ :

(تخلیہ)

ارجمند : اوہو - یہ کون ؟ ہاں یہ آپ !

ناصر : ہاں بھائی میں ہوں

ارجمند : یعنی جناب مہمان ہیں آپ !
کہیے یہ آج کس لیے زحمت اٹھائی ہے ؟

ناصر : اک التجا عجیب کہ اس در پہ لائی ہے

ارجمند : یہ کس طرح سے راستہ حضرت گئے ہیں بھول
یہاں میں حضرتِ زاہد کا کیوں نزول

ناصر : گو ارجمند ہم میں بہت کچھ ہیں اختلاف

ارجمند : چھوڑو بھی اختلاف کو تم آگئے یہاں
اب جیسے بھول جاؤ وہ سب پچھلی داستاں
اب غرق جام کر دیں ہر اک اختلاف کو

ناصر : انسانیت کے نام پہ کرتا ہوں التجا

ارجمند : آخر کہو تو صاف کہ یہ ماجرا ہے کیا ؟

ناصر : دردانہ کے خیال کو دل سے نکال دو
شادی جو ہو رہی ہے کسی طرح ٹال دو

ارجمند : (قہقہہ مار کر) استاد تم کو مان گئے خوب ہے سوال
کیا خوب مجھ سے آئے ہیں چلنے یہ آپ چال

ناصر : تم کو غلط خیال ہے میری نہیں غرض !

ارجمند : اپنا علاج کیجئے دل کا ہے یہ مرض !
حیرت تھی مجھ کو خود بھی کہ آئے ہیں کیوں جناب — مغرب سے کیوں طلوع ہوا آج آفتاب
اتنا تو بیوقوف نہ سمجھیں مجھے جناب — عادی نہیں ہوئی ہے ابھی اس قدر شراب

یہ داؤں پیچ آپکے سب جانتا ہوں میں   حرفوں کے پیچ سبھی پہچانتا ہوں میں

ارجمند : بس بس بہت ہی سن چکا ان صلوات کو   اپنی گرہ میں باندھ لو تم میری بات کو
شادی اس سے ہو کے رہے گی وہیں ضرور   پامال کر کے رکھونگا میں آپ کا غرور

راوی : ہوا تقدیر کا لکھا پورا   آخر کار دن وہ آ پہنچا
آج شادی تھی کیوں نہ ہوتی دھوم   مہمانوں کا تھا محل میں ہجوم
رشکِ فردوس تھا محل گویا   گوشہ گوشہ میں جشن تھا برپا
دھوم ہر سمت ہے برات آئی   نغمے برسا رہی ہے شہنائی

(نغمہ)

راوی : ارجمند آئے بن کے یوں نوشہ   سب نے خوش ہو کے واہ واہ کہا
مطربوں کی وہ گونجتی آواز   زمزمہ بار ہر طرف تھے ساز
تھا یہاں زمزموں کا یہ دور   اور ناصر کا حال تھا کچھ اور
دل شکستہ تھا زیست سے بیزار   بیکسی میں نہ تھا کوئی غمخوار
ضبط جب ہو گیا بہت دشوار   حسرتیں گنگنا اٹھیں اک بار

(ناصر کا گانا)

مل کے بچھڑ گئیں ہم سے نظریں آہ مقدر پھوٹ گیا
اُن کے ہاتھوں بن کر آخر دل کا کھلونا ٹوٹ گیا
ہائے کہاں اب بادۂ باقی افسانہ ہے جلوۂ ساقی
کشمکش اندوہِ وفا میں ہاتھ سے ساغر چھوٹ گیا
غنچے چٹکے سب نے دیکھے دل کی کون آواز سنے
کس کے دل کا سہارا ٹوٹا کس کا ساتھی چھوٹ گیا

(منظر — تبدیل ہوتا ہے)
(آگ آگ کا شور بلند ہے)

راوی : شور اٹھا آگ آگ کا ناگاہ   چرخ نیلی ہوا دھوئیں سے سیاہ

(شور جاری رہتا ہے)

اک کہرام سا مچا ہر سو — گویا محشر سا تھا بپا ہر سو
شعلے رقصاں سے ہونے لگے — دفعتاً ہاتھ پاؤں پھول گئے
دیکھتے تھے کھڑے تماشائی — نذرِ آتش کی شعلہ آرائی

ستارہ: بس جا کر ابھی کوئی بجھائے — کوئی دردانہ کو نکال کے لائے
آہ کیسی جلانے والی آگ — ہائے وہ جو جلا رہی ہے سہاگ

راوی: ابھی یہ سب غم میں بیٹھے تھے — کیا پڑی تھی کسی کو جان کی تھے
سنی ناصر نے شور کی آواز — اس کی وارفتگی تھی بے انداز
سن کے بھاگا وہ جیسے دیوانہ — شمع کی سمت مثلِ پروانہ
سامنے تھا اک آتشیں سیلاب — آگ کی موج میں آگ کے گرداب
شعلوں کو چیرتا بڑھا آگے — دیکھنے والے نقشِ حیرت تھے
دھن کا پکا تھا عزمِ مردانہ — وہیں پہنچا جہاں تھی دردانہ
وہ بچا لایا اس کو آخرکار — وہ بھی بے ہوش اور زار و نزار

(شور)

آگ ادھر بارگاہ تک پہنچی — آگ اب عز و جاہ تک پہنچی
ارجمند اور اس کے سب ساتھی — آگ میں گھر چکے تھے باراتی
ناصر اب اس طرف بڑھا یکبار — لایا وہ لپکا کر بھی وہ آخرکار
دیکھ کر اس کی جرأت و ہمت — متحیر سے خود فلک رفعت
گرا چکرا کے ناصرِ جانباز — تھے نگہباں کے اب ربِ کارساز

ارجمند: ارے ناصر کو کیا ہوا دیکھو!
فلک رفعت: نمک جلد لا کے ان کو سنگھاؤ
ناصر: میں ہوں اچھا نہ فکر کچھ کیجیے —— پہلے دردانہ کی خبر لیجیے!
راوی: بارے دردانہ ہوش میں آئی — ہونٹ کانپے نگاہ تھرائی
دردانہ: ناصر —— ناصر
فلک رفعت: کیا ہے دردانہ؟
ارجمند: یہ رہے ناصر

فلک رفعت: محسن خاندان ہیں ناصر شکر ہے بن کے ہے زبان ناصر

ارجمند : بھائی ناصر مجھے معاف کرو

دل کدورت سے اپنا صاف کرو

ناصر : بھائی ارجمند مجھے شرمندہ نہ کیجیے

ارجمند : نواب صاحب۔ التجا میری آخری یہ ہے

یہ ہوں نوشہ میں [illegible] خوشی یہ ہے

فلک رفعت: نواب صاحب۔ ع۔ فیصلہ خوب ارجمند کیا

ع۔ ہم نے داماد یہ پسند کیا

ارجمند : آداب عرض ہے سب کو مبارک ہمیں

آوازیں : حق تعالیٰ رکھے مبارک ہمیں

آوازیں : مبارک۔ سلامت

(نغمہ)

آوازیں : مبارک جشن شاہانہ

مبارک عقد فرزانہ

(فیڈ آؤٹ)

———

جگر مراد آبادی

یہ ذکر ہے [illegible] کا۔ میں حساب میں کمزور ہوں مگر غالباً چھبیس برس گذرے۔ ایک عمر ہوتی ہے بلکہ اس عمر آدمی تو اگر اختیار سے کام نہ لے تو صاحب اولاد تک ہو جاتا ہے۔ بہرحال معاف کیجئے گا یہ بہت پرانی بات ہے کہ دہلی کے شہر میں ایک مشاعرہ تھا۔ ایسا بے پروا مشاعرہ کہ [illegible] مشاعرہ ہو گیا۔ کچھ ایسا سماں بندھا ہے کہ شاعر کی آواز چوکیدار کی آواز معلوم ہوتی تھی [illegible]۔ میں بھی ایک طرف بیٹھا غالباً سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ یکایک طوفان آ گیا۔ سب میں بڑی حرکت ہوئی [illegible] اور اب جو دیکھا ہوں تو ایک صاحب جن کا چہرہ غائب تھا شمع [illegible] کے سامنے بیٹھے ترنم کر رہے تھے۔ چہرہ غائب یوں تھا کہ سر کے تمام بال اپنی تمام ژولیدگی کے ساتھ اس طرح داڑھی سے الجھے ہوئے تھے گویا یہ ایک مسلسل داڑھی ہے جو سر سے شروع ہو کر منہ چہرے کو چھپاتی ہوئی گردن تک آئی تھی اور یہ داڑھی سیاہ فر کی اس ٹوپی سے نکلی تھی جو ان صاحب کے سر پر نہایت بے ڈھنگے پن سے رکھی ہوئی تھی۔ گلے میں شیروانی جس کے دامن [illegible] ہوئے۔ شیروانی کے [illegible] جس کے رنگ کا صحیح اندازہ ناممکن تھا۔ چوڑی دار پاجامہ جو کسی زمانے میں غالباً سفید ہو گا اور اس وضع قطع کے ساتھ یہ صاحب غزل پڑھ رہے تھے۔ آواز ایسی کہ روح اس کی کھنک محسوس کرے اور کلام ایسا کہ اس مشاعرے کے سامعین جو داد دینے میں متانت کی حدود سے گذرتے ہوئے نظر آ رہے تھے خود بخود [illegible] ہوتے گئے۔ میں جس وقت ہوش میں آیا ہوں اس فضا پر یہ شعر برس رہا تھا ؎

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں زاہد
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

کتاب اٹھا۔ شباب اٹھا۔ شراب اٹھا ایسی زمین نہیں ہے کہ اس کو اس آسانی کے ساتھ آسمان بنایا جا سکے مگر یہاں تو عالم یہ تھا کہ ایک سے ایک ڈھلا ہوا شعر سماعت میں کھنک رہا تھا۔ ابھی اس شعر پر مجمع جھوم ہی رہا تھا کہ شاعر نے جھوم کر دوسرا شعر پڑھا ؎

مجھے اٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں
جو اٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اٹھا

اور پھر یہ شعر —

نشانِ منزلِ جذب تمام چھپ نہ سکا
اِدھر فنا ہُوا قطرہ اُدھر حباب اُٹھا

اور آخر میں مقطع —

کہاں یہ بار کہاں پاسِ نازکِ جاناں
اُٹھا سر، او جگر خانماں خراب اُٹھا

یہ تھے جگر۔ وہ جگر مراد آبادی جن کی دھوم سُن چکے تھے اور ملاقات آج اس طرح ہوئی کہ جب آپ غزل پڑھ چکے اور چہرے پر چھائے ہوئے بال چہرے سے ہٹا کر اپنی سیاہ فرکی ٹوپی کے نیچے دباتے ہوئے آپ اپنی جگہ پر آکر بیٹھے تو بیت سے داد دینے والوں میں ایک میں بھی تھا۔ مین پوری کے صرف شاعر تو جتی سرن شاد نے تعارف کرایا اور شوکت صاحب بہت جلد تعارف کی رسموں سے گذر کر بے تکلف ہو گئے پان کی وہ گلوری جو خود کھانا چاہتے تھے مجھے دے دی اور قوام کھانے کا وعدہ کر کے ایک صاحب کو اپنے ارد گرد ڈھونڈنے لگے جن کے پاس قوام کی شیشی دیکھ چکے تھے۔ اور پھر بہ اصرار یہ شیشی آپ ہی رکھ لیں حالانکہ وہ شیشی خود آپ کی بھی نہیں بلکہ آپ کے ایک دوست کی تھی۔

مین پوری میں قیام کا ارادہ بالکل نہ تھا مگر جگر صاحب نے زبردستی ایک ہفتے تک اُسی گھر میں مہمان رکھا جہاں خود مہمان تھے اور مارے خلوص کے اپنے میزبان کو طاق پر بٹھا کر خود ان کی اور اپنے دوسرے مہمانوں کی مدارات میں مصروف ہو گئے۔ مین پوری میں جگر صاحب اس زمانے میں منشی اصغر حسین صاحب اصغر مختار کے یہاں اپنا جیسا کارڈ بنائے ہوئے تھے۔ فرخ آباد چلے گئے اٹاوہ چلے گئے یا جہاں بھی کوئی پکڑ لے گیا چلے گئے اور پھر اصغر صاحب کے یہاں واپس آگئے معلوم نہیں اصغر صاحب سے یہ تعلق حضرت اصغر گونڈوی کے ہم نام ہونے کی وجہ سے تھا یا جگر صاحب کی قسمت ہی میں محبت کرنے کیلئے ہر قسم کے اصغر لکھے ہوئے تھے مگر اصغر کی یہ مین پوری والی قسم بھی واقعی محبت کرنے کے قابل ایک چیز تھی سفید داڑھی اور لمبے قد کا یہ بھولا بھالا آدمی اپنی شخصیت میں اس قدر محبوبیت رکھتا تھا کہ اس "بزرگ بچے" کو دیکھ کر خواہ مخواہ پیار آتا تھا پھر جگر صاحب کو تو ان کے گھر پر ایسا اقتدار حاصل تھا کہ واقعی خود صاحب خانہ جگر صاحب ہی کے مہمان نظر آتے تھے۔ میرے لیے ایک نزاکت یہ بھی تھی کہ اس مین پوری کو میری سسرال کی حیثیت بھی حاصل تھی میرے خسر صاحب محترم حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب مرحوم و مغفور اس زمانے میں یہیں بسلسلۂ ملازمت موجود تھے اور ملازمت کے علاوہ ایک مستقل حیثیت اُن کو یہ حاصل تھی کہ مین پوری کے مشاعروں کی صدارت کا گویا آپ ہی کے پاس ٹھیکہ تھا۔ ان کی موجودگی میں جگر صاحب کا مہمان بن کر رہنا ظاہر ہے کہ عجیب سی بات تھی مگر خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے خسر صاحب کو ان کو سوائے اس بات کے کوئی اعتراض نہ ہُوا کہ جگر کی صحبت بہرحال ایک رند کی صحبت تھی اور باوجود ضبط کرنے کے اتنا تو کہہ ہی دیا کہ "بھئی یہ جگر کمبخت شراب بہت پیتا ہے بس یہی نہایت لغو بات ہے اس میں" مطلب یہ تھا کہ اس لغویت سے دُور ہی رہنا چاہیئے۔ مگر داماد ہو تو ایسا سعادتمند کہ خود ان کے سایۂ رحمت سے زیادہ سے زیادہ دور اور اس لغویت سے قریب تر رہ کر ایک ہفتے کے بعد جگر کو اپنی روح پر طاری کئے اور ان ہی کے شعر گنگناتے مین پوری سے لکھنؤ واپس آگئے۔

دو ہفتے کے بعد پھر [illegible] جہاں ابھی ہم ٹھہرے ہوئے تھے اور معلوم ہوا کہ جگر صاحب بھی موجود ہیں جگر صاحب کے پاس پہنچا۔ معلوم ہوا کہ [illegible] آج خود جا کر ہیرا [illegible] لے آئے ہیں [illegible] ارشاد نے [illegible] اگر [illegible] پہنچ [illegible] کھانا [illegible] شروع کر دی۔ مگر [illegible] صرف ایک [illegible] [illegible] پہنچ [illegible] مشاعرے [illegible] صاحب [illegible] کے [illegible] شرکت کے [illegible] ہوئے تھے۔ [illegible] جگر صاحب کا [illegible] جو [illegible] [illegible] [illegible] تھے۔ [illegible] جگر [illegible] موجود ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] جگر صاحب [illegible] [illegible] جگر صاحب [illegible] [illegible] پہلے چلے جاتے تھے۔ [illegible] [illegible] عالم [illegible] [illegible] کسی کا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تیسری بات ان کی حالت نازک ہو گئی۔ [illegible] شراب کے [illegible] [illegible] [illegible] حضرت کا عالم [illegible] اگر شراب پیتے پیتے [illegible] مانگے پینے کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] جگر صاحب کا [illegible] عالم [illegible] [illegible] یہ ہرگز گوارا نہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] شوق [illegible] [illegible] [illegible] ہماری [illegible] صادق [illegible] [illegible] جگر [illegible] [illegible] دونوں کے علاوہ اور بھی بہت آدمی جمع ہو گئے۔ [illegible] [illegible] کہ اپنی معصومیت کا خود بھی قائل ہونا پڑا۔

انجمن معین الادب لکھنؤ کا ایک سالانہ مشاعرہ تھا۔ طے ہوا کہ جس طرح بھی ہو جگر مراد آبادی کو اس مشاعرے میں ضرور شریک کیا جائے۔ مگر جگر ہیں کہاں؟ نہ ان کا کہیں پتہ نہ نشان۔ پتہ تو اس کا ہوتا ہے جس کا کہیں گھر ہو اور جگر اس زمانے میں خانہ بدوشی کی بلکہ میخانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ طے یہ کیا گیا یہ کام شوکت تھانوی اور اس زمانے کے شاعر کے چودھری مولانا وصل بلگرامی مرحوم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں انھیں ڈھونڈنے نکلے۔ یوپی بھر میں ڈھونڈھا۔ آخر ہم ہر میخانہ چھان مارا اور ملے آپ کہاں فرخ آباد میں۔ وہ بھی اس حالت میں کہ نہ ان کو ہمارا ہوش تھا نہ اپنا۔ اسی حالت میں ان کو لے کر لکھنؤ روانہ ہو گئے اس لیے کہ اب وقت اتنا کم رہ گیا تھا کہ بمشکل مشاعرے کے وقت پر لکھنؤ پہنچ سکتے۔ اب مصیبت یہ تھی معین الادب کا یہ مشاعرہ طرحی تھا اور نہایت سختی سے اس ضابطہ کی پابندی ہو رہی تھی کہ خواہ کوئی بھی ہو کسی سے بغیر طرح کلام نہ سنا جائے گا۔ ادھر ان حضرت کا عالم یہ کہ شعر کہنا کیا معنی یہ بات بھی ڈھنگ سے نہ کر سکتے تھے۔ خدا خدا کر کے کانپور کے اسٹیشن پر آپ نے پوچھا کہ میں کہاں ہوں اور جب آپ کو بتایا گیا کہ آپ لکھنؤ جا رہے ہیں

بمشکل تمام آپ سمجھ سکے کہ واقعہ کیا ہے۔ موقع غنیمت جان کر اصل صاحب اور میں نے اس طرح میں کچھ کہنے کی خواہش کی
اور آخر مشاعرے تک پہنچتے پہنچتے دو شعر آپ نے کہے جو آج تک مجھے یاد ہیں —

محیطِ عشق میں جو کچھ بھی تھا اک عالمِ دل تھا ۔۔۔ اسی قطرے میں دریا تھا اسی قطرے میں ساحل تھا
خوشا وہ دور جب آغازِ دردِ عشق کامل تھا ۔۔۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں سرتا بہ پا دل تھا

اور یہ واقعہ ہے کہ یہی دو شعر حاصلِ مشاعرہ تھے۔ جگر اس خود فراموشی کے زمانے میں بھی عالم یہ تھا کہ مشاعرے کے لیے غزل کہی ہے کہ کوئی صاحب جن کو کسی حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے کہ شاعری ضرور کرو خواہ شعر کہہ سکو یا نہ کہہ سکو تشریف لے آئے اور چپکے سے کہہ دیا کہ طرح میں فکر نہیں کر سکا آپ نے اپنی غزل ان کے سامنے رکھ دی وہ مشاعرے میں لے گئے۔ کئی اور صاحب اسی قسم کے آتے وہ بھی ایک آدھ لے بھاگے کسی کو کوئی مطلع پسند آگیا وہ لے گئے اور غزلیت ان کے حصے میں آئی میں اس بات پر بہت جھگڑا کرتا تھا اور اکثر تو بدمزگی کی نوبت آگئی مگر اس معاملہ میں مجھ سے چڑ جاتے ہوں مگر یہ سلسلہ جاری رہا اور اب بھی جاری ہے حالانکہ ان سے پوچھئے تو نہایت برہمی کے ساتھ انکار کر جائیں گے۔

اردو کے اس حافظ نے مین پوری میں اپنے لیے شیراز بھی پیدا کر لیا تھا۔ اپنے بے تکلف دوست کو شیرازی کی مبہم کرنے میں جہاں جاتے تھے جذبۂ پرستش لے کر گئے واپس آتے تھے معمور ہو کر۔ اس شیراز کا نام آپ نے ... رکھا تھا اور صاحبانِ طور سے تعلقات اس قسم کے تھے کہ خود نہ کبھی موسیٰ بنے نہ برقِ طور کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ کلیم کی تاب نظر آزمائے معلوم نہیں اسے کلیم سے دلچسپی تھی یا کلام سے بہرحال جگر صاحب کی حیثیت میرے نزدیک صرف آزری بت تراش کی تھی۔

اب تو اللہ رکھے جگر صاحب گھر گرہست ہو گئے ہیں۔ سخت متوبہ کہ شراب پی پھر شراب ان کو پیا نہ شراب ان سے چھوٹی اور یہ شراب کے مدت سے پیتے نہیں مگر وہ رندانہ ادائیں آج بھی موجود ہیں۔ بچوں کا سا معصوم دل جس کے کیسے ذرا سی بات پر لڑوا دیں مگر لڑ کر بھی۔ وہ ٹھنا نہیں جانتے جس سے لڑتے ہیں اسی کو منانے بھی خود ہیں۔ سب کہتے ہیں جگر بہت بڑا شاعر ہے مگر میں کہتا ہوں جگر بہت بڑا انسان ہے اور شاعری اس کی شخصیت کا صرف ایک جز تو۔

ڈاکٹر صاحب

(منظر: ٹرین کا ایک ڈبہ۔ کچھ دیر کے بعد دو آدمی بیدار ہوتے ہیں
ٹرین غالباً آتی ہے)

ریاض: خالد خالد! اٹھو بھی۔ اسٹیشن آ رہا ہے سفر ختم ہوا۔

خالد: (انگڑائی لیتے ہوئے) کیا بجا ہوگا۔

ریاض: یہی بجا ہوگا کچھ پانچ ساڑھے پانچ۔ دوست گاڑی صرف ایک منٹ ٹھہرتی ہے۔

خالد: تو یہ کہو نا۔ لو میں بستر لپیٹ لیتا ہوں۔

ریاض: ذرا دیکھنا ادھر میرا سوٹ کیس تھا۔ ادھر جھک کے۔

خالد: نہیں ادھر تو میرا سوٹ کیس ہے۔ ایں! یہ کیا۔ یہاں تو میرا سوٹ کیس ہے نہ تمہارا۔

ریاض: یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ذرا آگے بڑھ کر دیکھو۔

خالد: نہ کوئی سوٹ کیس ہے نہ میرا ہینڈ بیگ۔ یہ تو بڑا غضب ہوا۔ دیکھو نا کسی اور کے نیچے۔

ریاض: کیا فائدہ اب دیکھنے سے۔ ظاہر ہے کہ دونوں غافل سوتے تھے کسی نے ہاتھ صاف کر دیا۔

خالد: مگر اب ہوگا کیا۔ اس پردیس میں میرے پاس نہ تو پہننے کو کپڑے ہیں نہ جیب میں دھیلا۔

ریاض: گویا میرے پاس سب کچھ ہے۔ شامت کی مار گھڑی اور پیسوں کا پرس بھی لیٹتے وقت سوٹ کیس میں رکھ دیا تھا۔

(ٹرین آہستہ ہوتی ہے)

خالد: غالباً اسٹیشن آ گیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مرے بے موت۔

ریاض: اور ٹکٹ؟ ٹکٹ بھی تو پرس ہی میں تھا۔

خالد: مانگنا پڑی بھیک برادرم۔ بہرحال اللہ مالک ہے۔

(ٹرین ٹھہرتی ہے کچھ اسٹیشن کی چہل پہل)

ریاض: مگر یہ حرکت کیا کی ہے تم نے ایک تو سفر میں لٹ گئے دوسرے تم نے [illegible] سامان [illegible]
آخر یہ ہینڈ بیگ ہے کس کا۔

خالد: تو بندہ مجھے کیا معلوم کس کا ہے میں نے تو بس ٹرین سے اُترتے وقت یوں ہی اُٹھا لیا تھا کہ جاتا اتنا سامان گیا ہے تو ہم کیا ایک ہینڈ بیگ بھی نہ اُٹھائیں۔ خیال یہ تھا کہ کچھ نہ کچھ تو نکلے ہی گا اس میں سے۔

ریاض: اس میں سے نکلے گا گرفتاری کا وارنٹ۔ دیکھ لینا ادھر گئے ہی اسٹیشن سے ہینڈ بیگ کا مالک ٹیلیفون کر کے تار کھڑکائے گا اور ہم یہاں یہ ہینڈ بیگ کے سمیت دھر لیے جائیں گے۔

خالد: دھر لیے تو جب جائیں گے کہ یہ سوٹ کیس میرا مطلب یہ ہے کہ یہ ہینڈ بیگ ہمارے پاس سے برآمد کر لیا جائے۔ ہم تو اس کو ابھی سامان نکالنے کے بعد پھینکے دیتے ہیں کسی طرف۔ کچھ نہ کچھ تو اس میں نکلے ہی گا۔ ایسا بھی کیا۔ جو ایسا شاندار ہینڈ بیگ رکھ سکتا ہے وہ تھوڑا بہت تو پیسے کا بھی ہوگا۔

ریاض: خدا کے لیے جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آنے ہی والی ہے شامت ہماری اسی ویٹنگ روم میں۔

خالد: دل کو مضبوط رکھو۔ اور چوروں والی گھبراہٹ خواہ مخواہ اپنے اوپر طاری نہ کرو۔

ریاض: اچھا تو تم غسل خانے میں یہ ہینڈ بیگ لے جا کر دیکھ بھال لو۔ میرا تو خون خشک ہوا جاتا ہے۔

خالد: خواہ مخواہ بھی، جتنا ہم اسے چھپانے کی کوشش کریں گے اتنے ہی مشکوک سمجھے جائیں گے۔ یہیں کھولے دیتے ہیں ہینڈ بیگ (ہینڈ بیگ کھول کر) یہ کیا۔ یہ تو کسی ڈاکٹر کا بیگ معلوم ہوتا ہے یہ دیکھو اسٹیتھسکوپ (STHETHIS COPE) ہے ڈاکٹر کا ہینڈ بیگ تو ہے ہی، یہ دیکھو، انجکشن دینے کا سامان البتہ کچھ ہے۔

ریاض: چھوڑو اسے بھی یہ بلڈ پریشر دیکھنے کا آلہ ہے۔ باقی یہ سب دواؤں کی ڈبیاں اور شیشیاں ہیں۔ کچھ نہیں ہے اس میں دفع کرو۔

خالد: ٹھہر تو جاؤ شاید ڈاکٹر صاحب کی ایک آدھ فیس بھی نکل آئے۔ یہ کیا ہے غالباً پرس۔

ریاض: جی نہیں نشتر دینے کے چاقوؤں کا پاکٹ سٹ ہے۔ لے یہ دیکھو۔

(ایک دم ویٹنگ روم کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک صاحب داخل ہوتے ہوئے کہتے ہیں)

محمود: وہی مثل کہ جہاں جائیے بھوکا وہیں پڑے سوکھا۔ روز یہ ٹرین لیٹ ہوا کرتی تھی آج ہی اس کو ٹھیک وقت پر آنا تھا تاکہ مجھے نہ مل سکے۔ کیوں صاحب معاف کیجیے گا۔ آپ کو کچھ پتہ ہے کہ دوسری ٹرین اب کس وقت چلے گی۔

ریاض: جی ہاں۔ یعنی جی نہیں ہم کو کچھ پتہ نہیں۔

خالد: کمبخت جانے والوں کے متعلق آپ پوچھ رہے ہیں۔
محمود: کمبخت جانے والی جائے۔ فلاں جانے والی جانے دو۔ ادھر چلا جاؤں وہ چور جانے والی جائے تو کمبخت چلا جاؤں۔ مگر آج تو کسی نہ کسی شہر تک جانا ہے لاریں بھی تھوڑی دیر پہلے پہنچ جاتا اور مجھ کو گاڑی مل جاتی۔ کاش میں کاش ... یہ ... یہ کیا ... یہ آپ کا سامان ہے؟
ریاض: جی نہیں خدا کے لیے میرا سامان نہیں ہے۔ میں تو آپ سے بالکل کہہ رہا کہ وہ تمہارا یہ سامان۔
محمود: تو پھر یہ سامان آپ کا ہوگا ... ڈالا ہے۔ مدد ... یہ سب اسباب ہے بے شک مگر ضرور ہے کہ میری رعب کی جلدی۔ ڈاکٹر صاحب مجھ کو شاید مانگ مروا لی گئی۔ میں اس وقت ڈاکٹر کو لینے ملتان یا وہیں جانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میری بیوی اس وقت موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ میری زندگی کی کوئی صرف یہی پونجی ہے۔ خدا کے لیے ... کر دیجئے۔
خالد: یہ تو درست ہے مگر بندہ نواز۔
محمود: اب اگر مگر کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب آپ مجھ کو خرید لیں گے اگر اس وقت میرے ساتھ چلے چلیں میں زندگی بھر آپ کا غلام رہوں گا ڈاکٹر صاحب بس اب چلے ہی آئیے میرے ساتھ۔
خالد: ذرا بات تو سن لیجئے۔
محمود: بات بھی سن لوں گا مگر پہلے آپ چلے چلئے۔ آپ کی جو فیس ہو اس سے دوگنی لے لیجئے جا کر ڈاکٹر صاحب میری بیوی کو چل کر بچا لیجئے۔ خیر بچانے والا تو خدا ہے مگر اس خدا نے آپ کو رحمت کا فرشتہ بنا کر یہاں بھیجا تھا۔ مجھ کو ڈاکٹر کی تلاش تھی۔ آپ مجھ کو مل گئے ہیں اس کو اتفاق نہیں کہنا بلکہ یہ قدرت کا انتظام تھا اور اب میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ میری بیوی بچ جائے گی اور آپ ہی کے علاج سے بچے گی۔ لائیے یہ بینڈ بیگ مجھے دیجئے۔ یہ بستر بھی میں ہی لادے لیتا ہوں۔
ریاض: نہیں صاحب یہ رہنے دیجئے میں خود اٹھا لوں گا مگر۔
محمود: اب آپ بھی کچھ نہ کہیئے ذرا جلدی کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ میرا تانگہ واپس لوٹ جائے۔ بس آہی چلیے۔ وہ ابھی موجود ہوگا۔ لائیے نا یہ بستر میں ہی لیے لیتا ہوں۔
خالد: جی نہیں ٹھیک ہے ان ہی کو لانے دیجئے مگر اس کمبخت نے اپنا ٹکٹ تک کہیں پھینک دیا ہے۔
محمود: وہ سب ٹھیک ہے کوئی نہیں پوچھتا آپ سے ٹکٹ۔ آئیے باہر میں ذمہ دار ہوں۔ خدا نے آپ کو واقعی رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔

(موسیقی)

محمود: دیکھو ذرا جلدی سے پردہ کرا دو۔ ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ آپ آ جائیے ڈاکٹر صاحب پردہ خود ہی ہو جائے گا ادھر تشریف لائیے۔ اس کمرے میں۔ یہ دیکھئے ڈاکٹر صاحب۔ آپ تشریف تو رکھیے۔ اور آپ بھی بیٹھ جائیے

ڈاکٹر صاحب یہ میری بچی ہے۔ آج چوتھا دن ہے بخار کو۔ آج تو اس نے صبح سے آنکھ ہی نہیں کھولی ہے بالکل بیہوش ہے۔ نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہی میری ایک بچی ہے ہم میاں بیوی اسی کو دیکھ دیکھ کر جی رہے ہیں۔

خالد : آپ گھبرائیے نہیں ذرا برف۔ مگر برف یہاں کہاں۔ کسی گھڑے کا باسی پانی منگا لیجئے اور ایک تولیہ یا تولیئے۔

محمود : ابھی لیجئے۔ (جاتا ہے)

ریاض : خدا جانے تم اب اور کیا گل کھلانے والے ہو۔

خالد : شش۔ دیوار گوش دارد۔ انشاء اللہ یہ لڑکی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ ذرا بیگ مجھے اٹھا دو۔

محمود : (آتے ہوئے) یہ لیجئے ڈاکٹر صاحب پانی اور یہ جھاڑن۔

خالد : دیکھو کمپاؤنڈر تم یہ جھاڑن اس پانی میں تر کر کے مریضہ کے سر پہ رکھو۔

ریاض : کیا مجھ سے کہا۔

خالد : تم پر سفر کی اتنی تھکن ہے کہ دماغ ہی حاضر نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ یہ جھاڑن پانی میں تر کر کے مریضہ کے سر پر مسلسل رکھتے رہو اور دیکھئے صاحب آپ تھوڑا سا پانی گرم کرائیے۔ باقاعدہ ابلوا لیجئے پانی۔

محمود : ابھی لیجئے۔ ارے بھئی ذرا پانی جوش کراؤ جلدی سے۔ اور جانے کے لیے جی بانی رکھواؤ۔ بلکہ میں خود لاتا ہوں ابھی۔ پانی ابھی حاضر ہوا۔ (جاتا ہے)

ریاض : یعنی میں کمپاؤنڈر بھی ہو گیا۔

محمود : (لوٹتے ہوئے) جی مجھ سے کچھ فرمایا۔

خالد : جی نہیں آپ تشریف لے جائیے۔ میں کمپاؤنڈر سے بات کر رہا تھا (وقفہ) تم سے کچھ دیر چپ نہیں رہا جا سکتا۔

ریاض : مگر میں کہتا ہوں کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ ہو جائے کہ دھر لیے جائیں۔

خالد : دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔ ذرا کھولو یہ بیگ۔ وہ انجکشن کے سیٹ کی ڈبیا کہاں ہے۔ ہاں یہ رہی۔

ریاض : خدا کے لیے اب کوئی انجکشن نہ دے بیٹھنا۔ (محمود آتا ہے)

محمود : بس ابھی آ بلا جاتا ہے پانی ڈاکٹر صاحب۔ اس کی حالت کچھ بہت خطرناک تو نہیں ہے۔

خالد : مرض بڑھ تو چکا ہے مگر خدا کی ذات سے امید ہے کہ فائدہ ہوگا اور مریضہ ٹھیک ہو جائیگی۔ آپ یہ انجکشن کی پچکاری اُبلتے ہوئے پانی میں رکھ دیجئے اور پھر وہ پانی یوں ہی اٹھا لائیے۔

محمود : ابھی لیجئے۔ اب تو شاید اُبل رہا ہوگا پانی۔ (جاتا ہے)

خالد : (ہینڈ بیگ میں کھڑ بڑ کر کے ٹٹولتے ہوئے) نہ جانے کیا کیا آخر بھرا ہوا ہے اس میں۔

[illegible] جلسہ وغیرہ رہا خطرناک ہے۔ [illegible] مرتبہ کسی [illegible] کئی بچے [illegible] جاتی ہیں۔

ریاض: [illegible] صاحب ڈالڈی [illegible] کو [illegible] ہیں۔ مگر [illegible] ہے۔ ان [illegible] یہی تو ہے وہ جلسہ جو خود [illegible] لایا تھا۔

محمود: [illegible] مجھے [illegible]۔

خالد: شکریہ۔ بس اب میں [illegible] جائے گا۔

محمود: خدا آپ کو [illegible] ٹھیک ہے [illegible]

خالد: [illegible] جی ہاں۔ [illegible] [illegible] ہے [illegible] تم [illegible] [illegible] آپ [illegible] ہو جائے۔

محمود: یہی [illegible]

خالد: جی ہاں یہی ٹھیک۔ وہ [illegible] سے بچے کی [illegible] سے [illegible] تھوڑی [illegible] جائیں۔ وہ ان [illegible] تھوڑی دیر کے بعد [illegible] عمل ختم کر دیجئے۔

محمود: بہت بہتر ہے۔ اب آپ لوگ [illegible] ٹھیک کر دوں [illegible]۔

خالد: جی ہاں۔ آپ بھی اب اطمینان رکھیے [illegible] ان شاء اللہ [illegible] ہو جائے گا۔

محمود: ان شاء اللہ۔ بہرحال تشریف رکھیے۔ [illegible] آپ کا کمرہ [illegible] ملا ہوا غسل خانہ ہے۔ ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ تشریف رکھیے۔ ادھر آئیے [illegible] اور جس چیز کی ضرورت ہو فرما دیجئے۔ اور چائے تو پہلے ہی سے کہی ہوئی ہے۔

خالد: بس شکریہ اب آپ تشریف لے جائیں۔ ہم لوگ خود چائے پی لیں گے دیکھئے آپ وہ [illegible] منگوا کر پاشویہ کرائیے۔

محمود: بہت اچھا۔ خدا حافظ (جاتا ہے)

خالد: بناؤ ریاض چائے بناؤ۔ سخت تھکن ہے چائے پی کر جان میں جان آئے گی۔

ریاض: تم کو جان میں جان آنے کی امید ہے اور تمھاری حرکتوں سے میری جان نکل جا رہی ہے کہ نہ جانے تم کیا کرنے والے ہو۔

خالد: تو آخر میں کیا کروں تم ہی بتاؤ۔ کوئی اپنی خوشی سے تو میں پھنسا نہیں ہوں اس خطرے میں۔

ریاض: خوشی سے تو نہیں پھنسے ہو۔ مگر اپنے لیے خطروں میں اضافے پر اضافہ جو کرتے جا رہے ہو۔ اول یہ کہ اس

نامراد ہینڈ بیگ کو اُٹھانے کی آخر کیا ضرورت تھی - خیر فرض کر لیجئے کہ یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ تو اب ڈاکٹر ہی بن بیٹھے سچ مچ -

خالد : کون بن بیٹھا ہے! بخدا مجھ کو زبردستی ڈاکٹر بنایا گیا ہے - اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیسے کہہ دیتا۔ کہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں - اور یہ ڈاکٹری کا سامان چوری کا ہے -

ریاض : خیر یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے - اور مجبوراً ڈاکٹر بننا بھی پڑا تھا - تو یہ آپ سے کس نے کہا تھا کہ آپ انجکشن دینا بھی شروع کر دیں اور جو یہ لڑکی مر وَر گئی تو -

خالد : جس کی موت آتی ہے وہ سچ مچ کے ڈاکٹر کی دوا سے بھی مر جاتا ہے اگر دعویٰ بھی کیا ہے تو ڈاکٹری کا کیا ہے خدائی کا تو نہیں کیا ہے -

ریاض : اب تک تو صرف یہ دھڑکا تھا کہ ہینڈ بیگ کی چوری کے سلسلے میں پولیس آتی ہی ہوگی گرفتار کرنے اب دیکھ لینا یہ ہوگا کہ مرے گی یہ لونڈیا اور یہ جو اس کا باپ ہے بندھوائے گا ہم دونوں کو -

خالد : خیر مرتی نہیں وہ اس کا ذمہ تو میں لیتا ہوں - میں نے صحیح انجکشن دیا ہے - ابھی میں تم کو کیسے یقین دلاؤں اسی انجکشن سے میرا بخار اُترا تھا - مگر ایک بات بتاؤ کہ ایسی خوبصورت لڑکی اگر واقعی مر گئی تو خود تم کو افسوس نہ ہوگا -

ریاض : اللہ رے اطمینان - یعنی آپ نے اُس کی خوبصورتی بھی تاڑ لی - یہاں کس کافر کو گھبراہٹ کی وجہ سے یہ خیال بھی آیا ہو کہ اس لڑکی کی صورت شکل بھی دیکھنا چاہیئے -

خالد : یہی مجھ میں و تم میں فرق ہے تم گھبراتے زیادہ ہو حالانکہ خطرے میں زیادہ مبتلا میں ہوں - اس لیے کہ اگر پولیس وغیرہ کی تحقیقات کی نوبت آئی تو تم کھٹ سے کہہ دو گے کہ سب کچھ کیا دھرا اس شخص کا ہے بلکہ تم تو ویٹنگ روم ہی میں کہنے والے تھے ان حضرت سے -

ریاض : جھوٹ کیوں کہوں میں سمجھا تھا کہ یہ پولیس کا آدمی ہے -

خالد : آپ کی اسی سمجھداری کا تو ماتم ہے - خیر چائے تو بناؤ ٹھنڈی ہو جائے گی -

ریاض : (چائے انڈیلتے ہوئے) بخدا میرا دل دھڑک رہا ہے - کہ نہ جانے تم نے کس دوا کا انجکشن دے دیا ہے! اور ابھی آتی ہے یہ خبر کہ وہ چھوکری چل بسی - لو پیو چائے -

خالد : چائے پی کر تھوڑی دیر سو لو گے تو دماغ کا یہ بار ہلکا ہو جائے گا - مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے مزاج میں اس قدر وحشت ہے -

ریاض : میں تو بھائی صاحب سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے تو دو گیارہ ہو جاؤں -

خالد : خدا تمہیں جیتا رکھے اگر یہ احسان کر جاؤ تو کیا کہنا ہے - میں صاف بچ جاؤں گا - اس لیے کہ مفرور ہی جرم کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے - شاید جناب کو یہ نہیں معلوم کہ فرار اقبالِ جرم کا دوسرا نام ہے -

ریاض: بہرحال مجھے کھسا کر تم نے کرا اور اپنے ساتھ مجھ کو پھنسوا کر رہو گے۔

خالد: جو قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔ مگر میں اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ ایسی حسین لڑکی کو واقعی مرنا ہرگز نہ چاہیے۔ حالانکہ بیچاری بیمار ہے۔ مگر پھر بھی سبحان اللہ، بہرحال تھوڑی دیر سو رہو۔ غالباً دو بج رہے ہیں۔

ریاض: دو؟ ــــ دماغ شکلنے پہ جا رہے کم نہ ہوں گے۔ ڈیڑھ بجے رحمت بی سے اترے تھے۔

خالد: خیر چار ہی سہی اب کرو نہ سے وقت نکلنے۔ مطلب یہ ہے کہ سو جانا چاہیے۔ اچھا بھئی شب بخیر۔

(خاموشی۔ گھڑی کی مسلسل ٹک ٹک۔ کچھ وقفے کے
بعد دروازے پہ دستک)

خالد: (انگڑائی لے کر) کون ہے۔ آجائیے اندر۔

محمود: (آتے ہوئے) معاف کیجئے گا شاید میں نے آپ کو جگا دیا۔ دن چڑھ آیا تھا۔ میں نے کہا ناشتہ بھی دیر نہ ہو۔

خالد: پہلے مریضہ کا حال بتائیے۔

محمود: اس کا حال مجھ سے نہ پوچھئے۔ اس بستی کے ایک ایک آدمی سے پوچھئے۔ ساری بستی میں اس وقت آپ ہی کی مسیحائی کے چرچے ہیں۔ میرے گھر میں تو سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا ڈاکٹر صاحب۔ میری رضیہ اس وقت ہوشیار ہے بخار بھی میرے خیال میں نہیں ہے اور وہ ماشاءاللہ بالکل ہشاش بشاش ہے۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

ریاض: (انگڑائی لیتے ہوئے) السلام علیکم۔

محمود: آئیے کمپونڈر صاحب دن چڑھ آیا ہے ہاتھ منہ دھولیجئے۔ ناشتہ تیار ہے۔

خالد: میں ناشتے سے قبل رضیہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔

محمود: تو آپ تشریف لے چلیے ناشتہ بھی تو وہیں ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب میری رضیہ کو بچا کر آپ نے مجھ کو خرید لیا ہے۔ زندگی بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھول سکتا۔

ریاض: یعنی۔ وہ گویا ٹھیک ہیں اب۔

خالد: ہاں بخار اتر گیا ہے اور وہ ہوشیار ہیں آپ نے کچھ کھانے کو بھی دیا ان کو۔

محمود: جی ابھی تو نہیں آپ سے پوچھے بغیر کیسے دیتا۔

خالد: بہرحال چلئے میں خود دیکھ کر کچھ تجویز کروں گا۔

محمود: تو پھر تشریف لائیے۔

ریاض: ابھی حاضر ہوا ذرا منہ دھو لیتا۔

محمود: جی ہاں شوق سے۔ وہ رہا غسل خانہ وہیں تولیہ بھی ہے صابن بھی۔ منجن بھی۔

خالد: اچھا تو تم آؤ میں چل رہا ہوں۔ تشریف لائیے صاحب۔

محمود: اسی دروازہ سے نکل چلئے۔ ارے بھئی ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ تشریف لائیے تا اپنے قدموں سے کس پردہ کرتا ہے۔ وہیں تمہارے ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں جنھوں نے تم کو بچا لیا ہے۔

خالد: کہیئے صاحب کیا حال ہے آپ کا۔

رضیہ: اچھی ہوں بالکل۔

خالد: کچھ سر میں درد ورد۔ کچھ بیماری کا اثر وغیرہ۔

رضیہ: جی کچھ بھی نہیں ہے بس بھوک کی شدت ہے۔

خالد: ابھی لیجئے۔ کھانے کو جی چاہتا ہے کوئی میٹھی چیز یا چٹپٹی چیز۔ بلکہ ٹھہریئے ناشتہ آ جائے تو ہیں آپ کے ساتھ ہم سب ناشتہ کریں گے۔ آیئے ریاض صاحب دیکھئے میری مریضہ کو جس پر آپ سب جیا رہنے کی تہمت رکھ رہے تھے۔ رضیہ صاحبہ یہ ہیں میرے کمپاؤنڈر ریاض صاحب ان بچارے نے بھی رات آپ کے لیے بڑی محنت کی ہے۔

ریاض: حیرت ہو رہی ہے آپ کو اس قدر جلد تندرست دیکھ کر۔

محمود: مجھے بالکل حیرت نہیں۔ مجھے تو اسی وقت رضیہ کی صحت کا یقین ہو گیا تھا جب عین مایوسی کے عالم میں آپ لوگ اچانک ویٹنگ روم میں مل گئے۔ یہ سب خدا کی طرف سے انتظام تھے۔ (آواز دے کر) ارے بھئی ناشتہ لاؤ نا۔

خالد: ہاں بھئی رضیہ اب یہ بتاؤ کہ بستر سے اٹھ کر ہم مہمانوں کی خاطر تواضع کا ارادہ کب سے ہے۔

رضیہ: میں تو ابھی بستر سے اٹھنے کو تیار ہوں اگر آپ اجازت دیں۔

محمود: بلکہ یہ تو ما رے باندھے پڑی ہوئی ہیں صبح ہی ان کا ارادہ ہوا تھا کہ بستر سے اٹھ کر حسب معمول گھرداری شروع کر دیں سے آئے ناشتہ ادھر رکھ دو۔ یہ دونوں چھوٹی میز پر ادھر لگا دو۔ ایک عجیب تماشہ ہوا ہے ڈاکٹر صاحب کہ آپکے تشریف لانے کی خبر سن کر اور رضیہ کے اتنی جلدی صحت پانے کے چرچے سے بہت مریض صبح ہی سے آپ کے لیے جمع کر دیئے ہیں۔ میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب لمبی چوڑی فیس لیتے ہیں۔

خالد: لاحول ولا قوۃ۔ فیس کا کیا سوال ہے میں آپ کا مہمان ہوں۔ ہاں بھئی رضیہ اس ناشتے میں سے کیا چیز پسند ہے سوائے اس ابلے ہوئے انڈے کے جو غالباً پورا ابلا ہوا ہوگا۔ اور باقی سب کچھ تم کو مل سکتا ہے۔ میری رائے میں تم کھاؤ۔ رس مکھن اور ایک پیالی چائے۔

رضیہ: جی ہاں ٹھیک ہے ٹوسٹ ہی کا ارادہ تھا۔

خالد: اچھا یعنی ٹوس نہیں بلکہ ٹوسٹ کہتی ہو کافی عالم فاضل معلوم ہوتی ہو۔

محمود: جی ہاں ان کا شوق ہی اور کیا ہے سوائے پڑھنے کے میٹرک کرنے کے بعد میں نے کہا بیٹی اب کیا کرو گی آگے پڑھ کر مگر ان کا نہ جانے کیا ارادہ ہے گھر سے دور لاہور میں ہوسٹل کی زندگی بسر کر تی ہیں اور پڑھ رہی ہیں۔

خالد: خوب خوب۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے اگر میرے دوستوں میں کوئی شخص ہوتا تو میں کچھ دلچسپ کہانی بنا کر آپ
کو سنا دیتا۔

محمود: مسلمان کچھ دن ہو گیا آپ کا۔

ریاض: وہاں تو روانہ ہونے والے تھے ہم لوگ جب آپ سے ویٹنگ روم میں اچانک ملاقات ہو گئی۔

محمود: تو کچھ بہت زیادہ نقصان ہو گیا حضور راستے۔

ریاض: صرف ایک بستر کے اور وہ بھی اپنا۔

خالد: اور وہ بھی اس لیے کہ گیا کہ اس پر سوئے ہوئے تھے۔ بس یہ ایک اور بستر رہا ہے۔

ریاض: جی ہاں جی ہاں گویا ہینڈ بیگ ہی۔ ورنہ بلوؤں کے سوٹ کیس۔ جس میں نقدی۔ یہ بھی تھا کچھ ضروری
کاغذات تھے گھروں کی ملکیت کے۔ سب ہی کچھ تو صاف ہو گیا۔

محمود: کوئی بات نہیں جان کا صدقہ مال ہے۔ سب کچھ مہیا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب دیکھیے آپ جتنے لوگ اس طرف
کے نہیں معلوم ہوتے۔

خالد: جی ہاں تو نہیں یہاں کا مگر اب تو مغربی پاکستان میں اطراف باقی ہی نہیں رہے۔

محمود: جی ہاں مگر میرا مطلب ہے کہ شاید ہندوستان سے تعلق رہا ہے آپ کا۔

خالد: اس اعتبار سے تو واقعی مہاجر ہوں۔ حالانکہ آج تک یہ بات مجھ میں نہیں آئی کہ اپنے گھر میں آنے والے
کو مہاجر کیوں کہا جاتا ہے۔

ریاض: شکر ہے کہ اب ایک وحدت ہے اور کوئی یہ نہیں پوچھ سکتا ہے کہ ہندوستانی ہو یا پنجابی، سندھی ہو یا
سرحدی اب تو واقعی کسی کو مہاجر کہنا یا کسی کا اپنے کو مہاجر سمجھنا بھی غلط ہے۔

محمود: بالکل غلط ہے۔ صاحب ہم سب مل جل کر ایک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں تو طے کر چکا ہوں اپنی بچی کی شادی کیے
یہ سوال ہی نہ اٹھاؤں گا کہ لڑکا کہاں کا ہے بس پاکستان کا ہونا کافی ہے۔

خالد: جی ہاں یکجہتی تو اسی صورت سے پیدا ہوگی۔ کیوں بھئی رضیہ ایک پیالی اور بنائی جائے۔

رضیہ: جی نہیں بس کافی ہے اب کھانا ہی کھاؤں گی تھوڑی دیر میں۔

خالد: صاحب آپ ذرا زحمت فرما کر ان کے لیے مرغی کے شوربے کا انتظام کریں تاکہ ان کو کھانے میں مرغ کا شوربا مل
سکے اور اگر زحمت نہ ہو تو ان مریضوں سے بھی فرما دیں جو میرے منتظر ہوں گے کہ شام کو آ جائیں تو اچھا ہے۔

محمود: بیشک بیشک میں بھی یہی چاہتا تھا کہ آپ ذرا آرام فرمائیں۔ کیوں بھئی یہ کیا لائے ہو کشتی میں۔ اچھا اچھا
نذرانہ ہوگا رکھو یہ کشتی۔ ڈاکٹر صاحب یہ نہ کوئی معاوضہ ہے نہ آپ کے احسانِ عظیم کا کوئی بدل بلکہ ایک
حقیر سی نذر ہے۔ یہ کچھ پارچہ جات یہ ایک ادنیٰ سی گھڑی اور یہ ایک حقیر سی رقم۔

خالد: یہ نوٹوں کی گڈی۔ اس کو آپ حقیر سی رقم کہہ رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ میرا فرض تھا اور جب ان

بیچ کر کوئی چیز قبول کر کے اپنے اس فرض کو کاروبار بنانا نہیں چاہتا۔

محمود : ڈاکٹر صاحب، دنیا اسی طرح چلتی ہے آپ نے مجھ کو میری کھوئی ہوئی بیٹی دلوادی ہیں آپ کا کھویا ہوا سا؟ اگر نہیں دلوا سکتا، تو حسب توفیق جو کچھ پیش کر سکتا ہوں اس سے تو انکار نہ کیجئے۔

خالد : اچھا اس کو چھوڑ دیجیے یہیں۔ فی الحال جو انتظامات میں نے کیے ہیں وہ کر دیجئے۔

محمود : بہتر ہے یہ بات بھی میں آپ سے نہیں کمپاؤنڈر صاحب سے طے کئے لیتا ہوں۔ آپ تشریف لائیے ادھر کمپاؤنڈر صاحب۔

(دونوں جاتے ہیں)

خالد : دیکھا آپ نے رضیہ بیگم آپ کے والد مجھ کو معاوضہ دے کر اس خوشی سے محروم کرنا چاہتے تھے کہ میں نے ایک مرجھانے والے پھول کو پھر سے شگفتہ کر دیا ہے۔

رضیہ : جی — پھول ؟ — اچھا گویا آپ ڈاکٹر کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔

خالد : میں شاعر ہوں یا نہیں مگر آپ سخن فہم ضرور ہیں۔

رضیہ : شکریہ۔ مگر آپ کو اس نذرانہ کے قبول کرنے سے انکار کیوں ہے۔ آپ نے مجھ کو دوبارہ زندگی دے کر میرے گھر بھر کو نئی زندگی بخشی ہے کاش ابا جان آپ کی خدمت میں وہ نذر پیش کر سکتے جو دراصل ان کو پیش کرنا چاہیئے۔

خالد : مگر مجھ سے یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں آپ کے علاج کا معاوضہ وصول کر لوں۔ میرا بہترین معاوضہ یہ ہے کہ مجھ کو اپنے تصور کے لیے ایک ایسا نقش مل گیا ہے جس کے سہارے تنہائیوں کو آباد رکھا جا سکتا ہے۔ اب میں یہاں سے تنہا نہ جاؤں گا۔

رضیہ : سوال یہ ہے کہ جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

خالد : کاش یہ سوال واقعی پیدا ہو سکتا۔

ریاض : (دور ہی سے) خالد۔ یعنی میں نے کہا ڈاکٹر صاحب ذرا بات سنیئے۔

(خالد جاتا ہے)

خالد : (قریب آتے ہوئے) کیا بات ہے۔

ریاض : ادھر آئیے۔ میں نے کہا یہ کیا حماقت ہے کہ اتنا روپیہ اور اتنے کپڑے ایسی قیمتی گھڑی اور یہ پر تکلف سامان چھوڑ رہے ہو معلوم بھی ہے ایک ہزار کے نوٹ ہیں۔

خالد : میں ایک اس سے بھی زیادہ قیمتی چیز چھوڑ کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ فوراً اسی وقت بس ہینڈ بیگ اٹھاؤ اور چل دو۔

ریاض : وحشت کیا ہے آخر۔

خالد: میں سب کچھ کر سکتا ہوں، صبر کر کے بھی نہیں سہ سکتا۔ مجھ کو ڈاکٹر سمجھا جا رہا ہے۔ وہ نہایت خطرناک طور پر میرے قریب آ رہا ہے۔ میں [illegible] نہیں کر سکتا۔

ریاض: تو پھر یہ چیز چھوڑ دو اور چلے جاؤ۔

خالد: یہی تو میں نہیں کر سکتا۔ میں اس کو چھوڑ کر تو جا سکتا ہوں مگر یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھ کو نفرت سے یاد کرے۔

ریاض: جو یہاں سے بھاگ کر تو رہے ہو [illegible] ہے کہ اب کس کس کا علاج کرو گے۔ وہاں بھی قسمت تمہارا ساتھ دے گی۔ مگر یہ چیزیں —

خالد: لعنت بھیجو ان چیزوں پر [illegible] ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں ورنہ ہم مر جائیں گے۔

ریاض: کیسے جاؤ گے تم [illegible]

خالد: مفلسی اور مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے [illegible] صرف دو نوٹ ہیں، مجھے بس کافی ہیں۔ اب جلدی کرو۔ میں چلا، تم بھی جلدی نکلو یہاں سے۔

ریاض: چل رہا ہوں، ہاتھ پیر کیوں ڈھیلے ہو رہے ہیں، چلو۔

خالد: بند کر دو یہ دروازہ

(ختم)

وہمی

ملازمہ : حکیم صاحب آئے ہیں۔ بیگم صاب!

بیگم : اچھا۔ دیکھنا! نجمہ وہ ان کی طرف نہ نکل جائیں، بلا لو یہاں، جلدی سے!

نجمہ : میں نے بیرے سے کہہ دیا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے مل کر جائیں ساجو جان کو دیکھنے — لیجئے وہ تو آ رہے ہیں اسی طرف حکیم صاحب!

حکیم صاحب : (کمرے کے باہر ہی سے آواز دے کر) میں حاضر ہو سکتا ہوں بندہ نواز!

نجمہ : تشریف لے آیئے حکیم صاحب!

حکیم صاحب : (آتے ہوئے) آداب بجا لاتا ہوں بیگم صاحبہ۔ جیتی رہو نجمہ بیٹی۔ کہیئے صاحب کیا حال ہے خان بہادر صاحب کا۔

بیگم : حال کیا ہوتا حکیم صاحب جس مرض کا آپ علاج کر رہے ہیں، سچ پوچھیئے تو اس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہ تھی۔

حکیم صاحب : یہ تو آپ نے عجیب بات فرمائی۔ میرے خیال میں تو دنیا میں کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کی دوا حق تعالیٰ نے بتوسل مولانا حاذق کے پیدا نہ کی ہو۔

بیگم : یہ تو ٹھیک ہے مگر وہم کا علاج نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں تو ان کو سوائے وہم کے کوئی بیماری نہیں ہے۔ خوراک ماشاءاللہ اچھی ہے۔ نیند خوب آتی ہے۔ وزن اللہ رکھے بڑھ ہی رہا ہے۔ بخار ان کو نہیں۔ کھانسی اللہ نہ کرے ان کو نہیں۔ درد بار کہیں درد بھی نہیں۔ پھر آخر بیماری کیا ہے۔

حکیم : بیگم صاحبہ! بعض امراض ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف مریض محسوس کر سکتا ہے۔ اور اگر عقل سے کام نہ لیا تو طبیب بھی کہہ سکتا ہے۔ لہٰذا بہت میرے نزدیک آپ کا یہ خیال درست نہیں کہ خان بہادر صاحب ہر طرح تندرست ہیں اور صرف وہم میں مبتلا ہیں۔

بیگم : تو آپ کے نزدیک ان کو شکایت کیا ہے۔

حکیم : وہی تمام شکایات جن کا اظہار خان بہادر صاحب کرتے رہتے ہیں کہ بخار نہیں ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہے، بھوک لگتی ہے مگر جتنا کھانا چاہتے ہیں نہیں کھا سکتے۔ دل جوان ہے اور خود روز بروز ضعیف ہو رہے ہیں۔

بیگم : کمال کرتے ہیں حکیم صاحب آپ بھی! میں کہتی ہوں عمر بھی آخر کوئی چیز ہے۔ آپ کے خیال میں کیا ہو گی ان کی عمر!

حکیم : بیگم صاحبہ [illegible] [illegible] ان کی طرف [illegible] خان بہادر صاحب کو [illegible] کی مشغلہ ملے گا!

بیگم : مگر آپ کا خیال ہے کہ اس طرح بھی ان کو تسکین کی شکایت نہ ہونی چاہیے۔

(خان بہادر کی آواز آتی ہے)

خان بہادر : (دور سے) اسے جمع کر لی ہے۔

نازو : کیا سرکار۔

خان بہادر : بیگم صاحبہ کو ذرا بھیج۔

نازو : بہت بہتر۔

(دیکھتے ہوئے) بیگم صاحبہ۔ سرکار یاد فرماتے ہیں۔

بیگم : اچھا چلو! میں آ رہی ہوں (حکیم صاحب سے) حکیم صاحب آپ آخر ان کا حال دیکھ رہے ہیں صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ بالکل تندرست ہیں۔

حکیم : واہ واہ آپ یہ کیا فرما رہی ہیں۔ میں ایسے لوگوں کی قیمت وصول کرنے کی وجہ سے خان بہادر صاحب کو خواہ مخواہ بیمار بناتے ہوں۔ مگر یہ غلط ہے بیگم صاحبہ وہ واقعی بیمار ہیں۔ علالت کا تعلق بعض اوقات ذہن سے ہوتا ہے۔

بیگم : تو یہ کہئے کہ ذہنی بیماری ہے۔

حکیم : ذہنی بیماری نتیجہ ہوتی ہے جسمانی علالت کا۔ ان کے عناصر میں اعتدال نہیں ہے۔ قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔

بیگم : میں غالب کا شعر پڑھنے کو نہیں کہہ رہی ہوں۔ حکیم صاحب میں ان کی صحت کے متعلق کسی قطعی نتیجے پر پہنچنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے میں نے آج اپنے بھانجے ڈاکٹر اکبر کو بھی بلایا ہے۔ دعا کرے وہ آپ کی موجودگی ہی میں آ جائیں۔ وہ کل بھی دیکھ چکے ہیں۔

حکیم : ڈاکٹر اکبر۔ وہ صاحبزادے گویا جن سے بچی کی نسبت بھی ہو رہی ہے۔

بیگم : جی ہاں وہی۔ ماشاء اللہ بڑا ہونہار ڈاکٹر ہے۔ ہزار بارہ سو کی پریکٹس تو ابھی سے ہو گئی ہے اس کی۔

حکیم : یہ درست ہے مگر شاید آپ کو معلوم نہیں کہ خان بہادر صاحب یونانی امراض میں مبتلا ہیں۔ ان امراض کو طبِ انگریزی کے علم مشکل ہی سے سمجھ سکیں گے۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔

بیگم : جی ہاں اب اسی اختیار سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ ہے۔ آپ تشریف رکھئے۔ وہ آپ کے پیچھے کچھ اور امراض تصنیف کئے بیٹھے ہوں گے۔

حکیم : بسم اللہ!

(دونوں جاتے ہیں ذرا سے وقفے کے بعد خان بہادر کی آواز قریب آنا شروع ہوتی ہے)

خان بہادر : نسخے میں صاف لکھا ہے کہ مربہ سیب دو ورق نقرہ پیچیدہ اول بخورند۔ اور جب کر چاندی کی پہلے دوا گویا جزو اول کہنہ

تھی وہ غضب ہی ہو گئی۔ خوب ہو رہی ہے تیمارداری۔ اب نہ جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔

نجمہ : غلطی تو ضرور ہو گئی مگر یہ کوئی اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے ابا جان!

خان بہادر : اے بیٹا بیمار کے لیے اتنی سی بات بہت ہوتی ہے۔ دیکھ رہی ہو میری حالت۔ گرمی میں تو ٹھنڈی ہی ماشہ ساور وہ ہوتی معجون!

نجمہ : اُن کی دوائیں تو دی جا رہی ہیں، چٹنی بھی تیار ہے۔ لعوق بھی بن گیا ہے۔

خان بہادر : ذرا دیکھنا بیٹی میرا جسم تو گرم نہیں ہے۔ آنکھیں کچھ جل سی رہی ہیں۔ نتھنے کی ہوا بھی گرم ہے۔

نجمہ : نہ کہیں ابو جان۔ جسم تو اچھا خاصہ ہے۔

خان بہادر : مگر یہ تمھاری ہتھیلیاں کیوں جل رہی ہیں۔ دکھانا ذرا۔ ہوں۔ ہوں دوسرا ہاتھ دو۔ ٹھیک ٹھیک۔ ضرور حرارت ہے۔ جسم گنگنا ہے۔ چہرہ بھی تمتمایا ہوا ہے۔ حکیم صاحب آئیں تو نبض دکھا دینا۔ آئیے حضور۔ یا د ش بخیر۔ عمر بڑی عمر ہے۔ نام لیا ہی تھا کہ تشریف لے آئے۔

حکیم : کہئے حضور مزاج مبارک۔ کیا حال رہا۔

خان بہادر : میرا حال تو بعد میں پوچھیے گا پہلے ذرا صاحبزادی کی نبض دیکھئے۔ میرے خیال میں حرارت ہے اور بخار کی آمد آمد ہے آنکھوں کا اضمحلال اور چہرے کی بھربھراہٹ ملاحظہ فرمائیے۔

حکیم : دکھانا بیٹی ذرا اپنی نبض!

بیگم : چھوڑیئے بھی حکیم صاحب اچھی خاصی ہے۔ یہ ان کو تو اپنے متعلق بھی طرح طرح کے شک گھیرے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی وہم میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

خان بہادر : کمال کرتی ہیں صاحب آپ بھی۔ یعنی میں کہہ رہا ہوں کہ لڑکی بیمار ہے اور آپ فرماتی ہیں وہم ہے۔ آخر عمر بھر کا کچھ نہ کچھ تجربہ تو ہے ہی۔ جو شخص اتنے دن سے بیمار ہو وہ خود بھی چھوٹا موٹا طبیب تو ہو ہی جاتا ہے۔ کیا رائے ہے حکیم صاحب۔

حکیم : بجا فرمایا غریب پرور۔ صاحبزادی کے چہرے پر علالت کی تمام علامتیں موجود ہیں۔ کیوں بیٹی نزلہ کی شکایت تو نہیں ہے۔ مثلاً چھینکیں، گلے میں کچھ سرسراہٹ۔

نجمہ : جی نہیں مجھے اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ ابو جان ہی کو دیکھئے۔

خان بہادر : اب ہو گی بھی کوئی شکایت تو وہ ظاہر تھوڑی کرے گی۔ ماں کی نگاہیں پہچانتی ہے۔ اس کو اپنی عاقبت تھوڑی خطرے میں ڈالنا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ یہی چھوٹی چھوٹی شکایتیں بڑھ کر مہلک امراض کی صورت اختیار کر لیں۔

حکیم : درست فرمایا غریب پرور۔ اگر ان معمولی شکایات کا ابتدا ہی میں سدِ باب ہو جایا کرے تو علالت طوالت اختیار نہ کرے۔

بیگم : حکیم صاحب آپ اس قصے کو چھوڑیئے فی الحال۔ آپ ان کا حال سنئے اور ان ہی کا معائنہ فرمائیے۔ کل ڈاکٹر اکبر نے ان کو دیکھ کر آپ کی ہر تشخیص سے اختلاف کیا ہے۔

خان بہادر : جی ہاں وہ صاحبزادے بھی عجیب اناڑی نکلے۔ میں تو سمجھا کہ اتنے دنوں تک میڈیکل کالج میں پڑھا ہے۔ دو تین سال فیل

جاریاں ہوتی ہے جو دوا بتلائیں صاحب پر بس۔ یہی بھی حاضر کر دیتا ہے۔ لہٰذا احتیاطاً ساری ہوگا۔ مگر وہ تو حضرت ہال ہی
معمول زندگی ہی بالکل بدلتے آپ کی سمجھ میں آسکتی ہے۔

بیگم : بالکل یہی بات ہے کہ ان سے نفسیاتی اثر ہی ان نہیں ملتی۔ انہیں تو رات بھر کے گئی نہیں لینے دیں۔

خان بہادر : پھر آپ کا فقرہ تو یہ ہے کہ گھنٹے پیٹ کی طرف جاتے ہیں۔ وہ آپ جانتے ہیں ہمیں اُس کی حرکت ہی آپ کے
ٹھیک طرح جب ہیں سمجھتے ہیں گئے کہ پیٹ کی طرف سے لئے جاؤ گے تو راز نہ رہے گا۔ دن میں پچھلا دن جا بجا ہے کے
جانے کہاں جاتیں۔

بیگم : جی ہاں بس وہی ہے تو ہے کہ انہیں کے نیند کے وہ جالیاں نہیں ہیں۔ ہاں مستقل رہتا ہوں۔

خان بہادر : جی حکیم صاحب! کمال دیکھئے ان صاحبزادے کا کہ میں نے ان سے کہا کہ کیا صورت ہے۔ وہ فرمانے لگے ذرا اس
قسم پر پہنچ کر گویا میں بیٹھا ہوں۔ اور وہ شیشے کا برتن ہے جس میں ہیں۔ سب کا ایک قطرہ ٹپکے گا تو ادھر گرتا ہے۔
میرے مقابلے میں چاہتا ہے میں نے ان سے کہا کہ دوا ہر وقت جاری رہتی ہے۔ ان حضرت نے ایک سفید کپڑا ان کو ایک
سیاہ پٹی باندھی۔ میرے بازو پر اور ایک چھٹانک بتانا شروع کیا۔ آخر میں کہہ دیا کہ بخار پر شربتی ٹھیک ہے۔ سرخ شربت
کی تو بازو پر پٹی باندھی اور صندوقچے کے چند روں سے نتیجہ نکال لیا۔ اس کو کہتے ہیں ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ سب سے پہلے تو
میں اپنی طرف سے کر اس کی زندگی تباہ کردوں گا۔ نالائق۔

حکیم : عجب تشخیص ہے یہ تو خوب پردہ غیر محسوس ہے۔ اس قصہ کو۔ یہ فرمائیے کہ رات کو نیند کیسی آئی؟

خان بہادر : ویسے تو میں خوب سویا مگر جو شخص رات بھر سوتے میں بیداری کے خواب دیکھے وہ کہاں ٹھیک سو سکتا ہے۔ چنانچہ
صبح جو میں بیدار ہوا تو معلوم ایسا ہوتا تھا۔ حکیم صاحب کہ گویا رات بھر سفر میں رہا ہوں۔

حکیم : وہ خستگی تو میں آپ کے چہرے پر بھی دیکھ رہا ہوں۔

بیگم : بالکل غلط مجھے تو کوئی خستگی نظر نہیں آتی۔ اچھا خاصا بشاش چہرہ ہے۔ ڈاکٹر اکبر کی رائے پر عمل کرکے اگر صبح غسل کیا ہوتا
اور ہوا خوری کو گئے ہوتے تو طبیعت اور بھی چاق ہوتی۔

خان بہادر : صاحب آپ کے ڈاکٹر اکبر کی رائے پر عمل تو میں جب کرتا اگر مجھ کو ان پر اعتقاد ہوتا۔ آپ کو کیا معلوم کہ کل میں نے
ان صاحبزادے کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے۔ میرے خیال میں تو اُس نے ڈاکٹری کوڑوں دے کر پڑھی ہے اُسے معلوم
ہی نہیں کہ کس مرض کا سر کدھر ہوتا ہے۔ اور دُم کدھر ہوتی ہے۔ بہرحال تو میں یہ عرض کر رہا تھا حکیم صاحب کہ صبح کچھ مضمحل
زیادہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناشتہ بھی حسب دلخواہ نہ کر سکا۔

بیگم : حکیم صاحب بھلے سے سنئے۔ ناشتے میں حسب معمول دلیا اور دودھ تھا۔ پھر دو تلے ہوئے انڈے۔ دو مکھن لگے توسٹ جن پر جیلی بھی
بھی خاصی مقدار میں چپڑی گئی تھی۔ اور دو چائے کی پیالیاں اور آخر ناشتہ کس کو کہتے ہیں۔

خان بہادر : ارے بھئی حکیم صاحب نے خود فرمایا ہے کہ پرندوں کا گوشت ناشتے میں کھایا جا سکتا ہے۔ بھنے ہوئے گردوں کی بھی
اجازت دی ہے۔ بہرحال تو جناب والا اس ناشتے کے بعد ہی کچھ اختلاج کی سی کیفیت محسوس ہوئی تو میں نے تھوڑے تھوڑے

ناشتے سے تین گلاس مالٹوں کے رس پیئے۔

بیگم : اور وہ چٹنیاں۔ معجونیں۔ لعوق۔ مربّے اور حریرے الگ سے استعمال کیے جو حکیم صاحب نے دوا کے طور پر بتائے تھیں۔

خان بہادر : خیر۔ خیر۔ یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات — تو میں یہ عرض کر رہا تھا حکیم صاحب کہ اب کھانے کا وقت ہوا ہے۔ مگر بھوک کا جیسے کوسوں پتہ نہیں۔ مجھے تو اب یہ شبہ ہو گیا ہے کہ میرے پیٹ میں معدہ ہے بھی یا نہیں۔ اور ہاں صاحب مجھ کو ایک عجیب شکایت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پیر سو جاتا ہے۔ یہ فالج کا مقدمہ تو نہیں ہے حکیم صاحب۔

بیگم : جب چوبیس گھنٹے پڑے رہوگے تو اور کیا ہوگا

خان بہادر : صاحب یہ عجیب مصیبت ہے جو بات میں حکیم صاحب سے کرتا ہوں جواب آپ دیتی ہیں۔ ان کو بھی تو کوئی رائے قائم کرنے دیجئے۔ یہ پیر کا سُن ہو جانا یا سو جانا معمولی بات نہیں ہے۔ مجھے تو بڑا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

حکیم : یہ بھی خطرناک بات ہے۔ میں اس کی رعایت نسخے میں کر دوں گا اور آپ بھی پرہیز میں کچھ ترک کا اضافہ کر دیجئے۔

(موٹر کار کا ہارن)

بیگم : ارے دیکھو۔ میرا خیال ہے اکبر میاں آئے ہیں۔ تم انھیں یہاں لے آؤ۔

لڑکی : بہتر بیگم صاحبہ۔

حکیم : تو میں اب اجازت چاہوں گا۔

خان بہادر : نہیں صاحب۔ آپ تشریف رکھئے۔ آنے دیجئے ان صاحبزادے کو۔ ایسے ایسے لونڈوں کو حاضری میں کون مانتا ہے۔ کہاں آپ ایسا طبیب حاذق کہاں وہ کل کا چھوکرا۔ اور میں نے کہا سن لیجئے۔ بیگم صاحبہ میری طرف اُن صاحبزادے کو توجہ نہ فرمائیے گا۔ ورنہ آج میں ان کی قلعی کھول کر رکھ دوں گا۔ آیا وہاں سے ڈاکٹر بن کر۔

بیگم : خدا کے لیے اب اُس کے منہ پر نہ کچھ کہہ بیٹھنا۔ سُن لے تو وہ بھی سمجھ لے کہ خوب قدر ہو رہی ہے ہونے والی سسرال میں۔

خان بہادر : خیر یہ تو ابھی غور طلب مسئلہ ہے۔

(دستک)

نجمہ : (دوڑتے ہوئے، دروازے کا پٹ کھولتے ہوئے) تشریف لائیے۔

اکبر : السلام علیکم۔ مزاج کے متعلق اگر کچھ فرمانا ہو تو فرما دیجئے۔

نجمہ : مجھے مزاج کے متعلق تو نہیں البتہ اور کچھ عرض کرنا ہے اور سنجیدگی سے عرض کرنا ہے۔

اکبر : بالکل ٹھیک۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان اب سنجیدہ گفتگو عام طور پر ہوا کرے۔ وہ کھلنڈرے پن کا زمانہ گیا۔ اب بقول خالہ جان کے اللہ رکھے ہم دونوں سمجھدار ہیں۔

نجمہ : میں تو خیر ہوں سمجھدار۔ مگر فریقِ ثانی کی طرف سے مجھے شبہ ہے۔

اکبر : فریقِ ثانی ! — وہ تو — وہ تو غالباً میں ہوا۔

نجمہ : غالباً نہیں بلکہ یقیناً آپ ہی ہیں اور آپ ہی کی عقلِ سلیم کی طرف سے مجھ کو شبہ ہے۔ میں یہ پوچھتی ہوں کہ جناب کو ابا جان کی

[illegible]

اکبر : [illegible]

نجمہ : [illegible]

[illegible]

[illegible]

اکبر : [illegible]

نجمہ : [illegible]

اکبر : [illegible]

نجمہ : [illegible]

اکبر : [illegible]

نجمہ : [illegible]

اکبر : [illegible]

نجمہ : [illegible]

اکبر : بس بس ہو گیا میں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔

(جانے ہی والے ہیں کہ خان بہادر صاحب کی آواز [illegible] قریب آتی ہے۔)

خان بہادر : بات جو ملازم میرے کمرے میں دودھ لے کر آیا تھا۔ اس کو چھینک آئی تھی۔ نزلے کی وجہ تو یہی ایک بیہودگی ہو سکتی ہے

حکیم : درست فرمایا غریب پرور۔ نزلہ چھینک ہی کے ذریعے پھیلتا ہے۔

اکبر : (داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض کرتا ہوں خالو جان۔ خالہ جان تسلیم۔ اور آپ کی تعریف۔

خان بہادر : یہ میرے طبیب خاص عمدۃ الملک حکیم اشرفی صاحب ہیں۔ کیا سر جو بر جو ہے اور کیا تشخیص ہے۔

اکبر : (ہاتھ ملاتے ہوئے) میرا نام اکبر ہے۔ بڑی مسرت ہوئی حکیم صاحب آپ سے مل کر۔ صاحب کل میں نے آپ کے مریض کا معائنہ کیا تھا اور چند معمولی شکایات محسوس کرنے کے بعد ہر خالو جان کو مطمئن کر دیا تھا کہ آپ کو کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔ مگر میں جو خون [illegible] ٹسٹ کرنے کے لیے لے گیا تھا اس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مریض سے بیماری چھپانا نہیں چاہئے تاکہ وہ زیادہ احتیاط برت سکے۔

خان بہادر : کیا مطلب۔ گویا آپ کے خیال میں کچھ امراض ہیں نا مجھے؟

اکبر : وہ میں ابھی عرض کرتا ہوں آپ کو دیکھ کر۔ ذرا نبض دیجئے مجھے۔ ہوں۔ ہوں۔ کبھی ایسی کوئی بات تو نہیں ہوئی کہ مثلاً آپ رات کو خوب سوئے ہی مگر صبح اس طرح اٹھے گویا سخت تھکن سی ہو۔

خان بہادر : بالکل۔ بالکل۔ وہ تو صبح آج ہی ہوا ہے۔ کیوں بھئی حکیم صاحب میں کہہ رہا تھا نا!

حکیم : جی ہاں آپ فرما رہے تھے اور مجھے بھی چہرہ پر خستگی نظر آئی تھی۔
اکبر : ٹھیک ہے میرا خیال۔ اچھا یہ بتائیے خالو جان کبھی آپ کے ہاتھ یا پیر سُن تو نہیں ہو جاتے یعنی سو تو نہیں جاتے۔
خان بہادر : ارے بھئی ہیں۔ کل بھی تکلیف بیان کر رہا تھا ابھی۔
بیگم : یہ تو آج ہی ان کو شکایات پیدا ہوئی ہے۔
خان بہادر : میرا خیال یہ ہے کہ تم اب مرض کی تہہ کو پہنچ گئے ہو۔
بیگم : کوئی خطرناک بات تو نہیں ہے اکبر میاں۔
اکبر : خالہ جان احتیاط شرط ہے انشا اللہ خالو جان بالکل تندرست ہو جائیں گے۔ ان کو دو مرض ہیں ایک کا نام ہے ضعف نیکیوپیٹا اور دوسرے کا نام ہے کانسٹیپشن نوپل۔
حکیم : بجا ارشاد ہوا غریب پرور۔ میری تشخیص بھی یہی تھی۔
خان بہادر : تشخیص تو آپ کی ضرور ہوگی۔ مگر علاج اب میں اکبر میاں ہی کا کروں گا۔ گھر کی مرغی دال برابر ضرور ہوتی ہے۔ مگر کیا سوجھ بوجھ ہے۔ یعنی پیروں کا سُن ہونا بھی گئے۔ صبح کا اضمحلال بھی گئے۔
اکبر : آپ اطمینان رکھئے۔ میں ابھی آپ کے لیے دوا منگواتا ہوں۔ خالہ جان آپ ذرا میرے ساتھ آئیے۔
حکیم : میں گویا اب اجازت چاہتا ہوں۔
خان بہادر : (بلند آواز سے) ارے بھئی حکیم صاحب کی فیس بھی بھیج دینا بیگم۔
بیگم : (دُور سے) بھیجے دیتی ہوں (آہستہ آواز میں) اکبر میاں۔ یہ ان کو آخر ہو کیا گیا ہے۔
اکبر : چپ بھی رہئے خالہ جان۔ کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ وہم کا علاج اس طرح ہوتا ہے۔ نجمہ سے جو حال سُنا تھا وہ اُن پر ظاہر کر دیا وہ معتقد بھی ہو گئے اور میری ساکھ بھی قائم ہو گئی اور رشتہ بھی گڑبڑ نہیں ہوا۔
بیگم : توبہ ہے میرا تو دم ہی نکال لیا تم نے۔ مگر تم نے ٹھیک کیا ان کا علاج یہی ہے۔ ٹھہرو میں حکیم صاحب کو فیس تو بھیج دوں۔
اکبر : بھیجئے یا نہ بھیجئے (آہستہ سے) میں نے تو اپنی فیس کھری کر لی کیوں نجمہ ؟
نجمہ : چُپ بھی رہئے گا کہ نہیں — شرم نہیں ......؟
اکبر : (بات کاٹ کر) شرم کس کی تمہاری ! اس کا بھی علاج کرنا پڑے گا مجھے — ٹھہرو ! (ہنستا ہے)

مُرقّع

(شیخ صاحب خوشی سے ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں)

شیخ صاحب: ارے صغریٰ میں نے کہا [illegible] سے جلدی کرو [illegible]

اصغر: ارے صغریٰ [illegible]

صغریٰ: ابھی کہتی ہوں ابا جان۔ یہ تار ہے آپ کے ہاتھ میں۔

شیخ صاحب: تم کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ مگر پہلے تمہاری ماں کو معلوم ہونا چاہئے۔ [illegible] تم سے بھی بھلا کوئی کام ہوا ہے۔ وہ خود آ رہی ہیں۔ [illegible] بھلا پوچھو تو سہی [illegible]۔ اچھا فرض کرو کہ یہ تار ہے تو بھلا کس کا ہے۔ اور اس میں کیا لکھا ہے۔

بیوی: کتنا اچھا موقع نکالا ہے پہیلیاں بجھانے کا۔ کہ ہاتھ میں تار ہے۔ اور کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

شیخ صاحب: پہلے مٹھائی کھلاؤ۔ پھر بتاؤں گا میں کہ میاں نجم الحسن کا تار ہے۔

بیوی: نجمی کا تار ہے۔ کیا لکھا ہے۔ خدا کے لیے کسی طرح بتا بھی چکو۔

اصغر: بہرحال ہے کوئی خوشی کی بات۔ اباجان خوش نظر آ رہے ہیں۔

شیخ صاحب: خوش تو خیر میں اس لیے نظر آ رہا ہوں۔ کہ میں تو ہوں ہی خوش مزاج میری خندہ پیشانی تو ایک دنیا مانتی ہے۔ مصیبتوں پر بھی مسکراؤں۔ آزمائشوں پر بھی ہنسوں۔ اباجان مرحوم کا جب انتقال ہوا ہے۔

بیوی: بھئی خدا کے لیے اصغر میاں تم ہی ان سے تار لے کر ذرا پڑھ لو۔

شیخ صاحب: نا۔ خبردار۔ یہ تار بغیر مٹھائی کھائے ہرگز نہ سنایا جائے گا۔

بیوی: کھلا دوں گی مٹھائی۔ کھلا دوں گی۔ خدا کے لیے اب تو بتا دو۔

شیخ صاحب: ہاں بات ہوئی نا اب۔ جناب والا۔ یہ تار ہے نجم الحسن کا۔ اس کی شادی ۲۵ کو ہو رہی ہے۔

بیوی: مجھے بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کہ بس ایک دم سے تار آ جائے گا کسی نہ کسی دن۔

شیخ صاحب: دھڑکا لگا ہوا تھا۔ یعنی۔ بھئی دھڑکا کیسا؟ بھائی کی شادی کی خوشی ہوئی ہے یا دھڑکا ہوتا ہے اتنی بڑی خوشخبری سنائی اور وہ کہتی ہیں دھڑکا لگا ہوا تھا صاحب یہ بیری شادی کا تار نہیں ہے جس کا آپ کو دھڑکا ہو سکتا ہے یہ آپ کے حقیقی برادرِ عزیز کی شادی کا مژدہ ہے۔

بیوی: مژدہ تو ہے مگر میرے تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ اب اتنی جلدی میں کیسے سارا انتظام کروں گی۔

شیخ صاحب: عجب حیرت انگیز واقع ہوئی ہیں آپ بھی۔ انتظام سے تم کو کیا مطلب۔ انتظام تو ان لوگوں نے خود کیا ہوگا ہم کو تو صرف شرکت کرنا ہے۔

بیوی: اسی شرکت ہی کے انتظام کو کہہ رہی ہوں۔ کچھ نہیں کچھ نہیں پھر بھی پانچ سو روپیہ سے کم کا خرچ نہیں ہے

شیخ صاحب: پانچ۔۔۔سو۔۔۔روپے تو کیا تمہارا خیال ہے کہ یہ دراصل ہم دونوں کی شادی ہے۔ ایک روپیہ دس آنے ہے ریل کا ٹکٹ۔ تم ہو۔ میں ہوں۔ اور چار پانچ بچے ہیں۔ اس کے لیے پانچ سو روپے آخر کس حساب سے جوڑ لیے۔

بیوی: بس لنگوٹیاں باندھ کر سب ریل پر بیٹھ جائیں۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ تجمل کی دلہن تمھاری کون ہے۔

شیخ صاحب: کون نفیسہ۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور میری۔

بیوی: وہ خالہ زاد بہن ہے تمھاری۔ لہذا ہمیں اُسے بھی جوڑا دینا ہے۔ تجمل میرا بھائی ہے لہذا اُس کی دلہن کو منہ دکھائی میں ہاتھ گلے کی کوئی چیز تو دی جائے۔ پھر تجمل کی سلام کرائی۔ ڈومنیوں کو دینے کے لیے بھاوراور شادی کے پچاس خرچ ہوتے ہیں۔ پھر کسی بچے کے پاس ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں دو دو جوڑے تو نئے ہوں سب کے۔ پھر بجمہ کی سینڈل آئے گی ——— الطاف کے پاس ٹوپی نہیں ہے۔ نیاز کے پاس بھی جوتا نہیں ہے۔

اصغر: ذرا اس جوتے کو بھی دیکھ لیجئے۔ جو دانت نکالے اس شادی کی خوشی میں ہنس رہا ہے۔

شیخ صاحب: قصہ مختصر یہ کہ شادی میں جانا تقریباً ناممکن۔

بیوی: لو اور سنو۔ جائیں گے کیسے نہیں۔ میرے کوئی دس پانچ بھائی نہیں ہیں۔ کہ میں تجمل کی شادی میں نہ جاؤں۔

شیخ صاحب: اچھا بھئی تو جاؤ۔ خدا مبارک کرے جانا۔ مگر یہ پانچ سو روپے کہاں سے آئیں گے۔

بیوی: جہاں سے بھی آئیں۔ کرو نا کچھ انتظام۔ وہ تو کہو دلہن کو منہ دکھائی میں دینے کے لیے میں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر کلائی کی گھڑی خرید رکھی تھی۔ نہیں تو دو ڈھائی سو روپے یہ بھی جا رہے تھے۔

شیخ صاحب: بھئی صاف بات یہ ہے۔ کہ اب تو پانچ سو روپے خود میری بھی قیمت نہیں رہی ہے۔ کہ میں اپنے کو نیلام پر چڑھا دوں۔

اصغر: مگر ابا جان شادی میں جانا تو بہر حال ہے ہی۔

شیخ صاحب: تو یہ بھی ہے ہی کہ میں کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ کہیں ڈاکہ ڈالوں۔

بیوی: تمھارا مطلب یہ ہے کہ اپنے بھائی کی شادی میں بھی میں شرکت نہ کروں۔ اور کیا تم یہ چاہتے ہو کہ بھائی

کی شادی میں بھی جا [illegible] بچا جاؤں۔ [illegible] بیوی [illegible]

شیخ صاحب: [illegible] اس طرح کے [illegible] روپے کا انتظام تو یہاں سے ہو [illegible] مجھے تو [illegible]

قرض بھی دے دے گا۔

بیوی: [illegible] حمیدہ کی شادی پر تو [illegible] بھی تو [illegible] بھائی کی شادی ہے۔

شیخ صاحب: بھئی میں کب کہتا ہوں [illegible] حمیدہ [illegible] لڑکی [illegible] شروع کر [illegible]

حمیدہ کی شادی کے اخراجات [illegible] اٹھائے [illegible] حالانکہ ان کو [illegible]

فرض بھی تھا۔ جانتا تھا [illegible] فرض بھی تھا۔

بیوی: [illegible] اس وقت خوب قرض لیا تھا [illegible]

[illegible]

[illegible]

شیخ صاحب: اگر وہ قرض ادا ہو گیا ہوتا تو [illegible] آج بھی قرض مل جاتا۔ [illegible]

مہینے کا قرض۔

بیوی: اچھا! [illegible] نہیں جاتی میں [illegible] تمہاری بہن مر چکی ہے بھائی کی ساری [illegible]

سدھار گئی۔ اس دنیا سے۔

شیخ صاحب: لیجئے رونا شروع ہو گیا [illegible] خدا کے لیے بس میرا مطلب یہ کہ میں [illegible]

چھیڑ رہا تھا۔ قرض کیسے نہ دیں گے لوگ مجھے۔ بخدا [illegible] تماشائے کر دوں۔ جو قرض دینے سے انکار کرے۔

ابھی ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنا کس بل ہے کہ قرض دینے سے انکار کرے کی ہمت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ لو اب

تو پونچھ ڈالو یہ آنسو۔ بخدا جب تم روتی ہو تو مجھے اپنی زندگی پر طرح طرح کے شک گزرنے لگتے ہیں۔ بس جا رہا

ہوں۔ روپیہ کا انتظام کرنے۔

بیوی: کچھ روپیہ زیادہ ہی لینا خود تمہارے پاس بھی کپڑے نہیں ہیں۔

شیخ صاحب: ہاں ہاں۔ زیادہ سے زیادہ لو۔ قرض ہی تو لینا ہے کونسی اپنی کمائی کا خرچ ہے۔ بہرحال تم چلنے کی

تیاری کرو۔

صفدر: میرا جوتا نہ بھولیے گا۔ ورنہ میں ہرگز نہ جاؤں گا۔

شیخ صاحب: نہیں صاحب نہیں۔ میں کچھ نہ بھولوں گا (زیر لب بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے) کاش آپ لوگ مجھ کو بھول سکتے

میرا کیا ہے۔ انشاء اللہ اتنا قرض چھوڑ کے مروں گا کہ طبیعت صاف ہو جائے۔ میرے پسماندگان کی۔ قرض

مانگتے مانگتے بدھیا بیٹھ جائے۔

(بڑے میاں کی آواز فیڈ آؤٹ۔ ٹرین کی آواز فیڈ ان ہوتی ہے

(اس ٹرین میں جھگڑا ہو رہا ہے)

ایک مسافر: جی نہیں۔ یہ ے باپ کی تو ریل گاڑی ہے نہیں۔ مگر جناب کے والد محترم کی بھی نہیں ہے۔ آپ کو اٹھ کر اٹھنا ہوگا۔

دوسرا مسافر: خواہ مخواہ بھی اٹھنا ہوگا۔ میں نے پہلے سیٹ تو بیچ میں بیٹھ جاؤں نا۔

ایک مسافر: ایسا ہی تو میں تمہارے پیچھے پیدا ہوا ہوں کہ تمہارے قدموں میں بیٹھ جاؤں۔

دوسرا مسافر. کتنی مرتبہ میں تم سے کہوں کہ مجھے بیٹھنے کا شوق نہیں ہے۔ بیمار ہوں

شیخ صاحب: ارے بھئی یہ کا ہے کا جھگڑا ہے۔ صفر بہاں تم کھڑے ہو ہو۔ ان کو جگہ دے دو مگر کچھ پتہ تو چلے کہ آخر بات کیا ہے۔

ایک مسافر: صاحب اصل قصہ یہ ہے کہ۔

دوسرا: جی نہیں اصل قصہ وہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ۔

ایک مسافر: آپ مجھ سے سنیئے۔

دوسرا: ان سے نہیں مجھ سے سنیئے۔

شیخ صاحب: میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں سے کچھ نہ سنوں بلکہ آپ دونوں مجھ سے سنیں۔ آپ کو شکایت ہے کہ لیٹے ہیں۔ یہی نا۔

ایک مسافر: جی ہاں، معلوم ہوتا ہے کہ جناب کا دولت خانہ ہے۔

شیخ صاحب: بہرحال، اور آپ کو شکایت یہ ہے کہ اگر آپ لیٹے ہیں تو یہ اٹھا کیوں رہے ہیں۔

دوسرا: نہیں صاحب۔ میں بیمار ہوں اس لیے لیٹا ہوں۔

شیخ صاحب: کیا تکلیف ہے آپ کو۔ ذرا دکھایئے نبض اپنی۔ بخار تو نہیں۔ ہے البتہ تخیری کیفیت ضرور ہے۔ ذرا زبان تو نکالیئے۔

دوسرا: (زبان نکال کر) آ آ آ۔

شیخ صاحب: کس کا علاج کر رہے ہیں آپ اور کیا مرض تجویز کیا ہے آپ کے معالج نے۔

دوسرا: میں حکیم ابو الشفا کے زیرِ علاج ہوں ان کا خیال ہے کہ مجھے ہڈیوں کا بخار ہے۔

شیخ صاحب: غلط۔ اور جب تشخیص ہی غلط ہے تو علاج یقیناً غلط ہوگا۔ آپ کو دراصل تپ۔

پہلا: (گھبرا کر) دق؟ تپ دق؟ آپ نے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ آپ آرام سے لیٹئے۔ میں اگلے سٹیشن پر اتر جاؤنگا۔ باپ رے باپ، تپ دق۔

شیخ صاحب: نہیں صاحب تپِ دق نہیں ہے بلکہ تپ محرقہ ہے اور اس کا علاج حکیم شیخ ابو البرکات ہی کر سکتا ہے۔

دوسرا: حکیم شیخ ابو البرکات؟ یہ کون بزرگ ہیں۔

شیخ صاحب: اب میں اپنی زبان سے کیا عرض کروں۔ بہرحال اگر آپ سنبھل سے اپنا علاج کرانا چاہتے ہیں اور
اس مرض سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مجھ سے خدمت لیجیے گا۔

دوسرا: جناب کا اسم مبارک؟

شیخ صاحب: اس خاکسار کو حکیم شیخ ابرار برکات کہتے ہیں۔

دوسرا: یعنی آپ خود ہی، گویا حکیم بھی شیخ، مطب بھی ابرار برکات ہیں۔

(گاڑی اسٹیشن پہ رکی ہے۔ قہقہوں کا اور اسٹیشن کا ہنگامہ
فیڈ ان ہوتا ہے۔ یہ شور رفتہ رفتہ فیڈ آؤٹ ہو کر موٹر کے
چلنے کی آواز فیڈ ان ہوتی ہے اور پھر شہنائی کی آواز میں گم
ہو جاتی ہے۔ شہنائی کی آواز فیڈ آؤٹ ہوتی ہے اور ڈھولک
کی آواز میں شباب آجاتا ہے۔ لڑکیاں ڈھولک پر
گا رہی ہیں)

گوری تیری گھونگھٹ میں چندا بڑا ہے
گوری ترے مکھڑے پہ تارا سا ہے

بیوی: ہائے ٹوٹے، تو یہ ہے تم سے بھی لڑکیو، بس اب یہ گانا بجانا بند کرو گی۔ ڈولی اور کار میں ہے برات آنے ہی
والی ہے۔

ایک لڑکی: ہم تو اسی وقت سے برات آئی ہوئی سمجھ رہے ہیں جب سے آپ آگئی ہیں۔

بیوی: ان کا ہی آنا تو چاہیے تھا مجھے سمدھن ہی بن کر برات کے ساتھ مگر انھوں نے یہی کہا کہ میں تو ان کا برات کے
ساتھ تم شریک کرو لڑکی والوں کی طرف سے گھر کی گھر میں شادی ہو تو یہی کچھ ہوتا ہے۔

دوسری لڑکی: مگر اب ایسا بھی نہیں ہوتا کہ سگی نند بھی سمدھن بن کر نہ آئے۔

بیوی: اے تو یہ بھی تو میری صرف بھاوج نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے کی اس کی بھاوج ہوں تو یہ ہے لڑکیو مجھے بھی
باتوں میں لگا لیا اور برات اب پہنچنے ہی والی ہے۔ میں نے کہا بس یہی جہیز ہے۔

ایک لڑکی: جو کچھ تھا وہ رکھ تو دیا ہے سامنے۔

دوسری: رکھ تو دیا ہے مگر ان کی نظر میں کیوں آئے گا۔ مگر وہ بھی مجبور ہوں ان کا رشتہ ہی ہے نام دھرنے کا۔

ایک لڑکی: شادی لڑکی کے لیے نگوڑی کہتے ہیں۔ جہیز کے لیے کرتے ہیں۔

بیوی: بس صاحبزادی بس۔ بہت ہولی۔ لا دو ستر بات پوچھ کر میں گنہگار ہو گئی۔ میں نے تو یہ پوچھا کہ سب
جہیز رکھ دی ہیں یا کچھ رہ گیا ہے۔ مگر تم تو جیسے بہانہ ہی ڈھونڈھ رہی تھیں لڑنے کا۔

دلھن کی ماں: کیا بات کیا ہے، دلھن بیگم کس پر خفا ہو رہی ہو۔

ایک لڑکی : آٹا چور کروا لی کر ڈانٹ رہا ہے جہیز پر اعتراض کر رہی تھیں کہ بس اتنا ہی ہے۔
دلہن کی ماں : عزا اس دنسہ ہوا ہماری غریبی کا مذاق اڑانا ہوگیا مگر میں تو یہ پوچھتی ہوں بلاؤ تم جہیز میں کونسے گھوڑے لائی تھیں
بیوی : یہ ہے نہ ہی سہی۔ جب نہیں کہا تھا تو اب کہتی ہوں کہ اس سے زیادہ جہیز تو اللہ میری توبہ ہے میرے باورچی کی بہو میں سے آئی تھی۔
دلہن کی ماں : اے ہے دیکھے ہیں۔ جو نے تمہارے باورچی ہیں وہی باورچی نا جو چھ مہینے کی تنخواہ کے بیے آٹا تھا پر بکسر روتا ہوا چلا گیا
بیوی : خیر میں تمہارے منہ تو لگتی نہیں مجھے خوب معلوم ہے کہ تمہارے ہی بہکائے ہیں آکر وہ موا نکل گیا پھر سے یہاں
ایک لڑکی : خیر ان جھگڑوں کا یہ کونسا موقع ہے۔
بیوی : او جیجیں مجھے کہ تم دلہن والوں کی طرف سے شرکت کرو۔ یہ ہیں کہاں۔ ذرا بلواؤں تو سہی میں ان کو۔
دوسری لڑکی : چھوڑئیے بھی ان باتوں کو۔ جو سنے گا وہ بھی کیا کہے گا۔ مہمان سے گھر بھرا ہوا ہے۔
بیوی : گھر بھرا ہوا ہے تو سب ہی دیکھ لیں گے یہ تماشہ میں تو اب ایک منٹ کے لیے بھی نہ ٹھہروں۔ اس گھر میں (آواز دے کر) اے میں نے کہا: لطاف او الطاف کے بچے ذرا دیکھ تیرے اباجان کہاں ہیں۔ ڈیوڑھی میں بلا ذرا ان کو۔
الطاف : (جاتے ہوئے) ابھی لاتا ہوں۔ ابھی لایا۔

(اس کے ساتھ ہی منظر باہر کا قریب آجاتا ہے)

شیخ صاحب : نہ نہ نہ۔ میری بات سنیئے۔
الطاف : اباجان۔ امی جان بلاتی ہیں۔
شیخ صاحب : خیر بلاتی ہوں گی۔ چپ رہ ذرا۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ مہر در اصل لڑنے کی چیز ہے ہی نہیں۔ اب مثلاً میرا مہر بندھا تھا سوا لاکھ روپیہ دینار سرخ، پاؤ بھر چڑیا کا دودھ۔ آدھ سیر گولر کے پھول۔
نظام : جی کیا فرمایا۔ چڑیا کا دودھ۔ گولر کے پھول۔
شیخ صاحب : جی ہاں جناب عرض تو کر رہا ہوں کہ چڑیا کا دودھ گولر کا پھول۔ مقصد یہ تھا کہ نہ چڑیا کا دودھ ملے گا نہ طلاق ممکن ہوگا نہ گولر کے پھول دستیاب ہوں گے نہ فارغ خطی کی نوبت آئے گی تو جناب والا اکیس ہزار سکہ رائج الوقت تو گویا کچھ بھی نہ ہوا۔ میرے خیال میں ٹھیک ہے، حساب دوستاں در دل کے معاملات میں سے ہیں یہ باتیں۔
نظام : جی نہیں یہ غلط ہے شرعی نقطۂ نظر سے نیت ہونا چاہیے ادائیگی مہر کی۔
شیخ صاحب : درست ہے مگر میں جو کہہ رہا ہوں وہ بھی درست ہے چلئے میں ہوا وکیل اور دوسرے سہرا پڑھے.

کی آواز آتی ہے ارے بھئی یہ کیا ہو رہا ہے۔

ناظم: مجلس کا کون دوست ہے پڑھ رہا ہے۔

شیخ صاحب: ارے بھئی سہرا [illegible] سہرا [illegible] پڑھا جا [illegible]

(پڑھنے والے کی آواز)

[illegible]

متعدد لوگ: سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ دوبارہ ارشاد ہو

شاعر: تسلیمات عرض ہے۔ عرض ہے۔

[illegible]
[illegible]

شیخ صاحب: خوب خوب ماشاء اللہ [illegible]

(واہ وا اور شور)

شاعر: آداب عرض کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو

ہر عضو پہ ہے [illegible] یہ [illegible]
[illegible] باندھا [illegible] کا سہرا

(واہ وا کا ہنگامہ)

شیخ صاحب: ارے بھئی میری بات تو سنو۔ سبحان اللہ کیا صاحبزادے۔

شاعر: حسن سماعت ہے آپ کا عرض ہے

تو حسن کا ہے گاہک صورت تو دیکھ اپنی
اس چاند کے لیے ہے تجھ سے گہن کا سہرا

(لوگوں کے قہقہے اور داد)

شیخ صاحب: استغفر اللہ۔ اپنی کہے جاتے ہو میری نہیں سنتے۔

شاعر: میں کس قابل ہوں حوصلہ بڑھاتے ہیں آپ سماعت فرمائیے۔

ہے جانگلوش دولہا جنگل کا رہنے والا
گلشن کا کیا کرو گے منگواؤ بن کا سہرا

(لوگوں کے قہقہے اور داد)

شیخ صاحب: میں کہتا ہوں میری بات سنو۔

شاعر: قدر افزائی ہے آپ کی پیش کرتا ہوں۔

سہرے کے بنائیں اور کیوں بنائیں آخر
کس چال ڈھال کا ہے اور کس چلن کا سہرا
(داد کا شور)

شیخ صاحب : ارے جی حضرت مسٹر۔ کمال کر دیا تم نے بھی سارا سہرا پڑھ گئے اور میری ایک بات نہ سنی حالانکہ سہرا نکاح کے بعد پڑھا جاتا ہے۔

نظام : بہرحال اب تو پڑھ ہی دیا گیا۔ اب نکاح کی جلدی ہونا چاہیے بہرحال۔ طے ہے کہ مہر گیارہ سو سے زیادہ نہ ہوگا۔

شیخ صاحب : پھر وہی۔ اگر بزرگ سمجھ کر مجھ کو بلایا ہے تو میری بات مانو ورنہ مجھ سے کوئی اپنا راستہ لوں جو بات ہے وہ اوندھی، باوا آدم ہی نرالا ہے یہاں کا چار شادیاں، یہی بھی ہوئیں سو شادیاں دوسروں کی دیکھیں مگر یہ اندھیر کہیں نظر نہ آیا۔

نظام : بہرحال یہ طے ہے قبلہ وکعبہ کہ مہر گیارہ سو۔

شیخ صاحب : تو یہ بھی طے ہے کہ میں نہیں بندھا دکیل۔

نظام : اس کا آپ کو اختیار ہے۔

شیخ صاحب : تو اس کا بھی اختیار ہے کہ میں واپس چلا جاؤں۔ اب منہ کیا دیکھ رہا ہے الطاف میرا جا کر اپنی ماں سے کہدے کہ بھر پایا میں نے میں جا رہا ہوں واپس۔

الطاف : وہ اسی لیے تو بلا رہی ہیں کہ وہ بھی واپس جا رہی ہیں۔

شیخ صاحب : بیشک جانا چاہیئے واپس کم سے کم اتنا تو خیال ہونا ہی چاہیئے میاں بیوی کو۔ جاکر بلاؤ ان کو۔

نظام : قبلہ میری بات سن لیجئے۔

شیخ صاحب : جی کچھ نہیں بس ہو چکی بات ختم۔ ۲ ۔ بس اب خانہ آباد و دولت زیادہ۔

الطاف : امی جان تانگہ پہ بیٹھ چکی ہیں۔

شیخ صاحب : بیٹھ چکنا چاہیئے تھا ان کو چلو تم سب بھی، صفدر کہاں ہے نیاز۔ مجمہ سب آگئے نا۔ بس ٹھیک ہے چلو۔

صفدر : آپ چل تو رہے ہیں گھر ـــــــــ

شیخ صاحب : اگر مگر کچھ نہیں قرض کے بارے میں بچے اور آن بھی قائم رہی یعنی وہ کیا ہے مصرعہ کہ جنت کی جنت لوور رند کے رند، خیر ہوگا کچھ مصرعہ گھر چل کر کہیں گے کہ ۲ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

(تانگہ چلنے کی آواز قریب سے دور جا کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

آم اور جامن

(تیز ہوا کے مسلسل جھونکے۔ درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ۔ پرندوں کی چہچہاہٹ
کے بعد جامن کی آواز آتی ہے)

جامن: آم ... میرے بھائی آم کیا سو گئے؟

آم: ارے نہیں! نہیں تو جامن۔ بھلا یہ سونے کا وقت ہے۔ میں تو ابھی ایک ڈال پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کی جوڑی کے راز و نیاز سن رہا تھا

جامن: اور میں نے تم کو اس لیے آواز دی تھی کہ میری ایک بہت اونچی شاخ پر طوطوں کی ایک جوڑی عجیب طرح کی باتیں کر رہی تھی۔

آم: عجیب طرح کی باتیں! وہ کیا؟

جامن: وہی انسان کا دکھڑا۔ وہی اشرف المخلوقات کا رونا۔

آم: بڑی بھولی ہو تم بھی جامن۔ انسان کی باتوں کو تم عجیب و غریب کہتی ہو۔ حالانکہ روز دیکھتی ہو کہ انسان اس کثرت سے عجیب باتیں کرتا ہے کہ اب میرے نزدیک تو اس کی کوئی بات عجیب نہیں رہی ہے۔ وہ یقیناً اپنے کو اشرف المخلوقات کہتا ہے مگر میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ عجیب المخلوقات ہے۔ بہرحال وہ کیا باتیں تھیں۔

جامن: طوطوں کا جوڑا اپنے کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کی داستان ایک دوسرے کو سنا رہا تھا۔ جس کو اس اشرف المخلوقات نے گرفتار کر لیا ہے۔ طوطا کہہ رہا تھا کہ اس بیچارے کو ایک خوبصورت سے پنجرے میں پر کاٹ کر بند کر دیا ہے۔ اور اس کو پنجرے میں اس کو کھانے کے لیے چنے کی بھیگی ہوئی دال۔ کچھ پھل۔ کچھ ترکاریاں اور جانے کیا کیا دیا جاتا ہے۔

آم: اور وہ انسان یہ سمجھتا ہوگا کہ جس طرح وہ خود پیٹ کا غلام ہے اسی طرح یہ طوطا بھی۔ اس پنجرے میں کھانے پینے کی یہ چیزیں پا کر خوش ہوگا۔

جامن: اسی پر تو مجھ کو بھی تعجب ہے کہ اتنی بے ہودہ بات سوچنے والا اپنے کو اشرف المخلوقات کیوں کہتا ہے۔

آم: وہ خود کہتا ہے نا، خود ہی کہتا ہے۔ اور خود ہی سن کر خوش ہو لیتا ہے اور ہنستا ہے۔ طوطوں پر کیا یہ اپنے کو میاں مٹھو کہلوانے کے عادی ہیں۔ مگر جامن مجھ کو طوطوں کی یہ بات سن کر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ مجھ کو تو انسان سے ہر قسم کی بیہودگی کی امید ہے

(دُور سے کچھ لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز قریب آتی ہے)

جامن : چپ رہو آم۔ وہ دیکھو سامنے کچھ لڑکیاں ایک موٹی سی رسی لیے اسی طرف آ رہی ہیں۔

آم : خدا خیر کرے۔ ان کے ارادے مجھے اپنے حق میں کچھ نیک نظر نہیں آتے۔

(لڑکیاں ہنستی ہوئی قریب آتی ہیں)

ایک لڑکی : اری دیکھو تو سہی تارا۔ یہ درخت ٹھیک رہے گا جھولے کے لیے۔

دوسری : بس ٹھیک ہے۔ اس کی اُس موٹی سی ڈال میں جھولا ڈال دو

ایک لڑکی : بھیا کو چڑھا دو درخت پر۔ وہی جھولا ڈالیں گے۔

لڑکا : لاؤ رسی ادھر لاؤ۔ میں ابھی ڈالے دیتا ہوں جھولا۔ تم جب تک پٹڑا اٹھا لاؤ۔

دوسری : ابھی لیجئے، یار چل جلدی سے۔

ایک لڑکی : ٹھہر تو سہی پٹڑا وہ لا رہی ہیں نجمہ اور سلمیٰ۔

لڑکا : ذرا دور سے۔ لو دیکھو ٹھیک ہے نا جھولا۔

ایک لڑکی : بس ٹھیک ہے۔ آؤ نجمہ اس رسی میں ادھر سے تم ڈالو، پٹڑہ اُدھر سے تارا اور سلمیٰ ڈالیں گی۔

دوسری : بس ٹھیک ہے۔ اب آؤ بیٹھو۔ میں اور سلمیٰ پینگ دیں پھر تمھاری باری آئے گی تارا۔

ایک لڑکی : چلو یہی سہی۔ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی ساز چھیڑ دیں۔

(جھولے کا کورس گانا)

(گانے کے بعد لڑکیاں ہنستی ہوئی فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہیں)

(سناٹا۔ ہوا کا شور۔ پرندوں کی چہچہاہٹ پر آم کے کراہنے کی آواز.....)

آم : (کراہتا ہے) آہ۔ اُف۔ ہائے۔ آہ۔

جامن : آم کیا بات ہے۔ کیسی طبیعت ہے۔

آم : سخت درد ہے میری اُس ڈال میں جس پر ابھی جھولے کی مصیبت آئی تھی۔

جامن : مجھے بڑا ترس آ رہا تھا تم پر، جب تمھاری وہ ڈال مسلسل چرچرا رہی تھی۔

آم : میں تو سمجھتا تھا کہ آج میری یہ ہری بھری ڈال ٹوٹ جائے گی۔ اتنا بوجھ۔ ایسے ہچکولے۔ جان نکل کر رہ گئی میری تو۔

جامن : مگر آم تم نے یہ بھی غور کیا کہ یہ گانا تھا انسان کا۔

آم : جی ہاں یہ حق کی ٹھیکہ دار مخلوق گانا بھی اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے گاتی ہے یعنی گاتی اتنا نہیں ہے جتنا سناتی ہے۔

جامن : ہم تو اپنی موسیقی صرف اپنے لیے سمجھتے ہیں۔

آم : موسیقی ہوتی ہی صرف اپنے لیے ہے کہ اس کو خود محسوس کیا جائے، خود اُس پر وجد کیا جائے، خود اس کا لطف لیا جائے۔ یہ تو غذائے روح ہے۔ اور غذا کے سلسلہ میں میری سمجھ میں تو آتی نہیں، یہ ترکیب کہ کھائے کوئی اور پیٹ کسی کا بھرے۔

جامن : یہی وجہ ہے کہ ان کی موسیقی کا کوئی بھی ایک سماں اور کوئی خاص کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

آم : مگر سب جانتے ہیں جو مشرقی دھن ہوتی ہو۔ وہ تو موسیقی کو ایک معاون چیز سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری موسیقی ہمارے اندر ہے اور ہم اس کو کسی قیمت پر باہر نہیں لا سکتے۔

جامن : ہم تو اگر اپنی موسیقی کو باہر لا کر کسی صورت سے ادا کریں تو ہماری موسیقی ختم ہو جائے۔

آم : بات یہ ہے کہ ہمارے تو خون میں سے بیشتر موسیقی ہی ہے۔ اگر وہ مغربیوں کی طرح ہم ایک سمندر سے نمک بنانے لگیں تو ہماری زندگی ہی کے حصے بڑھ جائیں۔ مگر تو ہم کو اپنا ایک ذاتی وجدان رکھتے ہیں۔ سمندر کی چیز نہیں جانتے۔ مگر انسان میں اتنا ظرف کہاں کہ وہ اپنی موسیقی کو سمیٹ کرے۔

جامن : مگر پھر بھی تو تعجب ہے کہ تم بھی موسیقی کی بات کر رہے ہو جو سب سے ۔ آج سے وہ موسیقی ہوتی بھی ہے یا نہیں۔

آم : میں سمجھ گیا تمہارے مقصد سے نفرت نہیں کرتا بلکہ اپنی غلط فہمی کا اظہار کر رہا ہوں۔ کیا میں خود نہیں جانتا کہ وہ موسیقی جو ہمیں سب سے پیارا کرے وہ مرتے دم تک سنبھالی جائے۔ وہ موسیقی جو دوسرے سے حاصل کر کے اپنے اوپر طاری کی جائے، موسیقی تو خیر کیا ہوتی کوئی کام دینا بھی مشکل معلوم ہوتی ہے۔

جامن : اور تم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ انسان کو اپنی موسیقی کے لیے سازوں کا کس طرح محتاج ہونا پڑتا ہے

آم : مغرب طرح اپنی مردہ موسیقی میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بیچارے کوئی پچھلے ان سازوں سے دلگا بھی کوئی گانے یا سننے سنانے کی چیز ہے۔ اس کو تو بس ہماری طرح محسوس کرنا چاہیے اور اس کے لطف کو اپنے اوپر طاری کر کے خود سراپا نغمہ بن جانا چاہیے۔ ہم تو خود ہی اپنا نغمہ ہیں۔ خود ہی اپنا ساز ہیں۔ خود ہی سب سے مغنی ہیں اور خود ہی اپنے سامع۔

جامن : تو پھر آخر ان کی موسیقی کو تم کیا کہو گے۔

آم : کچھ ہو رہا ہے اشرف المخلوقات کا۔ اور چاہے اس کا جو اپنے کو انسان کہتا ہے۔

جامن : دیکھنا سامنے والے بنگلے سے وہ دونوں پھر اسی طرف آرہے ہیں جو روز آیا کرتے ہیں۔

آم : اور پھر وہی باتیں دہرائیں گے، جو روز دہرایا کرتے ہیں۔ کل میری ڈال پر بیٹھے ہوئے ایک اُلو کی نیند ان دونوں کی باتوں سے اُچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ رات جاگنے کے بعد اپنی مادہ سے ہنس ہنس کر ان دونوں کی بیوقوفی کا ذکر کر رہا تھا۔

جامن : چپ رہو وہ قریب آگئے ہیں۔

(ہوا کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ)

خالد : محبت نہ کرتے بڑا کام کرتے۔

طلعت : محبت سے لیکن بڑا کام کیا تھا۔

خالد : مگر طلعت، تم خود ہی انصاف کرو۔ کہ زندگی کو کب تک اس شیریں خواب کے سپرد کر کے ہم یوں ہی دوریاں سہتے رہیں گے۔

طلعت : ابھی سے گھبرا گئے خالد۔

خالد : تم اضطراب کو گھبراہٹ کہتی ہو۔

طلعت : میں نے تو اضطراب کے یہی معنی پڑھے ہیں۔

خالد : میں کتابی دنیا کی باتیں نہیں کر رہا ہوں، محبت کی اصطلاحیں کتابوں میں نہیں ملتیں۔ تم جس کو ھیر جانتی ہو وہ میرے دل [illegible] ہیں۔ خود میرے لیے تو صرف اتنا ہی کافی ہے کہ تم مجھ کو اپنی وفا کا یقین دلا چکی ہو۔

طلعت : مگر آپ کے دلِ ناصبور کو یقین نہیں آتا۔ یہی نا!

خالد : اس کو بھی یقین ہے۔ مگر صرف یہ یقین ہی تو ہماری آخری منزل نہیں۔

طلعت : وہ آخری منزل کونسی ہے۔ کیا میں معلوم کر سکتی ہوں۔

خالد : جہاں امید و بیم کی جنگ نہ ہو۔ جہاں شک اور یقین کی کشمکش نہ ہو۔ جہاں مجھ کو تمہارے والد کے انکار اور تمہاری مجبوری کا دھڑکا نہ ہو۔ جہاں مجھے مسعود سے تمہاری منگنی کا دھڑکا نہ ہو۔

طلعت : خالد۔ میں نے تم سے پچاس مرتبہ کہا ہے کہ مسعود کا نام میرے سامنے نہ لیا کرو۔ میں اس کا نام برداشت نہیں کر سکتی۔

خالد : تم سے زیادہ یہ نام میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ مگر میں کیا کروں کہ اس کے امکان روز بروز قوی سے قوی تر ہوتے جا رہے ہیں۔

طلعت : مگر آخر میں اُسے ناکام ہونا پڑے گا۔ اس لیے کہ مجھے تم سے ۔

خالد : ہاں ہاں مجھ سے کیا؟ کہہ دو طلعت۔ خدا کے لیے اپنی زبان کو آزاد چھوڑ دو۔ طلعت میں وہی بات سننا چاہتا ہوں۔ جو تم سنانے سے کترا رہی ہو۔ جو تم نہیں کہنا چاہتیں۔ میں وہی سننا چاہتا ہوں۔

طلعت : تم خود جانتے ہو تو پھر پوچھتے کیوں ہو۔

خالد : جانتے ہوئے بھی جاننا چاہتا ہوں۔ اپنی روح میں بالیدگی پیدا کرنے کے لیے۔ امیدوں پر سے یاس کا زنگ اتارنے کے لیے دل کی مردہ امنگوں کو آبِ حیات پلانے کے لیے میں تم سے وہی سننا چاہتا ہوں۔ جو تم سنانے سے پرہیز کر رہی ہو۔ کہہ دو اچھی طلعت

طلعت : ہزار مرتبہ تو کہہ چکی ہوں۔

خالد : اس بات کو حدود شمار کا پابند نہ بناؤ۔ پھر کہہ دو۔ اچھی طلعت تمہیں مجھ سے کیا ہے ؟

طلعت : میں کہہ تو چکی ہوں کہ مجھے تم سے ۔ تم سے مجھے، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

خالد : طلعت یقین دلاؤ کہ میں جاگ رہا ہوں۔ قسم کھاؤ کہ یہ خواب نہیں ہے ۔

طلعت : پاگل ہوئے جا رہے ہو تم تو۔

خالد : ہاں اس لیے کہ اسی کو محبت کا ہوش کہتے ہیں۔ طلعت ابھی تم نے کہا تھا ۔

طلعت : کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے تم سے کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ اچھا اب اجازت دو مجھے بس اتنی ہی مہلت تھی

خالد : نہیں ابھی نہیں۔ اتنی جلدی نہیں۔ ان چند منٹ کے انتظار میں میں نے پہاڑ سی رات اور سست رفتار ڈھلنے والا دن کاٹا ہے ۔

طلعت : پھر وہی۔ تم چاہتے ہو کہ یہ مہلت بھی نہ ملے۔

خالد : اچھا تو چل۔
[illegible] : (جاتے جاتے) اسی وقت، دو بجے۔

(پردہ اٹھتا ہے۔ پہلے دن کی سی جگہ ہے)

آم : (ذرا غصہ کا اظہار) عجیب حرکات ہیں، یہ کونسا طریقہ ہے، عجیب حرکات۔
جامن : مگر تم بھی تو کل اسی میں بیچاری کی طرح جی گیا۔ بیچارے تو ہر بات پہ لڑ رہے تھے۔
آم : یہ باتیں تمہارے سمجھنے کی نہیں ہیں جامن۔ یہ لوگ آپس میں جب لڑ رہے تھے
جامن : جب لڑ رہے تھے، یہ کیا پیار جب بھی ہوتی نہیں بلکہ کی جاتی ہے۔ ہر او تو یہ، شاید معلوم ہو سکتا ہے۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ خود کر رہا ہوں، بیکار کر رہا ہوں، عاشقی کر رہا ہوں۔
جامن : واقعی عجیب بات ہے تو کیا ان بیچاروں کو اسی کا بھی اظہار کرنا پڑتا ہے۔
آم : میں نے اس گفتگو سے جو کچھ سمجھا وہ نہیں بلکہ اکثر محبت کرنے والے جو شعر آیا کرتے تھے۔ وہ یہ ہے کہ آج تک کسی کو بھی نہیں دیکھا جس نے محبت کا اظہار کئے بغیر محبت کا اظہار کیا ہو۔ یہ سن کر تو مجھ کو بڑی ہنسی آئی جب ایک عاشق نے اپنی محبوبہ سے کہا کہ ؎

محبت حسن ہے الفاظ میں لائی نہیں جاتی
یہ وہ نازک حقیقت ہے جو کہی نہیں جاتی

جامن : (بے ساختہ ہنس کر) اچھا۔ تو گویا یوں کہہ رہے تھے۔
آم : بات یہ ہے کہ خوش حقیقتیں اس بیچاری حضرت تک رفتہ رفتہ پہنچ تو رہی ہیں۔ مگر ابھی ان حقیقتوں کے رموز پا اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وہ ان لطیف باتوں کو اپنے کرخت ماحول میں لاکر عجیب مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔
جامن : مجھے تو بڑی ہنسی آرہی تھی۔ آم جب وہ شخص اپنی محبوبہ سے بار بار کہہ رہا تھا کہ تم اپنی زبان سے کہہ دو کہ تم کو مجھ سے محبت ہے۔ کیا اس کی آنکھ میں اتنا نور بھی نہ تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کی آنکھ میں اپنے لیے محبت دیکھ لیتا؟
آم : تم نہیں جانتیں جامن جو محبت پیدا نہ ہو بلکہ کی جائے وہ اسی قسم کی باتیں چاہتی ہے۔ اس مصنوعی محبت کے لیے صرف ایک دل کافی نہیں ہوتا۔ آنکھ بھی کچھ دیکھنا چاہتی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ محبت نہ ہوتی ہے۔ یہ صرف بقول انسان کے کی جاتی ہے بلکہ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ جتائی جائے۔
جامن : خیر یہ تو میں سمجھ گئی مگر فرض کرو کہ محبت ہوتی نہیں تھی۔ بلکہ کی ہی گئی تھی، تو بھی محبت کے بعد اس شخص کو آخر اتنے اندیشے اور اتنے خطرے کس بات کے تھے۔
آم : بڑی بھولی ہو تم جامن۔ نقل اصل تو نہیں ہو سکتی، نقل کو دیکھ کر اصل کے مطابق بنایا جائے۔ مگر اس کی طرف سے ہمیشہ یہ ڈر ہوتا ہے کہ ملمع اتر نہ جائے، اصلیت بے نقاب نہ ہو جائے۔ اس قسم کی نقلی محبت کرنے والا ظاہر ہے کہ وہ خود اعتماد نہیں ہو سکتا۔
جامن : یہ تو ٹھیک ہے آم۔ مگر مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کو محبت کے بعد کچھ اس قسم کا انتظار ہو جیسے امتحان دینے کے

طالب علموں کو کامیابی اور ناکامی کا انتظار ہوتا ہے۔

آم : ٹھیک ہے بالکل اسی طرح انسان محبت میں بھی سود و زیاں دیکھتا ہے۔ ہماری تمہاری طرح انسان کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ محبت پیدا ہو گئی، تو اس کے لب کو اس کا حاصل سمجھ کر اسی میں گم ہو گئے۔ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ جس سے وہ محبت کرتا ہے، وہ بھی اس سے محبت کرے۔

جامن : ٹھیک ہے یہ سب فتور ہمیں میں محبت کرنے کا ہے۔ اگر محبت خود بخود ہو جایا کرتی ہم لوگوں کی طرح تو انسان کو بھی دوسری طرف سے اس کے جواب کا انتظار نہ ہوتا۔

آم : جو عجب کی بات ہیں جامن۔ انسان تو محبت باہر سے اپنے لیے حاصل کرتا ہے بجائے اس کے کہ یہ طوفان خود اس کے اندر سے اُمنڈے۔ اس کے یہاں دو نگاہوں کے تصادم اور دو دلوں کے ٹکراؤ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ گویا یہ بھی تالی ہے۔ جو ایک ہاتھ سے بج نہ سکے

جامن : واقعی عجیب مخلوقات ہے انسان بھی۔ ہمارے یہاں تو محبت کی خبر کبھی کسی کو نہیں ہوتی ہم تو اس نعمت کے سلسلے میں اتنے خود غرض ہیں کہ اس میں اپنا شریک بھی کسی کو بنا ہی نہیں سکتے اور یہ دل ناصبور کیا چیز ہوتی ہے آم۔

آم : (قہقہہ لگا کر) جامن یہ بھی نہیں سمجھیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں جس وقت جذبہ محبت پیدا ہو جاتا ہے پھر ہم کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہمارا دل مستغنی ہو جاتا ہے۔ گویا اس کو سب کچھ مل گیا۔ اس کے برعکس انسان نے جہاں محبت پائی، اس کا دل اچھا خاصہ دلِ ناصبور بنا۔ پھر اس کو نہ دن چین رہتا ہے، نہ رات آرام۔

جامن : ہائے ہائے۔ ارے آم۔ کہیں یہ کم بخت اس عارضہ کو تو اپنی زبان میں محبت نہیں کہتے۔

آم : نہیں نہیں کہتے۔ تو یہ بھی محبت ہی کو محبت ہیں، مگر محبت کی روح سے بے خبر ہیں۔ ان کے یہاں تو محبت کو غم محبت تک کہا جاتا ہے

جامن : کیا کہا غم محبت۔ لو اور سنو۔ نشاطِ محبت شروع ہوئی۔ اور ان کی حالت غیر ہو گئی۔ سرد آہیں، گرم آنسو۔ بیماروں کی سی صورت۔ وحشیوں کی سی وضع قطع۔ وہ جو اس روز ایک شخص میرے گھنیرے سائے میں بیٹھا اپنے لمبے لمبے اُلجھے ہوئے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ کبھی ہنستا تھا کبھی روتا تھا، کبھی شاعری کرتا تھا۔ وہ بھی کوئی پاگل نہیں اہلِ محبت تھا۔

جامن : محبت کی طرح شاعری بھی انسان کے یہاں کی جاتی ہے۔

آم : جی ہاں جو ادا ہو جائے۔ یہ عقلمند اس کو شعر کہتا ہے۔

جامن : حالانکہ جو ادا نہ ہو سکے وہ شعر ہے۔ ارے دیکھنا آم یہ دو آدمی کون آ رہے ہیں ادھر۔ میرے خیال میں تو ڈاکو ہیں۔

آم : ہاں ایک قسم کے ڈاکو ہی ہیں۔ وہ خوفناک سا شخص اس باغ کا ٹھیکیدار ہے اور دوسرا شاید کوئی نیا گاہک پھانسا ہے۔

جامن : چُپ رہو وہ قریب آ گئے ہیں۔

(ہوا کا شور۔ پرندوں کی چہچہاہٹ)

ٹھیکیدار : یہ دیکھئے شیخ جی۔ ایک ایسی درخت کو دیکھ لیجئے۔ لدا پڑا ہے۔ اور قوم بھی جو کچھ ہے اس آم کی وہ ظاہر ہی ہے۔ مگر میں ایک درخت کا سودا نہیں کروں گا۔ باغ کا باغ لینا پڑے گا۔

ذیب : بابا جنگل میں گلاب کے پیڑ [illegible]
شیدا : [illegible]
ذیب : [illegible]
شیدا : [illegible]
ذیب : تم اپنے دوستوں کو دیکھ [illegible] تو دیکھتا ہے
شیدا : چلو آؤ [illegible] کی بات ہو سنے۔

(دونوں جاتے ہیں۔)

(ہوا کا [illegible] پھڑپھڑاہٹ)

آم : [illegible] ٹھنڈی سی [illegible] ہے [illegible]
جامن : [illegible] آم۔ تم تو ایک دم [illegible] گئے۔
آم : [illegible]
جامن : تمہارا سودا ہو رہا تھا کیا۔
آم : ہاں میرے ننھے منے بچے [illegible] میری آنکھوں کے تاروں کو [illegible] کا سودا ہو رہا تھا۔ اب ۔ عام بیچنے والے کو [illegible] جائیں گے۔ [illegible] سے میں [illegible] ہوں۔ [illegible] سے ان [illegible] ہوں۔ اور ہر سال [illegible] پکنے کے بعد پھل [illegible] جاتے ہیں، یہ [illegible] ہوتا ہے۔
جامن : میری گود بھی ہمیشہ اسی طرح خالی ہوتی ہے۔
آم : اپنے کو اشرف المخلوقات کہنے والا یہ انسان ہماری یہ بہاریں ہم سے چھین کر، یہ خزاں ہم کو [illegible] کرتا ہے۔ یہ کس قدر محتاج ہے ہمارا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کاروبار، اس کی ادنیٰ [illegible] ضرورتیں ہم ہی سب سے وابستہ ہیں اور یہ خود ہمارے کسی کام کا نہیں۔ اب یہ [illegible] ہمارے ننھے ننھے بچوں کو ہم سے چھین لے جائے گا [illegible] ان کو بھنبھوڑ کھائے گا (رو دیتا ہے)
جامن : صبر سے کام لو آم۔ یہ آنسو تمہارے وقار پر بہتان معلوم ہوتے ہیں۔
آم : یہ آنسو میں نے انسان کے لیے تھوڑی بہائے ہیں۔ جو بہتان نظر آئیں۔ یہ تو میں اپنے آپ پر بہا رہا ہوں۔
جامن : بات یہ ہے کہ انسان پر بھی آنسو بہانے کے تم۔
آم : تم نے۔ وہ کیوں؟
جامن : رات میرے نیچے ڈاکو چھدا اپنا چوری کا مال آپس میں بانٹ رہے تھے۔ اور پھر ان میں ایسی لڑائی ہوئی کہ ایک نے دوسرے کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا۔
آم : یعنی مار ڈالا۔ بالکل۔

جامن : مقتول مارا گیا اور قاتل مال لے کر بھاگ گیا۔ میں پھر دیر تک سو نہ سکی۔ میں نے سوچا کہ خدا نے یہ بھی کیا مخلوق بنائی ہے کہ سب سے پہلا
ایسی حقیر دھاتوں کے لیے جن کا خالق وہ خود ہے۔ یہ انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔

آم : سونے اور چاندی۔ ارے یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ سونا اور چاندی تو انسان کے لیے سب ہی کچھ ہے۔ وہ اپنی بڑائی اور چھوٹائی اسی
معیار پر جانچتا ہے۔ جس کے پاس یہ زیادہ ہے وہ بڑا ہے، اور جس کے پاس کم وہ چھوٹا ہے۔

جامن : خواہ وہ زیادہ طاقتور ہو۔

آم : طاقتور کمزور سمجھا جائے گا۔ بغیر سیم و زر کے اور کمزور طاقتور گنا جائیگا اگر اس کے پاس سونا چاندی ہے۔

جامن : خواہ وہ حسین ہو۔ عقلمند ہو۔ ہوش گوش کا آدمی ہو۔

آم : عقلمند اور ہوش گوش کا تو خیر اس مخلوق سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ مگر کوئی بھی وصف بغیر دولت کے بیکار ہے۔

جامن : دولت ! وہ کیا چیز ہے ؟

آم : یہی سونا چاندی وغیرہ۔ اسی سے وہ اپنی شان بڑھاتا ہے۔ اسی سے زیب و زینت کو فروغ دیتا ہے۔

جامن : تو یہ شان اور یہ زیب و زینت اس کی کب ہوئی یہ تو سونا چاندی کی ہوئی۔

آم : یہی باتیں تو یہ جانور سمجھتا نہیں۔ جس کو ہم انسان کہتے ہیں اور جو اپنے کو اشرف المخلوقات کہتا ہے۔ اگر اسی حقیقت کو یہ سمجھ جائے۔ تو اور چاہئے ہی کیا مگر اسی سے وہ کوسوں دور ہے۔ اس کی آنکھ باہر بنائی گئی ہے۔ جو اپنے اندر نہ اپنا حسن دیکھ سکتی ہے، نہ اپنی بدصورتی، وہ دوسروں کا حسن دیکھتی ہے۔ دوسروں کے عیب اس کو نظر آتے ہیں۔ وہ تحقیق اور تجسس میں بہت دور نکل گیا ہے سوائے اپنی تحقیق اور تجسس کے۔ سن رہی ہو جامن۔ جامن۔ ..... ارے سو گئیں تم تو۔ واقعی رات بھی زیادہ آگئی ہے۔ پرندے بھی بسیرا لے رہے ہیں۔ اُلو کی بیداری کا وقت آگیا ہے۔

اچھا شب بخیر!

نقش و نگار

(رحیم سو رہا ہے۔ بیوی کے جوتوں کی آواز پر صحت کی آواز غائب آتی ہے)

بیوی:- اللہ کی مار، اس مرد پر خدا کا غضب۔ دھوپ سر پر آ گئی اور یہ پڑے اینڈ رہے ہیں۔ جی کرتا ہے گھر میں جھاڑو پھیرے ہوئے ہے۔ بچے نے بڑے میں نے ناشتہ بھی ہے۔ خدا کے لئے اب اٹھو بھی۔ دوپہر ہونے کو آئی صبر کے آ [illegible] میں نے تو سیکھ لیا۔

رحیم:- کروٹ بدل کر) کیا غضب۔ چلا رہا ہے۔ دو گھڑی سنا بھی دو جانے دیا ہے۔

بیوی:- ذرا اٹھ کر تو دیکھو۔ سورج کہاں کا کہاں پہنچا۔ دھوپ میں ڈوبے پڑے ہو۔

رحیم:- بیگم ذرا ہول دل تو ہے۔ کم سے کم یہی سوچ لیا ہوتا کہ یہ محنت سے کس وقت تھا۔ ایک بجے شو ختم ہوا۔ دو بجے تک حساب کتاب کیا۔ تین بجے گھر پہنچا۔ آخر انسان ہوں۔ کوئی بھوت تو نہیں ہوں۔

بیوی:- وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں بھی آخر کیا کروں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں۔ کہو تو انہیں تو خرچ دیں۔ سودا سلف منگا دوں۔ پھر چولہا ہانڈی کروں۔ وقت پر کھانا نہ ہو تو گھر میں قیامت برپا ہو گی۔ مجھے خرچ دے دو۔ چاہے دن چڑھے تک پڑے اینٹھتے رہنا

رحیم:- دن بھر پڑے اینٹھتے رہنا گویا مجھے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ابھی جانا ہے ریہرسل کرانے آج کے شو کا۔

بیوی:- اسی لئے تو کہہ رہی ہوں، کہ خرچ دے دو۔ تاکہ وقت پر کھانا تو مل جائے۔

رحیم:- اب مجھے بیچ کر نہیں نیلام کر دو۔ تو شاید خرچ مل جائے۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں۔

بیوی:- لو اور سنو! ان کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں، اور گھر میں جیسے قارون کا خزانہ گڑا ہوا ہے۔ میں کہتی ہوں آخر کل کچھ آمدنی ہوئی تھی یا نہیں؟

رحیم:- خاک آمدنی ہوئی تھی۔ کل چودہ روپے کے ٹکٹ بکے باقی سارا منڈوا فری پاس والوں سے بھرا ہوا تھا۔ کل کا حساب ابھی اپنے سر قرض ہے۔ جو آج کی آمدنی سے ادا ہو گا۔

بیوی:- میں تو پہلے جانتی تھی کہ اس موئے گانے بجانے، ناچنے تھرکنے کی کمائی میں برکت نہیں ہے۔ زندگی بھر یہی بھاڑ جھونکا

اور رہے جوڑ بھو بنچے کے جوڑ بھو بنچے۔

رحیم :- یہ تم کہہ رہی ہو بھول گئیں، وہ دن جب ماسٹر رحیم کے ڈنکے پٹے ہوئے تھے۔ آج بھی تمہارے پاس وہ سارے تمغے موجود ہوں گے۔ جن سے یہ چٹان کا چٹان سینہ ڈھک جاتا تھا۔

بیوی :- ہاں ہاں پڑے ہوئے ہیں وہ موئے کھوٹی چاندی، گلٹ اور پیتل کے تمغے کیا کروں۔ ان کو اوڑھوں، بچھاؤں، چاٹوں، چباؤں، آخر یہ وہ کس مصرف کے، کس مرض کی دوا ہیں موئے ٹھیکرے؟

رحیم :- میری عزت کے نشان ہیں وہ۔ میری مقبولیت کی سند ہیں وہ۔ اب میں کیا کروں۔ کمبخت کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ورنہ آج دھن برس رہا ہوتا۔

بیوی :- ہاں اور کیا۔ جب بڑا دور دورہ تھا ناٹک کا۔ دھن تو اس وقت بھی برستے نہ دیکھا۔ جو جیسے تھے سو ہیں۔ جب ڈنڈ پیلتے تھے اور آج بھی پیل رہے ہیں۔ جو رہے سہے دو چار تار تھے ہاتھ کان میں وہ بھی لے جا کر اس موئے منڈوے پر لگا آئے۔ جس میں چودہ روپے کے ٹکٹ بکتے ہیں۔

رحیم :- اس کی تو خبر ہی یہ ہے۔ ابھی لوگوں کو معلوم ہی نہیں اس منڈوے میں ہوتا کیا ہے۔ ذرا چرچا ہونے دو۔ پھر دیکھنا کہ خلقت کیسی ٹوٹتی ہے۔ اور روپیہ کیسے برستا ہے۔

بیوی :- دل کو دیکھ کر گھڑے توڑتے تم کو دیکھا ہے کہ روپیہ برسنے کی امید پر میرے جہیز تک کا زیور ٹھکانے لگا آئے۔

رحیم :- جہیز کا طعنہ مجھ کو تو دے رہی ہو۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ میری زبان کھلواؤ۔ جو کچھ تم جہیز میں لائی تھیں۔ وہ میں ابھی بھولا نہیں ہوں۔ وہی مثل کہ نام بڑے اور درشن چھوٹے مشہور تو تھے۔ بڑے ضلعدار صاحب اور بیٹی کو رخصت کیا اس طرح گویا کوئی خانساماں رخصت کرے گا۔ ان میسیوں کی بیٹیاں بھی یوں رخصت نہ ہوتی ہوں گی۔

بیوی :- خیر میرے باپ بھائی تو خانساماں سہی، لیکن میلے تھے، مگر جناب کے دربار دولت پر کون سے ہاتھی جھوم رہے تھے۔ توبہ ہے میرے اللہ۔ اللہ بخشے ابا میاں کو خبر بھی ہو جاتی کہ ان کے جس لڑکے کو وہ ناٹک کا منیجر سمجھ رہے ہیں وہ حقیقت کا مسخرا ہے۔ تو ادھر کی دنیا ادھر ہو جاتی۔ کبھی جو وہ منظور کرتے یہ رشتہ۔

رحیم :- بکواس بند کرو۔ ورنہ ساری قلعی کھول کر رکھ دوں گا۔ سوائے اس کے وہ جو سائیکلوں کی پنکچر جوڑا کرتا تھا، تمہاری نسبت ہی اور کونسی آئی تھی۔ انھوں نے تو شکر کیا ہوگا کہ ایک معزز گھرانے سے نسبت آئی تو سہی۔

بیوی :- ہائے رے معزز گھرانے۔ دیکھا ہے میں نے وہ معزز گھرانا۔ ایک بھائی جادو کے کرتب دکھاتے پھرتے ہیں۔ گولی منہ سے کھائی۔ کان سے نکالی۔ دوسرے جیٹھ اللہ میری توبہ ہے، در در گھر گھر کٹ پتلیوں کا تماشہ دکھاتے پھرتے ہیں۔ یہی کام تو ہوتا ہے معزز گھرانوں کا۔

رحیم :- خیر وہ جادو کے کرتب دکھائیں یا کٹ پتلیوں کا تماشہ تمہارے یہاں کی طرح چوری تو نہیں کرتے۔ ڈاکے تو نہیں ڈالتے۔ نقب تو نہیں لگاتے۔ تمہارے بھائی قبو کی طرح۔

بیوی :- تو کس نے کہا تھا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کے یہاں نسبت کے لئے دوڑو، دوڑ کر جوتیاں توڑو،

رحیم:۔ [illegible] قبول کر لیجئے۔

بیوی:۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

رحیم:۔ [illegible]

بیوی:۔ دیکھو میں نے کہہ دیا ہے [illegible] ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

رحیم:۔ [illegible]

بیوی:۔ تو مجھے بھی [illegible]

[illegible] مجھ کو دے سکتا ہے۔

رحیم:۔ تو جاؤ [illegible]

بیوی:۔ تو تم کیا کر لو گے میرا؟

رحیم:۔ [illegible]

بیوی:۔ [illegible]

رحیم:۔ میں [illegible]

بیوی:۔ بس بس بہت ہو چکی [illegible] دروازے پر

تھوکنے بھی نہ آؤں گی۔

رحیم:۔ برداشت کر، خبردار جو قدم نکالا اس گھر کے باہر۔

بیوی:۔ تم مجھ کو نہیں روک سکتے۔

رحیم:۔ تم نہیں جا سکتیں۔

بیوی:۔ میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی، ہمت ہے تو روک لو۔

رحیم:۔ روکتا ہے کون، بیٹھا رہ [illegible] باتوں کا بھوت باتوں سے نہیں مانتا۔

(بیوی بلند آواز میں رونا شروع کرتی ہے۔ ہائے مجھے مار ڈالا)

(دروازے پر کئی دستکیں)

ایک اہل محلہ:۔ ماسٹر رحیم۔

دوسرا:۔ رحیم خان صاحب

پہلا:۔ ماسٹر رحیم دروازہ کھولو

دوسرا:۔ خان صاحب باہر تو آؤ خان صاحب

} بیوی کے رونے کی آواز مسلسل آ رہی ہے۔

رحیم :۔ (دروازہ کھول کر) فرمایئے کیا بات ہے۔
ایک اہلِ محلہ :۔ یہ کیا آفت مچا رکھی ہے ماسٹر تم نے۔ آخر بات کیا ہے؟
رحیم :۔ آفت ابھی کہاں مچائی ہے۔ آفت تو اب مچاؤں گا۔ میں اس کی جان لے کر چھوڑوں گا۔ اس نے آخر سمجھ کیا رکھا ہے۔

دوسرا :۔ بڑی بات ہے خان صاحب۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا بھی کوئی شرافت ہے۔
پہلا :۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر ہوا کیا۔ سارا محلہ اپنے دروازے پر جمع کر لیا تم نے۔
رحیم :۔ ابھی تو یہ تماشہ ساری خلقت دیکھے گی۔ جب میں اسے ختم کر کے پھانسی چڑھنے جاؤں گا۔
پہلا :۔ مگر کچھ معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے۔
رحیم :۔ دیکھئے صاحب میری سنی نہ سنیئے گا۔ خدا لگتی کہئے گا۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ میں اپنے زمانے کا تھٹ بڑھا ایکٹر رہ چکا ہوں ناٹک کا۔ کمپنی والے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے۔ مگر اب اس مقدر کو کیا کروں۔ کہ ناٹک کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ نہ وہ قدر رہی نہ وہ روزی۔ جب فاقوں پر نوبت آ گئی۔ تو ادھر ادھر ہاتھ پیر مار کر خود اپنا چھوٹا سا منڈوا بنایا۔ پرانے ساتھیوں کو جمع کیا۔ ٹوٹا پھوٹا سامان اکٹھا کیا۔ کہ جیسی چار پیسے کی صورت دکھائی دے۔
دوسرا :۔ یہ تو ماسٹر ہم خود دیکھ رہے ہیں۔ کہ بڑی محنت کر رہے ہو تم۔
رحیم :۔ ایسی ویسی محنت۔ اللہ جانتا ہے۔ رات کو رات اور دن کو دن نہیں سمجھا میں نے۔ اچھے کر بنایا میں نے یہ منڈوا بیٹھنے کے لئے اور آپ لوگوں کو میری قسم ذرا میرے ساتھ چل کر دیکھئے کہ میں نے تیاری کیسی کی ہے۔ بس اب مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔ خود ہی چل کر دیکھ لیجئے۔ یہ سامنے ہی تو ہے کونسا دور ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ذرا سی دیر کے لئے چلے چلیئے۔
پہلا :۔ خان صاحب ہم کو آپ کی بات کا یقین ہے۔ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہی ہوگا۔
رحیم :۔ یہ بات نہیں۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لئے ذرا چل کر دیکھ لیجئے۔ آیئے مرزا جی۔ آیئے نا آپ سب آیئے۔
دوسرا :۔ چلو بھئی چلو۔ ان کی خوشی ہو جائے۔

(سب چلتے ہیں)

رحیم :۔ تشریف لایئے۔ مرزا جی سچ کہتا ہوں فلاں فلاں کر دوں گا۔ اگر اتنی جلدی ایسی تیاری کوئی مائی کا لال کر دکھائے ذرا ایک منٹ۔ تالا کھول نکل نہ جائے کم بخت۔
(فیڈ آؤٹ ہوتا ہے اور جلد گھنگھروؤں کی آواز میدان ہوتی ہے۔)
رحیم :۔ (قریب آ کر) بند کر دو باجہ۔ تشریف رکھئے آپ لوگ۔ ماسٹر غزالی ذرا جلدی کرو۔ اور وہ سین دکھاؤ آپ لوگوں کو جب شہزادی محل کے باغ میں سپاہی زادے سے ملتی ہے۔ اور دونوں میں محبت کا عہد و پیمان ہوتا ہے۔ جلدی کرو۔ (اہلِ محلہ سے) آپ کے تماشے میں یہ محبت کا سین ایک ٹکڑا ہے۔ ہمارے آج کے کھیل کا۔ مگر اسی سے آپ کو

دانہ ہو جانے کا اور اس کے چھلکے سے ... میں ہم اپنی ... بڑی چیز پیش کر رہے ہیں۔
دروازے سے گلنار ... شہزادی۔
... جاتا ہے،

گلنار۔ شہباز!
شہباز۔ شہزادی عالم۔
گلنار۔ کیا تم نے مجھے ... میں معاف کیا۔ تو تم مجھے گلنار ہی نہیں کہہ ...
شہباز۔ ایاز اپنی جگہ پہچانتا ہے۔ شہزادی عالم۔
گلنار۔ کیا تم کو اب بھی یقین ہے کہ گلنار تمہارے سامنے شہزادی کی حیثیت سے آئی ہے۔ بلکہ ایک معمولی لڑکی کی حیثیت سے آئی ہے۔
شہباز۔ دنیا میں زمین اور آسمان ملے ہوئے نظر ضرور آتے ہیں۔ مگر کہیں مل نہیں جاتے۔ یہ نگاہوں کا دھوکا ہے۔
گلنار۔ تم میری محبت کو ٹھکرا رہے ہو۔
شہباز۔ یہ میری جرأت نہیں شہزادی عالم۔ مگر میں اپنی حقیقت سے بھی ناواقف نہیں ہوں۔
گلنار۔ تمہاری حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کہ میں تم کو چاہتی ہوں۔ تمہارے لئے سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔ اپنا
محل، اقتدار، اپنے محل کے خزانے، تخت و تاج کے تمام حقوق تم ایک مرتبہ مجھ کو اپنا کر کے دیکھو۔
شہباز۔ مگر میں حق نمک کیسے قربان کر دوں شہزادی عالم۔
گلنار۔ کیا تم کو مجھ سے محبت نہیں۔
شہباز۔ اگر میں انکار کروں تو یہ جھوٹ ہوگا۔ مگر غریب کی بے شمار تمناؤں کی طرح محبت بھی اس لئے ہوتی ہے کہ اس کا گلا گھونٹ
دیا جائے۔ میں اپنی محبت کو اپنے دل میں دفن کر سکتا ہوں۔ مگر مجھ سے یہ ناممکن ہے کہ سلطان عالم کا مجھ پر جو اعتماد ہے
اس کا خون اپنے ہاتھوں سے کر دوں۔ میں غریب سپاہی زادہ ہوں۔ مگر میری رگوں میں شرافت کا خون بھی ہے۔ یہ
خون اس وقت جم جائے گا۔ جب نامرادی ... پر ہاتھ ڈالنے کا ناپاک خیال بھی میرے ذہن میں آیا۔
گلنار۔ اور اگر خود بادشاہ بابا میرا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیں۔
شہباز۔ تو میں سمجھوں گا کہ نگاہ خسروی نے ایک ذرے کو آفتاب بنا دیا۔
گلنار۔ اچھا تو تم اپنی شرافت کی قسم کھاؤ اور میں اپنی محبت کی قسم کھاتی ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے سوا کسی کے
نہ ہوں گے۔
شہباز۔ آپ قسم کھاتی ہیں تو یہ قسم اسی دن کھا چکا ہوں جب آپ کے محل پر آنے سے بہت پہلے یہ پیام آپ کی
نگاہوں میں تھا۔
ایک اہل محلہ۔ سبحان اللہ۔ کیا کہتا ہے ماسٹر صاحب۔

دوسرا:۔ محبت کا سین ہے۔ مگر کس قدر پاکیزہ ہے۔ اور کیا کیریکٹر پیش کیا ہے۔ سپاہی زادے کا واہ۔ واہ واہ۔

رحیم:۔ صاحب یہ تو ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور ملاحظہ فرمائیے۔ (آواز دے کر) ماسٹر جی ذرا اب وہ سین پیش کرو۔ جب شہباز کے قتل کے بعد شہنشاہ محل سرا میں ملکہ کے پاس آتا ہے۔ (دلال سے) اور ذرا اس سین میں شہنشاہ کی ایکٹنگ دیکھئے اور یہ اندازہ کیجئے کہ یہ چند دن کی محنت کا نتیجہ ہے (آواز سے کمرہ ملکہ اپنی جگہ پر ہو گئیں؟ چلو۔ شروع) شہنشاہ تالی بجاتا ہے۔

ملکہ:۔ جہاں پناہ۔

شہنشاہ:۔ بس ملکہ۔ مجھ سے دور رہو۔ میں خونی ہوں۔ (جلدی سے، اور اونچی آواز میں) میرے یہ ہاتھ ایک بے گناہ کے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں میرے دامن پر خود میرے ہی ایک نمک خوار کے خون کا ایسا دھبہ ہے جس کو دریائے انفعال بھی نہ دھو سکے گا۔ میں نے محبت کا خون کیا ہے۔ میں نے بے زبانوں کا صبر سمیٹا ہے۔ دیکھو، میں قاتل ہوں خود اپنی اولاد کی تمناؤں کا قاتل۔ گنہگار بلبلیں کے آنسو مجھ کو غرق کر کے رہیں گے۔ شہباز کی بدنصیب ماں کی آہ مجھ کو بھسم کر دے گی۔ انصاف اور رحم دونوں میرے منہ پر تھوکیں گے۔ تاریخ میرے گلے میں لعنت کا طوق ڈالے گی۔ اور میرا ضمیر اگر زندہ رہا۔ تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔

ملکہ:۔ دیکھئے! جہاں پناہ کے دشمن۔ ایسی بات تو زبان پر نہ لائیں۔

شہنشاہ:۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو ملکہ۔ خود جشن مناؤ۔ سوتیلی اولاد کو تڑپا کر رقص کی محفل آراستہ کرو۔ میری معصوم بچی کا دل توڑ کر اپنی دلبستگی کے سامان کرو۔ کسی کے گھر کا چراغ بجھا کر اپنے محل میں چراغاں کرو۔ میں تم کو مبارک باد دینے آیا ہوں۔ کہ اپنی آتش انتقام کو سرد کر کے تم نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیا۔

ملکہ:۔ عالم پناہ! میں نے سب کچھ ناموس شاہی کے لئے کیا تھا۔

شہنشاہ:۔ ناموس شاہی! لعنت اور صد ہزار لعنت اس شاہی پر جو انسانیت سے گزر جائے۔ اگر بادشاہ کے سینے میں انسان کا دل نہیں ہے۔ تو وہ ایک خونخوار درندہ ہے۔ میں ایک خونخوار درندہ ہوں۔ میرے جبڑوں سے انسانیت کا لہو ٹپک رہا ہے۔ اس سے قبل کہ یہ درندہ تم پر جھپٹ پڑے۔ دور ہو جاؤ میرے سامنے سے —— آتش انتقام کو اگر کچھ چھینٹوں کی ضرورت ہے تو جاؤ گلنار کی طرف اور رقص بسمل کا تماشا دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈا کرو۔

ملکہ:۔ عالم پناہ۔ میں سوتیلی سہی مگر اُس کی ماں ہوں

شہنشاہ:۔ ماں کا مقدس نام اپنی زبان سے لے کر شفقت کو درندگی کی شکل نہ دو۔ جاؤ اُس بدنصیب شہزادی کو دیکھو جو اپنی سسکیوں اور ہچکیوں میں ڈھل کر رہ گئی ہے۔ جس کے آنسوؤں کا سیلاب شہباز کے خون ناحق کے ساتھ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں اس سیلاب میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔ اپنے اس تخت و تاج کو غرق کر دینا چاہتا ہوں اسی سیلاب میں۔ (جاتا ہے) اسی سیلاب میں۔ اسی سیلاب میں۔

ملکہ:۔ (اس کے پیچھے دوڑتی ہے) عالم پناہ! سلطان اعظم! ظل اللہ! (رفیق آتا ہے)

ایک اہلِ محفل۔ لیجئے صاحب۔ کس غضب کی پھڑکا دینے والی ہے۔
دوسرا۔ واہ واہ! کمال کر دیا آپ نے۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔
جھوندو۔ کاش آپ بات کے طریق پر چلیں۔ یہ تو ادھر ادھر کے چند ٹکڑے آپ اڑا سکے ہیں۔ اچھا ذرا ٹھہریئے۔ ایک کھیل کے کھیل کا ایک گیت آپ کو سناتا ہوں۔ [illegible] شہلا اور جھوندو کے ہونٹوں پر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سنیئے۔ [illegible] ہے۔ [illegible] سب جھوندو اور شہلا۔ بڑا آیا میرا خریدار۔
(گانا ہوتا ہے)

(گانا)

شہلا۔ بڑا آیا میرا خریدار۔ تیرا میرا میل کیا۔
جھوندو۔ میں ہوں دل سے تجھ ہی پہ نثار۔ تیرا میرا میل یہ۔
شہلا۔ تم ہو نہیں زمانے۔
جھوندو۔ آن چلیں جتانے۔
شہلا۔ میرے آپ تو ہی ساہوکار۔ تیرا میرا میل کیا۔
جھوندو۔ میں ہوں تیار ان سے ادھار۔ میرا تیرا میل یہ۔
شہلا۔ ان کے پاس ہے دولت۔
جھوندو۔ میرے پاس محبت۔
شہلا۔ تجھ پہ شامت بھلی ہے سوار۔ تیرا میرا میل کیا۔
جھوندو۔ اپنی شامت کا میں راہوار۔ تیرا میرا میل یہ
شہلا۔ دور ہو منہ کے گھمنڈ۔
جھوندو۔ میں ہوں اڑیل ٹٹو۔
شہلا۔ تجھ پہ اللہ کی ہو سنوار۔ تیرا میرا میل کیا۔
جھوندو۔ ہو سنوار اور ہو بوچھار۔ تیرا میرا میل یہ
شہلا۔ بڑا آیا میرا خریدار۔ تیرا میرا میل کیا۔
جھوندو۔ میں ہوں تجھ ہی پہ نثار۔ تیرا میرا میل یہ۔
ایک اہلِ محفل۔ مزا آ گیا ماسٹر رحیم۔ کیا بات۔
دوسرا۔ دھن بھی لاجواب ہے۔ اور گایا بھی خوب دونوں نے۔ اس گانے پر ونس مور ہو گا
رحیم۔ کیا عرض کروں وقت نہیں ہے۔ مجھے ریہرسل کرانا ہے۔ ورنہ گانے تو سب ایسے ہی ہیں۔ لڑکی لڑکوں میں نہ گاتے

جائیں تو مہربانی۔ اچھا میں آپ کو اسی کامک کا ایک سین دکھاتا ہوں (آواز دے کر) ماسٹر خیراتی زمانہ ملک کا وہ سین دکھاؤ۔ جس میں پھلجھڑی کو گھمن چکر شادی کا پیام دیتا ہے۔ (اہلِ محلہ سے) ذرا دیکھئے گا اس سین کو۔ آغاز دے کر باجا بھی شروع کرو (رسالی بجاتا ہے)۔

پھلجھڑی:۔ ہلو۔

گھمن چکر:۔ اے ہلو۔

پھلجھڑی:۔ آپ کا نام ہے ڈاکٹر ایکس، وائی، زیڈ، ڈنٹسٹ۔

گھمن چکر:۔ درست فرمایا آپ نے۔ اسی خاک کو اے۔ بی۔ سی۔ ڈی گھمن چکر کہتے ہیں۔

پھلجھڑی:۔ گھمن چکر؟ مگر کارڈ میں تو۔

گھمن چکر:۔ ذرا بلند آواز سے فرمائیے۔

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

پھلجھڑی:۔ آپ ڈنٹسٹ ہیں یعنی دندان ساز۔

گھمن چکر:۔ ساز یہ کمینہ ساز کیا جائے۔ اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیکھا تھا۔ ضرورت لاحق تھی۔ لہٰذا حاضر ہوں۔

پھلجھڑی:۔ یہ کارڈ کس کا ہے؟

گھمن چکر:۔ خود ہی پڑھ لیجئے۔ اس کارڈ کو پڑھنے کے لئے جس نمبر کی عینک درکار ہے۔ وہ عینک ابھی میں نے بنوائی نہیں ہے۔

پھلجھڑی:۔ (پڑھ کر) ڈاکٹر ایکس وائی زیڈ ڈنٹسٹ۔

گھمن چکر:۔ ارے نہیں۔ نہیں نہیں۔ یہ تو ان ڈاکٹر صاحب کا کارڈ ہے۔ جن سے بردکھوے میں آنے کے سلسلے میں نے دانت لگوائے ہیں۔

پھلجھڑی:۔ بردکھوے میں جناب والا خود تشریف لائے ہیں۔ یا کسی برخوردار کے ساتھ آئے ہیں۔

گھمن چکر:۔ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے۔ وہ درست ہی ہوگا۔ مگر میری نگاہ کی کمزوری، کان کی گرانی، بالوں کی سفیدی، اور دانتوں کی عدم موجودگی پر غور کرنے کے بجائے قابلِ غور ہے۔ صرف میرا دل بیتاب۔

پھلجھڑی:۔ اور دماغ کا ذکر ہی نہیں کرتے جو سب سے زیادہ خراب ہے۔

گھمن چکر:۔ مجھے آپ سے یہی امید تھی۔ اب آپ کے والد سے ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب خود آپ ہی نے پسند کر لیا۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

پھلجھڑی:۔ آپ نے وہ دروازہ دیکھا ہے۔ اس سے قبل کہ گھر کا راستہ یاد نہ رہے۔ اس دروازے سے نکل جائیے۔

گھمن چکر:۔ باہر۔ اگر آپ باہر تشریف لے چلنا چاہتی ہیں تو بسم اللہ۔ واقعی راز و نیاز کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں ہیں۔ میں

(سب گھر والے اور محلہ والے داخل ہوتے ہیں)

بیوی: ٹھہر جائیے میں بھی ہوں زندہ گیا ہے۔

تنخواہ: کیا رہا۔ بس ٹھیک ہے۔ میں ٹھیک گیارہ بجے باغیچہ میں انتظار کروں گا۔

بیوی: اچھی بات۔

تنخواہ: ٹھیک ہے۔ میرا مطلب ہے بائی بائی۔

(بیوی چلی جاتی ہے)

ایک اہل محلہ: کمال کر دیا ماسٹر جی۔ ماشاء اللہ ہنستے ہنستے

دوسرا: بیٹھے بیٹھے چل بسے۔ کس قدر زندہ دل ہے۔

رحیم: کیا عرض کروں۔ وقت ہی نہیں ہے۔ ورنہ اور بھی بہت چیزیں ہیں۔ کتاب ہوتی تو دکھاتا۔ مگر پچھلے تین مہینوں سے

معاوضہ نہیں ملا۔ وہ ایک عرصہ ہے کہ تحصیل پر برسوں جاری ہے۔

ایک محلے دار: رحیم ماسٹر کے ماتم کے لیے روپیہ اکٹھا کیا ہے۔ ہزار پانچ سو سے تو ہم بھی شرکت کر سکتے ہیں۔

رحیم: شکریہ۔ شکریہ۔

دوسرا: ابھی تو تقریباً اُدھار ہماری شرکت کی رقم لے لیجیے یہ حاضر ہے۔ دیجئے ان کو روپیہ۔ اور ختم کیجئے جھگڑا فساد۔

رحیم: نہ نہ یہ روپیہ۔ اس کے ہاتھ میں دیجئے گا۔ تشریف لائیے۔

ایک اہل محلہ: نہیں صاحب اس معاوضے میں ہم لوگوں کا سوال ہی نہیں ہے۔

(دروازے پر دستک)

دوسرا: میں نے کہا بھابی صاحبہ ذرا دروازے پر آئیے۔

بیوی: اندر سے ہی کہہ دیجئے۔ میں گھر دار کی تو قیدی ہوں۔ میں کیسے آؤں دروازے پر۔

ایک اہل محلہ: قفل کھل گیا ہے۔ یہ لیجئے ماسٹر رحیم۔ یہ روپے بھیجے ہیں۔ آپ میکے جا رہی ہیں۔ اسی کے لئے خرچہ ہے۔

بیوی: بھیا میں کہاں جاؤں گی میکے۔ عورت ذات کا گھر تو میاں ہی کا گھر ہے۔ جہاں سے بس جنازہ نکلتا ہے۔

رحیم: لیجئے سن لی حقیقت۔ اب تجہیز و تکفین کے لئے اور روپے کا انتظام کیجئے۔

(ہنستا ہے)

بیوی: بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں بیچارے۔

(سب ہنستے ہیں)

دو رُخ

(دروازے پر کوئی آہستہ سے دستک دیتا ہے)

شیخ صاحب: کون ہے۔ معلوم ہے۔ سب کو کہ آج میرا خضاب کا دن ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ میں خضاب کے دن کسی سے نہیں ملتا۔ پھر بھی دروازہ بجایا جا رہا ہے۔

ناہید: (دروازے سے جھانک کر) میں آ سکتی ہوں ماموں جان؟

شیخ: کون؟ ناہید۔ آؤ آؤ۔ میں سمجھا کہ جانے کون ہے۔ بیٹا تم اس وقت کہاں۔

ناہید: (قریب آتے ہوئے) تسلیم! امی جان کے ساتھ آئی ہوں۔

شیخ: خوب خوب، کہاں ہیں فرخندہ؟ بیٹی ذرا دیکھنا جلد پر سیاہی نہیں آئی خضاب کی۔ یہ بھی بڑھاپے کا ایک عذاب ہے۔

ناہید: جی نہیں بالوں ہی پر ہے۔

شیخ: بالوں پہ تو ہونا ہی چاہیے۔ تو ہیں کہاں بی فرخندہ جب میں تم کو دیکھتا ہوں۔ فرخندہ کا بچپن یاد آتا ہے ہو بہو ماں کی تصویر ہو، وہ تمھاری عمر میں بالکل ایسی ہی تھیں اور تم ان کی عمر میں بالکل ویسی ہی ہو جاؤ گی۔ بلاؤ نا فرخندہ کو۔ ذرا ٹھہرو یہ آئینہ میرے چہرے کی سیدھ میں لے کر بیٹھو۔ ہاں ہوں۔ مگر یہ کیا اس میں تو گھڑی نظر آ رہی ہے۔ اسے بھی چہرے کی سیدھ میں رکھو۔ ہاں یہ بس بس یوں ہی رہنا۔

فرخندہ: (باہر سے آواز آتی ہے) ناہید!

ناہید: (اندر ہی سے) آ جائیے امی جان ماموں جان یہاں ہیں۔

فرخندہ: (آتے ہوئے) بھیا تسلیم!

شیخ: (خضاب لگاتے ہوئے بند منہ سے) جیتی رہو۔ ہوں، ہوں، ہوں...... (صاف آواز میں) تم نہ بولو بیٹی ورنہ مونچھوں کے بجائے بھنوؤں میں لگ گیا ہوتا ابھی خضاب۔ بس ایک منٹ۔ ہوں ہوں۔ شاباش۔ بیٹھو نا فرخندہ بس ایک منٹ۔

فرخندہ: نسرین کہاں ہے بھیا!

شیخ: بس ایک منٹ بیٹی۔ بھیا رہنا، ایک مونچھ رہ گئی ہے۔ شاباش۔ ہوں۔ ہوں۔ بس اب ٹھیک ہے۔ ہاں کیا پوچھ رہی تھیں فرخندہ۔

فرخندہ: نسرین نظر نہیں آئی۔

شیخ: جب ہوگی یہاں تو نظر آئے گی۔ ارے میں فرخندہ۔ جاوید میاں۔ کیا نکھر آئے ہیں۔ ولایت سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی دیہات سے دھلی ہوئی ہے۔

فرخندہ: بھیا میری عقل تو خود حیران ہے مگر اب ہو گا کیا۔ یہاں نسرین بی بی تو کچھ کی کچھ بن چکی ہیں۔

شیخ: دونوں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں صاحب دونوں۔ اب میری سمجھ میں تو آتا نہیں یہ جوگ۔

فرخندہ: بھیا خدا لگتی بات یہ تو نہ کہئے۔ یہ بھول آپ کی غلطی ہے۔ جب نے اسی دن کے لیے دن گن گن کر برس گذارے ہیں کہ جاوید ولایت سے آئے تو ان دونوں کے سہرے کے پھول کھلیں۔ دونوں پروان چڑھیں۔

شیخ: انتظار تو مجھ کو بھی تھا۔ مگر اب تم خود دیکھ لو کہ کوئی بھی مناسبت ہے ان دونوں میں۔ تم کو معلوم ہے کہ تمہاری بھابی مرحومہ کے اور میرے مزاج میں کس قدر فرق تھا۔ ان کو چونکہ پسند مجھ کو نفرت شدید۔ وہ خس کا عطر لگائیں اور میں کہا کروں اس کمبخت کی خوشبو سے میری جان جائے، جنڈیوں پر اور وہ انگلیاں میں مہندی کے نام پر، مجھے شوق کہ ان کے صاف دانت دیکھوں اور وہ مسی کے سیاہ نتیجہ کیا ہوا۔ وہ جا کر بہشت میں بیٹھے اور میں نے کہا خس کم جہاں پاک ان کے جانے سے واقعی خس کے عطر کی خوشبو بلکہ بدبو سے نجات مل گئی لہٰذا خس کم جہاں پاک میں نے بالکل صحیح کہا۔

فرخندہ: مگر بھیا! نسرین اور جاوید تو ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

شیخ: میرا بھی یہی خیال تھا۔ مگر اب حالات کچھ اور نظر آ رہے ہیں۔ نسرین کو جس شدت سے انتظار تھا جاوید کا، اسی قدر وہ جاوید کو دیکھ کر مایوس ہوئی ہے۔

فرخندہ: اور جاوید بھی کچھ چپ چپ سا ہے۔ البتہ ایک دن یونہی کہہ رہا تھا کہ امی جان نسرین تو ایک دم میم بن کر رہ گئی ہے۔

شیخ: بے وقوف لڑکا۔ تم کو کہنا چاہیئے تھا۔ کہ اے عقل کے دشمن صاحبزادے وہ آپ کے لیے میم بن کر رہ گئی ہے۔ میں نے اس کو میم بنایا ہے کہ ولایت میں تعلیم پانے والے ایک لڑکے کی صحیح شریک حیات بن سکے مجھ کو کیا معلوم تھا کہ یہ صاحبزادے ولایت سے اس طرح آئیں گے گویا گاؤں سے غلہ جمع کرکے آئے ہیں۔ دیکھنا بیٹی کہیں ناامید سیاہی جلد پر تو نہیں آئی۔

ناہید: جی نہیں۔ ماموں جان بالوں ہی پر ہے۔

شیخ: بالوں پر تو ہونا ہی چاہیئے۔ بیٹی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ولایت جا کر جاوید کو آخر

ہوا کیا۔

فرخندہ: وہ جو باتیں کرتا ہے، ان کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں، وہ کہتا ہے کہ میں انگریز بننے نہیں گیا تھا پڑھنے گیا تھا۔ ایمانداری کے ساتھ پڑھا اور امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کر کے آیا ہوں۔

شیخ: تم کو معلوم ہے نسرین کیا کہہ رہی تھی۔ اس کے سامنے تو میں اس طرح چپ رہ گیا تھا۔ گویا مجھے ناگوار ہوا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بڑا برمحل مصرع پڑھا تھا اس نے کہنے لگی کہ ؎

لاکھ ملوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا

فرخندہ: بڑا غضب ہو جائے گا بھیا۔ اگر ان دونوں میں یہی اختلاف رہا۔

شیخ: غضب تو جو کچھ ہونا تھا میرے نزدیک ہو چکا ہے، اب تو حالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

فرخندہ: میری زندگی بھر کے ارمان کا یہ حشر ہوگا۔

شیخ: اپنے ارمان سے زیادہ ان دونوں کے ارمانوں کا خیال کرو۔

نسرین: ڈیڈی۔ ہلو آنٹی۔ ہلو ناہید۔ آپ لوگ کب آئیں؟

فرخندہ: بیٹی ہم تو تم کو پوچھ رہی تھی بھیا سے۔

ناہید: میں آپ کے کمرے میں بھی آپ کو ڈھونڈ آئی۔

نسرین: میں پکچر گئی تھی، ہلو ڈیڈی I say it is a wonderful Picture آپ نہیں گئے I missed you very badly

شیخ: بیٹی میرا خضاب کا دن تھا آج۔ ذرا دیکھنا Is it alright?

نسرین: کیوں لگتے ہیں ڈیڈی آخر آپ خضاب Why do you dye۔ اچھا میں جا رہی ہوں۔ کچھ سے میرے ساتھ میرے فرینڈ مسعود۔ ریاض اور خالد آئے ہیں۔ ان کو چائے پلانا ہے۔

شیخ: خانساماں سے کہہ دینا ذرا تیز سے چائے دے اور وہ بڑا کیک استعمال کر ڈالو۔

نسرین: O.k. Daddy، ناہید ڈیئر ابھی تو ہو نا۔ یا چلو تم بھی سب کے ساتھ چائے پی لو۔

فرخندہ: نہیں بیٹی اس کو رہنے دو۔ وہ لڑکوں میں کیا جائے گی۔

نسرین: ممی، یہ کیا بات ہوئی؟ Why is this لڑکوں میں جانے سے کیا ہو جاتا ہے۔ میں جو جا رہی ہوں۔

شیخ: ناہید کو رہنے دو بیٹا تم جاؤ۔ خانساماں سے کہہ دو یہاں بھی چائے بھیج دے۔

نسرین: O.k. Daddy (چلی جاتی ہے)

فرخندہ: بھیا سچ آپ نے بہت آزاد کر دیا ہے۔

شیخ: مجھے معلوم ہے کہ میں نے ضرورت سے زیادہ آزاد کر دیا ہے مگر تم کو بھی معلوم ہے کہ میں نے کیوں آزاد کیا

ہے۔ بار بار یہ بات مجھے کھوں کھلاتی ہو کہ میں نے کبھی جاوید کے قابل بننے کی کوشش کی۔ وہ جاوید جو ولایت گیا تھا اور جس کے سبب مجھ کو خیال حائل ہو گیا ہے کہ کسی قسم کی تہذیب جات کا منجمد ہوا آئے گا۔ تم کو معلوم ہے کہ جاوید کے ولایت جانے سے پہلے نسرین اسی لڑکی تھی۔ نسرین ناہید ہی کی قسم کی ایک لڑکی تھی۔ جس کو میں نے چنا ہے وہ لڑکا ابھی سے سمجھ نہیں کر سکتا جس نے سارا سال ولایت میں گذارے ہیں۔ لہذا جاوید کے لئے میں نے نسرین کو ہی چن لیا۔

جاوید: ذرا پرے آواز دیتا ہے۔ میں سنتا ہوں۔

ناہید: ماموں جان آگئے۔

شیخ: کون جاوید میاں۔ آ جاؤ بیٹے۔

جاوید: آتے ہوئے اندازہ ہوا کہ ماموں جان۔ میں کچھ بھی نہ معلوم ہو۔ ممانی جان اور ناہید یہاں ہیں۔

شیخ: اگر یہ معلوم ہوتا تو بھی تم یہاں آ سکتے تھے۔ بیٹھو نا۔ ادھر میرے پاس۔ آج برخوردار مجھے تم سے کچھ صاف باتیں کرنا ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں آدمی ہوں ذرا صاف قسم کا۔ میرے ذہن میں جو الجھنیں تمہارے متعلق ہیں اُنہیں تم تک نہ پہنچانا میرے نزدیک دیانت کے بھی خلاف ہے اور مروت کی بھی بد دلی ہے۔ کیوں بھئی فرزند، مجھے صاف بات کرنا چاہیے نا۔

جاوید: آپ ماموں جان ہیں۔ کیا پوچھتے ہیں۔ اگر مجھ پر آپ کو کچھ حق حاصل ہے تو بے شک آپ سے اجازت لے لیجئے۔ ورنہ میرے نزدیک تو اُس کی ضرورت نہیں ہے۔

شیخ: میں بغیر کسی تمہید کے براہ راست یہ سوال کرتا ہوں، کہ تم ولایت سے آخر کیا بن کر آگئے ہو؟

جاوید: ماموں جان اپنے نزدیک تو میں وہی بن کر آیا ہوں، جو مجھ کو بن کر آنا چاہیے تھا۔

شیخ: میں نے آج تک ولایت سے لوٹنے والے کسی طالب علم کو نہیں دیکھا کہ وہ سوٹ پہن کر جائے اور شیروانی پاجامے میں واپس آئے۔ میرے تصور میں تم اس طرح آیا کرتے تھے۔ کہ ولایت کی اعلیٰ تراش کے اسٹوڈنٹ سوٹ میں مرلی سی کمانی کی فیشن ایبل عینک لگائے تم ٹرین سے اترو گے، خالص انگریزی قسم کا مصافحہ کرو گے اور گھر پہنچ کر گھر کی فضائیں ہی بدل دو گے۔

جاوید: مگر میں آپ کی اُمید کے خلاف شیروانی، پاجامے اور دیسی جوتے میں ٹرین سے اترا اور السلام علیکم کہہ کر آپ کے سامنے ادب سے جھک گیا۔

شیخ: برخوردار اس میں سعادت مندی تو ضرور تھی۔ مگر یہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ تم لندن سے آ رہے ہو یا چھانگا مانگا سے، انگلستان سے آئے ہو یا قصور سے۔

جاوید: میں سمجھتا تھا کہ میری اِس سادگی اور میری اس شرقیت کو آپ پسند فرمائیں گے۔ میں بیشک یہاں سے سوٹ پہن کر ان لوگوں کے ملک میں گیا تھا جو یہاں آ کر شیروانی پہنتے ہیں نہ پاجامہ بلکہ اپنے ملکی لباس

میں رہتے ہیں۔ اور اپنی ہی معاشرت یہاں پیدا کر لیتے ہیں۔

شیخ: بات تو تم معقول کہہ رہے ہو مگر میں ذرا وضاحت سے سمجھنا چاہتا ہوں۔

جاوید: ماموں جان اس بات کا اندازہ تو مجھے وہاں جا کر ہوا کہ ہم ذہنی طور پر کس حد تک اُن کی غلامی کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم اُن کا کلچر اس طرح اوڑھ لیتے ہیں گویا خود ہمارا کوئی کلچر ہی نہیں اور ہم اُن کو بجا طور پر ناز کرنے کا موقعہ دیتے ہیں۔ کہ اُن کے کلچر نے ہم کو آدمی بننے کے قابل بنایا ہے۔ میرے ذہن میں صرف یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم اپنے وطن میں بیٹھے اُن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور وہ ہمارے یہاں آکر بھی اپنی اصلیت نہیں کھو دیتے۔ اس خیال نے مجھ کو خود مشرقی کلچر کی طرف متوجہ کیا اور میں نے وہاں رہ کر بجائے ذہنی غلامی کرنے کے اپنا کلچر ان کے سامنے پیش کیا۔

شیخ: دیکھنا بیٹا مغرب کی سیاہی جلد پر تو نہیں آئی۔

جاوید: جی نہیں۔ ٹھیک ہے۔ ماموں جان آپ کو حیرت ہو گی کہ میں نے وہاں کے درزیوں کو شیروانی کا نمونہ دے کر شیروانیاں اس سے زیادہ دام صرف کر کے بنوائیں جتنے میں سوٹ بنتا ہے مگر پہنی صرف شیروانی۔ میں صبح کے ناشتے میں بجائے دلیہ اور دودھ پینے کے اور بجائے ٹوسٹ میٹ اور انڈے کے خود پوریاں پکاتا تھا۔ اور آلو کی چٹپٹی ترکاری کے ساتھ نہ صرف خود کھاتا تھا بلکہ اکثر انگریز دوستوں کو اس ناشتے کا دلدادہ بنا آیا ہوں۔

شیخ: مگر برخوردار اس سے تو تم بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ان لوگوں میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔

جاوید: میں ان کی خوبیاں چھوڑ کر نہیں آیا ہوں۔ آپ مجھ کو وقت کا پابند پائیں گے۔ آپ مجھ کو محنتی اور جفاکش دیکھیں گے۔ کام کے وقت کام اور تفریح کے وقت صرف تفریح میرا بھی اصول ہے۔ معاملت میں صفائی اور دیانت کا میں بھی قائل ہوں مگر ان باتوں پر صرف سوٹ پہن کر اور سگار پی کر ہی عمل نہیں ہو سکتا۔

شیخ: برخوردار مجھے تمہاری باتوں کی معقولیت کا اعتراف ہے مگر میری ملاحظہ ہو کہ میں نے محض تمہارے لیے نسرین کو خدا جانے کیا کا کیا بنا دیا ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ولایت سے واپس آکر تم جس قسم کی شریک حیات چاہو وہ تمام صفات تم کو نسرین میں مل سکیں۔ میں نے اس کو نہ صرف کالج میں پڑھوایا بلکہ خاص یورپین ماحول میں رکھا۔ میں نے اس کو پیانو سکھوایا۔ میں نے اس کو ڈانس کی تعلیم دلوائی۔ وہ رائیڈنگ کر سکتی ہے۔ وہ سوئمنگ جانتی ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں بیٹھ کر مرعوب نہ ہو گی۔ وہ اس فراٹے سے انگریزی بولتی ہے اور اس کا لب و لہجہ اس قدر انگریز بہت سے سمجھتے ہیں کہ انگریزی اس کی مادری زبان معلوم ہوتی ہے۔

جاوید: میں یہ سب اندازہ کر چکا ہوں اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آپ نے یہ سب کچھ میرے ہی لیے کیا ہے

کہ حیرت صرف یہ ہے کہ اگر ان کو اس کی تمام سنت کی ضرورت ہوتی تو اس نقل کی کیا ضرورت تھی میں اصل ہی اپنے ساتھ ولایت سے کیوں نہ لے آیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ولایت میں اتنا زمانہ گزارنے کے بعد بھی نسائیت کے اس رنگ سے میں اجنبی ہی رہا اور ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ اس ولایتی حسن، اعوان و ولایتی اداؤں میں میرے لیے کوئی ہم جنسی نہیں ہے۔

فرخندہ: مگر اتنا سوال تو یہ ہے کہ اب کیا ہوگا۔

شیخ: اس کرامات کے نے دو دو بڑی گہری باتیں کر رہا ہے۔ اب بہ خود...

جاوید: ماموں جان۔ وہاں رہ کر میں نے پہلے اُس نسرین کے اسی تصور کو حاصل رکھا جیسا میں اس کو چھوڑ گیا تھا وہی ایک آپ سے پاک معصوم چہرہ۔ وہی دوپٹہ۔ وہی خواب۔ وہی شلوار اور وہی حیدر حیدری ماتھے پر ٹیکہ۔ ماموں جان ہماری مشرقی لڑکیوں میں جو ایک بے ساختہ جھجک در جھینپ ہے اس کا خدا کی قسم میں نے کہیں جواب نہیں دیکھا۔ وہ شرم اور وہ لاج جو مشرقی نسائیت کی روح ہے اس کے بغیر مغربی نسائیت بے روح نظر آتی ہے۔

شیخ: کیا تمھارے خیال میں کوئی ایسی صورت ہے کہ نسرین کو پھر مشرقیت کی طرف واپس لایا جا سکے۔

جاوید: مجھ کو پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکا کہ نسرین اپنے موجودہ رنگ میں کس حد تک ڈوب چکی ہے اگر اس نے اپنی اصلیت کی تجدید ابھی شروع نہیں کی ہے تو واپسی ناممکن نہیں ہے۔

فرخندہ: نہیں بیٹا وہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ اس غریب کو جیسا بنا دیا ہے وہ بن گئی ہے۔

شیخ: خیر۔ خیر میں اس قسم کی باتیں نہیں کرتا برخوردار تم خود اس کا جائزہ لو اور اگر اس کو واپس لا سکو تو مجھ سے زیادہ شاید کسی کو مسرت نہ ہو۔

جاوید: آپ سے کم خود مجھ کو بھی مسرت نہ ہوگی۔

شیخ: ذرا اس سے بات کر کے اندازہ تو کرو۔ ناہید بیٹی دیکھنا نسرین کے دوست گئے یا نہیں یہ بات تم نے لاکھ روپے کی کہی ہے کہ اگر تم کو یہی وضع قطع اور یہی معاشرت پسند ہوتی تو اس نقل کی کیا ضرورت تھی اصل ساتھ ہی لاتے۔ میں اس بات کی سچائی کا قائل ہو چکا ہوں۔

فرخندہ: اگر کوشش کی جائے اور شادی کے بعد رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔

جاوید: امی جان بس یہی بات غلط ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نسرین کے لیے میرے احساسات کیا ہیں مگر بغیر سمجھے بوجھے دو زندگیاں تلخ نہیں بنائی جا سکتیں۔

شیخ: بالکل ٹھیک ہے۔ بھئی معاف کرنا نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر معقول انسان بن کر آئے ہو میں تو تمھاری ظاہری وضع قطع کو تمھاری نامعقولیت ہی سمجھ رہا تھا۔

ناہید: (آتے ہوئے) نسرین آپا اپنے کمرے میں اکیلی ہیں پیانو بجا رہی ہیں۔

شیخ : میرے خیال میں تو تم پہنچ جاؤ برخوردار، خدا کرے تمھارے دلائل اس کو بھی اتنا ہی قائل کر دیں جتنا مجھ کو کیا ہے۔

جاوید : دیکھئے کوشش کرتا ہوں۔

(جاتا ہے۔ کچھ وقفہ۔ پھر پیانو کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی ہے۔ جاوید اجازت چاہتا ہے)

میں آسکتا ہوں۔

نسرین : (پیانو بند کرتے ہوئے) او منشی محمد جاوید صاحب Who is there ? (قہقہہ لگاتی ہے) By jove یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے جاوید۔ پیروں میں بندوں کے خلاف پہنے ہوئے ہیں اور یہ کیا نام ہے اس کوٹ کا شیروانی۔ کس قدر عجیب چیز ہے یہ بھی۔ اور معلوم نہیں بنیر (سُوکس) موزوں کے تم یہ ہیڈ دوم سلیپر قسم کا جوتا کیسے پہن لیتے ہو۔

جاوید : آپ کے دوست گئے۔

نسرین : جب وہ چلے گئے ہی ہے تھے میں نے تم کو جاتے دیکھا تھا۔ مگر میں نے بلایا نہیں وہ لوگ مذاق اڑاتے تمھارا بلکہ مسعود پوچھ بھی رہا تھا کہ تمھارے جو Causin ولایت سے آئے ہیں وہ کہاں ہیں۔ اب میں کیا بتاتی کہ وہ چیز تم ہو۔ چیز (قہقہہ)

جاوید : تم نے اچھا کیا کہ نہیں بتایا ورنہ میرے ساتھ تمھارا بھی مذاق اڑتا۔

نسرین : But, I don't know یہ تم بن کر کیا رہ گئے ہو۔ یہ تم کو ہوا کیا آخر۔ What's wrong

جاوید : کچھ نہیں نسرین۔ صرف یہ ہوا ہے کہ ولایت جاکر میری آنکھیں تھوڑی سی کھل گئی ہیں کہ ہم انگریزوں کی کس شدت سے ذہنی غلامی کر رہے ہیں۔ تم نے کبھی انگریز کو بھی دیکھا ہے کہ اس نے تمھارا ملکی لباس تمھارے ملک میں بھی آکر پہنا ہو۔

نسرین : یہ تو بالکل ویسی ہی بات ہوئی کہ جیسے کوئی افریقہ جاکر کوڑیوں کے ہار پہن لے۔

جاوید : کیا تمھارے خیال میں تمھارا کلچر ایسا گیا گزرا ہے۔

نسرین : What are you talking ہمارا کلچر ہی کیا ہے یہی کلچر جس کا تم نمونہ بنے ہوئے ہو؟

جاوید : ہاں بیشک۔ یہ جیسا کچھ بھی ہے مگر اپنا کلچر ہے۔ اور جس رنگ میں تم رنگی ہوئی ہو وہ خواہ کچھ بھی ہو تمھارا نہیں دوسروں کا ہے اور تم پر تہمت معلوم ہوتا ہے۔

نسرین : میں سمجھتی تھی کہ تم صرف وضع قطع ہی میں بدلے ہو مگر معلوم ہوا کہ تم ہر اعتبار سے اب سے سو سال پیچھے جا پڑے ہو۔ I wonder what is wrong with you

جاوید : ممکن ہے میرا قصور ہو مگر میں تمھارا قصور بالکل نہیں سمجھتا تم وہی بن گئی ہو جو تم کو بنا دیا گیا ہے۔ اور جو کچھ

تم کو بنایا گیا ہے۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ ماموں جان کا خیال تھا کہ میں بھی ولایت سے وہی بن کر آؤں گا جو عام قسم کے نوجوان بن کر آتے ہیں جو اپنی اصلیت کو بھول جاتے ہیں اپنے وقار کو خود اپنی نظروں سے گرا کر خود نگری کے بجائے احساس کمتری میں مبتلا ہو کر دوسروں کے قالب میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ ماموں جان نے تم کو میری نصف بہتر بنانے کی کوشش کی۔

نسرین: مگر تم وہاں سے نصف بدتر بن کر آ گئے۔ worst half (زہرخند لگاتی ہے)

جاوید: ہاں نسرین مجھ سے یہ قصور ضرور ہوا ہے کہ میں نے تم کو بھولا نہیں۔ کاش تم کو معلوم ہوتا کہ میں نے اس عرصے میں تمہارے اس لمحے کی کیسی پرستش کی ہے جب میں تم کو چھوڑ گیا تھا۔ میں بے صبری سے منتظر تھا اس وقت کا جب میں آؤں گا اور میری نسرین کی شرم آمیز تبسم میں ڈوبی ہوئی نظریں جانے کیا کیا مجھ سے کہہ ڈالیں گی۔

نسرین: Good Gracious. یہ تم کس دنیا کی باتیں کر رہے ہو جاوید۔ کاش تم کو بھی معلوم ہوتا کہ میں نے اس عرصے میں تمہارا کیا تصور قائم کر رکھا تھا کہ ایک فیشن ایبل مہذب Upto-date نوجوان۔ اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنے منہ میں پائپ لگائے ٹرین سے اترے گا۔ اور بڑھ کر میری طرف دوڑے گا۔ تم کو حیرت ہو جائے گی کہ جس نسرین کو وہ ایک جاہل گنوار اور دقیانوسی لڑکی چھوڑ کر گیا تھا وہ اب اس کے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر بن چکی ہے۔

جاوید: ہاں نسرین میں تم کو دیکھ کر قائل ہو گیا ہوں کہ واقعی خواب کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔

نسرین: مجھ کو بات ختم کر لینے دو۔ تم ٹرین سے اس طرح اترے کہ میں سکتے میں آ گئی I was shaked تم نے ایک ٹھنڈا سا سلام علیکم کیا اور میری تمام امیدوں پر اوس ڈال دی میں ایک دم بجھ کر رہ گئی۔ اب میں تم کو چھپاتی پھرتی ہوں اپنے کسی دوست سے تم کو ملا بھی نہیں سکتی میرے دوست تمہارا ذکر کرتے ہیں اور میں ٹال جاتی ہوں کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھ کو کچھ کم شاک پہنچا ہے مجھ کو تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم اپنے کو کھو کر آ گئے You have lost yourself تم نے اپنے کو گنوا دیا ہے۔

جاوید: اچھا اب ایک بات بتاؤ نسرین جہاں تک میں محبت کو سمجھ چکا ہوں یا یہ کہو کہ سمجھ سکا ہوں وہ تو اتنی کمزور چیز نہیں کہ ان سطحی اور ان ظاہری تبدیلیوں سے گھٹ بڑھ سکے۔

نسرین: No, No, No: تم ناولوں اور افسانوں والی محبت کی بات مجھ سے نہ کرو۔ جب میں اپنی کھلی آنکھوں سے تم کو دیکھ رہی ہوں کہ تم اپنے کو مہذب دنیا کے لیے Laughing stock بنا چکے ہو جتنا میں آگے بڑھی ہوں اتنا ہی تم پیچھے ہٹ چکے ہو تو میرے خیال میں میرا دماغ اتنا خراب نہیں ہونا چاہیے کہ میں اب بھی تم سے محبت کا دعویٰ کروں۔ میں اتنا بڑا جھوٹ کبھی نہیں بول سکتی۔

جاوید: تو پھر اس بات کو مانو نا کہ تم کو مجھ سے میری ذات سے محبت یا وابستگی نہ تھی بلکہ میری وضع قطع سے تھی۔

نسرین: My God میں تم کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے تم اب بھی عزیز ہو مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر میں کسی بی کے نیچے کو چمکارنے لگوں تو اس کو حیثیت شوہر کے بھی قبول کر لوں گی۔ جاوید تم یہ خیال تو اپنے دل سے نکال دو کہ ہم دونوں میں شادی بھی ہو سکتی ہے۔

جاوید: اچھا اگر میں اپنے اوپر جبر کر کے تمھاری مرضی کے مطابق Upto—date بن جاؤں تو۔

نسرین: تو مجھ کو یہ معلوم ہوگا جیسے کھویا ہوا جاوید مل گیا مجھ کو I assure you I will be too glad

جاوید: نسرین اب مجھ سے سنو کہ تم جاوید سے نہیں بلکہ کسی درزی کی دکان میں رکھے ہوئے اس مجسمے سے ملنا چاہتی ہو جس کو درزی نے سوٹ پہنا کر گاہکوں کو دکھلانے کے لیے رکھ چھوڑا ہو۔ جاوید کی جستجو ہوتی تو وہ تم کو مل جاتا مگر اب جاوید تم کو نہ مل سکے گا۔ اپنے تصور میں جو سوٹ تم نے اس کو پہنا رکھے تھے وہ ضرور مل جائیں گے۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ میں اپنے کو ولایت جا کر کھو آیا مگر اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ تم نے گھر بیٹھے اپنے کو گم کر دیا۔

نسرین: تم شاید برا مان گئے ہو مگر مجھے امید ہے کہ اتنی عقل تم میں ضرور ہوگی کہ تم یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے دور ہو چکے ہیں۔

جاوید: بہت دور۔ اتنی دور کہ میں تم کو واپس نہیں لا سکتا۔

نسرین: نہ تم واپس لا سکتے ہو نہ میں واپس آنا چاہتی ہوں جاوید تم بہت پیچھے ہٹ گئے ہو۔

(شیخ صاحب مع فرخندہ اور ناہید کے داخل ہوتے ہیں۔)

شیخ: بس میں یہی فیصلہ سننا چاہتا تھا۔ میں نے تم دونوں کی تمام گفتگو سن لی اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

فرخندہ: میری زندگی بھر کی تمنا کا یوں خون ہونا قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ (رونے لگتی ہے)

جاوید: امی جان ایسے حالات پیدا نہ کیجئے کہ سب سے تعلقات بھی ختم ہو جائیں باوجود ان تمام باتوں کے میں نسرین کا قصور نہیں سمجھتا۔

فرخندہ: نہیں بیٹا قصور تو ہے میرے مقدر کا۔

شیخ: قصور در اصل صرف میرا ہے مگر اس قصور میں نیک نیتی تھی کہ میں نے نسرین کو اس معیار پر لانا چاہا کہ ولایت سے واپس آنے والا جاوید اپنے کو کسی گھاٹے میں نہ سمجھے میرے حالات اگر مجھ کو اجازت دیتے تو شاید میں نسرین کو بھی ولایت بھیج دیتا۔

نسرین: مگر ڈیڈی مجھ کو یقین ہے کہ میں انگلینڈ جاؤں گی ضرور اور یورپ کی سیر ضرور کروں گی۔

فرخندہ: بیٹی تم یہ غور کرو کہ تم ایک مشرقی لڑکی ہو۔

جاوید: امی جان اب سمجھانا بیکار ہے۔ میں تو نسرین کا ممنون ہوں کہ اس نے نہایت صفائی کے ساتھ مجھ سے گفتگو

کی ہے۔

شیخ : اس عقدۂ مشکل کے ساتھ کہ میری طبیعت بھی صاف ہو گئی مجھ کو خود بھی اتنا اندازہ نہ تھا کہ اس تربیت نے نسرین کو اس حد تک بدل دیا ہوگا کہ جس کی چال ڈھال اور بولی بھی بدل گئی۔

نسرین : ڈیڈی Are you talking seriously

شیخ : میں صاحبزادی آئندہ مجھ سے براہِ مہربانی مادری زبان میں گفتگو فرمایا کیجئے۔ میں کم از کم صبر و آزادی سے یہ بتا سکتا ہوں کہ مجھ کو یہ بھی آتا ہے کہ میں تم کو اپنے ماحول میں واپس لاؤں۔

نسرین : But I mean to say that........ یہ بات یہ ہوئی ہے۔

شیخ : میں نے تم کو اتنی آزادی دی تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ بحیثیت باپ کے اپنے اختیارات سے کام لوں اور تمہاری شادی زبردستی جاوید سے کر دوں۔

جاوید : مگر ماموں جان معاف فرمایئے گا میں نسرین پر یہ ظلم نہیں کر سکتا۔

فرخندہ : تمہارے کیا مطلب بزرگوں کی باتوں میں کہیں بھی لڑکا اور لڑکی دخل دیتے ہیں۔

نسرین : آنٹی وہ زمانہ گزر گیا اب لڑکا اور لڑکی یہ اندھا جوا نہیں کھیل سکتے۔

شیخ : (روتے ہوئے) یہ دن دیکھنے کے لیے میں زندہ رہ گیا تھا۔ میری لڑکی اور میرے سامنے اس طرح زبان چلائے۔

جاوید : یہ بات آپ کو اس لیے بری معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی معاشرت اور آپ کے ماحول کے خلاف ہے مگر نسرین کو آپ ہی کی تربیت نے اس صاف گوئی کا عادی بنایا ہے۔ تو اب اس کا رنج فضول ہے۔

فرخندہ : بھیا آپ کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہے ہیں۔

نسرین : (جلتے ہوئے) شادی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے بیچ کسی کو اس طرح دبایا جا سکے I cannot tolerate this (چلی جاتی ہے)

شیخ : کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت آ جاتی۔

فرخندہ : اللہ نہ کرے، مجھ بدنصیب کا آپ کے اور جاوید کے سوا ہے ہی کون؟

شیخ : ناہید بیٹی دیکھنا جلد پر تو نہیں آئی خضاب کی سیاہی۔

ناہید : جی ہاں شاید آنسوؤں سے پھیل گئی ہے سیاہی۔

شیخ : بس تو پھر ٹھیک ہے۔ شکر ہے پروردگار تیرا۔ خود کردہ را علاج نیست۔ (ایک آہِ سرد)

ہم اور وہ

لڑکوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ لڑکیوں کے غلام بن کر رہتے ہیں ہم سب۔ نہ جانے اللہ میاں نے ہم کو لڑکا بنا کر کیوں پیدا کیا ہے۔ نہ پہننے کا مزہ نہ اوڑھنے کا۔ آخر ہمارے ہی ماں باپ کی بیٹی فرخندہ بھی تو ہے۔ دیکھیے اُس کے ٹھاٹھ۔ ستائیس کی عید تو جیسے سچ مچ اُسی کے لیے آئی تھی کہ کل رات کو چاند دیکھتے ہی اُس کے نخرے شروع کر دیے گئے۔ ہاتھ پیر کی بیسوں انگلیوں کو رنگا گیا۔ بال گیلے کر کے مینڈھیاں گوندھ دی گئیں کہ صبح عید کے دن جب یہ مینڈھیاں کھولی جائیں تو بال گھونگھر والے دکھائی دیں۔ جھلمل جھلمل کرتے ہوئے کپڑے آج ہی کے لیے نکالے گئے۔ اور جوتا تو اس کے لیے اتنا قیمتی آیا ہے کہ ان داموں کے ہمارے چار جوڑے جوتے آ جاتے۔ اور آج عید کے دن سے تو سویرے ہی سے اُس کے ایسے بناؤ سنگھار شروع کیے گئے کہ جیسے عید بس فرخندہ ہی کے لیے آئی ہے۔ نہ جانے کتنے زیور اس کے لیے نکالے گئے۔ ماتھے کا ٹیکہ۔ سر کا چھپکا۔ کانوں کے کرن۔ ہاتھوں کی چوڑیاں۔ گلے کا نکلس۔ پھر جب سرمہ لگ چکا تو نہ جانے کتنی کریمیں اُس کے منہ پر رگڑی گئیں۔ پھر پاؤڈر ملا گیا۔ گالوں پر سرخی لگائی گئی، ہونٹوں پر لالی رگڑی گئی۔ ہماری طرح تھوڑی کہ بس نہا کر جو نکلے تو سفید کرتہ پاجامہ پہن کر وہ شیروانی البتہ پہن لی جو عید کے لیے نئی سلوائی گئی ہے مگر حساب لگائیے تو جتنے کا ایک دوپٹہ ہے فرخندہ کا اتنے کا ہمارا پورا جوڑا بھی نہ ہوگا جوتوں سمیت ٹوپی بھی ملا کر۔

ہم دن بھر اسی بے انصافی پر کڑھتے رہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں میں آخر اتنا فرق کیوں ہے اور اگر فرق ہے تو آخر ہم نے کیا گناہ کیا تھا کہ ہم کو لڑکا بنا کر پیدا کر دیا گیا ہے جلنے اور کڑھنے کے لیے۔ لڑکی بنا کر پیدا نہیں کیا گیا کہ ہم بھی سر سے لے کر پیر تک آج سونے سے لدے چھم چھم کرتے پھرتے۔ ریشمی اور کامدار کپڑے پہنے جگمگ جگمگ نظر آتے سب کو۔ انگلیاں کیسی خوبصورت معلوم ہوتیں اگر ان کے ناخنوں پر وہی رنگ لگا ہوا ہوتا جو فرخندہ کے ناخنوں پر لگایا گیا ہے۔ یہ ڈنڈا جیسی کلائیاں کیسی اچھی لگتیں اگر ان میں چوڑیاں کھنکتی ہوتیں مگر یہ بھی اپنی اپنی قسمت ہے کہ وہ اپنی قسمت میں ریشم اور سونا لکھوا کر پیدا ہوئی ہے اور ہم اُس کے سامنے سچ مچ ٹھگنے نظر آتے ہیں۔

آج ہم دن بھر اپنے اور فرخندہ کے اسی فرق پر جلتے بھنتے رہے۔ عید کا سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا۔ اور رات کو بھی جب سب کے سب دن بھر کے تھکے ہوئے سونے کی تیاریاں کر رہے تھے جب امی جان نے فرخندہ سے کہا کہ "لو بیٹی اب زیور اور کپڑے

[illegible] تو اس نے ایک مرتبہ پھر سے اندر [illegible] تے کا [illegible] کیا اور سر پیچھے
پھینک دیا اور ہمت کر کے کہا: "امی جان میں بستر پر [illegible] بیٹھ کر دیکھوں [illegible] سب کچھ بھول کر
لے سب بیٹھنے کے بعد ہم اور ہم چل کر دو گئے کہ ایک [illegible] پھر [illegible] دیکھئے اور ایک ہم ہی کا آخر
[illegible] سمجھ کر کروٹ بدل لی۔
سامنے جانے پر [illegible] وہ اس وقت [illegible] پھر [illegible] بیٹھے
پھر خیال آیا کہ [illegible] کا [illegible] ہے۔ یہ خیال آتے ہی
[illegible] بیکنے [illegible] واقعہ [illegible] ہیں۔ مگر اب جو آئینہ کے سامنے
[illegible] بہت ہی [illegible] صاحب [illegible] ہیں۔ [illegible] خوش ہو کر
جاتی ہیں۔ [illegible] جو کی میں [illegible]
[illegible] پھول میں کہا کہ [illegible] سے [illegible] ہیں۔ [illegible] دیکھے [illegible]
بندھا ہوا تھا۔ سر پہ [illegible] تھے۔ گلے میں [illegible] تھا۔ [illegible] دیکھنے [illegible]
میں انگوٹھیاں دیکھ کر [illegible] نظر پڑی تو وہ بھی رکھے ہوئے ہے۔ [illegible] خوش ہو گیا کہ [illegible]
پڑا [illegible] دو پٹہ۔ [illegible] کرتی ہوئی [illegible] اور غرارہ تو ایسا تھا [illegible] نظر نہ ٹھہرتی تھی [illegible]
[illegible] ہوئی سینڈل۔ [illegible] کے ناچنے کو من [illegible] ——— [illegible]
اب تو کہنا چاہیئے کہ ناچی تو ہیں [illegible] خوشی سے تالی بجاتی دوڑی امی جان کو [illegible] سب کو دکھانے کہ اب [illegible] ہیں۔
مگر ابھی کمرے سے نکل کر [illegible] میں پہنچی ہی تھی کہ نانی اماں نے ایک ڈانٹ دی۔
صاحبزادی۔ صاحبزادی۔ حواسوں میں ہو کہ نہیں۔ بھلا یہ لڑکیوں کے ڈھنگ ہیں کہ [illegible] کی طرح ایک ٹانگ
سے اچکتی پھر رہی ہو۔"
امی جان نے بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا: "کیا مجال جو یہ صاحبزادی [illegible] چال کبھی چلیں۔ آخر ہم بھی تو تھے اپنے زمانے
میں پھونک پھونک کر نیچے تلے قدم رکھتے تھے کہ باپ بھائی آئے گئے کسی کو نام دھرنے کا موقع نہ ملے۔"
نانی اماں نے کہا: "یہ دو پٹہ اوڑھنے کا انداز ہے کہ جیسے گلے میں لالٹین کی تی پڑی ہو [illegible]۔ بہو یہ پرائے گھر
جانے کے ڈھنگ نہیں ہیں۔"
امی جان نے ہاں میں ہاں ملائی: "پرائے گھر جا کر بھی اماں باوا کے نام دھروائیں گی کہ اچھی تربیت دی ہے بیٹی کو۔ میں
بیکتی ہوں میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اب تمہاری عمر اتنی ہڑدنگوں کی نہیں ہے جو لہا [illegible] دیکھو۔ یہ عمر ہے کہ آئی
اور سوئی میں دھاگہ تک ڈالنے کی لاڈلی کو تمیز نہیں ہے۔ اب کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو جاؤ جا کر بوا نصیبن کا ہاتھ بٹاؤ
باورچی خانہ میں۔ آٹا گوندھا جا کر۔"
اور یہ کہہ کر بوا نصیبن کو آواز دے کر امی جان نے کہہ دیا کہ یہ آ رہی ہیں محمودہ بی بی ان سے کام لو۔ گویا محمودہ میاں سے
محمودہ بی بی بنتے ہی یہ قدر ہوئی ہماری کہ بوا نصیبن کی ماتحتی کرنا پڑی۔ مگر اب ہم ہی کیا سکتا تھا خود ہی تو لڑکی بننے کی دعائیں
مانگیں تھیں وہی مثل کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی، جانا پڑا باورچی خانہ میں جہاں بوا نصیبن حکم چلانے کے لیے تیار ہی بیٹھی تھیں ہماری

صورت دیکھتے ہی کہا :

"یہ لیجئے بی بی لگیں اور اس بہیں لا دیجئے کوٹھڑی میں سے آٹا اور بیٹھ کر گوندھئے میرے سامنے۔ ملنے کی بات کے بیچ کلام میں شکر ہے کہ بیگم صاحبہ کو اب ہوش آیا ہے میں تو سمجھی تھی کہ بیٹی کو وہ یوں ہی لاڈ پیار میں رکھ کر چولہا ہانڈی سینا پرونا کچھ بھی نہ سکھائیں گی۔"

میں نے امی جان اور نانی اماں کا غصہ بوا نصیبن پر اتارا "خیر تم سر پکڑ بیٹھے کو بیٹھنے دو مجھے بتاؤ کتنا آٹا نکالوں۔"

بوا نصیبن نے آنکھیں مٹکا کر کہا "واہ صاحبزادی واہ کیا میٹھی زبان ہے۔ جیتی رہو اسے لڑتی ہو۔ ذرا درشتی ہی سے کھا کیا ہے جو آئیں وہاں سے مجھ پر نہ جانے کس کس کا غصہ اُتارتے۔ میری بلا سے تم کرو یا نہ کرو کام۔"

بوا نصیبن نے یہ بات اتنی اونچی آواز میں کہی تھی کہ امی جان اور ان کے پیچھے پیچھے نانی اماں دونوں باورچی خانہ میں آموجود ہوئیں اور امی جان نے آتے ہی کہا "کیا بات ہے آخر۔"

بوا نصیبن نے خوب نمک مرچ لگا کر کہنا شروع کیا "سرکار میں نے بس اتنا کہا تھا کہ بی بی کوٹھڑی سے آٹا نکال لاؤ تو میں تم کو گوندھنا سکھا دوں۔ چار دن میں چولہے ہانڈی کا سارا کام سکھا دونگی۔ بس اتنی سی بات پر خفا ہو گئیں کہ میں یہ شوشہ سننے نہیں آئی ہوں یہ بکھیڑ ختم کرو۔"

نانی اماں نے کہا "یہ صاحبزادی تو اب خدا ہی ہے جو لڑکیوں کے ڈھنگ سیکھیں۔"

امی جان نے غصہ سے کہا "ڈھنگ تو سیکھیں گے ان کے فرشتے، نہیں تو مجھے گلا گھونٹ دینا بھی آتا ہے سب بارہ ہاتھ کی زبان جس وقت سسرال سے کر جائیں گی وہاں تھوکا تو جائے گا ان کی اوقات پر۔"

میری یہاں یہ گت بن رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ صحن میں فرخ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک زخندہ تھا آدھی آستینوں کی سفید قمیص اور نکر پہنے چھلانگیں مارتا پھر رہا ہے اور اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا کہ یہ کیا ڈھنگ میں یہ ننگا پہناوا۔ یہ اچھل کود بیستگے سر بال اچھال اچھال کر اس کا کودنا کس قدر آزاد ہے وہ بھی میری طرح نہیں کہ وہ پیدا ہوتے سرکا نہیں کہ آفت آگئی۔ چال میں ذرا تیزی آئی نہیں کہ روک ٹوک شروع ہو گئی۔ میں ابھی اُسے رشک کی نظروں سے دیکھ ہی رہی تھی کہ امی جان نے ڈانٹنا شروع کیا :

"اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیا بیٹھی ہے۔ آٹا آخر کب گندھے گا فرخ غریب بھوکا پھر رہا ہے۔ تیسرے پہر کو بھی اُسے ڈھنگ سے ناشتہ نصیب نہیں ہوتا۔"

نانی اماں نے کہا "وہ تو اس لیے نصیب نہیں ہوا کہ لڑکی ذات ہو کر ان کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ ابھی بھائی نے ناشتہ نہیں کیا ہے وہ کھیل کود کر تھکا ہارا واپس آئے گا تو کیا کھائے گا خود ناشتہ کر کے بیٹھ رہیں۔"

امی جان نے کلمہ کی انگلی ہلا کر کہا "دیکھو کان کھول کر سن لو شریف بہو بیٹیوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مرد کے لیے چاہیے وہ باپ ہو یا بھائی یا کوئی اور پہلے چیز نکال کر رکھ دی پھر خود کھائی آج تو میں نے کچھ نہیں کہا ہے مگر اب نہ ہو ایسی بدتمیزی۔ چلو گوندھو آٹا۔"

بیٹھنے لگی ہیں آٹا گوندھ کر رکھ دو ... اماں ایک مسئلے میں تھیں۔ جلدی جلدی بڑی اخوت والی
کی شادی آنے کو ہے
امی جان کہنے لگیں: بات یہ ہے کہ کسی کسی کا دل ادھر ہو ہی نہیں سکتا۔ بوا نصیبن ... تو کبھی کرائے سے جو نوکر
... یہ آٹا گوندھنا ہی آ جائے ... سامنے میرے آٹا گوندھا کرو گی۔
بوا نصیبن بھی کہنے لگیں خدا کی قسم آٹا گوندھ کے دکھا دوں بیٹا کر اور تھوڑا سا آٹا اور اس آٹے میں ملا کر ... منہ کھول
میں نے دونوں ہاتھ اس آٹے میں ... اب مصیبت یہ تھی کہ آٹا ہاتھوں میں چپک جاتا ہے اور کبھی آٹے سے ہی جاتی ہے
سب سے بہت گوندھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ جیسے میں آٹے کو نہیں بلکہ آٹا مجھے گوندھ رہا ہے۔ امی جان الگ بیٹھی ہنس
رہی ہیں۔

— بھئی یہ لڑکی ذات کے دھندے ہیں۔ تم بڑی ہو گئی ہو اور اب تک آٹا گوندھنا نہیں آیا۔
نانی اماں بولیں کیا۔ اس کو کچھ شوق ہی نہیں ہے یہ تو گڑیا ہے بس ہر وقت گڑیوں ہی میں تو لگی رہتی ہے کھیل ہی ایسے
ہوتے ہیں کہ کھیل ہی کھیل میں سب کام سیکھا جاتا ہے جیسے تم نے دیکھا نہیں کیسے ہنڈ کلہیا پکانے
امی جان نے کہا: تو دیکھئے وہ کبھی چولہے کا رخ نہیں کرتی۔ ہر دم تب کہا کہ اپنی گڑیا کی شادی کرو اور اس کا جہیز
تیار کرو امی بھلے سوئی پکڑنے اور ... میں وہ سلائی کا دھندا تو سیکھے گی۔
نانی اماں نے کہا: نہیں اسے ان باتوں کا شوق ہی نہیں ہے۔ تو دیکھو آٹے کی کیا گت بنائی ہے۔
امی جان نے مجھے میرے سامنے سے دونوں طرف کھسکا کر کہا: یہ آٹا گوندھنے کے لیے تو معلوم ہوتا ہے جیسے ہاتھوں میں دم ہی
نہیں ہے یوں چاہے سارے زمانے میں ڈنڈے بجاتی پھر لو۔ صاحبزادی دیکھو اس طرح سے یوں مکے چلائے جاتے ہیں ہاتھ
اور یہ کہہ کر امی جان نے آٹے میں پے در پے چند ہی ہاتھ مار کر جلدی سے آٹا گوندھ دیا۔ اور اب میرے سر پر آفت رہ
گئی کہ صبح ناشتے کی پوریوں کے لیے مجھ ہی سے آٹا گندھوایا جاتا تھا۔ دوپہر کو کھانے کے لیے بھی میں ہی آٹا گوندھتی۔ گویا بات
سکھانے کے لیے پھر بوا نصیبن کی شاگردی میں آٹا گوندھنا پڑا۔ آٹا گوندھنے کی مشق کے بعد بوا نصیبن نے پیڑے بنانا
سکھائے۔ پھر ہاتھ سے روٹی بنانا اور روٹی کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے چپاتی بنانا سکھایا۔ شروع شروع میں تو کبھی میں نے
... کا نقشہ بنا دیا تو کبھی روٹی کی شکل اچھی خاصی دوپلی ٹوپی کی بن کر رہ گئی مگر رفتہ رفتہ مجھ کو چپاتی توے تک پہنچانا آ گیا مگر
... یہ مصیبت ... کہ توے پر چپاتی ڈالنے کے بعد اس کو الٹوں کیسے۔ یہ کوشش جب کبھی کی انگلیاں توے سے لگ کر جل
گئیں۔ ایک طرف تو یہ تکلیف دوسری طرف خدا بچائے ان بوا نصیبن سے ایسے کڑے تیوروں سے بات کرتی تھیں کہ جی چاہتا
تھا کہ بس چلے تو اس چڑیل کے منہ پر مار کر باورچی خانے سے نکل جاؤں مگر بوا نصیبن کو خدا نے یہ موقع دیا تھا کہ وہ مجھ سے
اگلا پچھلا سارا حساب چکا لیں اس لیے ان کی باتیں بھی سننا اور سہنا پڑتی تھیں۔
ہائے کیسا رشک آتا تھا فرخ کو دیکھ کر جو شام کو اپنی ہاکی اسٹک لیے کھیل کود کر گھر میں آتا تھا اور پھر پنکھے کے نیچے
بیٹھ کر سب سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا تھا۔ کبھی کیرم کھیلتا۔ کبھی بیڈ منٹن اور کبھی امی جان سے اجازت لے کر سینما چلا جاتا تھا اور

ایک میں تھی کہ اسی وقت اس قیامت کی گرمی میں چولھے کے سامنے بیٹھی جھک کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ کہیں میرے منہ سے بھی نکل گیا تھا کہ امی جان میں بھی سینما دیکھوں گی۔ بس کچھ نہ پوچھئے سارا گھر ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا کہ اس نے آخر یہ بات کہی کیسے۔ امی جان باتیں سنا چکیں تو نانی اماں نے خبر لینا شروع کی وہ تھک گئیں تو پھر امی جان شروع ہو گئیں۔ وہ تو کہئے کہ اسی وقت کہیں ابا جان کو اللہ میاں نے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیج دیا اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے سینما جانے کے لیے کہا تھا تو وہ بجائے خفا ہونے کے کہنے لگے کہ "میں خود لے کر جاؤں گا اپنی بیٹی کو"۔ اس کے بعد پھر تو ان میں اور امی جان میں لڑائی شروع ہوئی ہے تو سچ مجھ کو رونا آ گیا کہ یہ سب کچھ مجھ کمبخت ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھ گئی کہ ابا جان نے امی جان سے کہہ دیا کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ لڑکیوں کو لونڈیوں کی طرح رکھا جائے۔ اور امی جان نے اس کے جواب میں ان سے کہہ دیا کہ زندگی بھر بیٹی کو گھٹنے سے لگائے بیٹھے رہنا۔ اسی لاڈ پیار نے تو بٹیا کا ناس مار کر رکھ دیا ہے یہ عمر ہونے کو آئی اور یہ صاحبزادی کو شانکہ بھرنا آیا نہ ہانڈی میں نمک ڈالنا"۔ ابا جان کے منہ سے نکل گیا کہ میں نے دیکھی ہیں تمہاری بہنوں کی لڑکیاں بھی جن کو بیگم بننے کی نہیں بلکہ کنیز بننے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ اس بات پر امی جان نے بھی میری تمام پھوپھی زاد اور چچا زاد بہنوں پر ایسے نام دھرے کہ ابا جان غصے میں تاؤ کھاتے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نانی اماں نے سارا غصہ مجھ پر اتارا۔

"اب تو کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ اماں باوا میں چوٹ ڈلوا کر جی خوش ہو گیا۔ گھر بیٹھے سینما دیکھ لیا"۔

امی جان نے کہا "ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ وہ غصہ کریں مگر میں ان صاحبزادی کو وقف کر دوں گی اگر یہ اپنے چچاؤں کی لڑکیوں کے ڈھنگ پر گئیں یا ان کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ ان کا کیا ہے وہ تو لڑکیوں کو لڑکوں کی اٹھان اٹھا رہے ہیں۔ سائیکل ان کی لڑکیاں چلائیں۔ گیند بلا ان کی لڑکیاں کھیلیں۔ رسیاں تان تان کر وہ پھاندیں۔ دوڑ ایسی لگائیں کہ جیسے تانگے کا گھوڑا۔ مگر میرے یہاں یہ نہ ہو گا"۔

اس تمام آفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں بھوکی پیاسی مرور کر بیٹھی جان دیتی رہی اور اسی طرح سو گئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ ابا جان نے بھی فاقہ کیا اور امی جان نے بھی نانی اماں کا البتہ دل گھٹ رہا تھا اس لیے دو چار نوالے کھا کر انھوں نے پانی پی لیا تھا۔

میری شامت کہ اسی دن میرے چچا کی لڑکیاں نوشابہ اور رخسانہ بھی آ گئیں۔ سچ پوچھئے تو مجھے ان کے سامنے بڑی شرم آئی کہ میں بوا نصیبن کی ماتحتی میں بیٹھی چولھا پھونک رہی تھی اور یہ دونوں مس بابا بنی اعلیٰ درجے کے کپڑے پہنے بنی سنوری آئی تھیں مجھے دیکھ کر ان دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ نوشابہ نے کہا:

"اوہ محمودہ یہ تم کو کیا ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم کو محمودہ بوا کہنا چاہیے"۔

رخسانہ نے کہا "چھوڑو یہ چولھا ہانڈی چلو تم کو اپنے اسکول لے چلیں وہاں آج فینسی فیر ہے"۔

نوشابہ نے کہا "میرے خیال میں ان کو اسی طرح لے چلیں۔ فینسی فیر تو ہے ہی کہہ دیں گے کہ یہ ماما بن کر آئی ہیں"۔

یہ دونوں اسی قسم کی باتیں بنا رہی تھیں کہ امی جان نے آ کر کہا "جلدی کرو آٹا گوندھ کر روٹی ڈالو اس کے بعد کلام

[illegible] اسلام کی بابت پوچھا:

[illegible] نے کہا: [illegible]

[illegible]

[illegible] تھی :

[illegible] نے کہا: [illegible]

[illegible] نے کہا: [illegible]

[illegible] نے کہا: [illegible]

[illegible] نے کہا: [illegible]

ہے :

قاضی واں نے قطعی فیصلہ کر دیا: [illegible]

قاضی واں کے فرزند نے: [illegible] ہیں کہ

سب غلط کہو کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

دل میں آیا کہ آئینہ کے سامنے جائیں اور دیکھیں تو سہی کہ کہیں [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] چلنے پر مجبور ہوئے کہ کہیں شرمندہ ہو کر یہ نہ کہنا پڑے کہ

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے

واقعہ یہ ہے کہ ہم، ہم ہیں اور وہ، وہ: آخر لاحول پڑھ کر ہم اس فلسفہ کی گردش کرتے ہوئے دل سے کچھ نہ کر کے سو گئے کہ

عورت کے خدا کتنے ہیں مردوں کا خدا ایک

(غیر مطبوعہ)

(قاضی جی)

قائدِ اعظم میموریل فنڈ

(قاضی جی تشریف لاتے ہیں)

قاضی جی:- ارے بھئی بیگم! سنتی ہو۔ عجیب خدا کی رحمت ہے اس گھر پر کہ گھر والی کام کے وقت ہمیشہ غائب رہتی ہیں۔ اب کبھی جو پتہ چلے۔ ارے صاحب کہاں ہیں آپ۔ للہ جواب دے دیجئے۔

بیوی:- توبہ ہے! منہ کے سامنے کھڑی ہوں۔ چیخ رہے ہیں۔

قاضی جی:- کیا خوب یہ گویا آپ تشریف فرما ہیں۔ [illegible] دھوپ سے منہ چھپا کر بیٹھی ہو کہیں مجھ کسی نے بستر و تزدھوپ کھانے کے لیے رکھ دیے ہیں [illegible] ہاں یہ کہنے کو [illegible] تھا کہ میرے ایک بہت پرانے دوست جن کے متعلق میں سمجھا تھا کہ واصل بحق ہو چکے ہوں گے [illegible] آگئے ہیں [illegible] تم جانتی ہوگی ان کو بھولا سا نام ہے ان کا زبان پر نہیں آرہا ہے۔ لاحول ولاقوۃ: یعنی ابھی [illegible] ذہن سے نکل گیا۔ ارے بھئی وہی جو بڑے اچھے شاعر بھی ہیں۔ مشاعرے اکثر کیا کرتے تھے

بیوی:- انجم صاحب تو نہیں؟

قاضی جی:- انجم۔ لاحول ولاقوۃ! اس کا تو میرے سامنے نام بھی نہ لو۔ خود غرض۔ دوست مار۔ ابن الوقت۔ ایسے مطلبی دوست تو خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان ہی حضرت کی وجہ سے آج میں [illegible] کا دودھ دہی گھی وغیرہ استعمال کرتا ہوں۔ میری بھینس کو گم کرانے میں ان ہی بزرگ کا ہاتھ تھا۔

بیوی:- توبہ ہے اب وہ بھینس یاد آگئی ہوگی دس برس کی بات۔

قاضی جی:- دس برس کی بات ہو یا سو برس کی جو بات دل میں [illegible] جاتی ہے وہ گرہ بن جاتی ہے۔ ارے بھئی آپ پولیس میں تھے۔ اپنے ہر وقت کے ساتھی تھے۔ اگر ذرا بھینس کو ڈھونڈ دیتے تو کونسی بڑی بات تھی مگر اس بندۂ خدا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ارے بھئی سنو۔ ذرا میری پشت کو [illegible] دھوپ میں تو بیٹھی ہی ہو ذرا دیکھو تو کم بخت کوئی جوں وغیرہ تو نہیں ہے۔ رات بھر کھجلی رہتی ہے۔

[illegible] :- جی وہ تو [illegible] آپ کے بیٹے

بیوی :- [illegible] کے [illegible] تو [illegible] کر سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ [illegible]

قاضی جی :- [illegible] آپ [illegible] کیسے [illegible] [illegible] [illegible] کر [illegible] ہیں [illegible] [illegible]

فرمائش کر دیجئے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] حاضر ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

کر رہے ہیں۔ کیا خوب آپ کو دیکھ کر [illegible] [illegible] ہیں [illegible] سے [illegible] کرتے ہوئے۔ یہ حضرت [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] ہیں۔ [illegible] [illegible] واقعی شاعر آ رہے ہیں؟

بیوی :- وہ [illegible] شاعر ہیں۔

سراج :- جناب جب ہی تو [illegible] کسی [illegible] [illegible]

قاضی جی :- وہ حال وہ وقت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کرنے کے علاوہ [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] کر معلوم ہوتا ہے [illegible] [illegible] [illegible] کر دیا [illegible] [illegible] [illegible] ہیں۔ [illegible] [illegible] [illegible]

ہے۔ یہی تو شاعر کے کرنے کو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

سراج :- بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ [illegible] تو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تو طبیعت [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔

قاضی جی :- اور میرا یہ عالم ہے کہ [illegible] [illegible] [illegible] کا نام [illegible] [illegible] زندگی [illegible] کی کوشش [illegible] شروع کر دیتی ہے دیکھئے

آپ نے بھی [illegible] طبیعت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] شاعرانہ [illegible] [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

آئے ہیں ان کا ذکر پھر رہ گیا۔ [illegible] وہ میرے نہایت عزیز دوست ہیں۔ ہاں [illegible] ہے [illegible] [illegible] ہے۔

سراج :- کون عزیز؟ وہ [illegible] [illegible] تو نہیں جن کے دیوان کا نام ہے کسب کمال

قاضی جی :- جی ہاں! یہ نام میں ہی نے تو رکھا تھا ان کے دیوان کا اور [illegible] [illegible] [illegible] کسب کمال [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

بڑا خوش فکر شاعر ہے اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ایک مشاعرہ [illegible]

ہی جاتا ہے۔ اس کی غزل [illegible] [illegible] اور میں ان سے یہ کہنے آیا تھا کہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ایک مشاعرہ۔

بیوی :- میرے یہاں اب مشاعرہ وشاعرہ نہیں ہو سکتا۔ [illegible] [illegible] روزمرہ کے اخراجات [illegible] [illegible] وہ آئے مشاعرہ کرنے۔

قاضی جی :- اخراجات ہی کی وجہ سے تو تم سے [illegible] کی ضرورت پیش آئی ورنہ کوئی [illegible] سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آپ نے

[illegible] کہہ دیا کہ مشاعرہ وشاعرہ نہیں ہو سکتا۔ اتنا بڑا میرا دوست [illegible] کے بعد [illegible] ہے۔ میں تو واقعی یہ سمجھا تھا کہ بیچارہ [illegible]

ہوگا مگر وہ زندہ سلامت آ گیا۔ دوسرے مشاعرے میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے۔ پان، سگرٹ، چائے۔ اور دری، چاندنی، قالین وغیرہ

سب [illegible] یہاں سے آ جائیں گے۔ شہرت کی شہرت اور تواضع کی تواضع۔

بیوی :- وہ تو ٹھیک ہے مگر میں طے کر چکی ہوں کہ اس وقت جتنے اخراجات ہیں سب میں کمی کر کے [illegible] [illegible] [illegible] زیادہ

سے زیادہ جو کچھ مجھ سے دیا جائے گا وہ میں [illegible] کی۔

قاضی جی :- [illegible] کا کون [illegible] [illegible] تم نے؟ اللہ مجھ سے انگریزی نہ بولا کرو۔ معلوم ہے کہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اے بی اے

مگر بیگم صاحبہ ہی کی اپنی انگریزی دانی کی وجہ سے زندگی اجیرن کیے ہوئے ہیں۔

زبیدہ :- بھائی جان! انھوں نے کہا ہے قائدِ اعظم میموریل فنڈ یعنی ———

قاضی جی :- بھئی تم چپ رہو۔ میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں۔ ایک گریجویٹ چپ ہو جائیں تو دوسری ایل۔ ایل ڈی چلیں ماں کا ریکارڈ لگانے آپ بتائیے سراج میاں یہ کیا بات ہے۔ بات یہ ہے کہ جہاں قائدِ اعظم کا نام آجاتا ہے وہاں میرا سر موت کے عالم تک جاتا ہے اور میں اس نام کے آنے کے بعد پھر اپنے دل کو قابو میں نہیں رکھ سکتا مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قائدِ اعظم کے نام سے دھوکے دیئے جائیں۔

سراج :- الحمدللہ کہ آپ کے دل میں ہمارے محسنِ اعظم اور پاکستان کے معمار کا اتنا احترام موجود ہے۔ بات یہ ہے بھائی جان کہ ہمارے محبوب قائدِ اعظم کی پیدائش کا دن ہے اور اسی دن سے ہمارے گورنر جنرل ہز ایکسیلنسی الحاج خواجہ ناظم الدین قائدِ اعظم میموریل فنڈ کا افتتاح فرما رہے ہیں۔

قاضی جی :- ہاں! یہ کوئی نہایت اہم بات ہے۔ للہ انگریزی نہ بولو مجھ کو سمجھ لینے دو کہ یہ ہے کیا۔

سراج :- میں عرض تو کر رہا ہوں بھائی جان کہ میموریل فنڈ کا مطلب یہ ہے کہ ایسا چندہ جس سے یادگار قائم ہو سکے حضرت قائدِ اعظمؒ کے احسانات قوم کبھی نہیں بھول سکتی۔

بیوی :- غلامی سے نجات دلانے والے کو کون بھول سکتا ہے۔

زبیدہ :- دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے بانی کو تاریخ کبھی نہیں بھول سکتی۔

قاضی جی :- صاحب آپ دونوں کی قابلیت کے سامنے میں سر جھکاتا ہوں۔ آپ کی قابلیت مسلّم۔ آپ کی ماہری تسلیم مگر التجا کرتا ہوں کہ مجھ کو بھی ذرا سمجھ لینے دیجئے کہ یہ واقعہ کیا ہے میں اس وقت نہایت سنجیدگی سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

بیوی :- سمجھنا ہی کیا ہے۔ بس کہہ تو دیا کہ قائدِ اعظم کی یادگار ان کی احسانمند قوم کو ایسی بنانا چاہئے جو ان کے شایانِ شان ہو اور اس یادگار میں قوم کے ہر فرد کا بڑے سے بڑا حصہ ہونا چاہئے۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ تین کروڑ روپیہ جمع کیا جائے جس میں ایک عالی شان مقبرہ تعمیر ہو ایک جامع مسجد ایک دارالعلوم اور ایک ٹیکنیکل درسگاہ۔

قاضی جی :- فرما چکیں آپ؟ اچھا بھائی سراج میاں آپ فرمائیے کیا کہہ رہے تھے؟

سراج :- بس میں یہی عرض کر رہا تھا کہ ۲۵ دسمبر سے یہ فنڈ کھولا جا رہا ہے اور ضرورت اس کی ہے کہ ہم سب مل کر قائدِ اعظم کے اس احسانِ عظیم کو یاد کریں جو قیامِ پاکستان کی صورت میں ملتِ اسلامیہ پر عموماً اور اس برِ عظیم کے مسلمانوں پر خصوصاً قائدِ اعظم نے فرمایا ہے۔

قاضی جی :- کس کو انکار ہو سکتا ہے اس سے اور کون قائدِ اعظم کی یادگار قائم کرنے کی مہم میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینا چاہے گا۔ یہ تو سخت احسان فراموشی ہوگی اگر اس وقت بھی ہم اپنی غیر ضروری اور فضول خرچیوں پر اس فنڈ کو ترجیح نہ دیں۔

بیوی :- یا اللہ تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج تو ایک بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ آج میں نذر مانا کروں گی۔

قاضی جی :- یہ تو جناب آپ کی زبردستی ہے کہ آپ نے مجھ کو ایک سرے سے بالکل ہی ناسمجھ سے کر رکھا ہے۔ جو بات معقول ہوگی

اس لئے میرے خیال میں [illegible] اسی میں ہے کہ آپ لوگ اس پر غور فرمائیں کہ ذائقہ کا تعلق جہاں تک ہے آپ لوگ اس بات کے قائل ہو جائیں۔ تو ناظرین! وہ کام کرنے کے لیے تو تم اگر کوئی بھی ذرا سا [illegible] کر بھلا سے پہلے وہ ہوں۔

زبیدہ :۔ [illegible] اچھے سے اچھا کون نہیں کھاتا ہے صرف اس احساس کی کہ

قاضی جی :۔ بس انہی باتوں سے مجھ کو الجھن ہے کہ آپ کا یہ احساس اور اس کی ضرورت کا اظہار جس طرح بہانے بنائے گا۔ کتابوں کی یہ صاحبزادیاں جو اتنے بڑے بڑے الفاظ بولتی ہیں مثلاً احساس وغیرہ کا حقیقت تک پہنچنا یاد ہے جب ایک بکرا ذبح ہوا تھا۔ اس سے پہلے تو ہم پہیہ بھی نہیں لیا تھا۔ آج کل گوشت کتنا ملتا ہے اور ابھی رات کو کس طرح [illegible] ہو کر اچھا خاصا گوشت کھانے کو ہے۔

بیوی :۔ واقعی رات کا گوشت ایسا مزہ تھا کہ تعجب ہے کہ تم بھول گئے۔

قاضی جی :۔ بجا ارشاد۔ اب گریہ ہی بات کی گئی تو سارا گوشت ہی بجائے ہر آن بھی ہو جائے جس کا کوئی جواب نہیں۔ بیگم صاحبہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں اس قسم کے خاندانوں سے جن کے لوگ ذرا سا مزا چکھ کر اس کا نمک بتا دیا کرتے تھے۔

زبیدہ :۔ لیجئے میرے اللہ! آپ بھی جب بات کرنے پہ آتے ہیں تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

بیوی :۔ اور حال یہ ہے کہ مزا درہ بہم اور گوشت وغیرہ کے کباب یا کوفتے کچھ بھی ہوں اور یہ مزہ کا چٹخارے جو بھی ان پر گوشت کا۔

قاضی جی :۔ دھوکہ تو خیر یہ ہے کہ بڑے بڑے دکانداروں سے بھی کہا۔ یہ عورت سے ہے کہ ہماری جو مسلم قوم کے بے جان بوڑھے انجان ہو گیا ہوں۔ سو دہرے یہ واقعہ ہے کہ ترکاریوں کے کباب بنانے میں تم کو کمال حاصل ہے۔ سراج میاں! ہماری بیگم کو یہ کمال ضرور حاصل ہے کہ ان کے پکائے ہوئے کھانے ہیں جو چیزیں پکائی ہیں ان کا مزا کبھی نہیں آتا۔ گوشت پکا ہو تو ترکاری کا مزا آئے گا ترکاری پکائیں گی تو گوشت کا دھوکہ ہوگا۔ اس روز فیرنی پکائی تھی تو ایسا لگ رہا تھا کہ دو پٹوں میں لپیٹنے والی تھیں کہ اس میں شکر گر پڑی۔

سراج :۔ کیسی بھی نہیں بھائی جان! فیرنی تو وہ نہایت لذیذ تھی۔

بیوی :۔ اس وقت کیا معلوم جو مزہ کے چٹخارے لے لے کر کھا رہے تھے اور اب وہ فیرنی غائب ہو گئی۔

قاضی جی :۔ افسوس تو یہ ہے سراج میاں کہ آپ نے فیرنی کبھی کھائی نہیں۔ بس اسی قسم کی کھائی ہے جیسی انہوں نے پکائی تھی اس دن ورنہ فیرنی پکاتا تھا اچھو۔ کمہار جو دادا جان کا خاص تیار کرتا تھا۔ شرط یہ تھی کہ ایک ہفتہ قبل اس سے کہہ دیا جائے کہ فیرنی کھانا ہے۔ بس جناب اسی دن سے وہ بھینس کو اپنے گھر کے پچھواڑے باندھ لیتا تھا۔

بیوی :۔ بھینس کو؟

قاضی جی :۔ جی ہاں! بھینس کو باندھ لیتا تھا اپنے گھر میں اور ہفتہ بھر تک اس کو زعفران اور مشک و عنبر کھلاتا رہتا تھا یہاں تک کہ تیسرے چوتھے دن کے بعد سے وہ زعفرانی رنگ کا نہایت معطر دودھ دینا شروع کر دیتی تھی اور اس کا کھویا بنتا رہتا تھا۔

بیوی :۔ پھر تم کہو گے کہ میں جھوٹ سمجھ رہی ہوں ان باتوں کو۔

سراج :- جھوٹ نہیں آپا! ان ہی باتوں کے پیچھے تو ہم لوگ اتنے دنوں تک غلامی کی چکی پیستے رہے ہیں۔
زبیدہ :- اللہ کا شکر کہ وہ زمانہ گیا۔
قاضی جی :- کیا کہتی چلی جا رہی ہو۔ یہاں یہ عالم کہ نگاہیں ڈھونڈتی ہیں اس زمانے کو اور بیگم صاحبہ ارشاد کر رہی ہیں [illegible]
اب وہ زمانہ کہاں آسکتا ہے۔
بیوی :- اور نہ خدا کرے آئے۔ ہم کو نہیں چاہیئے وہ زمانہ۔ اب ہم اپنا زمانہ خود بنا رہے ہیں۔
قاضی جی :- خیر خیر! بات سنو بیوی، تو سراج میاں! اس وقت کی فیری کا مزا آج تک نہیں بھولے ہیں۔ ایک مرتبہ ماداجا نے
ایک مخصوص مشاعرہ کیا تھا۔ ہاں بھئی تو میں نے کہا تھا کہ ہاں وہ مشاعرے کی بات تو رہ ہی گئی۔
زبیدہ :- میں بتاؤں بھائی جان: وہ مشاعرہ آپ اس فنڈ ہی کے لیے کیوں نہ کریں؟
سراج :- بات تو معقول ہے۔
بیوی :- توبہ کرو۔ یہ بھلا ان کے بس کا روگ ہے۔ ان میں بھلا اتنی عقل کہاں؟
قاضی جی :- ارے صاحب! اللہ مجھ کو سمجھ تو لینے دو کہ فنڈ میں مشاعرہ کیسے دے سکتا ہوں۔ یہ بات تو سمجھا دو مجھ کو۔ میری عقل
کا ماتم بعد میں کرنا مگر مجھے عقل سے کام لینے کا موقع تو دو۔ سراج میاں یہ بات کیا ہے۔ اس تجویز کو سمجھاتے تو ذرا مشاعرے
کا فنڈ۔ فنڈ کا مشاعرہ۔
سراج :- بات یہ ہے بھائی جان کہ قائد اعظم میموریل فنڈ میں جن جن صورتوں سے روپیہ دیا جا سکے دیا جائے۔ اب چونکہ آپ یہ دوست
آئے ہوئے ہیں آپ مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں تو اس میں ٹکٹ لگا دیجئے اور مشاعرہ کا انتظام ذرا دھوم دھام سے کیجئے تاکہ
ٹکٹ زیادہ سے زیادہ بکیں۔
قاضی جی :- اور جو آمدنی ہو وہ فنڈ میں دے دی جائے۔ بھئی کیا واجب ترکیب ہے یعنی آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔ تو
اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ اب میں ایسا بھی نکما نہیں ہوں کہ اتنا سا انتظام نہ کر سکوں۔ شہناز کی شادی کا سارا انتظام
میں نے کیا تھا۔
بیوی :- جی ہاں! جس کے بدولت برات واپس گئی تھی۔
قاضی جی :- وہ خیر دوسری بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ کھانے میں دیر تھی۔ بھوک پر غصہ آ رہا تھا وہ اتر آئے مہر کے سوال پر۔ اس میں میرے
انتظام کی کیا گڑبڑ۔
بیوی :- خیر میں نے کہہ دیا ہے کہ اتنا بڑا مشاعرہ تم نہیں کر سکتے۔
سراج :- اگر بھائی جان دخل نہ دیں تو انتظام میں کر دوں گا۔
قاضی جی :- یہ تو عجیب شرط ہے کہ میں دخل نہ دوں۔ یعنی میں شاعر اور مشاعرہ میرا خاص میدان آپ اس کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔
سراج :- بس آپ شاعروں کو جمع کیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ٹکٹ وغیرہ اور سننے والوں کے معاملات میں آپ دخل نہ دیں۔
قاضی جی :- چلیے منظور! مصرع طرح پہلے طے کرو، پھر صدر مشاعرہ طے کرو۔

زبیدہ ۔ [illegible] صاحب ہے۔

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔ صاحب [illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible]

(قاضی جی)

گداگری

(قاضی جی نجمہ کو لے کر داخل ہوتے ہیں)

قاضی جی :- آؤ۔ شاباش! آجاؤ تم سے کون پردہ کرتا ہے۔ ارے بھئی ایک تو تم بچہ ہو ابھی دوسرے تم تو لڑکی ہو۔ لڑکیوں سے تھوڑی کوئی پردہ کرتا ہے۔ لڑکیاں تو خود پردہ کرنے لگتی ہیں۔ سلام کرو ان کو، یہ چچی ہیں تمہاری۔ ارے جی! بیٹی ہو گئیں نا تم اس کی۔ ارے بھئی میں چچا ہوں تو میرے رشتے سے تم بچی ہی ہو سکتی ہو زیادہ سے زیادہ۔ سلام کرو بیٹی ان کو اور ان کو بھی یہ پھوپی ہیں تمہاری۔

نجمہ :- تسلیم! تسلیم!

بیوی :- جیتی رہو۔

زبیدہ :- کس کی بچی ہے یہ بھائی جان؟

قاضی جی :- ارے بھئی چھٹن خاں کی لڑکی ہے۔ نجمہ اس کا نام ہے۔ آج ان کے بادا کو ہوش آیا تو کہنے لگے کہ قاضی جی یہ دن بھر ٹھیٹ اڑنگے مارتی ہے نہ پڑھنے کی نہ لکھنے کی۔ اگر آپ کے یہاں چلی جایا کرے تو گھر پر سب ہی پڑھے لکھے ہیں بس کوئی چھٹی چھلی دو حرف پڑھا دے گا اور شاید گھرداری کے بھی ڈھنگ آ جائیں۔ چنانچہ میں ساتھ لیتا آیا۔

بیوی :- لڑکی تو صورت سے بھولی بھالی نظر آتی ہے۔ کیا پڑھتی ہو بیٹی تم؟

نجمہ :- الف سے انڈا بے سے بکری، تے سے تتلی۔

قاضی جی :- ہائیں ہائیں ہائیں۔ تے سے تربوز یا تتلی۔ کہاں ہے کتاب تمہاری؟

بیوی :- تے سے تتلی ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی تھیں بی بی! شاباش۔ اپنی کتاب لائی ہو نا؟

نجمہ :- یہ کیا ہے کتاب اور یہ تختی ہے۔

قاضی جی :- اچھا، ادھر بیٹھو تم میری طرف منہ کر کے۔ نکالو کتاب۔ یہ۔ یہ۔ رکھو انگلی اس پر، پڑھو اس کو۔ دیکھو میں پڑھتا ہوں پہلے غور سے سنو۔ الف سے انڈا بے سے بکری، تے سے تتلی۔ مگر مجھ کو خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جو قاعدہ میں نے پڑھا تھا اس میں تے سے تربوز تھا۔ اچھا خیر! تے سے بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ ذرا بتاؤ تو نجمہ تم کو یہاں کون کون سی چیزیں تے سے نظر آ رہی ہیں؟

بتاؤ۔ شاباش

زبیدہ: ۔۔ [illegible] ۔۔ [illegible]۔

[illegible] :

بیوی: ۔۔ [illegible] ۔

قاضی جی: ۔۔ واہ جی واہ! [illegible] ۔

بیوی: ۔۔ [illegible] ۔

قاضی جی: ۔ اور نہیں تو کیا [illegible] کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ [illegible]

بیوی: ۔۔ بس تو پھر [illegible] ۔

قاضی جی: ۔۔ جی ہاں ارشاد ہوا [illegible]

(۔۔ دروازے پہ دستک کے ساتھ جمیل کی آواز)

جمیل: ۔۔ جناب قاضی صاحب!

قاضی جی: ۔۔ آگے بڑھو بھائی برکت ہے۔

بیوی: ۔۔ ارے ارے جمیل بھائی ہیں۔

قاضی جی: ۔۔ اے جمیل میاں۔ ارے بھئی جمیل میاں آؤ نا۔ استغفراللہ۔ آج صبح سے اتنے فقیر آئے ہیں کہ ہم آواز [illegible] فقیرانہ آئے صدا کر چلے

جمیل: ۔۔ (ہنستے ہوئے) میں تو یہ کہہ کر واپس جانے والا تھا کہ فقیرانہ آئے صدا کر چلے [illegible] اور درویش کی صدا کیا ہے۔ اس کا مصرع کیا ہے

قاضی جی: ۔۔ ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا۔ مگر نہیں۔ یہ تو۔ یہ تو شاید اس کا مصرع ہے کہ فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ کچھ ہے ضرور دوسرا مصرع اس کا۔

جمیل: ۔۔ جی ہاں! وہ شعر یہ ہے۔ فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔ آپ نے جب کہا کہ برکت ہے آگے بڑھو تو میں یہی کہہ کر جانے ہی والا تھا۔

قاضی جی: ۔۔ مگر بھئی یہ قصہ کیا ہے آخر یا تو وہ زور و شور تھا فقیروں کی روک تھام اور گداگری کے خاتمہ کا یا پھر وہی رنگ نظر آ رہا ہے یعنی صبح سے چھ سات تو بھکاری ناطقہ بند کر چکے ہیں بلکہ صاحب اب تو مصیبت یہ ہے کہ یہ لوگ غالباً ڈر کے مارے قرض کے تعارف کے طور پر تو بھیک مانگتے ہیں۔ کچھ عجیب رازداری کے ساتھ سوال کرتے ہیں مثلاً صبح ایک بزرگ نے دستک دی۔ میں نے پوچھا کون ہے تو ارشاد ہوا باہر تشریف لے آیئے۔ میں نے باہر جا کر ان کو سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور تشریف آوری کا مقصد پوچھا تو بولے کہ میں مہاجر ہوں۔

زبیدہ: ۔۔ (ہنس کر) مہاجروں کی بھی ایک ہی رہی۔

قاضی جی :- جی ہاں! یہ جتنے مانگنے والے تھے ان کا پتہ لیے۔ بس وہ غریب نام مل گیا ہے اور عجیبہ یہ کہ صاحب جی یعنی
مہاجرین تو یعنی ہے: صاحب کی، مگر غیر اللہ کی اس غلطی کو وہ کیا سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ کی نہیں بلکہ۔۔۔ بلکہ قواعد کی غلطی کی۔ تو خیر
بہر حال ان صاحب نے نہایت سرگوشی میں سوال کیا اور مجھ کو ان سے معافی مانگنی پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر راستہ میں
ایک صاحب نے سلام علیکم کہہ کر روک لیا اور اللہ کے نام پر کچھ مانگنے کے بجائے پاکستان کے حوالے سے مانگنا شروع کیا
تو مطلب یہ کہ آخر یہ مانگنے والے بدستور موجود ہیں۔

بیوی :- بدستور تو خیر نہیں البتہ اب وقت جتنا جتنا گزرتا جاتا ہے اتنے اتنے یہ مانگنے والے پھر پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

قاضی جی :- یہ تو خیر غلط ہے پیدا ہو کر اتنی جلدی اتنے بڑے وہ ہرگز نہیں ہو سکتے کہ مانگنے کے قابل ہی ہو جائیں مثلاً آج ہی جو صاحب سب سے
پہلے تشریف لائے تھے وہ تو عمر میں بڑے بھی کافی صاحب قبلہ معلوم ہوتے تھے، آپ کہتی ہیں کہ یہ نئے پیدا ہونے والے
ہیں۔ جبہ خوش۔

جمیل :- (ہنس کر) پیدا ہونے کا مطلب آپ نے تو ایک دم ولادت ہی سمجھ لیا۔ مطلب بھابی کا یہ ہے کہ یہ طبقہ پھر رفتہ رفتہ ابھر رہا ہے

قاضی جی :- ہاں! یہ ایک حد تک ٹھیک ہے۔ ارے بھئی اس لڑکی کو فی الحال چپ ہی رہنے دو۔ یہ ڈیڈی تم کھیلو کودو۔ وہ دیکھو منو بھی
ہے، اس میں کوئی ازاربند باندھ کر گھوڑے تانگے کا کھیل کھیلو۔ مونڈھے کو بناؤ تانگہ اور منو بی بی کو بناؤ گھوڑا اور یہ مونچھ والی
اس کا بناؤ چابک، جاؤ جیبی کھیلو شاباش۔

جمیل :- آپ کی تعریف، کس کی بچی ہے یہ؟

قاضی جی :- یہ صاحبزادی ہیں چھٹو خاں کی اور شاگرد ہیں آپ سے بہری۔ ان چھٹن خاں کے نام پر یاد آیا کہ وہ جو غنڈوں کو ختم کرنے کی
مہم شروع ہوئی تھی اس کا بھی کچھ پتہ نہیں چلا۔ مجھ کو تو سب غنڈے جوں کے توں نظر آ رہے ہیں۔ اب مثلاً چھٹو خاں نہ جیل گئے
نہ حوالات نہ ان سے کسی نے کچھ پوچھا گچھا۔

بیوی :- ہاں جمیل بھائی آپ تو کہتے تھے کہ یہ چھٹن خاں وغیرہ سب پکڑے جائیں گے یہ آخر ہوا کیا؟

قاضی جی :- ہم کو تو بس چھٹو خاں کی گرفتاری کا انتظار ہے۔ میں نے خود اس سے بھی پوچھا تھا کہ بھئی اب تک گئے نہیں حوالات کی حوالات
میں تو نہایت اطمینان سے مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا کہ ـــ

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

جمیل :- قاضی جی اصل میں قصہ یہ ہے کہ کوئی بھی اصلاحی قدم حکومت اٹھائے اس میں کامیابی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ
عوام بھی حکومت کا ہاتھ نہ بٹائیں اور اس قسم کے کاموں کو سرکاری نہیں بلکہ قومی کام سمجھیں۔ اب مثلاً یہ آپ کا کام تھا کہ
چھٹو خاں کو گرفتار کراتے۔

قاضی جی :- جی ہاں کیا مطلب جناب کا۔ یعنی میں یہ حق دوستی ادا کرتا کہ اس کو جیل بھجواتا۔ بھئی جمیل میاں بعض اوقات تو تم ایسی بے سر پیر
کی بات کہہ دیتے ہو کہ مجھ کو حیرت ہوتی ہے کہ تمہارا دماغ آخر جسم کے کس حصے میں واقع ہے۔ ارے بھئی وہ لاکھ لفنگا سہی،

[illegible] ہاتھ سے [illegible] جیسا عجیب [illegible]

[illegible] وقت

[illegible] بھی کسی [illegible] وقت [illegible]

ہوں گے اور وہ سب [illegible] کامیاب [illegible]

[illegible] اور بہالی [illegible] کرتی ہے۔

قاضی جی [illegible] آپ کا [illegible] اگر آپ کا [illegible] صاحب [illegible]

[illegible]

ہاتھوں واقع ہوئے تھے۔ اگر [illegible] صاحب [illegible]

[illegible] کسی [illegible]

[illegible] صاحب [illegible]

[illegible] سب [illegible] کیا۔

جمیل : قاضی جی [illegible] آپ اپنے [illegible] بیٹھے [illegible]

بہت سے لوگ محض [illegible] سے عیب [illegible] ہیں۔

بیوی : [illegible] اور [illegible]

اور بزدلی ہی نہیں بلکہ خود داری کا ایک طرح سے [illegible] ہے۔

قاضی جی : اللہ اکبر [illegible] بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی جیسی بات ہے۔ بعض قسم کا دماغ بیوی ہونے کی بجائے اگر ایڈووکیٹ کی دلیل ہوتی [illegible]

پیشہ ورانہ [illegible] الفاظ پر زور دینا [illegible]

کو زبردستی منوا لینے کی [illegible] وکالت کی علامتیں ہیں۔ [illegible] کہتا ہوں کہ [illegible]

سائن بورڈ۔ مسز قاضی جی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی وکیل ایڈووکیٹ!!

بیوی : اب دیکھ رہے ہیں جمیل بھائی آپ ایک بات منہ سے نکلی ہے تو ختم ہی نہیں ہوتی کسی طرح۔ ذکر کیا ہو رہا تھا بات [illegible]

جمیل : قاضی جی! یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اس قسم کی کوئی اسکیم عوام کے تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ حکومت کے سامنے اس وقت بے شمار کام ہیں اور ظاہر ہے کہ حکومت کے انتظامی شعبوں کو سب ہی کام کرنا ہیں اور اپنی توجہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنا ہے۔

اب اگر ہمارے عوام حکومت کا ساتھ نہ دیں گے تو یہ بڑا [illegible] ہوگا۔

قاضی جی : بہتر ہے بہتر ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ آپ لوگوں کی باتیں پہلے تو میں لکھ لیا کروں اس کے بعد غور کیا کروں کہ آپ نے کیا فرمایا ہے؟ میں قسم لے لیجئے جو ایک بات بھی میرے پلے پڑی ہو۔ انتظامی شعبے، توجہ، حصے، تقسیم، خدا جانے کیا کیا کر گئے ایک سانس میں اور یہاں آستینوں میں کیسی جا رہی تھی ایک چیونٹی بس اسی میں الجھا رہ گیا۔ دنیا جہاں کی چیونٹیوں کو مُردوں سے دلچسپی لیتے دیکھا ہے مگر یہ لاہور کی چیونٹیاں زندوں کو ستایا فرماتی ہیں اور وہ کثرت ہے اس نسل کی کہ الامان والحفیظ۔

زبیدہ :- جمیل بھائی آج صبح جو فقیر آیا تھا تو میں نے بھائی جان سے خود کہا کہ اس سے جا کر کہئے کہ پولیس کے حوالے کرنا ہوں ابھی۔

بیوی :- اجی تو یہ سمجھتے اس روز کہہ رہے تھے کہ فقیر جو اگر ایک آدھ دعا دے جاتے تھے اب اس کے لیے بھی ترس کر رہ گئے۔ یہ بھلا حوالے کریں گے پولیس کے۔

قاضی جی :- ہاں صاحب تو مجھ سے تو یہ ناممکن ہے کہ ہیں فقرا کی بد دعائیں بیٹھا پھروں۔ ان لوگوں کی دعائیں بعض اوقات ایسی لگتی ہیں کہ پھر ان کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔ ایک چچا تھے صاحب ہمارے وہ ایک مرتبہ کسی فقیر سے الجھ گئے تھے۔ سنا ہے کہ کمبخت وہ فقیر تو آنکھوں کا اندھا تھا مگر کہہ کر جو پہلا تو اس نے کہہ دیا کہ جا بابا یہ گھر تجھ کو دے۔ یقین مانئے جمیل میاں کہ آج تک بیرے ان چچا کے پوتے پر پوتے ہیں اور سب اللہ کے فضل سے گنجے یعنی اس خاندان میں جو بچہ پیدا ہوتا ہے گنجا ہوتا ہے۔

جمیل :- کیا باتیں ہیں قاضی جی آپ کی بھی۔ یہ سب وہم ہے۔ جو ایسے پہنچے ہوئے فقیر ہوتے ہیں وہ یوں مانگتے نہیں پھرتے۔

قاضی جی :- سارے جناب تو اب یہ شناخت کون کر سکتا ہے کہ ان میں سے کون سے شاہ جی پہنچے ہوتے ہیں اور کون سے پیر مگر ماننا چاہئے وہی مثل کہ خاکسارانِ جہاں را بہ سوارے باشد۔

جمیل :- (ہنس کر) خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر   تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

قاضی جی :- جی ہاں یہی شعر پڑھنا چاہتا تھا۔ کیا مطلب ہوا جمیل میاں اس کا۔ سنا ہے تو موقع کا شعر۔ دادا جان اسی قسم کے موقعوں پر یہ شعر عموماً پڑھا کرتے تھے۔ ہاں تو کیا مطلب ہوا گویا اس کا۔

جمیل :- یعنی یہ جو خاکسار بنے ہوئے نظر آتے ہیں ان کو حقارت سے نہ دیکھو تم کو کیا معلوم کہ اسی گرد کے پردے میں کوئی شہسوار چھپا ہوا ہو۔

قاضی جی :- بس اتنا ہی سا مطلب تھا۔ میں تو سمجھتا تھا نہ جانے کتنی بڑی بات کہہ دی ہوگی۔ تو بہرحال مطلب صرف یہ ہے کہ میں ان غنڈوں سے ہمیشہ ڈرتا رہتا ہوں کہ خدا جانے ان میں سے کون سوارے باشد ہو۔

بیوی :- پیچھے فقیروں کا ذکر کرتے کرتے غنڈوں کے لیے یہ شعر بنا دیا اور میں نے کہا کیا تم فارسی پڑھے ہوئے نہیں ہو؟

قاضی جی :- سبحان اللہ فارسی نہیں تو اور آخر کیا پڑھا ہوا ہوں۔ شعر کا مطلب پوچھنے سے آپ یہ سمجھیں کہ گویا میں فارسی داں ہی نہیں ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب محاورہ نہیں رہا ہے ورنہ آمدنامہ ازبر تھا گلستان تو دوسری شادی کے بعد تک پڑھتا رہا ہوں۔ یہ آپ نے کیا کہی کہ فارسی پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ مگر صاحب فارسی میں چھٹن خاں کو اچھی مہارت ہے۔

بیوی :- آگ لگے اس کی صورت کو۔ اب علمی باتوں میں بھی اس جھاڑو پھرے کا ذکر آنے لگا۔

قاضی جی :- ہائیں ہائیں یعنی اس کی لڑکی سن لے گی تو کیا کہے گی؟

بیوی :- کہا کرے۔ میں تو اس کو اسی طرح کہوں گی۔ واور سنو اب وہ فارسی بھی جاننے لگے۔ جو الٹا بجیں گے ایسی ہی الٹائیں گے۔

قاضی جی :- الٹائیں گے۔ کیا مطلب الٹائیں گے سے۔ گویا میں جھوٹا ہوں، دروغ باف ہوں، کذاب ہوں، لزباف ہوں۔ مگر نہیں، لزباف تو دوسری چیز ہوا۔ مطلب یہ کہ میں جھوٹا ہوں۔ چلو میں جھوٹا ہی سہی۔ تری پہ سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے۔ یہ حرت ہے ہمارا اس گھر میں کہ ہماری بلی اور ہم ہی سے میاؤں۔ ہماری بیوی اور ہم ہی کو جھوٹا کہیں۔ واہ رے ہمارے مقدر۔

نقوش کے نقاش

کہتے ہیں کہ اس دنیا کے جب سب [illegible] چلیں گے اور [illegible] نفسی نفسی [illegible] معاملوں کے [illegible] ضرورت آئے گی اور ان کو بھی مرنا پڑے گا۔ خیر، تو جب کبھی ہوگا دیکھا جائے گا [illegible] واقعہ پیش آیا ہے [illegible] رسالہ نقوش کے اڈیٹر اور اپنے وقت کے مشہور [illegible] محمد طفیل صاحب کی ایک کتاب چھپ کر بازار میں آئی ہے اور دوسرے مصنفوں کو چھاپنے والے حضرت خود بھی چھپ کر رہ گئے ہیں۔ [illegible] شاعر نے اسی قسم کے موقع کے لیے [illegible] مصرعہ کہا ہے کہ:

بچا سکے نہ وہ چادر میں پھنس گیا صیاد بھی

طفیل صاحب کی اس تصنیف کا نام ہے "صاحب" اور اس میں ان کے وہ سات مضامین ہیں جو سات صاحبانِ شخصیت پر لکھے گئے ہیں اور ان ساتوں میں جو ایک شخصیت دوسروں کی نقاب کشائی کی کوشش میں خود بے نقاب ہوئی ہے وہ خود طفیل صاحب کی شخصیت ہے۔ ان سات مضامین میں سے چھ نقوش کے پچھلے شماروں میں نکل چکے ہیں صرف ایک ایسا مضمون ہے جو اسی مجموعے میں چھپا ہے۔ یہ ساتوں مضامین طفیل صاحب کے ذاتی مطالعے اور مشاہدے کے آئینہ دار ہیں جو وہ ان ساتوں ملنے والوں کے متعلق کر سکے ہیں اور نہایت سادگی اور صفائی کے ساتھ اپنے ان ساتوں کرم فرماؤں کے سامنے طفیل صاحب کا آئینہ پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ خود بھی اپنے کو طفیل صاحب کی نظر سے دیکھ لیں۔ اس ہفت پیکر کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:

۱۔ سعادت حسن منٹو۔ ۲۔ احمد ندیم قاسمی۔ ۳۔ شوکت تھانوی۔ ۴۔ جگر مراد آبادی۔ ۵۔ فراق گورکھپوری۔ ۶۔ عابد علی عابد۔ اور ۷۔ احسان دانش۔

باقی چھ حضرات کے متعلق تو میں وثوق سے کچھ عرض نہ کر سکوں گا مگر جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے جو خود میرے متعلق لکھا گیا ہے۔ مجھ کو ایمانداری کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں نے اپنی اتنی جامع تصویر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ تصویر وہ نہیں ہے جو ہونے والی سسرال بھیجنے کے لیے لوگ خاص طور پر کھنچوانے کے بعد بنواتے بھی ہیں کہ گال اگر پچکے ہوئے ہیں تو ذرا ابھر دیے جائیں، آنکھیں اگر چندھی ہیں تو ذرا روشن کر دی جائیں، رنگ اگر کالا ہے تو ذرا گورا کر دیا جائے۔ بلکہ یہ تصویر اصل

خدوخال کے ساتھ جوں کی توں پیش کر دی گئی ہے۔

خود اپنے متعلق اس قسم کا منہ پھٹ تجزیہ اس مضمون سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک آدھ مقام پہ شبہ بھی ہوا تو مجھ کو مجھ سے زیادہ سمجھنے والوں نے یہ کہہ کر اس شبہ کو دور کر دیا کہ آپ مانیں یا نہ مانیں بات سچی لکھی ہے۔ ایک مقام پہ مجھے شدید اختلاف تھا جہاں طفیل صاحب نے لکھا ہے:

"میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام ان کے ترنم سمیت سن چکا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوٹ ہوئے"

میں یہ کہہ رہا تھا کہ صرف دو مشاعروں میں ہوٹ ہوا ہوں ایک میں اس لیے کہ سخن فہم متعصب تھے اور ہوٹنگ کرنے والے فیاض اور دوسرے میں اس لیے کہ تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس دونوں شباب پر تھے۔ مگر یہ تو ایک ہی بات ہوئی بہر حال میں صرف دو مرتبہ ہوٹ ہوا ہوں مگر بیگم صاحبہ نے طفیل صاحب کی گواہی دی کہ خود آپ کو اندازہ نہیں ہے میں بڑے شوق سے مشاعروں میں جایا کرتی تھی مگر محض آپ کی غزل سرائی نے مجھ سے مشاعرے ترک کرائے ہیں۔ کاش آپ اپنی آواز خویش پروری سے باہر ہو کر بھی سن سکتے۔ پھر مجھ کو اس مضمون کے اس مقام پر غصہ آتے آتے رہا جہاں طفیل صاحب نے مجھے خبطی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

"ان کی طبیعت کی ایک اچھائی یہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے ناراض ہو جاتے ہیں نہ ناراض ہونے کا پلاٹ بناتے ہیں نہ کوئی اسکیم۔ نہ ہی دوسرے کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ بیچارہ مدافعت میں کچھ کہہ سکے ——"

میں نے جھلا کر کہا "یہ غلط ہے۔ متہم کرتے ہیں۔ تہمت لگاتے ہیں۔ اتہام ہے سراسر"

وہ بولیں "حرف بہ حرف صحیح ہے۔"

میں نے کہا "صحیح کیسے ہے یہ تو پاگل پن ہوا کہ بے وجہ کوئی ناراض ہو جائے میں بغیر کسی وجہ کے کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوا۔"

وہ بولیں "کبھی شاید نہ ہوئے ہوں مگر اکثر ہو جاتے ہیں"

میں نے واقعی مشتعل ہو کر کہا "مثلاً۔ مثلاً کب ناراض ہوا ہوں میں"

وہ بولیں "مثلاً اسی وقت ہو رہے ہیں"

اور مجھ کو واقعی اندازہ ہوا کہ میں خود اس دعوے کی دلیل پیش کر رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے یہ صفحہ الٹ دیا اور ایک مقام پہ بے ساختہ داد دی۔

"ذرا بادل گرجے۔ بجلی چمکے پھر دیکھیے آپ کا مزا۔ نادری حکم کے ماتحت تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرا دیں گے۔ اس کے بعد خود آ بیٹھیں گے چٹخنیاں

دلچسپ شگفتگی کی [illegible] تھی [illegible] شوکت [illegible]
کو اس [illegible] کر [illegible] خیالات [illegible]
[illegible] شوکت صاحب نے [illegible]

"[illegible] آپ [illegible]
[illegible] کا حال خدا جانے [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] آپ [illegible]

[illegible] شوکت [illegible]
[illegible] :

"[illegible] شوکت [illegible]
[illegible] آپ [illegible]
[illegible] آپ [illegible]
[illegible]"

اور پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ [illegible] قسم کی لغزشوں کو جن میں خود [illegible] بیان کر کے دنیا کے سامنے پیش کر چکا ہوں تو اب ان کو [illegible] لہٰذا چاہیے کہ رہا میں کا حال خدا جانے [illegible] صاحب جو کچھ شوکت صاحب کو جانتے تھے اس سے سب ہی کو آگاہ کر چکے ہیں۔ اس خوفناک اعتراف کے بعد بے شک [illegible] کی پردہ [illegible] بس یہ کہ جی ویسے ایک مقدمے میں سرکاری گواہ بن جانے کے حق [illegible] ہو گئے [illegible] چوری بھی گیا اور ہیرا پھیری سے بھی۔ یہ چالاکی بھی تو ہو سکتی ہے کہ اس طرح اپنا جرم قائم کر کے پھر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے کہ جو چاہیں کریں۔"

میں نے کہا کہ خیر آپ کا اور میرا رشتہ تو ہے ہی ایسا کہ اس میں اگر بدگمانی نہ ہو تو محبت ہی مشکوک ہو کر رہ جائے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل صاحب کس رشتے سے اس قدر بدگمان ہوتے ہیں۔"

خیر چھوڑیئے اس ذکر کو، میں تو اپنے ہی مضمون میں الجھ کر رہ گیا۔ اس کتاب میں اور مضامین بھی تو ہیں اور جس طرح اور مضامین کو پڑھ کر میرا یہ حال ہوا ہے کہ۔ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی طرح میرے متعلق جو مضمون ہے اس کو پڑھ کر دوسروں نے بھی یہی کہا ہوگا۔ اور یہی طفیل صاحب کی سیرت نگاری کا کمال ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون جو منٹو کے متعلق ہے اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں منٹو اپنی زندگی کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ چلتا پھرتا سامنے آجاتا ہے اور اس کو مردہ سمجھ کر کسے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی منٹو کی بہکی بہکی حرکتیں، وہی اس کی سرشاریاں اور وہی اس کے لغزیدہ قدم۔ وہی اس کا انداز بیان کہ مضمون پڑھتے جائیے اور منٹو کو سامنے بٹھا کر باتیں کرتے جائیے مگر دوسرے

حصے میں منٹو کی موت پر جو خط طفیل صاحب نے لکھا ہے وہ منٹو کے اسلوبِ تحریر کا ایسا جامع چربہ ہے کہ منٹو کی موت بھی ذی روح نظر آتی ہے۔ اگر یہ خط منٹو کے نام سے نہ بھی ہوتا تو بجائے خود ایک اہم ادبی دستاویز کی حیثیت اس کو حاصل ہوتی۔ طفیل صاحب نے اگر اپنی اس صلاحیت کو اب تک چھپایا ہے تو خیانت سے کام لیا ہے اور اب اگر اس میں بخل برتا تو مزید خیانت ہوگی۔

دوسرا مضمون جو احمد ندیم قاسمی کے متعلق ہے ندیم صاحب کو رفتہ رفتہ میرے قریب لا رہا تھا کہ یہ حصہ آگیا:۔

"اگر یہ چارپائی پر بیٹھے ہوں تکیے سے ٹیک بھی لگا رکھی ہو اور یہ ایک دم اکڑوں بیٹھ جائیں تو سمجھ لیجیے کہ یہ افسانہ لکھنے والے ہیں۔ اس وقت یہ سگریٹ پہ سگریٹ پئیں گے۔ خوبصورت سا کاغذ لیں گے۔ پنسل کو باریک بنائیں گے۔ مہین مہین خط میں افسانہ شروع کر دیں گے۔ آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے۔"

میں نے کہا "حیرت ہے ندیم صاحب کی یہ ادائیں مجھ سے کس قدر ملتی جلتی ہیں۔"

بیگم نے کہا "مگر آپ اکڑوں نہیں بیٹھتے۔"

میں نے کہا "خوبصورت سا کاغذ تو لیتا ہوں۔"

وہ بولیں "جی ہاں مگر آپ چارپائی پر کب بیٹھتے ہیں۔"

میں نے کہا "چلو نہ سہی مگر پنسل تو باریک بناتا ہوں۔"

وہ بولیں "عموماً قلم کا باریک نب تلاش کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "مطلب یہ ہے کہ مہین مہین خط میں تو مضمون شروع کرتا ہوں۔"

وہ اگلی سطریں پڑھوانا چاہتی تھیں "آگے تو پڑھیے۔"

میں نے پڑھنا شروع کیا:۔

"——— آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے البتہ شعر کہنے کے لیے تنہائی چاہتے ہیں اس لیے کہ انھیں ہلکا ہلکا گنگنانا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ اپنے ترنم کا مرتبہ جانتے ہیں اس لیے اس خداداد دہن کا حال سب پر آشکار کرنا نہیں چاہتے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "دیکھیے اس کو کہتے ہیں غیرت داری۔"

میں نے جل کر کہا "پھر آپ کا روئے سخن میرے ترنم کی طرف ہے۔ یہ تعصب کی عجیب گھریلو قسم آپ نے نکالی ہے۔"

احمد ندیم صاحب قاسمی والے مضمون میں طفیل صاحب اپنے اس احترام کو باوجود کوشش کے چھپا نہیں سکے جو ندیم صاحب کے لیے ان کے دل میں موجود ہے۔ جب خود طفیل صاحب نے ندیم صاحب پر مضمون لکھنے کے لیے ہاجرہ بہن سے درخواست کی تھی تو ان بیچاری نے بڑی سچی بات کہی تھی کہ:۔

"اگر میں سچ سچ لکھ دوں تو یہ مضمون کتنے صفحوں پر پھیلے گا اور پھر سب سے بڑی بات

یہ ہے کہ اتنی سچائی کا، سبھی کیا درجہ ہوگا۔ سوک ترے ہے؟ جاں نثار ہال بات کہ
ٹال دیں گے۔"

گویا طفیل صاحب بھی جانی کی پیار والی بات سے کام لیتے ہیں۔ اور صرف طفیل صاحب ہی نہیں اگر میں خود بھی ... صاحب کے متعلق لکھتا تو وہ بھی پیار والی بات ہی ہوتی اس لیے کہ اس شخص میں سب نے پیار کے اور ہے ہی کیا۔

جگر صاحب کے متعلق طفیل صاحب کا جو مضمون ہے وہ ایک منفرد و بے مثل بھی ہے اس لیے کہ طفیل صاحب جگر صاحب کے مراسم کی ابتدا ایسے ہی گھر پہ ہوتی تھی۔ مگر جیسے جیسے مضمون آگے چل کر صرف جگر صاحب کے متعلق ... وہ بہت ... ہوتی ہے کہ طفیل صاحب نے بھی تین دنوں میں جگر صاحب کو اتنا ہی پایا ہے جتنا میں ساری زندگی کے مراسم سے پا سکا ہوں۔ اس مضمون میں جہاں کہیں طفیل صاحب نے جگر صاحب کے اندازِ گفتگو کا چربہ اتارا ہے وہاں ایسے کوئی جانتا ہے اس معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب کے یہ الفاظ ان کے ذہن میں محفوظ تھے بلکہ دستاویزی صورت میں موجود تھے مثلاً لکھتے ہیں جگر صاحب کی باتیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں:۔

"اگر میں آپ کے کہنے کے مطابق یہ مان لوں اور مجھے اس کا بھی یقین کامل ہو جائے کہ فلاں صاحب شعر اچھے لکھتے ہیں۔ پھر بھی میں کہوں گا کہ ان میں وہی ایک چیز نہیں ہے اور وہ چیز پیدا تو ہوتی نہیں، وہ تو انسانِ کامل اور مردِ خود آگاہ میں خود ہی ہوتی ہے میری مراد خلوصِ باصفا ہے۔ وہ شعر بڑے بداعمال ہوتے ہیں جو ایسے ذہنی نابالغوں کے پروردہ ہو جاتے ہیں۔"

میں جانتا ہوں کہ یہ جگر صاحب کا اندازِ بیان ہے۔ یہی الفاظ یہی ترکیبیں یہی بندشیں۔ اس مضمون کا کونسا حصہ ایسا ہے جہاں جگر صاحب مجھے اپنی اصلی شخصیت کے متحرک نظر نہ آتے ہوں۔

فراق والا مضمون شخصیاتی بھی ہے اور دستاویزی بھی۔ اس مضمون میں فراق کے چند نہایت اہم خطوط ہیں کہ طفیل صاحب نے ہر ایک سے فراق کو نہایت نے خلوص کے ساتھ ملا دیا ہے بلکہ یوں فراق سے ملنے والا شاید فراق کو نہ پا سکتا البتہ ان خطوط کے آئینے میں اور پھر طفیل صاحب کی حاشیہ آرائیوں نے فراق کو اس مضمون کے پڑھنے والوں کے بالکل قریب کر دیا ہے۔ اسی مضمون میں ایک جگہ طفیل صاحب لکھتے ہیں:

"الٰہ آباد تین چیزوں کی وجہ سے مشہور ہے ان میں سے ایک جواہر لال نہرو دوسرے فراق تیسرے امرود"

یہ بات اکبر الٰہ آبادی بہت پہلے بڑے مزے میں کہہ گئے ہیں ؎

کچھ الٰہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

مگر یہ اس وقت کا ذکر ہے جب پنڈت نہرو اور فراق نہ تھے صرف اکبر اور امرود تھے اور طفیل صاحب نے آجکل کا ذکر کیا ہے

جب اُبھر نہیں ہیں پنڈت نہرو - فراق اور امرود ہیں -

سید عابد علی عابدؔ کے متعلق مضمون لکھتے لکھتے طفیل صاحب کے ان فقروں نے چونکا دیا :-

" مجھے ان سے یہ شکایت رہی ہے کہ اتنی ٹھوس علمی شخصیت ہونے کے باوجود انھوں نے کوئی قابلِ ذکر ادبی کام نہیں کیا یہ " فضیلت " صرف ان ہی میں نہیں ہے بلکہ یہاں کی کئی اور بڑی بڑی شخصیتوں میں تھی اور ہے اگر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر (بعض زندہ کرم فرماؤں کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کا نام لوں تو میرے کرم فرما مجھے معاف فرمائیں "

طفیل صاحب زندہ کرم فرماؤں سے ڈر جائیں مگر میں ان کا نام لیتا ہوں - ابھی چند ہی دن ہوئے کہ صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسمؔ کے گھر سید ذوالفقار علی بخاری نے یہی بحث چھیڑی تھی سید احمد شاہ بخاری پطرسؔ کا علم و تبحر دیکھئے اور ایک کتابچہ دیکھئے " پطرس کے مضامین " اس قابلیت اس ذہانت اور اس تبحر کے اہلِ قلم سے امید تھی کہ نہ جانے ادب اُردو کو کیا کچھ دے دے گا - ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرتؔ اپنی صلاحیتیں لیے اس دُنیا سے رخصت ہو گئے صوفی تبسم ہیں خدا کرے وہ اب بھی کوئی ادبی کارنامہ پیش کر دیں - سید عابد علی عابدؔ کی صحت اگر اجازت دے تو ان میں حزم بھی ہے ہمت بھی اور ان کے نمبر بتاتے ہیں کہ وہ خود اب تک کی غفلتوں کی تلافی کے لیے بے قرار ہیں - اس موقع پر ان کی صحت کے لیے دل سے دُعا نکلتی ہے - خدا کے پاس بہت کچھ ہے اور ان کی نیت بھی بخل کی نہیں - دیر میں سہی مگر ان کی توجہ اس طرف ضرور ہوئی ہے اور امید ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر دکھائیں گے

آخری مضمون احسان دانش پر ہے اور بہت ہی کامیاب مصوری ہے - احسانؔ اپنی تمام بے ساختگی اور تمام سادہ پُرکاری اور تمام پُرکار سادگی کے ساتھ اس مضمون میں سمٹ آئے ہیں - ان کا بینک کی عمارت پر قبضہ کرنا - ان کا کبوتروں سے شغف - ان کی موت کے متعلق وہ اسکیم جو تقسیم ملک کی وجہ سے ناکام ہو گئی ان کا مشاعروں سے شخصی پردے کی طرف فرار - ان کے تابوتِ مرحوم سے مراسم کی داستانیں اس خوبی سے بیان ہوئی ہیں کہ طفیل صاحب پر محمد حسین آزاد کی افسانہ طرازی کا شبہ ہونے لگتا ہے یہ مضمون بقول طفیل صاحب کے نامکمل بھی ہے اور ناکام بھی مگر احسن صاحب کا تو کام تمام کر ہی گیا ہے -

رہ گئی اس کتاب کی زبان - اندازِ بیان اور باقی ادبی نزاکتیں ان کے متعلق خود مصنف کا دیباچہ پڑھ لینا کافی ہوگا جو " اعترافِ جرم " کے نام سے کتاب کے شروع میں دیا گیا ہے -

---

خواہ مخواہ

دو گھنٹے صاحب کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ ان کی گلی کوچوں سے خوب واقف تھے۔ کسی پولیس سے پوچھا اور رکشہ کرایہ ٹیکسی کو ادا کرنا پڑا۔ تب کہیں جا کر عبدالغفور صاحب ٹھیکیدار کا وہ مکان ملا جس کا ایک حصہ انہوں نے کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ مدد آخر کی تو ملک گئی۔ انہوں نے بات ہی کی۔

"سیدھا سادہ پتہ تھا اگر ذرا عقل سے کام لیتے تو یہ پریشانی ہرگز نہ ہوتی۔"

میں نے جل کر کہا: "کیا جناب کا خیال یہ ہے کہ میں نسلوں سے ڈاکیہ ہوں؟ میں کیوں کر اس پتہ پر کہ سیکٹر نمبر کا جاؤں جو خود پر دو میل لمبا ہے۔ یہ تو ڈاکیوں کا خاص آرٹ ہے کہ وہ ۱-۲-۱۱-۹ کا مطلب سمجھ لیتے ہیں کہ بلاک نمبر، سب بلاک نمبر، گلی نمبر، مکان نمبر۔"

انہوں نے فاتحانہ شرمندگی کے لیے کہا: "اچھا خیر، اب سامان رکھو۔ غسل وغیرہ کر کے آدمی بنو تاکہ تم کو چائے پلا کر صحیح الدماغ بننے کے بعد بات کی جائے۔"

میں خود بھی فوراً نہانا چاہتا تھا اس لیے کہ لاہور سے کراچی آنے والے کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جنازے میں شرکت کرنے گیا تھا جہاں لوگوں نے بجائے مردے کے خود اسی کو دفن کر دیا تھا غلطی سے اور وہ اپنی اس تدفین کے بعد بمشکل تمام قبر سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہوا ہے۔ گرد میں اٹا ہوا تھا چنانچہ آئینہ کے سامنے پہنچ کر خود اپنے ہی عکس پر عبدالغفور صاحب ٹھیکیدار کا شبہ ہوا، جو ٹھیکیداری کی مناسبت سے اس حلیہ میں نظر آ سکتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ میں خود اپنے ہی عکس کو سلام کرتا گرد آلود عینک کو جھاڑا تو اپنے عکس کی اسی حرکت سے فوراً سمجھ میں آ گیا کہ یہ کوئی اور نہیں "خاکسار" ہی ہے۔ ورنہ اگر کوئی پوچھے تو آج ہی "خاکسار" کے معنی بھی سمجھ میں آئے کہ بغیر لاہور سے کراچی آئے ہوئے کوئی شخص صحیح معنوں میں "خاکسار" بن ہی نہیں سکتا۔ میں نے جلدی جلدی شیو کیا۔ کپڑے نکالے اور غسلخانے میں نل کے نیچے جا بیٹھا۔ ابھی سر اور چہرے پر صابن لگایا ہی تھا کہ نل غائب اور میں پریشان کہ اب کیا کروں۔ صابن تمام سر پر لگا ہوا ہے۔ آنکھیں بالکل بند ہیں یہ تو گویا "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" والا قصہ ہوا ہے۔ ایک آدھ منٹ تو تکلفاً خاموش رہا۔ اس کے بعد غسلخانے ہی سے اسلم کو آواز دی کہ دوڑو مدد کو۔ اسلم نے اس کے جواب میں یہ چیخنا شروع کیا:۔

"صاحب یہ میں نہیں ہوں ایک اور صاحب ہیں خدا کے لیے نل کھول دیجئے۔"

اور عجیب بات ہے کہ اس کے بعد ہی نل چلنے لگا۔ چنانچہ میں نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر جب پھر آئینہ کے سامنے آیا تو اب

آئینہ میں عبدالغفور صاحب ٹھیک دو نظر نہیں آئے بلکہ یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ جب کچھ بھی بُرا بھلا ہوں یہ میں خود ہی ہوں۔ ابھی کنگھا ہی پھیر رہا تھا کہ اسلم نے چیخنا شروع کر دیا :۔

صاحب سولہ سنگھار بعد میں کر لیجئے گا مگر چائے ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے۔"

چنانچہ میں اُس برآمدے میں آ گیا جہاں ایک چھوٹی سی میز پر اسلم چائے کے برتن رکھے خود کھیوں کے شکار میں مصروف تھے۔ میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہی پہلا سوال کیا :۔

"بھئی یہ نل کا بند ہونا پھر تمہارے ایک مجذوبانہ نعرے کے بعد یکایک چل دینا سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ قصّہ کیا تھا آخر؟"

اسلم نے کہا ۔۔۔ "ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"

میں نے کہا: "سبحان اللہ لیکن اگر اس شعر کا سلیس اُردو میں آپ ترجمہ بھی کر دیتے تو اچھا ہوتا۔ میں اتنا سخن فہم تو کبھی نہ تھا کہ اپنے تفصیل طلب سوالات کا جواب اشعار میں سُن کر مطمئن ہو جاتا۔ پھر اس وقت تو ابھی دماغ سے ریل کی گھڑ گھڑاہٹ ہی نہیں نکلی ہے۔"

اسلم نے کیتلی میں چینی کا ایک چمچہ ڈال کر چلاتے ہوئے کہا: "مطلب یہ کہ یہ تو ابتدا تھی ایسی ایسی بہت سی باتیں ہوں گی۔ کرایہ کے مکان میں رہنا آپ معمولی بات سمجھتے ہیں۔ کرایہ کے علاوہ اور بھی بہت سے ٹیکس دینا پڑتے ہیں۔ بخدا بعض اوقات تو جی چاہتا ہے کہ سامان بھی اسی گھر میں چھوڑوں اور جا کر سمندر میں چھلانگ لگا دوں۔"

میں نے کہا: "وہ تو خیر ٹھیک ہے کہ جب سمندر ہی میں چھلانگ لگانا ٹھہری تو سامان کی کیا ضرورت ہے۔ مگر کچھ بتاؤ تو سہی بات کیا ہے آخر۔"

اسلم نے چائے کی پیالی کھسکاتے ہوئے کہا: "بات نہیں ہے چیستاں ہے یہ۔ اجمال میں سنائے دیتا ہوں تفصیل خود دیکھئے رہنا اب تو رہنا ہی ہے اس گھر میں۔"

میں نے کہا: "اچھا فی الحال تم اجمال ہی سنا دو۔"

اسلم نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "کراچی میں مکان حاصل کرنا اتنا مشکل کام ہے کہ اگر یہ مرحلہ ان سائنسدانوں کو پیش آ جائے جو چاند اور مریخ وغیرہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں تو ان کے سارے اسپوتنگ اور طفیلی سیارے دھرے رہ جائیں۔ میرا ہی دل جانتا ہے کہ میں نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہیں یہ مکان حاصل کرنے کے لیے۔"

میں نے کہا: "شکر ہے کہ مل ہی گیا۔ اور ہے بھی اچھا خاصا بظاہر۔"

اسلم نے کہا: "جی ہاں۔ مگر بباطن جیسا کچھ بھی ہے۔ بس دعا مانگنا چاہئے کہ خدا دشمن کو بھی ایسا مکان نہ دے۔ معلوم نہیں میرے کن گناہوں کی پاداش میں یہ مکان مجھ کو مل گیا ہے اور اللہ جانے تمہاری تقدیر کی وہ کونسی گردش تھی جو تم کو بھی یہاں رہنے کے لیے لے آئی ہے۔ خدا کے لیے پرویز کوئی اور مکان ڈھونڈھو ورنہ اس مکان میں کل ہی سے تم بھی خودکشی کے امکانات پر غور کرنا شروع کر دو گے جس طرح میں اس حرام زندگی اور اس حرام موت کا موازنہ کرتا رہتا ہوں۔"

وہ واقعی رو دینے کے قریب تھا لہذا میں نے اس کو چمکارتے ہوئے کہا: "ہمت اور حوصلے سے کام لو انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ــــ"

میں نے برجستہ کہا: "اگر یہ تم کو نصیحت سناؤں۔ بھائی صاحب [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] بیٹھے ہیں [illegible] پوچھے:
میں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا: "خیریت [illegible]"
اسلم نے جز بز ہو کر کہا: "آپ بھی [illegible]
میری پوری بات تو سن لو۔"
میں نے پوری بات سننے کا وعدہ [illegible] کہا: "اچھا [illegible]"
اسلم نے کہا: "صاحب [illegible] ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اور کوئی سا نمونہ دکھائے دیتا ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ کمرے کے اندر گیا اور اپنے ہاتھ میں ایک کاپی لیے ہوئے واپس آگیا۔
"یہ ایک افسانہ تھا۔ [illegible]
آئی۔ ملاحظہ ہو:
میں نے پڑھنا شروع کیا: "تقسیم ملک کے بعد [illegible] ان کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ ان کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ان کی منزل کہاں ہے [illegible] جن کا کوئی جادہ ہو نہ کوئی منزل اور وہ سفر کرتے رہیں ٹکٹ نہ خریدیں تو جاؤں [illegible] ٹکٹ خریدیں تو کہاں کا خریدیں۔۔۔"
میں نے چونک کر کہا: "ایں یہ کیا۔ یہ ٹکٹ کیسا؟"
اسلم نے کہا: "در اصل کہا گیا رہا ہوں آپ کو۔ مسافر تھے جن کا کوئی جادہ ہو نہ کوئی منزل اور وہ سفر کرتے رہیں۔ بس یہاں تک میں لکھ کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ خرافات لکھی ہوئی دیکھیں۔ دیکھیے تو خط بدلا ہوا ہے۔"
میں نے کہا: "زنانہ خط ہے۔"
اسلم نے بیزاری سے کہا: "جی ہاں زنانہ خط ہے اور جس محترمہ کا یہ خط ہے وہی میرے لیے جان کا جنجال بنی ہوئی ہیں۔"
میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا: "مگر وہ ہیں کون؟ جملہ مہمل سہی مگر خط تو بڑا پاکیزہ ہے۔"
اسلم نے منہ بنا کر کہا: "صاحب ناک میں دم کر رکھا ہے اس لڑکی نے۔ بخدا اگر میری بہن یا بیٹی ہو خدانخواستہ اس قسم کی تو گلا مار کر پھانسی پر لٹک جاؤں۔"

میں نے پھر پوچھا "مگر بتایا نہیں تم نے کہ یہ لڑکی ہے کون ۔"

اسلم نے کہا: "صاحبزادی ہیں ٹھیکہ دار صاحب کی۔ اچھی خاصی جوان جہاں لڑکی ہے۔ میٹرک پاس کر چکی ہے۔ باوا جان شادی کی فکر میں گھلے رہتے ہیں اور میں یہ غور کیا کرتا ہوں کہ جس کے پلے بندھ گئی یہ بلا اس کے دونوں کانوں کے بیچ میں سر کردے گی صاحب چھلاوا ہے اچھی خاصی۔"

میں نے کہا "دیکھا ہے تم نے؟ عمر کیا ہوگی؟ صورت شکل کیسی ہے؟"

ایک ہی سانس میں اتنے سوال جو کئے تو اسلم نے گھبرا کر کہا "نہ دیکھا ہے نہ خدا دکھائے۔ عمر ان کے باوا جان کے حساب سے سولہ سال ہے لہذا ہوگی اٹھارہ انیس سال کی۔"

میں نے کہا "میٹرک فرسٹ ڈویژن میں کیا ہوگا اس نے۔"

اسلم نے مجھ کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا "یہ جناب کو کیسے معلوم ہوا۔"

میں نے کہا "اندازہ ہے میرا۔ خط نہایت اچھا ہے۔ ان خام شرارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہین بھی ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ لڑکی ہے۔ آجکل تو ڈویژن مارنا لڑکیوں ہی کا کام رہ گیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ تم نے دیکھا نہیں اب تک۔"

اسلم نے کہا "جی ہاں اب تک تو خدا نے محفوظ ہی رکھا ہے مگر اب آپ کے تیوروں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ غالباً آپ یہ کوشش بھی کریں گے۔"

میں نے کہا "نہیں خیر میں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے البتہ جو حالات تم نے سنائے ہیں وہ اتنے دردناک نہیں ہیں جتنے تم ستم رسیدہ بنے ہوئے ہو۔ بہرصورت میں حالات کا جائزہ لے کر کوئی رائے قائم کروں گا۔"

چنانچہ میں فی الحال اس کمرے میں سامان ترتیب سے لگانے لگا جو میرے لیے اسلم نے مخصوص کیا تھا۔

۲

میں ابھی سو کر اٹھا ہی تھا اور ایک آدھ انگڑائی لے کر "گذشتہ سے پیوستہ" کہہ کر پھر سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسلم نے کمرے میں داخل ہو کر کہا:۔

"چلو ان سے بھی مل لو وہ آگئے ہیں ہمارے اور تمہارے دونوں کے گارجین۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "گارجین؟ گارجین کون؟"

اسلم نے پڑوس کی طرف اشارہ کرکے کہا "وہ — مالک مکان۔ عبدالغفور صاحب ٹھیکہ دار۔ اچھے خاصے دردِ سر ہیں یہ حضرت بھی۔"

اور دیوار کے اس پار سے ایک کھنکتی ہوئی زنانہ آواز آئی "امی جان۔ دردِ سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید — کیا یہ سچ ہے؟"

اور میں نے ہاتھوں ہی ہاتھوں میں اشارہ کیا: سنو تو آپ نے

میں نے [illegible] کہا: میں نے [illegible]

اسلم نے [illegible] کہا: [illegible]

[illegible]

یہ بزرگوار اُٹھ بیٹھے [illegible]

[illegible]

[illegible] بزرگ محترم نے عینک [illegible]

[illegible] کہا:۔

"ٹھیکہ دار صاحب یہ ہیں میرے [illegible] دوست [illegible] صاحب"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا: "جی ہاں غائبانہ تعارف تو کافی سے زیادہ ہو چکا ہے۔ بہرحال بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ مجھے حقہ [illegible] مگر آپ کو ذرا سخت قسم کا ہے"

میں نے دست بستہ عرض کیا: "شکریہ۔ مگر میں محروم ہوں"

ٹھیکہ دار صاحب نے حقے کی نے پھر اپنی طرف کرتے ہوئے کہا: "غالباً سگریٹ پیتے ہوں گے آپ"

میں نے کہا: "جی نہیں سگریٹ بھی نہیں پیتا"

عجیب بات پوچھی ٹھیکہ دار صاحب نے: "تو پھر کیا پیتے ہیں آپ"

مجھے ہنسی آگئی اور میں نے جیسا سوال تھا ویسا ہی جواب بھی دے دیا کہ "پانی پیتا ہوں۔ چائے پیتا ہوں۔ کافی پیتا ہوں شربت وغیرہ پی لیتا ہوں"

اور ٹھیکہ دار صاحب نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر آواز لگائی: "میں نے کہا بھتیجی ذرا چائے بنوا دینا"

اسلم نے لاکھ کہا کہ چائے یہاں بھی تیار ہے مگر وہ "کوئی مضائقہ نہیں کوئی مضائقہ نہیں" کہہ کہہ کر اپنے یہاں کی چائے پلانے پر مصر ہی رہے چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ادھر ہمارا ملازم چائے اور ناشتہ لے کر آیا ادھر ایک نہایت خوبصورت سی کشتی میں نہایت دیدہ زیب سی کوزی سے ڈھکی ہوئی کیتلی اور نہایت سلیقہ سے رکھی ہوئی پیالیاں لیے ٹھیکہ دار صاحب کی ملازمہ داخل ہوئی اور وہ چائے بھی ہمارے ملازم نے اس سے لے کر میز پر لگا دی مگر ابھی وہ چائے لگا ہی رہا تھا کہ ٹھیکہ دار صاحب نے اپنے یہاں سے آئی ہوئی چائے [illegible] برتنوں میں سے ایک طشتری اٹھا کر کہا:۔

"ارے! یہ کیا ہے؟ درد سر کی گولیاں۔ یہ کس نے منگائی تھیں۔ ارے بھئی درد سر میں کون مبتلا ہے۔ یعنی خواہ مخواہ بھی۔ یہ کس کے لیے لائی ہے تو کامنی؟"

کامنی نے اپنا دوپٹہ منہ پر رکھ کر ہنستے ہوئے کہا: "بٹیا نے بھیجی ہیں"

ٹھیکہ دار صاحب نے عینک آنکھوں سے ہٹا کر ماتھے پر لگا کر گولی کو بغور دیکھا گویا ان گولیوں کو وہ آنکھوں سے نہیں بلکہ ماتھے

سے دیکھتے تھے۔ یہ بٹیا نے تو بھیجی ہیں مگر کس کے لیے بھیجی ہیں۔ میرے تو پرسوں ہوا تھا سر میں درد۔ گولیاں آج بھیجی گئی ہیں۔ پوچھو تو سہی ذرا جا کر بھئیں سے کہ یہ معمہ کیا ہے؟"

کامنی تو ہنستی ہوئی اندر چلی گئی گھر میں اور اسلم دونوں سمجھ چکے تھے کہ یہ اس قصہ کا سلسلہ اب تک چل رہا ہے وہ جو اسلم نے ٹھیکہ دار صاحب کو دردِ سر کہہ دیا تھا چنانچہ اب گولیاں بھیجی گئی ہیں کہ اگر میرے باپ دردِ سر ہیں تو یہ دردِ سر کی گولیاں کھا لو اور ان سے سر کھپاؤ۔ یہ دونوں ٹھیکہ دار صاحب سے آنکھ بچا بچا کر ابھی مسکرا ہی رہے تھے کہ ٹھیکہ دار صاحب نے کیتلی پر سے ٹی کوزی اتار کر اس کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:۔

"جو منظر اس میں دکھایا گیا ہے اُسے سمجھے آپ؟"

میں نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا" غالباً کامنی دکھائی گئی ہے جو پھول چن رہی ہے باغ میں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے بڑے معلمانہ انداز سے کہا" غلط ——— آپ بتائیے اسلم صاحب"

اسلم نے کہا" میں بھی بس اتنا ہی سمجھا ہوں"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا" تو آپ بھی غلط سمجھے ہیں۔ یہ دراصل چائے کا باغ ہے اور اس میں یہ لڑکی جو ایک ٹوکری مشرقی پہاڑ کی لڑکی دکھائی گئی ہے، اوپر کی کلی اور دو کو نپلیں چٹکی سے توڑ رہی ہے۔ آپ کو کسی چائے کے باغ میں جانے کا کبھی اتفاق ہوا ہے"

ہم دونوں نے ایک ساتھ انکار کر دیا تو وہ بولے" پچھلے سال اہل و عیال کو لے کر میں سلہٹ گیا تھا وہاں میں نے یہ باغ دیکھنے کا اتفاق ہوا چنانچہ عزیزہ جبیں سلمہ نے وہاں سے واپسی کے بعد ہی یہ ٹی کوزی بنائی تھی اور اس پر یہ منظر دکھایا تھا۔ کرما حظہ فرمائیے کہ سوئی سے بنائی ہوئی اس تصویر میں بھی کتنی زندگی ہے"

میں نے بھی داد دی" واقعی میں تو اس کو مشین کا کام سمجھا تھا۔ بڑی صفائی ہے ہاتھ میں ماشاءاللہ اور یہ خوش سلیقگی ہے کہ ٹی کوزی کے لیے مناسب ترین منظر کا انتخاب کیا ہے"

ٹھیکہ دار صاحب نے بڑی خاکساری کے ساتھ سر جھکا کر کہا" جی ہاں اس کو ہمیشہ اسی قسم کی اُپج سوجھتی ہے۔ آپ کی دعا سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا ہے۔ تقریروں کے مقابلہ میں اوّل آئی تھی اس کا کپ بھی لائی ہے۔ اسکول میں مشاعرہ ہوا تو اللہ جانے شاعری اس نے کہاں سے سیکھ لی ہے کہ مشاعرے کے لیے غزل بھی کہہ کر مجھے دکھائی، میں نے کہا کہ بٹیا میرے تو باپ دادا نے بھی کبھی شعر نہیں کہے۔ ٹھیکہ دار ہوں جیسی کہو عمارت بنوا دوں۔ پُل بنوا دوں۔ مسجد اور تالاب بنوا دوں مگر یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ مگر جناب وہ اسی غزل کو پڑھ کر تمغہ بھی لے آئی"

اسی وقت ٹھیکہ دار صاحب کی ملازمہ کامنی ایک دوسری کشتی لے کر آ موجود ہوئی جس پر کروشیہ کے کام کا نہایت نفیس خوان پوش ڈھکا ہوا تھا۔ ٹھیکہ دار صاحب نے کامنی سے پوچھا:۔

"یہ کیا ہے۔ اچھا گویا ناشتہ ہے۔ میں بھی غور کر رہا تھا کہ کیا کہیں گے یہ لوگ بھی اپنے دل میں کہ چائے بھی پلائی تو محض چائے۔ مگر یہ ہے کیا"

یہ کہہ کر خوان پوش جو ہٹایا تو اس کے نیچے واقعی نہایت پُرتکلف ناشتہ چنا ہوا تھا سرخ سرخ سیب۔ ٹوسٹ۔ مکھن۔ انڈے۔

[illegible] اور ایک طشتری میں نہایت نفیس قسم کا حلوہ [illegible] چاندی کے ورق لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان چیزوں کو دیکھ کر کہا:-

"یہ تو آپ نے تکلف کیا ٹھیکہ دار صاحب۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے [illegible] آپ کے سامنے بھی کو

صرف یہ [illegible] کہ جانے [illegible] خود موقع [illegible]

[illegible] ہے اور یہ [illegible] کہ کسی کو

چلنے پلانا [illegible] مٹھائیاں [illegible]

[illegible] مجھے لگا ہے

پرویز صاحب۔"

میں نے [illegible] خصوصیت کے ساتھ لوگ

[illegible] جیسے [illegible] کہا۔

"[illegible] سے [illegible] کی سے

سے بچایا گیا ہے [illegible] جانے [illegible] جائیگے۔"

ٹھیکہ دار صاحب۔ [illegible] ساتھ [illegible] گھر بھی [illegible] کا حلوہ۔"

ظاہر ہے کہ گاجر کا حلوہ تھا مگر میں نے ٹھیکہ دار صاحب کو خوش کرنے کے لیے [illegible] سیب کا معلوم ہوتا ہے یا شاید [illegible] کا ہے۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے ایک قہقہہ لگا کر کہا: "کس قدر [illegible] سیب [illegible] سیب کا معلوم ہے نہ

کوئی [illegible] بلکہ محض گاجر کا حلوہ ہے۔"

میں نے گویا حیرت سے کہا: "[illegible] اس قدر [illegible] ہے [illegible] اور ذائقہ کس قدر ہے۔ تم نے کیا [illegible]؟"

انہوں نے سیب چھیلتے ہوئے کہا: "جی ہاں میں سیب کے بعد کسی اور طرف متوجہ ہوں گا۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا: "ٹھیک ہے۔ صاحبزادی بھی یہی کہتی ہیں کہ [illegible] منہ پہلے سیب کھانا چاہیے اور انگریزی میں نہ جانے کیا فرماتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سیب کھاؤ بیماریاں بھگاؤ۔ پرویز صاحب یہ بسکٹ بھی گھر ہی کے بنے ہوئے ہیں۔ بچی نے خود ہی بنائے ہیں۔ بھئی مجھے تو بیحد پسند ہیں۔"

میں نے جلدی سے ایک بسکٹ کھا کر کہا: "ماشاءاللہ۔ بھلا بازار کے بسکٹوں میں یہ بات کہاں۔ مگر آپ نہ فرماتے تو میں ان کو ولایتی بسکٹ سمجھتا۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا: "اور ہیں بھی یہ اس اعتبار سے ولایتی کہ بلقیس نے ان کو بنانا ایک میم ہی سے سیکھا ہے جس کی کوٹھی کا ٹھیکہ میرے پاس تھا اور بلقیس سے اس میم کو بیحد دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ صاحب کیا ہنرمند اور سلیقہ شعار لیڈی تھی وہ بھی۔ یہ جو خوان پوش ہے بلقیس نے جب کروشیا سے اس کو بُنا ہے تو وہ میم ایک ایک کو دکھاتی پھرتی تھی کہ بلقیس کے ہاتھ میں کس قدر صفائی ہے اور کتنی بڑی آرٹسٹ ہے یہ لڑکی وہ تو میرے سر تھی کہ میں بلقیس کو اس کے ساتھ ولایت بھیج دوں۔ مگر نا کتخدا لڑکی کو سات سمندر پار

میں کیسے بیچ دیتا۔"

میں نے کہا "ہاں صاحب ہم لوگوں میں اس قسم کی آزادیاں کہاں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا "اور وہ خود بھی پسند نہیں کرتی اس قسم کی آزادی۔ آپ کی دعا سے کالج میں پڑھ رہی ہے مگر کیا مجال کہ برقعے کے باہر چشم فلک نے بھی اس کو دیکھا ہو۔"

ٹھیکہ دار صاحب اسی طرح اپنی صاحبزادی کی شان میں قصیدہ پڑھتے رہے، میں داد دیتا رہا مگر اسلم بیٹھا ہوا مسلسل گھورتا رہا اور صلواتیں سناتا رہا، خستہ ناشتہ پر ہاتھ صاف کرتا رہا کہ سیب کھا چکا تو حلوے کی پلیٹ پر حملہ کر دیا اس سے فارغ ہوا تو مکھن ہی توسٹ پر موٹی موٹی تہیں جما کر صاف کر گیا اور پھر انڈوں کی شامت آئی۔ وہ تو معلوم ہو رہا تھا کہ انتقاماً ناشتہ کھا نہیں بلکہ واقعی ٹھونس رہا ہے البتہ کبھی کبھی قہر آلود نگاہوں سے ٹھیکہ دار صاحب کو دیکھ لیتا اور پھر دانت پیس کر بے زبان ناشتہ سے بدلہ لینا شروع کر دیتا تھا۔ خدا خدا کر کے ناشتہ ختم ہوا اور چونکہ ہم دونوں کو دفتر جانا تھا لہذا ٹھیکہ دار صاحب سے رہائی نصیب ہو سکی۔

۳

وہ مصیبت جو ہر مردانے گھر میں ہوتی ہے جہاں کوئی عورت نہ ہو اس میں ہم دونوں بھی مبتلا تھے کہ مثلاً کپڑے بدلنے جو بیٹھے تو پتہ چلا کہ قمیص میں بٹن ہی ندارد ہیں۔ اب ڈھونڈھ رہے ہیں سوئی دھاگہ اور فرض کر لیجئے کہ مل بھی گیا سوئی دھاگہ تو سوئی میں دھاگہ پرونا کیا آپ کے خیال میں کوئی معمولی کام ہے۔ نہ جانے کتنے وار خالی جاتے ہیں تب کہیں جا کر سوئی کے ناکہ سے دھاگہ گذر سکتا ہے۔ مثلاً آج ہی مصیبت میں اسلم غریب مبتلا تھا۔ خدا جانے بیچارے نے کتنی کوشش کی ہو گی کہ آخر کار اس کو میری مدد کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس نے میرے کمرے میں آ کر کہا:۔

"سوئی میں دھاگہ پرونا آتا ہے تم کو؟"

میں نے کہا "کسی درزی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ تو نہیں کیا ہے مگر لاؤ کوشش کرتا ہوں۔"

اور خدا کو میری شرم رکھنا منظور تھی کہ پہلی ہی کوشش میں دھاگہ سوئی کے ناکے سے گذر گیا اور جب میں نے نہایت فخر کے ساتھ اسلم کو اپنا یہ کمال دکھایا تو وہ حیران ہی تو رہ گیا:۔

"کمال کر دیا بخدا۔ یقیناً تم نے اس فن پر ریاض کر رکھا ہے ورنہ اتنا صحیح نشانہ کسی اناڑی کے بس کا نہیں ہے۔"

اور وہ میرے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر قمیص میں بٹن ٹانکنے کی کوشش کرنے لگا اور غالباً دو ہی تین ہاتھ چلائے ہوں گے کہ ایک مرتبہ "سی سی سی" کرتا ہوا ایکدم کھڑا ہو گیا اور قمیص فرش پر جا گری۔ اب جو میں اس کو دیکھتا ہوں تو وہ ایک ہاتھ سے اپنے دوسرے ہاتھ کی انگلی پکڑے کھڑا ہے اور انگلی کے سرے پر خون کا ایک موٹا سا قطرہ کانپ رہا ہے۔ میں نے کہا:۔

"کیا چبھو لی سوئی انگلی میں؟"

اور اسی وقت دیوار کے اس پار سے بلقیس کی آواز آئی "امی جان۔ کیا ہے اس انگلی کو انگشتِ شہادت کہتے ہیں جس میں

دکھاؤ تو سہی:

اسلم نے واقعی بچوں کی طرح بسور کر کہا: "دیکھیے"

اور میں نے جلدی سے کہا: [illegible]

اسلم نے واقعی غصے سے کہا: "جی چاہتا ہے کہ دھوبی سامنے آجائے تو [illegible]

[illegible] کسی قمیص میں کوئی پن اس سے سلامت چھوڑ [illegible]

سلامت رہ جائیں۔"

میں نے ترس کھا کر کہا: [illegible] تو سوئی میں دھاگا ڈال

یا وہ کون سا الہام ہے۔"

اور اسی وقت کاشی نے دونوں ایک چھری اور ٹنکچر آیوڈین کی ایک شیشی لا کر دیتے ہوئے کہا:

"یہ بتایا نے آپ کے لیے بھیجی ہے اور قمیص منگائی ہے۔"

میں نے چھری اور ٹنکچر دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا: "قمیص [illegible]"

کاشی کو بھی یہ سن کر ہنسی آگئی اور وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر ہنستی ہوئی قمیص لے کر چلی گئی تو اسلم نے کہا: "دیکھا آپ نے اس طرح مذاق اڑایا جاتا ہے بات بات پر۔"

میں نے کہا: "معاف کیجئے گا بندہ نواز یہ مذاق تو آپ خود اڑوا رہے ہیں۔ ذرا سی سوئی چبھ گئی تو [illegible] ہو گئے اور دھوبی کو گولی مار دینے کا ارادہ کر لیا۔"

اسلم نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا: "اچھا خیر اُدھر آجاؤ۔ یہاں تو دیواروں کے بھی کان ہیں۔"

میں نے اس کے ساتھ جاتے ہوئے کہا: "صرف کان نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ آنکھیں بھی ہیں۔"

مگر ابھی ہم دونوں برآمدے میں جا کر بیٹھے بھی نہ پائے تھے کہ ٹھیکہ دار صاحب کچھ سراسیمہ سے داخل ہو کر نہایت گھبراتے ہوئے انداز سے بولے:-

"خیریت تو ہے میں نے تو ابھی سنا کہ خدا نخواستہ اسلم میاں کچھ زخمی ہو گئے ہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا: "استغفر اللہ۔ اگر زخمی ہونا اسی کو کہتے ہیں تو نہ جانے زخمی ہونے کو کیا کہا جائے گا۔ قمیص میں پن [illegible] تھے یہ حضرت کہ ذرا سی سوئی انگلی میں چبھ گئی تھی۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے بدستور تشویش کے ساتھ کہا: "یہ ذرا سی بات بھی خطرناک ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے کہ وہ سوئی زنگ آلود ہو تو اس کا زہر جسم میں داخل ہو سکتا ہے۔ ذرا دکھائیے تو مجھے۔"

اور کچھ نہ پوچھئے کہ اسلم کا کیا حال تھا اس وقت۔ دراصل اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا مگر وہ کھسیانی ہنسی ہنس ہنس کر اپنی اس انگلی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر ٹھیکہ دار صاحب نے بڑھ کر خود ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی دیکھتے ہوئے بولے:-

"بھلا یہ کون سا موقع ہے اس تکلف کا۔ بظاہر تو کوئی خاص بات نہیں مگر احتیاطاً ٹنکچر لگا ہی دینا چاہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر

آپ بٹن ٹانکنے بیٹھے ہی کیوں۔ ارے بھئی سیدھی سی بات تھی کہ قمیص اندر بھیج دی ہوتی، بٹن ٹنک کر آجاتے۔ یہ آپ کو تکلف کی سزا ملی ہے کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔ ؎

اے ذوق! تکلف میں ہے تکلیف سراسر

چنانچہ آپ نے تکلف برتا اور آپ کو سراسر تکلیف پہنچی۔"

میں ابھی اس لطیفہ کے نشہ ہی میں سرشار تھا کہ مصرعہ میں ذوق موجود ہے اور وہ فرما رہے ہیں کہ کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔ ؎ ——— اے ذوق! تکلف میں ہے تکلیف سراسر

کہ ٹھیکہ دار صاحب نے مجھ کو بھی مخاطب کر لیا:۔

"کان کھول کر آپ دونوں صاحبان سن لیں کہ یہ خانہ بے تکلف ہے اور میں آپ دونوں کو بخدا اپنا کرایہ دار نہیں بلکہ عزیز سمجھتا ہوں لہٰذا آئندہ اس قسم کا تکلف نہ ہو ورنہ مجھے صدمہ ہوگا میں نے تو پہلے ہی دن اسلم میاں سے کہہ دیا تھا کہ اس گھر کو آپ اپنا گھر سمجھ کر رہیں اور اگر محض کرایہ دار بن کر رہنا ہے تو اس شہر میں بے شمار گھر اور بھی مل سکتے ہیں بلکہ میں تو اکثر اسی پر نادم ہوا کرتا ہوں کہ آپ کو علیحدہ چولہا ہانڈی کرنا پڑتا ہے مگر بلقیس کی والدہ کی یہ رائے بھی صائب ہے کہ بہت زیادہ یگانگت سے بھی پھوٹ پڑ جایا کرتی ہے۔"

اسی وقت کامنی اندر سے قمیص لے کر آگئی اور اس نے کہا:۔

"بٹیا نے کہا ہے کہ باقی قمیصیں اور مرمت کرنے والے کپڑے بھی دے دیجئے۔"

اسلم نے کہا "شکریہ۔ کہہ دیجئے گا باقی سب کپڑے ٹھیک ہیں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے کہا "پھر وہی تکلف۔ بہتر ہے میں اس کی دوسری ہی صورت اختیار کروں گا۔"

ہم دونوں نے اس دوسری صورت پر غور کرنے کے بجائے دفتر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں اور ٹھیکہ دار صاحب سے رخصت ہو کر ہم دونوں دفتر روانہ ہوگئے۔ گھر سے نکلنے کے بعد میں نے اسلم سے کہا:۔

"اللہ جانے یہ بڑے میاں وہ دوسری صورت کونسی اختیار کریں گے۔"

اسلم نے کہا "خیر یہ بیچارہ بڈھا تو نہایت پُرخلوص قسم کا آدمی ہے مگر ان بڑے میاں کی صاحبزادی کی تیزیوں سے میں بہت گھبراتا ہوں۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں تو تمہاری یہ گھبراہٹ آتی نہیں، اچھی خاصی ذہین قسم کی تیز طرار لڑکی ہے اور خدا کرے یہ میں اس پر الزام نہ رکھ رہا ہوں مگر میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ تم میں غیر معمولی دلچسپی بھی لے رہی ہے۔"

اسلم جیسے سہم کر کھڑا ہوگیا "میں کیوں دیوانے ہو رہے ہو مجھے۔ یہ تیزی طراری اور ذہانت ایسی ہی پسند ہے تو اس شامت کا رُخ اپنی ہی طرف کیوں نہیں کر لیتے۔"

میں نے کہا "گویا میں بھی آپ کی طرح ——— برائے فروخت ——— کی تختی لگائے پھر رہا ہوں۔ اگر میں تمہاری طرح آزاد ہوتا تو اس اعلان پر پھولا نہ سماتا مگر خدا سلامت رکھے میرے متعدد بچوں کی والدہ کو جس کے نام میرے جملہ حقوق نہ جانے کب کے محفوظ ہو چکے ہیں۔"

اسلم نے کہا "تو گویا میں ہی فالتو رہ گیا ہوں۔ یہ تو عجیب خود غرضی کی باتیں کر رہے ہیں آپ۔"

میں نے کہا: "تو جناب صاحب آپ [illegible] ہے۔ وہ آپ کی [illegible]
[illegible] پہلے [illegible]۔"

اسلم نے گھبرا کر کہا: "مزاج ہم اور مزاج کیسے؟"

میں نے کہا: "وہی مزاج جس سے بظاہر [illegible] ہیں۔"

اسلم نے خفگی سے کہا: "بظاہر سے کیا مطلب [illegible]"

میں نے کہا: "بظاہر سے میرا مطلب یہ [illegible] غور کرنے کی بات [illegible] اور متواتر [illegible] آپ کی [illegible] ہے [illegible] کے پڑھنے میں جیسے [illegible] ہے اور آپ [illegible] کوئی معنی ہوسکتے۔"

اسلم نے کہا: "یہ تو [illegible] ہے۔ [illegible] کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

میں نے کہا: "اسی پر تو مجھ کو حیرت ہے۔"

اسلم نے کہا: "اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ دلچسپی ہونا تو درکنار مجھے تو وحشت ہوتی ہے اس تصور سے بھی اور مجھ کو [illegible] سخت بیزار ہوں۔"

میں نے کہا: "اس کی دلچسپی اور تمہاری بیزاری کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔"

اسلم نے بڑے تعجب سے پوچھا: "وہ کیا۔"

میں نے کہا: "وہ یہ کہ تم نے اس کو اب تک نہیں دیکھا ہے، ورنہ وہ تم کو برابر دیکھتی رہتی ہے۔"

اسلم نے منہ بنا کر کہا: "جی اور کیا ایسا ہی تو میں گلفام ہوں کہ وہ مجھ کو دیکھ کر اس طرح بے قابو ہو گئی ہیں اور [illegible] شدت سے دلچسپی لے رہی ہیں۔"

میں نے کہا: "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ایسی قابلِ نفرت نہ ہو جیسی بغیر دیکھے آپ اس کو سمجھ رہے ہیں۔"

اسلم نے جز بز ہو کر کہا: "نہیں صاحب وہ محض بیوقوف بنا رہی ہے۔ آج کل کی اسکولوں اور کالجوں کی بعض لڑکیوں کو بیوقوف سازی کا بھی بے حد شوق ہو گیا ہے وہ خواہ مخواہ بھی اچھے خاصے نوجوانوں کو اپنے ان ہی ہتھکنڈوں سے بیوقوف بنا دیا کرتی ہیں مگر میں ایسا چغد نہیں ہوں۔"

میں نے کہا: "بعض اوقات نہایت مسلم الثبوت قسم کے چغدوں کو بھی اپنے متعلق یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ وہ چغد نہیں ہیں بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک کسی چغد نے اپنے کو چغد نہیں سمجھا ہے اس لیے کہ یہ احساس ہی چغدیت کے منافی ہے۔"

اسلم نے پہلے تو غور کیا پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "اچھا خیر — مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ صرف بیوقوف بنا رہی ہے۔"

میں نے کہا: "مگر اس بیوقوفی کا جواب ہے کہ آپ نے نہ اس غریب کو دیکھا نہ اس سے براہِ راست کوئی واسطہ پڑا اور خواہ مخواہ بھی اس سے بیزار بنے بیٹھے ہیں۔"

اسلم نے کہا: "سوال یہ ہے کہ میں اس سے کیوں دلچسپی لوں؟"

میں نے کہا: "جناب کے اسی سوال سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دلچسپی کیوں نہیں آپ"؟

اسلم نے اُلجھ کر کہا: "میں تم ابھی پریشان کر رہے ہو۔ مگر میں بخدا عاجز آچکا ہوں، ان باتوں سے اور یہ بڑے میاں اور بھابی اپنی صاحبزادی کے قصیدے سنا سنا کر بور کرتے رہتے ہیں کوئی پوچھے کہ آپ کی صاحبزادی بڑی ہنرمند۔ بڑی سلیقہ شعار بڑی لائق فائق، اور بڑی وغیرہ وغیرہ ہیں تو ہم کیا کریں، دلوا دیجئے ان کو نوبل پرائز۔ ہمارا سر کیوں کھاتے ہیں آپ اور ہم کو کیوں مرعوب کرتے ہیں"؟

میں نے کہا: "اس بیچارے کا شاہکار اس کی یہی بیٹی ہے لہٰذا وہ اسی کا سرخروئی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ شاعر ہوتا تو شعر سناتا سیاستدان ہوتا تو سیاسی داؤں پیچ سناتا اپنے مگر وہ تو محض باپ واقع ہوا ہے۔

اسلم کا دفتر آچکا تھا لہٰذا وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا اور میں اپنی راہ ہو لیا۔

۴

یہ اسی دن کا قصہ ہے کہ میں جو شام کو دفتر سے واپس آیا تو اسلم صاحب برآمدے میں ایک کرسی پر سر تھامے بیٹھے تھے مجھ کو دیکھتے ہی کہنے لگے:۔

"میں تو خیر صاف ہو گیا ہوں بالکل، اب ذرا آپ بھی اپنا کمرہ کھول کر دیکھ لیجئے کہ آپ کی کیا کیا چیزیں غائب ہوئیں"۔

میں نے سناٹے میں آکر کہا: "صاف ہو گئے ہو بالکل؟ مطلب کیا ہے تمہارا"؟

اسلم نے نہایت بے بسی کے انداز سے کہا: "چوری ہو گئی اور کیا ہوتا۔ ایک چیز نہیں چھوڑی ہے۔ دیکھو تو سہی ذرا اپنا کمرہ"

میں نے لپک کر اپنا کمرہ کھولا تو میری تمام چیزیں بجنسہ رکھی ہوئی تھیں۔ تمام سوٹ کیس اپنی جگہ پر رکھے ہوئے تھے الماری کھول کر دیکھی تو کپڑے سب کے سب موجود تھے۔ حد یہ ہے کہ آج میں تکیہ کے نیچے اپنی گھڑی بھول گیا تھا وہ بھی اسی جگہ رکھی ہوئی ملی۔ مگر اپنے کمرے سے جا کر اسلم کے کمرے کو جو دیکھا تو وہاں اصطلاحاً نہیں بلکہ واقعی جھاڑو پھری ہوئی نظر آئی۔ بستر وغیرہ تو خیر نہایت سلیقہ سے لگا ہوا تھا مگر الماری میں ایک کپڑا موجود نہ تھا۔ تین سوٹ کیس تھے غریب کے وہ ندارد تھے۔ بجلی کی استری میز پہ رکھی رہتی تھی وہ ندارد تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں یہ سب کچھ دیکھ کر اسلم سے کہا:۔

"رحمان سے پوچھا"

اسلم نے کہا: "وہ تو آج صبح ہی اجازت لے چکا تھا کہ اپنے بھائی سے ملنے جاؤں گا"

میں نے کہا: "اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ پہلے ہی پروگرام بنا چکا تھا کہ ہم لوگ دفتر جائیں اور وہ یہاں ہاتھ صاف کر جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ میرا سامان اس نے کیوں نہیں چھوا"؟

اسلم نے کہا: "جلدی میں صرف ایک ہی کمرے کا سامان اٹھا سکا ہوگا"

میں نے کہا: "مگر بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ سامان سمیٹتا رہا اور ٹھیکیدار صاحب کے یہاں کسی نے اس کو ٹوکا بھی نہیں پوچھا تو ہوتا ذرا کامنی کو بلا کر"

[illegible] ٹھیکیدار صاحب [illegible]

[illegible] چیزیں [illegible]

[illegible] موجود ہے [illegible]

میں نے کہا [illegible]

میں ابھی یہ [illegible]

[illegible] کوئی بات [illegible]

[illegible] دیر ہو گئی [illegible]

[illegible] چا [illegible]

[illegible] نے دم بخود ہو کر کہا [illegible]

اور وہ دونوں [illegible] اس وقت [illegible] یہی سوال ہوگا [illegible]

[illegible] پر تھا لیکن مگر [illegible]

نہیں سکتا کہ اس طرح حیرت کا اظہار کرتے [illegible]

[illegible] سمجھا رہے تھے کہ [illegible] آ کر کہا۔

"مگر صاحب یہ کیسا چور تھا جو کپڑے لے گیا ہے تو کوٹ بھی لے گیا ہے۔ یا سارے دروازوں پر پردے نیچے لٹکے ہوں؟"

ہم دونوں نے تقریباً ایک ساتھ کہا: "پردے!"

اور وہ ہمیں کمرے کے اندر جہاں واقعی دونوں دروازوں اور دونوں کھڑکیوں پر نہایت خوبصورت پردے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے قریب جا کر ایک کھڑکی کے پردے کو جو ہاتھ میں لے کر دیکھا تو [illegible] کے ایک سوٹ کیس کی جھلک نظر آئی۔ [illegible] یہ تو تینوں سوٹ کیس نہایت سلیقہ سے اس پردے کے پیچھے رکھے ہوئے نظر آئے۔ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:-

"تو بھئی مبارک ہو تمہارا سامان چوری نہیں ہوا بلکہ پردہ نشیں ہو گیا ہے۔ یہ رہے تینوں سوٹ کیس۔"

اسلم نے قریب آتے ہوئے کہا: "اس کا مطلب یہ ہوا کہ باقی چیزیں بھی اسی طرح کسی نہ کسی پردے میں ہوں گی۔"

اور یہ کہہ کر [illegible] جا کر دیکھنا شروع کیا۔ مگر اس کو اپنے وہ کپڑے کہیں نہ مل سکے جو الماری میں اس طرح جمے ہوئے تھے جیسے گھری کا مجموعہ ہو کر غرض اس لئے کہ وہ ان کپڑوں کے متعلق تحقیقات کرتا۔ ٹھیکیدار صاحب کچھ پریشان سے کمرے میں داخل ہو کر بولے:-

"کمال کرتے ہیں آپ لوگ بھی کہ نہ کسی سے پوچھا نہ گچھا گھریلو طور پر تحقیقات کی اور تھانہ چوکی بھی شروع کر دی۔ بھلا بتلائیے میرے گھر پر پولیس آ موجود ہوگی اور مال مسروقہ میرے گھر کے اندر سے برآمد ہوگا تو میری کتنی بے عزتی ہوگی۔ صاحب آپ کے تمام کپڑے اندر اٹھوا لئے گئے ہیں تاکہ ان کو درست کر دیا جائے گودڑ کی طرح الماری میں ٹھنسے ہوئے تھے کسی قمیص میں بٹن ندارد تھے تو کوئی پتلون بغیر استری کے ملا رسلا پڑا تھا۔ کسی کوٹ کا کالر مرمت طلب تھا تو کسی شیروانی کی جیبیں کٹی ہوئی تھیں۔ بیگم نے اگر

وہ سب کپڑے نکال دیے ہیں تاکہ ان کو درست کر دیا جائے۔"

میں نے کہا: "یہ تو درست ہے مگر یہ تھانہ چوکی کی کیا بات فرما رہے تھے آپ؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "یہی کہہ رہا تھا میں کہ بلا وجہ پولیس نے آکر تحقیقات شروع کر دی تو کس قدر بدنامی کی بات ہے صاحب۔"

اسلم نے کہا: "مگر پولیس کا یہاں کیا ذکر تھا؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "اور ذکر کس کو کہتے ہیں کہ آپ جا رہے تھے رپورٹ درج کرانے۔ حالانکہ پہلے آپ کو مجھ سے دریافت کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں کیسے جا سکتا تھا۔"

اسلم نے کہا: "مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں پولیس میں رپورٹ درج کرانے جا رہا تھا؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "مجھے نہایت وثوق سے معلوم ہوا ہے۔"

اسلم نے کہا: "اور میں نہایت وثوق سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ غلط اطلاع آپ کو پہنچائی گئی ہے البتہ میں ڈھونڈ ضرور رہا تھا کہ سوٹ کیسوں کی طرح یہ کپڑے کس پردے میں رکھے گئے ہیں۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "کیسے رہے یہ پردے؟ اس کمرے کے رنگ اور اس صوفے کی وضع سے میل کھاتا ہوا ہی کپڑا صاحبزادی نے پسند کیا ہے۔ مگر پرویز صاحب کے کمرے کے لیے جو پردے آئے ہیں ان کا تو جواب ہی نہیں۔ کل دیکھئے گا پرویز صاحب۔ آپ ہی یاد آئے بھی۔ آپ کا کمرہ آج اس لیے درست نہیں کیا گیا کہ ان حضرت سے تو اجازت لینے کی گویا ضرورت ہی نہ سمجھی گئی مگر آپ سے اجازت کے علاوہ کنجی لینا بھی ضروری تھی اس لیے کہ آپ تو اپنا کمرہ مقفل کر جاتے ہیں اور میں نیک نیتی کے ساتھ بھی قفل شکنی کو اخلاقی جرم سمجھتا ہوں۔"

میں نے کہا: "مگر یہ زحمت آپ اٹھا ہی کیوں رہے ہیں؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "یہ زحمت اس لیے اٹھائی جا رہی ہے کہ آپ لوگ نہیں اٹھاتے۔ اب تک انتظار کیا گیا کہ شاید آپ لوگ خود اپنے رہنے کے ٹھکانے کو آراستہ کریں گے مگر آپ لوگ تو عجیب درویش صفت واقع ہوئے ہیں کہ گھر میں بھی اس طرح رہتے ہیں کہ کیا کوئی ویٹنگ روم میں رہتا ہوگا۔ حد یہ ہے کہ ان اسلم صاحب کے بستر کے نیچے سے ہولڈال تک معہ تسموں کے برآمد ہوا ہے۔"

اسلم نے کہا: "مگر ہماری اس بدسلیقگی کی سزا آخر آپ کیوں بھگتیں؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "میاں سچی بات تو یہ ہے کہ مردوں کی اکثریت اسی قسم کی اوٹ پٹانگ ہوتی ہے جیسے آپ ثابت ہوئے ہیں مثلاً میں خود بجد کباڑیا ہوتا اگر بلقیس میرا خیال نہ رکھتی چنانچہ باہر سے آکر میں خود کوٹ ایک طرف اچھال دیتا ہوں۔ ٹوپی گھڑونچی پر رکھ آتا ہوں، جوتوں کے اندر موزے ٹھونس کر ان کو پلنگ کے نیچے کھسکا دیتا ہوں، چھڑی پلنگ پر لٹا دیتا ہوں اور نہ جانے کیا کیا کرتا ہوں مگر دوسرے دن ہر چیز نہایت سلیقہ سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ملتی ہے۔ خیال آتا ہے تو صرف یہ کہ چار دن میں جب بلقیس کی شادی ہو جائے گی تو میرا کیا حشر ہوگا؟"

میں نے کہا: "کیوں کیا بیگم صاحبہ محترمہ سے آپ کو اس دستگیری کی توقع نہیں ہے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے منہ بنا کر کہا: "ابھی تو یہ کیجیے ان کی ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی تک تو میں خود اڑاتا ہوں وہ کیا کریں گی میرا کوئی

...سے اس قسم کی طاقت حاصل ہو کہ ان کی یہ بھدی ہی بیماری کی اصل جڑ ہے۔"

ہم نے کہا: "تمہاری بیگم تو آٹا دودھ پر ہی ... سبب فشار کو تقویت ... ان کی"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "جی بہت نہیں۔ عادت خراب ... انہوں نے دوا کو ملا کر پانی بھی کبھی نہیں پینے دیتی۔ نتیجہ یہ کہ بیٹھے بیٹھے جب چوتھی بیماری ہی ان اسباب تیزی سے موٹی ہو ... اگر صاف ... تو ہر وقت ... ضرورت ہے کہ ... تدارک تو ... بولی۔ پہلوان صاحب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے گھر میں سے نہایت پھرتیلے اور ... چست جسم کی خاتون تھیں اور بڑی ... تھی ان کی جسامت بھی مگر اب تو یہ حال ہے کہ ... میں سے بند کر رکھے ہیں۔ آ۔ وہ ان کو کھانے نہیں دیتا۔ مجھ فقط وہ ساٹھ ... یہ بہر کیف ہوں وہ خود ڈانس کرتی ہیں۔"

میں نے حیرت سے پوچھا: "کیا وہ ڈانس بھی کرتی ہیں؟"

اور کمرے کی دیوار کے پیچھے سے "کھی کھی کھی" قسم کی ہنسی کی آواز دور جاتی ہوئی محسوس ہوئی اور ٹھیکیدار صاحب نے ... سے جملہ مکمل کر لیا۔

"رقص یعنی ناچ! استغفراللہ۔ جی نہیں بندہ نواز میں نے شوقیہ ... سے ابھی ... نہیں چڑھایا ہوں کہ یہ ... کی نوبت ... شروع کر دیں۔ میں تو اس چیز کو کہہ رہا تھا جس کا مفہوم ہے کہ کھانا۔"

اسلم نے کہا: "اچھا اچھا ڈائٹنگ کو کہہ رہے تھے آپ۔ میں خود حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ ... سے کیا تعلق تو کیا وہ ڈائٹنگ بھی کرتی ہیں وہ؟"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "وہ بیچاری خود اپنے موٹاپے سے عاجز ہیں اور اس کو مستقل مرض سمجھتی ہیں بلکہ ... تو ارادہ ہو رہا ہے کہ اب ان سے چکی پسوایا کروں گا۔ مگر سنا ہے کہ تیرنے سے بھی جسم سڈول اور چھریرا ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو تیرانے کا انتظام کہاں کیا جائے۔ جی نہیں بس چکی پسوانا ٹھیک رہے گا۔"

اسلم نے کہا: "اس کے لیے کچھ ورزشیں بھی تو ہوتی ہیں۔"

ٹھیکیدار صاحب نے بڑی تشویش سے کہا: "چہ خوش یعنی آپ کا مطلب ہے ان کو باقاعدہ پہلوان بنا دیا جائے۔ یہ غلط ہے اور نہ یہ عورت ذات کو زیب دیتا ہے کہ وہ بیٹھکیں نکالتی رہے اور ڈنٹر مگدر وغیرہ کا شغل کرے بس چکی والی تجویز نہایت مناسب ہے ایک تو یہ کہ گھر کا پسا ہوا آٹا ملے گا کھانے کو، دوسرے ان کا وزن بھی کم ہو گا جاتی وہ تو اب پہاڑ کی چوٹی نظر آنے لگی ہیں۔"

میں نے ان کو ایک اور ترکیب بتائی کہ آپ ان کو نہار منہ ایک لیمو نچوڑ کر ایک پیالی دودھ پلا دیا کیجئے۔ بس یہی ان کا ناشتہ ہو اور اس کے بعد خواہ کتنی ہی بھوک لگے وہ کچھ نہ کھائیں تکلیف تو بہت ہو گی کلیجہ کٹ کر رہ جائے گا۔ بھوک سے برا حال ہو گا مگر یہ تکلیف ان کو برداشت کرنا پڑے گی اور جب بھوک بالکل ہی ناقابل برداشت ہو جائے تو مغرب کے وقت کوئی ہلکی سی غذا آدھی بھوک باقی رکھ کر کھایا کریں پھر دیکھئے کہ چند ہی دن میں کیا ہوتا ہے۔"

اسلم نے کہا: "مگر میرا خیال ہے کہ اس طرح بھوک مارنے کا نتیجہ بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوتا جسم تو ضرور گھٹتا ہے مگر کمزوری بھی بڑھتی ہے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "ابھی بڑھنے دیجئے کمبخت کے جسم کو لیکن کس طرح۔ تو کیا فرمایا آپ نے کیلا! یعنی یہی کیلا جو کیلا کہلاتا ہے یعنی چھال کا ہو یا کوئی خاص قسم کا کیلا؟"

میں نے کہا: "جی ہاں یہی چھال کا ایک کیلا کھلا کر ایک پیالی دودھ پلا دیا کیجئے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "کوئی دعا وغیرہ تو نہیں پڑھنا ہے اس کے ساتھ ۔۔؟"

میں نے کہا: "نہیں صاحب یہ کوئی روحانی عمل نہیں بلکہ مٹاپا دور کرنے کی دوا ہے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے زیرِ لب کئی مرتبہ دہرایا ایک کیلا ایک پیالی دودھ اور یہی کہتے ہوئے وہ اس طرح کمرے کے باہر چلے گئے گویا اگر یہ نسخہ حفظ نہ کیا تو کیلے کی جگہ کسٹل کھلا دیں گے۔

۵

میں تو چند ہی دن اس مکان میں رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ سوائے اسلم کی ناشکرگزاری اور احسان فراموشی کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ اس مکان سے عاجز تھا اور دوسرا مکان تلاش کرنا چاہتا تھا حالانکہ اس کو شاید اپنے گھر میں بھی اتنا آرام نصیب نہ ہو سکا جتنا اس گھر میں اس کو حاصل تھا کہ تھا تو کرایہ دار مگر کیا کسی مہمان کی کوئی میزبان آؤ بھگت کر سکتا ہے جو خاطر تواضع اس کی اور اس کے طفیل میں میری ہو رہی تھی۔ ہم دونوں کے کمرے تو خیر آراستہ کر ہی دیئے گئے تھے مگر اب تو کیفیت یہ تھی کہ بلا طلب ہم کو ہماری ضرورت کی ہر چیز موجود ملتی تھی مجھے تو حیرت اس بات پر ہوئی کہ میری شیونگ اسٹک ختم ہو چکی تھی اور میں ارادہ ہی کر رہا تھا کہ آج دفتر سے واپس آتا ہوا لیتا آؤں گا کہ دیکھتا کیا ہوں کہ میز پر نئی شیونگ اسٹک موجود ہے۔ بات بظاہر یہ کچھ ایسی بالشان نہ تھی مگر مجھ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ میں وہ شیونگ اسٹک لیے اسلم کے کمرے میں جا پہنچا اور اس سے کہا:۔

"یہ شیونگ اسٹک کیا تم نے لا کر میری میز پر رکھی ہے؟"

اسلم نے کہا: "یہ غالباً میرے ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ لائی گئی ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ ہم کو اس طرح کیوں زیرِ بار احسان کیا جا رہا ہے اور ہم کب تک یہ بار اٹھا سکتے ہیں؟"

میں نے کہا: "یہ بات اس ناگواری کے ساتھ کہنے کی نہیں ہے بلکہ حسن سلوک کا جواب بھی حسن سلوک ہی سے دینے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے موقع کی تلاش میں رہنا چاہئے۔"

اسلم نے کہا: "وہ موقع کبھی ہاتھ نہ آنے گا اور اُس طرف سے یہ احسانات ہوتے ہی رہیں گے مگر یہ آخر کیوں ہو رہے ہیں احسانات۔ کیا مطلب ہے اُس کا؟"

میں نے کہا: "بغیر کسی مطلب کے بے لوث خلوص بھی تو ہو سکتا ہے۔"

اسلم نے کہا: "خواہ مخواہ کی شرمندگی میں مبتلا کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ میرے پاس اتفاق سے رومال ختم ہو گئے تھے۔ کچھ دھوبی نے کھوئے کچھ خود میں نے کھوئے۔ ایک دن دفتر جانے کے لیے میں نے اپنا میلا رومال دھو کر سوکھنے کے لیے باہر پھیلا دیا بس یہ غلطی مجھ سے سرزد

"ذرا پھر جا کر دیکھا کہ کپڑوں کی الماری میں ایک سو درجن کیلے وہاں رکھے ہوئے ہیں۔ اُف۔ زیادہ آگئے یا نہیں۔"

اور اسی وقت وہی مانوس لکنتی ہوئی آواز باہر کے کمرے میں گونجی۔

"امی جان۔ یہ شبو کرتے کے دامن سے ناک صاف کر رہا ہے اس سے کہئے رومال رکھا کرے۔"

میں تو بمشکل تمام اپنی ہنسی ضبط کر سکا مگر اسلم کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا جو غصے سے تمتما اٹھا تھا۔ میری ہنسی پر اسلم نے جھلا کر کہا۔

"تو ہنسی آرہی ہے اور میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے ان باتوں سے۔"

ابھی میں اسلم کو سمجھانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ٹھیکیدار صاحب نہایت سراسیمہ تشریف لائے۔

"کہاں؟ کدھر؟ ارے میں کہاں آگ لگ گئی کیسے لگی۔ کس نے لگائی؟"

اسلم اور بھی جھنجھلا کر رہ گئے مگر میں نے ٹھیکیدار صاحب کو مطمئن کر دیا کہ کوئی آگ واگ نہیں لگی ہے۔ آپ مطمئن رہئے۔ اور جب انہوں نے بحث شروع کر دی کہ میں نے نہایت وثوق سے سنا ہے کہ آگ لگی ہے تو مجبوراً مجھ کو کہنا ہی پڑا کہ آگ واقعتاً نہیں بلکہ محاورتاً لگی تھی۔ یہ اسلم صاحب ایک صاحب کا ذکر کر رہے تھے کہ ان کی باتوں سے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

ٹھیکیدار صاحب نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا: "لاحول ولا قوۃ۔ میں سمجھا کہ خدانخواستہ آتشزدگی ہو گئی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ بعض لوگوں کی باتوں سے خواہ مخواہ تن بدن میں آگ لگ جایا کرتی ہے مثلاً آج صبح سے بھتیجے کی والدہ مجھ کو جلا رہی ہیں۔ آپ نے صرف ایک کیلا کھانے کو بتایا تھا وہ پورا درجن صاف کر گئیں۔ ان کا علاج تو صرف یہی ہے کہ جھکی رہیں۔ یہ کیلا وغیرہ مسواجیات ہے اس سے تو جسم اور بھی بگڑے گا۔"

میں نے کہا: "جی نہیں یہ نہایت آزمودہ نسخہ ہے کہ نہار منہ ایک کیلا کھا کر ایک پیالی دودھ پی لیجئے اور پھر بھوک کو برداشت کیجئے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "مگر بندہ نواز میری بیوی تو نادر شاہ درانی کی ہمشیرہ عزیزہ ہیں۔"

اسلم نے حیرت سے پوچھا: "نادر شاہ درانی کی بہن! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جیسے نادر شاہ نے قلاقند کا پورا مرتبان شاہی حکیم سے چھین کر صاف کر دیا تھا اور پھر کہا تھا کہ — حلوائے خوب است دیگر بیار۔ اسی طرح یہ محترمہ بھی ایک کے بجائے ایک درجن کیلے کھا گئیں۔"

اسلم نے بدستور سوالیہ نشان بن کر پوچھا: "واقعی"

ٹھیکیدار صاحب نے کہا: "جی ہاں واقعی، بلکہ واقعتاً۔"

اسلم پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ جب ماں کا یہ حال ہے تو صاحبزادی بھی کچھ کم ثابت نہ ہوں گی۔ ٹھیکیدار صاحب کے پاس تو گنجائش تھی کہ وہ درجنوں کیلے لا سکتے تھے۔ مگر غریب اسلم کیلوں کا باغ کیسے خریدتا! — یہی سوچ کر اس نے اپنا بوریا بستر باندھا اور ناک کی سیدھ میں اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

لاحول ولاقوۃ

۱

نواب سکندر بخت کو آپ نہیں جانتے ؟

لاحول ولا قوۃ۔ تو پھر آپ جانتے ہی کیا ہیں۔ مل لیجئے ان سے' یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ، اور عنقریب فسانہ بننے والے ہیں۔ پھر ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ ہمارے عجائب خانوں میں بھی تو یہ انتظام نہیں ہے کہ اس قسم کے نمونے محفوظ کر لیے جائیں۔ یہ چُنی ہوئی دوپلی ٹوپی۔ سر پر یہ عنبریں لہریا پٹے۔ لبوں میں دبی ہوئی ابابیلوں جیسی گھنی کالی بھونرا سی مونچھیں۔ ہر چند کہ یہ کاریگری خضاب کی ہے مگر کہاں ملتے ہیں ہر ایک کو خضاب کے یہ خاندانی نسخے کہ اس عمر میں جیسے شباب پھٹا پڑتا ہے۔ جالی دار بنیائن پر خوردبین سے دیکھا جائے تو کرتہ بھی نظر آ سکتا ہے مگر اس طرح کہ جیسے سبزے پر اوس پڑی ہو۔ اس کرتے کے گریبان پر مُرّی پھندے کا ایسا نفیس اور باریک کام ہے کہ جس کمبخت نے یہ کام بنایا ہوگا، وہ اب آنکھیں مانگتا پھر رہا ہوگا۔ اور کرتے ہی پر کیا منحصر ہے جس نے یہ چوڑی دار پاجامہ بنایا ہے اُس کے فن کا کیا جواب ہے۔ پنڈلیوں پر کیسی لہریا تراش ہے اور کس قدر باریک جالی کھول کر ایسا چُست بٹھایا ہے پنڈلیوں پر کہ گویا لئی سے چپکا دیا ہو ظالم نے۔ معلوم نہیں نواب صاحب نے اپنے اس درزی کی زندگی کا بیمہ بھی کرا رکھا ہے یا نہیں۔ ایسے فنکاروں کے متعلق تو سنا ہے کہ وہ اپنا فن بھی اپنے ساتھ ہی قبر میں لے جاتے ہیں۔ شیطان کے کان بہرے اگر کسی کی نظر کھا گئی اس درزی کو تو کیا کریں گے آخر ہمارے نواب صاحب اور کون سی کر لیا کرے گا ان بیچارے کے لیے ایسا انگرکھا جیسا ابھی یہ سی کر لایا ہے جسے پہن کر نواب صاحب قد آدم آئینہ کے سامنے اس طرح اپنا اور اس انگرکھے کا جائزہ لے رہے ہیں جیسے کتھک ناچ کے مختلف بھاؤ بتا رہے ہوں۔ اس پر طرّہ ان کے حاضر باشوں کی داد کا شور کہ نواب صاحب نے ایک ہاتھ پھیلا کر دوسرا سینہ کی طرف سمیٹا اور ایک شور بلند ہوا کہ :۔ "سبحان اللہ۔ جواب نہیں ہے حضور والا۔ اور کیا کہنا ہے مجنو استاد انگرکھا کیا سیا ہے بخدا مرقع کھینچ دیا ہے مرقع ——"

ایک صاحب نے الگ سے مصرعہ لگایا :۔ "مجنو صاحب کا کمال تو ہے ہی مگر اپنی قسم ہے دُہائی ہے کیا جامہ زیبی پائی ہے میری آنکھوں میں خاک ۔"

دوسرے نے کہا :۔ "یہ تو ہے ہی یہی انگرکھا مجھے پہنا دیجئے بخدا معلوم ہوگا ڈفلی پر کھال منڈھ دی ہے ۔"

تیسرا بولا :۔ "اجی سارنگی پر غلاف کہو ۔"

مجھو دری نے کانوں کو ہاتھ لگا کر عرض کیا: "حضور! اپنی قسم [illegible] جو [illegible] سی ہو رکے پیچھے ایک ٹانگ بھی [illegible] نواب آغا جانی صاحب [illegible] حضور [illegible] اجازت ہو تو عرض کروں کہ پہلے نواب صاحب [illegible] پھیرو پھیکنے کے خواب دیکھنے لگا۔ حضور [illegible] بات کسی ایک [illegible] بڑی بڑی [illegible] جو [illegible] کی ہمدری تو [illegible] بھی [illegible] سنڈیوں پر جا کر۔"

نواب صاحب بے ساختہ ہنس کر مصاحبوں کے ساتھ [illegible] اس طرح [illegible] مجھو [illegible] آپ ہی سے [illegible]۔ خیر خیر۔ یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ [illegible] کہ مجھو کے ہاتھ کے [illegible] کبھی تو کوئی عیب نکال سکتے۔ [illegible] ہاتھ پاؤں ہے اس کا مطلب کہ [illegible] نہیں جو [illegible] ایک ٹانگ [illegible]۔

مجھو نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "حضور [illegible] کو [illegible] شوق [illegible]"

نواب صاحب نے ایک مصاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا: "شبن صاحب [illegible] جا کر [illegible] اس سے بھی روپے زیادہ دے دیجئے گا اس ٹھرکے کا انعام۔"

مجھو دوری فرشی سلام کرتا ہوا جب شبن صاحب کے ساتھ چلا گیا تو نواب صاحب نے [illegible] میں سے ایک سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ اسی وقت مجھو کو بھی آنا تھا ٹھرک کھانے کو۔ ہاں بھائی شبن صاحب تو لو، آپ کو [illegible] کہ حضور [illegible] ناحال تکلف فرما رہے ہیں۔"

شبن صاحب نے کہا: "تکلف بھی نہیں حضور والا [illegible] ہی ہے کہ لڑکی والے ایک [illegible] کوئی نسبت بھی منظور نہیں کرتے خواہ وہ اس نسبت کو دل ہی دل میں کتنا ہی اچھا کیوں نہ سمجھیں اور دوں میں کیسے ہی لڈو کیوں نہ پھوٹ رہے ہوں [illegible] مزا جاتے۔"

نواب صاحب نے دوسرے مصاحب ابن صاحب سے کہا: "آپ کا خیال کیا ہے ابن صاحب آپ کی نظر بڑی گہری ہے آپ نے کیا اندازہ کیا حکیم صاحب سے مل کر اور یہ ذکر چھیڑ کر۔"

ابن صاحب نے بڑے مفکرانہ انداز سے کہا: "مجھے شبن بھائی کی رائے سے ذرا اختلاف ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ بڈھا نہایت خرانٹ ہے۔ شیشے میں تو خیر ہم اس کے باپ کو بھی اتار لیں گے مگر میرا خیال یہ ہے کہ اتنے بڑے گھرانے سے جو نسبت گئی ہے تو اس کا دماغ بھی عرش معلٰے پر پہنچ گیا اور غالباً وہ چاہتا ہے کہ پہلے آپ کی اولوالعزمیوں کے تماشے دیکھے آپ کی آتش شوق کو بھڑکائے اور اندازہ کرے کہ آپ کا ایسا رئیس اس معاملہ میں اپنی ریاست کے کیا نمونے پیش کرتا ہے اس کے بعد وہ راضی تو ہو ہی جائے گا۔ فی الحال اس کو یہ بھی تو ظاہر کرنا تھا کہ گویا دولت پر ایک دم گر نہیں پڑا ہے وہ۔"

نواب صاحب نے بڑی تشویش سے پوچھا: "آپ میں سے کسی نے یہ تو نہیں کہہ دیا کہ میں ان کی دختر نیک اختر کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہوں۔"

شبن صاحب نے اُچھلتے ہوئے کہا "کمال ہے بخدا ابھی سنا ابن صاحب دختر نیک اختر فرمایا ہے نواب صاحب نے آپ کو بھلا یہ تو سرکار یہ بتا دیجئے کہ آپ کو کیسے معلوم ہو کہ اُن صاحبزادی کا نام اختر ہے۔"

نواب صاحب نے بڑی معصومیت سے کہا "آپ کے سر عزیز کی قسم میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ اس کا نام اختر ہے مگر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ اختر نام ہے اُس کا۔"

ابن صاحب نے کہا "جناب جب ہم کو آپ نے اس خدمت پر مامور کیا ہے تو یہ نہ پوچھئے کہ ہم کیا کچھ کر چکے ہیں اب تو تمام ہی [illegible] حیران ہیں ہم تو یہاں تک معلوم کر چکے ہیں وہاں بھی کسی کا نام معلوم کرنے کی کھوج جاری تھی۔"

نواب صاحب نے ذرا دبے دبے ہنستے ہوئے کہا "تھی میری قسم، مگر ان کو کس کا نام معلوم کرنے کی کھوج تھی۔"

شبن نے کہا "ہائے رے — ہائے — اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — اُسی کا نام جس سے نگاہیں چار ہوتے ہی ایک برق تبسم گرائی گئی تھی۔ نگاہیں جھک کر جھک گئی تھیں اور چہرہ زرد پہ گلابی شروع ہو گئی تھی۔ برقعہ کا باریک نقاب چہرے پر آ گیا تھا، ورنہ بیزار تھا سب اُمڈ دیا گیا تھا۔"

نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا "مگر شبن بھائی وہ برقعہ کا باریک نقاب بھی کیا قیامت تھا۔ شربت دیدار کیسے چھان چھان کر پلا رہا تھا اور ابر کی ہلکی چادر سے ماہتاب کیسا نظر فریب معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں تو یہ معلوم کیسے ہوا کہ میرا نام گویا معلوم کرنے کی فکر تھی۔"

ابن نے کہا "چھوڑیے بھی میں کہتا ہوں کہ آپ کو آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے کو بیٹھ کر۔ ان تفصیلات میں آپ کیوں جا رہے ہیں۔ ہم نے نہ جانے کیا کیا حق کئے ہیں۔ حکیم صاحب ہیں تو بڑے حرفوں کے بنے ہوئے مگر ان کو بھی خبر نہیں کہ خود ان ہی کے گھر میں ہمارے پہنچائے ہوئے گھر کے بھیدی موجود ہیں۔"

شبن صاحب نے لقمہ دیا "حضور ہم نے اب تک آپ کو یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ ہم اس سلسلہ میں کتنا پیسہ پانی کی طرح بہا چکے ہیں اور اس قسم کے معاملات میں پیسہ تو خیر صرف ہونا ہی ہے مگر ہم نے کیسے کیسے جرأت مندانہ قدم اٹھائے ہیں۔"

نواب صاحب نے کہا "یہ تو گویا آپ لوگوں نے سراسر تکلف برتا ہے کہ اخراجات تک مجھ کو نہ بتائے بغیر جرأت مندانہ قدم تو آپ نے اٹھائے ہوں گے مگر بھائی جو کچھ صرف ہوا ہے وہ تو لے لیا ہوتا۔"

ابن صاحب نے بُرا مان کر کہا "جواب نہیں شبن بھائی آپ کا بھی۔ منع کر دیا تھا میں نے کہ یہ بات زبان پر نہ لائیے گا مگر آپ تو بخدا کئے دھرے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔"

شبن صاحب نے کہا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر میں نے یہ بات اس لیے جان بوجھ کر کہہ دی ہے کہ ابھی تو خیر چار پانچ سو روپے ہی صرف ہوئے ہیں مگر اس معاملہ میں اگر تکلف برتا گیا تو اپنی اتنی حیثیت کہاں ہے کہ بغیر نواب صاحب کو بتائے ہوئے ہم روپیہ پانی کی طرح بہاتے رہیں گے۔"

نواب صاحب نے کہا "نہیں صاحب یہ غلط ہے اور بخدا اگر اس قسم کا تکلف آپ لوگوں نے کیا تو مجھے سخت تکلیف ہو گی۔"

شبن صاحب نے کہا "اب میں آپ سے عرض کروں حضور والا کہ بھائی ابن صاحب نے بھابی صاحبہ کے زیور رکھ کر اس روپے کا انتظام

ہاں ذرا سی سو رہی ہے تو صرف اس عورت کو دیکھنے گئی ہیں جو ضمیر صاحب کے یہاں ملازم ہو رہی ہے وہ کہتی ہے اچھے خاصے گھر کی عورت کسی بڑی اچھی سی جگہ ہو جیسے کہ آپ کی قسم میں کو تو نوکری میں بڑی چاہیے تھی

بیگم صاحبہ نے کہا: "جناب والا یہ ایسی عورت کا ذکر ہے کہ جس سے وہ بن جاتے ہیں ان سے حضرت ہی سے کہا ہے چنانچہ سنتے ہیں کہ اب وہ چاہتے ہیں نواب صاحب کہ میں ان سے کہہ دوں گی:"

نواب صاحب نے بے تاب ہو کر کہا: "بھئی کسی بات ... اگر میرے متعلق بھی کوئی بات وہاں ہو تو کیا کہنے

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

امّن صاحب نے کہا: "ابھی تو صرف اتنی سی بات ہوئی ہے کہ ان سے چند روز سے یہ پوچھا تھا کہ جامن والی کوٹھی میں جو نواب صاحب ابھی ابھی آئے ہیں یہ ہیں کون؟ تو خیر وہ بھی اس پر فوراً تیار ہو گئیں، عورت نے وہاں یہ بتایا تھا کہ ان میں سے بعض وہاں کی نواب صاحب کے یہاں ملازم ہیں مگر وہ حضرت پچھلے زمانے کے رئیس ہیں جن کا کھانا بند نہ آیا ان کو

نواب صاحب نے بے صبری سے پوچھا: "پھر پھر کیا ہوا؟"

امّن صاحب نے کہا: "عرض کیا تو تھا ابھی آج ہی کی تو بات ہے اب یہ لوٹ جا رہی ہیں وہ آئیں گی تو ان سے کچھ معلوم ہوگا:"

نواب صاحب نے ان دونوں کو روانہ کرنا مناسب سمجھ کر ایک لفافہ میں پانچ سو کے نوٹ بند کر کے ہر دو مصاحبوں کے نذر کیے اور ان کو رخصت کر دیا۔

۲

بات صرف اتنی ہے کہ جامن والی کوٹھی میں نواب سکندر بخت کو آئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ ایک دن اسکول جاتی ہوئی برقعہ پوش لڑکیاں جو اُدھر سے گذریں تو نواب صاحب اپنی ٹوپی کا زاویہ درست کرتے ہوئے کوٹھی کے پھاٹک پر آ گئے۔ وہ لڑکیاں آپس میں چہلیں کرتی ہنستی بولتی جا رہی تھیں۔ کسی کسی کے برقعہ کا نقاب اُٹھا ہوا تھا۔ کوئی زیر نقاب نمک مرچ لگا کر املی کھانے میں مصروف تھی کوئی کسی ہم جولی پر آوازے کس رہی تھی کہ ان حضرت کو اس طرح کھا جانے والی نظروں سے گھورتا ہوا دیکھ کر سب ایکدم سنبھل گئیں مگر خدا بچائے ناہید سے ایک ہی بلا ہے وہ تو، اُس نے اختر کو ٹھوکا دے کر کہا:۔

"بھلا پہچان تو سہی تاش کا کونسا پتا ہے یہ"

اختر نے بے ساختہ نواب صاحب کو دیکھا اور برقعہ کا باریک نقاب چہرے پر ڈال کر دبیز نقاب الٹ لیا بس یہ ادا تھی جو نواب صاحب کو ختم کر گئی۔ ان کے حرفوں کے بنے ہوئے مصاحب ایک ہی نظر میں بھانپ گئے کہ معاملہ کیا ہے اور پھر جو ان مصاحبوں نے اس ذرا سی بات کا بتنگڑ بنایا ہے تو نواب صاحب نے واقعی انتقال فرمانا شروع کر دیا۔ نواب صاحب حدِ نظر تک ان لڑکیوں کو گھورتے رہے اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں تو ایک آہ بھر کر جیسے ہی پلٹے ہیں شبّن صاحب نے نہایت خوبی سے شعر پڑھا ؎

ہمارے واسطے اب موت بن کے پلٹی ہے

وہی نگاہ جو ان کو گئی متی پہنچا سنے

اور ابن صاحب نے اور بھی قیامت برپا کر نے لگے: "جی ہاں مگر میں نے تو اس وقت یہ عالم دیکھا ہے کہ سے

گزر گئے وہ نگاہِ کرم بچاتے ہوئے

ہم انتظار میں تھے کوئی ہم کو پہچانے

آخر نواب صاحب نے تڑپ کر کہا: "کاش یہ تیر چلانے کے بجائے آپ لوگوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہوتی کہ وہ ہے کون اور کہاں ہوتی ہے یہیں کھڑے ہوئے مشاعرہ کر رہے ہیں آپ لوگ۔"

ابن صاحب نے کہا: "حضور والا ہم اپنے فرض سے غافل نہیں ہیں۔ لڈن صاحب کو پہلے ہی روانہ کر چکے ہیں کہ وہ جا کر دیکھیں کہ یہ لڑکیاں کہاں جاتی ہیں خصوصاً وہ لڑکی جو تبسم کی بجلیاں گرا گئی ہے اور پلٹ پلٹ کر اپنے بسمل کی تڑپ دیکھتی گئی ہے۔"

نواب صاحب نے کہا: "بخدا — ع — تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں — خوب سمجھے آپ کہ مجھ کو دراصل اسی کی لَو لگی ہے کہ آخر وہ ہے کون۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ پلٹ پلٹ کر کیوں دیکھتی گئی ہے دُور تک۔"

شبن صاحب نے کہا: "اب یہ تو آپ جانیں کہ آپ کی نگاہوں نے اس سے کیا کہہ دیا ہے مگر اتنا ہم نے بھی سن رکھا ہے کہ یہ تیر دو طرفہ ہی چلتے ہیں۔"

ابن صاحب نے کہا: "ابھی صاف کیوں نہیں کہتے آپ کہ — ع

تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

لڈن صاحب کو آتا ہوا دیکھ کر شبن صاحب نے جلدی سے پوچھا: "کیوں بھئی کیا پتہ چلا —"

لڈن صاحب نے قریب آ کر کہا: "کچھ لڑکیاں تو مُڑ گئیں چھاپہ خانہ کی گلی میں مگر وہ لڑکی آگے بڑھتی چلی گئی اور میں نے اسی کا پیچھا کیا آخر پتہ چلا لیا کہ وہ حکیم احسان علی کے گھر میں گئی ہے غالباً حکیم صاحب ہی کی لڑکی ہے۔"

شبن نے کہا: "ظاہر ہے درد لے دردِ دل دینے والی کسی حکیم ہی کی لڑکی ہو سکتی ہے۔ مگر تم اسی کو کہہ رہے ہو نا وہ جو دُور تک مُڑ مُڑ کر ادھر ہی دیکھتی گئی ہے۔"

لڈن صاحب نے کہا: "جی ہاں وہی۔ اس بے چاری کو تو باقی سب لڑکیوں نے آگے بڑھ کر گھیر لیا تھا اور غالباً سب اسی کا مذاق اڑا رہی تھیں۔"

نواب صاحب نے دریافت کیا: "یہ حکیم احسان علی کون صاحب ہیں؟"

ابن صاحب نے کہا: "یہاں سے قریب ہی رہتے ہیں اور طبابت کرتے ہیں مگر مریض وریض تو میں نے کبھی دیکھے نہیں کوئی ان کے مطب میں البتہ بیٹھتے ضرور ہیں نہایت باقاعدگی سے حقّہ وقہ لگا کر۔ اور اگر کبھی کوئی بھولا بھٹکا مریض آ نکلے تو اس کو دوائیں خود ہی بنا کر دیتے ہیں اپنے دواخانہ سے جو اسی مطب کی چند طاقوں پر مشتمل ہے جن پر کچھ ڈبے اور کچھ شیشیاں رکھی رہتی ہیں۔"

شبن صاحب نے کہا: "توبہ ہے آپ سے بھی ابن بھائی اتنی تفصیل کون پوچھ رہا ہے آپ سے، بس یہ کہہ دینا کافی ہے کہ

: نہ ہونے سے حکیم ہی بھلا ہے۔"

زیبا صاحب نے کہا: "ظاہر ہے جب کہ یہ مثالی شادی مند ہو تو ہو نہیں سکتی البتہ یہ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ نسبت ٹھہری ہوئی ہے یا ... نہیں بھی تو بھی اس کا کیا یقین کہ اگر ہم نسبت بھیجیں تو وہ منظور بھی کریں۔"

اِبّن صاحب نے کہا: "ماشاء اللہ یہی صورت۔ ہم حد تک آپ سب کی نگاہ میں بڑھ چکے۔"

شبّن صاحب نے کہا: "نہیں صاحب یہ آخر شوہر نے غلط تو نہیں کہا ہے۔ ع

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

نواب صاحب نے کہا: "ان بھائی اب تو سوال ہے میرا۔ کاش تم کو معلوم ہوتا کہ یہی ایک نگاہ مجھ کو واقعی کہاں سے کہاں پہنچا گئی ہے۔ ہماری قسم ابّن صاحب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرے زندگی بھر کے خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر آج میری نگاہوں کے سامنے آئی ہے۔ بخدا اس نگاہ میں میرے بے رہا نے کیا کیا پیغام تھے مگر آخر میں فوراً کرتا ہوں کہ کہاں میں اور کہاں وہ۔"

فرّن صاحب نے گویا چونک کر پوچھا: "یہ کیا بات ہوئی حضور والا کہ کہاں میں اور کہاں وہ۔ میں ہوتا اس کی جگہ تو چہرہ دیکھتا رہ جاتا۔"

شبّن صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "آپ ہوتے اس کی جگہ تو ہمارے نواب صاحب کی کیفیت ہی کچھ ہوتی۔ مگر واقعی یہ کہا کیا ہے نواب صاحب نے کہ کہاں میں اور کہاں وہ۔"

نواب صاحب نے کہا: "ٹھیک تو کہا ہے میں نے کہ کہاں وہ نوخیز لڑکی کہاں میں بوڑھا آدمی۔"

ابّن صاحب نے بڑی قابلیت سے کہا: "دیکھئے حضور والا ایک بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ اگر فرض کر لیجئے آپ بقول خود بہت بوڑھے بھی سہی حالانکہ یہ غلط ہے مگر میں ایک بات کہہ رہا ہوں اور مان لیتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہیں تو بھی آجکل کی لڑکیوں کا عجیب عالم ہے کہ وہ نوجوانوں میں اپنے لیے کوئی کشش نہیں پاتیں اس کے کئی وجوہ ہیں ایک یہ کہ آج کل کے نوجوان خود اس حد تک محبوبیت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ بجائے محبت کرنے کے وہ چاہتے ہیں کہ خود ان سے محبت کی جائے گویا اس قسم کی شادیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میاں اور بیوی دونوں آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور بیچ میں شمع جلا دیتے ہیں پھر دونوں انتظار کرتے ہیں کہ۔ ع

ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

شبّن صاحب نے داد دی: "اے سبحان اللہ کیا بات کہی ہے۔ ایمان کی کہوں گا میں تو کہ ابّن بھائی کی نظر جس قدر گہری ہے اتنی ہم میں سے ایک کی نہیں ہے۔"

ابّن صاحب نے بات کاٹ کر کہا: "بات سنئے میری۔ محبوبیت دراصل عورت کا حق ہے وہ چاہتی ہے کہ وہ چاہی جائے اور آج کل یہ نو عمر صاحبزادے چاہتے ہیں کہ بیوی اُن سے اظہار عشق کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُن نوجوانوں سے آج کل کی لڑکیاں یہ بھی ڈرتی ہیں کہ وہ کہیں دوسری شادی نہ کر لیں۔ سوکن نہ سر پر لا بٹھائیں۔ ایک پکی عمر کے آدمی سے ایک نوجوان کو یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ کے نخرے نہ کرے گا۔ یہ نہ چاہے گا کہ اس کو چاہا جائے دوسرے وہ دوسری شادی ذرا مشکل ہی سے کرے گا۔"

للّن صاحب نے کہا: "بخدا دل میں اتر گئی یہ بات۔ کیا سوجھ بوجھ پائی ہمارے ابّن بھائی نے۔"

ابن صاحب نے پھر بات کاٹی "آپ کا قطع کلام ہوتا ہے۔ میں آپ لوگوں کو یورپ اور امریکہ تک کی مثالیں دے سکتا ہوں کہ وہاں بھی آجکل کی لڑکیاں ان نوخیز صاحبزادوں کے بجائے ان لوگوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں جن کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے ہوں اور جو سوٹ بننے کے شوق میں مبتلا نہ ہوں بلکہ صحیح معنوں میں پجاری ثابت ہو سکیں۔"

نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا "بات تو آپ کچھ خدا لگتی کہہ رہے ہیں تو گویا آپ کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ وہ لڑکی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور تعلیم نے اس کی عقل پر بھی جلا کر دی ہے لہٰذا وہ جانتی ہے کہ اس کی پرستش آج کل کے یہ نوعمر لڑکے اتنی نہیں کر سکتے جتنی میری عمر کے لوگ کر سکتے ہیں۔"

ابن صاحب نے کہا "جی اور کیا۔ اب میں آپ سے عرض کروں کہ اپنی عمر کے متعلق بھی آپ کو کچھ غلط فہمی ہے۔ عمر دراصل ماہ و سال کے اعداد و شمار کا نام نہیں ہے بلکہ عمر نام ہے دلولے کا۔ اگر آپ کی عمر جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں واقعی زیادہ ہوتی تو آپ میں اس لڑکی کے لیے کوئی کشش باقی نہ ہوتی۔ آپ کا دل اس کی طرف کیوں کھنچا اس لیے کہ آپ کا ولولہ ابھی جوان ہے۔"

نواب صاحب نے بیحد خوش ہو کر کہا "بھئی ابن صاحب میں تو قائل ہوں بخدا آپ کی ذہانت اور طباعی کا۔ اس کے علاوہ چونکہ مطالعہ ماشاء اللہ وسیع ہے لہٰذا آپ سے بات کر کے بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے ہم خوشہ چینوں کو۔"

ابن صاحب نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "استغفراللہ حد کر دی بخدا آپ نے بھی یعنی آپ خوشہ چین ہیں۔ حضور یہ جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ ان ہی قدموں کا فیض ہے۔"

نواب صاحب نے یہ ذکر گول کرتے ہوئے کہا "قصہ مختصر یہ کہ اب آپ حضرات سے کیا چوری۔ میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ جب سے میں نے اس کو دیکھا ہے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میری روح جس کے لیے بھٹک رہی تھی وہ سوائے اس لڑکی کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اب آپ حضرات مجھ کو یہ مشورہ دیں کہ اس کو حاصل کیسے کیا جائے۔"

شبن صاحب نے جو گویا اس سوال کے جواب کے لیے پہلے سے تیار تھے کہا "اس میں سوچنے کی کیا بات۔ باقاعدہ نسبت بھیج دینا چاہیے حکیم صاحب کے پاس۔ ظاہر ہے کہ حکیم صاحب کی اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کو ایسا عالی مرتبت داماد مل جائے۔"

ابن صاحب نے کہا "جی نہیں یہ غلط ہے۔ نسبت بھیجنے سے کام نہ چلے گا بلکہ ہم خود لے کر جائیں گے نسبت تاکہ ان کو تفصیل سے سب کچھ سمجھا سکیں اور ان پر واضح کر سکیں کہ ان کی قسمت کا ستارہ واقعی کس قدر بلند ہو چکا ہے۔"

نواب صاحب نے تائید کی "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آپ حضرات خود نسبت لے کر جائیں۔ مگر نسبت لے جانے سے پہلے کسی طرح اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ خود ان صاحبزادی کو بھی یہ نسبت منظور ہے یا نہیں تو بڑی اچھی بات ہوتی۔"

ابن صاحب نے کہا "آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی میں دراصل پہلے یہی سراغ لگواؤں گا۔ بہرحال اب آپ سے کوئی مطلب نہیں ہم لوگ انشاء اللہ سب کچھ کر لیں گے اب آپ ہم کو اجازت دیں۔ انشاء اللہ کل مٹھائی کھائیں گے کوئی خوش خبری سنا کر۔"

اور اس قرارداد کے بعد وہ سب کچھ ہوا تھا جس کا پہلے باب میں ذکر آچکا ہے کہ حکیم صاحب کے یہاں ایک ماما بھجوائی گئی اور یہ گر گئے نواب صاحب کی نسبت بھی لے گئے۔

۳

[illegible] دن سے جہاں جہاں لڑکیاں ملتیں سامنے سے گزرتے وقت ان کی نظریں [illegible] بتیسی [illegible] لڑکیوں کو [illegible] اختر [illegible] ہنستے ہنستے اس لطیفہ پر [illegible] جب وہ بڑھاپے [illegible] بھی [illegible] اس کی حرکت [illegible] کرنے والے ملتے [illegible] ہنس پڑتی تھی اور سب ہی جب کبھی یہ ذکر چھڑ جاتا تھا [illegible] لوٹ پوٹ ہو جاتی تھیں [illegible] ایک دن ہو کر ختم نہیں ہو گیا تھا [illegible] ان کی یہ [illegible] روزانہ [illegible] کالج جایا کرتی تھیں [illegible] ہوتی تھی [illegible] کر رہا تھا [illegible] اپنی کوٹھی کے دروازے پر بیٹھے ہوئے نظر آجایا کرتے تھے اور ان لڑکیوں کو دیکھتے ہی عجیب و غریب [illegible] شروع کر دیتے تھے کبھی آنکھوں میں [illegible] کی کوشش کر رہے ہیں تو کبھی [illegible] رہے ہیں گویا [illegible] ہے۔ کبھی ٹوپی کو کوئی زاویہ دیا جا رہا ہے کبھی [illegible]۔ آج جا رہی تھی تو [illegible] والا [illegible] ہاتھ میں ہے۔ سر پر [illegible] ٹوپی ہے۔ آنکھوں پر [illegible] لگا رکھی ہے اور [illegible] شروع سے ہی [illegible] اسانے کالج تک میں پہنچ چکے تھے اور ہر روز جیسے ہی اختر، ناہید، سلمیٰ اور زرینہ کالج پہنچی تھیں [illegible] حضرت کی خیریت اور ان سے متعلق آج کے موسمی حالات دریافت کرنا شروع کر دیتی تھیں [illegible] یہ [illegible] میں داخل ہوئیں خود ہی تو ہنسی کے مارے دوہری ہوئی جا رہی تھیں [illegible] سوالات کی ہر طرف سے بوچھار ہوگئی:

''آخر کیا ہوا۔ آج [illegible] کیوں بیٹھی ہیں۔ آج کیا معلوم تھا۔ آج [illegible] بہت [illegible]''

اختر نے ہنستے ہوئے ناہید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ان ہی سے پوچھو۔''

ناہید نے ایک آہ سرد بھر کر کہا ''کچھ نہ پوچھو آج کا عالم۔ ویسے [illegible] میں''

سلمیٰ نے کہا ''غلط۔ حسرت نذیر [illegible] والی''

ستارہ نے تالی بجا کر کہا ''ہاں ہاں ٹھیک ٹھیک ویسی ہی ٹوپی تھی اور ویسی ہی صورت''

اختر نے کہا ''اور آج آپ کا غلام سیٹی بجانے کی کوشش میں نقلی دانت کس احتیاط سے ٹھیک کرتا جا رہا تھا''

ناہید نے کہا ''بھئی میں تو یہ کہتی ہوں کہ اب اس عشاق کے جد امجد کو کچھ ٹھیک کرنا چاہئے ہم لوگوں کو بھی''

اختر نے کہا ''نہیں بھئی خدا کے لیے ایسا غضب بھی نہ کرنا مجھے تم سے بس یہی ڈر لگتا ہے''

ناہید نے اور لڑکیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا ''گواہ رہنا تم سب۔ پھر کہتی ہے کہ میں اس بڈھے کی طرفداری کیوں کرو گی۔ طرفداری نہیں تو اور کیا ہے؟''

اختر نے ڈانٹا ''دماغ خراب ہے تیرا تو۔ میرا مطلب یہ کہ اس کو منہ لگانے سے کیا فائدہ نہ جانے وہ اور کیا رنگ لائے''

ناہید نے کہا ''تو میں کچھ اور تھوڑی کرنا چاہتی ہوں بس ذرا لکھنا شروع کر دوں گی دادا میاں کہہ کر''

زرینہ نے کہا ''جی ہاں ایسے بے حیاؤں پر ان باتوں کا اثر نہیں ہوتا''

سلمیٰ بولی: "دوسرے یہ کہ دادا میاں لکھتا ہی ہے تو تم کیوں لکھو یہ کہیں اختر؟"

اختر نے بُرا مان کر کہا: "لو اور سنو بھلا سے کیا مطلب اس رنگے ہوئے سیارے کا۔"

ناہید نے طنز سے کہا: "جی بجا ارشاد۔ میں پوچھ سکتی ہوں کہ اور کس سے مطلب ہے۔ دیکھو بھئی خود سے سب اور دانستہ جان کر فیصلہ کرو۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ پہلے تو کئی دن ہم کو پتہ ہی نہ چلا کہ ان مرحوم و مغفور کا خون ہم میں سے کس کے دامن پر ہے بلکہ ہم اپنی عقلمندی سے یہی سمجھتے رہے کہ یہ ایک نیلامی مال ہے جو بھی بولی بول کر چھوڑ اسے اُسی کا ہے مگر ایک دن یہ ہو گئیں بیمار اس دن یہ راز کھلا کہ دراصل وہ قبلہ و کعبہ گاہک صرف ان ہی کے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو غور سے دیکھا اور اس کے بعد نہایت مایوسی سے لوٹ گئے گھر کے اندر ورنہ یہ حضرت بھلا لوٹنے والے حد نظر تک گھورا کرتے ہیں کھڑے ہونے بلکہ خود اپنے دروازے ہی پر کھڑے رہتے ہیں اور دیدے اُن کے ہمارے قریب ہوتے ہیں۔ اچھا صاحب اس دن تو یہ ہوا دوسرے دن جب یہ بھی ہمارے ساتھ تھیں ان کو دیکھ کر اُس کی نگاہوں نے اسی طرح دُم ہلانا شروع کر دی جیسے کتا کسی اجتماع میں مالک کو پہچان کر دُم ہلانا شروع کر دیتا ہے۔ اس دن یہ حضرت ہنسے بھی مسکرائے بھی۔ لال رومال سے رُخ روشن کو بھی صاف کیا اور جب ہم قریب سے گزرے تو کچھ گنگنا بھی رہے تھے حضور اب بتائیے کس سے مطلب ہے ان کو؟"

زرینہ نے کہا: "نہیں خیر یہ تو طے ہے کہ سوائے ان کے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔"

اختر نے کہا: "تم سب رشک کر رہی ہو میری قسمت پر حسد کی آگ میں جلی جا رہی ہو؟"

ناہید نے کہا: "تو بھلا حسد نہ کریں گے، ہم کس کو ملتا ہے اس قدر کہنہ مشق عاشق جانباز۔"

سلمیٰ نے کہا: "کیوپڈ کے بزرگوں میں بس اب یہی مدظلہ العالی رہ گئے ہیں۔"

ناہید نے بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا: "بوا بزرگوں کا سایہ بڑا غنیمت ہے۔"

اختر نے کہا: "سچ مچ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھوسٹ پر غصہ کیا جائے یا ہنسا جائے۔"

زرینہ نے کہا: "میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کی ذرا حوصلہ افزائی کی جائے اس کی نگاہوں کی رسید دی جائے۔"

اختر نے کہا: "یعنی وہ جو ہمارے یہاں نئی ماما آئی ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا ہے کہ ان بڑے میاں کا نام نواب سکندر بخت ہے۔"

ناہید نے کہا: "حالانکہ مونچھیں دیکھ کر میں سمجھی تھی کہ نام نامی ہوگا نواب مچھندر بخت۔"

زرینہ نے کہا: "نواب کم بخت ٹھیک ہے نا ان کا نام۔"

اختر نے کہا: "اس ماما سے معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب کے ایک صاحبزادے بھی ہیں جن کو ولایت بھیج رکھا ہے اور اب یہاں یہ بڑے میاں عیش و عشرت میں دونوں ہاتھوں سے خوب دولت لٹا رہے ہیں۔ دن رات مصاحبوں کا مجمع رہتا ہے اور رنگ رلیاں رہتی ہیں۔ یہ ماما پہلے ان ہی کے گھر میں ملازم تھی۔"

زرینہ نے کہا: "بس تو اسی کے ذریعہ کسی دن ان بڑے میاں کو نہایت سعادتمندی سے خط لکھ کر بھیجو کہ قبلہ و کعبہ کیوں موت آئی ہے آپ کی۔"

اختر نے آنکھیں نکال کر کہا: "لو اور سنو اب یہ خط بھی لکھوائے گی خط لکھے ہماری جوتی۔"

[illegible] نے کہا: [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ماجرا اس کا بھی ذکر کیا ہے:

[illegible] نے تائی [illegible] کہا: [illegible] کہ اس وقت [illegible] اور [illegible] ذرا واقعہ:

اختر نے ترکی بہ ترکی کہا: جی ہاں [illegible] [illegible] لگے:

ماجدہ نے [illegible] کہا: [illegible] جوانی میں [illegible] لہٰذا اس [illegible] جوانی [illegible] سکتا ہے تو اس کے نوجوان بیٹے ہیں:

زبیدہ نے اختر سے پوچھا: نام کیا ہے ان برخوردار کا؟

اختر نے تراخ کر کہا: تو جب مجھے کیا معلوم، میری ماں سے جا کر کیا نام ہے۔

ماجدہ نے ہنستے ہنستے کے انداز سے کہا: مطلب یہ کہ اس وقت پوچھ تو [illegible] [illegible] دنیا و [illegible] آید بکار:

اختر نے جل کر کہا: میں اس ماما کو تمہارے گھر بھیج دوں گی تم ہی خود پوچھ لینا [illegible] ناک نقشہ کا عہد شباب [illegible] تصور میں [illegible] لڑکے کا نام بے تکلفی کے ساتھ اس سے پوچھ لینا بلکہ اس سے کہنا وہ شاید پتہ بھی لا دے۔

ماجدہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا: بہن پتہ منگا کر مجھے اپنا دل تو وی۔پی کرنا ہے نہیں۔ میں تو تمہارے ہی لیے پوچھ رہی تھی تاکہ تمہارے [illegible] یہ مثل صادق آسکے کہ۔ ع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

اختر نے بُرا مانتے مانتے ایک دم ہنس کر کہا: سچ سچ قینچی کی طرح چلتی ہے اس کی زبان اور میں تو حیران ہوں کہ اللہ جانے اس کو یہ باتیں آ کہاں سے گئیں کہ دل وی۔پی کرنا بھی جانتی ہیں اور باپ کے ناک نقشے سے بیٹے کے چہرے مہرے کا اندازہ بھی کر لیتی ہیں۔ ماماؤں کے ذریعہ نامہ و پیام کی ترکیبیں بھی چشم بد دور جانتی ہیں۔ توبہ ہے سچ سچ ہم لوگ کیسی بیہودہ باتیں کرنے لگے ہیں۔ نہ زبان میں لگام ہے نہ دیدوں میں پانی باقی ہے۔ چھوڑو بھی اس واہیات بکواس کو۔

زرینہ نے کہا: پھر تم ہی اُلجھنے لگتی ہو کہ زندگی میں پہلا تو رومان کیا ہے اور اس سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔

اختر نے چیخ کر کہا: حد ہوتی ہے مذاق کی، لو اور سنو۔ رومان کرے میری بلا۔ جو منہ میں آتا ہے بکتی چلی جاتی ہو۔

اور وہ واقعی اپنا موڈ خراب کر کے وہاں سے چلی ہی تھی کہ سب لڑکیوں نے قہقہہ بلند کر کے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ اور سلمیٰ نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا: سچ سچ تم تو بُرا ہی مان گئیں صدقہ کروں اس موٹے منگور کو تم پر سے اچھا

سوا کار لوں ہے۔ یہ بات ہنسی کی ہے یا اس طرح بُرا ماننے کی۔"

ناہید نے کہا: "ذرا اس برہمی کی سنجیدگی تو دیکھئے کوئی میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم اس لطیفہ پر بُرا بھی مان سکتی ہو۔"

اختر نے اُسی بھولے سوچے انداز سے کہا: "آپ کے تو مذاق ہو گیا مگر اللہ جانے کون عقلمند اس کو کیا سمجھ بیٹھے۔"

اُدھر حلیمہ صاحبہ نے بھی لڑکیوں کی ساری گفتگو سُن لی تھی۔ وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح انھیں نواب سکندر بخت مل جائیں تاکہ ان کے دماغ کا علاج کر دیا جائے۔ مگر نواب صاحب ہاتھ نہ آئے۔ اس لیے حلیمہ صاحبہ لاحول پڑھنے کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔

خالہ حسینہ

معلوم نہیں اس کو [illegible] جب بڑے ہوئے [illegible] حسینہ کا
[illegible] حسینہ نہ تھا لیکن وہ تھیں بھی بس [illegible] خاندانوں میں ایک [illegible]
کا نام بھی معلوم ہونے لگا مگر ایک عجیب دلچسپی اس میں [illegible] بھی پائی جاتی تھی اور یہ [illegible] ان کے [illegible] کی
[illegible] بڑی بات یہ کہ [illegible] رکھتے تھے [illegible] اور ان کی کوشش تو یہ
[illegible] رہتا تھا کہ رشتہ داروں کا ایک [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] ہے۔ اب سے [illegible] میں بائیس سال [illegible] آپ [illegible]
[illegible] تھا اس وقت میں والدہ صاحبہ مرحومہ کی گود میں انگوٹھا چوس رہا تھا۔ کسی سے آخر نسبت قریبی رشتہ بتا دیا کہ آگرہ میں جب آپ کی والدہ اور میری نانی دونوں کا بچپن گزر رہا تھا اور نانی کی منڈی میں آمنے سامنے دونوں کا مکان تھا۔ اس وقت ان دونوں خاندانوں [illegible] ایک رشتہ داری قائم ہوئی تھی کہ آپ کی والدہ کی گڑیا تھی اور میری نانی کا گڈا ان دونوں کی نسبت دھوم سے شادی ہوئی تھی۔ خالہ حسینہ ان تمام رشتوں کو فوراً تسلیم کر لیتی تھیں اور اس قسم کے رشتہ داروں کی بھرتی مسلسل جاری رہتی تھی۔ مگر [illegible] بہت جلد گھبرا اٹھیں اس لیے کہ یہ ریل پیل تو کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور خالہ حسینہ کی حویلی مفت خوروں کی چھاؤنی بن کر رہ گئی تھی جس سے مارے اخلاق کے وہ کچھ کہتی تو نہ تھیں لیکن مزاجی طور پر بے حد [illegible] جلتی چلی جا رہی تھیں اور انہوں نے سب ہی سے سیدھے منہ بات کرنا چھوڑ دیا تھا یعنی اس طرح گیہوں کے ساتھ وہ گھن بھی پس رہے تھے جو ان کے واقعی قریب ترین بھانجے بھتیجے تھے۔

میرا اور خالہ حسینہ کا رشتہ اتنی دور کا ضرور تھا کہ میں براہ راست ان کا بھانجا نہ تھا لیکن ان کی سگی بہن کا سگا بیٹا تو تھا ہی اور میری حیثیت ان تمام بناسپتی بھانجوں بھتیجوں سے قطعاً مختلف تھی جو "بان نہ پہچان بڑی خالہ سلام" کے مصداق نہ جانے کہاں کہاں سے چلے پڑے تھے اور اپنے ساتھ ہم حقیقی رشتہ داروں کی بھی مٹی پلید کرائے ہوئے تھے کہ خالہ کی تیوریوں پر ہم کو دیکھ کر بھی وہی بل پڑ جاتے تھے جو ان سب کو دیکھ کر پڑتے تھے مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کمبخت استغراق نے ان پر کیا جادو کر رکھا تھا کہ اگر ان کی جبین کی شکنیں ہموار ہوتی تھیں تو صرف اسی کو دیکھ کر۔ یہ حضرت خالہ حسینہ کی ایک ایسی بہن کے فرزند ارجمند تھے جن کو وہ آج تک بھلا نہ پائی تھیں کہ ان کی یہ پیاری بہن کہاں تھیں

مگر یہ عزیز از جان بھانجے خالہ کے مزاج میں ایسے دخیل ہو گئے تھے کہ ان کے مقابلہ میں کسی کی دال نہ گلتی تھی اور اگر کہا جائے تو ان ہی کو خالہ کے معین المہام کی حیثیت حاصل تھی، ان ہی کے ہاتھ میں سارا انتظام تھا۔ وہی سب سے بڑے بہی خواہ سمجھے جاتے تھے۔ وہی گویا سب سے بڑے ایماندار تھے۔ ان ہی کی باتوں پر خالہ کو بے ساختہ ہنسی آتی تھی، ان ہی سے خالہ خندہ پیشانی کے ساتھ بات کرتی تھیں، ان ہی سے دوسروں کی شکایتیں کرتی تھیں اور ان ہی سے دوسروں کی شکایتیں سنتی تھیں۔ لیکن کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ ان سے اشفاق کی کوئی شکایت کر سکے۔ اس سلسلہ میں خود میں نے ایک مرتبہ خالہ کی ایسی ناراضگی خریدی تھی کہ مہینوں وہ مجھ کو دیکھ کر منہ پھیرتی رہیں۔ میں نے تو جب سے کان پکڑ رکھے کہ اب کبھی جو اشفاق کے بارے میں خالہ سے کچھ کہوں۔ مجھے یہ کہنا ضرور ہے کہ اشفاق کے پاس وہ کوئی عمل تسخیر ہے جس نے خالہ کو رام کر رکھا ہے۔

یہ تو خیر ہم کو معلوم تھا کہ خالہ کی سب سے بڑی کمزوری ان کی خوشامد پسندی ہے چنانچہ ان بھانجوں بھتیجوں کے اس لشکر جرار میں درباریوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ایک سے ایک خوشامدی ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا مگر اشفاق کی بات ہی کچھ اور تھی

(ناتمام)

سرپنچ کی ایک جھلک

ہفت روزہ

مزاحیہ شرح دیوان غالب

[illegible]

دیباچہ

منظور ہے گزارش احوال واقعی — اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مگر — کچھ شرح لکھنا باعث ذلت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل — غالب سے کیا کسی سے عداوت نہیں مجھے
میں شرح لکھ رہا ہوں شرف کچھ یہ کم نہیں — مانا اسد کا مرتبہ شوکت نہیں مجھے
غالب ۔ اور مجھ کو ہو تنقید کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
میرا مزاج آپ ہے جام جہاں نما — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں اور شرح لکھنا مگر اس سے مدعا — جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے
یوں ہی سا اک مذاق تھا جو شرح بن گیا — دیکھا کہ چارۂ غیر طباعت نہیں مجھے
اس میں جو آ پڑی ہو سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے ترک محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
حرکت تو یہ بری ہے پہ نیت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں نیت خدا گواہ — سچ بولتا ہوں گو کہ یہ عادت نہیں مجھے

شوکت تھانوی

[illegible]

(۱)

شوقِ ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا   قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

آج کل ننگی تصویریں فروخت ہونا جرم ہے لیکن مرزا غالب نے تقریباً سو سال پہلے مجنوں کی کوئی ننگی تصویر ضرور دیکھی ہے ورنہ وہ کبھی نہ لکھتے کہ قیس نے جو تصویر کھنچوائی تو وہ بھی ننگی آئی۔ سچ ہے کہ عشق واقعی سروسامانی کا دشمن ہے چنانچہ اس سے مجنوں کی لنگوٹی بھی نہ دیکھی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ تصویر میں لنگوٹی بھی غائب ہو کر رہی۔

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب   تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

"یارب" اس میں تخلص نہیں ہے ورنہ شعر کا تیسرا حصہ رحمن کے برابر نہیں ہے رحمن کا ہو جاتا ہے پہلے مصرع کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یا قدیر یا جو ہر ہے کہ تنگی دل کے باوجود زخم نے داد کی صورت اختیار نہیں کی لیکن دوسرے مصرع سے مطلب کچھ اور ہی ہو جاتا ہے جو غالباً یہ ہے کہ میرے زخم نے میرے دل کی تنگی کی داد نہیں دی یعنی اسی چھوٹی سی کوٹھڑی میں میں نے زخم کا ملوطا بھی پالا اور پھر ایک تیر بھی زبردستی ٹھونس دیا جو پھڑپھڑاتا ہوا اس طرح نکلا کہ یا دل میں بہت زیادہ جگہ تھی۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہ شعر دراصل شکایت ہے یعنی دیکھو نے معشوق صاحب تمہاری بہت بدنامی ہو رہی ہے اپنی اصلاح کرو ورنہ ہم نہیں جانتے کہ دنیا بھر میں تمہاری رسوائی ہو گی حد غضب خدا کا کہ تمہاری محفل سے جو نکلتا ہے سخت پریشان اور شاکی نکلتا ہے بوئے گل بیچاری نکلی تو سخت پریشان نالۂ دل غریب نکلا تو وہ پریشان چراغِ محفل کا دھواں پریشان ہو کر نکلا۔ مختصر یہ بات کیا ہے کہ۔ ع

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد   کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

اگر پہلے مصرع کے معنی نہ کیے جائیں تو دوسرے کے صرف یہ ہوتے ہیں کہ یاروں سے صرف یہ ہو سکا کہ ہونٹ چڑھا کر اور دانت نکال کر رہ گئے لیکن چونکہ پہلے مصرع سے سلسلہ قرابت ملاتا ہے لہٰذا مکمل شعر کے معنی یہ ہوئے میرے شہید حسرت دل کو بیچ تک ہر مختلف اقسام کے درد کا دسترخوان تھا تاکہ احباب ماحضر غم تناول فرما کر بندہ کو رہینِ منت کریں لیکن افسوس ہے کہ دوستوں نے پیٹ بھر کر میرا غم نہیں کھایا اور تکلف سے کام لیا۔

اے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند   سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

الہ دین کے چراغ کے موکلوں کا یہ حال تھا کہ جو مشکل سے مشکل کام دیجئے فوراً انجام دے دیتے تھے اور ناطقہ بند کر رکھا تھا بالکل یہی مرزا کی ہمتِ دشوار پسند کا تھا کہ مشکل سے مشکل کام کو آسان کر کے پھر ایک دشواری پیدا کر دیتی تھی یہاں تک کہ مرنے کو بہت زیادہ مشکل سمجھا تھا لیکن تو نے اس کو بھی یاد کئے ہوئے آموختہ کی طرح آسان بنا دیا اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسا مشکل کام تیرے لیے تجویز کیا جائے۔ ہم مرزا کی جگہ پر ہوتے تو اپنی ہمتِ دشوار پسند کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتے مثلاً یہی کام کہتے کو کہتے کہ الٹی گنتی گن یعنی مرنے کے بعد زندگی عطا کر اور زندگی کے بعد ولادت ہو یہ نہیں کہ ولادت ہوئی زندہ رہے اور مر گئے۔

دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب　　آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

[illegible] حسرت کو بھی [illegible] نکل جاتا ہے اگر [illegible] مرزا صاحب [illegible] طوفان بن کر نمودار [illegible] بات اصل میں یہ ہے کہ [illegible] آنسو کا قطرہ [illegible] سب کا بالکل ہی نکل جانا اچھا ہوتا ہے [illegible] رہ جانے کا وہی نتیجہ ہوتا ہے جو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

(۲)

دھمکی سے مر گیا جو نہ باب نبرد تھا　　عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک [illegible] صاحب کو فوج میں [illegible] کی سوجھی چنانچہ پہنچے آپ [illegible] آپ کی بہادری اور فوجی اہلیت کا امتحان اس طرح لیا کہ [illegible] بہت خوش ہوا [illegible] حضور تنخواہ کا [illegible] کہنے لگے حضور وہ بھی خراب ہو گیا ہے یہی مضمون اس شعر میں ادا کیا گیا ہے کہ عشق کی جنگجوئی کے لیے [illegible] والوں یا گولی کی آواز ہی کر رہ جانے والے بزدلوں کی ضرورت نہیں ہے اس کے لیے تو سینہ پر حسن کی گولی [illegible] جانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا　　اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

اگر کھٹکے کے معنی قفل والے کھٹکے کے لیے جائیں تو پہلے مصرع کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی کے قفل میں موت کا کھٹکا لگا ہوا تھا لیکن دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا نہیں کیا گیا۔ ملک الموت کے پاس اس قفل کی کنجی تھی بلکہ ایک بالکل بے جوڑ سا مصرع کہہ دیا ہے۔ یعنی۔ م

اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

اب دونوں مصرعوں کو ملا کر یہ مطلب بیان کیا جائے گا۔ مرنے کے بعد تو خیر رنگ کا زرد ہونا ایک معقول سی بات ہے لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ زندگی میں بھی موت کے ڈر کے مارے آپ کی وجہ سے رنگ زرد ہی تھا اور مرنے کے بعد وہی رنگ ہے یعنی ہماری موت اور زندگی باعتبار رنگ یکساں ہیں۔ مرزا غالب کا یہ شعر ان اشعار میں ہے جو مرزا کو کبھی مرنے نہ دیں گے اور ہمارے ایسے سیکڑوں شوکت تھانوی شرح لکھتے رہیں گے۔

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں　　مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

بچپن کے ہیر پھیر [illegible] نظر آ جاتے ہیں اب دیکھئے تا کہ مرزا صاحب اپنے بچپن کا ذکر فرماتے ہیں کہ جب مجموعۂ خیال فرد فرد تھا یعنی کسی بات کا کوئی ٹھیک شعور نہ تھا اسی وقت آپ کا یہ عالم تھا کہ طریق وفا اسی وقت سے یاد کر رہے تھے اور وفا کے نسخے جمع

کرنے کا آپ کو جب بھی شوق تھا۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب ۔ اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

یعنی دل سے لے کر جگر تک جو قطعہ زمین اب ساحلِ دریائے خون بنا ہوا ہے جب ساحل نہ بنا تھا تو یہاں پھول کھلے ہوئے تھے اور ایسے ... معلوم ہوتا ہے کہ گلوں کی رنگینی کے تمام جلوے اس کے آگے گرد ہو کر رہ گئے تھے لیکن اب وہی جگہ ساحل کا کام دے رہی ہے اور ساحل بھی دریائے خون کا ساحل۔ ایسے دریائے خون کو دنیا کے نقشہ میں تلاش نہ کیجئے یہ صرف شاعروں کے تخیل میں مل سکتا ہے۔

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی ۔ دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

یہ مضمون بھی عجیب و غریب قسم کا رفاہِ عام طلب ہے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سینکڑوں شعر اسی مضمون کے ہم نے خود سنے ہیں اور کہے بھی ہیں ایک شعر تو خود کہا بھی ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

نظر کے سامنے اک پیکرِ مجاز رہے
بلا سے دل نہ رہے دردِ دل گداز رہے

مولانا آسی مدنی مدظلہ کا شعر ہے ؎

وحشت تھی کہ چارہ گر و دوا کرتا ہے
پہلو میں دل نہیں ہے تو کیا درد بھی نہیں

حضرت جگر مراد آبادی کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

اب بنا بھی دے ادائے شکر کے قابل مجھے
درد بخشا ہے اگر تو نے تو بخشے دل مجھے

بہرحال ان تمام اشعار اور مرزا غالب کے شعر کے یہی معنی ہیں کہ دل کے مرجانے کے بعد اس کا بھوت درد بن کر سینہ میں رہ جاتا ہے۔

حباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے ۔ زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

واقعی وحشت کا یہی ایک علاج تھا جو مرزا کے دوستوں نے کیا کہ پکڑ کر بڑے گھر کی سیر کرا دی، اس لیے۔ اس زمانہ میں اگرچہ جیلوں میں کوئی انتظام نہ تھا لیکن تخیلات پر ان کا کب بس تھا اور اس کا کیا علاج تھا جو یہ حضرت زنداں میں بیٹھے بیٹھے خاک چھاننے اور جنگل جنگل پھرنے کے خیالات میں کھوئے رہتے ہیں۔

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے ۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے، خدا پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے مگر تعجب تو یہ ہے کہ یہ شعر مرنے کے بعد کا ہے لیکن اس سے ڈرنے نہیں یہ شاعروں کا طبقہ ہمیشہ مرنے کے بعد بھی شعر کہتا رہتا ہے چنانچہ ہمارے استاد حضرت ناطق مدظلہ بالائے مدظلہ کا شعر ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ ناطق بیٹھا بیٹھا چل بسا ۔ ہائے کیا کمبخت کو رکھی ہوئی سی آ گئی

[illegible] کا ہے ۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

قلمی تصویر: پنڈت مدن موہن مالوی [illegible]

آپ مالوی [illegible] ہندوستان [illegible] سمجھے جاتے ہیں بہرحال یہ تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ آپ پنڈت جی [illegible] ہندوستانی ہیں ۔

برہمن ہیں اور خطرناک قسم کے برہمن ہیں [illegible] گنگا جل [illegible] اور جہاز کے عرشہ پر بھی آپ کی سوشلی کا جھنڈا [illegible] ہوا تھا اور جیل میں بھی یہ ضابطہ [illegible] مشکوک [illegible] گنگا کے کنارے اپنے دھرم کی [illegible] شدت پسندی [illegible] دوسری طرف گاندھی جی کی ہریجن تحریک ناک میں دم کئے ہوئے ہے اور گاندھی جی [illegible] ہریجنوں سے جہاں تک زبانی ہمدردی اور قومی بھائی چارہ کا تعلق ہے وہاں تک تو غنیمت ہے لیکن [illegible] اس سلسلے میں قائل [illegible] کے قائل ہیں کہ ہریجنوں سے معانقہ یا مصافحہ قسم کی بے تکلفی شروع کر دی جائے [illegible] رام رام رام رام کا قصہ شروع ہو جاتا ہے اور گئو متر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لہذا آپ نہیں چاہتے کہ گوبر اور گئو متر سے پاک بنائے ہوئے دھرم کو اچھوتوں کی وجہ سے نشٹ کریں اور ہریجنوں سے بھائی چارہ کر کے مجبور ہو جائیں ۔

آپ ویسے بہت زیادہ قابل بہت زیادہ سمجھدار اور بہت زیادہ اچھے آدمی ہیں البتہ بس یہی دقیانوسیت اور مذہبی شدت پسندی نہ ہوتی تو کیا کہنا تھا۔

سفید مونچھیں ہیں سفید لباس پہنتے ہیں اور سر سے پیر تک کالا آدمی ہونے کے باوجود سفید فام رہتے ہیں تقریر بھی خوب کرتے ہیں مگر جیل والے نکات بچا بچا کر تحریر بھی ماشاء اللہ اچھی ہے ہندو یونیورسٹی کے آپ سر راس مسعود ہیں بنارس کے رہنے والے ہیں لہذا پنڈت جی بنارسی بھی کہلاتے ہیں۔ جہاں تک خود ہماری ذات کا تعلق ہے ہم پنڈت جی کے اس چھوت چھات کو بھی اچھا

سمجھتے ہیں اور راسخ الاعتقادی کی بھی قدر کرتے ہیں بشرطیکہ وہ وسیع النظر اور روشن خیال وغیرہ ہونے کا دعویٰ نہ کریں۔

نئی روشنی کے میاں بیوی

از جناب محوی لکھنوی

ایک شوہر نے یہ بیوی سے کہا ڈر ڈر کر — اپنی زلفوں کو مری جان کٹایا نہ کرو
پوڈر اور سینٹ سے چھوڑو بھی محبت کرنا — ہے قلیل آمدنی خرچ بڑھایا نہ کرو
مضحکہ دوست اڑاتے ہیں مرا مجلس میں — صورت اپنی کس و ناکس کو دکھایا نہ کرو
آگ غیرت کی مرے دل میں بھڑک اٹھے گی — ہاتھ غیروں سے سر بزم ملایا نہ کرو
خبریں اغوا کی بہت آتی ہیں اخباروں میں — سیر کرنے تن تنہا کبھی جایا نہ کرو

بھڑکے غصہ میں لگی کہنے وہ بنتِ تہذیب — کہہ دیا ہے تمہیں بس باتیں بنایا نہ کرو
خرچ بڑھتا ہو، اگر کھانے پہننے سے مرے — بھیج دو میکے شب و روز جلایا نہ کرو
ہم نکالیں گے قدم گھر سے نہ ہرگز اپنا — تم سینما کی طرف بھول کے جایا نہ کرو
بوجھ بالوں کا اٹھائیں گے سرِ نازک پر — داڑھی مونچھوں کا مگر تم بھی صفایا نہ کرو
اپنی عادات میں تبدیلی جو منظور نہیں — میرے کاموں میں بھی پھر ٹانگ پھنسایا نہ کرو

تم ہو ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تم نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی

غالب اور وہمی

(مندرجہ ذیل غزل میں ہر شعر کا ایک مصرع مرزا غالب کا ہے اور ایک مصرع حضرت وہمی دہلوی کا ہے لہذا یہ غزل دونوں کی مشترکہ سمجھی جائے۔) ایڈیٹر

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصالِ یار ہوتا — شبِ وعدہ آ بھی جاتی تو ہمیں بخار ہوتا
تجھے ہم ازل سے جھوٹا مری جان جانتے تھے — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا — ترے ہاتھ ٹوٹ جاتے جو وہ پائدار ہوتا
یہ خلش تو اس لیے ہے کہ جگر کے اس طرف ہے — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — ادھر اگر بنا تھا ناصح تو وہ غمخوار ہوتا
ہمیں ہوا تو تعجب کہ رہا جلوں پہ یورش — مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
یہ شرر جو تجلی ہے یہی غم کی شکل پاتا — جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا
اگر آ گئی تھی شامت تو نکالتے کیسے ملتی — غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
بھلا مثال پھر کبھی قدرت ہے چلے — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
... وہ ہوا اس لیے کہ دوئی کو نہیں — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہماری شرارتیں

جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی

مختصر ... [illegible] ... جیسے ہی ... شروع کئے ... جب ناوقت ... وہاں بیٹھے ... اور ... ہم سائیکلیں تیار کر دیں ... سے فارغ ہی ہونے تھے کہ ... خیال آیا کہ ... ہم ... ہی آ کر گرتا تھا اور ... کھلاڑیوں کو واپس کر دیتے ... ایک مرتبہ ... بھی ... پسینے ہی کی ... اس ... سے دور ... ہو گئے کہ وہ ... جو ... وہی حشر کیا ... اب ... ہو گیا ... وہاں سے ... ہم ... ہو گیا اور ... لطف تو جب آیا ... سب ... فوراً اترنے پر مجبور ہونے۔ اب ہم ... اس کے دوسرے ... چالک پر ... تو دیکھا کہ ایک آدمی کپڑے کی دکان لگائے ہوئے ہے اس دکان کی اس نے چاروں ... کر کپڑے کی دیواریں ... کپڑے کی چھت بنائی تھی ہم اس کی پشت پر ... ہو کر گئے کہ ہم کو ایک چھوٹا سا ٹیلہ نظر پڑا جس پر وہ کپڑے گھر سے لا کر دیا تھا ہم نے فوراً ... دوڑا کر وہ ... کی پشت میں اس زور سے ریلا کہ وہ کپڑے کی دیوار پھاڑتا ہوا دکان کے اندر اس طرح گھس گیا کہ ساری دکان گر گئی اندر سے دو آدمیوں کے چیخنے کی آواز آئی مگر ہم بھاگ گئے۔ اب مٹھائی کی ٹھہری ہم روپیہ لے کر مٹھائی لینے ایک ساتھی کے ساتھ گئے اور باقی کو وہیں چھوڑا ہر دکان پر ہر قسم کی مٹھائی چکھی اور وہ بھی اس طرح کہ آخر کو انھوں نے چکھانے سے انکار کر دیا۔ ہم نے بنگالی مٹھائی پسند کی حالانکہ ہمارے ساتھی کشمیری برہمن تھے مگر دکاندار ہم دونوں کو بنگالی سمجھا تھا اور کہا الگ کھڑے ہو ہم کو پتا معلوم ہوا اس نے سیر بھر مٹھائی ہماری فرمائش سے تولی اور بجائے ہاتھ میں دینے کے ہم سے کہنے لگا ہاتھ پھیلاؤ ہم نے ہاتھ پھیلا دیئے اس نے دور ہی سے دونا مٹھائی کا ہمارے ہاتھ پر چھوڑا ہم نے فوراً ہاتھ ڈھیلے کر دیئے اور دونا مٹھائی کا نیچے گرا۔ ہم کہ ... دکاندار پر برس پڑے اور ادھر وہ دکان سے اتر پڑا کہ میں اپنے پورے دام لوں گا، پورا فتنہ کھڑا ہو گیا مگر ہم

نے دام نہ دینا تھے نہ دیئے۔ دوسری جگہ سے مٹھائی خریدی اور کھا کر پان والے کی دکان پر پہنچے یہ پان کی دکان بھی دیکھنے کے لائق تھی، پان والا صدر دروازہ کے بائیں جانب تخت پر گدی بچھائے ایک بازو پر جھک کر بیٹھا تھا اور دکان کو ایسا سجا رکھا تھا کہ لوگ اس دکان پر فوٹو بنواتے تھے۔ پان والے صاحب اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھے ہوئے تھے، دکان پر بیسیوں رنگ رنگ کی بوتلیں اور سجاوٹ کا سامان بنا ہوا پڑا تھا، گدی بچھی تھی، ایک جھاڑ لگا ہوا تھا اور پنکھے کی چھت لگی تھی جس میں فریم میں لٹکے آئینے تھے جن میں سی تصویریں چاروں طرف لگی تھیں، ہاتھ میں پان والے صاحب کے ایک پنکھی تھی جو وہ ہر اس پیسے والے کے رسید کرتے تھے جو ان کے پان کے پنکھے کے پاس آتا تھا ہم کو۔ بہت برا معلوم ہوا اور ہم نے ان سے کہا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو انھوں نے کہا صاحب یہ دنیا کا کھیل ہے پر کہ پنکھا ڈٹا ہوا ہے زمین میں یوں رکھا ہوا ہے اور مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں ٹھیس لگ کر ساری دکان ہی دکان نہ آ پڑے۔ ہم نے کہا کہ یہ تو زمین پر گڑا ہوا ہے بھلا کیسے گرے گا تو انھوں نے فرمایا کہ صاحب یہ یوں ہی رکھا ہے اور پھر طرہ یہ کہ پنکھا کے نیچے میں بند بھی نہیں ہے اس وجہ سے مجھ کو بہت اندیشہ ہے۔

اب پان کھا کر ہم نے دوستوں سے صلاح کی کہ بھئی لالہ آپ راستے سے اس پان والے کی دکان کیوں نہ گرائی جائے تو ہم سے ہمارے کسی ساتھی نے حامی نہ بھری، دکان کیا تھی پورا تعزیہ تھا۔ مکان پر لا کر سامان آرائش تل دھرنے کی جگہ نہ تھی اور مجمع یہاں ایسا تھا کہ پکڑا جانا قطعی تھا مگر ہم نے کہا کہ خواہ کچھ بھی ہو ہم یہ کام ضرور کریں گے ہمارے ساتھیوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے ہم نے بھاگنے کی راہ وغیرہ خوب غور سے دیکھ لی اور گھوم پھر کر اس جگہ پہنچے جہاں احاطہ کی چھوٹی سی کچی دیوار تھی یہ جگہ ایک سی تھی اور یہاں لوگ پیشاب کرنے آتے تھے ہم نے ساتھیوں کے ساتھ دو تین گھنٹہ بسر کی اور پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے، گھومتے، پھرتے دکان کے پاس آ کر ہم نے ہمت کر کے مجمع کے دباؤ میں پیچھے سے لگ کر جو ڈنڈے کو گھسیٹا تو ایک شور بے ہنگام برپا ہوا اور دکان مع چھت و سامان سجاوٹ اور پان والے اور بوتلوں کے آن پڑی، کتھے اور چونے کی کلھیاں سب ایک ہو گئیں اور غضب یہ ہوا کہ وہ برتن بھی گرا جس میں کہ پان والا پیسے رکھتا جا رہا تھا پیسے جو مجمع میں گرے لوگوں نے دست اندازی کرنا شروع کی ہم کو اس میں فرار کا موقع مل گیا اور اس شور و غل میں ہم مع ساتھیوں کے دیوار پھاندتا اور گلی میں کود کر اس بری طرح بھاگے کہ نہ معلوم کہاں آ کر نکلے ہم کو سخت اندیشہ پکڑے جانے کا تھا کیونکہ دو ایک پر جو کانسٹیبل تھا اس نے ہم کو شرارت کرتے ہوئے شاید دیکھ لیا تھا اور ہم عجب نہیں پکڑے جاتے اگر کہیں دکان نہ ٹوٹنے لگی ہوتی۔

رات کافی آ گئی تھی اور ہم نہ معلوم کہاں تھے جہاں نسبتاً سناٹا تھا جگہ جگہ لوگ سڑک کے کنارے چارپائیوں پر سو رہے تھے ایک لالہ ننگے بدن پلنگ پر ایک موڑ پر اس طرح توند پھیلائے لیٹے ہوئے تھے کہ ہم کو مجبوراً اپنا سگریٹ جو قریب الختم تھا ان کے پیٹ پر رکھ دینا پڑا، وہ ایسے تڑپ کر پیٹ پیٹتے ہوئے اٹھے کہ ہم کو لطف ہی آ گیا اور ہم بھاگ کر دوسری جگہ پہنچے کچھ آگے پہنچ کر ہم نے ایک چارپائی مع سونے والے کے لوٹی اور گھر واپس ہونے سے پہلے پہلے ہم نے ایک برہنہ بدن سونے والے کے پیٹ پر سگریٹ جلتا ہوا رکھ کر بہترین تماشہ دیکھا۔

رات گئے گھر واپس آئے مگر چونکہ صبح ہم گھر سے اجازت لینے ... اس لیے دوسرے روز صبح ہی جرم ہمارے

[illegible] اور تم لوگ [illegible] آپ [illegible]

[illegible] صاحب [illegible]

[illegible] افسوس [illegible] اعلان [illegible]

مرنے ہم [illegible]

[illegible]

غسل

[illegible]

[illegible] ہوا [illegible] آپ [illegible]

[illegible] ابھی [illegible] ہوتے یا [illegible]

[illegible] ہماری سمجھ میں [illegible] شوکت [illegible]

[illegible] خدا [illegible]

[illegible] محسوس [illegible]

[illegible] طبعی کے [illegible] شروع [illegible]

[illegible] صاحب [illegible]

[illegible] صحیح نہیں ہے کیونکہ [illegible] احساس [illegible] حالت [illegible]

کسی شخص سے [illegible] کتنا گناہ ہے۔

[illegible] اللہ آبادی [illegible] آگئے [illegible] کی شادی کرتے [illegible]

جب تو شیخ علیم [illegible] کے لیے [illegible]

[illegible] زیادہ [illegible] علیم [illegible]

[illegible] بیگم سے عشق شروع [illegible]

[illegible] ہوتے ہے کہ وہ لوگ [illegible] دوستوں [illegible]

[illegible] تھوڑی سی افیون [illegible] افیون [illegible]

[illegible] مقدار میں شروع کر دی گئی [illegible] افیون اور ضعف کا جوڑ اور [illegible] یہاں تک کہ [illegible] آنے لگی

پھر آپ ہی بتائیے کہ شیخ جی جوان کب ہوئے؟

[illegible] اور کاہلی سی چھا جاتی ہے۔ [illegible] اور آپ نے [illegible]

تھوڑے دنوں تک تو خیر کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ علیم کے ایک لڑکی پیدا ہوئی [illegible]

تاکید کر دی کہ اگر بچی کی زندگی اور تندرستی کا کچھ بھی خیال ہے تو ایک مٹر کے برابر افیون [illegible]

غالباً سرسوں کہا ہوگا) افیونی کو دو تین چیزوں سے عشق ہوتا ہے لیکن ساتھ کی چیزوں سے عداوت بھی ہو جاتی ہے [illegible]

کہ اگر کسی افیونی کو سانپ کاٹ لے تو سانپ خود ہی انا للہ ہو جاتا ہے اس کی وجہ جو کچھ بھی ہو لیکن ہمارا تو یہ خیال ہے کہ

ایسا نہ نہانے کی وجہ سے ہوتا ہے جسم پر میل کے ساتھ ہی ساتھ زہریلے جراثیم بھی جمتے چلے جاتے ہیں ہم لوگ غلطی کرتے ہیں

اکثر غسل کر کے انھیں دھو دیتے ہیں ایک افیونی اس کا خاص خیال رکھتا ہے اس کے جسم پر کبھی پانی نہیں پڑنے پاتا۔ جس طرح

عام طور پر لوگوں کو بچھو کے ڈنک سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح افیونی کو پانی سے ایذا پہنچتی ہے۔

شیخ جی نے نہانا بالکل ترک کر دیا بیوی نے بہت سمجھایا لیکن اُن کے فلسفے کے آگے کسی طرح بس نہ چلا، ہر چند بغیر درس و تدریس کے ایک بہترین عالم ہوتا ہے اُس کے پاس چھوٹے تاریخی افسانوں کا گراں بہا خزانہ ہوتا ہے، ہر موضوع پر وہ دستے زنی کر سکتا ہے سیاست حاضرہ پر اُس کی رائے اُس کے حلقۂ احباب میں بڑی وقعت رکھتی ہے یہی حال علم کا تھا۔ انھوں نے شجاتی کو ہمیشہ سمجھایا کہ نہانا بالکل جائز نہیں کیونکہ قرآن کا حکم اس کے خلاف ہے۔ بیوی نے سر پیٹ لیا اور پوچھا "تو لہ جو لوگ نہاتے ہیں وہ قرآن شریف کے خلاف عمل کرتے ہیں؟" مرزا مرزا حلیم نے افیون کی گولی کو چائے کی پیالی میں گھولتے ہوئے کہ پھر سر اُٹھا کر بولے "آخر قرآن میں یہ تو لکھا ہے کہ اسراف بیجا جائز نہیں پھر اگر میں نہاؤں تو پانی بہت خرچ ہوگا جبکہ نہانے کی کوئی ضرورت نہیں تو کیا یہ اسراف بیجا نہ ہوگا؟ اب بولو!"

بیوی کی سمجھ کے باہر تھا کہ اس تحقیقات کا جواب دیں انھوں نے طعنے کے طور پر کہا "ارے تو کبھی کبھی تو نہا لیا کرو تب تو اسراف نہ ہوگا۔"

"کیا کہا؟ کبھی کبھی؟ ارے تم بھول گئیں ابھی جس سال ہاجرہ پیدا ہوئی ہے اُسی سال عید میں تو میں جب نہایا تھا، ابھی یہ کہتے ہوئے ہاجرہ قریب ہی کھڑی ہوئی تھی اُس نے کہا "ابا میری عمر کیا دس برس سے کم ہے؟"

"ہاں تو دس برس تو دیکھتے گزرتے ہیں دیکھو جس طرح امریکہ لڑائی میں ہار کر کمزور ہو گیا تھا اُسی حال میں پڑا ہوا ہے روس کے بادشاہ اُسی طرح حکومت کر رہے ہیں ایک تنکا بھی تو اپنی جگہ سے نہیں ہلا اور تم لوگوں کے نزدیک بڑا زمانہ ہوگیا۔"

(۲)

جاڑے کا موسم تھا، حلیم نے کسی خیال سے اپنے کپڑے اُتار کر دھوپ میں ڈال دیئے تھے اور خود بھی وہیں دھوپ میں بیٹھ کر سجدے کی رسم ادا کر رہے تھے۔ بدن کی رنگت تبدیل ہو چکی تھی کیونکہ جلد بدن پر ایک تہہ گرد و غبار کی جمی ہوئی تھی، کھانا سامنے لایا گیا اور شیخ جی نے کھانا کھایا، ایک چلو پانی سے ہاتھ منہ بھی دھو لیا اور برتن بھی قریب قریب صاف کر دیا۔

بیوی کو اُن کی حالت پر ترس آگیا اُس نے نہایت منت و سماجت سے کہا "دیکھو کل جمعہ ہے میں پانی گرم کر دوں گی نہا ڈالنا۔"

شیخ جی نے غصہ سے آنکھ اُٹھا کر دیکھا جیسے کسی دشمن کو گھور رہے تھے، "کیا چاہتی ہو کہ مر جاؤں؟" شجاتی حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہی تھیں کہ انھوں نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔ بیوی نے دبی زبان سے پوچھا کہ "آخر مطلب کیا ہے؟"

خالہ کی لڈو

ڈاکٹر سید نادم رضوی المناظری بیتناپوری

جہاں تک ہم نے اندازہ لگایا ہے خالہ کسی وقت بھی ان "مرغیات" اور "تجربات" وغیرہ کے موافق نہیں تھے۔ مگر صرف خالہ کی ہمنوائی میں تائید کر دیا کرتے تھے خیالی اور زبانی تائید ہوتی تو ہم سمجھتے کہ خیر! لیکن خالہ جان عملاً مؤید بن جایا کرتے تھے ہم نے خود اکثر دیکھا کہ خالہ جان کی عدم موجودگی میں اُن کی مرغیوں کے چارہ پانی کی فکر کیا کرتے تھے۔ کوئی تین چار برس ہوئے ہوں گے جب جاڑوں میں خالہ نے حسب معمول لوگوں سے "عمدہ انڈوں" کی فرمائش کی اور اللہ میاں کی عنایت سے کامیاب بھی ہو گئیں یعنی کوئی دو تین درجن انڈے مل گئے اور کڑک مرغیوں کی تلاش ہونے لگی جہاں انڈے مل گئے تھے مرغیوں کا مل جانا بھی کوئی

[illegible]

[illegible]

[illegible] خالو نے [illegible] خالہ جان [illegible] "لاڈو جانم" [illegible]
ناراضگی کی وجہ سے اُن کے نام کو رائج نہ ہونے دیا اور خود اپنے رکھے ہوئے نام [illegible]
محبت اور پیار میں "میری لاڈو" سے "میری ڈلّدو" بن گیا۔

اس فخرِ خاندان تحفہ پر خالہ کے بعد اگر کسی شخص کو محبت تھی تو وہ میاں بیچو تھے جو اکثر روٹیاں [illegible] آتے کی لونڈیاں بنا کر "لڈو" کو کھلایا کرتے تھے۔ مثل ہے "جس کا کھائیں گے اُسی کا گائیں گے"۔ لڈو نا سمجھ سہی مگر اس مثل کو ضرور سمجھتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اُسے بھی فطرتاً انھیں دو آدمیوں یعنی خالہ اور میاں بیچو سے محبت ہونی چاہیئے تھی۔

جب خالو کا تبادلہ لکھنؤ ہو گیا اور کئی مہینے ٹال مٹول کے بعد خالہ مع اپنے "کورٹ آف وارڈس" کے لکھنؤ گئیں تو میاں بیچو اور یہ مرغی خانہ یعنی "پولٹری فارم" بھی ساتھ تھا ریل کے کرایہ کا تو کوئی غم نہ تھا اگرچہ ایک ایک مرغی کا کرایہ ایک آدمی کا آدھا چارج ہوا مگر سب کچھ برداشت ہے صرف "لڈو" کے لیے۔

"لڈو" اگرچہ حیوان تھی مگر اُس میں خالہ شناسی کا بہت مادہ تھا اور جس وقت خالہ چھالیاں کترنے کے لیے ہاتھ میں سروتا لیتیں تو "لڈو" بھی ایک زانو داب کر جا بیٹھتیں اور ٹکٹکی باندھے بڑے پیار و محبت سے خالہ کے اس مشغلہ کو دیکھا کرتی تھی۔ خالہ جب طلب کے لیے پان کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھ لیتیں تو "لڈو" کا فرض تھا کہ وہ بھی [illegible]

کو ان کی موجودگی میں ہضم و برداشت کر لے حالانکہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک مرغی کو مٹھو کے پاؤں سے کیا تعلق۔

یہ میری آنکھوں کا دیکھا ہوا واقعہ ہے اور میں فخریہ کہنے کے قابل ہوں کہ مجھے بھی اکثر لڈو کے ساتھ ناشتہ اتفاق ہوا ہے آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ ڈائننگ ٹیبل اور ایک مرغی کی ہم جلیسی لیکن کوئی حیرت کی بات نہیں سمجھیے جب ہم لوگ ناشتے کے لیے بیٹھتے تو خالہ "لڈو" کو پکارتیں آواز دیتیں اور وہ دوڑتی ہوئی آکر خالہ کی پہلو نشین ہو جاتی خالہ جب پیالی میں چائے انڈیلتیں اور پرچ میں ٹھنڈی کرتیں تو پہلے لڈو پہلے چکھا کرتیں اور بعد میں کچھ روغنی روٹی اور ٹوسٹ کے نیچے کچھ ٹکڑے بھی نوش فرماتیں اور حسب معمول پان۔

اسی طرح جب میاں بیوی کھانا کھانے کے لیے باورچی خانے جاتے تو لڈو بھی پہنچ جاتیں اور بیچ بیچ گوشت کے ٹکڑے وغیرہ کھلانا کرتی گیارہ بجے تک یہ پروگرام رہتا اور ٹھنڈک کافی دوپہر میں بی لڈو خالہ والے پلنگ پر آرام فرماتیں

لکھنؤ کے زمانہ قیام میں چند بلے خالہ کی پولٹری فارم کے دشمن ہو گئے تھے اور انھوں نے لڈو کے دو چار بھائی بہنوں پر ہاتھ بھی صاف کر دیا تھا مگر قسمت کو بچانا منظور تھا "لڈو" ان موذیوں کے ہاتھ سے بال بال محفوظ رہیں مگر میاں بیچو کی دور اندیشی نے اس کا بھی خدشہ مٹا دیا یعنی بیچو نے رفتہ رفتہ سات بلوں کا کام تمام کر کے تمام گھر کو مطمئن کر دیا کہ اب "لڈو" کا خدا حافظ ہے "بلی" کا خدشہ نہ کبھی خالہ کو ہوا نہ ہونا چاہیے کیونکہ "بجلی" اس کے دفعیہ کے لیے موجود۔

مراجعت وطن پر جب خالہ کا پولٹری فارم بھی آگیا تو خالہ نے کچھ اور مرغیوں کا بھی اضافہ کر دیا اور پہلے سے کہیں زیادہ دلچسپیوں کا اضافہ ہو گیا "لڈو" کے ناز نعم اور چاہ و پیار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہی ہوتی گئی اور پروگرام میں کچھ فرق نہ آیا وہی لیل و نہار ہے۔ "لڈو" کے انڈے بھی بٹھائے گئے اور بچے بھی نکلے مگر ؎

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اور حکم خدا سے کوئی بچہ زندہ نہ رہا خالہ کو بھی کچھ شک سا ہو گیا تھا اس لیے انھوں نے "لڈو" کے انڈے بٹھانے بھی بند کر دیے ——— ؟

(۱۹۳۳ء)

شوکت تھانوی کا اپنا روزنامہ

طُوفَان

اور اس کے چند مندرجات

ڈوبنے کے واسطے واقف ہے ساحل کی سی موت

ان ابھرنے کے لئے موجوں نے طوفان ہے

روزنامہ طوفان کا اجرا دراصل میرے اس مسلسل خواب کی ایک خوشگوار تعبیر ہے جو اپنی صحافتی زندگی میں ہمیشہ دیکھتا رہا ہوں۔ اور اخبار نویس کا ہر شخص تجربہ ہے جب تک یہ توقع اور جب خوشگوار مستقبل ہے جب سے خواب مشغولیت اور اس کے بعد مسرت سے ہمیشہ ... وہ شیریں توقع آج پوری ہو رہی ہے اور وہ خوشگوار مستقبل آج میرے پیش نظر ہے آج میرے ہاتھ میں میرا اپنا قلم ہے۔ اور میرے دماغ میں میرے ہی خیالات۔ میں آج مسلم لیگ کا حامی ہوں یا کانگریس کا ... اس کے متعلق پر ایمان رکھتے ہوئے مسلم لیگ کی حمایت کی ہے تو مجھ کو کوئی مجبور کرتا ہے۔ حالانکہ اپنی صحافتی زندگی میں ... برس اپنے قلم سے دوسروں کے خیالات کی ترجمانی میں بسر کئے۔ ... مجھ کو ضمیر فروشی بھی کرنا پڑی ... یہی ایک قسم کی قلمی تجارت۔ مگر میں جو تماشا کرتا تھا وہ در اصل قلم نہیں بلکہ چند ذرہ ہے اور میرا ... دماغ کو بالکل منتقل کرنے ... اپنے سرمایہ دار کے اشارہ پر چلا دوں۔ اس میں شک نہیں کہ ... یہ طریقہ اخلاقی اور اعتبار کی حیثیت سے خواہ کیسا ہی نامناسب کیوں نہ ہو مگر حقیقتاً اس میں اور ... کوئی فرق نہیں۔ ... اعتبارات کے ایک وسیع دام کا ... حیثیت سے نہایت جائز طریقہ پر اس ناجائز ذریعہ معاش کو بارہ سال تک اختیار کئے رہا۔ اس لئے کہ میرے حالات نے مجھ کو اس کے لئے مجبور کیا تھا اور میں اپنی مجبوریوں کے احترام کے لئے بھی مجبور رہا۔

بہرحال بارہ سال کی اس ضمیر فروشی نے مجھ کو بہت سے قیمتی سبق بھی پڑھائے ہیں۔ اور ان ہی قیمتی اسباق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں سیاسی عقائد کے اعتبار سے ایک اخبار کا اپنے کسی ایک عقیدے کے لئے وقف کر دینا اصول صحافت کے قطعاً منافی سمجھتا ہوں۔ کسی اخبار کا اپنے کو کسی جماعت کا آرگن کہنا اس کی اخباری شان کے شایان نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس قسم کے جماعتی آرگن اخبار کی تعریف سے علیحدہ ہو کر اشتہار کی تعریف میں آتے ہیں۔ ایک مشتہر تو بے شک یہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنے تمام عیوب کو بھی محاسن کی صورت

میں پیش کرے۔ مگر اخبارات کے لئے یہ ذرا مشکل ہے اور اسی وہ اپنی مخصوص جماعت کی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسا کرتے ہیں جو صحافتی دیانت کو یکسر بے قدر کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی سیاسی جماعت خواہ وہ اپنے مقاصد اپنے افراد اپنے اقتدار کے اعتبار سے کیسی ہی مکمل ہو مگر وہ بہرحال انسانوں کی ہی ایک جماعت ہو گی۔ کوئی خدائی جماعت نہیں ہو سکتی۔ اور ہر انسانی جماعت کے ساتھ خامیاں اور کوتاہیاں بھی قدرتی طور پر ممکن ہیں۔ ایسی حالت میں اس جماعت کے نام ہوا اخبار کے لئے صرف دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو وہ ان خامیوں کو نظر انداز کر دے۔ یا ان خامیوں کا زبردستی جواز ڈھونڈھے اور درست کر دکھانے کی کوشش کرے

اب اگر اخبار نے سکوت اختیار کیا ہے تو اس کی مجرمانہ خاموشی ہے اور اگر ناجائز طریقہ پر حمایت کی ہے تو اخبار اپنی اخباری حیثیت سے گر کر اشتہار کے درجہ پر آ جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ان تمام جماعتی اخباروں کی ہے جو مختلف سیاسی جماعتوں سے اپنے کو منسوب کرتے ہیں۔ خواہ اس کے کہ وہ کانگریس کے اخبار ہوں، لیگ کے، مہاسبھا کے اخبار ہوں یا جمعیۃ العلمائے ہند کے۔ ان میں سے کسی جماعت نے آج تک یہ دعوے نہیں کیا ہے کہ یہ خدائی جماعت ہے۔ اور جب ان میں سے ہر جماعت انسانوں ہی سے متعلق ہے۔ تو وہ غلطیوں اور خامیوں اور لغزشوں اور کوتاہیوں سے کیونکر غیر متعلق ہو سکتی ہے۔ مگر جماعتی اخبارات اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی جماعت کو تمام عیوب سے پاک اور تمام ممکن خامیوں سے بے نیاز ثابت کرنے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ کاش بجائے اس کے یہ ہوتا کہ اخبارات اپنے زور صرف یہی خدمت لیتے کہ ہر جماعت کو اس کی برائیوں اور بھلائیوں سے نہایت دیانتداری کے ساتھ آگاہ کرتے رہتے تاکہ ان کی اصلاح بھی ہو سکے اور وہ اپنی حقیقت سے بھی باخبر رہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تہذیب اور تمدن کے گہوارہ ممالک میں بھی صحافتی دیانت، سیاسی مصلحت کوشیوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہر گتھی بجائے سلجھنے کے الجھتی ہی جاتی ہے۔ ہر حزب فریب تیرہ میں مبتلا ہے۔ اور سیاست نام ہے دروغ مصلحت آمیز کا۔

طوفان اسی ماحول میں نکل رہا ہے۔ مگر اس ماحول سے علیحدہ رہنے کے لئے عزم بھی ہے۔ مگر اس عزم کی تکمیل کا علم خدا کو ہے۔ بشعلوں سے کھیل کر دامن کو بچانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر انسان کا ہر ارادہ بشرط خلوص اگر صفا پر منحصر ہو کر ذہن میں آئے تو اس کے تکمیل تک نہ پہنچنے کا اندیشہ بھی ایمانی کمزوری ہے۔ اور کم سے کم میں اس وقت جبکہ طوفان کا اجرا خدا کے نام سے ہو رہا ہے۔ اس ایمانی کمزوری کے لئے تیار نہیں ہوں۔

طوفان ہر جماعت کا اخبار ہے اور ہر جماعت کے جائز حقوق کا محافظ مگر اس کے ساتھ ہر جماعت کی خامیوں اور کوتاہیوں کا آئینہ بھی ہے۔ طوفان کے نزدیک ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت واجب احترام ہے۔ مگر طوفان ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی قائل نہیں ہے۔ کہ ان میں سے ہر جماعت یا ان جماعتوں میں سے کوئی جماعت بالکل پاک اور بے عیب ہو سکتی ہے۔ طوفان کے تمام تبصرے اور تمام نکتہ چینیاں بالکل نیک نیتی کے ساتھ محض اصلاحی مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہمیشہ ہوں گی۔ اسی کے ساتھ ہر جماعت کے جائز حقوق کا تحفظ طوفان کا سب سے پہلا صحافتی فرض ہو گا۔ اور اگر اس ارادہ میں نیک نیتی کو دخل ہے تو میرا ایمان ہے کہ خدا مجھ کو اسی جادہ پر استقلال اور ہمت عطا کر کے کامیابی کی منزل کی طرف سلامت روی کے ساتھ گامزن رکھے گا۔

آمین ثم

اس کو طوفان حوادث سے بچاتا یا رب
آرزو چھوٹی سے چھوٹی ہے دل نادان نما

درمیانی خلیج

مسلم لیگ اور کانگریس کی مفاہمت ہو اور ہندو مسلم اتحاد
مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کی ملاقات و گفت و شنید کی خبر ہے کہ اخبارات
و عوام میں اس کا خوشگوار تذکرہ ہے لیکن افسوس ہے کہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ اخبارات
نے اس ملاقات کے متعلق عجیب عجیب قیاس آرائیاں پیش کئے جا رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ سب سے پہلے کانگریسی
اخبارات جماعتوں سے شائع ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے متعلق جو افواہیں مشہور ہو گئی ہیں مہاتما گاندھی کی حیثیت سے
پہلی روحانی اور اخلاقی بلند پایہ حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے جس پر اس قدر زور دیا گیا ہے اس کا فرق ہے۔ وہ یقیناً مہاتما گاندھی کی
کی بلند شخصیت سے خود ہم کو بھی انکار نہیں ہے۔ مگر اس مقابل میں قائد اعظم کی شخصیت کو گھٹا کر پیش کیا جاتا ہے
جاتا ہے کہ اس ملاقات کو گویا مسٹر جناح کا مہاتما گاندھی کے دربار میں حاضری دینا ہے جس کے معنی بالفاظ دیگر یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ گاندھی جی محض
کی خاطر اس وقت اس ایک بات اور اس فتوے کے لئے بھی تیار ہو گئے کہ وہ مسٹر جناح سے ملیں۔ مقررین گاندھی جی کی
خصوصیات کا اظہار بھی اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ مسٹر جناح سے بڑھ کر ہیں نہیں رہ سکتے تھے۔ بشرطیکہ وہ ان کا بہت ساتھ
چونکہ اس ملاقات کا صرف ایک نتیجہ ہی ہو سکتا ہے کہ لیگ کے اخبارات مسٹر جناح کے متعلق اس قسم کے مقالات لکھیں۔ مہاتما گاندھی کی
شان کا ایثار قرار دیا جاتا ہے۔ پھر کانگریسی اخبار اس لیگ والوں کا تعصب ہیں اور لیگ والے کانگریسی اخبارات سے شدت
کے ساتھ الجھ جاتیں۔ یعنی ادھر گاندھی جناح ملاقات ہو رہی ہے اور ادھر درمیانی خلیج کو اخبارات وسیع بناتے رہے۔ کیا ہی نہیں ہوتا کہ
گیا اخباروں کو اس سے بہتر طریقہ ملک کی خدمت کرنے کا نہیں ملتا کہ وہ محض اپنی گرمی بازار کے لئے ملک میں آگ لگاتے رہیں۔
۱۱ مئی ۱۹۳۸ء

سورج کی جامع تصویر اور مغل آرٹ کا ایک نمونہ

ہندوستان کا وہ زمانہ جب انگلستان ہندوستان کے کپڑے کا محتاج تھا۔ کیا ہندوستان کا مستقبل اس کے گذرے
ہوئے دور سے زیادہ شاندار ہو سکتا ہے؟

ہندوستان میں اسلامی دور حکومت کے متعلق متعصب مورخین خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانہ
کا ہندوستان موجودہ ہندوستان سے کہیں زیادہ خوشحال تھا۔ اس زمانہ میں نہ لوگوں کو فاقہ کشی کرنی پڑتی تھی۔ اور نہ تن ڈھانکنے کے لئے ملک
کے باشندے کپڑوں کے لئے ترستے تھے۔
مغلوں کے عہد حکومت میں ہندوستان کی خوشحالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ مغلوں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اس لئے

ہندوستان کا روپیہ ہندوستان سے باہر کسی ولایت کو نہیں جاتا تھا بلکہ ہندوستان ہی میں رہتا تھا۔

مغلوں کے زمانہ میں ہندوستان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جتنے اچھے تعلقات ہندو مسلمانوں کے مغلوں کے دورِ حکومت میں رہے۔ اتنے پھر کبھی نہیں رہے۔ اس زمانہ میں نہ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے تھے۔ نہ باجے اور مسجد کا جھگڑا تھا، نہ گائے کی قربانی کا قضیہ تھا۔ ہندو مسلمان اس طرح رہتے تھے جیسے ایک ماں کے دو بیٹے۔ یا ایک خاندان کے دو ہونہار فرزند۔

مغلوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمانوں میں رواداری کس درجہ بڑھ گئی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہندو اور مسلمانوں میں مذہب کے اختلاف کے باوجود شادی بیاہ کا باہمی ملاپ کا سلسلہ بھی قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ مغلوں کے بیشتر حکمران ایسے گزرے ہیں جو ہندو عورتوں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ باہمی شادی بیاہ کا سلسلہ قومی اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کی مثالیں موجودہ دور میں بھی جب کہ لوگ بہت زیادہ آزاد ہو گئے ہیں بہت کم ملتی ہیں۔ غرضیکہ خوشحالی اور رواداری کے اعتبار سے اس زمانہ کا ہندوستان قابلِ رشک تھا

مغلوں کے زمانہ میں ہندوستان کس قدر دولت مند اور خوش حال تھا۔ اس کا اندازہ مغربی مورخین کے مندرجہ ذیل بیانات سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی صنعت و حرفت پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور مغربی مورخ ایچ۔ ڈبلیو۔ ولسن لکھتا ہے کہ

"اٹھارہویں صدی تک ہندوستان کے سوتی اور ریشمی کپڑے۔ انگلستان کے تیار کردہ کپڑوں کی نسبت برطانوی منڈیوں میں پچاس ساٹھ فی صدی کی کفایت سے فروخت ہوتے تھے۔ جب برطانیہ نے دیکھا کہ ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی انگلستان کی صنعت کو برباد کئے دیتی ہے تو برطانیہ میں بعض ہندوستانی کپڑوں کی درآمد قطعاً ممنوع قرار دے دی گئی۔ اور بعض کپڑوں پر اسی فی صدی تک محصول لگا دیا گیا۔"

گویا اس زمانہ میں انگلستان کو ہندوستانی مال کی روک تھام کے لئے وہی ذرائع اختیار کرنے پڑے جو آج جاپانی مال کے لئے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہندوستانی مال انگلستان کی منڈیوں میں برابر بکتا رہا کیونکہ ہندوستانی کپڑا انگلستان کے امرا کے طبقہ میں فیشن میں داخل ہو چکا تھا۔

ایک مغربی یورپین سیاح ہندوستان کی خوشحالی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"ہندوستان نہایت شاداب ملک ہے۔ اس کے باشندے سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن بہت زیادہ خوشحال ہیں۔ ان کے تمول کا اندازہ ان کی شاندار عمارتوں اور مندروں سے کیا جا سکتا ہے جن میں کروڑوں روپیہ کی دولت پوشیدہ ہے۔"

یہ ہے قدیم ہندوستان کی خوشحالی کی داستان لیکن یہ افسانہ اس وقت کا ہے جب ہندوستان پر ہندوستانیوں کی حکومت تھی اور ہندوستان کا روپیہ ہندوستان ہی میں رہتا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی ہر ایک چیز کس قدر ارزاں تھی۔ اس کی تفصیل کپتان ہملٹن کے سفرنامہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ کپتان ہملٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

• گوشت تین فارد نگ یعنی چند کوڑیوں میں نصف سیر ملتا ہے۔ ایک ٹن یعنی کئی من غلہ ایک کراؤن (دو ڈھائی روپیہ)

[illegible] کا [illegible] ایک بہترین صنعت [illegible] تھا۔ وہ زمانے میں ایک سونے کی چڑیا [illegible] فروخت ہوتی ہیں۔ [illegible] کے اعتبار [illegible] سستا ہے [illegible] ۔ یہ چند چیزوں کے نرخوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ [illegible] ہندوستان [illegible] دولت کے ساتھ [illegible] یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کا اس زمانہ کا ہر فرد [illegible] آج کل کے دولت مندوں سے بھی بہتر حالت میں تھا۔

ہندوستان کی خوشحالی اور فارغ البالی کے بعد جب اس زمانہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ہندوستان کا مغلیہ دور ایک [illegible] دور نظر آتا ہے جس کی مثال [illegible] ملنی ناممکن ہے۔ [illegible] اور حکومت [illegible] ہندوؤں کو بڑے اعزازات دیئے گئے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ چنانچہ اس وقت ہندوستان میں حقیقی ہندو ریاستیں موجود ہیں وہ اکبر اور اس کے جانشینوں کی [illegible] ہیں۔ جنھوں نے سارا ہندوستان فتح کر کے ان کو [illegible] اور ان کی حکومتوں کی صورت [illegible] جو آج بھی [illegible] ریاستوں کی صورت میں نظر آ رہی ہیں۔ [illegible] بڑے بڑے عہدوں پر ہندو حاکم قابض اور متصرف رہے۔ [illegible] ہندو [illegible] نہیں ہوا۔ اس زمانہ میں عہدے ہندو اور مسلم تناسب سے نہیں دیئے جاتے تھے بلکہ قابلیت اور خدمت گزاری کے [illegible] مذہب وقت [illegible] دیئے جاتے تھے۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب بھی اس دستور پر عامل رہے۔ عہد اورنگ زیب میں ہندو مسلمانوں کی [illegible] روشنی ڈالتے ہوئے کپتان ہیملٹن لکھتا ہے کہ:

"حکومت کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان۔ ہندوؤں کے مذہبی [illegible] پورے طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں۔ اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں۔ جس طرح کہ سابقہ بادشاہت میں مناتے تھے۔"

یہ تھی ہیملٹن کی رائے اس عہد اورنگ زیب کے بارے میں ہے جس کو متعصب کہا جاتا ہے۔ کپتان ہیملٹن ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ:

"یہاں پارسی بھی رہتے ہیں۔ اور وہ اپنی رسوم زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ وہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں۔ لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں کیا ان کے خیالات اس شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے برے ہو جاتے ہیں؟"

گویا نہ صرف مغلیہ دور میں مذہبی آزادی تھی۔ بلکہ ہر مذہب کے باشندوں کو اس کی بھی اجازت تھی کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت بھی کریں۔ یہ تھا۔ ہندوستان مغلیہ دور اور اس کی خصوصیت۔

۱۱ مئی ۱۹۳۸ء

مد و جزر

جس وقت لوگ یہ سنیں گے کہ طوفان آ گیا۔ خدا جانے بیچاروں کا کیا حال ہوگا۔ بہت سے ایسے ہوں گے جو اس کو دیکھنے کے بجائے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں گے۔ اور تمام اوراد و وظائف بغیر کسی ترتیب کے پڑھ جائیں گے تاکہ طوفان سے محفوظ رہ سکیں۔ بہت سے ایسے ہوں گے جو طوفان کے آنے کا شور سن کر اپنے بچوں کو کلیجے سے لگا لیں گے۔ اور بہت سے اپنی بیویوں کو۔ کسی کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں گی۔ اور کسی کو یکایک اختناق الرحم کا دورہ شروع ہو جائے گا۔ مگر بعد میں جب سب کو یہ معلوم ہوگا کہ یہ طوفان دراصل کیا طوفان ہے۔ تو سب ایک دوسرے کا منہ اس طرح دیکھیں گے کہ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ ہم زیادہ بے وقوف بنے یا تم حالانکہ بنے دونوں رہ گئی کمی بیشی وہ حسابِ دوستاں در دل کے تحت آتی ہے

ہر چند کہ یہ طوفان طوفانِ نوح نہیں ہے مگر اس کے مد و جزر سے خدا ہی ود۔ سُواع۔ یغوث۔ یعوق اور نسر کے پرستاروں کو محفوظ رکھے۔ حضرت نوحؑ نے تو اپنی کشتی پر ان باطل پرستوں کو محض اس لئے جگہ نہ دی تھی کہ حق کشتی پر محفوظ رہے گا۔ اور باطل اس طرح غرقِ طوفان ہو جائے گا۔ کہ نہ کہیں جنازہ اٹھے گا۔ نہ مزار بنے گا۔ مگر اس طوفان میں انتظام یہ کیا گیا ہے کہ کاغذ کی ناؤ ہے۔ جس میں یہ تمام باطل پرست محض اس لئے بھرے جا رہے ہیں کہ ان کو بیچ سمندر لے جا کر ڈبو دیا جائے۔ ایسی صورت میں حق پرستوں کو تو ڈرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ البتہ باطل پرستوں کو ہر طوفان طوفانِ نوح ہی سمجھنا چاہیئے۔ خواہ وہ کاغذی طوفان ہو یا بحری۔

خیر یہ باتیں تو ذرا ٹھوس قسم کی سنجیدہ تھیں حالانکہ "مد و جزر" کے لکھنے والے جناب کیمون ارث کو ان سنجیدہ باتوں سے کیا تعلق یہاں تو مقولہ یہ ہے کہ ع

ہر گھڑی پیشِ نظر اک تازہ طوفان چاہیئے

اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہمیشہ طوفان کا تازہ پرچہ چاہیئے جو جناب کیمون ارث کو چائے کی پیالی سے طوفان اٹھانے کا موقع دے دے۔ یہ تو ہمارے جلنے کی محض ہے۔ یہاں سلامت روی۔ متانت سنجیدگی اور اسی قسم کی دیگر مضامین کی کیا ضرورت ہے ہمارا کام گدگدانا ہے خواہ گدگدی ایسی ہو کہ ہنسی آئے یا گدگدی کی شدت سے رونا۔ بہرحال اس کا ذمہ دار "گدگدانندہ" تو ہو ہی نہیں سکتا۔

سیاسی رونا رونے کے لئے اس اخبار کے باقی تمام کالم پڑے ہوتے ہیں بلکہ رونے کے لئے تو تمام ہندوستان ہی پڑا ہوا ہے۔ اور ہندوستان ہی کو کیوں لیجئے، یہ کہیئے کہ اگر کسی کو رونا ہی ہے تو "ملکِ خدا تنگ نیست" مگر اس کالم میں تو رونے والوں کو بھی ہنسنا ہی پڑے گا۔ اور ہنسنے والے تو خیر ہنسیں ہی گے۔ ان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ہم تو اس کالم میں اشکوں کو بھی تبسم کی تعلیم دیں

... ہندوستان کی آدھی آبادی کے تمام مصائب اور تکلیفوں پر اٹھنے کا مقصد ہماری اس جنسی گھٹن میں بھی ہے۔ پھر بے حیا بھی، اس طرح کی باتیں ... کی طرف کھلا دروازہ ہو جاتا ہے۔

منٹو

(۲)

ہندوستان کے مردوں کا عجیب حال ہے کہ اپنی بہو بیٹیوں کو تو سب پردہ کراتے ہیں، مگر اپنی بیوی کے علاوہ دوسری عورتوں کو ہر طرح سے دیکھنے کو تیار رہتے ہیں۔ دل میں تو عورتوں کے ساتھ زبان سے بھی لطف لیتے ہیں۔

اسے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کا خیال عزت و حرمت ہے۔

مگر ان حالات سے ان کی ہر نظر کا اعلان ملتا ہے کہ وہ خیال عزت و حرمت سے بے نیاز ہو کر ہے۔ یہ عزت صرف اپنی بیوی اور ماں بہن کی ہے۔ بہت سے مغرب زدہ ہندوستانیوں کا خیال ہے کہ مردوں کی اس ذہنیت کی وجہ پردہ کا رواج ہے۔ اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو مردوں کی نگاہیں سیدھی ہو جائیں اور وہ عورتوں کو عجیب و غریب چیز نہ سمجھیں۔ تاہم مرد بے پردہ عورت کو بھی دیکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی نظریں ترسی ہوئی ہوتی ہیں۔ بہر حال وہ بے نقاب عورت کو بھی کیا جانے دیں، نظروں سے گھورتے ہیں اور ساتھ نظروں سے بھی۔

یہ نظریہ صحیح ہو یا نہ ہو، مگر اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ہر وہ کام جو چھپ کر کیا جائے عیب ہے، اور یہ وہ عیب ہے جو اعلان کیا جائے، اس تہذیب اور تمدن کے دور میں ہنر بن جاتا ہے۔ چنانچہ عورتوں کے سلسلے میں بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی برقع پوش عورت سے بات کرنا بھی بُرا سمجھا جاتا ہے، مگر ایک بے پردہ عورت کے ساتھ باغ کے تنہا گوشوں میں تنہائی میں مشکوک طریقہ پر چہل قدمی کرنا سوسائٹی کی نظروں میں کوئی عیب نہیں، بلکہ اس کو مہذب اصطلاح میں تفریح کہتے ہیں۔ عورتوں سے بغل گیر ہو کر منظرِ عام پر ناچنا بھی کوئی غیر شریفانہ حرکت نہیں ہے، بلکہ اس کو بڑے آدمی نہایت فخر کے ساتھ ڈانس کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس تہذیب اور تمدن کے دور میں دراصل شرافت ہی انتہائی کمینہ پن ہے، جبکہ شرافت کمینہ پن ہے۔ لہٰذا شریف بہو بیٹیوں کا پردہ بھی بُرا ہے، اور اس پردے کے محافظ بھی ایسے مجرم ہیں جن کو پولیس شک و شبہ کی بنا پر گرفتار کر سکتی ہے۔

ہمارے ہندوستانی خیال اور مغرب زدہ ذہنیت میں جو زبردست اختلافات اس سلسلے میں موجود ہیں، ان کی تشریح بیکار ہے۔ نئی روشنی کے سودیشی صاحب بہادر لوگ پردہ کو ہر برائی کی جڑ کہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عورت اور مرد کا معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ پرچھائیں کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر اس سے خود بھاگ گئے تو وہ آپ کے پیچھے دوڑتی ہے، اور اس کے پیچھے بھاگے گئے تو وہ آپ کو برابر وعلیٰ التواتر تعاقب دیتی رہے گی۔ بعینہٖ یہی حال عورتوں کا ہے کہ چونکہ مردوں نے خود ان کو گھورنا، ان کے حسن پر چھچھوری نظر ڈالنا، اپنے عشق کو نالاں اپنے دل کو پھینکنا اور اپنے جذبات اچھالنا اپنا شعار بنا لیا ہے، لہٰذا عورتیں ان ناز برداروں سے ناز برداریاں کراتی ہیں۔

اپنی جوتی کی نوک پر اُن کے تمام جذبات کا استقبال کرتی ہیں اور اپنی ہر جنبشِ ابرو پر اُن کو نچاتی ہیں حالانکہ اگر مرد یہ خود بینی اور ادا انگیزی ذرا بھی چھوڑ دے تو یہی عورتیں اپنے حسن پر چار چاند لگائے ہوئے مردوں کے قدموں پر بچھ جائیں۔

پناما کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ وہاں اتفاق سے مردوں کی تعداد بہت کم اور عورتوں کی بہت زیادہ ہے۔ اس وجہ سے زیادہ تر عورتوں کو شوہر نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ جو مرد وہاں ہیں۔ وہ چونکہ عورتوں کو شوہر ناپسند نہیں کرتے ان کے حضور اپنا دل پیش کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے حسن سے مغلوب نہیں ہوتے اور اُن کے نسائی تیروں سے مرعوب ہونا مردانگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہاں کی عورتوں کا حال یہ ہے کہ وہ عورتیں کیا ہیں۔ گویا ہندوستان کے مرد ہیں۔ وہ مردوں کا احترام کرتی ہیں مردوں سے اظہارِ عشق کرتی ہیں۔ مردوں کی ناز برداری کرتی ہیں۔ اور اگر ان کو کبھی کوئی ہمدرد دل مل جاتا ہے تو وہ اس کو [illegible] ہیں۔ گویا گِدھوں کے غول میں کوئی لاش آکر گرے۔ ہندوستان کے مردوں کے منہ میں اس جزیرہ کا حال سن کر پانی بھر آیا ہوگا اور ہم خود ہندوستانی مردوں اور اس جزیرہ کی عورتوں کی باہمی اصلاح کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے مرد اور اس جزیرہ کی عورتیں تھوڑے دنوں کے لئے یکجا کر دی جائیں۔ تاکہ ان کی بدنیتی اور ان کی ہوس کا [illegible] جن سے مستقل قسم کی آبادی پیدا ہو سکے جو دنیا بھر کے مردوں اور عورتوں کے لئے معیاری قسم کے جذبات پیش کر سکے گی۔

یکم جون ۱۹۳۸ء

(۳)

یہ تو محض ایک شاعرانہ خیال ہے کہ وہ آنسو جو محبوب کے دامن پر گر جائیں۔ ان کی قیمت لعل و گہر سے بھی زیادہ ہوتی ہے ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ آنکھ سے گرا ہوا آنسو بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا ہے۔ اور اگر قیمت ہی رکھتا ہوتا تو یقین جانیئے کہ اس بے روزگاری کے زمانہ میں جتنے بیکار گریجویٹ ہیں۔ وہ سب بیٹھے ہوئے رویا کرتے اور اپنے آنسوؤں کی آمدنی سے پیٹ پالتے۔ بلکہ بہت سے باکمال انسان جو ہاتھ پیر کی مزدوری کرتے ہیں مزے سے گھر بیٹھے آنکھوں کے اس پانی کی تجارت کرتے اور چین کی بنسی بجاتے مگر اب تک تو آنسو کو نامبارک قسم کا عرق سمجھا گیا ہے۔ البتہ آج یہ سننے میں آیا ہے کہ کوئی بزرگ سر المرتھ رائٹ ہیں جن کی دریافت یہ ہے کہ آنسو میں نہایت قیمتی جوہر ہوتا ہے جو ہر قسم کے جراثیم کو مار سکتا ہے۔

سر المرتھ رائٹ کا یہ روتا ہوا بسورتا نظریہ ممکن ہے کہ غلط ہو مگر قرینِ قیاس ضرور ہے اس لئے کہ فطرت کا انتظام ہی رکھا گیا ہے کہ جب کوئی شخص مرتا ہے۔ تو اس کے پسماندگان اظہارِ غم میں آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دیتے ہیں۔ وہ اپنے نزدیک تو صرف روتے ہیں۔ مگر دراصل ہوتا یہ ہے کہ مرنے والے کے بعد اُس کے مرض کے جراثیم کو مارنے کے لئے اشکوں کی کثرت سے ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ یہی جراثیم پسماندگان کو بھی مرحوم و مغفور بنا دیں۔ مگر کہنا تو یہ ہے کہ خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا اب ان آنسوؤں پر بھی غور کیجئے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ رونا اظہارِ غم کا طریقہ بھی ہے۔ اور ایک لاجواب قسم کا ڈس انفیکٹ بھی یعنی جراثیم بھی

۔ غریبوں کی جان جاتی ہے۔ اگر آنسوؤں کی [illegible] تجارت [illegible] بند کرنے [illegible] ہو [illegible] جاتا۔

اگر ہمارا [illegible] ہے تو [illegible] بیٹھے بیٹھے تجارت [illegible] آنسوؤں [illegible] ہندوستانیوں کے [illegible] ہندوستان کی صورت [illegible] ایسی صورت میں [illegible] سب [illegible] کی قیمت کے [illegible] ہندوستان [illegible] کے لئے۔

ضرورت ہے کہ اس ملک کی حکومت اس تجارت میں خاص حصہ [illegible] آنسو [illegible] اور امید ہے کہ اگر آنسوؤں سے جرائم کشی شروع کی گئی تو بہت جلد مختلف [illegible] جرائم ختم ہو جائیں گے [illegible] اس انتظام کی ہے کہ دوسرے ملک میں جو جرائم پیدا ہوتے ہیں [illegible] ہندوستان کے [illegible] ہو سکتی ہے مگر امید ہے کہ جس وقت آنسوؤں کی یہ تجارت شروع ہوگی اس تجارت سے [illegible] بھی عجب [illegible] پیدا ہو جائیں گے۔

۲۰ جون ۱۹۳۶ء

(۴)

امرتسر سے ایک اطلاع موصول ہوئی ہے کہ سیکرٹری صاحب مجلس اتحاد ملت نے رستم زماں گاماں پہلوان اور رستم ہند حمیدا پہلوان کو دعوت دی ہے کہ وہ نیلی پوش مجاہد بن کر اپنی سیاسی حیثیت کو بھی نمایاں کر دیں۔ غالباً اس خبر سے اتحاد ملت کی دوسری حریف جماعتوں میں عجیب کھلبلی پیدا ہو گئی ہوگی۔ اس لئے کہ اگر واقعی یہ دونوں پہلوان لنگوٹ باندھ کر نیلی پوش ہو گئے تو باقی جتنے سفید پوش ہیں، ان سب کی خیریت نہیں۔ اور اتحاد ملت کی حریف جماعتوں کو تو وہ یوں اٹھا اٹھا کر پٹخیں گے کہ دو ہی دن میں سوائے اتحاد ملت کے اور کوئی اکھاڑہ باقی ہی نہ رہے گا۔

اب اگر ان سیاسی جماعتوں میں پہلوان بھرتی کئے گئے۔ تو سیاسی کاٹ چھانٹ کی جگہ پر کشتی کے عجیب عجیب داؤں پیچ دیکھنے میں آئیں گے اور جماعت کی طاقت کا اندازہ ان کے پہلوانوں کی طاقت سے ہوگا۔ اس کے علاوہ اب سیاسی اختلافات اس طرح نہ ہوں گے کہ اخبارات میں مضامین بازی ہو رہی ہے۔ یا پلیٹ فارموں پر تقریر کے جوہر دکھائے جا رہے ہیں۔ بلکہ اب یہ ہوگا کہ اگر اختلاف کو اکھاڑے سے کوئی شکایت ہے تو ادھر سے گاماں نے خم ٹھونک کر یاعلی کا نعرہ بلند کیا ادھر سے گونگا پہلوان اپنا کسرتی بدن دکھاتا ہوا اکھاڑے میں کود گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں داؤ پیچ ہو گئے۔ یعنی کوئی نہ کوئی فیصلہ ہوگا۔ یہ کیا کہ زمانہ چل رہا ہے۔ اور قلم چل رہا ہے۔ مگر کچھ طے نہیں پاتا۔

پہلوانوں کی سیاسی بیداری کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ اگر کوئی جماعت عوام میں یا دیہاتیوں میں اپنی تحریک پھیلانا چاہے گی تو اس کا طریقہ صرف یہ ہوگا کہ اس جماعت سے نامی گرامی پہلوان اس طبقہ میں جس میں تحریک پھیلانا ہوگی۔ بیٹھک ڈنڈ وغیرہ کرائیں گے اور جب وہ کچھ زور کر جائیں گے تو ان کو استاد ہی کا ایک آدھ داؤں بتا کر چھوڑ دیا جائے گا۔ تاکہ جس کو چاہیں اٹھا کر دے ماریں اور اپنی جماعت کی طاقت کا اعتراف کرائیں۔ پہلوانوں کی سیاسی بیداری کے بعد یہ آل انڈیا کانگریس اور مسلم لیگ سیشن کی قسم کے جلسے نہ ہوا کریں گے۔ بلکہ عظیم الشان دنگل منعقد کئے جائیں گے جن کا اعلان اس طرح ہوا کرے گا کہ۔

عظیم الشان دنگل

جس میں اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ طے کرنے کے لئے ہندوستان کے مشہور لیڈر مثلاً رستم زماں گاماں پہلوان۔ رستم ہند حمیدا پہلوان۔ رستم اودھ صادق پہلوان۔ اکھاڑہ جوالا مست۔ و جن پہلوان جھنڈا سنگھ وغیرہ حصہ لیں گے۔ اور ان ہی کی کشتیوں سے یہ طے پایا جائے گا کہ کونسی جماعت کن حقوق کی مستحق ہے۔ اور کس جماعت کے لئے نیابت کا تناسب کیا ہونا چاہیئے۔

ابھی تو کانگریس کو باوجود گاندھی کا سا سینک سلائی لیڈر ہونے کے اپنی اکثریت پر ناز ہے۔ مسلم لیگ کو مسٹر محمد علی جناح ایسے جوانی رہنما کی طاقت پر فخر ہے۔ اور ہندو مہا سبھا کو ڈاکٹر مونجے ایسے دہان پان لیڈر پر گھمنڈ ہے مگر پہلوانوں کی سیاسی بیداری کے بعد یہ تمام اپنی ہڈیاں پسلیاں بچانے کے لئے سیاسیات سے خود ہی کنارہ کش ہو کر کوئی اور کاروبار شروع کر دیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا جب نہ سہ رنگا جھنڈا لہرا سکے گا۔ نہ ہلالی بلکہ قومی جھنڈا محض لنگوٹ ہوگا اور اس کا احترام سب پر واجب ہوگا۔

۲ جون ۱۹۳۸ء

(۵)

حیدرآباد سے ایک اطلاع موصول ہوئی ہے کہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر میونسپل کمشنر اپنے رفقائے کار کی ایک جماعت کے ساتھ ۲ جون کی صبح کو جھاڑو، پنجرا اور ٹوکری لے کر نکلے اور سڑکوں کی صفائی اپنے دست مبارک سے شروع کر دی۔ اس منظر کو

[illegible] یہ رپورٹ نے تعجب سے دیکھا ہوگا کہ ایک طرف جہاں تم کا آدمی ایم میونسپل کمشنر اور پڑھا لکھا عالی خاندان اور عالی نسب پیش [illegible] اور کہیں چارے پر [illegible] افتادہ پڑتی ہے کہ اس نوزائیدہ شخص کو جھاڑو بجز سنبھالنے کی ضرورت [illegible] وہ صاحب کشتی کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ مگر جب [illegible] معلوم ہوا کہ نواب مہدی نواز جنگ بہادر کا مقصد [illegible] یہ ہے کہ امیر اور غریب بلند مرتبہ اور پسماندہ سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور [illegible] یہ ہر انسان کا فرض ہے کہ بہت [illegible] دوڑے اور ایک ایک جھاڑو لے کر گلیوں کو جھاڑ دے۔

اس میں شک نہیں کہ اپنے اس طرز عمل سے نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے ایک ایسا [illegible] ہے اور [illegible] کا نام صرف حیدرآباد ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے میونسپل کمشنروں کے لئے باعث تقلید ہونا چاہئے۔ میونسپل کمشنری کو [illegible] سمجھ کر الیکشن پر ہزاروں روپیہ بہانے والے یہ سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔ ہم آج جب جانیں کہ میونسپل کمشنر نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی طرح عمل پیرا ہو کر [illegible] خدمت اور [illegible] میں کمیٹی [illegible] ہے [illegible] کمشنر [illegible] کہ ان کے [illegible] رہ جاتی ہیں۔ اور [illegible] لوگ [illegible] آواز [illegible]۔ حالانکہ [illegible] خدمات [illegible] کے لئے نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس لئے ہوتی ہیں کہ [illegible] خدمت خلق کرے۔

نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی قسم کے میونسپل کمشنروں کا ملنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ صحیح معنوں میں میونسپل کمشنر وہی ہو سکتا ہے جو اسی قسم کے نمونے پیش کر سکتا ہو۔ بلکہ ہماری تو یہ رائے ہے کہ میونسپل کمشنروں کے انتخاب کا طریقہ ہی غلط ہے۔ انتخاب کے بجائے اگر مقابلہ کا امتحان ہوا کرے تو زیادہ مفید ہو سکتا ہے اور اس امتحان میں اسی قسم کے تحریری اور عملی سوالات امیدواروں سے ہوا کریں کہ۔

۱۔ ایک نالی میں چالیس مقامات سے پانی آکر گرتا ہے۔ اور وہ نالی اس پانی کو چار گھنٹے سے پہلے بڑے نالے تک نہیں پہنچا سکتی تو تم اس کی صفائی کا کیا انتظام کرو گے۔ اور اس کے جراثیم کو مارنے میں کتنی فنائل صرف کرو گے؟

۲۔ اپنے والد کو دس صفحات کا خط لکھو جس میں دن بھر کا پروگرام واضح کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنی جاروب کشی کے واقعہ کو نمایاں طور پر ظاہر کرو اور اس بات پر روشنی ڈالو کہ جھاڑو دینے سے تمہارا ہاضمہ کیسا درست رہتا ہے اور جھاڑو دینا کیسی مفید قسم کی ورزش ہے۔

۳۔ تم ایک جھاڑو سے چار فرلانگ کی ایک گلی پندرہ روز تک جھاڑ سکتے ہو تو بتاؤ کہ بیس فرلانگ کی ایک گلی کو جھاڑنے کے لئے اسی مدت میں تم کو کتنی جھاڑوؤں کی ضرورت ہوگی؟

۴۔ اگر تم روزانہ ایک نالی کو صاف کرنے کے بعد چار سو اٹھائیس جراثیم سے پاک کرتے ہو تو بتاؤ کہ تمہارے سات دن کام نہ کرنے سے اس نالی میں کتنے جراثیم پیدا ہو جائیں گے۔

مختصر یہ کہ اسی قسم کے پرچے اور اسی قسم کے عملی امتحان کے بعد جس کے نمبر زیادہ آئیں وہ میونسپل کمشنر ہو جایا کرے یہ کیا کہ انتخاب ہوا روپیہ پانی کی طرح بہا اور چپراسی صاحب کی قسم کے ممبر منتخب ہو گئے جو بعد میں اپنے ووٹوں کو منڈی تک پسند نہیں کرتے سڑکوں پر جھاڑو دینا یہ معنی!

۰ جون ۱۹۳۸ء

(۶)

کسان زمینداروں کی دولت ہیں۔ اپنی دولت کس کو عزیز نہیں ہوتی اور کون یہ چاہتا ہے کہ اس کی دولت لٹے اور وہ تباہ و برباد ہو جائے دگر خدا بچائے اس نیند سے کہ انسان غفلت کے ساتھ سو جاتا ہے۔ اور اس لئے گھروں میں چوری ہو جاتی ہے صاحب خانہ جتنی گہری نیند سوئے گا۔ اسی قدر چور کو چرانے میں آسانی ہوگی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سونے والا یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ سوتا رہے۔ اور اس کی دولت لٹ جائے۔ البتہ یہ تو ایک قسم کی ناگہانی مصیبت ہے کہ ادھر سے نیند آئے اور ادھر سے چور۔ اگر وہ جاگتا ہی رہتا تو چور تو کیوں آتا۔ اور جب چور نہ آتا تو چوری خود بخود تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ انسان کچھ کھو کر ہی سیکھتا ہے۔

زمیندار غفلت کی نیند سوتے رہے کانگریس نے کسانوں کو اپنانا شروع کر دیا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زمینداروں کی یہ دولت ان کے قبضہ سے نکلنا شروع ہو گئی یہاں تک کہ جب کانگریس کے جلسے ہوئے کسان اپنے زمینداروں کی جان تک کے دشمن ہو گئے۔ تو زمینداروں نے پہلے تو کچھ کروٹیں لیں پھر کچھ اینٹھ سے ایک دو مرتبہ ہاں ہوں کیا اور آخر انگڑائی لے کر جو اٹھے ہیں تو دیکھتے کیا ہیں کہ چراغ گل پگڑی غائب ان کی نیند سے فائدہ اٹھا کر کانگریسیوں نے ان کی دولت یعنی کسانوں کو اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے۔ اب تو یہ حضرات بھی گھبرائے اور دوڑے اپنے کسانوں کے لئے کانگریس کے پیچھے۔

کانگریس نے زمینداروں کی نیند سے فائدہ اٹھا کر نہایت آسانی کے ساتھ کسانوں کو اپنایا تھا۔ مگر اب زمینداروں کی بیداری سے وہ اس طرح سٹپٹا گئی ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو جیسے سمجھدار شخص کی سمجھ میں بھی کوئی بات نہیں آتی۔ اور وہ سوائے جز بز ہونے اور زمینداروں پر کٹکٹانے کے اور کچھ نہیں کہتے۔ ان کا جو بیان شائع ہوا ہے۔ اس میں الفاظ تو بہت ہیں۔ مگر مطلب صرف یہ ہے کہ سونے والے آخر کیوں جاگ اٹھے۔ اگر یہ ذرا اور سوتے تو کانگریس ان کو کبھی سو کر اٹھنے کے قابل نہ رہنے دیتی۔ اور یہ نیند موت کی نیند بن جاتی۔ وہ تو یہ کہئے کہ زندگی تھی جو یہ بیچارے جاگ اٹھے۔

کانگریس والے جو زمینداروں کو حلوا سمجھ کر عرصہ سے تناول فرما رہے تھے اور ڈکار تک لینے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ وہی زمیندار اب ایسے کمربستہ ہوتے ہیں کہ کانگریس اپنا کھایا پیا اگلنے کے خطرہ میں مبتلا ہے۔ زمینداروں نے یہ طے

یہ ہے ایک واقعہ کو جانے تک زمینداروں کے جب ان وہاں واقف رہے۔ اس کانگریس پر پہنچنے سے جو شخص
پتہ لگتا ہے اس کا سیاب کرنے۔ اس حاشیہ کو۔ ان تحریک نے کانگریس والوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا ہے۔ اس لیے مکمل
ان دو پہلے دیہاتیوں کو ہر طرح نازک تھا اور یہ کانگریس کا رد۔ اصل سب کچھ رکتے دھرتے تھے۔ وہ ان کی صعوبتی کا کام
ہے وہ سے پشت پناہی ہوا بروقت ہر روز پہلوؤں کے بجائے دو یت سے سوشل عدوت سمجھتے ہیں وہ مکمل حد تک لوگوں سے
بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب کانگریسی دیہاتیوں کی حالت دکھائی ہے۔ شملہ جب آتے تو ہے
ر کانگریس نے کسانوں کے سامنے ہو بہ پرک اس قسم کی وقت اس وقت کانگریس والوں
کے متعلق رائے کیا قائم کی ہے اور کانگریس والے کس کو شہر چھپا لیں گے۔ شہروں سے جو گئے تھے۔
اب وہ بات سے دیکھنا ہے کہ وہ جاتے ہیں

۰ جون ۱۹۳۰ء





طوفان کی آمد

(طوفان کے خاص شاعر کے قلم سے)

طوفان آتے ہیں گو مٹانے کے لیے
بنیادِ زمانہ کو ہلانے کے لیے
لیکن یہ ہے اپنی نوعیت کا طوفاں
آیا ہے یہ سوتوں کو جگانے کے لیے

(۱۱-مئی ۱۹۳۸ء)

اُردو، ہندی اور ہندوستانی

کہو "آب" اور "جل" کو تم صرف "پانی"
وہ اُردو، وہ ہندی یہ ہندوستانی
زباں ایک ہو گی تو دل ایک ہوگا
یہ کوشش تو اچھی ہے لیکن زبانی

(۱۴-جون ۱۹۳۸ء)

کانپور کی ہڑتال

یہ پٹی عجب کانگریس نے پڑھائی
کہ بھوکے رہو میرے مزدور بھائی
قسم ہے تمھیں اب جو تم مِل میں جاؤ
تم ہڑتا لیے ہو دکھاؤ ڈھٹائی
خود اپنی ہی روزی میں بٹہ لگا کر
بہادر اگر ہو تو چھوڑو کمائی
مگر اب تو ہر فاقہ کش چیختا ہے
مرے جاتے ہیں کانگریس کی دہائی

(۱۰-جون ۱۹۳۸ء)

سُوبھاش بابو کا مسلمانوں کو پیغام

اے مسلمانوں کرو تم ایک کام
پہلے تو چپکے سے بن جاؤ غلام
پھر یہ دیکھو ہم تمھیں دیتے ہیں کیا
تم لگاتے کیوں ہو آخر اپنے دام
گھاس کھاؤ یا چنا حاضر ہے سب
ہاتھ میں رکھیں گے ہم لیکن لگام

(۱۵-جون ۱۹۳۸ء)

جناح نہرو خط و کتابت

صلح کی کوشش ہو کیونکر کامیاب
مصلحت جب ہے حجاب اندر حجاب
لیگ نے جو کانگریس کو خط لکھے
آئیں بائیں شائیں ہے ان کا جواب

(۱۰ جون ۱۹۳۸ء)

مخالفین طوفان سے

تم سے یہاں میں ہو جو طوفان بپا آسان نہیں
میں کوئی چیونٹی نہیں تم کوئی جب پان نہیں
یہ وہ طوفاں ہے جو کنکر بہا لے جائے
خس و خاشاک سے رک جائے وہ طوفان نہیں

(۲۰ جون ۱۹۳۸ء)

کانگریس والنٹیر کور

جنگجوئی سے ہے نفرت صلح کی تعلیم ہے
کانگریس اک گروہ مسکیں ہے یہ تسلیم ہے
ہاں مگر کچھ قول میں اور فعل میں ہے اختلاف
امن کا دعوےٰ ہے اور افواج کی تنظیم ہے

(۲۱ جون ۱۹۳۸ء)

بے روزگار شماری

ہونے والا ہے حکم یہ جاری
ایسی فہرست کی ہو تیاری
درج ہوں جس میں سب جو ہیں بیکار
یہ بھی ہے ایک شغل بے کاری

(۲۸ جولائی ۱۹۳۸ء)

منظومات

(گہرستان* کے بعد کا کلام)

دل اب دنیا و مافیہا سے غافل ہوتا جاتا ہے
یگانہ بن کے بیگانوں میں شامل ہوتا جاتا ہے

نظر کو اب ترا نظارہ مشکل ہوتا جاتا ہے
نگہ کے سامنے پردہ سا حائل ہوتا جاتا ہے

مرا ہر رنج اب راحت میں شامل ہوتا جاتا ہے
جسے میں درد سمجھا تھا وہی دل ہوتا جاتا ہے

ہر انساں فرضِ انسانی سے غافل ہوتا جاتا ہے
زمانہ آگ دے دینے کے قابل ہوتا جاتا ہے

مذاقِ بے خودی کا لطف حاصل ہوتا جاتا ہے
دلِ دیوانہ اب ان سے بھی غافل ہوتا جاتا ہے

زمانہ آخر آخر میرا قائل ہوتا جاتا ہے
یہ کل عالم سمٹ کر اب مرا دل ہوتا جاتا ہے

خودی پر بیخودی کا رنگ غالب آتا جاتا ہے
مرا دل رفتہ رفتہ ان کے قابل ہوتا جاتا ہے

جہاں تک امتیازِ حق و باطل اٹھتا جاتا ہے
جنونِ شوق گویا اور کامل ہوتا جاتا ہے

نتیجہ چارہ گر کی کوششِ بیکار کا یہ ہے
کہ محرومی کا میری وہ بھی قائل ہوتا جاتا ہے

سناتا جا رہا ہے ناخدا روداد بچنے کی
سفینہ میرا گویا غرقِ ساحل ہوتا جاتا ہے

میں کرتا جا رہا ہوں جس قدر آسانیاں پیدا
محبت کا معمہ اور مشکل ہوتا جاتا ہے

جہاں تک ڈوبتی جاتی ہے کشتی میری اے شوکت
اسی رفتار سے نزدیک ساحل ہوتا جاتا ہے

* مجموعہ کلام

بے حجابی کا تری بزم میں دستور نہیں
ورنہ وہ کون سا ذرّہ ہے جو پُر نور نہیں

ذوقِ نظّارہ کا اس دور میں دستور نہیں
آج موسیٰ بھی وہاں پر ہیں جہاں طور نہیں

موت منظور ہے آجائے اگر حسبِ مراد
نامرادی ہو تو پھر زیست بھی منظور نہیں

کبھی ویراں کبھی آشوبِ خیالات سے دل
کبھی معمور ہے دنیا کبھی معمور نہیں

دیدنی ہے کششِ ذوقِ ستم کا اعجاز
میں زمیں پر ہوں مگر مجھ سے فلک دور نہیں

جوش کہتا ہے کہ ہر بات انا الحق بن جائے
لیکن اس راز کا افشا مجھے منظور نہیں

صورتِ حال خود افسانہ ہے میرا شوکت
ضبط وہ رازِ محبت ہے جو مستور نہیں

وفا نا آشناؤں سے وفا کی ‏ ‏ خطا کی اور بڑی ہم نے خطا کی
جہاں تک ہو سکا دل کی دوا کی ‏ ‏ اب اس کے بعد جو مرضی خدا کی
بڑھا جاتا ہے جتنا زورِ طوفان ‏ ‏ گھٹی جاتی ہے ہمت ناخدا کی
خدا جانے اب اس کے بعد کیا ہے ‏ ‏ بقا تو پہلی منزل ہے فنا کی
جسے منزل سمجھ کر میں بڑھا تھا ‏ ‏ وہ گمراہی تھی میرے رہنما کی
کہیں گے حالِ دل اک روز تم سے ‏ ‏ قسم ہے جذبِ جرأت آزما کی
مرادِ عاشقی ہے نامرادی ‏ ‏ دعا کی طرح ہم نے بد دعا کی
خدا کی مصلحت سے لڑ رہا ہے ‏ ‏ ذرا ہمت تو دیکھو ناخدا کی
ملی جنت ترے کوچہ کے بدلے ‏ ‏ جزا میں بھی ہے نوعیت سزا کی
مگر اب کیا کرے طوفانِ غم کو ‏ ‏ جہاں تک بہ سکی کشتی بہا کی
سفینے کی تباہی دیکھتی ہے ‏ ‏ خدائی سے لڑائی ناخدا کی

یہی اک مدعا باقی ہے شوکتؔ
ضرورت ہے دلِ بے مدعا کی

شب غم فسانہ غم دل کہانی
نہ یہ جاودانی نہ وہ جاودانی

عطا کر کے مجھ کو مری عمر فانی
محبت نے بخشا غم جاودانی

نہ گرداب ہے اور نہ موجیں نہ طوفاں
کہاں لے کے ڈوبی ہے مجھ کو جوانی

نہ پوچھے مرا آج مجھ سے فسانہ
زمانہ سنائے گا میری کہانی

یہ بے مائگی اور الفت کا سودا
نہ دل میں لہو ہے نہ آنکھوں میں پانی

تم اپنی جفاؤں کی شدت بڑھاؤ
ستم آزما ہے مری سخت جانی

خموشی ہے پردہ در رازِ الفت
تکلم بنی ہے مری بے زبانی

مری موت کو جانتے بھی ہو کیا ہے
شباب محبت وفا کی جوانی

ہر اک سانس ہے مستقل موت گویا
بسر ہو رہی ہے مگر زندگانی

محبت ہے میری تو سب کچھ ہے شوکت
مری نامرادی مری کامرانی

تخیل سے دامن بچاؤ تو جانیں
تصور میں بھی تم نہ آؤ تو جانیں

محبت کا اک کھیل ہے ناز اٹھانا
محبت کے تم ناز اٹھاؤ تو جانیں

میں اپنے فسانہ پہ خود ہنس رہا ہوں
سنو اور اب مسکراؤ تو جانیں

تمہارا بھلانا تو ہے دوسری شے
ہمیں تم ہی خود بھول جاؤ تو جانیں

بھلاتے ہو شوکت کو اچھا بھلا دو
اسے بھی نہ تم یاد آؤ تو جانیں

نہ وہ رقصِ ساغر نہ وہ دورِ بادہ
زمانے کا ہے اور ہی کچھ ارادہ

محبت نے گو لاکھ رنگیں بنایا
یہ پھر کیا یہ دل میرا اب تک ہے سادہ

ہجومِ مسرت سے گھبرا کے دل نے
غمِ عشق سے کر لیا استفادہ

مسافر ہوں مجھ کو سفر سے غرض ہے
نہ کچھ ہوشِ منزل نہ کچھ فکرِ جادہ

فریبِ نظر سے مفر کب ہے ممکن
محبت کا پھر کر رہے ہیں اعادہ

مرا دل بھی رخصت ہوا مجھ سے کہہ کر
بس اب خانہ آباد دولت زیادہ

تری بزم میں اس طرح آئے شوکت
لبِ مدعا بستہ و دل کشادہ

اثر جذبِ دل کو دکھانا پڑے گا
وہ آئیں گے اور اُن کو آنا پڑے گا

محبت کا وہ دَور بھی آ رہا ہے
کہ ہر حال میں مسکرانا پڑے گا

بھلایا تھا جس کے لیے ہم نے سب کچھ
ارے کیا اسے بھول جانا پڑے گا

وہ اپنے کو شاید سمجھنے لگے ہیں
انھیں بھی اب اُن سے چھپانا پڑے گا

خدا ہم کو توفیق دے روٹھنے کی
انھیں آ کے ہم کو منانا پڑے گا

خودداریٔ جنوں کو رسوا نہ کیجئے
ان کا بھی التفات گوارا نہ کیجئے

بیگانہ بن کے بزم میں دیکھا نہ کیجئے
نظروں سے دل کے راز کو افشا نہ کیجئے

جور و جفا تو حسن کے جائز حقوق ہیں
جور و جفا کا شکوہ بیجا نہ کیجئے

امروز کے طلسم کو رہنے ہی دیجئے
للہ آپ وعدۂ فردا نہ کیجئے

زاہد کی ضد ہے کالی گھٹاؤں کو بھول جا
کالی گھٹائیں کہتی ہیں توبہ نہ کیجئے

خود اپنا حسن دیکھ کے انصاف کیجئے
خود اپنی ہی نظر سے تو پردہ نہ کیجئے

کب تک یونہی بہار کا موسم گزارئے
کب تک نہ عزم جانبِ میخانہ کیجئے

دھوکے نہ دیجئے نظرِ التفات سے
سرسبز پھر سے داغِ تمنا نہ کیجئے

محبت کے موے محبت کے مارے
تم ہی جب نہیں تو جئیں کس سہارے

مجھے ناخدا تیرے احساں نے مارا
میں طوفاں سے بچ کے ڈوبا کنارے

محبت میں اتنا تو دل کو مٹا دوں
جدھر سے میں گزروں مجھے دل پکارے

اگر ہو یہ سودا تو منظور ہم کو
کہ ان کا ہو سب کچھ مگر وہ ہمارے

ذرا دیکھئے موت کترا رہی ہے
میں دریا میں ہوں اور طوفاں کنارے

محبت کی بازی عجب طرح کھیلی
رہا کھیل قائم نہ جیتے نہ ہارے

یہ ہے فرقِ نازو نیازِ محبت
کہ تم ہو ہر اک کے مگر ہم تمہارے

میں شوکت اسی فکر میں چپ ہوا ہوں
کہ کب تک کوئی چپ رہے دم نہ مارے

پاک نخوت سے کبھی شیخ کا ایماں نہ ہوا
مجھ کو یہ ناز ہے میں نعت پہ نازاں نہ ہوا

موت کا شکر سہی آپ کا احساں نہ ہوا
یہی کیا کم ہے کہ میں طالبِ درماں نہ ہوا

دل میں گھٹ گھٹ کے رہا درد نمایاں نہ ہوا
وہ یہ سمجھے کہ پریشان پریشاں نہ ہوا

اپنی ہستی کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوئی
دل میں جب درد ترا سلسلہ جنباں نہ ہوا

حشر میں بھی مجھے شرم آئی شکوہ کرتے
جس کو ہونا تھا پشیماں وہ پشیماں نہ ہوا

اے غمِ دل تری کس طرح تلافی ہوگی
قبر میں بھی جو کوئی داغ نمایاں نہ ہوا

میری ہستی بھی عجب عقدۂ لاینحل تھی
زیست دشوار تھی مرنا مجھے آساں نہ ہوا

ہم گلستاں میں ہر اک گل کو سکھلاتے کھلنا
ہائے اے جوشِ جنوں آج گریباں نہ ہوا

اعتبارات کا پردہ جو اُٹھا کر دیکھا
حسن اور عشق میں کچھ فرق نمایاں نہ ہوا

گل و گلزار کی کیا اس کو حقیقت معلوم
گل بداماں جو ہوا شعلہ بداماں نہ ہوا

دستِ وحشت میں خود اپنا ہی گریباں ہوگا
دستِ شوکت میں اگر آپ کا داماں نہ ہوا

ہوش میں آپ نہ اب لائیے دیوانے کو
یہ بہانے سے نہ کہیں عشق کے افسانے کو

آپ بیکار نہ سمجھیں مرے مر جانے کو
ختم کرنا تھا یہیں پر مجھے افسانے کو

لوگ ترغیبِ چمن دیتے ہیں دیوانے کو
عالمِ ہوش سمجھتا ہے جو ویرانے کو

آگیا جب کبھی بدمست ہوا کا جھونکا
توبہ کے ہاتھ میں لرزش ہوئی پیمانے کو

خونِ حسرت ہی سہی خونِ تمنا ہی سہی
ہم نے رنگین بنایا ترے افسانے کو

فصلِ گل آئی تو صحرا میں ہوا جشنِ جنوں
وحشتیں ڈھونڈنے نکلیں ترے دیوانے کو

عشق سے ہم کو ملے تو کہیں فرصت شوکتؔ
انقلاب اور بھی باقی ہیں کئی آنے کو

کاش اس سوز میں کچھ ساز بھی شامل ہو جائے
دل کبھی درد بنے درد کبھی دل ہو جائے

دل سے اتنی ہی تسلی مجھے حاصل ہو جائے
ان کے قابل نہ سہی میرے تو قابل ہو جائے

جس کو تو دیکھ لے سرتا بہ قدم دل ہو جائے
میں تو میں سارا زمانہ ترا قائل ہو جائے

مجھ کو بیکس نہ سمجھ میری تباہی پہ نہ جا
آج چاہوں تو ترا دل بھی مرا دل ہو جائے

زندگی کیف محبت میں ہے سرشار مگر
موت سے کس نے کہا ہے کہ وہ غافل ہو جائے

ناخدا دیکھ خدائی میں کوئی دخل نہ دے
کیا عجب ہے کہ یہ طوفان بھی ساحل ہو جائے

شمع کا سوز ہے فطرت کی غلط بخشی سے
میں تو کہتا ہوں کہ یہ بھی مجھے حاصل ہو جائے

سانحہ عشق کا وہ عقدۂ لاینحل ہے
کوئی پوچھے تو بتانا مجھے مشکل ہو جائے

جستجو جس کی ہے وہ مل نہیں سکتا شوکت
دل مگر کہتا ہے شاید کبھی حاصل ہو جائے

میں کافر ہوں میں کافر ہوں قسم کھاتا ہوں ایماں کی
کوئی پوچھے مرے دل سے جو ہے توقیر عصیاں کی

مری مایوسیوں نے لاج رکھ لی میرے ارماں کی
جو مشکل پڑ گئی مشکل پسندی ہی نے آساں کی

ذرا عظمت تو دیکھو اس جنونِ فتنہ ساماں کی
بہاریں لے کے آیا ہوں بیاباں میں گلستاں کی

بہار آئی بلاتی ہیں فضائیں اب گلستاں کی
اگر روکے تو بڑھ کر روک لے دیوارِ زنداں کی

پشیمانی نہ دیکھی جائے گی مجھ سے پشیماں کی
اڑا دے جوشِ رحمت دھجیاں تو فرد عصیاں کی

ذرا سے جام میں کیا غرق ہو جاتا ہے کُل ایماں
جنابِ شیخ کیا قیمت یہی ہے اک مسلماں کی

خدا اور ناخدا ہیں دیکھئے اب کون کام آئے
ادھر میرا عقیدہ ہے ادھر شدت ہے طوفاں کی

اگر صیاد نے میرے نشیمن پر نظر ڈالی
بہاریں لے کے اُڑ جاؤں گا میں صحنِ گلستاں کی

ذوقِ صہبا دیجئے پھر دوزخی کہہ لیجئے — اپنی کوتاہی کو بھی میری کمی کہہ لیجئے

زندگی کا ہے فسانہ لطف دے گا ہر طرح — میں جو کہنا چاہتا ہوں آپ ہی کہہ لیجئے

یہ عقیدہ بندہ ہے مرے مذہب میں کفر — سرکشی ہے آپ اس کو بندگی کہہ لیجئے

زیست کی دشواریوں نے ہم کو یہ سمجھا دیا — جو بسر ہو جائے اس کو زندگی کہہ لیجئے

مبتلائے پیچ و خم ہے آج بھی زلفِ ایاز — ہے کوئی ایسا کہ جس کو غزنوی کہہ لیجئے

لب ہلانے کی اجازت ہی نہیں دیتی حیات — وہ غنیمت جانئے جو کچھ کبھی کہہ لیجئے

اک سرور اس میں بھی ہے بے کیفیوں کے کیف کا — تشنگی کو آپ میری مے کشی کہہ لیجئے

پھر لبِ خاموش سے کہنا ہے مجھ کو داستاں — آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے ابھی کہہ لیجئے

اب نیا رخ ہے نئی دنیا نئے علم و ادب — ان نئی تاریکیوں کو روشنی کہہ لیجئے

ماورائے عالمِ ہستی ہیں ان کے واردات — شیخ جی کو اصطلاحاً آدمی کہہ لیجئے

دیکھئے کافور ہو جائے گا دورِ حال بھی
اس کو شوکت چار دن کی چاندنی کہہ لیجئے

خدا کو اب بھول جائیں گے ہم خودی کا سجدہ ادا کریں گے
جنوں کی انتہا یہی ہے یہیں سے ہم ابتدا کریں گے
جفائیں تم آزمائے جاؤ وفا کے خوگر وفا کریں گے
ہمارے کہنے میں دل نہیں ہے تو ہم ہی دل کا کہا کریں گے
غرور دیوانگی سلامت تو عرض کیوں مدعا کریں گے
طلب کی توہین خود طلب ہے کبھی نہ ہم التجا کریں گے
تم اپنے وعدوں کو بھول کر بھی اگر ہمیں یاد رکھ سکو گے
یہ دل سلامت تو ہم اسے پھر فریب میں مبتلا کریں گے
اگر محبت میں کچھ کشش ہے اگر جنوں کی ہے کچھ حقیقت
ہمارا قصہ جو سن رہے ہیں وہ خود ہم ہی سے کہا کریں گے
خوشی کا تو خیر ذکر کیا ہے ہمارا غم بھی نہ غم رہے گا
ہمارے رونے پہ دیکھ لینا ہمارے آنسو ہنسا کریں گے
محبت اک راز منکشف ہے مگر یہ افشا نہ ہوگا شوکت
یہ ایک پردہ نہ اٹھ سکے گا ہزار پردے اٹھا کریں گے

یہ کس نے کہہ دیا وہ آ رہا ہے — کہ دل ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے

سنبھالو ہوش مجھ کو آ رہا ہے — یہ پردہ بھی اب اُٹھتا جا رہا ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کسی کی — میں دل کو دل مجھے سمجھا رہا ہے

وہ عرضِ مدعا پر سرنگوں ہیں — کہ جیسے چاند ڈوبا جا رہا ہے

دہائی ہے فریبِ آرزو کی — توجہ پھر کوئی فرما رہا ہے

بھروسہ ہے مجھے رحمت پہ زاہد — تو پھر تو کیوں مجھے بہکا رہا ہے

میں اپنے دل کی دھڑکن سن رہا ہوں — کہ جیسے دور کوئی گا رہا ہے

قیامت ہے مری مرگِ جوانی — پسینہ موت کو بھی آ رہا ہے

گھٹا توبہ پہ چھائی جا رہی ہے — اور ایماں ڈگمگایا جا رہا ہے

بڑھے آتے ہیں ساحل میری جانب — سفینہ ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

گواہی کون دے محشر میں شوکتؔ

ہمارا دل ہمیں جھٹلا رہا ہے

مری وفا کا کوئی زمانہ کسی زمانے سے کم نہیں ہے
سکون جس کو سمجھ رہے ہو وہ غم اٹھانے سے کم نہیں ہے

بلا بلا بے قراریوں کو کہ اب وہی ہیں سکونِ خاطر
تری تسلی تری تشفی بھی دل دُکھانے سے کم نہیں ہے

یہ کونسا میکدہ ہے آخر جہاں مجھے لائی ہے محبت
کہ اس جگہ کا ہر ایک ساغر شراب خانے سے کم نہیں ہے

خدا ہی جانے کہ کیا سمجھ کر ہوئی یہ فطرت کی دستکاری
میں کہہ رہا تھا مرا بنانا مرے مٹانے سے کم نہیں ہے

نہ کھاؤ دھوکہ نہ کھاؤ دھوکہ کہ غم کی موجوں میں غرق ہوں میں
فلک کو یوں بار بار تکنا بھی سر جھکانے سے کم نہیں ہے

سمجھ کے آ جا رہِ وفا پر سنبھل کے چل راہِ زندگی پر
کہ اس جگہ ہوشیار رہنا فریب کھانے سے کم نہیں ہے

مصیبتوں کا مقابلہ کر مصیبتوں ہی میں زندگی ہے
کنارِ ساحل میں جا کے چھپنا بھی ڈوب جانے سے کم نہیں ہے

جنابِ شوکت خموش کیوں ہیں کھلا نہیں ہے یہ راز اب تک
خود ان کا افسانۂ محبت کسی فسانے سے کم نہیں ہے

خموشی کہہ رہی ہے جانے کیا کیا
سب بے مدعی کا مدعا کیا

محبت کیا، وفا کیا اور جفا کیا
یہ سب دھوکے ہیں دھوکوں کے سوا کیا

نہ وہ سمجھے نہ میں سمجھا ہوا کیا
نگاہوں نے نگاہوں سے کہا کیا

جبیں کیا سجدہ کیا اور نقش پا کیا
ان ہی رسموں سے ہو گا حق ادا کیا

علاج اس کا بتا اے مبتلا کیا
اگر یہ درد دل ہے تو دوا کیا

میں خود کشتی ڈبونے جا رہا ہوں
ارادہ ہے ترا اے ناخدا کیا

نقاب اٹھنے ہی تک تھی سب پہ حیرت
نقاب اٹھی تو کوئی دیکھتا کیا

جفا ہے اور جفائے دوست ہے یہ
روا کیا اور اس میں ناروا کیا

وہ رہ رہ کر ہر اک سے پوچھتے ہیں
یہ شوکت تھانوی کو ہو گیا کیا

درِ جاناں پہ جبہ سائی ہے
اب خدائی مری خدائی ہے

بے قراری ہے جو نوائی ہے
زندگی موت بن کے آئی ہے

لاکھ پردوں میں اس کو دیکھ لیا
عشق نے کب نگاہ پائی ہے

کعبہ اور عرش کس کو کہتے ہیں
ان کے در تک مری رسائی ہے

جس پہ ہنستی ہے دوریٔ منزل
وہ ہماری شکستہ پائی ہے

شب کو دورِ سرود و ساغر و مے
صبح ہنگام پارسائی ہے

وعدۂ دید اور حشر مگر
یہ خبر بھی سنی سنائی ہے

بارِ ہستی کا شکوہ کیا شوکت
یہ ہوا کس کو راس آئی ہے

خیالِ خواب کی دنیا بسا رہا ہے کوئی
پھر ایک لب سے مگر یاد آ رہا ہے کوئی

نگاہِ شوق سے بچ بچ کے جا رہا ہے کوئی
سکونِ زیست کو طوفاں بنا رہا ہے کوئی

وفائے عشق کو ان بے اصولیوں سے کیا
کہ حق کسی کا ہے اور داد پا رہا ہے کوئی

غرورِ حسن وفا قابلِ پرستش ہے
لبوں پہ آہ ہے اور مسکرا رہا ہے کوئی

یہ ہو نہ ہو مرا افسانۂ محبت ہے
سنا رہا ہے کوئی مسکرا رہا ہے کوئی

یہ وصل ہے کہ جدائی میں کیا کہوں اس کو
قریب تر ہے مگر بچ کے جا رہا ہے کوئی

خدا ہی جانے کہ کانٹوں سے کیا شکایت ہے
کہ اب گلوں سے بھی دامن بچا رہا ہے کوئی

فلک حریفِ وفا بد نصیب دلِ بیتاب
نئے نئے مجھے منظر دکھا رہا ہے کوئی

تمام حسن و جوانی تمام رنگینی!
بری طرح سے مجھے یاد آ رہا ہے کوئی

فریبِ کشتی و ساحل نہ کھائیے شوکت
کہ ساتھ ساتھ ہی طوفاں بھی آ رہا ہے کوئی

بدلیاں دن کی گھٹائیں رات کی
زندگی ہے زندگی برسات کی

توبہ کی آتے ہی رُت برسات کی
کی مگر اک بے محل سی بات کی

میرے دیوانے نے جس سے بات کی
پوچھی گردن کی تو سن لی رات کی

تم تصور میں ہوئے تھے ہمکلام
سوچتا ہوں میں نے کس سے بات کی

رو رہا ہوں میں ہنسے دیتے ہیں وہ
کتنی پیاری ہے فضا برسات کی

یاالٰہی کونسا عالم ہے یہ
چھائی ہے دن پر سیاہی رات کی

حشر میں کیا آتے خالی ہاتھ ہم
لائے ہیں اک فرد الزامات کی

کیا ہوا دل کو الٰہی خیر ہو
کچھ کمی پاتا ہوں محسوسات کی

مستقل جذبات بن کر رہ گئی
یاد اک غارت گر جذبات کی

اس طرف بحرِ ندامت موج زن
اس طرف اک فرد الزامات کی

میں ہوں شوکتؔ اور مری تنہائیاں
حد نہیں ہے ان کے احسانات کی

ندامت ہے مجھے جذب و اثر سے
کہ اب پیغام آتے ہیں ادھر سے

مجھے اب دیکھنے والے نہ دیکھیں
انہی کو دیکھ لیں میری نظر سے

جنون و ہوش دونوں ننگِ الفت
ہمیں صحرا سے مطلب ہے نہ گھر سے

جبیں جنت میں ہے کھوئی ہوئی سی
کہ اٹھا ہوں تمہارے سنگِ در سے

ہمائیں اڑ رہی ہیں چار جانب
مگر بیٹھے ہیں ہم بے بال و پر سے

یہ کم ظرفی کہ ہم کہتے فسانہ
مگر کچھ بس نہیں چلتا نظر سے

طلب چھوڑی غرورِ عاشقی نے
انھیں دکھلا دیا ان کی نظر سے

محبت ہے مگر اس کش مکش میں
تقاضا ہو ادھر سے یا ادھر سے

تمنا ڈوبنے کی ہو گی شوکت
یہ پانی جب گزر جائے گا سر سے

تم سے اب اپنے سے بھی بیگانہ ہونا چاہیے
بس ترے دیوانہ کو دیوانہ ہونا چاہیے
حشر کے دن ہاتھ میں پیمانہ ہونا چاہیے
کم سے کم یہ جرأتِ رندانہ ہونا چاہیے
تم ہو عنوانِ محبت تم ہو عنوانِ حیات
اب مرے افسانہ کو افسانہ ہونا چاہیے
جب کبھی برسے تو دنیا غرقِ مے ہو کر رہے
ہر گھٹا کے ساتھ اک میخانہ ہونا چاہیے
میں ترا دیوانہ بن کر تجھ سے بیگانہ بنا
اب تجھے میرے لیے دیوانہ ہونا چاہیے
ہر نظر میں تم ہی تم ہو ہر طرف ہو تم ہی تم
جب تم ہی تم ہو تو پھر پروانہ ہونا چاہیے
طالبِ دیدار بننا ننگ ہے اے جذبِ عشق
خود نظر کو جلوۂ جانانہ ہونا چاہیے
شیخ تو واقف بھی ہے آدابِ میخانہ سے کچھ
توبہ کرتے وقت بھی پیمانہ ہونا چاہیے
یاد فرماتے ہیں شوکت کو وہ اپنی بزم میں
ہر قدم پر سجدۂ شکرانہ ہونا چاہیے

ہوں بے حسیِ عشق کا ساماں لیے ہوئے
حسرت لیے ہوئے ہوں نہ ارماں لیے ہوئے

وہ جس طرف گئے رخِ تاباں لیے ہوئے
ہم دیکھتے رہے دلِ حیراں لیے ہوئے

کس کی طرف اٹھاؤں نظر کس کو چھوڑ دوں
اک زندگی ہے سیکڑوں ارماں لیے ہوئے

کم مائیگیِ اشک پہ دامن پر نہ جائیے
قطرہ ہے بحر، بحر ہے طوفاں لیے ہوئے

اے زاہدو گناہ مجھے بخشوائیں گے
بیٹھے رہو تقدسِ ایماں لیے ہوئے

ہر پھول دے رہا ہے مجھے دعوتِ جنوں
عریانیاں بجائے گریباں لیے ہوئے

آئینہ دیکھتے ہیں ہمیں دیکھتے رہو
ہم بھی کھڑے ہیں دیدۂ حیراں لیے ہوئے

سوغات لے کے آئے ہیں دیوانگانِ شوق
ہاتھوں میں چند تارِ گریباں لیے ہوئے

ہوتا ہے لمحہ لمحہ سکوتِ فراق کا
نیرنگیِ حیات کے عنواں لیے ہوئے

کانٹوں سے تصفیہ ہے یہ اب اہلِ ذوق کا
دامن دئے ہوئے ہیں گریباں لیے ہوئے

دن کٹ گیا بلاؤں کا شوکت تو کیا ہوا
آئی ہے رات خوابِ پریشاں لیے ہوئے

نیم باز آنکھوں میں بیداری خواب آلودہ
ہائے یہ نرگس بدمست شراب آلودہ

دل میں ایک موج ہے اور ہائے طلب ہیں چھالے
ایک سیلاب ہے اور وہ بھی حباب آلودہ

ہائے وہ پہلے پہل قول و قرارِ الفت
تیری آواز تھی اس وقت رباب آلودہ

اس صیاد کو بلبل نہ بنا دوں تو سہی
ایک ایسی ہی بہار اور گلاب آلودہ

اپنے ہر گام پہ منزل کا گماں ہوتا ہے
میری منزل بھی ہے کس درجہ سراب آلودہ

شرم رکھ لی ہے مرے ذوقِ نظر کی تو نے
مجھ کو جلوہ بھی دکھایا تو نقاب آلودہ

عمر بھر کے لیے پیمانِ وفا لیتی ہے
اک تری چشمِ کرم وہ بھی عتاب آلودہ

ہیچ دنیا ہے کرم اس کی نظر میں اے دوست
جس نے دیکھی ہے تری چشمِ عتاب آلودہ

شاعر کی بیوی

شاعری اور پیٹ کا دھندا عجب ڈھب   جان سے تنگ ہیں بیوی اور بچے سب کے سب
فاعلاتن فاعلاتن بیٹھ کر کرتے ہیں جب   ان کو یاد آتی ہے بیماری بے سبب

اک سروتا ہاتھ میں اور پاندان اپنا لیے
سر پہ آ جاتی ہیں لڑنے خاندان اپنا لیے

ایک لڑکا جس کو پچھلے چار دن سے ہے بخار   ایک لڑکی جس کی آنکھیں دکھ چکی ہیں بار بار
تیسرا جو ٹھیک ہے وہ رو رہا ہے نابکار   شامتِ اعمال کی ہر قسم ہے سر پہ سوار

شاعرِ شیریں بیاں بیٹھا ہے گھبرایا ہوا
ذہن میں ہے طرح کا مصرع بھی بولایا ہوا

وہ یہ کہتی ہیں کہ جائے بھاڑ میں یہ شاعری   ایڑی چوٹی پر کروں قربان یہ کاریگری
اتنے دن سے کوئی بھی پیسہ ملا سوچو ذری   یاد کر لو خود دسمبر جنوری پھر فروری

تم ہی سوچو کس طرح ہوگا ہمارا اب نباہ
مجھ کو روٹی چاہیے اور تم کو خالی واہ وا

میں یہ کہتا ہوں کہ اے شمعِ شبستانِ حرم — تو ہے اک شاعر کی بیوی کیا ہے یہ اعزاز کم
تجھ کو کیا معلوم میرا مرتبہ میرا حشم — گھر کے باہر دیکھ چل کر کس قدر ہوں محترم
تو سمجھتی ہے مجھے یوں ہی سا اک انساں ہوں
اے میری ناداں بیوی میں ادب کی جان ہوں

جان وہ اپنی جلا کر منہ چڑھاتی ہیں مجھے — منہ چڑھا کر میرا آئینہ دکھاتی ہیں مجھے
گھر کی جو حالت ہے وہ سب کچھ بتاتی ہیں مجھے — شرم میری شاعری پہ پھر دلاتی ہیں مجھے
وہ یہ کہتی ہیں کہ شاعر تو یقیناً آپ ہیں
لیکن ان بچوں کے بھی تھوڑے بہت تو باپ ہیں

شاعری کرتے ہیں اور بھولے ہوئے ہیں شوہری — کوئی دھندہ بھی نہیں کرتے نہ کوئی نوکری
باپ دادا کی کمائی بھی نہیں گھر میں دھری — میں تو پلّے بندھ کے اک شاعر کے جیتے جی مری
یہ نحوست شاعری جس کلموہی کا نام ہے
مجھ سے پوچھو یہ نکھٹو مردوؤں کا کام ہے

میں گئی چولھے میں حلیہ دیکھئے اپنا ذرا — جیسے خود رو گھاس ہو خط اس طرح سے ہے بڑھا
جیسے اک قیدی جو کاٹے کوئی لمبی سی سزا — مرحبا اے شاعرِ رنگیں بیاں صد مرحبا
بھاڑ میں جائے یہ تیری شاعری یہ تیرا فن
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

مری

اے مری اے گرمیوں میں اہلِ دولت کے وطن ۔۔۔ اے چمن اندر چمن اور اے چمن در چمن
اللہ اللہ تری رعنائیاں اللہ رے یہ بانکپن ۔۔۔ جنتِ کشمیر کی بیشک ہے تو چھوٹی بہن
ہیں تو کہتے ہوں زمانہ میں ترا ثانی بھی ہے
تجھ میں خوباں بھی بہت ہیں اور خوبانی بھی ہے
عاشقوں کی سرد آہیں ہوکے ملتی ہیں یہاں ۔۔۔ سرد مہری سیکھنے آتے ہیں حسینانِ جہاں
سیکھتی ہیں آسماں سے ظلم تیری چوٹیاں ۔۔۔ پھر دکھاتی ہیں خود ہی ماہ جبیں تیری بیٹیاں
اہلِ دل کے واسطے المختصر تو موت ہے
بلکہ جنت تک یہ کہتی ہے کہ میری سوت ہے
حسن بھی گو حسن ہے لیکن عجب مردانہ وار ۔۔۔ وہ حسیں جو ہیں سمندِ ناز کے گویا سوار
لے کے اب ہنٹر کراتے ہیں وہی سب گلعذار ۔۔۔ کھیلتے پھرتے ہیں تیرے گوشہ گوشہ میں شکار
ایسا عالم تیرا ہوتا ہے مئی اور جون میں
بیبیاں بھی چلتی پھرتی ہیں یہاں پتلون میں
وہ حسینائیں قمیصوں میں جو ہوتی ہیں بھلی ۔۔۔ وہ لیڈی بوائز جو صاحب تو ہیں لیکن چلبلی
چال بے ڈھنگی ادائیں سب کی گڑبڑ دلی ۔۔۔ اس جگہ کثرت سے ملتی ہے ان ہی کی فیملی
یہ مری کے واسطے خود مستقل بھونچال ہیں
اے مری کی مال تیرے سب یہی تو مال ہیں
زندگی ہی زندگی ہے نام ہے لیکن مری ۔۔۔ خود ہی گویا قاف ہے تو اور خود اس کی پری
مال پر اللہ اکبر حسن کی کاریگری ۔۔۔ عشق پر طاری ہے جس کو دیکھ کر اک تھرتھری
یہ بناوٹ یہ سجاوٹ یہ نکھار اور یہ پھبن
اے مری اے گرمیوں میں اہلِ دولت کے وطن

آٹا

حضرتِ آدم پہ جو گزری ہے سب کو یاد ہے — دانۂ گندم کی زندہ آج تک بیداد ہے
آج پھر اولادِ آدم پر وہی افتاد ہے — اس کا بانی بھی فرشتوں کا وہی اُستاد ہے
دور دورہ آج اس کا چور بازاروں میں ہے
ماہرینِ چور بازاری کے غمخواروں میں ہے

اُن میں دیکھا اس کا جلوہ جو ذخیرہ باز ہیں — دفن تہ خانوں میں جن کے بوریوں کے راز ہیں
بوریوں سے ملتے جلتے توند کے انداز ہیں — اور فریاد و بکا میں سب کے ہم آواز ہیں
توند پر ہے ہاتھ اور فاقوں سے حالت زار ہے
ان کو ایندھن اس جہنم کے لیے درکار ہے

ہو گیا بازار سے آٹے کا ایسا انتقال — اب کھلے بازار میں آٹے کا ملنا ہے محال
لہلہاتی کھیتیوں کے دیس میں کیسا یہ کال — کال کی حیرت ہے پاکستان میں گل جائے دال
دستِ قدرت سے چھنا آزار کا ہر اختیار
فقر و فاقہ کا بنا انسان خود پروردگار

اک ذخیرہ باز مولانا نے دوکاں دار / وہ مرے اس ابتلا سے کل بہت تھے بیقرار

آہ اس قلت کا کیوں گیہوں پہ ہے دارومدار / کوئی کھاتی باجرا یا کاش یہ کھائی جوار

اس کے کھانے کے لیے نعمت ہزار موجود ہے

دانۂ گندم جسے گیہوں کہو پر مقصود ہے

کیا جو پوچھو تو گیہوں شیطان کا راشن ہے یہ / جس نے جنت لوٹ لی انساں کا وہ دشمن ہے یہ

حضرت آدم کے وقار و شان کا مدفن ہے یہ / لعنت ابدی انساں کا فقط بندھن ہے یہ

حیف ہے احسان کرتے ہیں یہ جنت تک نثار

سب کو گندم سے بچانا اے مرے پروردگار

سیکڑوں من ہیں تو گیہوں میرے تہ خانے میں ہے / اور مزا بھی کیا مجھے آزار پہنچانے میں ہے

میرے حصے کی وہی مے ہے جو پیمانے میں ہے / ہاں مگر دوزخ جو ہے گیہوں کے پروانے میں ہے

جس نے گیہوں کھا لیا دوزخ میں گولے کھائے گا

جس کو جنت چاہیے وہ صرف چھولے کھائے گا

کراچی کی بسیں

دلربا اے نازنینو! اے کراچی کی بسو — تم پہ صدقے ہو کے ہم مر جائیں بس تم جیو
کج روی بھولے فلک اب چال تم ایسی چلو — ہم تو خود ہی چل بسیں گے تم مگر چلتی رہو

تم پہ ہم عشاق کا چلتا نہیں جب کوئی بس
بیٹھ کر پڑھتے ہیں ہم اللہ بس باقی ہوس

کاش اپنے عشق کے ماروں کا کرتیں تم شمار — جو ہر اک اڈے پہ لٹکے ہیں قطار اندر قطار
اپنے پہلو میں دبائے اک دلِ بے اختیار — اور نظروں سے گرائے زندگی کا اعتبار

اس قدر لمبی قطار اور زندگانی مختصر
گھر پہنچنے سے تو ہے آسان دنیا سے سفر

اور اگر کُل مل کے ہو جائیں کبھی ہم باریاب — گھر پہنچنے کی دعا گڑبڑ میں ہو کر مستجاب
شرم سے شائستگی گرمی سے ہم ہوں آب آب — زندہ باد اس بس کے اندر آئے دیکھیں انقلاب

دیکھنا چاہیں اُسے گردن میں بانہیں جس کی ہیں
جسم تو اپنا ہے لیکن اس میں ٹانگیں کس کی ہیں

منہ لٹکے ہیں ہر کسی کے مرا ان جو ہیں سوار — ہو جو قبلی منشی تو ہو جب ... بار
خوب پڑ جو بیٹھیں کانوں سے ... تک نوکار — یاد سب آئے ... اپنی ... کا ...

آج خانہ ... خانہ ... سے بچے

... جس طرح بوتل شراب سے بچے

سامنے دو چوہیں بیٹھی میری شہزادی سے ہے — جس جگہ ... ہیں وہ ... ہے
ہم نشینو تم سے ... ہے — جب کہ ... نے ... ہے تو مطلع صاف ہے

پار کر کے پار کرنے والا ... گیا

اور کنڈکٹر یہ کہتا ہے کرایہ کر ادا

ہو کے چلتا چور اترے بس سے با حال خراب — جیسے بندر نوچ کر چھینے منڈیری سے کتاب
اس زبوں حالی پہ بھی خوش ہیں کہ ہم ہیں کامیاب — مل گئی ہے گھر کی جنت جیسی کر یوم الحساب

رات بھر یہ بس رہے گی ذہن پر اپنے سوار

صبح دم ہم پھر وہی ہوں گے وہی اپنی قطار

الوداع

چور بازاری گرانی الوداع
دودھ میں نل کے پانی الوداع
گھی کے اندر موبل آئل الفراق
تیری معدوں میں روانی الوداع
اب کہاں مکھن پہ مرہم کا گماں
اے گمانِ بدگمانی الوداع
اے پسی اینٹو نہیں مرچوں میں تم
تم نے بھی رحلت کی ٹھانی الوداع
اے اُپلیں بے کساں آٹے کی ریت
ہوگئی تو بھی کہانی الوداع
الفراق اے شورہ پشتی الفراق
خندہ گردی آنجہانی الوداع
کیسی بے بس ہوگئی کنڈکٹری
ہائے وہ چنگیز خانی الوداع
دم بخود ہیں ٹیکسی والے سب کے سب
اُف وہ اُن کی بدزبانی الوداع
اب صفائی خود ہمارا فرض ہے
الوداع اے مہترانی الوداع
سچ تو یہ ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس
الوداع اے من کی مانی الوداع

شہادتِ عظمیٰ

آندھی تھی وہ یہاں کہ ہو قرآن منتشر — عصیاں کا ایسا دور کہ ایمان منتشر
مقصد تھا یہ کہ اب ہوں مسلمان منتشر — ازبس کہ سب تھے سخت پریشان منتشر

رشتے تمام توڑ کے پروردگار سے
سب لو لگا چکے تھے فقط شہریار سے

وہ شہریار نشۂ نخوت میں جو تھا چور — باطل پرست حق و صداقت سے دور دور
جام و سبو میں غرق کیے اپنا ہر شعور — معبودیت کے زعم میں اک پیکرِ غرور

اس کو تھا یہ گھمنڈ کہ فرمانروا ہوں میں
سودا یہ ہو گیا تھا کہ شاید خدا ہوں میں

وہ چاہتا تھا کوئی نہ ہو اس کا نکتہ چیں — اس کے حضورِ عجز سے سب کی جھکے جبیں
اس کے اثر سے کوئی بھی باہر نہ ہو کہیں — ڈر تھا کہ اک حسینؑ ہیں اور کوئی بھی نہیں

بیعت طلب تھا سبطِ رسالت مآب سے
ذرہ خراج خواہ بنا آفتاب سے

کس طرح کوئی کفر کو ایمان سونپ دے — شیطاں کو کون وہ ہے جو قرآن سونپ دے
فاسق کو کعبہ اس کا نگہبان سونپ دے — فاجر کو دین اپنا مسلمان سونپ دے

یہ حوصلہ کہ ذہن مشتعد خرید سے لے !
بیعت حسین ابنِ علیؓ سے یزید سے لے

یہ دست حق پرست ہو دستِ یزید میں　　اسلام کی شکست ہو دستِ یزید میں
کعبہ کا بند و بست ہو دستِ یزید میں　　اسلام جا کے پست ہو دستِ یزید میں
ان ذلتوں کا اور ہو یارا حسینؓ کو
تھی موت ان کے بدلے گوارا حسینؓ کو

وہ سوچتے تھے آج جو ہوتے یہاں رسولؐ　　کیا ان مطالبات کو کر لیتے وہ قبول
واقف ہے خود یزید بتا یا ہے کیا اصول　　پھر بحث اس نے چھیڑی ہے یہ ہم سے کیا فضول
کیا واقعی نہیں ہیں ٹھکانے اب اس کے ہوش
سمجھا ہے اس نے ہم کو بھی شاید خدا فروش

میں بیچ دوں رسول کی غیرت نہیں نہیں　　قرآں کی اور ختم ہو عظمت نہیں نہیں
ہو داغ دار کعبہ کی حرمت نہیں نہیں　　میں اور کروں یزید سے بیعت نہیں نہیں
سن لے بگوشِ ہوش کہ انکار ہے مجھے
اور ایک بار بھی نہیں سو بار ہے مجھے

اب کیا تھا اک گھٹا سی اٹھی فوج شام کی　　کوندی افق پہ برق سی اک انتقام کی
ہر چند تھی وہ فوج بڑے اختشام کی　　خاطر میں اس کو لائی نہ عظمت امامؑ کی
کثرت سے کیا ڈرے کہ جو وحدت پرست ہو
یہ عزم وہ نہ تھا کہ جو اس طرح پست ہو

دشمن نے اپنے مہرے بچھے لگا دیے — پوچھے یہاں تو وہاں کچھ بتا دیے
مجبور کر چکے ہیں یہ تیور دکھا دیے — پانی پہ بھی لعین سے پہرے بٹھا دیے
کیونکر بھی جائے کسی تو نشاں تک
سیرابیوں کا آسرا نہ ان کو خیال تک

عباسؑ کو تھا ضبط دل دو بجھ گئے — اکبرؑ بھی جنگ میں گر کے سو گئے
قاسم کچھ ایسے طیش میں آ کے ٹھہر گئے — اب بھی مگر حسینؑ تھے جو ضبط کر گئے
سب کو دیا یہ حکم کہ دیکھو پہل نہ ہو
ہو ابتدا ادھر سے تو جنگ جواب دو

تیر اُس طرف سے اور ادھر سے جری چلے — خیبر شکن کا عزم لیے حیدری چلے
شایانِ شاں بھی جن کے لیے سروری چلے — کس شان سے حسینؑ کے یہ عسکری چلے
ایک ایک جائے ہونے لگا رن میں سرخرو
دل کا حسینؑ اپنے نچوڑا کیے لہو

قاسمؑ نے گر کے رن سے پکارا حسینؑ کو — جیسے کسی نے تیر سا مارا حسینؑ کو
ہر چند تھا نہ ضبط کا یارا حسینؑ کو — دیتی تھی بے کسی ہی سہارا حسینؑ کو
غلطاں تھا خاک و خون میں بیٹی کا اب سہاگ
لب پر خدا کا شکر تھا سینہ میں ایک آگ

بھائی کی لاش پر بھی کیا شکر ہی ادا — دل کا ہو جو بھی حال زباں پر تھا مرحبا
عباسؑ میرے بھائی جو کرنا تھا وہ کیا — دیکھو تو مجھ کو تم کو سکینہ کا واسطا

بے شک سلام کے لیے اب مت اٹھاؤ ہاتھ
لیکن خدا کے واسطے چھوڑو نہ میرا ساتھ

ہم شکلِ مصطفےؐ کی اٹھا لائے جا کے لاش — محکم تھا اب بھی عزم نہ تھا اب بھی ارتعاش
وہ مر چکے تھے اور یہ کہتے تھے زندہ باش — ہوتا ہمارا شباب سرافرازیاں ہی کاش
یارب تو جانتا ہے یہ میری کمائی ہے
اور یہ کمائی نام پہ تیرے لٹائی ہے

جب مرتبۂ شہید کا اکبرؑ بھی پا گئے — اصغرؑ ہمک کے باپ کی گودی میں آ گئے
کس خاندان سے ہیں یہ سب کو بتا گئے — ہنس ہنس کے رن میں تیرِ قضا وہ بھی کھا گئے
بولے حسینؑ آخری میرے چمن کا پھول
پروردگار نذر ہے تیرے جو ہو قبول

سب کچھ لٹا کے رن کی طرف اب چلے ہیں شاہ — آراستہ ہے ان کے لیے خود رضا کی راہ
ان کے ثباتِ عزم کا ہے خود خدا گواہ — پہنچانے جا رہی ہے سکینہ کی ایک آہ
خیمہ میں لاڈلی کو بلکتا ہی چھوڑ کے
دنیا سے جا رہے ہیں یہ منہ اپنا موڑ کے

مقتل میں آئے حشر سا آ کر بپا کیا — بچپن میں جو کیا تھا وہ وعدہ وفا کیا
حاصل ہے جو سجود کا سجدہ ادا کیا — شمرِ لعیں نے جسم سے سر کو جدا کیا
خیمہ میں شور اُٹھا کہ سکینہ بھی کھو گئیں
وہ آ کے اپنے باپ کے لاشہ پہ سو گئیں





بڑا سانحہ

چوہدری خلیق الزمان

مکرمی جناب جمیل صاحب :

آپ نے شوکت تھانوی مرحوم پر نقوش کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ شاید آپ بھول گئے کہ میں ساحر کی اس غزل

یہ ہوں کہ اپنے ہاتھ سے لکھنا گناہ ہے ۔۔۔ کے مصداق ہے۔

یوں تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ باپ کے اوصاف اولاد میں بھی نظر آتے ہیں مگر جس طرح شوکت تھانوی اپنے والد بزرگوار سے

مزاح اور معاشرہ جاتی کا ورثہ لے کر آئے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ میرے دوستانہ تعلقات محمد صدیق صاحب ان کے والد مرحوم سے

تھے جن سے اکثر ملاقاتیں ہوتی۔ بڑی نفیس طبیعت والد ان کی صحبت میں چند لمحے ہنسی مذاق میں گذر جاتے تھے۔ جو بے پناہ آمد ان کے مزاح

میں تھی وہ میں نے کسی میں بھی نہیں دیکھی سوائے مولانا محمد علی جوہر اور چودھری محمد علی ردولوی مرحومین جو خود بھی اعلیٰ پایہ کا مذاق رکھتے

تھے محمد صدیق صاحب کا لوہا مانتے تھے۔ محمد صدیق صاحب کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ کچھ لکھنے سے قاصر تھے مگر شوکت تھانوی

نے ان تینوں مرحومین کا رنگ اڑا لیا تھا۔ اور جو دلکشی و نازک خیالی اپنے انداز مزاح میں پیدا کی تھی وہ کب کسی ایک انسان کو

نصیب ہوتی ہے۔

شوکت تھانوی مرحوم اپنے پیچھے بہت سی تصانیف یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں مگر جتنا مواد بے شمار لوگوں کے ذہنوں میں

محفوظ ہے وہ بھی ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ غضب تو یہ تھا کہ نثر سے نثر پھبتی کر جی وہ ایسے شیریں الفاظ و انداز سے

ادا کرتا تھا کہ کسی کو خلش تک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ہر بات میں آمد تھی اور جو کچھ کہہ جاتا تھا، قبل اس کے کہ آدمی سنبھلے

بیسیوں اور پھبتیاں اڑا دیتا تھا اور سب ہنس ہنس کر بیٹھے اور رو گداز انداز ہیں۔

ہندی راج میں دیسیوں کا کیا حشر ہوگا اکثر لوگ سوچتے رہتے ہوں گے، مگر اس نے سودیشی راج لکھ کر ایک دنیا کے انداز کو

چند صفحات میں منتقل کر دیا۔ قاضی جی کا شاہکار اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ خود ہی قاضی جی خود ہی ان کی بیگم اور مسلسل ان کا پروگرام

ریڈیو پاکستان میں نشر ہوتا رہا اور اکثر ناواقف قاضی جی اور ان کی بیگم کو دو مختلف افراد سمجھتے رہے۔*

سچ پوچھئے تو میں اس کی اچانک موت کو ایک بڑا سانحہ سمجھتا ہوں۔ پطرس پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ سالک مرحوم

بھی جا چکے تھے۔ ان کے بعد شوکت کی جدائی قوم و ملک کے لیے ناقابلِ تلافی سانحہ ہے۔

(چوہدری خلیق الزمان)

---

* شوکت صاحب ضرورت پڑنے پر بیگم کا پارٹ بھی ادا کر لیتے تھے

شوکت تھانوی مرحوم

عبدالماجد دریابادی

"شوکت تھانوی" کے ساتھ مرحوم کا لفظ لگنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ گویا اجتماع ضدین! لیکن مالآخر جو ہونا تھا واقع ہو کر رہا! ——— زندگی اور زندہ دلی اگر کبھی مجسم ہو کر گوشت و پوست کی شکل میں سامنے آسکتے۔ تو وہ شاید شوکت تھانوی ہوتے۔ اور یہ اگر کہیں یونانیوں کے دور میں ہوئے ہوتے، تو عجب کیا کہ زندہ دلی و ظرافت کے ایک چھوٹے موٹے دیوتا مان لئے گئے ہوتے! موت کے بس سے اگر کسی کا باہر رہنا ممکن تھا تو ہماری تخیل کی دنیا میں بھی تھے ——— وقت آیا تو جس کے وجود کا جیسے مقصد ہی ہنسنا ہنسانا، لوگوں کا دل خوش کرنا تھا، خود ایک خاک کا ڈھیر تھا۔ دوسروں کے لیے سرمایۂ ماتم سامان حسرت و غم!

پرانوں میں کسی نے انسان کی تعریف کی تھی۔ کہ وہ حیوان ضاحک ہے۔ عجب نہیں کہ انھیں سابقہ وقت کے کسی شوکت تھانوی ہی سے پڑا ہو۔ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ذہانت کا خزانہ آج کل کے محاورہ میں بے پناہ تھا ——— انشا کے لیے مشہور ہے کہ جب بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک لطیفہ روز نیا سنایا کرو۔ تو ہمت جواب دے گئی۔ اور پسینہ آنے لگا ——— یہ فرمائش اگر شوکت سے کی جاتی تو بے تکلف تیار ہو جاتے۔ اور عمر چاہے سو سال کی ہو جاتی۔ یہ ہر روز بلا ناغہ نئی ہی سناتے رہتے! اپنے صیغہ میں، اتنا حاضر دماغ میں نے تو دیکھا نہیں۔ خدا جانے کتنی کتابیں، کتنے رسالے، کتنے مضمون، کتنے خاکے لکھ ڈالے۔ اور تھکن یا ماندگی کا پتہ نہیں۔ ہر وقت آمد ہی آمد۔ آورد جیسے ان کی طبیعت جانتی ہی نہ تھی ——— دوسروں کو جو لکھ لکھ کر بڑی فیاضی اولوالعزمی سے دے دیتے تھے۔ اس کا حساب الگ! اور پھر آخر میں تو کئی سال سے ایک روزنامہ میں ہر روز لطائف کا کالم پوری لطافت کے ساتھ پورا کیا کرتے!

یہ ہنسوڑ پن تمامتر بے مقصد نہ ہوتا۔ بلکہ ریڈیائی تقریریں ہوں، یا اخباری تحریریں سب میں ہلکی پھلکی تعلیم تبلیغ مشرقیت و شرافت کی ہوتی۔ بلکہ کبھی کبھی تو عین دین و اخلاق کی بھی! ——— خود بھی عقیدۃً پختہ مسلمان تھے اور اعمال کی کوتاہیوں پر نادم و شرمسار۔ آخر تھانہ بھون ہی کے تو تھے۔ ؎

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!

[illegible]

جو اعزاز [illegible] ہو [illegible] لکھنے والا ہے۔

سب سے پہلے شاید [illegible] میں آ گئے

پھر اخبار رسالہ [illegible] کے نام سے [illegible] لکھ کر

[illegible] غالباً ۱۹۲۹ء میں [illegible] بعد سے [illegible] ہونے چلے گئے [illegible] پسندی [illegible] ہوئے

جدیدیت کے کسی [illegible]

کے بعد ہی پاکستان منتقل ہو گئے۔ تو لاہور [illegible] ماضی جی کے [illegible]

کی معصومانہ دل لگیوں نے [illegible] تھانوی [illegible] ورنہ اصولی [illegible] لکھنؤ میں [illegible] لڑکپن

اور جوانی کا بیشتر زمانہ یہیں گزرا۔ اس لیے زبان کے لحاظ سے پورے لکھنوی تھے۔ یہاں کے محاورہ [illegible]

پر عبور رکھنے والے۔ [illegible] زبان لکھنے والے [illegible] خدائے آمرزگار [illegible]

سے درگزر فرمائے۔ اور مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ عمر شاید [illegible] باقی ہو۔ مرض آخر کینسر

سا موذی نصیب ہوا۔ اس کی ناقابل بیان اذیتیں خود ہی [illegible] بڑا سبب [illegible] کا بن گئی ہوں گی۔ پھر سفر آخرت

کے لیے ذی الحجہ کے متبرک عشرۂ اول میں بھی متبرک ترین تاریخ یعنی یوم الحج کی [illegible]! یہ تاریخ کیا ملی۔ گویا انھیں بشارت

مغفرت کاملہ کی ہاتھ آ گئی۔ وما یلقٰہا الا ذو حظ عظیم۔

ایک مہذّب ظرافت نگار

قرۃ العین حیدر

مدتیں گزریں جب میں نے "سودیشی ریل" پڑھی تھی۔ مگر اس کے بہت سے جملے آج تک اس طرح یاد ہیں جیسے یہ مضمون ابھی ابھی پڑھ کر ختم کیا ہو ـــــ

بابو جی لائیے ـــــ نہ ہماری بات نہ آپ کی۔ بوہنی کا وقت ہے، لائیے تیرہ آنے ہی دے دیجئے۔ ٹکٹ بابو نے کہا اور ایک پرچے پر کچھ لکھ کر دے دیا۔

"ٹکٹ کہاں ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"ابھی نئے ٹکٹ چھپنے گئے ہیں۔"

ریل چلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

"ارے صاحب جب مسافر پورے ہو جائیں گے تب ہی تو ریل چھوڑیں گے یا ایسے ہی چھوڑ دیں۔"

مسافر کھچا کھچ بھر گئے۔ ریل پھر بھی نہ چلی۔

"لٹو فائرمین کوئلہ لینے شہر گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا جلدی آجائیو ـــــ اسی لیے چھٹنے میں دیر ہو رہی ہے۔" گارڈ صاحب نے فرمایا۔

اتنے میں لٹو فائرمین بھاگتا ہوا آیا۔ "اپنے باپ کا نوکر سمجھ رکھا ہے؟ سوراج کی خوشی میں شہر کی ساری دوکانیں بند ہیں۔ کہیں کوئلہ نہیں ملا۔ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے پانچ سیر لایا ہوں" ـــــ اس نے کوئلے کی بوری غصے سے پٹخ دی۔

یہ جملے ممکن ہے بالکل اسی طرح نہ ہوں۔ میں نے حافظے کی مدد سے لکھ دیے ہیں۔ لیکن کتنے مضامین یا افسانے ایسے ہوں گے بچپن میں پڑھے ہوئے جن کے پورے پیراگراف یاد رہ جائیں؟

—

لکھنؤ میں جب ریڈیو اسٹیشن کھلا تو "بچوں کا پروگرام" بھی شروع ہوا۔ اس پروگرام کے تین کردار تھے۔ آپا جان۔ ان کا ڈ "بدھو" اور تیسرے ایک پوپلی سی آواز والے بزرگ "چاچا"

بچپن ہی سے میری حقیقت تھی اور سانحہ عجیب یہ تھا کہ آپا جان بھی آپا جان ہیں۔ جن سے ان کا اتفاقی تعارف ہو کر ہے (یہ رشتہ بڑا تھا اور شوکت "موج" کا فوٹو بھی تھا جسے وہ "نوٹ شدہ" کہتا تھا) جو جا بجا سے مستقل جلوہ گر رہتا ہے۔ اور آپا "ایک بے حد دلچسپ شخصیات ہیں۔

کچھ عرصے بعد جب بچے اس پروگرام میں شرکت کے لیے بلائے گئے تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یعنی یہ کہ ہم آپا جان، منو اور چاچا کو نہ صرف زندہ جیتا جاگتا اور بولتا دیکھیں گے بلکہ ان کے ساتھ پروگرام میں شرکت کا فخر بھی حاصل کریں گے۔ ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپا جان کا اصل نام تو عرش منیر ہے (جو ایک اسٹاف آرٹسٹ تھیں۔ ان کی بے حد خوبصورت آواز تھی اور برسوں یہ لکھنؤ اسٹیشن کے ڈراموں کی اسٹار "صداکار" رہیں اور بہت عرصے سے کراچی کی ایک دور افتادہ مہاجر بستی میں بڑی تکلیف اور تنگدستی کی زندگی گزار رہی ہیں) بڈھو کے متعلق انکشاف ہوا کہ یہ آپا جان کے نوکر نہیں ہیں بلکہ ریڈیو کے بلند ... ہیں (یہ اب ریڈیو پاکستان کے اعلیٰ افسر ہیں اور کئی برس سے اقوام متحدہ نیویارک میں تعینات ہیں) اور چاچا کے بیچ پتہ چلا کہ ارے یہ تو شوکت تھانوی ہیں۔

آئندہ برسوں میں ہم بچوں کے پروگرام کے زمرے سے نکل کر "بزموں" کے پروگرام میں شامل ہونے لگے اور کچھ تھوڑی بہت "فون تان" بھی شروع کر دی۔ یعنی یہ کہ عورتوں کے پروگرام کے لیے ایک آدھ "اسکٹ" تصنیف فرمایا۔ سکول سے نکل کر کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچے۔ ریڈیو اسٹیشن کی فضا وہی رہی۔ وہی سب جانے پہچانے لوگ اور آوازیں۔ مگر بڑوں کا ماحول۔ ان دنوں لکھنؤ ریڈیو کے ڈرامے فلمانے کی چیز ہوتے تھے اور لاہور ریڈیو سے دوستانہ مقابلہ اور چشمک رہتی تھی کیونکہ وہ بھی لاہور والوں کو بھی اپنے فنکاروں پر بہت ناز تھا۔ شاید اسی دوران میں شوکت تھانوی کسی فلم کمپنی میں مکالمے لکھنے کے لیے لاہور چلے گئے اور ایک عرصے بعد لکھنؤ واپس آ گئے۔

غالباً اگست ۱۹۴۷ء کی ایک شام ریڈیو اسٹیشن اجڑا اجڑا سا لگ رہا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشن نئے نئے ریڈیو پاکستان میں شامل ہو جانے کی وجہ سے تازہ انڈین لسنر بلکہ بے حد دبلا اور مدقوق سا معلوم ہو رہا تھا۔ لکھنؤ سے سعیدہ بانو اور آل حسن پہلے ہی تبدیل ہو کر دہلی جا چکے تھے۔ بیشتر مسلمان اراکین لاہور، پشاور، ڈھاکہ اور کراچی روانہ ہو گئے تھے۔ گوہر سلطان، حفیظ بیگم اور صفیہ حبیب اللہ انگلستان جا چکی تھیں۔ وہ پرانا ماحول راتوں رات بدل سا گیا تھا۔ عرش منیر نے بتایا کہ جگل کشور مہرہ، شیخ احمد حسن ... میں تبدیل ہو کر پاکستان چلے گئے۔ شمشیر سنگھ نرولا بھی (شاید یہی نام تھا) سیم شاہد ہو کر لاہور گئے۔ شوکت صاحب بھی لاہور میں ہیں اور عنقریب اپنے گھر والوں کو وہاں بلانے والے ہیں۔

اس کے فوراً بعد ہی لاہور سے "پاکستان ہمارا ہے" کا پروگرام شروع ہو گیا جسے امتیاز علی تاج اور شوکت صاحب مرتب کرتے تھے۔ اس کے بعد "قاضی جی" کا سلسلہ شروع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔

—

لاہور ریڈیو اسٹیشن پر شوکت صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہی۔ ۱۹۴۸ء میں ایک مرتبہ کرشنا آل حسن میرے ساتھ ریڈیو اسٹیشن گئی کیونکہ وہ آل حسن سے شوکت صاحب سے پرانی دوستی کی وجہ سے مرحوم سے خاص طور پر ملنا چاہتی تھی۔

شوکت صاحب ریڈیو اسٹیشن کے پیلو والے کمرے میں اپنی میز پر بیٹھے تھے۔ کرشنا سے ان کی قربت خوب ہوتے ہیں — میں نے کہا: "شوکت صاحب آپ کا وہ ترکہ اب تک نہیں ملا، ہم لوگ بے تابی سے اس کے منتظر ہیں۔"

قصہ یہ تھا کہ چند برس قبل صدیق احمد صدیقی نے بتلایا تھا کہ شوکت صاحب کے ساتھ ایک بڑی ڈرامائی بات ہوئی ہے، وہ یہ کہ ان کے ایک چچا انگلستان میں بس گئے تھے اور مشہور ہنٹلے اینڈ پامر بسکٹ کمپنی کے ڈائریکٹر یا مالک یا جو کچھ بھی، بہرحال بہت سخت کروڑپتی ہو گئے تھے۔ انھوں نے لاولد وہاں انتقال کیا اور شوکت تھانوی ان کے واحد قانونی وارث ہیں اور عنقریب یہ اپنے چچا کا ورثہ حاصل کرنے کے لیے ولایت آنے والے ہیں۔ یہ واقعی اکسائٹنگ بات تھی۔ ظاہر ہے اب شوکت تھانوی مع انگلستان کے ایک کروڑپتی بن جائیں گے تو کلاریجز یا ڈورچیسٹر میں رہا کریں گے۔ ایک آدھ قلعہ وغیرہ خرید لیں گے اور ایک عدد رولس رائس تو لامحالہ رکھیں گے ہی۔ تو ہم سب پر کیا لازم آیا — ؟ ہم سب پر یہ لازم آیا کہ ہم لوگ موصوف کو ابھی سے "کلٹی ویٹ" شروع کر دیں اور اہلِ ولایت پر ثابت کریں کہ شوکت تھانوی مدظلہٗ کے نہایت قریبی رشتے دار ہیں، تاکہ موصوف کے ڈورچیسٹر ہوٹل اور رولس رائس کار وغیرہ سے ہم صوفیا کو بھی فیض حاصل ہو سکے۔

چنانچہ میں نے شوکت صاحب سے پوچھا کہ وہ ترکہ آپ کو اب تک کیوں نہیں ملا۔ ہم لوگ آخر کب تک انتظار کریں؟ واقعی میں نے کہا — ہم مقبول انگریزی ناولوں میں پڑھا کرتے تھے کہ فلاں کا چچا آسٹریلیا میں بے اندازہ دولت چھوڑ کر مرا۔ یا افریقہ میں ہیرے کی کانیں، اپنے کسی دور افتادہ اور گمنام بھتیجے کے نام منتقل کر کے دوسری دنیا کو سدھارا۔ آپ کے چچا نے یہ روایت سچ کر دکھائی۔

شوکت صاحب نے جواب دیا کہ بھئی، اس میں ایک شاخسانہ نکل آیا۔ اس ترکے کی لندن میں ایک انگریز خاتون دعویدار پیدا ہو گئی ہیں اور انھوں نے وصیت کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ اب میرے پاس اتنا پیسہ کہاں ہے کہ میں اتنا مہنگا مقدمہ لڑتا پھروں لہٰذا میں نے اس کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

اسی وقت ن۔ م۔ راشد آ گئے۔ جو ان دنوں نیویارک میں تعینات تھے اور رخصت پر پاکستان آئے ہوئے تھے۔ اس سے قبل میں راشد صاحب سے نہیں ملی تھی۔ شوکت صاحب نے بڑی برجستگی سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ ریڈیو کی بیٹی ہیں۔"

اور کرشنا کو متعارف کیا۔ "یہ ریڈیو کی بہو ہیں۔" (یعنی آل حسن کے رشتے سے وہ ریڈیو کی بہو تھی!)

کل کی بات ہے کہ صدیق احمد صدیقی، شوکت صاحب کے کروڑپتی ہونے کی بشارت دے رہے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن پر محمود نظامی نہایت جوش و خروش اور نفاست سے مارچ کا سالانہ جشنِ موسیقی منعقد کر رہے ہیں اور شوکت صاحب باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔ اے بھئی —— آج نہ صدیق احمد صدیقی ہیں نہ محمود نظامی نہ شوکت تھانوی —— کمال ہے واقعی ——

مجاز کے لطیفوں جتنے تو نہیں مگر شوکت صاحب کے بھی بہت سے لطائف و ظرائف مشہور ہیں کہ کیسے انھوں نے انتہائی رنج و الم کے موقعے پر اپنے ایک جملے سے روتوں کو ہنسا دیا۔ یا کسی بے ڈھب اور نازک صورتِ حال کو ایک برجستہ فقرے اور بذلہ سنجی کے

ے خوبصورتی سے نبھاں پیدا نہیں ہوتی۔ تحریر [illegible] مزاح [illegible] شوکت تھانوی [illegible] ادیب [illegible] کی صورت اختیار کر لیتی ہے
ہمارے مزاح نگاروں کے برعکس شوکت صاحب [illegible] سے [illegible] جہاں تک مزاح کا
ہونی غیر معمولی [illegible] واقعاتی [illegible] حالات میں تبدیلی ہو جائے
مشکل ہے۔ محض یہ بات کہ وہ [illegible] ان کے [illegible] ادیب کو قریب
سے ادب جان پیدا اور ملک [illegible] کا اضافہ ہونا بھی ضروری ہے۔

شوکت تھانوی بے حد پڑھے جاتے تھے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے [illegible] ان کی ہر تحریر [illegible] ہوتا تو وقت [illegible] یہ مقبولیت انھیں دونوں ملکوں میں حاصل تھی۔ [illegible] ہندوستان میں ان کی [illegible] کا ہندی میں ترجمہ ہوتا ہے اور وہ ہندی والوں کے حلقے میں بھی بہت مقبول تھے۔ انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ ناول، افسانے، ڈرامے، خاکے، [illegible] مزاحیہ نظم [illegible] لکھتے تھے۔ ایک پیشے سے [illegible] ادیب کو اخبار نویسی کی مانند [illegible] لکھنا [illegible] جب عادت ثانیہ اور میکانکی عمل بن جاتا ہے۔

مگر اس زود نویسی کے باوجود شوکت صاحب کی زیادہ تر تحریریں تر وقتی موضوعات پر لکھی گئی تھیں۔ [illegible] کی وجہ سے پڑھنے کے لائق ہوتی تھیں۔ سوائے روزنامہ جنگ کے اس کالم کے جو انھوں نے مجید لاہوری کے انتقال کے بعد لکھنا شروع کیا تھا اور جس میں آمد کے بجائے محض آورد ہوتی تھی۔

"عظیم فنکار"، "عظیم ناول نگار"، "عظیم شاعر"، "عظیم مزاح نگار" ۔۔۔ میں ان عظیم عظیم کو ہمیشہ شک و شبہے کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ عظمت کا فیصلہ صرف تاریخ کے ہاتھ میں ہے اور یہ سوال بہت بعد کا ہے کہ ادب کی تاریخ کس لکھنے والے کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرے گی۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ برنارڈ شا مرنے کے فوراً بعد بھلا دیئے گئے۔ دور کیوں جایئے خود ہمارے یہاں طنز کے سلسلے میں جوش و خروش اب مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ بہت سے اچھے ادیب اپنے دور کے بعد مختلف وجوہ کی بنا پر محض "DATED" ہو کر رہ جاتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کا آج وہ غلغلہ نہیں رہا جو آج سے تیس سال قبل "نیرنگ خیال" کے دور میں تھا۔ وقت اور تاریخ دونوں انتہائی ظالم اور ستم پیشہ ہیں۔ وقت کوئی لحاظ نہیں رکھتا۔ نہ وہ خود ستائی، گروہ بندی، من ترا حاجی بگویم، "منی مثل بنام پہلی مثل"، سنسنی خیزی، یا "فقرہ بازی" کے چکر میں آتا ہے۔ آپ اپنے فن کے متعلق خود کتنے ہی مقالے لکھ بیٹھیے، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پچاس برس کے الٹ پھیر کے بعد معلوم ہو گا کہ کس ادیب کی تخلیقات کا کتنا حصہ باقی بچ گیا اور کتنا زمانہ برد ہو گیا۔ ادبی رجحانوں، تنقید کی ٹکسالوں، نظریاتی بحثوں اور وقتی مقبولیت سے بالاتر کوئی چیز ہے۔ ادیب کی اپنی صلاحیت اس کا فنی اور نظریاتی خلوص اور ARTISTIC CONSISTENCY جو اسے زندہ رکھتی ہے اور اس کے لیے وقت کی کسوٹی درکار ہے۔

ادب کی دنیا بڑی انوکھی دنیا ہے۔ میرے نزدیک سید ابو تمیم فریدآبادی ایک بہت اچھے مزاح نگار ہیں۔ لیکن میں نے کسی تذکرے یا جائزے میں ان کا نام نہیں دیکھا۔ بلکہ بہت سے لوگ تو ان کی تحریروں ہی سے ناواقف ہوں گے۔ عظیم بیگ چغتائی بہت بڑے مزاح نگار تھے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا آج وہ اتنے مقبول نہیں رہے اور بعض اوقات بعض گمنام ادبی شخصیتوں کو

"ڈسکور" کر لیا جاتا ہے اور فراموش شدہ فنکاروں کی "تجدید" بھی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ مرزا رسوا اور نظیر اکبر آبادی کے ساتھ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سی چیزیں جن کو ہم ادب عالیہ کہہ کر خوش ہو بیٹھتے ہیں۔ ان کی محض ایک دستاویزی حیثیت ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آج سے پہلے کا بیشتر نثری اور افسانوی ادب خاصا کثیف تھا۔ لیکن شوکت تھانوی نے "سودیشی ریل" اسی زمانے میں لکھی اور پطرس کے مضامین بھی لکھے گئے۔ لہٰذا ہم قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کسی ایک دور میں صرف دوسرے درجے کا ادب تخلیق کیا گیا۔ ادب میں "ترقی یافتہ" اور "درخشندہ" زمانوں یا "تنزل پذیر" اور "کمزور" زمانوں سے بڑے ادیب کا کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنا کام کیے چلا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے ادبی رواج، معاشرے اور قارئین کے تبدیل شدہ تعصبات، مزاج اور رجحانات، یا بعض اوقات چند نقادوں کی نظر کرم اور مبالغہ آمیز تعریف یا نقادوں کا عتاب، یا لاعلمی یا جہالت، تعصب یا بے نیازی، یہ ساری چیزیں مل کر ایک مصنف کے لیے کسی ایک ادبی شخصیت کو یا آسمان پر چڑھا دیتی ہیں یا پاتال میں گرا دیتی ہیں۔ مگر بات وہی رہتی ہے۔ اگر اس لکھنے والے میں کوئی "چیز" تھی تو وہ وقت گزر جانے پر بھی زندہ رہے گا اور بھلا دیئے جانے کے بعد پھر یاد کیا جائے گا۔

لہٰذا میں شوکت صاحب کے متعلق یہ حکم لگانے کا کوئی حق نہیں رکھتی کہ وہ کس قدر عظیم ظرافت نگار تھے اور کتنے بلند پایہ فنکار تھے اور ان کا مزاحیہ ادب زندگی کی کن اعلیٰ ترین قدروں کا حامل تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں بحیثیت ایک قاری کے اتنا جانتی ہوں کہ زندگی کا بھرپور احساس اور ایک لطیف اور مہذب ظرافت ان کی تحریروں میں جاری و ساری تھی۔ ایک اچھے ظرافت نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ روزمرہ کے معمولی واقعات میں، زندگی کے بے تکے پن اور بدصورتی اور لطیفے میں، صورت حالات کی شدید نامعقولیت میں ملاحت کا رخ دیکھے اور اس پر ہنس اور ہنسا سکے۔ اچھا مزاح نگار زور سے قہقہہ نہیں لگاتا، صرف مسکراتا رہتا ہے۔ وہ چٹکلوں اور سوقیانہ باتوں یا محض ضلع جگت یا چند بندھے ٹکے جملوں یا چند STOCK مسخرے کرداروں کی تکرار سے مزاح پیدا نہیں کرتا۔ وہ زندگی کی گہرائیوں میں اتر کر زندگی کا مضحک پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ اسی وجہ سے شوکت تھانوی کی تحریروں میں طنز کی تلخی یا خاص مسخرے پن کے ابتذال کے بجائے محض مزاح کی شگفتگی ملتی ہے۔ یہ فرحت بخش ظرافت نکتہ سنجی، خوش طبعی، ذہین زندہ دلی، پُر مذاق اور لطیف فقروں اور الفاظ کے نفیس اور مہذب استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور شوکت تھانوی ہمیشہ ایک مہذب ظرافت نگار رہے۔ یہی تہذیب اور متانت ہمیں رشید احمد صدیقی کے یہاں ایک بہت اونچی اور فلسفیانہ سطح پر ملتی ہے۔

شوکت تھانوی اپنی زندگی میں ایک طویل عرصے تک اپنے الفاظ اور اپنی آواز کے ذریعے لاکھوں انسانوں کو ہنساتے رہے اور اس روتی بسورتی اعصاب زدہ دنیا میں اگر کوئی انسان اپنی فطری شگفتگی کے ذریعے دوسروں کو تھوڑی دیر کے لیے محظوظ اور بشاش کر سکے تو ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

کوئی دوسرے شوکت تھانوی اب دنیا میں نہیں آئیں گے۔

میرا رفیق

قدرت اللہ شہاب

شوکت تھانوی کے ساتھ مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ایک عجیب جھجکاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ جس باغ و بہار شخصیت نے اپنی تحریر اور گفتار سے لاکھوں کا دل خوش کیا ہو وہ یوں دفعتاً موت کی آغوش میں سو جائے گا، اس کا کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا۔ شوکت تھانوی نے بے شمار لوگوں کو ہنسایا ہے لیکن ان کے اپنے دکھ اندر ہی اندر ناسور بنتے گئے۔ یہاں تک کہ اس ناسور نے چپکے چپکے گھن کی طرح اُن کی زندگی کو کھا لیا۔ ایسے بندوں کی بخشش کا یہی ایک نشان ہے کہ ان کی موت پر ایک زمانہ سوگوار ہوتا ہے۔ آج بھی اُردو داں طبقے کا ہر فرد شوکت تھانوی کی وفات پر اشک بار ہے۔ شوکت کے اُٹھ جانے سے اُردو ادب کی محفل ویران ہو گئی ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ اپنے ایک محترم اور بزرگ ممبر سے محروم ہو گیا ہے۔ اور ذاتی طور پر میرا ایک عزیز دوست اور رفیق مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی روح کو جنت میں اُسی طرح ہنستا رکھے جس طرح اس دنیا میں اُس نے لاکھوں ہزاروں انسانوں کو اپنی شگفتہ تحریروں اور تقریروں سے ہنسایا——
آمین

باغ و بہار شخصیت

حفیظ جالندھری

شوکت سے مل کر ہنستے ہم
یہ کیا خبر تھی رونا پڑے گا

شوکت تھانوی کو آج اُردو کی ساری دنیائے ادب رو رہی ہے۔ شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ضاحک و ظریف، شوکت اخبارات و رسائل و مدیر، صحیفہ نویس، ہیئت گو شوکت بزمِ ادب شعر و فن کی ایک باغ و بہار شخصیت ہم سے جسمانی طور پر رخصت ہو گئی ہے۔ وہ شخصیت جو زندگی کے اذیت دہ پھوڑوں پر اپنی خوش گفتاری کا مرہم رکھا کرتی تھی۔ آج شوکت جن کو ہنسایا کرتے تھے، وہ سب روتے رہ گئے ہیں۔ شوکت کے رخصت ہو جانے کے بعد بزمِ یاراں کو اب سارا عالم کچھ عجیب سا نظر آ رہا ہے ؎

کس قدر آباد ہے دنیائے دوں — مردہ وافسردہ و خوار و زبوں
خاک کا پیوند ہونے سے پہلے — صورتِ اشکِ ندامت سرنگوں

اور یہ بالکل سچ ہے۔ صورتِ حال اب یہی ہے کیونکہ

اہلِ دل کی زندگی ہے زندگی — روح کی تابندگی ہے زندگی
ہو گئے رخصت جہاں نورد و سرود — کچھ نہیں شرمندگی ہے زندگی

شوکت تھانوی ایک کثیر الاحباب شخصیت تھے، پاکستان میں بھی اور بھارت میں بھی اُن کے بے شمار ذاتی دوست موجود ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے تاکہ وہ شوکت کے لطائف سے خود بھی مزید لطف حاصل کرتے رہیں اور دوسروں کو بھی ایسے ظرائف سے باخبر کریں جو ابھی تک ذاتی دوستوں ہی کو معلوم ہیں۔

ان کی تحریروں سے شگفتگی حاصل کرنے والے قدردان یا ریڈیو اور مشاعروں میں اُن کی زبان سے بذلہ کے موتی چننے والے ان گنت ہیں۔ اپنے ذوق کے مطابق شوکت کی رحلت پر سب ماتم کناں ہیں۔ سب اس جدائی سے متاثر ہیں۔ سب اپنے ذہن کی تسکین کے معاملے میں طنز و مزاح نگاری اور خندہ گفتاری کی فضا میں ایسا خلا دیکھ رہے ہیں جو شوکت کے بعد آسانی سے پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔

ذاتی دوست احباب سے اُن کے مراسم انتہائی مخلصانہ بھی تھے اور شرارتِ معصومانہ سے بھی بندھے ہوئے تھے۔ شوکت کی زبانی لطیفے اور شرارتیں جو سب دوستوں کو زندہ دلی عطا کرتی تھیں — اب موت نے ان کو قبر میں دفن کر دیا ہے، شوکت کے ساتھ ہی — !

پھولوں کی طرح کھلی حیات کے ہر قدم پر ظرافت کے [illegible] سے فرد یا سب سے قوم
[illegible] کے لیے شوکت کے پاس [illegible] [illegible]
شوکت کی بذلہ سنجی حاضر جوابی [illegible]
[illegible] شاید کسی کو حاصل ہو [illegible] نئے مقام [illegible]
[illegible] جس مقام اور جس دور [illegible]
[illegible] اور حماقتیں بھی" اُن کے ذہن پر [illegible] نئے مقام اور نئے دور [illegible] حماقتوں کو کیا
[illegible] دونوں کو [illegible] [illegible]
سمجھتے ہوئے چلتے پھرتے لکھتے رہتے [illegible] ہر مقام میں ایک خاص [illegible]
[illegible] ہوتا تھا۔ دوست ہو یا دشمن [illegible]
سے اور فقرہ بھی کیسا کہ بایدو شاید!
مجھے تو کچھ ایسا نظر آیا کہ اُن کے صدر و سینہ میں کوئی مقناطیس ہے جو لطیفہ ہو یا کوئی شرارت [illegible] مقناطیس کی آنچ میں تیار ہوتی رہتی ہے۔ یہ مقناطیس بڑی بزم ہو یا محض ایک ہی دوست کے ساتھ [illegible] کسی نہ کسی زبان سے یہ مقناطیس ایسی [illegible] کھلوا دیتا تھا۔ کوئی ایسی حرکت یہ مقناطیس دوسروں سے سرزد کرا دیتا۔ جس پر فوراً وہ چھپا ہوا لطیفہ شوکت کی زبان سے [illegible] کر فضا میں قہقہوں کا لالہ زار سجا دیتا تھا۔ لطیفے کے پیچھے غور و فکر یا اُمڈی ہوئی شرارت کے لیے کسی مقام اور مرحلے کی ضرورت شوکت کو نہیں تھی۔ جو بات دوسروں سے غائب رہنا چاہتی، شوکت کے لیے حاضر ملتی۔ اُن کے لطیفے یا شرارت میں بھی کوئی زہر۔ کبھی کسی کی دل شکنی یا دل آزاری نہ موجود تھی نہ شوکت کا مقصود!

شوکت کی ظرافت زندہ دلی تھی۔ یہ دل لگی ہوتی تھی۔ دل کی لگی نہیں۔ لگاؤ تھا لاگ نہ تھی ——— اس لیے جس پر وہ فقرہ سناتا تھا، وہ روتے روتے قہقہے لگا کر ہنستا تھا۔ اس کے ذہن سے نکلے ہوئے الفاظ کے ہر ہر حرف کو لکھتے ہوئے صدف سے موتی ملتے تھے۔ اس کی تراوشِ بذلہ سے سوکھے ہوئے چمن لہکتے تھے۔ افسوس آج وہ ذہن بند ہو گیا ہے! آہ آج وہ اپنی رنگینیِ بیان سے زبان کی لذت کو بیدار کرنے والا خود ہی سو گیا ہے!

جو قیامت اٹھائے پھرتے تھے
سو رہے ہیں وہ لمبیاں تانے

شوکت پرانے دور اور پرانے مقام سے چلتا ہوا جس نئے مقام اور جس نئے دور میں آ گیا تھا، ہماری طرح وہ پرانی یادوں پر بسورتا نہیں تھا۔ کیونکہ اس دور کی حماقتوں پر ہنسنے ہنسانے کا ملکہ اسے ودیعت تھا۔ نئے ماحول کی حماقتوں اور پرانے دور کی حماقتوں کو ہم آہنگ کر لینے اور پھر دونوں تصویروں کو ایک تصویر میں بھر دینے کی لیاقت شوکت میں جس ڈھنگ سے نظر آئی وہ دوسرے میں نہیں پائی گئی۔ رنگ برنگ قہقہوں کو ایک ہی جنبشِ قلم سے ہر پس منظر کے ساتھ فضائے عالم پر ثبت کر دینا شوکت کے لیے آسان تھا۔ دوسروں کے لیے محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

دل جانتے ہیں کہ جو لوگ دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ وہ خود لازماً خوش و خرم بھی ہوں گے۔ تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ میں شوکت کے خاص الخاص حلقۂ احباب میں سے نہیں ہوں۔ خاص الخاص احباب تو واقعی ان کو بہت زیادہ جانتے ہوں گے۔ تاہم میری بھی چھتیس برس سے اچھی خاصی شناسائی کہئے یا دوستی پر محمول کیجئے۔ شوکت سے گہری محبت رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کے قلب پر بہت سے ایسے چھپے ناسور تھے، زندگی کی ذمہ داریوں کے دو پاٹ جن کو پیسے ڈال رہے تھے۔ تاہم وہ باتوں کو بلند مرتبہ دوستوں اور عہدہ افسروں کے ان کھانے پر چلائے جاتے۔ عام مشاعروں پر پے بہ پے بلوائے جاتے تھے اور رات رات بھر جاگتے رہتے۔ مشاعروں سے معاوضہ ضرور حاصل ہوتا ہوگی۔ لیکن چھینٹوں سے گزر اوقات بمشکل ہوتی تھی۔

جامہ زیب آدمی۔ وضعداری کا رسیا۔ اپنے زخم ہائے داخلی کو چھپاتا رہا اور خارجی دنیا کو اپنے انداز گفتار سے پُر بہار بناتا رہا۔۔ معاش کے لیے شوکت کی محنت کا اندازہ شاید آپ نہیں کر سکیں گے۔ جس پر ایسی ہی بیت رہی ہو۔ اس کے سوا کون جانتا ہے کہ یہ ہنسانے والی مشین اپنے ایندھن کے لیے کیا کیا جتن کر رہی ہے۔ اس نے بارہا مجھے، میرے استفسار پر، اشک آلود آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے آپ بیتی سنائی تو مزاح اور ظرافت کے پیچھے شوکت کی اصل خونچکاں صورت نظر آئی ——— !

جنگ کے زمانے میں شوکت نے میرے اسٹاف میں صوبہ متحدہ کے اندر تبلیغ مقاصد جنگ کے سلسلے میں بطور ڈائرکٹر اہتمام بھی کام کیا تھا اور میں نے لکھنؤ میں اس کی قیام گاہ پر بھی اس کی میزبانی کے چند مرتبہ طور طریق دیکھے ——— مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔ لیکن میں تحسین کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے پہلے فرزندوں کی تربیت اور پھر ان کو برسر روزگار بنانے میں کس قدر پدرانہ شفقت اور ذمہ داری اختیار کئے رکھی اور اپنی پہلی بیگم کو آخری دم تک باقاعدہ وہ جس قدر روپیہ مہیا کرتے تھے، وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ الحمدللہ ان کے دو فرزند اچھا خاصا کما رہے ہیں تیسرا تعلیم کے آخری مدارج طے کر لینے کے قریب ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ مرحوم شوکت کے احساس ذمہ داری نے پہلی بیوی اور بچوں کے سلسلے میں وہ سب کچھ کیا ہے۔ جو ایک شریف ترین مسلمان کو کرنا چاہیئے تھا۔ یہ بچے سعید اور سعادت مند ہیں۔ ماشاءاللہ برسر روزگار ہیں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی کریں۔ وہ اپنی والدہ کو تو بے نیاز کر ہی چکے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی دوسری والدہ کو بھی نہ بھولیں گے۔

آہ ——— دوسری بیوی جو شوکت کے بڑھاپے کا سہارا تھی۔ جس کو میں نے ایک لمحہ بھی شوکت کی خدمت سے غافل نہیں دیکھا اور اس بیوی سے تین بچیاں ——— :

شوکت کو بیماری کے عالم میں جس نے بھی دیکھا ہے، وہ شاہد عادل ہے کہ اپنی موت پر تو وہ ہنستا ہی تھا۔ بلکہ شاید عزرائیل کو بھی کوئی فقرہ چست کئے بغیر اس نے نہ چھوڑا ہوگا۔ لیکن وہ روتا تھا۔ روتا کیوں تھا۔ اس لیے کہ اس بیوی کی بیچارگی اور ان تین بچیوں کی یتیمی اس کو کھائے جا رہی تھی۔ میں نے اسی لیے اخبار جنگ کے ذریعے پاکستان کے اہل دل سے استدعا کی تھی۔ مگر اللہ کریم جو سننے والا ہے اس نے سنی تو، لیکن بندے کے لیے بہتر کیا ہے جاننے والا بھی تو وہی ہے ——— !

میر خلیل اور میر جمیل تک میری رسائی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ دونوں بھائی جان و مال ایمان کے ساتھ کوشاں رہے اور اب یتیم بیٹیوں اور ناچار بیوہ کے سلسلہ میں بھی جنگ کے ادارے کے ساتھ شوکت سے وابستگی سے بھی بہت زیادہ شوکت کی شخصیت اور

ان مصنفوں نے جس طرح اپنے فن کا تجدد و اکتشاف کیا کوئی مرجع نہیں قرار دیے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ دریا میں طغیانی ہے کہ بہ مجرنے
درجہ بدرجہ بہت بہتر لوگوں نے بالاتر ملاکے ذریعے سے ہی تمدن والی شوکت کی زنجیریں ہوتی ہیں اور ترقی سے جھلکتی ہیں
سے بھی اسی طرح چلتا ہے وہ حرکت کی لذت پر دوڑ رہے ہیں جن ستاروں کو دیکھنے کے لیے نہیں جوڑیں گے
باقی رہ گئے ہم تو ہم حرکت کی خوشبو قریب سے اور لذت لیے رہے ان کے تازہ بتازہ لطافت و ذوق
سے تو محروم ہو گئے لیکن یہی چاہتا کہ ان کی شائع شدہ کتابوں کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کے لیے سعی بلیغ کریں اور جو
ہم میں ایسی کتابی صورت اختیار نہیں کر سکے ان کو ان کی صورت میں محفوظ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ایک قوم کی حالت تو یہی ہے
ونہ ہے

کیسی کیا جانیں نہیں رہتے وہ جو پرانے — اسی لوازم میں کہ گزر سر کھیتے ہیں

شوکت تھانوی کی یاد میں

فیض احمد فیض

شوکت تھانوی مرحوم یکایک محفل سے اُٹھ گئے۔ اس ہمدمِ دیرینہ کی جدائی پر احباب کے دل پر جو گزری سو گزری لیکن ذاتی غم سے زیادہ اس بات کا دُکھ ہے کہ محفلِ وطن میں جہاں رُلانے کو بہت کچھ ہے۔ لیکن ہنسانے کو شوکت تھانوی تھے وہ ان کی جگہ اب کون سنبھالے گا۔ برسوں سے اُن کا نام تکیۂ کلام کی صورت گھر گھر وردِ زبان تھا۔ یہ فقرہ، وہ لطیفہ وہ نقل۔ ہزار جگہ ہزار بات شوکت تھانوی سے روایت تھی۔ پھر اُن کے لطفِ صحبت پر مستزاد، آنکھ اوجھل یاد سے دُور، دو بیسیوں محفلیں۔ بیسیوں صورتیں اور طرح طرح کے بزرگ بھی تھے۔ جنھیں مرحوم اپنی شعبدہ بازی سے دم بھر کو زندہ کر لیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کا کوئی مشاعرہ۔ پٹیالے کے کسی رئیس کی بیٹھک۔ دہلی میں کسی حکیم کا مطب۔ یہ ثاقب لکھنوی ہیں۔ یہ نوح ناروی ہیں۔ یہ احسن مارہروی ہیں۔ یہ فلاں حکیم صاحب ہیں۔ اور یہ فلاں نواب صاحب۔ شوکت مرحوم اپنے ممدوح کی نقل نہیں اتارتے تھے۔ خود وہی بن جاتے تھے۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ جس صحبت کا تذکرہ کرتے اس کی فضا اُس کا سماں، اس کا پورا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا یوں تھا کہ اُن کے دم سے صرف شوکت ہی ایک عالم زندہ تھا۔ اب جو وہ رخصت ہوئے تو ان اَن گنت محفلوں کا لطف بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن یہ تو ان کے گوناگوں کمالات کا بہت چھوٹا سا جزو تھا۔ اُن کی ذہین اور بوقلموں شخصیت نے جولانیٔ طبع کے لیے جو بھی میدان منتخب کیا اس میں یکساں جوہر دکھائے۔ نظم، نثر، تمثیل، افسانہ، شخصیت نگاری، نامہ نویسی، ریڈیو، صحافت، بذلہ سنجی، بدیہہ گوئی اُن کی طبع زبان اور قلم یکساں۔ ہر میدان میں یکساں طراری سے رواں رہتے۔ اُن کی ظرافت میں تکلف اور آورد کو دخل نہ تھا بے تکلف اور بے تکان، جیسے بولتے ویسے لکھتے۔ نہ گفتار میں اُن کی طبع کو غیر حاضر پایا نہ تحریر میں کبھی انھیں قلم پہ زور دیتے دیکھا اور اس مشاقی کا راز ریاضت نہ تھی، ان کی خداداد ذہانت تھی جو اکتساب کی محتاج نہیں ہوتی۔

شوکت مرحوم اپنی ہمصو دنیا کے ان محسنوں میں سے تھے جنھیں زندگی کی آسائشوں میں بہت کم حصہ ملا لیکن وہ اپنے سوا سب کے لیے فرحت اور انبساط کے اسباب بہم کرتے رہے۔ اب جو وہ نہیں ہیں تو اپنی محرومی پر رنج ہے کہ ان کی باغ و بہار صحبت اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گی اور اس سے زیادہ رنج ان کی محرومی پر ہے جو اس لطف سے کبھی بھی آشنا نہ ہو سکیں گے۔

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

گوہرِ مخزنِ ظرافت

کنہیا لال کپور

شوکت تھانوی، جو جب تک بقیدِ حیات رہے، عوام اُن سے خوش اور نقاد ناراض رہے۔ مؤخر الذکر کو مرحوم سے طرح طرح کی شکایتیں تھیں۔ مثلاً شوکت تھانوی شوکت تھانوی کیوں تھے؟ رشید احمد صدیقی، پطرس، عظیم بیگ چغتائی یا فرحت اللہ بیگ کیوں نہیں تھے؟ شوکت تھانوی عوام میں ہر دلعزیز کیوں تھے؟ شوکت مزاح نگار ہونے کے علاوہ فلسفی کیوں نہیں تھے؟ شوکت بسیار نویس کیوں تھے؟ شوکت اپنے عہد کے نباض کیوں نہیں تھے؟ بلاشک یہ سب خامیاں شوکت میں تھیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو وہ ان میں سے کسی خامی کے لیے مطلقاً ذمہ دار نہیں تھے۔ اگر وہ شوکت تھانوی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے۔ تو یہ امر اُن کی خود اعتمادی اور دیانتداری پر دلالت کرتا ہے۔ آخر یہ کہاں کی تنقید ہے کہ کسی مزاح نگار سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنی انفرادیت کو ترک کر کے اپنے کو دوسروں میں مدغم کر دے۔

خدا کا شکر ہے کہ قریب قریب سب نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ شوکت عوام میں حد درجہ مقبول تھے۔ وہ شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں یا دیدہ و دانستہ اس سے آنکھیں چرانا چاہتے ہیں کہ شوکت خواص میں بھی اتنے ہی ہر دلعزیز تھے۔ کیونکہ بیسیوں علما اور ادبا بھی اُن کے اتنے ہی مداح تھے جتنے کہ عوام۔ اب یہ اور بات ہے کہ اُن کی ہر دلعزیزی کا خمیازہ اُن کے مداحوں کو اٹھانا پڑتا تھا۔ وہ جب بھی شوکت کی تازہ تصنیف خریدتے۔ اُن کا کوئی نہ کوئی دوست اُسے اٹھا کر لے جاتا۔ مجھے اس بات کا ذاتی تجربہ ہے کہ شوکت کی تصانیف دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا۔ کہ میری میز پر مشہور ادبا کی تازہ ترین تصانیف پڑی ہیں اُن میں سے ایک کا مصنف شوکت بھی ہے۔ میرے احباب جن میں سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں کسی اور کتاب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن شوکت کی تازہ تخلیق پر اس طرح جھپٹتے ہیں جیسے بھوکا آدمی خوانِ نعمت پر۔ اور اُن کی اس حرکت کو دیکھ کر مجھے اُن پر غصہ اور شوکت پر پیار آنے لگتا ہے۔ اور اسی وقت فوراً مجھے ایک بھولا بسرا واقعہ یاد آ جاتا ہے۔

یہ شاید ۱۹۴۵ء کی بات ہے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور میں کافی ہاؤس میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ ایک مشہور ناشر جو اپنی بھاری بھرکم جسامت کی وجہ سے مولوی اور پہلوان کا مرکب معلوم ہوتا تھا۔ ہماری میز کے قریب

آیا۔ ملیک سلیکس کے بعد اُس نے ہم تینوں سے درخواست کی۔ ”ہمیں بھی کبھی خدمت کا موقع دیجئے۔“

منٹو نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔ ”بس آپ شوکت تھانوی کی کتابیں چھاپا کیجئے۔“ کرشن اور میں نے منٹو کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ”منٹو صاحب ٹھیک فرما رہے ہیں۔“ ایک لمحہ کے لیے ناشر دم بخود ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے ہم تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”گستاخی معاف۔ ایک بات عرض کر سکتا ہوں؟“

”ہاں ہاں بڑے شوق سے۔“

”آپ اپنے کو عظیم ادیب سمجھتے ہیں اور شاید عوام کے علمبردار بھی۔ لیکن معاف کیجئے گا آپ کی تصنیفات عوام نہیں خریدتے۔ کالج کے چھوکرے اور چھوکریاں خریدتی ہیں۔ لیکن وہ تو عوام میں سے نہیں ہیں۔ ادھر شوکت تھانوی کی تخلیقات کا یہ حال ہے کہ ہم صرف اُس کی نئی کتاب کے نام کا اعلان کرتے ہیں کہ پانچ ہزار جلدیں بُک (BOOK) ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ آپ کی کسی کتاب کا ایڈیشن ایک ہزار سے تجاوز نہیں کرتا۔ شوکت تھانوی کچھ بھی ہوں۔ عوام کے ادیب ہیں۔ وہ عوام کے لیے لکھتے ہیں۔۔۔ اچھا السلام علیکم۔“

وہ کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔ اور ہم تینوں پہ گویا برف گر گئی۔ دل ہی دل میں ہمیں شدید خفت کا احساس ہوا۔ کیونکہ اُس کی بات صداقت پر مبنی تھی۔ شوکت کو عوام سے اور عوام کو شوکت سے والہانہ عشق تھا۔ وہ صحیح معنوں میں عوامی ادیب تھے۔ اور ہم جو بزعم خویش اپنے کو عوام کا حامی سمجھتے تھے۔ اُن سے اتنے ہی دور رہے جتنا کفر ایمان سے ہوتا ہے۔

شوکت کی یہی خوبی کچھ نقادوں کے نزدیک اُن کی سب سے بڑی خامی ہے۔ میری رائے میں عوام کے لیے لکھنا جرم ہے نہ گناہ۔ آج تمام اشتراکی ممالک میں عوام کے لیے لکھنا باعثِ فخر خیال کیا جاتا ہے۔ استالین (STALIN) نے ایک بار ادیبوں سے خطاب کرتے وقت ایک یونانی دیو کی مثال دی تھی۔ جسے کوئی شخص اُس وقت تک پچھاڑ نہیں سکتا تھا جب تک اُس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہتے آخر ایک پہلوان نے اُسے ہوا میں اچھالا۔ اور اُس پر کاری وار کر کے اُس کا کام تمام کر دیا۔ استالین نے اس کہانی سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا تھا ”یاد رکھیے۔ وہ ادیب کبھی فنا نہیں ہو سکتا جس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہیں گے۔“ شوکت تھانوی خدانخواستہ اشتراکی ادیب تو نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ زمین سے اپنا رابطہ قائم رکھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ نقادوں کی کڑی تنقید کے باوجود زندہ رہے۔ اور اپنی زندگی میں زندہ جاوید بھی ہو گئے۔

کچھ نقادوں کو شکوہ تھا کہ شوکت کی ذہنیت خام تھی۔ اُن کا شعور ناپختہ تھا۔ وہ دوسرے یا تیسرے درجے کی چیزیں لکھا کرتے تھے۔ مجھے اس رائے سے بھی اتفاق نہیں۔ جو شخص اتنا کچھ لکھے چاہے وہ ٹیگور ہو منشی پریم چند یا اقبال ہمیشہ اعلیٰ پائے کے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ ٹیگور کو ہی لے لیجئے۔ آپ کو اُس کے کلیات میں ایسی چیزیں مل جائیں گی جنہیں پڑھ کر آپ کا سر ندامت سے جھک جائے گا۔ خود ٹیگور نے اپنی مشہور عالم تصنیف ”گیتانجلی“ کے بارے میں کہ جس پر اُسے نوبل پرائز ملا لکھا ہے ”میں یہ نظمیں رات کے وقت چھپ کر لکھا کرتا تھا۔ کیونکہ ان میں ادبیت کا فقدان

نہیں لکھتے وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کسی نے آ کے دیکھ لیا تو"

اس میں مطلقاً شک نہیں کہ شوکت نے دوسرے ادیبوں کی طرح بہت سی چیزیں لکھی ہیں بعض اوقات بھونڈے مضامین میں فرسودہ یا عامیانہ اشعار بھی نقل کئے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے اعلیٰ قسم کے ادب کی بھی تخلیق کی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں "مضامین شوکت" "شیش محل" "بار خاطر" اور "قاعدہ بے قاعدہ" پیش کئے جاسکتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے "شیش محل" پہلی بار پڑھی تو میری ملاقات ایک نئے شوکت سے ہوئی۔ یہ شوکت جو محض ایک فقرے کے شیشے میں پوری ... اتار سکتا تھا۔ وہ جس کے اسلوب بیان کے ایجاز و اختصار کا یہ عالم تھا کہ اس کا ایک ایک جملہ دوسروں کے پورے مضمون پر بھاری تھا۔ کوزے میں دریا کو بند کرنے کی بہتوں نے مشقیں لی ہیں۔ کہیں یا تو انھیں کوزہ دستیاب نہیں آیا یا وہ "دریا" کو "بحر بیکراں" کے ساتھ خلط ملط کر گئے ہیں۔ اس محاورے کو عملی جامہ پہنانے کی سعادت صرف شوکت کے حصے میں آئی۔ اور ان کے قلم سے اتنے خوبصورت پھول جھڑے۔ جن کی تازگی اور رعنائی ابد الآباد تک مستقائم رہے گی۔ "بار خاطر" شوکت کا شاہکار ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ اس کو لکھنے کے بعد اپنا قلم توڑ دیتے تو بھی محض اس تصنیف کی بدولت ان کا نام زندہ رہتا۔ "بار خاطر" جیسا کامیاب تحریف ابھی تک نہیں لکھی گئی اور نہ مستقبل قریب میں اس کے لکھے جانے کا امکان ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شوکت کے طنز و مزاح میں شائستگی یا گہرائی نہیں۔ انھیں چاہیے "بار خاطر" کا بار بار مطالعہ کریں۔

عموماً دیکھا گیا ہے کبھی کبھی ایک اچھا مضمون مصنف کے حق میں رحمت کی بجائے زحمت ثابت ہوتا ہے۔ ایسا ہی سانحہ شوکت کے ساتھ بھی پیش آیا۔ انھوں نے ایک مضمون بعنوان "سودیشی ریل" لکھا۔ اور "سودیشی ریل والے شوکت" کے لقب سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ اس مضمون کے بعد انھوں نے سینکڑوں کامیاب مضامین لکھے جنھیں بیشتر نقادوں نے اس بنا پر پڑھنے سے انکار کر دیا کہ سودیشی ریل سے بھلا بہتر مضمون اب شوکت صاحب کیا لکھیں گے۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ "سودیشی ریل" ان کی ابتدا تھی نہ کہ انتہا۔ میں ایسے نقادوں کو بھی جانتا ہوں جنھوں نے "سودیشی ریل" بھی نہیں پڑھا۔ لیکن جو اس امر کے باوجود یہ فتوے صادر کرنے کو تیار رہیں کہ شوکت کا مزاح سطحی ہے۔ تنقیدی سطحی پن کی اس سے بدتر مثال مشکل سے ملے گی!

اور پھر وہ نقاد ہیں جو تنہائی میں شوکت کے مضامین مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ لیکن کھلے بندوں ان کی مذمت کرتے ہیں کیونکہ ایسا کرنا فیشن میں داخل ہے ان لوگوں پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزہ بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

شوکت صاحب تعریف و تنقیص سے بے نیاز تھے۔ میں نے انھیں کبھی کسی نقاد کی شکایت کرتے نہیں سنا۔ وہ جانتے تھے کہ سب سے بڑا نقاد "وقت" ہے اور اگر وہ ان کے مضامین پر سبحان اللہ کے ڈونگرے برسا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آنے والی نسلیں انھیں فراموش کر سکیں گی۔ انھیں نہ کرم کی خواہش تھی نہ ستم کا شکوہ۔ فطرتاً وہ ظریف اور

بذلہ سنج واقع ہوئے تھے اور انھیں خیال - واقعہ یا کردار سے مزاح پیدا کرنے کے فن میں قابلِ رشک مہارت حاصل تھی چونکہ انھوں نے کسی مغربی ادیب کا تتبع نہیں کیا اس لیے اُن کی ظرافت کے نمونے سو فیصد مشرقی ہے۔ اُن کے نمونہ ہر معیار ذوق جوئی تھا۔ دل شکنی نہیں۔ وہ نہ کسی "بزم" (۱۸۹۴ء) سے تعلق رکھتے تھے اور نہ انھوں نے بھی اپنے طنز و ظرافت کو اصلاح و تربیت کا ذریعہ بنایا۔ اُن کی زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے ہنسانا تھا وہ مجسم "اودھ پنچ" تھے۔ اور شاید اسی لیے "اودھ پنچ" کی شان میں کہا گیا اکبر الہ آبادی کا قصیدہ درحقیقت شوکت کا بہترین مرثیہ ہے۔

اے گوہرِ مخزنِ ظرافت — اے جوہرِ معدنِ لطافت
سرمایۂ انبساطِ خاطر — تسکینِ دل و نشاطِ خاطر
دیباچۂ دفترِ فصاحت — عنوانِ صحیفۂ بلاغت
رنگینی میں غیرتِ گلستاں — شوخی میں حریفِ برقِ تاباں
معقول مزاح ہے تو یہ ہے — شرعاً مباح ہے تو یہ ہے
ہے خلقِ خدا قتیل اس کی — حاسد کا حسد دلیل اس کی
ہر کس کہ بدید گفت خوب است — باللہ مفرح القلوب است

صاحب طرز ادیب

سید ہاشم رضا

شوکت تھانوی کو مرحوم لکھتے ہوئے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے جب وہ راولپنڈی کلب کی ایک تقریب میں جو عید الاضحیٰ کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی، بلبل ہزار داستان کی طرح چہک رہے تھے۔ میں نے ان کے عید کارڈ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سامنے آپ کے کارڈ کی طباعت، نفاست اور نفاست دیکھ کر گمان گزرا کہ یہ کسی والیٔ ریاست کا کارڈ ہے تو کہنے لگے کہ ہاں مجھے محسوس بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے آتش کا شعر پڑھا ؎

جہاں سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں — حواس خمسہ سے بڑھ کر کوئی سپاہ نہیں

اس دن جب یہ خوش گپیاں ہو رہی تھیں، کسے خبر تھی کہ ان کے حواس خمسہ کی سپاہ میں ایسی افراتفری پیدا ہو جائے گی کہ ان کا آخری وقت عید قرباں کے ایک دو دن پہلے ہی آجائے گا۔ ان کی بیماری کی خبریں اخباروں میں پڑھیں لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ آج سے پہلے نہ ہوا اور آج جبکہ بہت سے دلوں میں اُن کی یاد میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اُن کی شخصیت کا بھی اندازہ ہو رہا ہے، اُن کی ذات ایک انجمن تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، مؤرخ بھی تھے اور بذلہ سنج بھی۔ حقیقت نگار بھی تھے اور افسانہ نگار بھی۔ ڈرامہ نویس بھی تھے اور اکثر بھی قصہ گو بھی تھے اور تمثیل نگار بھی۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی، قطعات بھی لکھے اور مرثیے بھی، ان کی نثر اور نظم میں ایک چیز جو سب سے زیادہ نمایاں تھی وہ ان کی اسٹائل تھی۔ صد حیف کہ آں ساقی نماند و آں قدح بشکست

ان کی تصنیف میں ہندوستان اور پاکستان کی بہترین روایات اور قدروں کا تذکرہ ملے گا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ملک اور ملت کی کمزوریوں کا بھی پتہ چلے گا۔ "سودیشی ریل" کی روانی کو کون پڑھنے والا بھلا سکے گا۔ "قاضی جی" کی شگفتہ بیانی کو کون سننے والا بھول سکے گا۔

انھوں نے جنت نگاہ اور فردوس گوش دونوں کے لیے سامان مہیا کیا۔

اُن کی وفات کی خبر سن کر مجھے ایک اور صاحب طرز کی یاد آئی یعنی ظریف لکھنوی۔ ان کے دمِ آخر کا نقشہ ان کے بھائی صفی لکھنوی نے یوں کھینچا تھا ؎

جو اُٹھ نہ سکتا تھا بے سہارے وہ شور محشر اٹھا کے اُٹھا — ستم ظریفی تو دیکھئے گا، ہنسانے والا رُلا کے اُٹھا

بالکل یہی تاثر شوکت تھانوی کی موت کا بھی ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

شوکت تھانوی

شاہد احمد دہلوی

خدا بخشے شوکت تھانوی ان لوگوں میں سے تھے جو روتوں کو ہنساتے تھے۔ ان کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی تھی عجب زعفرانِ زار شخصیت تھی مرحوم کی۔ چلبلے آدمی تھے ٹکے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کی رگوں میں خون کے بدلے پارہ دوڑتا تھا۔ ترت پھرت، یہ آئے وہ گئے۔ آدمی کیا تھا چھلاوا تھا۔ بڑی جان تھی مرنے والے میں۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ اب بھی وہ آنکھوں میں، آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ بھلا جس میں اتنی زندگی اور زندہ دلی ہو وہ بھی مر سکتا ہے؟ مگر یقین کرو یارو کہ وہ شوکت واقعی مر گیا۔ روتوں کو ہنسانے والا ہنستوں کو رونا چھوڑ گیا۔ میں اس کے حد سے بڑھے ہوئے خلوص کو دیکھ کر کہا کرتا تھا "دیکھ لینا یہ شخص ایک نہ ایک دن ایسا دھوکا دے گا کہ بلبلاتے ہی رہ جاؤ گے۔" دیکھ لیا نا؟ پینتیس سال کے تعلقات کا ذرا سا بھی خیال نہیں کیا اور اکیلا ہی سدھار گیا۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ ساتھ ہی چلتا۔ ہر کام میں جلدی، زندگی میں بھی جلدی، مرنے میں بھی جلدی ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

شوکت تھانوی کا نام پہلی بار اس وقت سنا جب ۳۵ سال اُدھر کسی نے بتایا کہ "نیرنگ خیال" کے سالنامہ میں ان کا ایک مضمون "سودیشی ریل" پڑھنے کے لائق چھپا ہے۔ رسالہ منگا کر پڑھا، واقعی طبیعت پھڑک گئی۔ اب بھی جب کبھی وہ مضمون یاد آجاتا ہے تو ہنسی آجاتی ہے۔ جب اس مضمون کی شہرت عام ہوئی تو کسی حاسد نے پتہ چلایا کہ کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون چھپا تھا، یہ مضمون اس کا ترجمہ ہے۔ ہمیں بھی اس کی ٹوہ لگ گئی۔ اصل مضمون کا تراشہ حاصل کیا۔ ترجمہ تو ترجمہ ان دونوں مضمونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ بہت سے بہت یہ کہا جا سکتا تھا کہ مرکزی تصور اس مختصر خاکے سے لیا گیا تھا۔ شوکت تھانوی نے اس تصور کو اپنے رنگ میں اس خوبی سے پیش کیا تھا کہ یہ سولہ آنے (یا سو پیسے؟) انہی کی تخلیق ہو گئی تھی۔ اور جو خوردہ گیری ہی پہ آؤ تو شیکسپیئر کا کونسا ڈرامہ طبعزاد کہلانے کا مستحق ٹھہرے گا؟ یونہی چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے، اور بڑا فن کار غاصب ہی ہوتا ہے۔

اس مضمون کے لکھنے سے پہلے بھی شوکت تھانوی بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ پہلے لکھنؤ کے ایک اردو اخبار میں کالم لکھنے

یہ وہ پرچہ اخباروں میں چھپنے لگے۔ مہر و ماہ نکلنے لگے [illegible] ادبی [illegible] نے شہرت پائی۔ ان کے والد ایک بڑے پولیس افسر تھے۔ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شوکت تھانوی [illegible] صحافی ہو گئے تھے [illegible] شعر و ادب کے چکر میں پڑ جاتے ہیں [illegible] بے مانگے زیادہ گندا۔ یہ بڑی ہی خوبی والی [illegible] میں اور یہ خاتون وہ ہیں جن کے شوہر [illegible] خاتون ہیں جو شوکت تھانوی کے چار اولادیں ہیں [illegible] شوکت کو شاعر و ادیب اور صحافی [illegible] بنا کر چھوڑا [illegible] لکھنؤ میں [illegible] نام محمد عمر، تخلص شوکت [illegible] تھانوی کا لاحقہ ادبی [illegible] کی مقبول چوک [illegible] جانتے ہیں۔

[illegible]

سن ۳۲ء کے دنوں میں ایک [illegible] صبح [illegible] اطلاع ملی کہ وہ [illegible] تشریف لائے ہیں۔ نام دیکھ کر [illegible] نہیں ملتے [illegible] کی بد اخلاقی طبیعت کو ناگوار [illegible] میں نے [illegible] اس وقت [illegible] نے دل میں سوچا کہ انھیں تھوڑی دیر بیٹھنے اور انتظار کرنے کی سزا ملنی چاہئے۔ چنانچہ [illegible] اور آدھ گھنٹہ بعد مردانے میں آیا۔ دونوں [illegible] تھے [illegible] ہوئے۔ یہ دو نوجوان تھے جنہیں دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد کے [illegible] یاد آگئے۔ دونوں [illegible] تھے۔ ان میں سے ایک جو زیادہ چلبلے تھے ذرا آگے بڑھ کر بولے "ہمیں پہچانیے"۔

میں نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھا۔ آڑی مانگ نکلی ہوئی، کسی قدر تنگ پیشانی، گول چہرہ، آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، شریر بے قرار آنکھیں، [illegible] ہونٹوں پر پان کی ہلکی سی سرخی، ترشی ہوئی مونچھیں، داڑھی گھٹی ہوئی، بے شکن اچکن، چست پاجامہ، وارنس کا پمپ شو، داہنے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی۔ ان کی تصویریں دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا —
"شوکت تھانوی"۔ مسکرا کر بولے "آپ نے ٹھیک پہچانا۔" یہ کہہ کر معانقہ کیا۔ پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے بولے "اور یہ؟"
میں نے انھیں بھی سر سے پیر تک جانچا۔ تقریباً ایک ہی سا حلیہ تھا دونوں کا سوائے اس کے کہ ان کے چہرے پر عینک نہیں تھی۔ میں نے کہا "یہ آپ کے نفسِ ناطقہ نسیم انہونوی ہو سکتے ہیں۔" شوکت نے کہا "بھئی خوب اندازہ لگایا۔" نسیم صاحب بھی آگے بڑھ کر گلے ملے۔ ان کا پرچہ "حریم" نکلتا تھا اور [illegible] کے نام [illegible] آتا تھا۔ اب شوکت اور نسیم دونوں نے مل کر "سرپنچ" ایک مزاحیہ اخبار (ہفتہ وار) نکالنا شروع کیا تھا۔ نسیم صاحب بھی مضامین لکھتے تھے مگر کوئی مضمون ان کا مشہور نہیں ہوا تھا۔ محنتی آدمی تھے۔ ان کی محنت اور شوکت کی ذہانت نے مل کر بڑا کام کیا۔ اور اب تو خود نسیم صاحب بھی ایک بھاری بھرکم مصنف ہیں۔

جاڑوں کے دن تھے۔ میں نے اِن حضرات سے کہا کہ آپ کل صبح ہمارے ساتھ نہاری کھائیے۔ یہ دلّی کی ایک خاص چیز ہے۔ سارے دلّی والے ہی اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر اس کے کھانے کا لطف علی الصبح کا ہے۔ اس لیے آپ حضرات چھ بجے آجائیے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے ماموں چشتی صاحب سے کہا کہ کل صبح کے لیے نہاری کا انتظام کر دیجئے۔

میں خود چونکہ رات کو دیر سے سوتا ہوں اس لیے صبح دیر سے اٹھتا ہوں۔ اس دن الارم لگا کر اٹھا۔ چشتی صاحب نہاری کا دیگچہ اور دو [illegible] لیے ہوئے چھ بجے سے پہلے پہنچ گئے۔ انگیٹھی دہکا دی گئی۔ اس پر گھی کڑکڑا دیا گیا۔ نہاری پر سے تار اُتار کر الگ کر دیا اور جب گھی میں پیاز سرخ ہو گئی تو پاؤ رنگ ایک پیالے میں نکال لی اور گھی سے نہاری کو بگھار دیا۔ چھ بجے، ساڑھے چھ بجے، سات بجنے لگے۔ چشتی صاحب نے کہا "تمھارے مہمان نہیں آئے۔" میں نے کہا "لکھنؤ والے ہیں، تکلف میں کہیں رہ گئے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔" دو صاحب، سات بج گئے، ساڑھے سات ہوئے کوئی نہ آیا۔ انتظار میں طبیعت بڑی بدمزہ ہوئی۔ جوانی کی ترنگ، اس زمانے میں میں ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ جب آٹھ بجے تو میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے چشتی صاحب سے کہا "ماموں جان، یہ سارا سامان زنانہ میں بھیج دیجئے۔" وہ گھبرا کر بولے "کیوں بھئی کیوں؟ تھوڑا سا انتظار اور کر لو۔" مگر میرا پارہ چڑھ چکا تھا۔ میں نے کہا "اب اگر وہ آئیں گے بھی تو میں نہیں کھلاؤں گا۔" ماموں جان نے کہا "یہ بڑی نامناسب بات ہوگی۔" مگر میں نے سارا سامان اٹھوا کر اندر بھیج دیا اور خود بھی اندر چلا گیا۔

کوئی نو بجے دونوں حضرات تشریف لائے۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ مہمان آگئے۔ میں نے بیوی سے کہا "چائے اور پان بھیجنا۔" انھوں نے پوچھا "اور نہاری؟" میں نے کہا "اب وہ نہاری کہاں رہی، وہ تو باسی قورمہ ہو گیا۔ اسے مت بھیجنا۔" انھوں نے سر کو حرکت دی جیسے کہہ رہی ہوں "عجب اوندھی مت کا آدمی ہے؟" اور باورچی خانہ میں خاموش چلی گئیں۔

میں مردانے میں آیا تو شوکت صاحب نے کہا "ہمیں کچھ دیر ہو گئی۔" میں نے کہا "جی ہاں۔ م

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند"

بولے "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ سے ملانے کے لیے جن احباب کو بلایا تھا انھوں نے دو گھنٹے تک آپ کا انتظار کیا، اس کے بعد کھا پی کر رخصت ہو گئے۔"

"یعنی نہاری ختم؟"

"جی ہاں۔ دلّی کے شرفا سورج نکلنے سے پہلے ہی نہاری کھا چکتے ہیں۔ ویسے بازاروں میں مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کے لیے دن چڑھے تک بکتی رہتی ہے۔"

"یہ تو بُرا ہوا۔"

"وقت کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ بُرا ہی ہوتا ہے۔ اب آپ کچھ اور باتیں کیجیے۔ کہیے کل کس کس سے ملے؟"

شوکت صاحب نے بتایا کہ سردار دیوان سنگھ، ایڈیٹر ریاست سے ملے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب سے ملے اور پروفیسر اکبر حیدری سے ملے جو اس قدر تپاک سے ملے کہ گھنٹوں ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ حکیم یوسف حسن صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال

[illegible] وہاں تشریف رکھتے تھے۔ اُن سے بھی ملاقات ہوئی [illegible] کے مقابلے پر بھی پروفیسر صاحب نے [illegible]

پروفیسر صاحب تھے تو [illegible] امبالہ کے مگر دلی ہی میں آ کر بس گئے تھے۔ اس زمانے میں بعض لوگ [illegible] معمہ [illegible] اور [illegible] تھے۔ بہت پڑھے لکھے [illegible] استاد [illegible] تھے۔ [illegible] کے باعث اس پیشے کو [illegible] چکے تھے۔ اکبر حیدری اچھے وجیہہ آدمی تھے۔ ان کی تعلیم شاید [illegible] دوسری طرف [illegible] ذہانت اور [illegible] اس پیشے میں گھس گئے تھے اور [illegible] بہت [illegible] بڑھتے جاتے تھے [illegible] کے لیے وہ ایک [illegible] جو [illegible] ہو جانے کی وجہ سے خوب بکتی تھیں۔ چنانچہ [illegible] دلی میں [illegible] کے بعد چند سال کی [illegible] ایک [illegible] بھی [illegible] جس میں کسی [illegible] نقصانات بھی [illegible] ہونے لگے تھے اور وہ پروفیسر اکبر حیدری [illegible] مشہور ہو گئے تھے۔ ویسے طبیعت کے [illegible] تھے اور ملنے جلنے میں [illegible] اخلاق سے۔ بہت [illegible] اللہ [illegible] اُن کی میزان نہیں [illegible]۔

شوکت صاحب نے بتایا کہ [illegible] ان کے ہاں دعوت میں گئے تو وہاں دو اور [illegible] سے بھی ملاقات ہوئی [illegible] عشرت رحمانی تھے اور دوسرے اخبار [illegible] کے سب ایڈیٹر حنیف ہاشمی۔ حکیم یوسف حسن صاحب [illegible] جتنے تنومند اور قوی الجثہ آدمی تھے حنیف ہاشمی اتنے ہی [illegible] اور نحیف الجثہ۔ ابھی خاص باتیں [illegible] نہیں [illegible] کہ حنیف ہاشمی پنجاب اور یوپی کا قضیہ لے بیٹھے۔ اکبر حیدری امبالہ کے تھے، نہ اِدھر کے اور نہ اُدھر کے [illegible]۔ بیچارے بار بار اس بحث کو ختم کرنے کی کوشش کرتے مگر حنیف ہاشمی کانپ کانپ کر [illegible] کر پھر کچھ [illegible] رہتے۔ اِدھر یہ دونوں بھی کچھ کر بولنے والے نہیں تھے۔ پہلے تو اُنھوں نے کچھ ٹالا مگر جب [illegible] حد سے بڑھنے لگے تو یہ بھی پیٹ پڑے۔ غرض شوکت صاحب نے بتایا کہ فضا اتنی مکدر ہو گئی کہ ہم وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے مگر اکبر حیدری نے پکڑ کر بٹھا لیا اور فوراً کھانا منگوایا۔ مگر دلوں میں غبار بھرا ہوا تھا، کھانا کیا خاک کھایا جاتا۔ دو چار لقمے زہر مار کر کے وہاں سے پیچھا چھڑایا۔

میں نے کہا ”مجھے یہ رُوداد سُن کر مطلق تعجب نہیں ہُوا۔ اکبر حیدری جب اکیلے ہوتے ہیں تو نہایت معقول باتیں کرتے ہیں۔ مگر جب دو چار ادیب یا شاعر اُن کے ہاں جمع ہو جاتے ہیں تو پھر ایسے ہی ہنگامے ہوتے ہیں۔ اُن کے گھر کی رونق ہی ہنگاموں پر موقوف ہے۔“

اتنے میں چائے آگئی۔

شوکت صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا ”تو کیا واقعی نہاری نہیں ملے گی؟“

میں نے کہا ”نہاری اب آئندہ کسی اور موقعہ پر۔ اب تو آپ چائے پیجیے اور پان کھائیے۔“

اس واقعہ کے بعد شوکت صاحب میری طبیعت سے واقف ہو گئے۔ مجھ سے وہ عمر میں دو تین سال بڑے تھے

مگر وہ مجھے ہمیشہ شاہد بھائی ہی کہتے رہے۔ وہ بڑے بڑوں پر فقرے کس جاتے تھے مگر انھوں نے میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں کیا۔ مذاق البتہ ہوتا رہتا تھا۔

شوکت تھانوی سے میرے تعلقات اڈیٹر اور مضمون نگار کے ہی سے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بلا معاوضہ نہیں لکھتے تھے جب کبھی ان سے مضمون لکھوانا ہوتا تھا تو انھیں معاوضہ منی آرڈر سے بھیج دیا جاتا تھا۔ اور اس زمانے میں معاوضہ ہی کیا ہوتا تھا؟ دس روپے۔ منشی پریم چند پندرہ روپے فی افسانہ لیتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ کسی نے پندرہ روپے انھیں دیے ہیں تو ان پر بڑا احسان کیا ہے۔ سو دو سو میں شوکت تھانوی اپنا ناول دینے پر تلے بیٹھے تھے۔ ایک دفعہ آغا خورس کو زبردستی اپنا مسودہ دے کر کچھ روپے لے گئے۔ آغا صاحب نے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ کہا، "جو جی چاہے نام رکھ لو"۔ آغا صاحب کو شوخی سوجھی۔ کتاب کے ٹائٹل پر ایک گیدڑ بنوایا اور اس گیدڑ کا چہرہ شوکت تھانوی کا بنوایا۔ گیدڑ کو پنجرے میں بند دکھایا اور کتاب کا نام رکھا "مجھے خرید لو"۔ یہ ادب کے عروج اور ادیبوں کی پستی کا وہ زمانہ تھا کہ اچھے خاصے مشہور ادیب اپنے مسودے کے ساتھ دو دو سو روپے بھی دیتے تھے کہ للہ ہماری کتاب اپنے مکتبے سے چھاپ دو۔

شوکت تھانوی میں جو خوبی کہیے یا عیب یہ تھا کہ ان کے کسی کام میں استواری نہیں تھی۔ وہ اتنے بڑے آدمی تو تھے نہیں کہ زمانے کو اپنے ساتھ کر لیتے۔ اس لیے وہ زمانے کے ساتھ ہو جایا کرتے تھے۔ جب دلی سے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام ہونے لگے تو ایک دفعہ شوکت صاحب کو بھی تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اسے انھوں نے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا۔ اس زمانے میں احمد شاہ بخاری (پطرس) اسٹیشن ڈائرکٹر تھے اور ذوالفقار بخاری ڈائرکٹر پروگرام۔ شوکت صاحب ان دونوں بھائیوں سے مرعوب ہو گئے، کچھ کور بھی دبتی تھی۔ ایک ایک سے ان کی تعریف کرتے پھرتے تھے اور لکھنؤ واپس پہنچنے کے بعد انھوں نے ایک اردو اخبار میں (جس سے وہ وابستہ تھے) ان دونوں بھائیوں کا نثری قصیدہ لکھا اور اس کا تراشہ انھیں بھیج دیا۔ اس کے بعد میں انھیں دلی مزید پروگراموں کے لیے بلایا گیا اور جب لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن کھلا تو انھیں مسودہ نویس کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ ریڈیو میں انھیں اخبار کے مقابلے میں دگنی بلکہ تگنی تنخواہ مل گئی اور ان کے دلدر دور ہو گئے۔ اخبار نویسی نے انھیں زود نویس بنا دیا تھا۔ ذہین آدمی تھے، فیچر اور ریڈیو ڈرامہ کی تکنیک کو سمجھ لینے کے بعد انھوں نے لکھ لکھ کر مسودوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور صلاحیت کا بھی انکشاف ہوا کہ ریڈیائی اداکاری اچھی کر سکتے تھے۔ نقالی کا مادہ تو ان میں شروع ہی سے تھا، کئی طرح کی آوازیں بنانے پر بھی قادر ہو گئے۔ لکھنے میں انھیں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا، قلم برداشتہ لکھتے تھے، اچھا لکھتے تھے اور خوش خط تھے۔ میں نے ان کے مسودے دیکھے ہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں کاٹتے تھے اور سطریں موتی کی لڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لکھنؤ سے انھوں نے اپنا ایک ہفتہ وار فیچر "منشی جی" شروع کیا جس میں کسی معاشرتی خرابی یا وقت کے کسی اہم موضوع پر بڑی دلچسپ بحث ہوتی تھی۔ کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور نہایت کامیابی کے ساتھ۔ جب پاکستان بن گیا تو "منشی جی" نے "قاضی جی" کا روپ دھار لیا۔ یہ فیچر لاہور سے شروع ہوا، پھر شوکت صاحب کراچی آ گئے تو یہاں سے نشر ہونے لگا۔ اور جب وہ راولپنڈی چلے گئے تو راولپنڈی سے۔ اس ہفتہ وار فیچر کی روحِ رواں قاضی جی تھے جن کا پارٹ خود شوکت صاحب ادا کرتے تھے۔ مدتوں

[illegible] پڑھنے والوں کو نہیں معلوم ہوا کہ قاضی جی کی صدا [illegible] کی بات [illegible]۔ قاضی جی ایک کمرشل [illegible] تھے جو
[illegible] جنت میں رہتے تھے [illegible] آپ کے پیشے سے جو باتیں جلی کٹی جملی
[illegible] مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ شوکت صاحب کو قاضی جی کی آواز بنانے میں کمال حاصل تھا۔ اس کمال کا ثبوت یہ ہے کہ
[illegible] کے نقال پیدا ہو گئے تھے۔ اور محفلوں میں جو دوسرے نقلیں پیش کرتے تھے وہ قاضی جی کی نقل کو بناتے اور سنتے
تھے۔ شوکت صاحب نے منشی جی اور قاضی جی کے سیکڑوں مسودے لکھے اور [illegible] ان کے مسودوں پر [illegible] تھے۔
[illegible] ایک کو بھی [illegible] سب میں ایک ہی جیسی خفگی اور تازگی پائی۔

بہرکیف ان کی کالم نویسی کی [illegible] چند دنوں کے [illegible] کے بعد شوکت صاحب خود جنگ سے وابستہ
ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں روزانہ ایک [illegible] کالم [illegible] وغیرہ لکھنا ہوتا تھا [illegible] نواب
سعادت علی خان نے انشاء اللہ خاں سے فرمائش کی تھی [illegible] عالم ہو گیا کہ
ایک ایک سے کہتے۔ کوئی مضمون کوئی چٹکلا [illegible] لون مرچ لگا کر نواب کو خوش کر دینا [illegible] شوکت کا شگفتہ قلم
ہر روز روانہ چھپتا رہا اور [illegible] کے پھول کھلاتا رہا۔ پنڈی جانے کے بعد دوسرے اخبار [illegible] ہوتی تھی
مگر وہ بہار [illegible] عنوان سے کالم برابر لکھتے رہے۔ [illegible] کے علاوہ بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ [illegible] انھوں
نے اپنی آپ بیتی لکھنی شروع کی تھی۔ [illegible] اس کی چند قسطیں ہی چھپنے پائی تھیں کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔
پاکستان بننے سے [illegible] ڈھائی سال پہلے وہ [illegible] تنخواہ پر پنچولی فلم کمپنی [illegible] مکالمہ نویسی کے لیے بلائے گئے تھے
اس کمپنی میں انھوں نے سید امتیاز علی تاج کے ساتھ کام کیا۔ [illegible] لکھنے لگے تھے۔ [illegible] ایک فلم میں
انھوں نے اداکاری بھی کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

تاج صاحب کے ساتھ وہ بھی لاہور ریڈیو میں آ گئے تھے۔ پاکستان کے تعمیری پروگرام میں انھوں نے "قاضی جی" لکھنا شروع
کیا تھا اور سب سے زیادہ مقبول پروگرام انہی کا ہوتا تھا۔

[illegible] "محکمہ گیر" کے شوکت صاحب قائل نہیں تھے۔ پیسے کے [illegible] تھے۔ جس کام میں پیسہ زیادہ ملتا
دنیا اُسی کو اختیار کر لیتے۔ کالم نویسی سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ وہاں سے ریڈیو میں آئے۔ ریڈیو چھوڑ کر پچھلی
بڑی جنگ کے زمانے میں سانگ پبلسٹی کے محکمے میں چلے گئے۔ وہ محکمہ ختم ہوا تو پنچولی فلم کمپنی میں آ گئے۔ وہ بند ہوئی تو پھر
ریڈیو میں آ گئے۔ پھر جنگ اخبار میں چلے گئے۔ پیسہ انھوں نے خوب کمایا، مضامین سے، کتابوں سے، ریڈیو سے،
اخباروں سے، مشاعروں سے، مگر کبھی انھیں خرچ کرتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو تنگ دست ظاہر کرتے تھے۔ پانوں
کی ڈبیا تو وہ ضرور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ سگریٹ تک وہ نہیں پیتے تھے۔ سینما، تھیٹر، کلب،
سیر سپاٹا، دعوتیں، ہوٹل بازی، یا کوئی اور بازی، کچھ نہیں۔ البتہ بڑے آدمیوں کے ساتھ لگے رہنے کا شوق تھا، اور
انہی کے ساتھ ان کے شوق پورے ہو جاتے تھے۔

شوکت تھانوی کا کمزور پہلو ان کی شاعری تھی۔ وہ ساری عمر شعر کہتے رہے۔ آسی الدنی کی انھوں نے شاگردی بھی اختیار کی۔ مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ کوئی ۲۵ سال ہوئے انھوں نے اپنے منتخب کلام کا مجموعہ "گہرستان" کے نام سے شائع کیا تھا مگر شاعر کی حیثیت سے انھیں کوئی نمود حاصل نہیں ہوئی۔ شعر کلام موزوں کے علاوہ اور بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ "اور بہت کچھ" شوکت کے کلام میں نہیں تھا۔ چند سال سے انھوں نے مزاحیہ اشعار اور طنزیہ نظمیں بھی لکھنی شروع کر دی تھیں۔ یہ اثر تھا سید محمد جعفری کی صحبت کا جن کے سلسلے میں بھی انھوں نے دو ایک نظمیں کہی ہیں۔ مگر ان میں بھی وہی آورد اور بے رنگی ہے جو ان کے سنجیدہ کلام کا عیب ہے۔ شوکت صاحب کا معاملہ کچھ اکبر الہ آبادی سے ملتا جلتا تھا۔ اکبر کی شاعری کا آغاز سنجیدگی سے ہوا۔ مدتوں اس بحر میں شناوری کرتے رہے مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔ پھر ایک دن اتفاق سے خوش طبعی کے شعر جو لکھے دُرِ منضود ہاتھ آگیا۔ یہ مرلی تھی طنز و مزاح کی جس کی دھوم چاروں طرف سے ہونے لگی۔ تب اکبر کو معلوم ہوا کہ ان کا فطری جوہر ظرافت ہے اور انھیں اسی جوہر کو ابھارنا چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے اسے مشق کی سان پر چڑھایا اور مزاولت سے ایسے پہل تراشے کہ اس کی آب و تاب ایک دنیا کے دیکھنے کی چیز بن گئی۔

شوکت صاحب بھی برسوں اخباروں میں لکھتے رہے مگر جب حسنِ اتفاق سے "سودیشی ریل" ان کے قلم سے نکلی تو اس کی مقبولیت نے انھیں بتایا کہ ان کا جوہرِ اصلی مزاح ہے۔ اگر نمود چاہتے ہو تو اسی کو چمکاؤ۔ چنانچہ شوکت نے اپنے اسلوب کو اسے چمکایا اور اس تیز رفتاری سے کہ دو سال ہی میں موجِ تبسم، بحرِ تبسم اور دو اور تبسم، چار مجموعے ان کے مضامین کے شائع ہوگئے۔ مگر ان کی زود نویسی نے انھیں طنز و مزاح کی بلندیوں کو چھونے نہیں دیا۔ آج تک ایورسٹ کی چوٹی کسی نے دو بار سر نہیں کی۔ یہ بڑا جان جوکھم کا کام ہے جس میں قدم قدم پر احتیاط کرنی ہوتی ہے۔ اور کوئی بڑا ہی خوش نصیب ہوتا ہے جو اپنا جھنڈا گاڑ کر لافانی ہو جاتا ہے۔ دوڑ کر ہانپ جانے والوں میں عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی ہیں۔ قدم قدم چل کر چوٹی تک پہنچنے والوں میں رشید احمد صدیقی اور پطرس۔ ثانی الذکر نے زندہ سلامت واپس آجانے کے بعد کوہ پیمائی کا سامان ایک طرف ڈال دیا۔ صدیقی صاحب بہت زیادہ سخت کوش ہیں۔ تن سنگھ کی طرح بار بار چوٹی پر دھاوا بولتے رہتے ہیں۔

شوکت تھانوی خوش اخلاق آدمی تھے، اور جن سے دوستی کا رشتہ قائم کر لیتے تھے ان سے تعلقات میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ مگر وہ دوست صرف انھیں بناتے تھے جن سے انھیں فائدہ پہنچتا رہتا تھا یا فائدہ پہنچنے کی امید ہوتی تھی۔

باتوں کے طوطا مینا بنانا یوں تو سبھی یو۔پی والوں کا شیوہ تھا مگر شوکت صاحب کو اس میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی اسی صلاحیت کے بل بوتے پر بڑے بڑے جنوں کو شیشے میں اتار رکھا تھا اور ان سے کماحقہٗ فائدہ اٹھاتے تھے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ تم بے ہڈی کے آدمی ہو۔ اپنے سے زبردست کے سامنے جاتے ہو تو سوائے جی ہاں جی ہاں کہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے تھے "نہیں، یہ بات تو نہیں ہے"۔

ایک دفعہ میں شوکت تھانوی کے پاس ریڈیو اسٹیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے شوکت صاحب ایک دم

یہ کھڑے ہو گئے اور بیٹھے" ایک لطیفہ یاد آگیا۔ وہ عطار صاحب ... بازار تک آؤں گا۔ وہ لطیفہ سنانے میں بیٹھے ہیں تو ان کے دوست نے کہا "اس نے تو وہ سادہ لوحی کی حد ہی نہیں رکھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟"
انہوں نے کہا "اچھا، یہاں اسی طرح کام چلتا ہے۔ پولسنگ کی خبر ہے:"

"یہ نیا لفظ تم نے کیا اڑایا؟"

"پولسنگ۔"

"یعنی؟"

"بٹرنگ — مکھن لگانا — پولس کا مطلب ہوتا ہے۔"

پولسنگ، بٹرنگ، مکھن لگانا، خوشامد کرنا، یہ سارے محاورے اسی زمانے میں وضع ہوئے۔ ایک صاحب نے اسی زمانے میں کہا تھا "آج بازار میں مکھن ہی غائب ہے۔"

"کیوں؟ کیا مکھن بھی چور بازار میں چلا گیا؟"

"نہیں، فلاں صاحب نے دن بھر کے لگا دیا سارا۔"

ایسی باتوں پر ہنسی بھی آتی تھی اور بات بھی چلتا تھا۔ مگر یہ عام دستور تھا اور شوکت صاحب کے متعلق کہا جاتا تھا انھوں نے اس کی تکنیک کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا، بلکہ اس کے ایکسپرٹ ہو گئے تھے۔ جب عام معاملہ یہ ہو کہ۔

بات تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

تو پھر کسی ایک کو ہدفِ ملامت کیوں بنایا جائے؟ اگر ایسا ہی خودی اور خودداری کا خیال ہے تو اپنے گھر بیٹھو، دنیا چھوڑ دو۔

یہ آخر تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنی کمائی خرچ کہاں کرتے تھے۔ صرف دو ہی ایسی دکھائی دیں جن میں انھیں ضرور ہی گرہ ڈھیلی کرنی پڑتی تھی۔ ایک پان اور دوسرے لباس۔ پان وہ کھاتے کم تھے، کھلاتے زیادہ تھے۔ انھوں نے ایک بڑی ڈبیا کتاب کی شکل کی بنوائی تھی جس میں پان کا پورا لوازمہ ہوتا تھا۔ یہ ڈبیا تقریبِ بہرِ ملاقات بطور بہت کامیاب تھی۔ جو اس سے بچ نکلتا اس پر بیڑے سے وار کیا جاتا۔ اس میں چھالیا، الائچی، لونگ، جاوتری، منقا ان کی کمی سی شیشی، کبھی کچھ ہوتا تھا، کہاں تک کوئی بچتا؟ مار کھا ہی جاتا۔ اس پر غضب ان کی سخن سازی و سخن بازی، نووارد رام ہو کر ان کا کلمہ پڑھنے لگتا۔

شوکت صاحب بڑے فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ریڈیو اسٹیشن، لاہور پر اپنے چپراسی کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگے "آپ کو دیکھئے، نیوی کٹ سگریٹ پر آپ ہی کی تصویر ہے۔" اور واقعی میں اس غریب کی ہیئت میں وہی شکل تھی جو نیوی کٹ کی ڈبیا پر ہوتی تھی۔ پھر اس سے کہا، "جائیے، جا کر چائے لائیے۔"

اس کے چند روز بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو سلام کے بعد شوکت صاحب نے پہلی بات یہ کہی "یہ جو بیٹھے ہوئے ہیں میرے صاحبزادے ہیں۔" اور ان صاحب سے کہا "انھیں تم جانتے ہی ہو گے، شاہد احمد دہلوی ہیں۔" انھوں نے اٹھ کر سلام کیا۔ میں وعلیکم السلام کہہ کر بیٹھ گیا۔ وہ صاحب "اچھا، میں چلتا ہوں" کہہ کر چلے گئے تو میں نے ہنس کر کہا

"جس جیسے آدمی کو دیکھئے جو کسی کو اپنا بیٹا اور کسی کو اپنا باپ بنا لیتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟" بڑی سنجیدگی سے بولے "نہیں یہ تو میرا بڑا لڑکا تھا، بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ نوکر ہے۔" مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا۔ اتنے میں عشرت رحمانی آ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا "ان کا کوئی لڑکا ان سے بھی بڑا ہے؟" انھوں نے کہا "قد میں بڑا ہے۔ ان کی عمر آپ کیا سمجھے ہیں؟ یہ تو آپ سے بڑے ہیں یہ حضرت۔ پچاس سے اوپر ہیں، ۳۰-۳۲ سال کا تو لڑکا ہی ہے۔" اس وقت شوکت صاحب کی صحت اتنی اچھی تھی کہ چالیس سے زیادہ کے نظر نہ آتے تھے۔ بال خوب لمبے اور کالے تھے، سفید بال نہ تو سر میں تھے اور نہ مونچھوں میں۔ چہرے پر کوئی جھرّی نہیں تھی اور نہ آنکھوں کے کونوں میں کوّے کے پاؤں۔ دس بارہ سال بعد یعنی سنہ ۱۹۶۱ء میں بھی بالکل ایسے ہی تھے۔ عمر کے ساتھ مزاج میں بردباری اور سنجیدگی آ جایا کرتی ہے، مگر شوکت صاحب کی بات چیت کا انداز بالکل نہیں بدلا تھا۔ جوانی کا سا ہی چلبلا پن قائم تھا، بلکہ نخرا پن کچھ بڑھ ہی گیا تھا۔ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء کے آخر میں پاکستان سے بھارت جو خیر سگالی کا ثقافتی وفد گیا تھا اس میں لاہور سے امرتسر تک اور امرتسر سے دلی تک ذوالفقار بخاری، سید محمد جعفری، شوکت تھانوی اور میں، ہم چاروں ایک ہی ڈبے میں تھے۔ بالعموم بخاری صاحب اپنی بذلہ سنجی اور چرب زبانی سے سب کو دبا لیا کرتے ہیں، مگر اس سفر میں شوکت تھانوی نے سب کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

پان کے خرچ کے علاوہ شوکت صاحب اپنے لباس پر بھی روپیہ صرف کرنے پر مجبور تھے۔ وہ روزانہ ایک جوڑا بدلتے تھے اور ٹیپ ٹاپ سے رہتے تھے۔ بعد میں شرٹ بھی سلوا لیے تھے۔ وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ آدمی کی عزت اس کے کپڑوں سے ہوتی ہے۔ جیسے الفربہ خواہ مخواہ مردِ معقول ہوتا ہے اسی طرح بڑھیا لباس والا خواہ مخواہ معزز سمجھا جاتا ہے۔ مجھے اس کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ میرے پرانے ہم جماعت اور بے تکلف دوست ممتاز حسن صاحب نے مجھے کہلوا بھیجا کہ کسی دن شام کو ۵ بجے میرے دفتر آ جاؤ، ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ممتاز صاحب اس وقت سیکرٹری فنانس تھے۔ میں سیدھے سبھاؤ ان کے دفتر وقتِ مقررہ پر پہنچ گیا۔ ان کا چپراسی مرغِ زرّیں بنا باہر کھڑا تھا۔ میں نے پرچے پر اپنا نام لکھ کر اسے دیا کہ صاحب کو دے آئیے۔ اس نے بڑی بے مہری سے میری طرف دیکھا اور بولا "بنچ پر بیٹھ جاؤ۔ صاحب کام کر رہے ہیں۔" میں بیٹھ گیا، وہ بھی تھوڑی دیر بعد آ کر مجھ سے ذرا ہٹ کر اسی بنچ پر آ بیٹھا۔ دس منٹ گزر گئے، اس نے مجھ سے بات کرنی بھی گوارا نہیں کی۔ میں نے کہا "آپ جا کر میرا پرچہ تو دے آئیے، مناسب سمجھیں گے تو بلا لیں گے۔" بولا "اندر کسی بڑے افسر کے ساتھ ضروری کام کر رہے ہیں۔ ابھی ٹھہرو۔" ٹھہرے رہے۔ جب پھر کچھ وقت گزر لیا تو میں نے کہا "صاحب نے مجھے بلایا ہے، میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا ہوں، آپ اطلاع تو کر دیجئے۔" وہ میری چٹ لے کر اندر چلا گیا اور وہاں سے چائے کے خالی برتن لے کر باہر نکلا۔ میری چٹ اس کے ہاتھ ہی میں تھی۔ برتن لیے چلا گیا مجھ سے کچھ نہ بولا۔ جب واپس آیا تو آ کر خاموش بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا "چٹ نہیں دی؟" اس نے نہیں کہہ کر منہ پھیر لیا۔ میں جلتا رہا، بھُلستا رہا۔ پون گھنٹے بعد جب ممتاز صاحب اپنے معزز مہمان کو رخصت کرنے دروازے پر آئے تو اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ چونک کر بولے "ارے! آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں، پون گھنٹے سے۔ اور آئندہ آپ مجھے کبھی اپنے دفتر نہ بلائیں، میں آنے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔" وہ "آئیے آئیے" کہہ کر گلے میں ہاتھ ڈال کر

[illegible] مارے چھپتے گئے۔ بولے: آپ اندر نہیں آ گئے؟ میں نے کہا وہ جو باہر بہت سا [illegible] ہے [illegible] بھی، مگر اس کے اندر نہیں سماتی۔ آپ کے یہاں [illegible] کہاں [illegible] ہیں؟ [illegible] نہیں، ایسا تو نہیں ہوتا [illegible] بن گئے [illegible] [illegible] کا [illegible] گھنٹوں [illegible] [illegible] کی حالت۔ [illegible] صاحب [illegible] [illegible] [illegible] ہوگا [illegible] صاحب [illegible] کچھ [illegible] ہوگا [illegible] شرمندہ ہو کر [illegible] نہیں جاتی ہیں۔ تم مجھے معاف کرو۔

تو شوکت صاحب ہمیشہ اپنی [illegible] لباس پہنا کرتے تھے۔ [illegible] [illegible] مثل مشہور ہے [illegible] لباس [illegible] آج کا [illegible] نہیں ہے، [illegible] سے ہی چلا آتا ہے۔ شیخ سعدی [illegible] دعوت میں داخل ہونے سے دربان نے روک دیا تھا۔ جب وہ جبہ پہن کر گئے تو عزت و تکریم کے ساتھ [illegible] گیا۔ جب کھانا سامنے آیا تو حضرت شیخ نے شوربے میں اپنی آستین ڈبوتے ہوئے فرمایا "پیجیے" تو لوگوں نے [illegible] پوچھا تو فرمایا "اسی نے تو مجھے دسترخوان تک پہنچایا ہے"۔ [illegible] بے رنگ [illegible] کپڑے پہن [illegible] لہٰذا [illegible] ہر دور [illegible] پہننے ہی میں عزت ہے۔

شوکت صاحب میں ایک بڑی خوبی [illegible] کہ شاعروں کے ساتھ [illegible] میں بسنے کے باوجود شراب نہیں [illegible] تھے۔ آئے دن غیر ملکی سفارت خانوں میں کاک ٹیل پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں، بلکہ ہمارے بڑے آدمیوں نے بھی [illegible] شانِ امارت میں داخل کر لیا ہے کہ جب ان کے ہاں "معزز مہمان" آ رہے ہوں تو [illegible] کا بھی اپنے ہاں اہتمام [illegible] کی تو قاضی کو بھی حلال ہے۔ مگر ان "قاضی جی" نے اسے ہمیشہ حرام ہی سمجھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر میں نے اچھے ثقہ لوگوں کو چسکی لگاتے دیکھا ہے کہ بس دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔

عورتوں کے باب میں بھی شوکت صاحب ندیدے نہیں تھے۔ بلکہ خواتین سے ملنے میں بڑی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے یہ نہیں کہ ہمارے بعض شاعروں کی طرح جس عورت سے بھی تعارف ہوا چھوٹتے ہی سمجھ لیا کہ پہلی ہی نظر میں وہ ان پر عاشق ہو گئی اور لگے اس کی فرضی داستانیں سنانے۔ شاید اس وضع احتیاط کی وجہ یہ ہو کہ شوکت صاحب کی شادی نوجوانی ہی میں ہو گئی تھی۔ انہی کی بے تکلف گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ کبھی اوائل شباب میں "جنگلی جڑی بھی پی لیا کرتے تھے" مگر اس کا انھیں چسکا نہیں پڑا تھا۔ وہ ایک طرحدار جوان تھے، وہ اگر بگڑنا چاہتے تو خوب پیٹ بھر کے بگڑ سکتے تھے، مگر اللہ نے انھیں اس خرابی سے محفوظ رکھا ——— وہ بھی کسی حد تک!

عجیب و غریب ادبی شخصیت

محمد شعیب (وزیر خزانہ)

شوکت تھانوی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے میں اُن کے مطبوعہ کلام کے ذریعے سے ایک مدت سے اُن سے تعارف رکھتا تھا۔

ادبی نقطۂ نظر سے اُن کے مضامین، اُن کے افسانوں اور ناولوں سے بہتر ہیں۔ طنز و مزاح کی جو چاشنی اُن کے مضامین میں ہے وہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں، پلاٹ سے قطع نظر نہیں ملتی۔ متعدد کتابوں کی تصنیف کے علاوہ مدت سے وہ ریڈیو پر ہفتہ وار مزاحیہ پروگرام بھی نشر کرتے تھے۔ پہلے لاہور سے اور پھر پنڈی سے۔ پنڈی میں دار الخلافہ تبدیل ہونے کے بعد وہ اخبار "جنگ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور مغربی پنجاب میں "جنگ" کی مقبولیت کا انحصار خود شوکت تھانوی کی ذات تھی وہ عجیب و غریب ادبی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور مضامین، افسانے اور ناولوں کی تصنیف کے علاوہ ایک فلم میں بہ حیثیت فنکار بھی حصہ لے چکے تھے۔ غرضیکہ ادب اور آرٹ کی ہر ایک صنعت پر اُن کو دسترس تھی۔ بہت کم لوگ ہیں جو بیک وقت شاعر بھی ہوں اور افسانہ نگار بھی۔ ناول نگار بھی ہوں اور فلمی فنکار بھی۔ یہ ہمہ گیری شوکت صاحب ہی میں پائی جاتی تھی۔ اُن کی قبل از وقت وفات سے جو خلا ادبی حلقے میں پیدا ہوا ہے وہ مشکل سے پورا ہوگا۔

"جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں"

حجاب امتیاز علی

[illegible] ہے [illegible]

[illegible] سنجیدگی [illegible] سے بدل [illegible]
جو [illegible] سب سے [illegible] چاہ [illegible] ہے [illegible]
[illegible] وہ نو پڑے انجمن پسند و مجلس آرا [illegible] تھے۔ [illegible] کی [illegible]
میں ایک خفیہ [illegible] محسوس کی تھی [illegible]
[illegible] ہے [illegible]
یا وہ غیر معمولی طور پر [illegible] جاتی [illegible]
[illegible] ہوتی [illegible]
نے میری حالت [illegible] نہ [illegible] لطف [illegible] گفتگو
میرے چند منٹ بھی سکونِ قلب کے نصیب نہ ہوتے تھے۔
ایک دن اخبار پڑھتے تھے۔ [illegible] شوکت [illegible] تو مجھے [illegible]
جو کسی ٹانک یا پیٹنٹ دوا کا نام ہو۔ میں نے ان کی [illegible] پر زیادہ توجہ نہ دی۔ طبیعت کی افسردگی کی وجہ سے میں اس زمانے
میں تو ہم بیزار سی رہتی تھی۔ اور کسی سے مطلق نہ ملتی تھی۔
لیکن ایک روشن سہ پہر امتیاز اور شوکت میری خواب گاہ کے دروازے میں کھڑے ہوئے نظر آئے۔ میں نے با دلِ
ناخواستہ سلام کا جواب دے کر بیزاری کے عالم میں سر دیوار کی طرف پھیر لیا۔ شوکت صاحب [illegible] واحد میں [illegible]
اور میرے درمیان آکھڑے ہوئے۔ میں نے دائیں طرف سر پھیرا تو وہ لپک کر دائیں طرف آگئے [illegible] طرف [illegible]
نازل ہوگئے۔ لیکن نہایت خاموشی اور سنجیدگی سے۔
ان کی ان حرکات پر میں مسکرائی تو فوراً پوچھنے لگے: "ہائیں۔ آپ مسکرائیں کس بات پر؟ آپ کی حالت نہایت
مخدوش ہے یہ مسکرانے کا موقع نہیں ہے۔"
یہ سُن کر میں نے بیزاری کے لہجے میں کہا: "مجھے ڈراتے ہیں۔"
کہنے لگے "یہ ڈرانے ورانے کی بات نہیں۔ یقین کیجئے۔ آپ کی حالت بہت نازک ہے۔"

[illegible] مان کر کہا تھا "آخر آپ سب بُت بنے کیوں بیٹھے ہیں؟"

"اس لیے کہ آپ کی موجودہ حالت دیکھی نہیں جاتی" [illegible] رہا ہوں مایوس نہ ہو جائیے۔ [illegible] کچھ نہیں [illegible] جیسے [illegible] کے پاس بیٹھتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک [illegible] عجب کی لہر [illegible] علاج [illegible] اور بے شمار [illegible] ان کی ہنسی [illegible] عجیب صاحب کی باتوں [illegible] مجھے ہنسی آتی گئی۔ اور وہ [illegible] افسردگی کی بجائے [illegible] گزرتی گئی۔

[illegible] ہوئے۔ شوکت [illegible] باقاعدگی سے آتے [illegible] شام کی چائے [illegible] ہم سب کی بھوک کو [illegible] اور کھانا یا چائے [illegible] ختم کر دیتا۔

[illegible] مستقل مرض تھا [illegible] سب [illegible] ڈرائیو پر نکل جاتے۔ شوکت [illegible] چُپکے نہ رہتے مسلسل باتیں کرتے اور باتیں بھی [illegible] دلچسپ [illegible] مضحکہ خیز۔۔۔ کہ مالیخولیا والا مریض بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جائے۔

ایک دفعہ ہم سب ایک ہی [illegible] ڈرائیو کو نکلے۔ سامنے [illegible] کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ میں نے، ضیا کو مخاطب کر کے کہا "آپ دیکھئے تو، چاند کتنا بڑا ہو گیا!"

فوراً شوکت کی آواز آئی۔ "مگر ضیا اب تک نہیں آئی۔"

ان کی باتوں نے آخر میرے [illegible] اضمحلال کو کچھ کچھ کم کر دیا اور میری طبیعت نسبتاً پرسکون رہنے لگی اس وقت سے ہم سب ان پر ایمان لے آئے۔ جب کوئی غمگین یا متاثر ہوتا فوراً شوکت صاحب کے لیے کار بھجوا دی جاتی۔ وہ بھی ایسے بادہ واقع ہوئے تھے کہ گرمیاں ہوں یا سردیاں کار کبھی خالی واپس نہ لی۔ ایک دفعہ اعتماد کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی۔ فون کر کے شوکت صاحب کو تاکید کی کہ فوری امداد کا بکس لے کر تشریف لے آئیے۔ گرمی کی تپتی ہوئی دوپہر تھی مگر شوکت صاحب آ گئے آتے ہی یاسمین سے کہا "دیکھا جنجی۔ ساری دوپہر کوئی ٹھنڈی شے اور رقیق سی چیز مجھے مسلسل پہنچتی رہے۔ میں تمہارے ابا کے علاج کے لیے آیا ہوں۔" اور پھر ساری دوپہر خس خانہ قہقہوں اور چہچہوں سے گونجتا رہا۔ اور شام کو اعتماد ہشاش بشاش باہر نکل آئے۔ اس طرح وہ ہمارے خاندانی طبیب بن گئے تھے۔

یاسمین کے امتحان کا زمانہ آیا تو ایک روز پہلے وہ بے حد متوحش اور غمگین ہو گئی۔ کہنے لگی "شوکت چچا کو بلا لیجئے تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔ چنانچہ ہم سب شوکت کے ہاں پہنچے۔ انھیں ساتھ لے کر ایک لمبی ڈرائیو کو روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے ہمارے ساتھ ہمارے ایک اور دوست بھی تھے جن کے بال کسی قدر لمبے تھے اور وہ ان پر بہت نازاں تھے اس غلط فہمی کا شکار بھی تھے کہ لمبے بال ان کے حسن میں چار چاند لگانے کے علاوہ انھیں آرٹسٹ ثابت کرنے میں بھی کارآمد ہیں۔ انھیں دیکھ کر شوکت نے کچھ دیر تو ضبط کیا پھر پوچھا "کیوں صاحب۔ آپ کی سالگرہ کس تاریخ کو ہوگی؟" انھوں نے مسکرا کر ایک ادائے محبوبی سے فرمایا "جی۔۔۔ ۱۵ اگست کو" شوکت بولے "اس لیے پوچھا کہ اس موقع پر میں آپ کو بالوں میں لگانے کا فیتہ اور ماتھے پن

ہے [illegible] دینا چاہتا ہوں تو چاندی کی [illegible] ہوتی تھی۔ [illegible] مکان کی [illegible] عجیب [illegible] گئی۔

وہ پڑھے لکھے مشہور شاعر بھی تھے [illegible] حاصل [illegible] شاعری کا [illegible] چکا تھا۔ [illegible] جو حالی [illegible] شوکت [illegible] [illegible] سے [illegible] دونوں [illegible] ہو جاتی تھی۔

[illegible] عادت [illegible] خوب [illegible] تھی۔ [illegible] نظر آتے ہیں۔ [illegible] والا بھی۔

افسانہ اور شوکت دونوں [illegible] پان کھانے کی بہت بری عادت تھی۔ [illegible] صاحب کی [illegible] عادت اب [illegible] شوکت [illegible] آرٹ [illegible] خائف اس بات سے رہتی تھی کہ اس کی [illegible] فرنیچر قالین [illegible] آخری ہو جاتی تھی۔ [illegible] طرح فرنیلوں کے بعد میرے [illegible] منزل کی [illegible] ہوتی [illegible] ایک اونچی میز پر رکھوا دیا [illegible] کر دیا [illegible] بھی پان کھانا ہو انھیں حدود میں رہ کر کھائے۔ اور پان کھانے کے بعد [illegible] ایک طرح رومال سے [illegible] جو پان دان میں [illegible] صاف کر کے [illegible] رہے۔ مگر باوجود میری اس احتیاط کے چند ہی ہفتوں میں پاندان کے قریب کی دیوار پر گز گز بھر تک کتھے کے چھینٹوں نے نقش و نگار بنا دیئے تھے۔ نہ معلوم پان کھانے میں کتھا کیونکر اُڑ اُڑ کر دیوار کی طرف جاتا اور اسے رنگین بناتا تھا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو میں نے تہیہ کر لیا کہ پاندان ہی گھر سے اُٹھا دینا چاہیئے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس کی اطلاع شوکت صاحب کو ملی تو فوراً آئے اور کہنے لگے کہ "میں نے پاندان کے متعلق ایک ترکیب سوچ لی ہے۔ اس پر عمل کرنے سے بانس بھی رہے گا بانسری بھی بجے گی۔ یعنی پاندان بھی گھر سے نہ اُٹھے گا اور دیوار بھی صاف ستھری رہے گی۔ میں نے پوچھا وہ کیا ترکیب ہے؟ کہنے لگے "رات بھر سوچتا رہا جب کہیں جا کر تدبیر ہاتھ آئی ہے۔ آپ یوں کیجئے کہ پاندان کے قریب کی دیوار دو دو گز کولتار سے سیاہ کرا دیجئے۔"

کسی زمانے میں ہماری کوئی دعوت شوکت کے بغیر ہوتی نہ تھی۔ لوگ ان سے ملنے اور ان کے لطیفے سننے کے اتنے مشتاق رہتے تھے کہ صبح ہی فون کر کے پوچھا کرتے تھے "آج کے ڈنر میں آپ کے ہاں شوکت تو موجود ہوں گے نا؟"

اپنی اسی خوش مزاجی اور شگفتگی کی وجہ سے وہ تمام معیاری حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔

جب وہ جنگ میں ملازم ہو کر پہلے کراچی اور وہاں سے پنڈی گئے تو تعلقات پر اوس سی پڑ گئی۔ ایک دو دفعہ دوستوں سے سنا کہ شوکت لاہور آئے ہیں۔ مگر وہ ہم سے ملے بغیر واپس چلے گئے۔ وجہ سمجھ میں نہ آئی مصروفیت؟ کوئی غلط فہمی؟ اتفاق؟ جو کچھ بھی تھا۔ دل مکدر سا ہو گیا۔

ان سے آخری مفصل ملاقات ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء یوم پاکستان کے موقع پر لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں ہوئی تھی۔

مہمانوں کا اژدہام تھا۔ دور سے انھوں نے سلام کیا۔ دور سے ہی میں نے جواب دیا۔ پھر وہ امتیاز سے باتیں کرتے ہوئے مہمانوں کے ہجوم میں جا ملے۔

اس کے دوسرے یا تیسرے ہی دن سنا کہ شوکت سخت بیمار ہیں۔ ان کا مرض بغیر معلوم ہوئے پیچیدہ اور اندیشناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ ٹی۔ بی؟ دل؟ کینسر؟ بلڈ پریشر؟ ——— ڈاکٹر متحیر تھے کہ کس مرض کی تشخیص کریں۔ اور مرض دن بدن بڑھ رہا تھا۔

میں انگشت بدنداں تھی۔ ابھی یومِ پاکستان کے استقبالیہ میں تو وہ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اور آج ——— اتنی جلدی یہ حالت ہو گئی!

پھر روز بروز ان کی بیماری تشویشناک صورت اختیار کرتی گئی۔ وہ نہ چاہتے تھے مگر دوستوں اور خیر خواہوں نے اصرار کر کر کے ان ہی کے آرام و سکون کے لیے انھیں البرٹ وکٹر ہاسپٹل میں داخل کرا دیا۔ ہم کو باقاعدگی سے اطلاعات ملا کرتیں کہ آج شوکت کو نیا خون دیا گیا۔ آج فلاں نئی دوا آزمائی گئی۔ آج طبیعت مقابلتہً بہتر رہی۔ میں اور امتیاز ہر روز ارادہ کرتے کہ شام کے وقت جا کر شوکت کو دیکھ آئیں۔ موٹر سوار ہونے کے بعد کار سے اتر پڑتے۔ کسی طرح ہمت نہ پڑتی۔ نہ طبیعت چاہتی کہ چہکنے والے شوکت کو بسترِ مرگ پر سسکتے دیکھیں۔ دل کہتا شوکت کی جگہ زعفرانِ محفل و انجمن ہے ہسپتال نہیں۔ آخر اسی کشمکش و ذہنی انتشار میں ہم نے ایک ہفتہ ضائع کر دیا۔

آخر ایک دن دل کڑا کر کے اور ایک دوسرے کی ہمت بندھا کر ہم دونوں ہسپتال جا پہنچے۔ ہسپتال کے لمبے لمبے برآمدے سخت ماتمی نظر آ رہے تھے۔ شام بے حد افسردہ تھی اور ہوائیں خاموش۔ ان کے کمرے کے آگے جا کر تردد کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کیا معلوم۔ آج طبیعت کیسی رہی ہو گی! اسی تگ و دو میں کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک ان کے صاحبزادے باہر نکل آئے اور ہمیں دیکھ کر دروازہ کھول دیا اور اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم اندر گئے۔ بستر ایک طرف دبلے شوکت چپ چاپ پڑے تھے۔ چند ہی روز میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر پہلے ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر وہ رو پڑے ——— دوستوں کو ہنسانے والے کا یوں رو پڑنا ناقابلِ برداشت تھا۔ کیا کہہ کر انھیں حوصلہ دلائیں۔ کس بات سے انھیں بشاش بنائیں۔ کچھ نہ سوجھتا تھا۔ اور سوجھتا بھی کیا۔ وہ اتنے ذہین تھے کہ ہماری جعلی تسلیاں انھیں اطمینان بخش نہ سکتی تھیں۔

میں کمرے سے چپ چاپ باہر نکل آئی۔ دوبارہ اندر نہیں گئی۔ باہر ان کی مغموم بیگم اور چاہنے والا بیٹا دم بخود کھڑے تھے۔

پھر ۹ مئی کی صبح اچانک سنا کہ شوکت نے ہم سے منہ موڑ لیا۔

امتیاز انتہائی اندوہ سے کہنے لگے: "کس کس کا صدمہ سہوں۔ راجہ غضنفر کا غم نہیں بھولا شوکت داغ دے گیا! پطرس گیا۔ سالک گیا۔ غضنفر گیا۔ اور اب شوکت بھی روٹھ گیا!" ——— وہ اپنے ایک ایک دوست کا نام لینے لگے۔ جو اب ہم میں موجود نہیں لیکن جن کی یادوں کے چراغ نہاں خانۂ دل میں ہمیشہ روشن رہیں گے۔

میں سوچتی ہوں ان کی [illegible] ہوئی۔ موت [illegible] بہت معمولی لفظ [illegible] کا حادثہ مرگ بہت عظیم ہے۔

[illegible] زندگی ایک [illegible] تو دل [illegible] ہو جاتا ہے۔ [illegible] بڑے بڑے [illegible] ہو جاتے، جیسے بعض [illegible] ہو جاتے ہیں۔ [illegible] ہیں [illegible] شگفتہ [illegible] منافق ہیں۔ [illegible] اندھیرا ہے۔

آہ! شوکت

محمد عبدالرؤف عباسی

سر کنم تا در اگر تاب شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری

اواخر ۳۹ء یا اوائل ۴۰ء کی بات ہے دسمبر یا جنوری کا مہینہ ہے جب کا جاڑا پڑ رہا ہے کہ کاتب الحروف اپنی زندگی کا اہم ترین اقدام کر گزرا۔

سبب کو نظر انداز کیا۔ مسبب اعلیٰ کی کارسازی پر نگاہ رکھی اور طے کر لیا کہ قدم عشق بیشتر بہتر ہے حق۔ ہفتہ وار بہت نکل چکا اب یہ بھی ایک قدم آگے بڑھے۔

اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک میرا مدار کار ساز عالم کی کارسازی پر مبنی یقین رہا اور آج بھی ہے۔ اس وقت نہ کوئی مشیر معاون تھا نہ شریک کار، بہر نوع اللہ کا نام لے کر ؎

درین دریائے بے پایاں درین امواج شور افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

ہفتہ وار حق بہت کامیاب تھا، روزنامہ ہوا تو کہنے والوں نے چار دن کی چاندنی کہہ کر تمسخر کیا۔ بہر صورت گزشتہ ۳۵ برس سے یہ چاندنی ضیا بیز اور ضو بار ہے بقول کسے ؎

فانوس بن کے آپ حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ تھا کہ اسٹاف میں اضافہ ہو، آدمی ایسے ہوں کہ جو تنخواہ اتنی ہی لیں کہ جتنی حق کی وسعت کے اندر دیکھیں محنت اور تن دہی سے اپنا کام انجام دیں۔ نگاہِ انتخاب شوکت تھانوی پر پڑی اور اسی جگہ قائم ہو گئی۔

یہ وہ وقت ہے کہ سودیشی ریل چھوٹ چکی ہے۔ یہ اور اس قسم کے دیگر طنزیات دنیائے ادب سے خراج تحسین وصول کرنے لگے ہیں۔ اس کا دلکش اور ظرافت آمیز اندازِ تحریر مقبول عام ہی نہیں خواص پسند ہو چکا ہے۔

میں نے شوکت سے صرف اتنا کہا کہ سودیشی ریل بحمد اللہ چل رہی ہے لیکن دنیا میں تم کو بہت کچھ کرنا ہے۔ اب اپنا اخبار

[illegible] اخبار [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] جناب [illegible] آپ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] وہ اوقات کیا ہوں گے

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] منصب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

اس [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بہت پہلے [illegible] کرنا [illegible] ایک [illegible] تھا۔

صبح کا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] شام کی تفریح سب ساتھ ہونے لگی اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

میرے والد مغفور کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] پنجہ حضرت پیر و مرشد کے حضور میں پیش کر دیا [illegible] [illegible] [illegible]

شوکت بجائے خود ایک انجمن تھا۔ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ [illegible] حد تک [illegible] [illegible] [illegible] کسی دوسرے پر نہیں۔

اس کا جوہرِ اصل ظرافت تھا۔ بات میں بات پیدا کرنا [illegible] زندہ دلی، شگفتہ مزاجی محض عطیہ [illegible] کیونکہ لا انتہا تھی۔ ظرافت کی ایک نثر ایک انگریز ادیب پی۔ جی۔ ووڈ ہاؤس کے ہاں [illegible] دیکھئے تو [illegible] کے الٹ پھیر سے ہر جگہ زعفران زار [illegible] بالکل یہی صورت شوکت کے ہاں ہے۔ ووڈ ہاؤس زندہ قوم کا فرد ہے [illegible] سب ادب مدت تک زندہ رہے گا اور شوکت کو دنیا جلد ہی بھول گئی۔

اخبار جنگ کے پنڈی ایڈیشن کا مدیر اعلیٰ شوکت تھا۔ خیال تھا کچھ نہیں تو [illegible] اس کے مذاکرات سے اخبار کے صفحات لبریز نکلیں گے مگر یہ بھی نہ ہوا۔ رہے نام اللہ کا۔

اللہ نے شوکت کو وہ ذہنِ رسا دیا تھا کہ جو ہمہ گیر تھا۔ جدھر رخ کیا ایک نیا راستہ اپنے واسطے نکال لیا۔ شاعری ہو یا ادب سب میں اپنے جوہر دکھائے۔

شوکت من حیث الشاعر

افسوس یہ ہے کہ اس کا کلام پیشِ نظر نہیں ہے ورنہ یہ ثابت کرنا بہت دشوار نہیں تھا کہ اپنے ہم عصر شعرا میں بہ زود ایک

وہ کسی سے بہت پست نہیں تھا۔

انشا نصیرالدین حیدر کے دربار کا مایہ ناز شاعر، علم و فضل، منطق، عروض اور فن شعر کی باریکیوں پر پوری طرح حاوی، مرزا مظہر خان آرزو ایسے مسلم الثبوت استاد نے کم سنی کے دنوں میں بہت سے میر و سودا وغیرہ کے ساتھ شعر و سخن کے مطلع یہاں تک پہنچ ہو کر بیٹھے اس بھرے دربار کہ انشا کے علم و فضل کو شاعری نے کھو دیا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے۔ بر ایں ہمہ یہ تھا کہ سعادت علی خاں نے انشا کو موقع ہی نہ دیا کہ انشا غور و فکر سے شعر کہتے ورنہ جیتے جاگتے جوہر دکھاتے۔

کسی سے مقابلہ نہیں ہے۔ شوکت بدقسمت نہیں تھا۔ کہنا یہ ہے کہ شوکت نے کبھی غور و فکر سے شعر نہیں کہا اور نہ لکھنے کے بعد نظر ثانی کی۔ اس کے باوجود جو کچھ جب کہا، ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ اس کا بے پناہ مزاح عوام میں مقبول تھا جو کچھ وہاں رہ گیا۔ متعدد غزلیں ایسی ہوں گی کہ جو کسی کاغذ پر نہ آئیں۔

شوکت من حیث مصنف

اللہ نے شوکت کو بہت کچھ دیا مگر عمر نہ دی۔ جن لوگوں نے شوکت کو بہت قریب سے دیکھا ہے متحیر ہیں کہ اس ہنسنے ہنسانے والے کھلنڈرے کو اتنا وقت کہاں ملا کہ اتنی سی عمر میں کم و بیش پچاس کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان میں سے بیشتر چھپ چکی ہیں اور بہت ایسی بھی ہیں کہ جو مسودہ کی حد سے آگے نہ بڑھیں۔ ان کے پاکستانی احباب میں اگر کوئی صاحب اتنی ہمت کریں کہ مسودوں کو فراہم کر کے شائع کرا دیں تو اس کی معصوم خورد سال لڑکیاں کبھی کسی کی دست نگر نہ ہوں۔

ریڈیو کی طرف جھکا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کی صف اولین کی زینت ہو گیا۔ راقم الحروف کو کبھی یہ اندازہ نہ ہوا کہ شوکت کو موسیقی سے بھی کوئی مناسبت ہے۔ مشاعروں میں ترنم سے غزلیں پڑھنے ضرور رہا۔ نوخاستہ شعرا میں آج بھی بیسیوں ہیں کہ جو اس کی غزل سرائی کی نقالی کرتے ہیں۔

عالمگیر جنگ ثانی میں حکومت وقت نے اپنے پروپیگنڈے کے واسطے دو آدمی منتخب کیے۔ پنجاب میں حفیظ جالندھری اور یو۔ پی میں شوکت۔ کام یہ تھا کہ شعر و نغمہ کے ذریعے عوام الناس کو حالات حاضرہ سے باخبر رکھیں۔ ہزار روپیہ تنخواہ، بھتہ اور سفر خرچ مزید برآں مصارف کا بجٹ شاید ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ۔ اور بہت سے ہوں گے کہ جنہوں نے اتنے کم وقفے میں ایسی محیر العقول ترقی کی مگر شوکت کا ایسا علو ظرف نہ دیکھا۔

شوکت کی ہردلعزیزی

یہ ہرگز نہیں تھا کہ شوکت کا قلم محض گلباری کے لیے وقف ہو، آتشباری پر آجاتا تھا تو خوف معلوم ہوتا تھا کہ کہیں کاغذ آگ نہ پکڑ لے۔

حیرت یہ ہے کہ اس دریدہ دہنی کے باوجود میرے علم میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے کہ جو حقیقتاً اس کا بدخواہ ہو۔
کوئی پھبتی زیب برخود غلط آدمی اس کے منہ آیا، اس کے اعمال و افعال کا تجزیہ کر ڈالا۔ ہر فقرہ ایک طرف تو زعفرانی تھا

[illegible] دوسری حرکت جو بری تھی۔

ایک صاحب کو میں جانتا ہوں کہ جو [illegible] کے [illegible] ہے پتا [illegible] شوکت [illegible] وقت [illegible] بات [illegible] ۔ دور سے آواز [illegible] بہت قریب ہے [illegible] ہوا ہے ۔ تھا [illegible] ہے کہ [illegible] ایک [illegible] بات [illegible] چہرہ پر کسی قدر [illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] اور شعر [illegible] پڑھا ہوں سنئے ؎

[illegible]

[illegible]

اس وقت بھی یہ صورت ہے کہ ان کا جو [illegible] آ جاتے [illegible] تڑپ اٹھتا ہے۔ شوکت [illegible] ۔ [illegible] ایک [illegible] اس طرح کہ جس طرف [illegible] کے پیرستے (خود ہی [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] ہونے کا جواز رکھتا ہے۔ [illegible] ۔

ہندوستان میں شوکت نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سوسائٹی کی صفِ اول میں پہنچ گیا۔ [illegible] شوکت [illegible] ہوگا اور نہ یہ جگہ ہوگی۔ خیر! یہ تو رفتارِ زمانہ ہے اس کا گلہ نہیں۔ صدیاں گزر گئیں [illegible] ہوا [illegible] سچی امیرزادہ، امیر، ماہرِ موسیقی، شاعرِ اعظم [illegible] کامل ہوتا۔ قرن پہ قرن گزرتے جاتے ہیں [illegible] کا جواب نہیں پیدا ہوتا۔

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ شوکت ان کا ہم رتبہ تھا۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ مگر [illegible] ضرور ہے کہ شوکت بھی کسی ایک راستہ کا پابند نہیں ہوا۔ جس راستہ پہ چلا بڑھتا ہی چلا گیا۔

شوکت پاکستان میں

شعر ہے کہ ؎

دو چیز آدمی را کشد زور زور   یکے آب و دانہ دویم خاک گور

اس دوہری کشش سے شوکت کیسے نکلتا۔ پاکستان معلوم ہوتا تھا کہ اس کا راستہ ہی دیکھ رہا تھا۔ سوسائٹی میں [illegible] گیا۔

اب معاشرت بھی امیرانہ تھی۔ پاکستان کے عمائدین میں کون تھا کہ جو اس کا مداح و گرویدہ نہ ہو۔

راقم الحروف کے ساتھ شوکت کا انداز اس سے کہیں زیادہ پُرخلوص اور برادرانہ تھا کہ جس سے ۲۲ برس پہلے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔

۵۴ء میں راقم الحروف کا پاکستان جانا ہوا۔ اس وقت شوکت لاہور ریڈیو سے وابستہ تھے۔ غیر ممکن تھا کہ شوکت

کے دن قیام کے لیے مجبوراً کراچی چلا جاتا۔ چنانچہ اس کے اُن دو تین دن قیام ہو گیا۔ ایک روز ریلوے کے ایک آفیسر مسٹر معین الدین نے اپنی ترقی کے سلسلے میں بہت بڑی دعوت دی کہ جس میں شوکت بھی مدعو تھے۔ اس نے ان کو لکھ دیا کہ لکھنؤ سے میرے صاحبزادے آ گئے ہیں، میں حاضری سے معذور ہوں۔ خط دیکھ کے مسٹر معین الدین خود دوڑ پڑے۔

شوکت کی خاطر سے مجھ کو جانا پڑا۔ دعوت میں اعلیٰ حکام و عمائدین کا اجتماع تھا اور شوکت اس بزم کی شمعِ محفل۔

شوکت کی وضعداری اور صلح صفائی کی انتہا ملاحظہ ہو کہ مجھ کو جس سے بھی متعارف کرایا یہی کہا کہ آپ جس حال میں مجھ کو دیکھتے ہیں وہ اسی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ سچ ہے۔ نہد شاخِ پُر میوہ سر بر زمیں۔

شوکت کی بیماری اور سفرِ آخرت

شوکت بیمار ہوا۔ مرض و علاج۔ جگر پر کینسر، علاج معالجے کے سلسلے میں تمام تر دوا دوش بے کار رہی۔ اس نے ہر طرح کی تکالیف اٹھا کے گناہوں کا کفارہ دیا اور رہگرائے عالمِ جاودانی ہوا۔ سب نام اللہ کا۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تاریخِ انتقال

دلِ خوں گشتہ در فغاں آمد — خاک بر فرقِ این و آں کردم
نالہ چوں گشت ہم ردیفِ زباں — رخنہ در سقفِ آسماں کردم
بہرِ تاریخ رحلتِ شوکت
سینہ از داغ گلستاں کردم

مسکراہٹوں کا سفیر

ماہر القادری

اللہ تعالیٰ کی اس میں بڑی گہری مصلحت پنہاں ہے کہ اس نے مستقبل کا علم ہمیں نہیں دیا۔ ورنہ آدمی آنے والے کل کو کے بارے میں بھی قطعی طور پر علم نہیں کہ منہ کیا ہوگا، عالم غیب و شہادت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ منصب اللہ کے سوا دوسرے کسی کو زیب نہیں دیتا۔ جو تقدیر بتانے والے نجومی اور جوتشی ہیں وہ مستقبل کے واقعات بتا کر خوب مال بٹورتے ہیں۔ اندھیرے میں اٹکل سے تیر چلاتے ہیں۔ جوتشی نے جو کچھ کہہ دیا اب اتفاق سے ٹھیک لگ گیا تو اس کی شہرت ہو جاتی ہے: کون بچہ بڑے ہو کر کیا بنے گا؟ اس کا حال کسی کو نہیں معلوم!

آج جو دنیا میں مشاہیر سمجھے جاتے ہیں انہیں اپنی زندگی اور شعور کے آغاز میں وہ نہیں جانتے تھے کہ ہم بڑے ہو کر کیا بنیں گے اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بلوغ و شعور کے بعد زندگی کا آغاز کسی پیشے سے ہوتا ہے اور مستقبل میں جا کر زندگی کی یہ لائن ہی بدل جاتی ہے۔

شوکت تھانوی مرحوم تھانہ بھون کے رہنے والے تھے۔ یہ قصبہ حضرت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔ یہاں خانقاہِ امدادیہ بھی ہے جو کم و بیش نصف صدی سے رشد و ارشاد و اخلاق کا مرکز رہی ہے۔ شوکت مرحوم مجھ سے بیان کرتے تھے کہ وہ اپنے بچپن میں بارہا حضرت مولانا تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور ان کے دستِ شفقت سے مس ہونے کی سعادت انہیں حاصل ہوئی ہے۔ تھانہ بھون پہلے ہی سے مشہور تھا۔ شوکت تھانوی نے اسے اور زیادہ مشہور کر دیا۔ مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی ہم وطنی اور زیارت و صحبت کا یہ اثر تھا کہ شوکت نے اسلامی قدروں پر بعض دوسرے غیر محتاط ادیبوں اور شاعروں کی طرح طنز نہیں کی۔ دین سے وہ ذہنی و فکری لگاؤ رکھتے تھے۔ اُن کی خواب گاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کا نقشہ آویزاں رہتا تھا اور دفتر جانے سے پہلے وہ اُسے آنکھوں سے لگاتے تھے۔

شوکت تھانوی نے کئی مرثیے بھی کہے ہیں۔ ڈاکٹر یاور عباس صاحب کے یہاں کراچی میں ہر سال بڑی دھوم کی مجلسیں ہوتی ہیں۔ شوکت ایک دن اپنا کہا ہوا مرثیہ پڑھتے اور سننے والوں سے بہت کچھ داد و تحسین وصول کرتے۔ انہوں نے لکھنؤ میں میر انیس کے پوتے دولھا صاحب عروج، پیارے رشید، فائق اور دوسرے مشہور و معروف مرثیہ خوانوں کو پڑھتے سنا تھا۔ اس طرح

شوکت صاحب کی مرثیہ خوانی میں وہی جھلک پائی جاتی تھی۔ تمہید کی تشریح کا بند پڑھتے تو اپنے ہاتھ کو اس طرح اٹھاتے جیسے پیچ پیچ تلوار کھینچی ہوئی ہے۔ آواز ہائے مارتی جو تحت لفظ کے لیے بہت موزوں تھی۔

قصبہ تھانہ بھون مولویوں اور مولاناؤں کی مشہور بستی ہے۔ وہاں کے ایک پولیس افسر کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا ہے اس کے بارے میں یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ بڑے ہو کر یا تو مولوی بنے گا یا پولیس کا کوئی عہدیدار! عربی کی مشہور ضرب المثل بھی ہے "الولد سر لابیہ"۔ انگریزی میں یوں کہتے ہیں A CHILD TAKES AFTER HIS FATHER.

اور

ہندی اردو میں یہ کہاوت اس طرح مشہور ہے۔ ---- باپ پہ پوت پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا

مگر ——— شوکت تھانوی ایک صحافت نگار کی حیثیت سے منظر عام پر آتے ہیں۔ شروع شروع میں وہ اخباروں میں سنجیدہ کالم لکھا کرتے تھے۔ یہاں کا رجحان شباب تھا تبھی جوانی کا اٹھان! جب وہ لکھنؤ پہنچے ہیں تو ابھی عمر میں بیس ہی چلی تھیں۔ ان دنوں روزنامہ "ہمدم" کے ایڈیٹر سید جالب دہلوی کی صحافت نگاری اور اخبار نویسی کی بڑی دھوم تھی۔ شوکت تھانوی کو اخباری دنیا میں سید جالب کی رفاقت میسر آئی اور اس رفاقت سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

شوکت تھانوی کی شاعری کا آغاز بھی سنجیدہ غزل گوئی سے ہوا اور دوسرے مشاعروں میں وہ غزلیں پڑھتے تھے۔ ان کی غزلیں قابل شہرت میں چھپ چکی ہیں۔ جناب منظر صدیقی اکبرآبادی (سابق مدیر ماہنامہ "کنول" آگرہ) کا بیان ہے کہ ان کے والد حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم نے شوکت تھانوی کے اس مجموعہ کلام کا تاریخی نام رکھا تھا۔

شوکت تھانوی شاعری میں مولانا عبدالباری آسی لکھنوی سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ آسی شاگرد تھے حضرت ناطق گلاؤٹھوی کے جو داغ کے شاگرد ہیں اور اللہ کے فضل سے ابھی تک بقید حیات ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ "پیر مغان سخن" لکھا جاتا ہے۔

مولانا عبدالباری آسی ضلع میرٹھ کی ایک بستی "الدن" کے رہنے والے تھے۔ وطن کی نسبت کے ساتھ ان کا نام یوں لکھا جاتا تھا "عبدالباری آسی الدنی"۔

آسی مرحوم کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ لوگ ان کے نام کو "آسی الدّنی" پڑھتے ہیں یعنی "الدنی" کی بجائے عربی قاعدے کے تحت "ل" ساکت اور "دال" مشدد، اس طرح "دنی" تلفظ کرتے ہیں۔ "دنی" عربی میں سفلہ، کمینہ اور ذلیل کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد آسی صاحب اپنے نام کے ساتھ "الدنی" کی بجائے "لکھنوی" لکھنے لگے۔ لکھنؤ ان کا وطن ثانی تھا۔ نولکشور بک ڈپو سے ملازمت کا تعلق تھا۔ شوکت تھانوی اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جناب آسی لکھنوی سے انہوں نے شعر و سخن میں مشورہ اور استفادہ کیا ہے۔

شوکت تھانوی مرحوم کا غالباً پہلا افسانہ جس سے وہ دنیائے اردو میں متعارف ہوئے "اُردو کا جوڑ" ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ملا رموزی کی "گلابی اردو" بہت پسند کی جاتی تھی۔ اور اردو زبان و ادب میں ملا رموزی شاید پہلے شخص ہیں جن کے مضامین کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔

شوکت تھانوی کے مزاحیہ افسانے اور تمثیلیں رسالوں اور اخباروں میں آنے لگے۔ یہاں تک کہ "سودیشی ریل" نے انہیں خاصا مشہور کر دیا اور اس کے بعد ان کی جو کتاب بھی مارکیٹ میں آتی وہ مقبول ہوتی اور ارباب ذوق ان کی نئی نئی کتابوں کے مشتاق اور منتظر رہتے

[illegible] کالموں میں [illegible] شوکت تھانوی [illegible] ان کے مقالوں میں بہت زیادہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی کوشش میں لگے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔ [illegible] قہقہہ کی [illegible] ہے۔ ان کا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کا [illegible] عالم ہے۔

شوکت تھانوی ہر چیز کا مشاہدہ بڑی گہری نگاہ سے کرتے تھے۔ [illegible] مزاح نگاری [illegible] ایک [illegible] ہے: طنزیہ مضامین میں بعض مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ [illegible] کے مصنف قاضی عبدالستار [illegible] [illegible] ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ طنز نگاری میں قاضی عبدالستار کے مقلد تھے [illegible] [illegible] طور پر لکھنے سے [illegible] ہوتا تھا۔ شوکت نے اپنی شخصیت، فن کاری اور شہرت و مقبولیت کی دنیا خود بنائی تھی [illegible] [illegible] کے سہارے مشہور نہیں ہوئے، ان کا فن ان کی شہرت کا سبب ہے۔

بعض شاعروں اور فنکاروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اس شہرت سے اور آپے سے باہر ہو گئے۔ ان کی عام زندگی کے تعلقات میں [illegible] آجاتا ہے۔ مگر شوکت تھانوی پاکستان و ہندوستان گیر شہرت حاصل کرنے کے باوجود اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔ یہ دلیل ہے ان کے [illegible] ظرف ہونے کی۔ اب رہی تھوڑی بہت انسانی کمزوریاں تو انسان [illegible] خالی ہے [illegible] اس مضمون کا لکھنے والا سب سے پہلے [illegible] اعتراف کرتا ہے۔ شوکت تھانوی بھی انسان تھے فرشتے نہ تھے۔ اب سے سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے، ملتان میں مشاعرہ تھا، شاعروں کو ٹھہرانے میں مشاعرے والوں کی طرف سے کچھ دیر ہو گئی، شوکت تھانوی اس پر اس قدر برہم ہوئے اور اتنے بگڑے کہ ہم سب کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ ان کی برہمی کے سبب ہمارے معاوضہ کی رقم میں کہیں کھنڈت نہ پڑ جائے۔

تقسیم ہند سے پہلے شوکت تھانوی مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے متعارف نہیں تھے۔ سب نے انہیں کسی مشاعرے میں نہیں [illegible]۔ انہوں نے اس زمانے میں لکھنؤ کے ایک بہت بڑے شیعہ مجتہد کی موت پر ایک طنزیہ مرثیہ لکھا تھا جسے وہ پاکستان بننے کے بعد بھی خاص محفلوں میں سناتے تھے۔

یہ اس دور کا ذکر ہے جب ہندوستان میں ظریف لکھنوی کے بعد ظریف لکھنوی اور احمق پھپھوندوی کی مزاحیہ شاعری کی بہت شہرت تھی۔ سر سیتا رام جو برسوں یوپی لیجسلیٹو کونسل کے اسپیکر رہے ہیں اور پاکستان میں ہندوستان کے ہائی کمشنر بھی تھے۔ ان کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں ظریف لکھنوی نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا ؎

نر ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اس نام کی

کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتا رام کی

پاکستان بننے کے بعد شوکت تھانوی ایک مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے اور دیکھتے دیکھتے مشہور اور مقبول ہو گئے۔ بمبئی اور دہلی کے مشاعروں میں بھی ان کو بارہا بلایا گیا اور ہر مشاعرے میں کامیاب رہے۔

شوکت تھانوی شعر سنجیدہ، طنزیہ اور سادہ ترنم سے پڑھتے تھے۔ ان کے ترنم میں قدرے غنائیت بھی ہوتی تھی۔ آواز قریب قریب پاٹ دار تھی۔ مشاعرے میں اپنا مزاحیہ کلام سناتے تو سننے والے ہنسی کے مارے "لوٹن کبوتر" بن جاتے۔ مگر شوکت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی نہ آتی۔ بڑے تجربہ کی بات کہی تھی علامہ اقبال نے کہ اگر قوالی میں قوال کو بھی حال آجائے تو قوالی کا لطف ہی جاتا رہے۔

مشاعروں میں شاعروں کے ناموں کی فہرست کی ترتیب بھی کہیں مشاعرے کا رنگ دیکھ کر شعر خوانی کے لئے اسٹیج پر بلوانا، یہ ایک طرح کا آرٹ ہے اور شوکت تھانوی کو یہ آرٹ آتا تھا۔ شاعروں کے وہ کامیاب کنڈکٹر تھے۔ مگر اس کی بدولت انہیں بعض شاعروں کی خفگی بھی برداشت کرنی پڑتی۔ جو شاعر مشاعرے میں کامیاب نہ رہتا وہ اپنی ناکامی کا الزام شوکت تھانوی کے سر دھرتا کہ انہوں نے مجھے غلط نمبر پر اور ناسازگار فضا میں پڑھنے کے لئے بلوایا۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ جس کسی سے عوام کی ذمہ داری متعلق ہوتی ہے۔ اسے کسی نہ کسی حیثیت سے ہر وقت ملامت مورد بننا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں ہر کسی کو کوئی بھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ جس سے کوئی بھی ناراض اور شاکی نہ ہو، سمجھ لو کہ وہ آدمی منافق ہے۔ یہ تو شعرا کا ذکر کیا ہے۔ نبیوں اور رسولوں تک سے لوگوں کو شکایتیں رہی ہیں اور وہ سب کو خوش نہیں رکھ سکے۔ اولیاء، انبیاء اور رسول تو پھر انسان ہیں اللہ میاں تک سے بعض جہلا اور سفہا شکایتیں رکھتے ہیں۔

انشا پردازوں اور خاص طور سے شاعروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ رہنے سہنے اور لباس وغیرہ کے معاملہ میں بے پروا بلکہ بدسلیقہ ہوتے ہیں۔ مگر شوکت تھانوی بڑے قرینہ اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ میں نے انہیں کبھی میلے تو کیا ملگجے کپڑے پہنے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ صاف ستھرا لباس۔ گٹکے کی ڈبیہ سے لے کر عینک کی کمانیوں تک ہر چیز اُجلی اور خوش منظر، چوڑی دار پاجامہ پہنتے تو کس اہتمام اور سلیقہ کے ساتھ اس کی چُنٹیں کرواتے

محفلوں میں اُن کے دم سے رونق تھی۔ کیسے کیسے مزیدار لطیف لطیفے بیان کرتے اور دوسروں کے لہجہ، گفتگو اور طرز ادا کی نقلوں سے محفل کو دیوارِ قہقہہ بنا دیتے۔ نقل کرتے ہوئے وہ ایک ایک جزئیہ کا خیال رکھتے۔ اس فن میں وہ بڑے مشاق اور دیدہ ور تھے

شوکت تھانوی مرحوم کے لطائف تحریری بھی ہیں اور تقریری بھی۔ انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس تھا۔ سردار عبدالرب نشتر مرحوم جو اس وقت مغربی پاکستان کے گورنر تھے، اس کے صدر تھے۔ شوکت نے اس اجلاس میں اپنا مضمون سنایا۔ اُن کے اس ایک جملہ پر ———

"بعض لوگ پڑھنے میں املا کی غلطی کرتے ہیں"

سب لوگ مسکرانے لگے اور سردار نشتر مرحوم تو جھومنے لگے۔

مولانا سہا بھوپالی نے بچکانہ قد و قامت اور صورت پائی تھی۔ اُن کے اس "بہ قامت کہتر" ہونے کی کس خوبصورتی اور پُرلطف انداز میں شوکت تھانوی نے ترجمانی کی ہے۔ ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک محفل میں بہت دیر تک گراموفون بجتا رہا۔ جب گراموفون کا ڈھکنا بند کیا گیا تو پتہ چلا کہ اُس کی آڑ میں مولانا سہا بھوپالی بیٹھے تھے۔

شوکت نے اپنی مشہور کتاب "شیش محل" میں متعدد شخصیتوں کے خاکے شگفتہ قلم سے بنائے ہیں۔ ایک بزرگ "افقر موہانی" ان کے نام کے ساتھ "لسان الطریقت" لکھا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے جو انہیں ایک بار دیکھ لے گا وہ دوسری بار دیکھنے کی تمنا کرے گا۔ شوکت تھانوی نے ان کے بارے میں ایک سطر بھی اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ اُن کا نام صفحہ کے سرنامہ پر لکھ کر اس کے نیچے چھوڑ

[illegible]

صاحبزادہ خواجہ [illegible] [illegible] ترپ [illegible]

قدسی کا مصرعہ کس قدر سلیس، موزوں اور برمحل استعمال۔ اس ایک مصرعہ نے صاحبِ تقریب کے اوصاف و محاسن جمیع اور حسنات و مکنات کا نقشہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ اس مصرعہ کو شوکت تھانوی نے منتخب کیا ہے، اور وہ [illegible] ہے اس کی تعریف بھی نہیں ہو سکتی۔ مگر اس سے ان کے وجدان و ذوق کی لطافت کا بھی اندازہ ہوتا ہے

شوکت تھانوی اور میں جس محفل میں یکجا ہوتے دونوں طرف سے خوب چھیڑ چھاڑ اور فقرے بازی رہتی۔ بعض اوقات محفلوں میں وہ مجھے اس قیامت کے ساتھ بلاتے: ——— "حضرت بہت عرصے [illegible] کے لئے سب حضرت مولانا [illegible] کو زحمت دی جاتی ہے ..." "حضرت [illegible] کی [illegible]" کا ترنم کے ساتھ تلفظ ادا کرتے ہوئے۔

ایک محفل میں بولے ...... سب لوگ ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہیں اور یہ مولانا (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) پیروں سے تالیاں بجاتے ہیں۔

مشاعروں میں اکثر و بیشتر مجھ سے "بنا کا گنبد" پڑھنے کی فرمائش ہوا کرتی ہے۔ اس نظم کا آخری شعر یہ ہے ـ

اے بت کدۂ ہند کے بے ترشے ہوئے بت !
بخشیں گے نگاہ تو سمرقند و بخارا !

میں نے ایک ادبی نشست میں یہ نظم سنائی تو شوکت تھانوی بولے: آج تم نے فارسی مصرعہ پڑھ کر اس کلاسیکی [illegible] کو جلا دیا۔ اس قسم کی پھلجھڑیاں تو وہ ہر محفل میں چھوڑتے رہتے تھے۔

تیس سال پہلے کی بات ہے ——— کراچی میں "انڈو پاک مشاعرہ" تھا۔ میں نے باہر سے آئے ہوئے شاعروں کی دعوت کی۔ شوکت تھانوی کو اس دعوت کا علم ہوا تو شکایت کی کہ تم نے مجھے نہیں بلایا۔ میں نے کہا کہ بھائی۔ میرے فلیٹ کا جو مردانہ کمرہ ہے اس میں چودہ آدمیوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے جگہ کی کمی کی وجہ سے آپ اور بعض دوسرے احباب کو بھی تکلیف نہ دے سکا۔ اس دن کے بعد جب وہ ملتے تو مزاحاً کہا کرتے تھے ----- "میرا شمار ان چودہ (۱۴) آدمیوں میں ہوا یا پندرھواں سولھواں نمبر ہے؟"

۱۹۶۲ء میں مظفرآباد (آزاد کشمیر) میں خاصا شاندار مشاعرہ ہوا۔ سب شاعروں نے اسٹیشن ویگن میں سفر کیا۔ یہ راستہ ہے تو بڑا دلچسپ اور مناظر خیز۔ مگر جب جلدی جلدی موڑ آتے ہیں، ساتھ ہی نشیب و فراز بھی، تو بعض مسافروں کو چکر آنے لگتے ہیں اور طبیعت مالش کرنے لگتی ہے۔ کوہ مری اور کوہالہ کے درمیان میری طبیعت بگڑنی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ ویگن کو رکوانا پڑا اور میں نے نیچے اتر کر قے کر ڈالی، استفراغ کے بعد طبیعت ہلکی ہو گئی۔ جب ہم سوار ہو کر روانہ ہونے لگے تو شوکت تھانوی مجھ سے بولے:

"تم نے بڑی ترلاوٹ کے ساتھ قے کی"

سب لوگ ہنسنے لگے اور میں بھی کچھ تلملا کر اور کچھ مسکرا کر رہ گیا۔

شوکت تھانوی خود اپنی ذات سے مجموعہ لطائف و ظرائف تھے اور ساتھ ہی لطیفہ ساز اور لطیفہ گو تھے۔ دوسروں کی کیسی کیسی نقلیں محفلوں میں کرتے۔ ایک دفعہ لکھنؤ کی پرانی صحبتوں کا ذکر چل پڑا۔ یہاں تک کہ وصل بلگرامی کا تذکرہ بھی درمیان میں آگیا۔ شوکت تھانوی

نے کہا یہ شخص بڑا ہی رئیس و فنی عجیب پرلطف حرکتیں کرتا تھا۔ ایک بار چند شعراء کسی مشاعرے میں جا رہے تھے۔ چار باغ جنکشن پر ایک نوجوان انگریز لڑکی ٹہل رہی تھی۔ سب دوستوں نے وصل بلگرامی سے کہا کہ اگر تم اس لڑکی کا منہ چوم لو تو دس روپیہ ہاتھ کے ہاتھ تمہاری نذر کئے جائیں گے۔ اس شخص نے ہامی بھر لی۔ سب لوگ حیران تھے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ یہ سب اب سے چالیس برس پہلے کی بات ہے جب نیم انگریز رہے ہوں گے ہاتھ ملانے میں ہندوستانیوں سے ہاتھ ملاتے جھجکتے تھے۔

وصل بلگرامی اس انگریز لڑکی کے پاس پہنچے۔ اسے غور سے دیکھتے جاتے اور آنسو بہاتے جاتے ہیں۔ تھوڑی دور جا کر وہ پلٹ آتے۔ وہ لڑکی بے ... دیکھنا شروع کئے اور پھر یکایک تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیا اور منہ چومنے کے بعد رونے لگے۔ پلیٹ فارم پر دوسرے مسافر اور اس لڑکی کے ساتھی سب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ وصل صاحب کی داڑھی آنسوؤں میں تر ہوئی جا رہی ہے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہے ہیں۔ میری لڑکی کا بالکل یہی حلیہ تھا۔ بالکل اسی طرح کا ناک نقشہ، ایسا ہی بوٹا سا قد۔ اس جانمار کی اتنی ہی عمر ہوگی جب وہ اللہ کو پیاری ہوئی ہے۔ شوکت تھانوی کہتے تھے کہ وصل بلگرامی کی اس حرکت پر کسی قسم کا نوٹس لینا تو ایک طرف رہا اس لڑکی کے رشتہ دار وصل صاحب کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ وہ رو دھو کر پھر دوستوں کے پاس آئے، دس روپیہ کی نذر وصول کی۔ اور جن لبوں پر نامرادی آہ و فریاد تھی ان پر اب ہنسی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

بے تکلفی کی محفلوں میں شوکت کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ اُن کی لطیفوں کی نقل بعض احباب کرتے ہیں مگر وہ بات کہاں آتی ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے دو بار ان سے ملاقات ہوئی تھی مگر یہ بہت ہی سرسری اور رسمی سی ملاقات تھی۔ ان سے بے تکلفی پاکستان بننے کے بعد ہوئی۔ کیسا ہی سنجیدہ اور ثقہ آدمی کیوں نہ ہو اسے بے تکلف کرنے میں شوکت تھانوی ید طولیٰ رکھتے تھے۔

ریل میں، لاری میں، بس میں اور ہوائی جہاز میں۔ نہ جانے کہاں کہاں میرا ان کا ساتھ اور ہمسفری رہی ہے کبھی کبھی ایک جگہ ٹھہرے ہیں۔ کیا باغ و بہار آدمی تھا، مزاج میں کس درجہ شوخی اور طبیعت میں کس قدر شگفتگی تھی۔

ایک بار میں نے ان سے کہا کہ میں نے "ہڑل سی" (LITTLE - SEA) میں غزل کہی ہے۔ بہت دیر تک سر پکڑے کہ میں نے "زبانِ راز" میں کیا کہہ دیا ہے دیکھ کر کہ یہ معمہ ان سے حل نہیں ہو رہا ہے میں خود بول پڑا ——— "چھوٹی بحر"! میرے اس کہنے پر زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے پھر کہا میں نے تمہارے نام کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ بولے کیا؟ میں بولا (GRANDEUR-OF POLICE STATION) اپنے نام کا انگریزی ترجمہ سن کر وہ ہنسے ہیں تو ہنستے ہی رہے۔ روزنامہ "جنگ" کے فکاہی کالم میں اس واقعہ کا ذکر بھی کیا۔

شوکت تھانوی بہت ہنس مکھ، ملنسار اور خوش مزاج تھے۔ مگر خلافِ طبیعت بات سنتے تو چہرہ تمتما جاتا۔ اپنی ذات پر تنقید کم ہی برداشت کرتے۔

شوکت تھانوی مرحوم نے اردو زبان و ادب کو قہقہے، مسکراہٹیں، چٹکیاں اور گدگدیاں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو پر بہار اور ان کی آخرت کو تبسم زار بنا دے اور جنت میں بھی وہ حوروں کے ساتھ شوخیاں اور ٹھٹھولیاں کرتے نظر آئیں (آمین)

آہ شوکت تھانوی

امین سلونوی

اردو ادب کے مایۂ ناز مزاح نگار، بہترین وقت باغ و بہار کی زندگی گزارنے والے شوکت تھانوی ۴ مئی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ ہماری تمام انجمن خاموش ہو گئی اور ایک سناٹا چھا گیا ہے۔ اطلاع ٹھیک اس وقت ملی جب کہ ہم لوگ لکھنؤ میں عید قربان سے روز نماز عید کے لئے عیدگاہ میں موجود تھے۔ اس وقت ہم لوگوں پر جو کیفیت طاری ہوئی اور میں کیسے گھر تک پہنچا اور اس سانحہ کو کیسے برداشت کیا۔ اب یہ جاننے کا وقت نہیں۔ مشیت خداوندی سے کون لڑ سکتا ہے۔ ورنہ ابھی کیا عمر ہے۔

شوکت تھانوی ایک جید مزاح نگار، اخبار نویس، ادیب اور شاعر تھے۔ لیکن ان کی فطرت میں مزاح رچا اور بسا ہوا تھا۔ ان کے قلم سے خواہ کتنا ہی سنجیدہ مضمون لکھا جاتا۔ ان کی فطری مزاح نگاری کی صلاحیتیں نمایاں ہو جاتیں۔ شادی ہو یا غم، ہر موقع پر شوکت کی متین مزاحی فطرت پژمردہ سے پژمردہ انسان کو بھی بغیر ہنسائے نہ رہتی تھی۔ مگر افسوس کہ اسی شوکت تھانوی کا ایک مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ کافی عرصہ ہوا جب کہ مرحوم نے ایک خط کے ذریعہ یہ اطلاع دی تھی کہ انہیں حکومت نے تمغۂ امتیاز عطا کیا ہے۔ اور اسی تمغۂ امتیاز کے حاصل کرنے کے لئے وہ غالباً راولپنڈی سے لاہور آئے۔ اور پھر واپس جانے کی مہلت موت نے نہ دی۔ جب وہ ہسپتال داخل ہوئے تو پھر ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ محفلوں کو زعفران زار بنانے والے، دوسروں کو ہنسانے والے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو سوگوار بنا کر رخصت ہو گئے۔

شوکت مرحوم کا آخری خط جو انہوں نے راولپنڈی سے ۸ فروری ۱۹۶۳ء کو لکھا تھا۔ وہ مجھے یہاں ۱۳ فروری ۱۹۶۳ء کو موصول ہوا۔ خط کا انداز ایسا تھا جو اب سمجھ میں آیا کہ وہ ان کا میرے نام آخری خط تھا۔ جس میں انہوں نے اپنی عادات کے مطابق "میارے امین" کہہ کر مخاطب کیا تھا اور اپنی آخری کتاب "کچھ یادیں اور کچھ باتیں" مرتب کرنے میں مجھ سے یہ خواہش کی تھی کہ اس کے لئے لکھنؤ کے وہ حضرات جن سے مرحوم بے تکلف تھے۔ اور اس میں اولیت میرے نام کو دی گئی تھی اور اس کے بعد نسیم انہونوی، مولانا آسی، سید جالب دہلوی، وصل بلگرامی، رفیع احمد خاں، سراج لکھنوی، قدیر لکھنوی، ظریف لکھنوی، حکیم ڈاکٹر محمد امین، عبدالرؤف عباسی ایڈیٹر حق، مسٹر انیس احمد عباسی، ایڈیٹر حقیقت، صباح الدین عمر وغیرہ حضرات کی تصاویر فوراً مہیا کروں۔ اور اپنی عادت کے مطابق خط میں لکھا تھا کہ پیارے امین، خیریت اور عافیت کے تمام تکلفات کو چھوڑ کر اپنے چند لمحات مجھ پر قربان کر دو۔ اور ابھی یہ کام

کر دوں کہ ان حضرات کی تعداد پر ماحصل کر کے ان کے متعلق اور تفصیلات بھی جمع کر کے رکھ دوں۔ مرحوم ہمیشہ اسی قسم کے خطوط لکھا کرتے تھے اور چونکہ ہم دونوں میں کسی قسم کا تکلف نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ جب تک یہاں رہے ہم سارا دن نسیم انہونوی اور مرحوم) تھا شوخ زبان پر ہوا۔ جلد اُن سے لوگوں نے یہاں تک شہرت دی کہ بعض لوگوں نے باپ بیٹا ... بات بھی کہہ ڈالی۔ اور اگر یہ ان چٹکلوں تک رہ جاتے تو بس، تھا تو شاید میں تھوڑا سا رنج پڑا۔ مگر علاوہ اتحاد شکست ... کی ابتدا ۱۹۲ ... کے اجزا سے ہوتی تھی۔ شوکت مرحوم میں اور نسیم انہونوی کو ایک دنیا یک جان تین قالب سمجھتی تھی اور تھے بھی۔

میری اور ان کی ملاقات بالکل غائبانہ نہیں ہوئی تھی۔ میں اس زمانہ میں رسالہ نظر کی ادارت کر رہا تھا اور شوکت سے بذریعہ ڈاک متعارف تھا اور دونوں ایک دوسرے کو بزرگ اور بڑا سمجھتے تھے۔ لیکن ایک دن یہ پردہ اٹھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ ... ملاقات کے نتیجے سے خطوط کے ذریعے تھا مگر پھر بھی جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو دونوں حیرت میں تھے۔ شوکت نے کہا ارے آپ ایسے ... ہیں۔ میں نے کہا اور آپ وہ شوکت تھانوی ہیں۔ روزنامہ میں کام کرنے والے لوگ بھی اس ملاقات کو دیکھ رہے تھے اور نتیجہ تھے کہ ... دونوں کی ذہن میں دو چار ... بہر حال ایک دوسرے سے ملے اور پھر یہ دوستی، رفاقت آخر دم تک قائم رہی۔ شوکت بڑے ذہین انسان تھے لکھنے پڑھنے میں وہ بالکل مجھ سے مطابقت رکھتے تھے۔ لیکن ان کا فنی ذوق شعری اور مزاح نگاری رسالہ نظر کے ذریعے پہلی دنیا کے سامنے آیا۔ اور پھر اس کے بعد جب ... ہو گئے تو نسیم انہونوی نے رسالہ انکشاف میں ان کے مضامین شائع کئے اور ان کا مجموعہ بھی مرتب ہوا۔ میں شوکت مرحوم اخباری دنیا میں مدتوں ایک ساتھ رہے۔ روزنامہ ہمدم میں سید جالب دہلوی مرحوم کی عنایت اور مہربانی ہم دونوں پر یکساں رہی۔ شوکت نے وہاں ... شائع کیے۔ اور میں نے مقامی خبروں کی ذمہ داری سنبھالی۔ اور اس کے بعد لکھنؤ کے سب سے بڑے اور ... اخبار ... میں ہم دونوں ایک ساتھ کام کرتے رہے۔ وہاں بھی شوکت مزاحیہ کالم لکھتے تھے اور مجھے اداریہ دیا گیا تھا۔ لکھنؤ میں مسٹر رام لال ورما جو ... کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے لکھنؤ سے روزنامہ "ہند" کے نام سے اخبار جاری کیا میں اور شوکت دونوں وہاں بھی ساتھ رہے۔ اور سرپنچ میں تو مستقل طور پر ہم دونوں کام کرتے تھے۔ اور پھر شوکت نے خود بھی ایک روزنامہ طوفان کے نام سے جاری کیا ظاہر ہے کہ شوکت کا اخبار تھا میرے اوپر پوری ذمہ داری تھی۔ سرپنچ نے ہم تینوں کو ایک ہی ساتھ ... ایک ہی ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور دوسرے غلط اور صحیح مشاغل بھی عام طور پر ہم لوگ دہلی ... مہینہ سفر کرتے۔ اور بعض لوگوں کے واسطے ہوٹل میں بیٹھ کر رات بھر میں متعدد مضامین لکھ کر سپرد کرنے تھے وہ ایسے لوگ تھے جن سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور انکار کس سے کیا جاتا جنہیں دیکھنے اور ملنے لکھنؤ سے دہلی کا سفر کیا جاتا تھا۔ وہ دور یاد آتا ہے تو دل روتا ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے۔

لکھنؤ میں جب آل انڈیا ریڈیو کی بنیاد پڑی تو شوکت مرحوم مستقل طور پر آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہو گئے۔ اس زمانہ میں جو لوگ ریڈیو کے عملے اور اسٹاف میں تھے۔ سبھی ادیب، سبھی اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک لوگ تھے۔ انہوں نے اس اسٹیشن سے مزاح اور طنز کو کافی ترقی دی کبھی کبھی میرے اور شوکت کے درمیان آل انڈیا ریڈیو سے دلچسپ مزاحیہ مکالمے بھی نشر ہوتے تھے۔ اور ہم دونوں مختلف نوع کی تخلیقات برابر پیش کرتے رہتے تھے۔ جب تک لکھنؤ میں آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن قائم نہیں ہوا تھا ہم لوگ دہلی اسٹیشن پر جاتے

یاد ہے کہ مجھے یاد ہے جو وہ شیشی سے پی رہے تھے پہلے گھونٹ پیتے ہی انہوں نے ... لیا اور وہ پسند کیا۔ شوکت نے اسے بعد میں ایک بوتل بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پھر تھوڑا تھوڑا جب ہم لوگ نشے میں ہو گئے تو ایک غزل ہوئی۔ شعروں کے ٹکڑوں کا مجموعہ مرتب کیا اور پھر کہا کہ بعد اس سلسلہ کو جاری رکھا۔

آل انڈیا ریڈیو سے شوکت مرحوم کی غزلیں نشر ہوتی تھیں۔ انہوں نے لاہور چھوڑ دیا اور وہاں دو ایک ہی سال رہے تھے کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی جو یورپ میں پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ ملک کا ماحول آزادی کی تحریک کی وجہ سے ... تھا وہ ختم ہو گیا کیونکہ ابھی تک جاری تحریک باقی تھی۔ بعض اصحاب جیلوں میں تھے ... تھی۔ ہم برطانوی اقتدار کے ساتھ اپنی قومی غیرت اور اپنی حیثیت کے ساتھ کوئی ... جنگ پراپیگنڈا کے واسطے جنگ کے دوسرے سال کی مد میں ... مرکزی حکومت نے عوام و خواص میں بیداری اور جنگ ... کے لئے سانگ پبلسٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ ... ہندوستان کے گوشے گوشے میں اسے وسعت دی جانے لگی۔ اتر پردیش میں بھی سیاسی پیمانے پر سانگ پبلسٹی کی بنیاد رکھی جانے والی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی چارج منتخب نہیں ہوا تھا کل ہند سانگ پبلسٹی کا ڈائریکٹر ابو الاثر حفیظ جالندھری کو مقرر کیا گیا تھا۔ اور حفیظ صاحب یو۔ پی کی تنظیم میں لگے ہوئے تھے۔ ان کا ایک پیغام ہمارے پاس بھی پہنچا تھا۔ میں نے ... ہم لوگ شہر شہر ... دورہ کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے تھے ... کے واسطے مختلف مقامات کے دورے میں اور حضرت قدر لکھنوی کر رہے تھے۔ اور اسی بزم اردو کے سلسلے میں دہلی بھی جانے کا اتفاق ہوا اور حفیظ صاحب سے دہلی ہی میں ملاقات ہوئی۔ ان کی خواہش تھی کہ میں یو پی کی ... سنبھال لوں میں ساری زندگی سے جاگتا رہا اور چونکہ برطانوی اقتدار کے ساتھ تعاون کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ گرچہ میں کسی سیاسی پارٹی میں شامل نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ملک کی آزادی کی تڑپ میرے دل میں بھی تھی۔ اور ملک میں جو تحریکات جنم پا رہی تھیں میں پورے طور پر ان کے ساتھ تھا ... ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جب کہ ملک کی آزادی کی جد و جہد شدت کے ساتھ جاری تھی اور آل انڈیا کانگریس کے ۱۹۴۲ء کے اجلاس کے موقع پر ایک قومی مشاعرہ میں اور پنڈت آنند نرائن ملا ... تھے۔ اس لئے میں اس نظریہ کا نہ تھا کہ اس ادارہ میں شامل ہو جاتا۔ لیکن میں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ شوکت صاحب کو لاہور سے بلا لیں وہ اس کے واسطے موزوں ثابت ہوں گے اور اس لئے بھی کہ ان کے اندر سانگ پبلسٹی کے سنبھالنے کی صلاحیت بھی تھی۔ اور یہ بھی میری خواہش تھی کہ شوکت پھر لکھنؤ آ جائیں چنانچہ حفیظ صاحب نے میری اس تجویز کو پسند کیا۔ اور شوکت مرحوم کو اتر پردیش سانگ پبلسٹی کا ڈائریکٹر مقرر کر کے انہیں لاہور سے یہاں بلا لیا اور ہم دونوں پھر یکجا ہو گئے۔ انہوں نے لکھنؤ میں اس ادارہ کا دفتر قائم کیا۔ اور کام شروع ہو گیا۔ سانگ پبلسٹی کے ذریعہ شعراء کو بھی کچھ نہ کچھ نوازا جاتا تھا مثلاً ... سے متعلق دو چار شعر لکھنے والے کو بھی دس بیس روپے ملتے تھے۔ گویا یہ سرکاری طور پر معاوضہ مقرر کیا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ اس ادارہ سے کون کون لوگ فیضیاب ہوئے۔ لیکن میں نے شوکت مرحوم سے ایک پیسہ بھی اس سلسلہ میں کبھی نہیں لیا۔ اس کے جاننے والے آج بھی وہ شعراء موجود ہیں جو مستقل طور پر اس ادارہ میں ملازم تھے۔ ان میں حضرت عیش لکھنوی اور بسمل الہ آبادی دونوں حضرات اس ادارہ سے متعلق تھے میں نے صاف طور پر لینے سے انکار کر دیا۔ البتہ شوکت کی دوستی کی وجہ سے تعاون کا یقین دلایا اور وہ تعاون برابر دیتا رہا۔ اگرچہ حضرت حفیظ نے شوکت مرحوم سے شکوہ کیا کہ ان کے مخصوص دوست ان کے ساتھ اشتراک اور تعاون نہیں کر رہے ہیں لیکن جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے حفیظ صاحب سے بہ حیثیت

کہ وہ انہیں بتایا کہ اشتراک اور تعاون کا مقصد معاوضہ حاصل کرنے سے نہیں ہو رہا ہے۔ میں شوکت سے تعاون کروں گا لیکن اپنے نظریات چند پیسوں کے واسطے فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اور میں نے ان کی غلط فہمی بھی دور کی۔ خود شوکت مرحوم کہا کرتے تھا کہ میرا تعاون انہیں برابر حاصل رہتا ہے۔ بہرحال میرے اور شوکت مرحوم کے درمیان جو تعلقات قائم تھے وہ برابر قائم رہے۔ اس میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی

آج شوکت کی موت نے ایک زبردست خلا پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کا پُر ہونا ممکن نہیں ہے۔ جب تک وہ لکھنؤ میں رہے طنز و مزاح کی دنیا میں کرشمے بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ اور سرپنچ کے ذریعہ مزاح نگاروں کا ایک وسیع حلقہ بن گیا تھا۔ اور اس حلقہ کے لوگ کبھی کبھی عنوان مقرر کر کے مزاحیہ مضامین لکھتے اور حلقہ کے ممبران کو طبع آزمائی کی دعوت دی جاتی تھی۔ اور اکثر مضامین اسی سلسلہ میں لکھے گئے۔ سودیشی عنوان کے تحت شوکت نے سودیشی ریل لکھی۔ میں نے سودیشی اردو لکھی۔ کسی اور نے سودیشی کونسل لکھی۔ غرضیکہ ایک لمبا سلسلہ تھا۔ ایک ڈپلیکیٹ شادی کا شروع ہوا اور اس کی ابتدا میں نے کی اور ختم شوکت نے کیا۔ اور درمیان میں اس سلسلہ میں نسیم انہونوی، دیوانہ بریلوی۔ نظر بریلوی۔ شمیم بہوری۔ سلیم نندوری وغیرہ نے حصہ لیا۔

لکھنؤ میں روزانہ ہی شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ میں بھی شریک رہتا تھا۔ اور مولانا عبدالباری آسی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

جب شوکت مرحوم ابتدائی دور میں مجھ سے ملے تو انہوں نے بتایا کہ وہ کسی سے اصلاح نہیں لیتے۔ میں نے شوکت مرحوم سے کہا کہ شعر و شاعری کی دنیا میں اگر واقعی کوئی جگہ حاصل کرنا ہے۔ تو پھر یہ ضروری ہے کہ ہم کسی سے رجوع کریں۔ شوکت مرحوم نے دریافت کیا کہ پھر کس کے پاس جائیں۔ اس وقت بے اختیار میں نے مولانا آسی کا ایک شعر سنایا۔

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

شوکت مرحوم نے یہ شعر سن کر چونک اٹھے۔ اور اسی وقت انہوں نے خواہش کی کہ مجھے انہیں کے پاس لے چلئے۔ یہ واقعہ مرحوم شوکت تھانوی نے اپنے آخری سلسلہ "کچھ یادیں اور باتیں" نے ابتدا ہی میں میرے حوالے سے اخباروں میں لکھا ہے۔ اور وہ شائع ہو چکا ہے کہ کس طرح وہ مولانا آسی کی خدمت میں پہنچے۔ اور اسے مرحوم شوکت نے اپنے مزاحیہ انداز میں اسے پیش کیا ہے۔ اور پھر یہ سلسلہ قائم رہا۔ شوکت اپنا تمام کلام مولانا آسی کی خدمت میں پیش کرتے اور اصلاح لیتے اور اپنا ایک مجموعہ گہرستان کے نام سے مرحوم نے چھپایا بھی۔

شوکت شاعر تھے۔ اور سنجیدہ اور طنز و مزاح دونوں ان کے حصہ میں آئی تھی۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اگر شوکت طنز و مزاح کی شاعری پر زور دیتے تو آج ان کا پایہ بہت بلند ہوتا۔ اس لئے وہ فطرتاً مزاح نگار تھے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے۔ جاگتے، سوتے طنز و مزاح کے موتی بکھیرتے رہتے تھے۔ مجھے بھی مزاح سے دلچسپی تھی۔ مگر میں سست رفتار تھا۔ اور شوکت تیز رفتار قلم برداشتہ لکھنے کے عادی۔ اکثر مجھ سے انہوں نے سر پر سوار ہو کر لکھوایا ہے۔ آہ! اس دور کی سیکڑوں باتیں آج یاد آتی ہیں۔ اور اپنے دل و دماغ میں محفوظ ہیں لیکن یہ وقت ان تفصیلات کا نہیں ہے۔ کبھی انہیں یاد کر کے ہنستا ہوں اور کبھی روتا ہوں میرے اور مرحوم شوکت کے درمیان کوئی پردہ نہ تھا ایک دوسرے کے گھروں میں آمد و رفت تھی۔ اس لئے ہر ایک بے تکلف تھا۔ جن لوگوں سے ملا ہوں اس پر ایک کتاب مرتب کی

[illegible] یہ سب کی سب یادیں [illegible]
[illegible] میں فہرست مرتب کر رہا تھا [illegible]
[illegible] مرتب کرتا ہوں کہ فہرست
[illegible] فہرست [illegible] اب سوچتا ہوں کہ [illegible] مرحوم دوست کی یادیں [illegible] مرتب کرتا ہوں۔ کاش میرے دل و دماغ میرا ساتھ
[illegible] جائیں۔ شوکت کے ساتھ میرے تعلقات کی دنیا کافی وسیع تھی۔ لیکن اس مختصر فہرست میں اپنی یادوں کے تمام حاصل
ہے کہاں تک!

شوکت اور نسیم

نسیم انہونوی

ستمبر ۱۹۳۱ء کی ایک شام ہم باپ بیٹے روح القدس یعنی امین سلونوی شوکت تھانوی اور راقم الحروف حسبِ معمول لکھنؤ کے امین آباد پارک میں بیٹھے تھے کہ میں نے وہ منصوبہ شوکت تھانوی صاحب سے بیان کیا جو ان کی عدم موجودگی میں میں نے امین صاحب کے مشورے سے بنایا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ایک تثلیث قائم کی جائے۔

شوکت نے کہا ایسا ہی تثلیث پرستی کا شوق ہے تو بھئی سمجھ لو کہ یہ تثلیث تو مدت سے قائم ہے۔

میں نے کہا: "وہ تثلیث پرانی ہو چکی ہے۔ اور پھر ہماری تثلیث اس سے مختلف ہوگی۔ ہم کسی مذہب کی نہیں ایک ہفتہ وار اخبار کی اشاعت کریں گے اور جس کا کام لوگوں کو ہنسا کر ان کی زندگی بڑھانا ہوگا۔ اس وقت ایسے اخبار کی اشد ضرورت ہے جو ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ طنز و مزاح کو پیش کر سکے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب اودھ پنچ کا دورِ جدید بھی دم توڑ رہا تھا۔ اس لئے کہ اس نے حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اشاعت ہوتی تھی مگر گنڈے دار اور یہی سب سے بڑا سبب ہوتا ہے کسی اخبار کے بند ہو جانے کا۔ اودھ پنچ کی جگہ کوئی اور پنچ نکالا اس وقت موقع کی بات تھی۔ جو میرے کاروباری دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے کہ انکشاف کی غیر معمولی مقبولیت سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اگر کوئی اخبار یا رسالہ شوکت صاحب کی ادارت میں شائع کیا جائے تو یقیناً بہت مقبول ہوگا۔ مجھے اس وقت تین سال تک انکشاف اور ۹ ماہ تک حریم نکالنے کا تجربہ تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر شوکت صاحب راضی ہو جائیں تو ایک مزاحیہ اخبار نکالا جائے۔ امین سلونوی صاحب اس میدان کے مجھ سے بھی پرانے کھلاڑی تھے۔ اس لئے میں نے ان سے بھی رائے لی۔ اور انہوں نے نہ صرف اس خیال کو پسند کیا۔ بلکہ تعاون کا بھی وعدہ کیا۔ اس کے بعد ہم نے اسکیم شوکت صاحب کے سامنے پیش کی تھی۔

شوکت صاحب ادارت کے لئے راضی ہو گئے اور نام تجویز کرنے لگے پنچ کا لفظ ضروری تھا۔ اس میں شوکت صاحب کی تجویز پر سر لگا کر سرپنچ کر دیا گیا اور ہم لوگ ہی پر پہاڑ کھیلتے ہوئے میں نے ایک مکان بھی موجودہ دفتر کے قریب ہی کرائے پر لے لیا تاکہ اس میں دفتر قائم کیا جائے ــــ ابھی تک حریم کا دفتر نیاز صاحب کے دفتر نگار ہی کے ایک گوشے میں قائم تھا۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں سرپنچ کا دفتر کھلا۔ ایک میز اور چند پرانی کرسیاں خریدی گئیں۔ پہلا پرچہ ۲۰×۳۰ سائز کے ۱۶ صفحات پر شائع کرنے کے انتظامات کئے گئے۔ اس

...ت ہے وہ ہے مضمون نگاروں کا تعاون بھی حاصل نہیں یا بہ مشتاق ... سے شامل ہو جیسی ۔ نجی طور سے عملہ تنہا ساتھ
... ہی شوکت صاحب نے لکھے ۔ لکھنؤ کے علمی و ہندو رئیس تھے آپ ... شاہ ... سید صاحب نے ملاقات کی ۔ اور ...
... ہی تھے اور بھی چھپ کر پبلشوں کو بیچے دیتے ۔ اور جو ... ہفتوں میں ... ت چار ... سے تاو ذکر کی شوکت صاحب
... تحریر نے شوکت سے ہی وزن دیا ... ایسی شہرت ... دو سرے اخباروں کو برسوں میں نہیں ہوتی ۔

اس زمانہ میں شوکت صاحب اخبار ہمدم میں کام کرتے تھے کہ جب خود شوکت صاحب نے ... نکالا ۔ ...
... اپنے مضمون کچھ یادیں ... میں تھا ۔

"اس زمانہ میں ہمدم ایک عجیب ... میں مبتلا ہو گیا تھا ... خان صاحب ... ہمدم کے ... لی
نہ رکھی ۔ خان بہادر ... حسین ... نے مینیجر ... حیثیت سے استعفیٰ دے دیا چودھری خلیق الزماں
صاحب ... مقرر ہوئے ۔ مگر وہ بھی زیادہ وقت ... مشہور ... کا ... مستقل ہو گئے ...
چودھری ... نے ادارت سنبھالی ... میں میرے ... چکے سے ...
جاؤں ... انہوں ... خاموش تھے کہ اب ... وقت سرپنچ ... ۔ مگر میں نے اپنا ...
... صاحب نے کہا ... کے اردو اخبار کی ادارت سنبھالی ... سرپنچ کا ... جاری
رہا ۔ اور اب سرپنچ نے اپنے ... ایک ... حاصل کر لیا تھا ... تو ان ہی ... لرث ...
تعاون سے سرپنچ ... ترقی کرتا رہا ... صاحب خالص ... قسم کے آدمی تھے ... حسن
انتظام نے سرپنچ کی بنیادیں نہایت مستحکم کر دیں ......"

اس تحریر کی تفصیل یہ ہے کہ سرپنچ اس وقت ... کی تعداد میں چھپنے کے باوجود ... قابل نہ تھا کہ شوکت صاحب کو اتنی تنخواہ دے سکتا جس سے ان کی گزر بسر با فراغت ہو سکتی ۔ اس لئے ہمدم کے بعد وہ اودھ اخبار میں چلے گئے سرپنچ کو ان کے پورے وقت کی ضرورت بھی نہ تھی ... ہونے کے ساتھ ہی شوکت صاحب ... بھی تھے اور ... بھی ۔ آپ یقین فرمائیں کہ جس روز سرپنچ نکلتا ہوتا اس سے ایک روز پہلے وہ قلم و کاغذ لے کر بیٹھتے اور کاتب کو بٹھا لیتے اور صرف چند ہی گھنٹوں میں اداریہ سے لے کر اشتہارات تک سب لکھ دیتے اور اخبار مکمل ہو جاتا ۔

سرپنچ کا دفتر قائم ہوتے ہی وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ اسی عمارت میں آگئے تھے ۔ عقبی حصہ ... شوکت دلہن کے تصرف میں تھا ۔ اور باہر کے دو کمرے دفتر کے لئے وقف تھے ۔ اور جب رات میں دفتر بند ہو جاتا تو یہ کمرے بھی شوکت صاحب ہی کے اختیار میں رہتے ۔ شوکت دلہن اس وقت پردہ کرتی تھیں ۔ مگر مجھ سے ان کے تعلقات کچھ ایسے ... پر پہنچ گئے تھے کہ وہ میرے سامنے آنے لگی تھیں اور میں ان کی نظروں میں ان کے سگے دیور سے بھی زیادہ عزیز تھا ۔

اودھ کا ایک ہفتہ وار اخبار جو بلا کسی معتد بہ سرمایہ کے نکالا گیا ہو کبھی اس قابل نہیں ہو سکتا کہ تین خوش پوش گھرانوں کی کفالت کر سکے ۔ اس لئے ... صاحب اور شوکت صاحب دونوں ہی اودھ اخبار سے متعلق رہے ۔ کچھ ہی دنوں بعد ... صاحب کی دلچسپیاں کم ہو گئیں اس لئے کہ انہوں نے انڈین پنڈنٹ نیوز سروس قائم کر کے اردو اخبار کو رکل خبریں فراہم کرنا شروع کر دی تھیں ۔

اس کے لئے انہیں محنت سے بچا ہوا تمام وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ ان کا نام معاون اڈیٹر کی حیثیت سے صفحے میں لکھا رہا۔ مگر کام اداریہ تمام تر شوکت صاحب ہی کرتے تھے۔ انہیں اس سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ اپنا بچہ سمجھتے رہے۔ اور میں بھی پورے یقین کے ساتھ یہ کہوں گا کہ شوکت صاحب سے جو عقیدت، محبت اور خلوص تھا اسے نہ صرف شوکت ہی جانتے تھے۔ بلکہ ہر وہ شخص ان حقائق سے واقف تھا۔ جو ہمارے قریب تھا۔

شوکت صاحب کی قابلیت اور ذہانت سے کسی کافر کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود ان کی شہرت میں میرا بہت ہاتھ تھا۔ میں نے انہیں مشہور کرنے کے لئے معلوم نہیں کیا کیا کیا تھا۔ سویرا کی ادارت نے جہاں سویرا کو شہرت بخشی وہاں خود انہیں بھی اس سے سارا ہندوستان جان گیا۔ اور ان کے جوہر اجاگر ہونے لگے۔ اس لئے کہ اس وقت بھی شوکت صاحب کے قلم میں اتنا زور تھا۔ جو پختہ کاروں کی تحریروں میں بھی کمتر ہی ہوتا ہے۔

ایک ہی سال بعد سویرا کا دفتر بدلنا پڑا۔ اب ہم اس عمارت میں آ گئے تھے، جہاں آج کل نسیم بک ڈپو کا دفتر قائم ہے۔ اس کے تین حصے تھے۔ دو میں دفتر تھا اور ایک حصہ شوکت صاحب کی رہائش کے لئے وقف تھا۔ اس میں کئی سال تک شوکت صاحب رہے۔ اس کے بعد انہوں نے خود اپنا اخبار طوفان نکالنے کا منصوبہ بنایا اور سامنے کی ایک کشادہ عمارت کرایہ پر لے کر اس میں چلے گئے تھے اس اخبار کے لئے انہیں قادیانی فرقہ سے ایک معتد بہ رقم مل گئی تھی۔ لیکن افسوس کہ وہ اخبار اپنے زور قلم کے باوجود نہ چلا سکے۔ اخبار کے لئے ایک بہترین منتظم ایڈیٹر سے زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ اور اس صنعت میں شوکت صاحب بالکل کورے ہی نہ تھے بلکہ اپنی تلخ مزاجی اور زود رنجی کے باعث اشتہار کا تعاون بھی حاصل نہ کر پائے۔ اور انتظامی خرابیوں کے باعث طوفان کا زور بہت جلد کم ہو کر ختم ہو گیا۔

شوکت صاحب کی مزاجی کیفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے دفتر میں ایک بہت بڑے افسر کی حیثیت سے بیٹھتے تھے۔ نوکروں کو ہر طرح کے ضابطہ اور قانون کا پابند رکھنا چاہتے تھے۔ نوکر کی معمولی سی بات بھی انہیں اس درجہ مشتعل کر دیتی تھی کہ وہ اسے فوراً برخواست کر دیتے تھے۔ خواہ وہ کتنا ہی عمدہ کام کرنے والا کیوں نہ ہو۔ ان کا یہ طرز عمل ایک ایسے چھوٹے ادارے کے لئے کبھی مفید نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے سویرا کا دفتر قائم کیا تو عالم یہ تھا۔ کہ میں چپراسی، کلرک، اور منیجر سب ہی کی عزت کرتا تھا۔ کبھی ان کے پاس جاتا اور وہ احتراماً کھڑے ہونا چاہتے تو میں انہیں ایسا نہ کرنے دیتا۔ ان سے میری ایسی بے تکلفی تھی کہ کوئی نیا شخص دفتر آتا تو مالک و نوکر میں تمیز نہ کر پاتا۔ دو پہر کا کھانا میں دفتر ہی میں کھاتا تھا۔ اور یہ کھانا اتنا آتا تھا کہ میرا اسٹاف بھی میرے ہی ساتھ کھاتا تھا۔ میرے اس برتاؤ کا یہ اثر ہوا کہ میرے معاون، مددگار یا میرے دست و بازو میرے ملازم ہر حالت میں میرا ساتھ دیتے تھے۔ اس وقت سخت مالی مشکلات تھیں۔ صرف بارہ روپے سے میں نے اپنا کام شروع کیا تھا اور جیسا کہ شوکت صاحب نے میرے متعلق مضمون لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ میں لنگوٹی میں پھاگ کھیلتا تھا واقعی سچ ہے۔ میری جیب میں دس روپے ہوتے اور کام ہزار کا کرنے لگتا لیکن یہ سب کچھ میری نرم مزاجی۔ ضبط و صبر اور مساوات کا طفیل تھا کہ گاڑی چلتی رہی۔ میں کبھی کبھی نوکروں کی ایسی باتیں بھی مصلحتاً برداشت کر لیتا تھا جیسی کوئی دوسرا برداشت نہیں کر سکتا لیکن شوکت صاحب نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا۔ وہ بلا سوچے سمجھے ہر کام کرتے اور نتیجہ خراب ہی نکلتا۔ وجہ ان کی فطرت تھی۔ جو سنا ہے بدلی نہیں جا سکتی۔ وہ برابر والے کی بھی کوئی بات برداشت نہ کر سکتے تھے۔ چہ جائیکہ نوکر۔ شوکت صاحب سے میں نے اتنی مدت تک کس طرح نباہ کیا۔ لکھوں تو ایک طویل مضمون اسی بحث پر ہو جائے گا۔ بس مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ میں جتنا شوکت صاحب

کے ذریعہ تھا، دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا، حتیٰ کہ خدا سے بھی نہیں۔ مگر [illegible] کے اعتقادات کیا تھے معلوم نہیں۔ [illegible] کسی درجہ پر پہنچا دیتا۔ [illegible] شوکت صاحب [illegible] بڑا مزہ دار شخص تھا۔ [illegible] شوکت صاحب کو جانتے ہیں۔ [illegible] خلاف [illegible] ہو جائے۔

شوکت صاحب شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ افسانہ نگار بھی تھے اور صحافی بھی۔ [illegible] کے ساتھ [illegible] لکھ سکتے تھے [illegible] سے توجہ بھی کر سکتے تھے۔ لیکن [illegible] زبردست [illegible] جو کچھ بھی لکھتے، سنانے کے بڑے شوقین تھے اور [illegible] سے زیادہ مجھ ہی پر [illegible] تھا۔ اس لئے اس وقت مجھ سے زیادہ قربت کسی کو حاصل نہ تھی۔ سورج کے نکلنے سے [illegible] میں پہنچتے تھے اس لئے صبح جب میں دفتر آتا تو سب سے پہلا کام یہ ہوتا کہ شوکت صاحب کا لکھا ہوا مضمون سنوں۔ اس کے سنانے کی کوشش ان کا ضروری ہوتا۔ مجال نہ تھی کہ اس دوران میری توجہ کسی اور طرف ہو سکتی۔ [illegible] اپنا منہ ان کی طرف کر کے بیٹھ جایا کرتا اور کسی کی مجال نہ ہوتی۔ اس وقت دفتر میں کوئی بھی آ جائے میرا کسی سے مخاطب ہونا شوکت صاحب کی نظروں میں ایک جرم ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ دفتر آتے ہی کام شروع ہو جاتا۔ کوئی بات پوچھنے کاتب یا دفتری، ہرکارہ یا منیجر میرے پاس آ جاتا۔ لیکن میں ذرا بھی مخاطب نہ ہوتا۔ گویا کہ اسے دیکھتا ہی نہ تھا صرف اس لئے کہ شوکت چاہتے تھے کہ ان کا مضمون سنتے وقت میں اور کسی سے بھی بات کر کے اپنے ذہن کو منتشر نہ ہونے دوں۔ حالانکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں بظاہر ہمہ تن گوش بنا ہوتا۔ مگر میرا دماغ کسی اور الجھن میں ہوتا۔ اور زبردستی مجھے شوکت کا مضمون سننا پڑتا۔ خصوصیت کے ساتھ اس وقت میں بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ جب ایسے موقعوں پر کوئی معزز شخص باہر سے آ جاتا۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار جبکہ شوکت صاحب تازہ [illegible] کا مسودہ مجھے سنا رہے تھے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب آ نکلے۔ یہ سر پنچ کے مداحوں میں تھے۔ اور ان کی عدالت میں میری جائیداد کا ایک مقدمہ بھی اسی زمانہ میں چل رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کی آمد پر بھی میں شوکت صاحب ہی کی طرف متوجہ نہیں رہ سکتا تھا۔ میری توجہ ڈپٹی صاحب کی طرف ہو گئی۔ کھڑے ہو کر میں نے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں عزت کے ساتھ بٹھایا۔ مگر خوف و دہشت سے میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ میں نے شوکت صاحب کی طرف دیکھا جو اب مسودہ میز پر رکھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ ڈپٹی صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔ مگر شوکت صاحب نے پھیکی مسکراہٹ سے ہاتھ ملایا اور اٹھ کر اپنے [illegible] چلے گئے۔ میں ڈپٹی صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ اور اس سے پہلے کہ ڈپٹی صاحب رخصت ہوں۔ شوکت صاحب کا نوکر ایک پرچہ لئے ہوئے آیا۔ پرچہ کیا تھا [illegible] تھا جس کی مجھے امید تھی یعنی استعفیٰ۔ لیکن ان کے استعفے سے میں زیادہ گھبراتا نہ تھا۔ وہ جہاں انتہا درجہ کے تنک مزاج اور زود رنج تھے وہاں دل کے اتنے صاف تھے کہ بڑے سے بڑے واقعہ کو بھی چند گھنٹوں یا دنوں میں اس طرح فراموش کر دیتے تھے۔ جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

سورج کی اشاعت کے بعد ہی میں نے شوکت صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے مضامین کتابی شکل میں مرتب کریں۔ اور نسیم بک ڈپو سے اس کی اشاعت کی جائے۔ شوکت صاحب نے میری اس رائے سے اتفاق کیا اور موج تبسم کے نام سے اپنے ابتدائی منتخب مضامین کو مرتب کر کے دیا۔ اس کی اشاعت ۲۰×۲۶/۱۶ سائز پر ہوئی۔ پورے کپڑے کی جلد بنی اور سنہرے الفاظ میں کتاب کا نام چھاپا گیا۔ جس طرح شوکت تھانوی کا نام میرے تعاون سے پہلی بار کسی اخبار پر اڈیٹر کی حیثیت سے لکھا گیا۔ اسی طرح یہ فخر بھی مجھی

لاہور میں ان کی پہلی کتاب کا پبلشر بنا اور اس کے بعد میں نے شوکت صاحب کی دیگر کتابیں موجِ تبسم، بحرِ تبسم، بڑھیا، مضامینِ شوکت، سودیشی کانسٹی ٹیوشن، خانم خاں، وہ لیڈر صاحب اور شیطان کی ڈائری، بیوی وغیرہ بھی شائع کیں۔

اور مجھ کو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انگلستان کی اڈیٹری کے زمانہ میں شوکت صاحب سے جب میرے تعلقات ہوئے تو میں ان کے ساتھ ہی مشاعروں میں بھی جایا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے نہ صرف عمر میں بڑے تھے۔ بلکہ ذہانت و ذکاوت میں بھی بڑھے ہوئے تھے۔ ان کا کلام اس وقت بھی معیاری ہوا کرتا تھا۔ وہ لکھنؤ کے مشہور شاعر جناب آرزو کے شاگرد تھے۔ میں بھی آرزو صاحب کی خدمت میں جایا کرتا تھا مگر کبھی ان سے اصلاح نہیں لی۔ ہاں شوکت صاحب نے میرے اکثر اشعار پر اصلاح کی اور کبھی کبھی جب وقت کی کمی یا اور کسی مجبوری کے باعث میں غزل مکمل نہ کر پاتا تو شوکت صاحب اپنی غزل کے چند اشعار مجھے دے دیتے۔ یہی نہیں۔ اکثر مشاعروں میں میری غزل پڑھتے بھی شوکت صاحب ہی تھے اس لئے کہ وہ ذہن و دماغ کے ساتھ ہی آواز بھی مترنم رکھتے تھے۔ اور ان کے پڑھنے کا طرز اتنا دلکش ہوتا تھا کہ وہ مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔

موجِ تبسم کی اشاعت کے بعد میں نے اور شوکت صاحب نے ایک ٹور کیا جس میں کانپور، دہلی، شاہجہان پور وغیرہ کا دورہ کرتے ہوئے ہم دونوں بھوالی پہنچے۔ اس زمانہ میں بھوالی سینی ٹوریم میں ڈاکٹر زبیر صاحب انچارج تھے۔ یہ شوکت صاحب کے کچھ عزیز تھے۔ انہیں کے ساتھ ہم دونوں نینی تال پیدل آئے تھے۔ اس سے پہلے ہم نے نینی تال نہ دیکھا تھا۔ تمام دن وہاں کی سیر کر کے ہم پھر بھوالی واپس آ گئے۔

اس سفر میں موجِ تبسم کی صدہا جلدیں فروخت ہو گئیں۔ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت پسند کی گئی۔ اس وقت صرف مرزا عظیم بیگ چغتائی کی چند کتابیں شائع ہوئی تھیں مزاح پر۔ لیکن ان کا رنگ شوکت صاحب کے رنگ سے بالکل مختلف تھا اور نئی چیز ویسے بھی زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ موجِ تبسم کی کامیابی کے بعد بحرِ تبسم چھپی اور وہ بھی پسند کی گئی۔

شوکت صاحب کو فلش کھیلنے کا بہت شوق تھا اور یہ ناممکن تھا کہ شوکت صاحب جو بات پسند کرتے ہوں میں اس سے انہیں روک لوں یا خود اس سے پرہیز کروں۔ تفریح کی باتیں تو خیر کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اور اس میں برائی کیا ہے جو کسی نے کسی کھیل سے دلچسپی ظاہر کی ہو اس لئے اگر میں شوکت صاحب کی خاطر ان باتوں میں حصہ لیا کرتا تھا جو انہیں پسند تھے تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ حیرت تو مجھے یہ ہے کہ شوکت صاحب نے مجھے بے نمازی تک بنا دیا تھا۔ خدا مغفرت کرے اور مجھے بھی معاف کر دے۔ اب سوچتا ہوں تو سخت ندامت ہوتی ہے۔ ایک انسان کی خاطر مجھے معبودِ حقیقی کی ناراضگی کا بھی خیال نہ ہو سکا۔ بات یہ تھی کہ میں جو کچھ بھی ہوں۔ ایک بہت ہی متقی اور پرہیزگار باپ کا بیٹا ہوں۔ والد مرحوم کی نماز کبھی قضا نہ ہوئی تھی۔ مجھ پر بھی اتنا اثر اس زمانہ میں ہو گیا تھا۔ جب میں حرم و مسجد کا خیال کرتا تھا کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھوں۔ لیکن شوکت صاحب اس وقت نماز پڑھتے ہی نہ تھے۔ اس لئے وہ مجھے بھی طرح طرح سے روکتے تھے۔ مثلاً میں مصلے پر ہوں اور قبل اس کے کہ میں سجدے میں جاؤں۔ شوکت صاحب لوٹا لا کر سجدے کی جگہ رکھ دیتے۔ کبھی کرسی اٹھا کر جانماز پر لے آتے۔ کبھی جانماز ہی الٹ دیتے۔ غرض ان کی ان حرکتوں سے عاجز آ کر توبہ توبہ، خوفِ خدا نہ محسوس کرتے ہوئے ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں ہی چھوڑ دیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کہہ یہ رہا تھا کہ شوکت صاحب کو فلش کھیلنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس لئے میں نے ان کے اس

شروع کر دیا کرتے ... ایک منظم پولیس فورس کی شکل ... شوکت صاحب مرحوم ... صاحب مرحوم ... صاحب جانی مرحوم اور ... کے ساتھ ... [illegible] ... وقت کی بات ہے ... [illegible] ... شوکت صاحب ... [illegible] ... ہو گئے تو وہ سب ہی ... [illegible] ... شوکت صاحب کی ہوتی ہوا نہیں۔ لیکن وہ اس صحبت کو چھوڑ کر ... [illegible] ... محبت بھی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ اور حالات ایسے کبھی کبھی پیدا ہو جاتے تھے ... [illegible] ... ہم پہنچ گئے۔ اور ... [illegible] ... شوکت ... [illegible] ... مجھے معلوم ہوا کہ میں نے کبھی ان کی تنقید کا مناسب نہ سمجھا۔

شوکت صاحب میں میرے خیال سے سب سے بڑی کمزوری تھی وہ یہ تھی کہ ... تنقید برداشت نہ کر سکتے تھے اگر ایسا ہو جاتا تو شوکت صاحب اس بات پر برہم ہو جاتے تھے ... شوکت صاحب کی کمزوریوں پر کبھی تنقید نہ کرتا ... ان کے دوستوں سے کوئی بھی واقف نہ تھا ... کبھی نہ ڈرا۔ ... لیکن شوکت صاحب میں یہ احساس تھا کہ میری حق گوئی ان کے مقابل ہمیشہ شکست کھاتی رہی۔

ریڈیو کی سروس کے دوران شوکت صاحب سے میری ملاقات کبھی کبھی ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ میرے آفس کے سامنے ہی رہتے تھے۔ جن لوگوں نے شوکت صاحب کو قریب سے دیکھا ہے۔ یا وہ لوگ جو ان کے قریب رہ کر ان سے دور ہو گئے ہیں۔ وہ یقیناً اس بات سے واقف ہوں گے کہ شوکت صاحب پاس ہوتے تو بہترین دوست ہوتے اور دور ہوتے تو اس طرح بھول جاتے جیسے کبھی ساتھ ہی نہ رہا ہو۔ اور جب کبھی وہ دور رہ کر خط لکھتے تو پھر اس انداز میں کہ پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا جیسے کہ شوکت صاحب آج بھی اس سے اتنے ہی قریب ہوں جیسے پہلے تھے۔

لاہور جانے اور پاکستانی بن جانے کے بعد شوکت صاحب کئی بار لکھنؤ آئے لیکن ان کا قیام نہ تو میرے یہاں رہا نہ ان صاحب کے یہاں۔ نہ ہی وہ کسی عزیز کے یہاں ٹھہرے۔ حالانکہ ان کے چچا سسر ظفر صاحب بھی یہیں رہتے ہیں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ہمارے یہاں قیام کے بعد رمی کھیلنے کا انہیں موقع نہ ملتا۔ جب کہ ان کا تقریباً تمام وقت اسی شغل میں ان احباب کے ساتھ صرف ہوتا جو ریڈیو اسٹیشن کی سروس کے زمانہ میں ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ ایک بار جب شوکت صاحب کو میں نے اس سلسلہ میں احتجاجی خط لکھا تو انہوں نے اپنے خط مورخہ ۴ ا۔ اپریل میں مجھے لکھا تھا۔

"— میں تم سے دور ہو چکا ہوں۔—— اتنی دور سے یہ دل آزاری کرتے شرم نہیں آتی — میری بے وفائی کا شکوہ کرنے والوں میں تم بھی ہو لہٰذا سنو۔

لاہور سے تین مرتبہ ایک نہ ایک کام سے وہاں گیا۔ اور تینوں مرتبہ اس حالت میں کہ بھارت جا کر پاکستان والے ایک

ایک پیسہ واسطہ سے پکڑ کر صرف کرتے ہیں۔ میں نے ریڈیو کی پرواہ نہ کی، اور لکھنؤ چلا گیا۔ ایک مرتبہ تمہارا مسعود صاحب کا بچوں کے کیمپ صاحب کیا کام تھا کرداں؟ کسی تجارتی شو پر گیا تھا۔ کوئی جاننے والا موجود تھا، صرف دوستوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے۔ آخری مرتبہ تم خود موجود۔ مجھے ٹیں ٹال گئے تھے۔ بہرحال اس میں میرا قصور نہیں۔ بہرحال میں بے مروت ہی طوطا چشم ہی محبت فراموش تھا مرتبہ ان حضرات سے سنے گیا ہے۔ مگر اس وعدہ کی محبت اور مروت کے قیمت کے بعد سجادہ نشین بنے بیٹھے ہیں۔ اب ذرا اپنے گریبان میں تم بھی منہ ڈال کر دیکھو۔ مسالہ خود جو تم اپنی گفتگو کر لب لہجہ سا سہے ہو۔ سچ۔ غزالہ اور ممو میاں اور بھابی اور ننھی بچی کے۔

۱۰۰ پچھے پرانے جو میری بے مروتی کے شاکی ہیں ان کی سلامتی کے لئے میں دعا کرتا ہوں کہ جب میں سدھاروں تمام کو میری مروت اور وفا بھی یاد آ کر پھر تو سزا دے

طرزی صاحب کو تسلیم۔ ممو میاں کو پیار۔ اور بچی کو بہت بہت پیار۔

جاؤ ہم اپنا نام نہیں لکھتے۔

میں نے اس خط کا جواب دیا اور ریڈیو کو گالی کہ لکھنؤ آپ آئے رنگ کھینچ رہی سب سے اہم مسئلہ ہے آپ کی زندگی کا۔ وغیرہ وغیرہ اور اس کا جواب شوکت صاحب نے ۲۰، اپریل ۱۹۵۵ء کو ریڈیو پاکستان سے لکھا جو حسب ذیل تھا۔

برادرم نسیم صاحب آپ کا خط ملا۔

لکھا تھا کہ حسد محبت کو جلا دیتا ہے اور بدگمانیوں کو ختم کر دیتا ہے مگر معلوم ہوا کہ بدگمانیاں جدائی اور بعد کی فضاؤں میں بھی پروان چڑھتی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تم میرے خلوص کے کبھی قائل نہ تھے۔ اور ہمیشہ پرورش کے طور پر مجھ سے خلوص برتتے رہے۔ بہرحال تم اپنی خو نہ چھوڑو ہم اپنی وضع نہ چھوڑیں۔ اور یہ تعلقات یوں ہی چلتے رہیں۔

یار ایک بات بتاؤں۔ مجھ ایسے لعنت زدہ ہستی کو بھول جاؤ سمجھ لو کہ مر گیا۔ وہ بدنام کنندۂ وفا اور صبر کرو۔ تمہارا اور تمہاری غزالہ کا خط پڑھنے کے بعد میں اپنی نظروں میں جس حد تک گرا ہوں اس گہرے غار سے شاید تم خود مجھ کو نہ نکال سکو گے یہ معاوضہ ہے میرے ان جذبات کا جو تمہارے لئے دل میں تھے۔ ہیں اور باوجود اس قدر افزائی کے ہمیشہ رہیں گے۔

تمہارا بے وفا
شوکت

میں نے اس کا جواب بھی لکھا اس لئے کہ اب شوکت صاحب سے میرا خوف دور ہو چکا تھا اس لئے کہ نہ سوریٰ کے ایڈیٹر تھے نہ ہی اپنا کوئی ناول مجھے اشاعت کے لئے دیتے تھے۔ لکھنؤ آتے تو ان لوگوں کے یہاں قیام کرتے جو صرف رمی کے ناتے ان کے دوست تھے۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ اب بھی میں حق بات کہتے ڈرتا۔ میرا خط پا کر شوکت صاحب نے پھر مجھے ریڈیو پاکستان سے ۲۴ مئی ۱۹۵۶ء کو جو خط لکھا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

میرے نسیم! اپنی بیوی کے ماتم پر مرثیہ پڑھ رہے ہو۔ میرے خدا [illegible] کیا ہو گیا [illegible] تم نے [illegible] سینہ چاک کر کے رکھ دیا اور اب [illegible] [illegible] وقت [illegible] ان [illegible] کے ساتھ [illegible] سب [illegible] ہیں۔ [illegible] اپنے [illegible] [illegible] [illegible] یہ حال تھا [illegible] [illegible] حقیقت حال [illegible] سب کچھ ہے [illegible] شوکت [illegible] سب کچھ [illegible] ہو جاؤ اور کسی [illegible]
[illegible] کے اس [illegible] [illegible] ہے۔

بہرحال تم مجھ سے بدظنی [illegible] تمہارے [illegible] [illegible] [illegible] اور پھر [illegible] [illegible] [illegible] خدا تم کو [illegible] کرنا [illegible] ہی پاس۔

جالب کی خدمت میں آداب۔ ثمر میاں کو دعائیں۔ چندہ [illegible] ۔۔۔ [illegible] صاحب اگر قریب ہوں تو ذرا انگشت شہادت ۔۔۔۔

تمہارا شوکت

اور اس کے بعد جب تک شوکت صاحب زندہ رہے۔ افسوس کہ حالات سازگار نہ ہو سکے۔ اور پھر ان کی علالت نے وفا نہ کی۔ میں بھی کبھی کبھی خط لکھتا رہا۔ اور کبھی کبھی شوکت کے خطوط بھی آتے رہے۔

دفتر [illegible] راولپنڈی سے ۲۸ جولائی [illegible] کو انہوں نے مجھے یہ خط لکھا تھا

نسیم پیارے۔ میری عمر بھی تم کو لگے۔

تمہارا خط ابھی ملا ہے۔ اور میں عالم تصور میں اس کو سرونج کے دفتر میں بیٹھ کر پڑھ رہا تھا۔ خدا تم کو خوش رکھے کہ تھوڑی دیر کے لئے تم نے مجھ کو وہیں پہنچا دیا جہاں کی سہانی یادیں اب صرف تڑپا ہی جاتی ہیں۔

تمہاری عزیزہ اور میری بیگم [illegible] مجھ سے واقعی روحانی طور پر بہت قریب ہے۔ میں نے ایک دن [illegible] کو ایسی جگہ یاد کیا کہ جہاں انسان خود اپنے کو بھول جاتا ہے۔ پیرس [illegible] دیکھنے گیا تھا وہاں ایک مغربی خاتون کو دیکھا جو اس طرح [illegible] رہی تھیں کہ دل میں خیال آیا کہ یہ ہنسی گوش آشنا ہے۔ اپنے حافظہ کو کریدا اور فوراً ہنستی ہوئی عزیزہ سامنے آ گئیں کہ آپ مجھ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ پھر لندن واپس آ کر میں نے غالباً عزیزہ کو خط بھی لکھا تھا۔ میں نے اس لئے لکھا کہ وہ

لہ یہ خط حریم [illegible] جون میں شائع ہو چکا ہے۔

لہ میری بیوی کی عرفیت۔

عزیز مجبور رہا میں سمائے رہتے ہیں۔ اسی طرح اچانک یاد آجایا کرتے ہیں۔ بیگم جانی ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ اسی طرح میرے تصور میں ابھر چکی ہیں۔ اور یہ ایک روحانیت کا مسئلہ ہے کہ بعض افراد سے روحانی تعلق ہوتا ہے۔ وہ اسی قسم کا سلسلہ وارد ہوتا ہے۔ بیگم جانی کو مجھ سے جو عقیدت ہے وہ اسی قلبی اور روحانی تعلق کا نتیجہ ہے۔ خدا اس کو تمہارا خوش نصیب سہاگن رکھے۔ اور تم اس کے لئے سلامت رہو۔ نانا ابا میری اس دعا کا مفہوم واضح ہو گیا ہوگا کہ میری عمر بھی تم کو لگے۔

نسیم تم نے جس جدوجہد سے حالات کے ساتھ کشتی لڑی ہے اس سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ اور قدر کرتا ہوں وہی عزم کا انسان سمجھتا ہوں۔ یہ وقار قائم رکھنے کے لئے بیشک کسی کے سامنے دست سوال دراز کئے تم نے اپنے ادارے کو زندہ رکھ کر معجزہ کیا ہے۔ مگر تمہارے اس اہتمام اور اس محنت سے میں ڈر رہا ہوں کہ صحت کی ذمہ داری سے غفلت نہ برتنا شروع کر دو۔ بات یہ ہے کہ یہ تو آدمی میرا ایسا بے حیا ہو کر

غم ہائے روزگار نے آساں بنا دیا
جو غم ملا اسی کو ہنسی میں اڑا دیا

مگر تم میں یہ بات نہیں ہے۔ تم آدمی ہو حساس بھی اور فطرتاً کم تندرست بھی۔ لہٰذا تم بہت نازک آبگینہ کی حیثیت رکھتے ہو۔ مناسب یہی ہے کہ اب اپنی حفاظت خود کرو۔ شمو میاں اب بالغ ہو چکا ہے۔ عاقل تو پہلے ہی سے ہے۔ اس سے تھوڑی ذمہ داریاں سنبھلواؤ۔ یہ کھو دیا اور خود ذرا آرام بھی کیا کرو۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ تم تندرست اور زندہ رہو۔ خواہ وصل یار ہی کے شوق میں مبتلا ہو کر ہی کیوں نہ زندہ رہو۔

اپنی عزیزہ کو ماموں جان کی دعائیں پہنچا دو۔ بیگم اسکو اور منے کو پیار شمو میاں کو دعا اور پیار دونوں بھاوج کو آداب۔

میرے یہاں بھی سب اسی قسم کی باتیں کہہ رہے ہیں۔ طرزی نمبر بھیجنا ضرور۔

تمہارا شوکت

اس خط سے پہلے ہی طرزی صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر شوکت صاحب نے دفتر جنگ راولپنڈی سے ہجران کو لکھا تھا۔

پیارے نسیم

خدا تم کو سلامت رکھے۔

آج صبح ناشتہ کرنے بیٹھا اور چائے کے پہلے ہی گھونٹ کے ساتھ نظر پڑی۔ اخبار میں اس نحس خبر پر جس نے چائے کی اس گھونٹ کو بھی حلق میں پھنسا دیا۔

محبوب طرزی ہمارا ایک خلوت و جلوت کا ساتھی اس طرح ہم سے بچھڑ گیا۔ کاش تم یقین کر سکو کہ آج دن بھر میں عالم تصور میں لکھنؤ ہی میں رہا ہوں۔ یہ بس غضب ہے جب طرزی کا تصور لے گیا۔ اللہ جانے تم آج کل لکھنؤ میں ہو یا نینی تال میں بہر صورت کسی طرح میری تعزیت اس کے پسماندگان تک پہنچا دو۔ مجھے اس کا پتہ معلوم نہیں۔ مگر آج

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ت . ثبوت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شوکت تھانوی سودیشی ریل کے بعد

حکیم یوسف حسن

۱۹۲۶ء کا زمانہ تھا۔ متحدہ ہندوستان پر ہر جگہ برطانوی پرچم لہرا رہے تھے۔ بھارت میں سودیشی تحریک زوروں پر تھی۔ ہر پلیٹ فارم اور اخبارات کے صفحات پر حکومت پر شدید نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ ہندوستانی رائے عامہ کو بیدار کر کے سوراج حاصل کرنے کے لئے اُسے تیار و متحد کیا جا رہا تھا۔

ہندوستان کی ادبی فضا پر "نیرنگ خیال" ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوا تھا۔ اس کے صفحات پر بنگال، بہار، یو۔پی، حیدر آباد، بمبئی اور پنجاب کے چوٹی کے ادبا اپنے رشحاتِ قلم پیش کرتے تھے۔ اس کی کامیابی اور مقبولیت غیر معمولی تھی۔ ہم نت نئی باتیں سوچا کرتے تھے۔ پرچہ کو آگے بڑھانے اور ریکارڈ توڑ نمبر نکالنے کی دھن ذہن پر سوار رہتی تھی۔

ذہن نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا۔ یہ مختصر سا لفظ تھا "سالنامہ"۔ ہم نے گویا انگریزی لفظ ANNUAL کا صحیح ترجمہ کیا تھا "روزنامہ" کے وزن پر سالنامہ گویا سال بھر کا یا سال بعد کا نمبر ہونا چاہیئے۔ نیرنگ خیال نے سب سے پہلے سالنامہ ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔

یہ خیال ۱۹۲۷ء کے آخر میں سوجھا۔ ذہن رسا اس کے لئے قسم قسم کی جدتیں سوچنے لگا مثلاً

اس کا سائز عام رسائل سے بڑا ہونا چاہیئے۔

اس کا ٹائیٹل نئے انداز پر خاص قسم کے کاغذ پر رنگین چھاپا جائے۔

مشہور مصور عبدالرحمان چغتائی اس کے لئے ڈیزائن عطا کریں۔

کتابت اور طباعت بڑی دلکش اور دیدہ زیب ہو۔

چھ، سات ٹرائی کلر (رنگین) آرٹ کی تصاویر سے اسے مرصع کیا جائے۔

متعدد ہاف ٹون بلاک چھاپے جائیں۔

اس کا اشتہار خاص انداز سے جاری کیا جائے۔ اور سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ زمیندار سے معاملات کر لئے جائیں۔

ایک کالم مخصوص ہو۔ اس پر عنوان ہو۔

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۲۸ء۔۔ اور پھر اس کے نیچے ان تمام اہلِ قلم کے نام دیئے جائیں جو اس میں مضامین لکھ رہے ہیں۔

ترتیب ہو کر چھپے [illegible] ایک نام ہر صفحے پر سب سے اوپر درج ہوں۔ اور تیسرے صفحے پر تین نام ہوں [illegible] بعد ایک نام اضافہ ہوتے ہیں نیرنگ [illegible] نام ہیں اور [illegible] پاسبان نام ہیں۔ اور صفحہ [illegible] بحث جا [illegible] ایک نام [illegible] اشتہار شائع کر لیں۔

[illegible] کے اشتہار کی کامیابی کا عام [illegible] نیرنگ خیال [illegible] اور لوگ [illegible] نیرنگ خیال [illegible] کے [illegible] تھے۔

اس وقت سستا زمانہ تھا۔ پہلے [illegible] روپے میں جو ماہانہ [illegible] روپے میں بھی پیش کی [illegible] ہے۔ [illegible] پانچ روپے کا تھا اور آج وہ ۳۲ روپے میں ہے۔ [illegible]

اور ماہانہ سے مضامین۔ نیرنگ خیال کی ترقی کے لیے اس کو [illegible] کے لیے ہر دن رات ایک ہی بات سوچتے تھے۔

نیرنگ خیال!!!

خواہ [illegible] ہمارے احباب پر نیرنگ خیال بڑی طرح سوار تھا۔ ہر ماہ اس کے مضامین لکھے جاتے [illegible] ہندوستان کا سفر کرنے کی تیاری پہلے کی۔ خاص خاص اہل قلم کو خطوط لکھے گئے۔ ہندوستان کے [illegible] سے [illegible] اور ہم لوگ [illegible] سعادت، میرٹھ، دہلی، کانپور اور [illegible] ایک ہی چکر میں [illegible] جہاں نیرنگ خیال کی [illegible] نہیں تھی [illegible] چند [illegible] گئی ہیں۔

ان لمحات میں۔ حضرت شوکت تھانوی کی!

ان دنوں شوکت ایک نوخیز نوجوان تھے۔ کچھ تھوڑا بہت لکھ لیتے تھے۔ کبھی شعر و شاعری سے شوق فرماتے۔ کبھی افسانوں میں دلچسپی لیتے۔ کبھی کسی اخبار میں کچھ کام کر لیتے کبھی کسی کی کتاب مرتب کر دی۔ دو چار ایسے مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے تھے۔ جن میں مزاح کی چاشنی اسی طرح تھی جس طرح ان کے منہ سے وہ پھولوں کی صورت بکھرتی رہتی تھی۔ ابھی ادب میں ان کی صحیح [illegible] یا مقام کا تعین نہ ہوا تھا۔

لکھنؤ میں نیرنگ خیال کے محسن اول ہمارے دوست حامد اللہ افسر مقیم تھے۔ آپ تھے تو میرٹھ کے لیکن لکھنؤ میں ان کا قیام اتنا طویل ہو گیا تھا کہ انہیں اب لوگ لکھنوی ہی سمجھتے ہیں۔ وہیں ہماری پہلی ملاقات شوکت صاحب سے ہوئی۔ اور متعدد دعوتیں ہوئیں اور لکھنؤ کی سیر کا پروگرام بنا۔ وہ بطور رہنما کے لکھنؤ میں ہمارے ساتھ رہے۔ اور ان کے امداد و تعاون سے ہمیں اپنے مقاصد میں بڑی کامیابی ہوئی۔ ہم نے باتوں باتوں میں شوکت کے ذہن پر نیرنگ خیال کے آنے والے سالنامے کا ایسا خاکہ ابھارا کہ یہ نوجوان ادیب ٹھٹھک کر رہ گیا وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا اور سمجھا کہ کسی علاؤ الدین چراغ کے ذریعہ دنیائے ادب کے سامنے ایک ایسا طلائی اور نقرئی محل پیش کرنے والا ہوں جس میں سینکڑوں کھڑکیاں ہوں گی۔ اور ہر ایک کھڑکی میں ایک نامور ادیب جلوہ افروز ہوگا۔ اور پھر کیا اس میں شوکت تھانوی بھی ہو سکتا ہے؟ یہ سوال تھا جو اس نوجوان ادیب کے ذہن پر بار بار ابھر رہا تھا

کیوں نہیں! اس میں شوکت تھانوی بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ذرا محنت کر کے ایک ایسا شاہکار مضمون لکھو کہ لوگ محو حیرت رہ جائیں!

ہماری عادت تھی کہ ہم نوجوان اور نوخیز ادیبوں کو مختلف ڈھنگوں سے لکھنے اور اچھا لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

اور بعض اوقات اصلاح لے لینے پر بھی مجبور کر دیتے تھے۔ ناصر اور استاد قمر کے اہلِ قلم سے جاں نثار تعلق دوسری نوعیت کا تھا۔ الغرض یہ تمام احباب اور ایڈیٹری کے جھمیلے میں محفوظ رہتے تھے۔ اور ہر وقت وہاں سے کام لیا کرتے اور کام کرتے تھے۔
شوکت صاحب نے کہا افسانہ کے متعلق :
میں نے کہا افسانہ ! افسانے تو بہت آ جاتے ہیں۔ اور نظموں کے لئے تو جگہ نہیں نکلتی۔ نثری علمی مقالے کم تھے میں نے کہا اگر آپ مزاحیہ یعنی مزاحیہ افسانہ لکھیں تو بات دلچسپ رہے گی۔ اس انداز میں لکھنے والے کم ہیں۔ اور آپ میں بڑی صلاحیت ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک مزاحیہ افسانہ جب پوری کوشش سے لکھا جائے تو وہ کامیاب نہ ہو۔ ذرا ذہن پر زور دے کر کوئی پلاٹ سوچئے۔ اور مزاح کا رنگ بھرتے جائیے۔ اور پھر دیکھئے کہ شوکت کے نام کا ڈنکا بجتا ہے یا نہیں۔"
ہم نوجوان مسکراتے رہے۔ شوکت نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری اور کہا میں کوشش کروں گا۔ اُس وقت میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میں سودیشی ریل کے مصنف سے بات چیت کر رہا ہوں۔ یا میری اس تحریک کے نتیجہ میں ایک شاہکار مضمون کی تخلیق ہونے والی تھی۔
نیرنگِ خیال کے اس سالنامہ میں بڑے پایہ کے مضامین تھے۔ مگر جو چرچا سودیشی ریل کا ہوا وہ کسی دوسرے مضمون کو نصیب نہ ہوا۔
۱۹۲۵ء میں انگریزی حکومت ہندوستان پر اپنا تسلط مضبوط کرنے کی فکر میں تھی۔ اور ساتھ ساتھ وہ ان تمام تدابیر اور ذرائع کو ملیا میٹ کرنا چاہتی تھی جو سوراج حاصل کرنے کیلئے اختیار کئے جا رہے تھے۔ سودیشی ریل جس کا ردو ادب میں مزاحیہ رنگ میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ وہ دشمنانِ آزادی، ہندوستانیوں کے سوراج حاصل کرنے پر اس ملک کی جو گت بنے گی اس کے نقوش دکھانے کے لئے بطور دلیل کے پیش کر رہے تھے۔
سودیشی ریل کا بے ساختہ پن۔ ہندوستانیوں کی تحریک سودیشی کا مضحکہ اڑانے والا ثابت ہوا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا ہر ایک ممبر اس مضمون سے بہت متاثر ہوا۔ اور محکمہ اطلاعات حکومت ہند نے اس مضمون کے انگریزی تراجم مختلف ذمہ دار افسروں گورنروں اور وائسرائے کو بھجوائے کیونکہ اس میں سودیشی تحریک کا مضحکہ جس انداز میں اڑایا گیا تھا وہ حکومت کے اقتدار کو مضبوط کرتا تھا اور انہیں سودیشی ریل جیسے متعدد مضامین کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔
ہمیں سو فیصدی یقین ہے کہ شوکت تھانوی کا ذہن اور دامن اس قسم کی آلائشوں سے پاک تھا۔ اور انہوں نے سودیشی ریل خالص مزاحیہ انداز اور مزاحیہ بنیادوں پر استوار کی تھی۔ اُسے سیاسیات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ لیکن انگریزی حکومت کے ارباب حل و عقد نے اس سے جو تاثر لیا اور اس سے اپنے مقاصد میں جو امداد حاصل کی اس سے اس کا مصنف نا واقف تھا۔
حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات کے سربراہ ان دنوں علامہ جعفری تھے۔ جو بڑے مدبر اور مشہور اہلِ قلم تھے۔ اس مضمون کی وجہ سے شوکت تھانوی کا تعارف جعفری صاحب سے ہوا۔ اور بعد میں یہ تعارف شوکت صاحب کے سونگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں منسلک ہو جانے کا باعث بنا۔ جعفری صاحب نیرنگ خیال کے نہ صرف مداح تھے۔ بلکہ سرپرست بھی تھے۔ اور خود بھی نیرنگ خیال میں وقتاً فوقتاً لکھتے تھے۔

سودیشی ریل کے علاوہ بھی شوکت صاحب کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جو [illegible] خوشگوار [illegible] کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مضامین کی [illegible] خصوصیات یہ ہیں کہ ان مضامین میں شوکت صاحب نے جو مزاح پیدا کیا ہے [illegible] وہ سراسر [illegible] معصوم ہوتی ہے۔ [illegible] ایک جگہ بھی نہیں کیا۔ ان مضامین میں [illegible] بات کامیاب ثابت ہوا [illegible] کے لئے صرف ادب [illegible] نے ایک [illegible] حاصل کیا [illegible] تھا۔

اس زمانے میں پطرس اور رشید احمد صدیقی کے علاوہ [illegible] نگاروں میں بہت کم تخلیقات میں جو مزاح نہ تھا۔ [illegible] کا [illegible] تھا تو دوسرا طنز نگاری کا علم [illegible] پطرس نے کسی مضمون کے لئے [illegible] کی [illegible] مضمون رسالے کے صفحات پر نظر آتا تھا۔ یہی حالت رشید احمد صدیقی کی تھی۔ [illegible] رسالے چاہتے تھے مزاحیہ مضامین [illegible] سے زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس لئے وہ چند اہل قلم [illegible] لکھنے کا شوق رکھتے تھے۔ شوکت کی [illegible] کامیابی سے بہت متاثر ہوئے [illegible] کوشش کی۔ [illegible] مضمون شوکت تھانوی ادب کی [illegible] میں طے کر گئے ہیں۔ انہوں نے [illegible] وہ مقام حاصل کر لیا جو ایک ادیب برسوں کی مسلسل کاوش کے بعد حاصل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان دونوں [illegible] [illegible] عظیم بیگ چغتائی اور بہت سے دیگر اہل قلم نے زیادہ توجہ [illegible] سے لکھنا شروع کیا اور رسالوں کا ہر نمبر [illegible] مزاحیہ مضامین سے مزین ہونے لگا۔ مشہور رسالوں کے علاوہ قریباً [illegible] جن دوسرے ادیبوں نے بھی اس سلسلہ میں خامہ فرسائی کی۔ مثلاً ابو ظاہر، پروفیسر غلام سرور، ساغر، میر ولی اللہ ایبٹ آبادی، پروفیسر حسن جعفری وغیرہ وغیرہ۔ ان کے مضامین بھی مزاحیہ ادب میں کچھ نہ کچھ مقام رکھتے ہیں۔ گویا ادب کے اس نوع پر بھی خاص توجہ دی جانے لگی۔ بلکہ مزاح کی یہ مقبولیت اخبارات تک بھی جا پہنچی اور اکثر روزناموں نے مزاحیہ کالم اپنے لئے لازمی قرار دے دیئے۔ روزنامہ انقلاب کی مقبولیت کا باعث، فیض [illegible] جناب سالک مرحوم کے لکھے ہوئے افکار و حوادث تھے۔ افکار و حوادث علم و ادب مزاح اور طنز کے شہ پارے ہوتے تھے۔ اگر ان کا انتخاب شائع کیا جائے تو ہمارے خیال میں وہ مجموعہ تمام مزاحیہ کتابوں سے گراں بار ثابت ہوگا۔ ہندوستان کے اخبارات میں ظفر علی خان کی [illegible] اور زمیندار اخبار میں حاجی لق لق کے مزاحیہ کالم گو علمی ادبی [illegible] سے محروم تھے لیکن کچھ نہ کچھ مزاح کا رنگ ضرور رکھتے تھے۔ یہ رسم یہاں تک بڑھی کہ آج بھی روزنامہ جنگ میں ابراہیم جلیس کا کالم "وغیرہ وغیرہ" شوکت تھانوی کا "آپ یا ہم" تھے۔ روزنامہ نوائے وقت کا "سر راہے" خاصے مقبول ہیں۔ شوکت تھانوی کی سودیشی ریل نے مزاحیہ ادب کی کامیابی کے راستے استوار کر دیئے۔ اس کامیابی کا ایک بین ثبوت شوکت تھانوی کی درجنوں مزاحیہ تخلیقات ہیں۔ جن کی مقبولیت اس بات کی شاہد ہے کہ ہر پڑھا لکھا اپنے دماغی سکون کے لئے تفریح و تنفس کے لئے اور غم و افکار کے ازالہ کے لئے جب کچھ پڑھنا چاہتا ہے تو اس قسم کے لٹریچر کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ افسانہ اور ناول ٹریجڈی سے بھرپور ہوتے تھے۔ اور خوش انجام ناول بھی جب تک ایک [illegible] پوری طرح رنگ نہ جائیں، مسرت کی گھڑیوں کے قریب نہیں پہنچتے۔ اس لئے دو گھڑی ہنس بول لینے کے لئے اور تفکرات دنیا سے آزاد رہنے کے لئے مزاحیہ کتابوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

شوکت تھانوی نے جو کچھ لکھا ہے بہت کم لکھا ہے۔ [illegible] ریڈیو کی نذر ہو گیا، یا روزناموں میں کھو گیا۔ ریڈیو کی صورت

سب سے حالت ناہموار ہے۔ وقت بے وقت، بلا ضرورت، جبراً لکھنا پڑتا ہے۔ یہ آمد نہیں آورد ہوتی ہے۔ مدنی کا سوال ہمیشہ مقدم ہوتا ہے۔ مجبوری کے لئے جو ادب تخلیق کیا جائے گا وہ یقیناً پست ہوگا۔ وقتی طور پر چٹخارہ ضرور آ جاتا ہے۔ مگر اسے کوئی مستقل شکل نہیں دی جا سکتی۔ ریڈیو کی شدید مصروفیت نے شوکت تھانوی کی ادبی صلاحیتوں کے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور وہ وہ مقام حاصل نہ کر سکا جو وہ اطمینان اور سکون سے لکھی ہوئی تحریروں سے حاصل کر سکتا تھا۔

شوکت تھانوی ابتدا میں سب سے اول شاعر تھے۔ اس کے بعد افسانہ نگار بنے اور آخر میں مزاح نگار ہو گئے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ شوکت تھانوی اچھے شعر کہتے تھے۔ اب بھی جب کسی مشاعرہ میں مدعو ہوتے تو اپنا کلام سناتے تھے جو پسند کیا جاتا تھا۔ اگر آپ مزاح نگار نہ ہوتے تو یقیناً ایک نامور شاعر ہوتے۔

۱۹۳۳ء کا سالنامہ نیرنگ خیال میرے سامنے ہے اس میں جن شعراء کا کلام درج ہے ان کے نام ملاحظہ ہوں۔ کیفی چڑیا کوٹی، ساغر نظامی، جگر مراد آبادی، آرزو لکھنوی، اصغر گونڈوی، جمیل قدوائی، تپش لاہوری، حسن ... آزاد انصاری، ... لکھنوی، بادی حسن، مرزا یاس، شوکت تھانوی، سید عابد علی، اختر شیرانی، حضرت سیماب، ... حشر، رگھوپتی سہائے فراق، سید الطاف شاہ بیکش، ضیا فتح آبادی، احسان بن دانش، اکبر حیدری، محمود اسرائیلی۔ ان سب کے دوش بدوش شوکت تھانوی موجود ہیں۔ حضرت شوکت تھانوی کی غزل ملاحظہ ہو۔

نوائے شوکت

فریبِ ذوق کو ہر رنگ میں عیاں دیکھا
جہاں جہاں تجھے ڈھونڈھا وہاں وہاں دیکھا

جب اپنے آپ کو آمادۂ فغاں دیکھا
تو دردِ عشق نے لرزہ میں آسماں دیکھا

وہی ہے وحشتِ جنوں اور وہی ہے تنہائی
ترے فریب کو اے گردِ کارواں دیکھا

عجب یہ دل ہے جسے باوجود تنہائی
گھرا ہوا ترے جلووں کے درمیاں دیکھا

جنوں نے ذوقِ محبت مٹا دیا دل سے
پھر اب تو یاد نہیں ہے کسے کہاں دیکھا

ہے برق کو بھی کوئی لاگ نامرادی سے
گری تڑپ کے جہاں اس نے آشیاں دیکھا

کبھی ذرا نہ ہمیں کچھ لطف شہر آیا
ادھر اُدھر وہ وقت کا ضائع ہی کیا
دیکھ دیکھ تیرے جلووں نے آگ جلائی
جہاں جہاں کوئی بے نام و بے نشاں دیکھا
شادی جاں کی بازی ستم محبت نے
جب اُن کے حسن کا سودا بہت گراں دیکھا

۱۹۳۳ء سالنامہ نیرنگِ خیال، صفحہ ۴۰

یہ شوکت تھانوی کا ۱۹۳۳ء کا کلام ہے۔ آج سے ۴۰ سال قبل کا۔ اگر مزاح کا رنگ نہ ہوتا تب پتہ چلتا کہ شوکت ایک اچھے شاعر بھی تھے۔

حضرت شوکت تھانوی کی ایک خصوصیت جو ان کے شعر اور نثر دونوں سے پوشیدہ رہی ہے۔ یہ تھی کہ آپ ہر شاعر کے طرزِ بیان کی ہو بہو نقل کرتے تھے۔ اکثر تنہائی میں یہ شغل بڑا دلچسپ اور پُر لطف رہتا تھا۔ کبھی آپ جگر کے انداز میں اور کبھی شورش کے، کبھی ساغر نظامی کے انداز میں، کبھی حضرت حفیظ جالندھری کے انداز میں پڑھ کر نقل اتارتے تھے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کمرے میں بیٹھا ہو تو وہ اُن کے منہ سے سن کر یقیناً یہی کہتا کہ جناب جگر یا ساغر یا حفیظ صاحب پڑھ رہے ہیں۔ شوکت تھانوی خود تو [illegible] تحت اللفظ پڑھتے تھے مگر [illegible] کی پوری اور ہو بہو نقل ترنم سے اتارتے تھے۔ اگر ریڈیو والوں کو حضرت شوکت تھانوی کی اس خصوصیت کا علم ہو جاتا تو وہ اُن سے بہت سے مفید کام لے سکتے تھے۔ کم از کم اگر ان کا ایک ایسا ریکارڈ ہی تیار کر لیا جاتا جس میں [illegible] ہر ایک شاعر کی ہو بہو نقل اتاری ہو تو یہ ریکارڈ یقیناً عجوبۂ روزگار سمجھا جاتا۔ جب کبھی ہم تنہائی میں شوکت سے ملتے تو اکثر ہماری فرمائش یہی ہوتی تھی۔ شوکت صاحب کچھ ہو جائے۔ اور کچھ سنائیے۔ ذرا ساغر صاحب کی نقل اتاریئے۔ شوکت صاحب زیرِ لب مسکراتے اور [illegible] کی طرح شروع ہو جاتے۔ اور وہ جنوں شعر اسی طرح پڑھتے ہوئے نکل جاتے۔ اس وقت ہم اُن کی مزاحیہ خصوصیات کو بھول جاتے تھے۔ ہمیں اُن کی ان نقالیوں میں اتنا لطف آتا کہ دوسری ملاقات تک قلب و روح پر طاری رہتا تھا۔

غرض شوکت تھانوی ہر فن مولا تھے۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے کر لیتے تھے۔ جو کچھ چاہتے تھے کہہ لیتے تھے۔ یہ خوبی آج اُردو کے کتنے ادیبوں میں ہوگی؟ — جو جانِ محفل بھی ہو۔ اور جانِ ادب بھی!

———— ✻ ————

"شوکت میرا دوست"

سید عطا حسین کلیم

سودیشی ریل کے مصنف سے ملاقات کی تمنا کس کو نہ ہوگی۔ میں بھی شوکت تھانوی کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سودیشی ریل لکھ کر شوکت تھانوی نے ہندو سامراج پر بہت گہری چوٹ کی تھی۔ اُن کی اس تحریک کے بعد عوام کی نظروں میں ہندو کانگرس کے سودیشی راج کی کوئی وقعت باقی نہ رہی تھی۔ اس سے برصغیر میں ہندو راج کے منصوبے خواب پریشاں ہوکر رہ گئے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شوکت تھانوی کی سودیشی ریل نے پورے ملک میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور وہ لوگ بھی جن پر اس میں طنز کیا گیا اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

شوکت تھانوی سے ملاقات کی تمنا مجھے محض اس لیے تھی کہ میں اس شخص کو دیکھوں جس نے اپنی صرف ایک تحریر سے شہرت و ناموری کے تمام مراحل اس قدر جلد طے کر لیے تھے لیکن جب میں اُن سے ملا تو سودیشی ریل ہمارے درمیان موجود نہیں تھی۔ وہ ایک سنجیدہ، دردمند، متین، ہمدرد اور غمگسار دوست کی طرح ملے اور پھر ہم اس وقت تک ملتے رہے جب تک موت نے ہمارے درمیان ایک نہ گرنے والی دیوار حائل نہ کردی۔ یوں تو شوکت تھانوی سے میری یاد اللہ بہت مدت سے تھی لیکن جب وہ راولپنڈی میں "جنگ" اخبار کے مدیر ہوکر آئے تو ہمارے تعلقات اور بھی استوار ہوگئے دن ہو یا رات روزانہ ملاقاتیں رہتیں۔ کبھی بالمشافہ اور کبھی ٹیلیفون پر۔ وہ ایک سچے دوست کی طرح میری زندگی میں داخل ہوئے اور مرتے دم تک میری ہر مشکل کو اپنی مشکل اور میری ہر تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے رہے۔ پچھلے سال جب میں بیمار ہوا اور مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا تو اس کے باوجود کہ وہ خود پاؤں کے درد میں مبتلا تھے ہر شام اپنی بیگم کے ہمراہ عیادت کے لیے ہسپتال آتے رہے۔ اُن کے اور میرے تعلقات اب ہمارے گھروں تک پھیل گئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے دکھوں سے واقف ہو چکے تھے لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شوکت نے اپنے سینے کے اندر اس نامراد بیماری کا جو دکھ پال رکھا تھا اُسے اُس نے کبھی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ شوکت تھانوی بہت کم آمیز انسان تھے لیکن شہرت اور ان کے قدر دانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا وہ جس سے ایک بار بھی ملتے وہ انھیں عمر بھر اپنا خیال کرتا۔ شوکت زندگی کے ہر معاملے میں نفاست اور ایک خاص قسم کے رکھ رکھاؤ کے پابند تھے اُن کی شانی وضع داری اور کم آمیزی زبان زدِ عام تھی لیکن اس کے باوجود کوئی بھی انھیں غرور اور پندار کا طعنہ نہ

ے سکتا تھا۔

شوکت تھانوی ایک بزم آرا انسان تھے یا یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے جس
کی زندگی چہک اٹھتی۔ بات کرتے ہوئے ان کا چہرہ ہمیشہ پُرسکون اور سنجیدہ رہتا، ہونٹوں پر ایک
مسکراہٹ کھیلتی نظر آتی اور گہرے رنگ کی عینک کے پیچھے ان کی آنکھوں میں ایک نہ بجھنے والی چمک
ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا تجزیہ کرنا اور اسے دلکش بنا دینا ان کا خاص وصف تھا۔ وہ صرف ایک نکتے
کو پھیلا کر داستان بنا لیتے تھے۔ ان کی باتوں سے لوگوں کے دلوں میں گدگدی ہونے لگتی، محفل کشتِ زعفران بن
جاتی لیکن وہ خود بہت پُرسکون اور سنجیدہ بیٹھے رہتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

مجھے شوکت تھانوی کی رفاقت میں متعدد مشاعروں میں شرکت کا موقع بھی ملا۔ یوں تو ہر جگہ ان کی طبیعت
کی شگفتگی اور حاضر جوابی نے سفر کی کوفت کو آرام اور سکون سے بدل دیا۔ مگر مظفرآباد کے مشاعرے تو عمر بھر
یاد رہیں گے۔ مولانا ماہر القادری اور صابر دہلوی مرحوم کے دیرینہ مراسم تھے مولانا سے ان کی محبت اور بے تکلفی
تو بعض اوقات گستاخی کی حدوں کو چھو لیتی تھی مگر چونکہ دونوں جانب یکساں خلوص اور محبت کارفرما تھے کبھی
بھی بدمزگی کی نوبت نہیں آئی۔ مظفرآباد کے مشاعرہ میں مولانا ماہر القادری کو رات بھر جگائے رکھا۔ ان سے
پرانے وعدہ کا کلام مجبور کر کے سننا پھر ان کی سادہ لوحی کو کسی فرضی محبوبہ اور شکوہ کا مجموعہ بنا کر صبح تک عشقیہ
اشعار سنتے رہنا یہ سب شوکت کی زندہ دلی کے مظاہرے تھے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ شوکت مولانا کی
عزت نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی تاویل یوں کی جا سکتی ہے کہ شوکت کی سدابہار طبیعت نچلی چین سے بیٹھنے نہ
دیتی تھی اور ان کی حاضر دماغی سنجیدہ سے سنجیدہ گفتگو میں بھی مزاح کے نکات ڈھونڈھ لیتی تھی۔ مری میں گزشتہ
سال جشنِ مری کے سلسلہ کا سالانہ مشاعرہ تھا دیگر شعرا کے ساتھ شوکت، سید محمد جعفری اور میں بھی مدعو تھے
منتظمین سے طے یہ پایا تھا کہ ہم تینوں برائٹ لینڈ ہوٹل میں اکٹھے ٹھہریں گے شوکت نے پہلے تو یہ شرارت کی کہ شام
کے وقت جب ہم مال روڈ پر گھوم رہے تھے ایک بہت طویل القامت انسان کو عجب ڈرامائی انداز میں پکڑ کر لے
آئے اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے پھر عرض کی "بندہ پرور ہماری زندگی وبال ہو گئی ہے کیا
آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں آپ کا کرم ہو تو ہم اس مصیبت سے نجات پا سکتے ہیں۔"
وہ شریف آدمی حیران ہوا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے شوکت تھانوی جیسا مشہور ادیب اور گفتگو کا یہ انداز!
خدا جانے انھیں کیا مشکل درپیش ہے اس دوران سید محمد جعفری ملتجی نظروں سے اسے دیکھتے رہے جیسے کہہ
رہے ہوں بھائی خدا کے لیے ہماری مدد کرو ہم مظلوم ہیں بہرحال وہ صاحب قدرے پریشان ہو کر گویا ہوئے
"فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" "بس آپ تھوڑی دیر کے لیے ہمارے ساتھ تشریف لے چلیے
وہیں معاملہ طے ہوگا۔" شوکت نے کہا۔ میں ڈاکخانے کے سامنے حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ خدا جانے ان دونوں پر
کیا افتاد پڑی ہے جو اس طرح ایک اجنبی کی خواہ مخواہ منت سماجت کر رہے ہیں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو شوکت

اور جعفری اُن صاحب کو ساتھ لیے میری سمت چلے آ رہے ہیں۔ قریب پہنچ کر شوکت نے للکار کر مجھے مخاطب کیا "بڑا بنا ہے۔ اب بات کر۔ زندگی اجیرن کر رکھی ہے چھ فٹ تین انچ قد کیا ہوا سامنے بے حیثیت ہی گیا۔ جلال آباد کے سامنے تیری کیا حیثیت ہے اور اس تعارف کے بعد یہ بھی سن لے کہ یہ عرب ہیں عشق کی اولاد میں سے ہیں۔" میرا ہنسی کے مارے برا حال تھا اور وہ صاحب ہنسنے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی نظر آ رہے تھے وہ تو کہیے جعفری اور مشاعروں میں جو شعرا کی ایک ٹولی اِدھر آ نکلی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

لاہور کے ایک مشاعرہ میں ایک وہابی قسم کے باریش بزرگ سید محمد جعفری کو ہر مصرع پر بڑھ بڑھ کر داد دے رہے تھے کہ شوکت کو جو شرارت سوجھی تو اپنی جگہ سے اٹھ، ایک لمبا چکر کاٹ کر مولانا کے پاس جا پہنچے۔ مولانا نظم سننے اور داد دینے میں محو تھے کہ شوکت اُن کے قریب منہ لے جا کر بولے ——— "شرم تو نہیں آتی آپ کو انھیں داد دیتے ہوئے۔" وہ بزرگ بہت جز بز ہوئے اور غصے میں کہنے لگے "یہ کیا بد تہذیبی ہے منہ سنبھال کر بات کرو۔ تم نہیں تو مشاعرہ میں کیوں آئے ہو" اب شوکت نے دوسرا وار کیا۔ "حضرت یہ شیعہ ہے" اب کیا تھا مولانا ایسے چپ ہوئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو اور مشاعرہ کے اختتام تک پھر کسی نے اُن کی آواز نہ سنی ——— شوکت تھانوی ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ شیعہ، سنی، وہابی کے امتیازات سے بالاتر۔ اُن کے بہترین دوست سید محمد جعفری اور ظریف جبلپوری کی عمر بھر کی رفاقت اس امر کی شاہد ہے کہ کسی فرقہ کی دل آزاری اُن کے نزدیک گناہِ عظیم تھی اس کا مظاہرہ انھوں نے ایک مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے بھی کیا تھا۔ شوکت زود رنج بھی تھے اور جلد ہی من بھی جاتے تھے میں نے انھیں دوستوں کے لیے کڑھتے دیکھا ہے۔ میرے علم میں ایسی کئی مثالیں ہیں جب انھوں نے اپنے آرام اور فائدہ پر دوستوں کے فائدہ کو ترجیح دی۔ وہ مشاعروں میں شرکت کے تمنائی نہیں تھے لیکن جب کسی مشاعرہ میں بلائے جاتے تو اپنی طرف سے تمام شرائط اور معاملات پہلے سے تصفیہ کر لیتے اور پھر منتظمین کی طرف سے اس معاملے میں ذرا سی کوتاہی بھی گوارا نہ کرتے۔ عام طور پر وہ مشاعروں میں تنہا جایا کرتے لیکن اگر کبھی دوسرے دوستوں کو اُن کی رفاقت میسر آتی تو نہ صرف یہ کہ سفر بہت عمدگی کے ساتھ کٹتا بلکہ اُن کے رفیقوں کو ہر قسم کا آرام بھی ملتا اور شوکت خود تکلیف اٹھا کر بھی اُن کی آسائش کا خیال رکھتے۔

شوکت تھانوی کو قدرت نے ایک سدا بہار ذہن عطا کیا تھا۔ وہ ایک ہی بات کو سو طرح بیان کرنے پر قدرت رکھتے تھے، ان کی نظم میں بے ساختہ پن ہوتا تھا اور ان کی نثر بے خوفی اور بے باکی کی مظہر تھی۔ طنز و مزاح پیدا کرنے کے لیے انھیں کسی تکلف یا بناوٹ کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ وہ مزاح میں طنز کے ساتھ ساتھ اصلاح کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے۔

ان کا کردار "قاضی جی" ریڈیو پاکستان کے جس اسٹیشن سے بھی وابستہ رہا قومی اور ملی مسائل کو سلجھانے میں بے حد مددگار ثابت ہوا۔

قاضی جی گو ایک مزاحیہ فیچر تھا لیکن اس میں شوکت تھانوی کا دل پوری شدت سے دھڑکتا تھا۔ وہ قوم اور وطن کی اصلاح و تعمیر کے لیے اس کردار کے روپ میں کچھ اس طرح نمایاں ہوئے کہ عوام اور خواص یکساں اُن کی شخصیت سے مانوس و متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

۲۳ مارچ سے پہلے وہ قریب قریب صحت یاب ہو گئے۔ وہ اس طرح اکثر بیمار ہو جایا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی انہیں اس قدر پریشان نہیں دیکھا تھا۔ اگر کوئی اُن کی صحت پر ان کے سامنے پریشانی کا اظہار کرتا تو وہ اُسے گوارا نہ کرتے۔ جیسے کہ صحت پر سے اُن کا اعتماد اٹھ گیا ہو۔ لیکن انہیں تکلیف تھا جہاں تک کسی پر فکر مندی کا اظہار کیا جاتا۔ ۲۳ مارچ کو صبح ہی صبح اُس روز ہم میں حکومت کی طرف سے تمغۂ امتیاز ملنے والا تھا ـــــ وہ ملا بھی گئے۔ جو تمغہ بھی شوکت مرحوم کو حاصل کیا لیکن پھر واپس نہ آ سکے آن کے، جب یہاں اس اعزاز پر انہیں مبارکباد دینے کی سوچ رہے تھے خبر ملی۔ شوکت تھانوی میو ہسپتال میں داخل ہو گئے ہیں ـــــ پھر خبر آئی ان کی حالت تشویشناک ہے یہ پڑھ کر ڈاکٹروں نے رپورٹ کا پتہ چلا ہیں، دوسرے عزیز دوست سید محمد جعفری اور میں جلدی ان کے ہمراہ ہو کر ہسپتال میں شوکت سے ملا۔ مگر شوکت مل نہ سکے۔ وہ تو شوکت تھانوی کا بے روح جسد تھا۔ وہ جس تکلیف کے ساتھ سانس لیتے تھے اس سے خود مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

میں تین چار روز تک ہر روز وہاں رہا مگر مجھے شوکت تھانوی ایک دن بھی یوں نہ مل سکے جیسے وہ کبھی ملا کرتے تھے، وہ بے جو تین ہو رہے وہ بجائے خود اس دور کی نشانیاں تھیں جسے شوکت تھانوی نہ جانے کب سے اپنے سینے میں چھپائے بیٹھے تھے۔ اور جو آج ایک مہلک اور آخری روگ بن کر ظاہر ہو گیا تھا۔

اپریل کے آخری ہفتے میں مجھے اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں مشرقی پاکستان جانا پڑا اور چٹاگانگ میں مجھے یہ خبر ملی کہ شوکت تھانوی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ۴ مئی ۱۹۶۳ء کو میں چاٹگام میں تھا۔ وہ دن صبح سے اُداس تھا عالم غربت میں یوں بھی دوستوں اور عزیزوں کی یاد ستاتی ہے ـــــ اور میں تو اپنے جان سے پیارے دوست شوکت کو نزع کی حالت میں چھوڑ کر آیا تھا مجھے بے حد پریشانی تھی پونے نو بجے (مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق) ریڈیو پر خبریں سنیں شوکت کی موت کی خبر نے میرے حواس کھو دیئے میں رات بھر سو نہ سکا۔ اُف! کس قدر بھیانک تھا یہ خیال کہ میں اب قیامت تک اپنے عزیز دوست کو دیکھ نہ سکوں گا۔

میں لاہور سے ڈھاکہ آتے ہوئے شوکت سے ملا تھا۔ اور شوکت کا یہ فقرہ کہ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ مجھے کفن میں لپیٹے دفنانے جا رہے ہیں" میرے کانوں میں گونج رہا تھا شوکت جسے میں نے اپنا عزیز ترین دوست جانا اور مانا اور جس نے مجھ سے اپنی زندگی کا کوئی راز نہ چھپایا ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا میری بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ میں جو اُس کے ہر اچھے بُرے میں شریک تھا اُسے سفرِ آخرت میں کندھا بھی نہ دے سکا۔

ـــــ زندگی کی مجبوریاں ـــــ

بے شک میں نے انہیں شدید بیماری کی حالت میں بھی دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ شخص جسے زندگی سے والہانہ عشق تھا، جو دوسروں کو بھی زندگی کرنے کے گر سکھاتا تھا یوں اچانک موت سے ہمکنار ہو سکتا ہے ـــ! لیکن یہ ہمارے وہم و یقین پر منحصر نہیں، موت کا ایک وقت معین ہے جب وہ وقت آ جائے تو زندگی آپ ہی آپ موت کی تاریک وادیوں میں چپ چاپ اتر جاتی ہے۔

شوکت تھانوی مرگئے یا نہیں ——— لیکن یہ ایک اذیت ناک حقیقت ہے کہ اب وہ ہم میں موجود نہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے رائٹرز گلڈ کے جلسے آپ کے بغیر سونے پڑے ہیں ہمارے مشاعرے بے کیف ہیں ہمارے ریڈیو کے "قاضی جی" کہیں نظر نہیں آتے اور جنگ اخبار کا کالم "پہاڑ تلے" اپنے قارئین کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گیا ہے۔

دنیائے ادب کی طرف سے شوکت صاحب کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں مجھے کیا کہنا چاہیئے میں کیا کہہ سکتا ہوں اور پھر میرے سامنے ایک بھیانک خلا پھیل جاتا ہے جس سوچتا ہوں یہ خلا جسے شوکت کی موت نے پیدا کیا ہے کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ ہم اس بہت ہی پیارے دوست کو اب کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی بے اختیار میرا دل ڈوب جاتا ہے میری پلکیں بھیگ جاتی ہیں۔ ڈھاکہ سے واپسی پر میں لاہور ٹھہرا تھا۔ اپنی بدنصیب بھاوج زہرا شوکت سے ملنے گیا ہم دونوں مرحوم کو یاد کرکے آنسو بہاتے رہے پھر میانی کے قبرستان میں گیا جہاں دنیائے ادب کا یہ درخشندہ ستارہ دھندلکوں میں کھو گیا ہے۔

ایک کچی قبر دُنیا اور دنیا والوں کے عہدِ محبت کی ناآستواری پہ نوحہ کناں ہے اور صبح و شام کی آوا سیاں شوکت کے طنز و مزاح کی جاوداں شگفتگی پر خندہ زن نظر آتی ہیں۔

——— ———

بیگمات نے کہا

محمد طفیل

خلد اللہ کا فرمان ہے دنیا میں، اگر کسی کو ثبات حاصل ہے تو وہ اہل قلم ہی ہیں۔ جو اپنے فن کے بستے پر صدیوں زندہ رہتے ہیں اور رہتے ہیں۔

شوکت تھانوی جسم کے اعتبار سے اس دنیا میں موجود نہیں۔ مگر وہ کسی رنگ میں موجود تو ہیں ورنہ کیوں دل کی ویرانیاں قہر کے لیے سوال بنتیں؟

ان دنوں میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار کاغذ اور قلم کی مدد سے آپ پر واضح نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسی مرحوم مگر زندہ شخصیت " پر لکھنے کے لیے جس دل گردے کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے میسر ہی نہیں۔ میں تو یادوں کے ہجوم میں خود ہی گم ہوا جا رہا ہوں۔

میں جس حال میں بھی رہا۔ انھوں نے میرا ساتھ دیا۔ وہ مجھے چھوٹا بھائی کہتے تھے۔ میں انھیں بڑا بھائی سمجھتا تھا مگر انھوں نے میرے ساتھ تعلقات کو کچھ ایسے نبھایا کہ جیسے وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے اور میں انھیں بڑا بھائی کہتا تھا۔

ادیب کی حیثیت سے میرا سب سے پہلا واسطہ شوکت صاحب ہی سے پڑا۔ اُس دن سے لے کر مرنے کی گھڑی تک اُس واسطے کو نبھانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس عرصے میں ہم متعدد بار روٹھے، متعدد بار خوش ہوئے "مگر آفرین ہے شوکت صاحب پر کہ وہ ابھی روٹھتے تھے اور ابھی مان جاتے تھے۔ اگر یہ خوبی اُن میں نہ ہوتی تو ہم دو برس بھی ایک ساتھ نہ چل سکتے۔

شوکت تھانوی کون تھے۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ میں بھی جانتا ہوں۔ مگر کیا تھے؟ یہ سب نہیں جانتے اور یہی بتانا ہے بھی مشکل، اس مشکل کو حل کرنے کے لیے، میں نے مرحوم کی بیگمات سے مضمون لکھوانے کی کوشش کی۔ مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اگر میں مرحوم کے بارے میں باتیں بھی کرتا تھا تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

باتوں باتوں میں، مختلف اوقات میں، میرے تجسس نے ان کے آنسوؤں کے درمیان جو کچھ دیکھا اور سنا وہ آپ کو بھی دکھائے اور سنائے دیتا ہوں:—

(اس وقت میرے سامنے شوکت صاحب کی بڑی بیگم سیدہ خاتون بیٹھی ہیں۔ میں ان سے ۱۹۴۱ء سے واقف ہوں اُس وقت سے لے کر آج تک میں نے انھیں حد درجہ سنجیدہ، رکھ رکھاؤ والی اور مصلے تسبیح والی خاتون پایا)

بھابی! ——— یہ تو بتائیں آپ کی شادی کس سن میں ہوئی تھی اور اس وقت آپ دونوں کی عمر کیا تھی؟

طفیل بھائی! میرا نکاح ۱۹۲۲ء میں ہوا، تاریخ اور مہینہ ٹھیک سے یاد نہیں اور رخصتی دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ رخصتی کے وقت میری عمر بہت کم تھی۔ شوکت صاحب تقریباً بائیس سال کے تھے اور میری عمر تقریباً سولہ سال ہوگی۔ چھ سال کا فرق تھا۔

طفیل: ——— کیا شوکت صاحب آپ کے رشتہ دار بھی تھے؟ یا یہ بندھن ایسے ہی انسانی برادری کا قصہ تھا۔

جی ہاں! شوکت صاحب میرے رشتے کے چچا ہوتے تھے۔ میرے والد حکیم مولوی سجاد حسین صاحب شوکت صاحب کے قریبی رشتے کے خالہ زاد بھائی تھے۔

بھابی گستاخی معاف! یہ تو بتائیں آپ کی شادی میں کچھ ہاتھ شوکت صاحب کا بھی تھا یا یہ شادی بھی قرعہ فال کے قاعدے کے مطابق ہوئی تھی؟

طفیل بھائی! شوکت صاحب قرعہ فال کے قائل نہیں تھے اور یہ شادی سولہ آنے ان کی اپنی پسند سے ہوئی تھی جس کا ذکر انھوں نے خود اپنی کتاب "مابدولت" میں کیا ہے۔ کہ وہ کس طرح مین پوری میرے گھر آتے، مجھ کو دیکھا پسند کیا اور اپنے ماں باپ سے کہہ کر شادی کا پیغام بھجوایا۔ حالانکہ اس وقت تک میری بڑی بہن کی شادی نہیں ہوئی تھی اور میرے والد صاحب کی خواہش تھی کہ پہلے بڑی لڑکی کا عقد ہو جائے اس کے بعد منجھلی کی نسبت پر غور کیا جائے۔ لیکن شوکت صاحب کی ضد کی وجہ سے والد صاحب کو پہلے میری ہی شادی کرنا پڑی۔ لیکن ابھی صرف نکاح کی رسم ادا ہوئی تھی، والد صاحب قبلہ کی خواہش یہ تھی کہ شوکت صاحب جب انٹرنس پاس کر لیں گے تو اس وقت رخصتی کی رسم ادا کی جائے گی۔ شوکت صاحب کو یہ شرط منظور تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد شوکت صاحب کی بے قرار طبیعت نے ایک بار پھر والد صاحب کو مجبور کر دیا کہ وہ شوکت صاحب کے انٹرنس پاس کرنے کا انتظار نہ کریں اور میری رخصتی کر دی جائے۔

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ شوکت صاحب کو جس بات کی دُھن سوار ہوتی تھی اُس سلسلے میں جلدی کے قائل تھے۔ پھر یہ معاملہ تو شادی کا تھا (جب میں نے یہ فقرہ کہا تو مجھے بڑی شرم آئی مگر میں آنکھیں نیچی کرکے کہہ ہی گیا) اچھا یہ تو بتائیے اس وقت شوکت صاحب کیا تھے؟ اور آپ کی ان کے بارے میں کیا رائے تھی؟

اس وقت وہ صرف محمد عمر تھے شوکت تھانوی انھوں نے بننا شروع کیا تھا۔ شاعری اور مضمون نگاری کی طرف ان کا رجحان ہو چکا تھا۔ نکاح کے بعد رخصتی سے پہلے ان کا پہلا مزاحیہ مضمون جس کا عنوان "میٹھے چاول" تھا۔ ابن سلوزی صاحب کے رسالے "ترچھی نظر" میں شائع ہوا اور کافی مقبول عام ہوا، مجھے بھی بہت پسند آیا۔ میری اس وقت عمر ہی کیا تھی جو میری رائے کی کوئی اہمیت ہوتی مگر جب میں نے ان کا یہ مضمون پڑھا تو نہ معلوم میرے دماغ میں یہ کیوں بیٹھ گیا کہ شوکت صاحب ایک بڑے ادیب ہیں اور میں اپنے آپ ہی ان سے بے انتہا متاثر ہو چکی تھی۔

یہ بتائیں کیا شوکت صاحب آپ سے ڈرتے تھے؟ مابدولت میں بھی اس امر کا سراغ ملتا ہے اور ان کے دوسرے مضامین بھی اسی امر کی چغلی کھاتے ہیں؟

طفیل بھائی! میرے خیال میں مابدولت میں کسی جگہ بھی یہ تاثر پیدا نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے ڈرتے تھے۔ آپ پھر اسے غور سے

بچپن تو آپ کا شاندار ہوا ہوگا اس وقت میں اور مضحکہ خیز کوئی شرارت؟ نہیں تھا بلکہ میں ایک عجیب قسم کی سنجیدہ بچی اس لیے کہ وہ کسی قیمت پر میری طبیعت کو آمادہ نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے اکثر وہ باتیں جو ان کے خیال میں میرے لیے ناپسندیدگی کا سبب بن سکتی تھیں وہ مجھ سے چھپائے جاتے تھے۔ وہ بچا ہونے کے جن مضامین کی طرف اشارہ کیا ہے تو ان کو بھی صرف مضمون نویسی کی حد تک، حقیقی زندگی میں ان واقعات کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف ہنسانا تھا، کبھی مجھے چھیڑ دیا کبھی آپ کو گدگدا دیا اور کبھی خود ہنس دیئے اور لوگ ہنس پڑے —

ان کا ہنسنا ہنسانا تو ان کی زندگی کا معمول ہی تھا۔ مگر میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ شوکت صاحب آپ سے ڈرتے نہ تھے باوجودیکہ ان کے مضامین میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس کرۂ ارض میں نوے فیصد شوہر ایسے ہی تو ہیں جو اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں۔ چلئے اس قصے کو ہم نے یہ کہہ دیتے ہیں تو رہنے دیجئے کہ یہ مگر یہ بتائیے کہ آپ کی ازدواجی زندگی کیسی گزری؟ کیا تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے یا برتن بجنے کا سا انداز رہا؟

ہماری ازدواجی زندگی بڑی پرسکون تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تحاشہ محبت کرتے تھے اور کسی قیمت پر بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ دونوں میں سے کسی کے بھی جذبات مجروح ہوں اور جہاں یہ جذبہ ہو وہاں ناخوشگواری کا سوال ہی کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر میں یہ کہوں کہ ہماری زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی تو یہ بھی مبالغہ آرائی ہوگی۔ برتن جہاں ہوتے ہیں تو کھڑک ہی جاتے ہیں بس اختلاط یہ ہے کہ ٹوٹیں نہیں۔

ہاں صاحب برتن ضرور کھڑکتے ہیں۔ ویسے بھی زندگی میں ذائقہ پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کبھی کبھی برتنوں کو کھڑکا ہی دیا جائے۔ یکسانیت بڑی یکسانیت ہے، خواہ وہ خلوص اور پیار ہی پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس سے آدمی بور ہو جاتا ہے۔ میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں کہ صرف پیار ہی پیار، وہ بھی ایک لمبے عرصے کے لیے، کیا بد مذاقی ہے ——— ویسے میں نے یہ تو محسوس کیا اور دیکھا کہ شوکت صاحب کو اپنے بچوں اور رشتہ داروں سے بڑی محبت تھی۔

شوکت صاحب کو اپنے تینوں لڑکوں سے بے انتہا پیار تھا اور ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بچوں کی ہر خواہش کو پورا کریں اور اسی بات پر میری ان سے جھڑپ بھی ہو جاتی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس طرح بچوں کی ہر ضد پوری کرنے سے بچے خراب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں شوکت صاحب میری ایک نہ سنتے اور بچوں کی ہر جائز و ناجائز ضد کو پورا کرتے رہتے۔ خود ان کے ساتھ بچہ بن کر کھیلتے مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے اپنے تینوں لڑکوں میں سے کسی کو مارا بھی ہو اگر کبھی کسی بات پر ڈانٹ بھی دیا تو خود ہی تھوڑی دیر میں گلے لگا کر چمکار بھی لیا رات کو جب تک کوئی بچہ ان کی بغل میں نہ لیٹے ان کو نیند نہیں آتی تھی وجہ ہے بچے بھی مجھ سے زیادہ ان سے مانوس تھے۔ شوکت صاحب کا اپنے رشتہ داروں سے سلوک بہت مشفقانہ تھا اور وہ اسی وجہ سے تمام رشتہ داروں میں ہر دلعزیز تھے۔

ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے کہ شوکت صاحب ہر دلعزیز تھے دوست احباب کے دلوں میں بھی ان کے لیے ہمیشہ ہی جگہ رہی۔ مگر شوکت صاحب اپنے دوستوں سے ایسے ایسے بھی مذاق کر لیا کرتے تھے جو حد درجہ خطرناک ہوا کرتے۔ گھر میں ان کا کیا عالم تھا؟

جی ہاں! جب ان کا مذاق کا موڈ ہوتا تھا تو وہ گھر میں بھی کسی کو نہیں چھوڑتے تھے چاہے والدہ ہوں چاہے بہن بھائی سے،

بچوں سے اور حد یہ کہ نوکر چاکر سے بھی مذاق کرنے سے نہیں چوکتے تھے اور وہ اس وقت ایک شریر لڑکے کی طرح ہر ایک کو چڑاتے پھرتے تھے ——— میں نماز پڑھ رہی ہوں تو میرے گلے میں ہینڈ بیگ لٹکا دیا۔ اب نہ میں رکوع میں جا سکتی ہوں نہ سجدے میں ایک عجیب مخمصہ میں جان ہے اور وہ ہیں کہ لطف لے رہے ہیں اور ایک ایک کو بلا کر تماشہ دکھا رہے ہیں ... ——— یا کبھی نماز پڑھتے ہوئے مجھے چوکی سے اٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا، کبھی میں سجدے میں ہوئی تو کسی بچے کو میری پیٹھ پر سوار کر دیا اور میں سجدے ہی میں رہ گئی ——— اپنی ماں کے کان میں نہ معلوم کیا بات کہہ دی کہ وہ ان کے پیچھے "خبیث، کمبخت" کہہ کر دوڑیں ——— اسی طرح ایک دفعہ پڑوس میں ایک دھوبی کے گھر کوئی تقریب تھی۔ شوکت صاحب کی بڑی بہن نے ان سے کہا کہ "دھوبی کے گھر کے ماش اور چاول کھانے کو جی چاہ رہا ہے" یہ سننا تھا کہ شوکت صاحب چپکے سے اُٹھے اور دھوبی کے گھر جا کر کہہ دیا کہ "ہماری بہن صاحبہ ماش اور چاول مانگ رہی ہیں" اور یہ کہہ کر غائب ہو گئے ——— تھوڑی دیر بعد دھوبی ماش اور چاول کا تھال لیے دروازے پر تھا۔ اس تحفہ پر ان کی بہن صاحبہ حیران ہوئیں، تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ یہ سب شرارت شوکت صاحب کی ہے۔ اور وہ گھر سے غائب ہیں۔ کبھی نوکر کو بلایا کہ لاؤ تمہارا شیو بنا دوں اور اس کی مونچھیں، بھویں اور پلکیں تک مونڈھ کر رکھ دیں اور وہ بیچارہ سب سے منہ چھپائے پھر رہا ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ کچھ ایسی خطرناک شرارت بھی کر جاتے کہ جس سے سارا گھر پریشان ہو جاتا تھا۔ ۱۹۲۶ء کا ذکر ہے کہ ایک دن پتہ نہیں کیا سوجھی کہ ایک دم اپنے ہاتھ پیر ٹھنڈے کر کے بیٹھ گئے۔ آنکھیں اوپر کو چڑھا لیں دانت بھینچ لیے، پکارو تو بولتے نہیں ہلاؤ تو جنبش نہیں، پانی کے چھینٹے دیے تو بھی کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ سارا گھر پریشان ہو گیا کہ یا اللہ یہ ایک دم سے کیا ہو گیا۔ لڑکے تینوں چھوٹے تھے، وہ حیران و پریشان، گھبرائے ہوئے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے، میں گھر میں بالکل تنہا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بے حد پریشان ہو کر بڑے لڑکے سعید سے کہا کہ "میاں جاؤ جلدی دوڑو سامنے کی کوٹھی میں اطلاع کرو کہ تمہارے ابا کی طبیعت بے حد خراب ہے فوراً کسی ڈاکٹر کو فون کر کے بلا دیں۔" ابھی سعید جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک زوردار قہقہہ لگا کر اُٹھ بیٹھے۔ اب ہم لوگ ہیں کہ ان کا منہ تک رہے ہیں اور وہ ہیں کہ ہنسے جا رہے ہیں، یہ ان کی اتنی خطرناک شرارت تھی کہ اگر تھوڑی دیر اور یہ قائم رہتی تو میں اپنے حواس کھو بیٹھتی۔

جی ہاں، خود تفریح کا موڈ ہوتا تو دوسروں کی پریشانیوں کا مطلق خیال نہیں رکھتے تھے۔ میرے سامنے بھی ایسے بہت سے واقعات ہیں مگر میں آپ سے وہ کیا کہوں۔ جبکہ آپ کی معلومات مجھ سے کچھ زیادہ ہی ہوں گی۔ یہ تو خیر شوکت صاحب کا سلوک اپنے دوستوں اور اپنے ملنے والوں کے ساتھ تھا۔ خود آپ کی شوکت صاحب کے دوستوں کے بارے میں کیا رائے تھی • یہ میں نے اس لیے پوچھا ہے کہ بعض تو اُن میں سے ایسے تھے جو ہر وقت کے "رمتے" (رمی کھیلنے والے) تھے۔ بعض ایسے تھے کہ صرف ہا ہا ہُو ہُو اور سبحان اللہ، جزاک اللہ کرنے والے تھے۔

طفیل بھائی! شوکت صاحب کے دوستوں کی فہرست بہت لمبی چوڑی ہے اور میں ان ہی لوگوں کو جانتی ہوں جن کا کہ میرے گھر آنا جانا تھا لیکن سچ پوچھئے اور کسی کو بُرا نہ لگے تو ان دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آیا جو کہ دوستی کے معیار پر پورا اُترے وہ سب شوکت صاحب کی تفریحات کے ساتھی تھے جیسا کہ ابھی آپ نے کہا کہ بعض تو ان میں سے ایسے تھے

جو بہو لکھتے گئے "دیپ" تھے۔ بعض صرف شاعر ہونے کے ساتھی تھے اور بعض محض پڑوسی یا خوش لکھنے کے لیے ملتے تھے
پھر جیسا بیمار ہوں کے متعلق کیا رائے ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی چند ایک شخصیتیں ایسی ضرور ہیں کہ جن کو شوکت صاحب کا بڑا خلوص
دوست کہا جا سکتا ہے کم سے کم میں تو ایسا ہی سمجھتی ہوں اب پتہ نہیں شوکت صاحب کی خود کیا رائے تھی۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ ہر قوم کے ادیب بڑے گہری قسم کے دوست ہوتے ہیں جیسی کہ "دوستی" کی اور جانثار دیئے ہوئے ہیں، یہ
شعر جو شوکت صاحب کے ساتھی نہ تھی سادی دنیا کو اسی ماحول میں اپنی زندگی گزارنی پڑتی ہے جیسیاں پر ایک سوال ذہن میں
سوال ذہن میں آیا ہے۔ اگر آپ اس پر روشنی ڈال سکیں تو بڑا اچھا ہو۔ وہ سوال یہ ہے کہ مرحوم کو ایسی لکھنے کا بڑا ہو کا عادی رہا ہے
نے کہ غلط سلط جھوٹی سچی باتیں لکھ کے ہی، اپنی فوقیت اپنے ہم چشموں پر جتاتے رہیں۔

خلیل بھائی! آپ مجھ سے یہ سوال نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے جواب سے آپ کو مطمئن نہ کر سکوں
بات یہ ہے کہ مجھے تو آپ کے اس سوال کی بنیاد ہی پر اعتراض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شوکت صاحب کو ہر لحاظ سے اس قدر
نوازا تھا کہ اب انھیں کسی کو گرانے کی بھلا کیا ضرورت تھی بہرحال پھر بھی ہو سکتا ہے انھوں نے اپنی باہر کی مضمون میں تفریحاً کچھ
ایسی باتیں لکھی ہوں کہ جن سے آپ نے یہ اندازہ لگایا۔ لیکن میں ان باتوں سے قطعی اجنبی ہوں۔

ہاں صاحب! بیویوں کے اتنے حوصلے کہاں کہ وہ کسی سے اپنے شوہر کی برائی سن سکیں۔ ویسے چاہے خود ہزار برائیاں نکالتی رہیں
مگر وہ کسی دوسرے کی بات نہیں سن سکتیں۔ آپ شوکت صاحب کی اتنی تعریفیں کر رہی ہیں۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ مگر خود شوکت صاحب کا
ایک خط ایسا چھپا ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ میرا ایک عورت سے غیر شرعی تعلق بھی رہا ہے۔ آخر وہ عورت کون تھی!

جی ہاں! وہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ایک ڈرامہ آرٹسٹ تھی وہیں شوکت صاحب کی اس سے ملاقات ہوئی اور مراسم پیدا ہو گئے
مجھے جس وقت اطلاع ہوئی تو شوکت صاحب اپنی اس لغزش پر بیحد پشیمان تھے اور اس سے بے تعلقی کا عہد کر چکے تھے۔ میرے خیال
میں اس بات کو یہیں پر ختم کر دیجئے گندی باتوں کو کریدنے میں کچھ مزا نہیں آتا۔

واقعی بری باتوں کو کریدنا ہے تو برا، مگر بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان پر سرے سے غور ہی نہ کیا جائے تو اس کے نتائج چپ رہنے
سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ مجھے اس نمبر کی ترتیب کے سلسلے میں یہ دقت پیش آئی ہے کہ بیشتر مضمون نگاروں نے اس بات کا ذکر کیا
چونکہ ذکر مناسب الفاظ میں نہ تھا۔ اس لیے میں نے ان باتوں کو حذف کر دیا۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ اس بات کا کچھ تو سرا ملے۔ اچھا بھائی
یہ ذکر چونکہ تکلیف دہ ہے اس لیے ہم کیوں نہ مرحوم کی خوبیوں کا ذکر جی بھر کے کریں۔

آپ نے ایک مختصر سا سوال کیا لیکن میرے جواب کے لیے ایک مضمون پیدا کر دیا ہے۔ شوہر جیسا کچھ بھی ہو لیکن ہر بیوی کو اپنا
شوہر خوبیوں کا ایک مجسمہ ہی نظر آتا ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے کس کس پہلو کی خوبیاں اجاگر کروں کچھ خوبیاں تو ان
کی ایسی ہیں کہ جن پر آپ بھی اتفاق کریں گے مثلاً ان کی نفاست پسندی ہر پہلو میں نمایاں تھی، لباس بھی نفاست سے پہنتے
اور اس پر بلا کے جامہ زیب تھے کیا مجال جو کسی کپڑے پر کوئی داغ، دھبہ یا شکن پڑ جائے۔ کھانے کے سلسلے میں یہی حال
تھا، اچھا کھانے کے شوقین تھے اور اس سے بڑھ کر کھانے کا سلیقہ تھا اسی طرح ان کی تحریر میں بھی آپ یہی دیکھیں گے۔
الفاظ کے مناسب چناؤ کے ساتھ ساتھ خط نہایت نفیس تھا اور ان کی تحریر میں آپ کہیں کاٹ چھانٹ نہیں دیکھیں گے۔

خود اعتمادی کا یہ حال تھا کہ ایک بار لکھ کر اپنی تحریر کو کبھی دوبارہ نہیں پڑھا جیسے کہ ان کو یقین ہوتا تھا کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ کبھی غلط نہیں ہو سکتا — وہ دھن کے پکے تھے اور یہ ان کی مستقل مزاجی ہی تھی جس کی بدولت وہ آخر کار شاعر بنے "مابدولت" میں ایک جگہ انھوں نے خود ذکر کیا ہے کہ میں نے جو پہلی غزل اپنے نام سے سب کو سنائی وہ چرائی ہوئی تھی۔ جب اس بات کا بھانڈا پھوٹا تو اس خفت کو مٹانے کی خاطر خود کچھ کہنے کی کوشش کی، کئی بار ناکامی ہوئی لیکن بہت جلد شاعری اور ادب پر ان کا شمار چوٹی کے شاعروں میں ہونے لگا، پھر جب مزاح نگاری کی طرف رخ کیا تو بڑے بڑے مزاح نگار ان کا لوہا مان گئے ریڈیو میں ملازم ہوئے تو "قاضی جی" جیسا ایک زندہ و جاوید کردار ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے، جب صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو ایک نیا رنگ پیدا کیا — خودداری کا یہ عالم تھا کہ اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے نہ چوکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۲ء میں جب شوکت صاحب پنچولی آرٹ پکچرس میں ملازم تھے تو ایک زیر تکمیل فلم کی کہانی میں پنچولی آرٹ کے جنرل منیجر دیوان سرداری لال نے شوکت صاحب کی غیر موجودگی میں ان کی لکھی ہوئی کہانی میں کچھ رد و بدل کر دیا۔ کسی کے مشورے پر اپنے قلم سے تو وہ رد و بدل کر سکتے تھے لیکن بھلا یہ کیونکر برداشت کرتے کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی اور ان کی تحریر میں رد و بدل کر دے۔ نتیجہ یہ کہ فوراً استعفا دے دیا اور کہانی ساتھ لے کر گھر پہنچ گئے۔ اس وقت مالی طور سے حالات بہتر نہیں تھے لیکن وہ اپنی خودداری کو کسی قیمت پر بھی بیچ نہیں سکتے تھے — آخر کار دیوان سرداری لال نے ان سے معافی مانگی تب کہیں جا کر انھوں نے اپنا استعفا واپس لیا۔ مہمان نوازی کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی دشمن بھی کبھی مہمان بن کر آ جائے تو وہ اس کے آگے بچھے جاتے اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے یہ تو دشمن کے ساتھ سلوک تھا اور اگر کبھی خوبیِ قسمت سے کوئی دوست مہمان بن کر آ جائے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں کوئی خزانہ مل گیا ہو، مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے۔ مالی حالت جیسی بھی ہو لیکن خاطر مدارت میں کمی نہ ہونے پاتی چاہے اس کی خاطر جو کچھ بھی کرنا پڑے۔ مجھے یاد ہے جب شوکت صاحب لکھنؤ میں اسمال سیونگ آرگنائزر کی حیثیت سے تعینات تھے تو ان کے ایک دوست کا آل انڈیا ریڈیو دہلی سے لکھنؤ تبادلہ ہو گیا۔ شوکت صاحب تو اس تلاش ہی میں رہتے تھے کہ کوئی دوست آئے اور وہ اس کی مہمان نوازی کریں بس اب کیا تھا ان کو پا کر اپنی حسرتیں پوری کرنا شروع کر دیں۔ خیال یہ تھا کہ جب تک انھیں کوئی مکان نہیں ملتا وہ ہمارے ہی گھر رہیں گے۔ لیکن شوکت صاحب کی پُرخلوص شخصیت نے ان کو اپنے جال میں ایسا جکڑا کہ پھر وہ اپنے لیے مکان نہ ڈھونڈ سکے اور جب تک وہ محکمہ قائم رہا اور ہم لوگ اس سرکاری کوٹھی میں رہے وہ ہمارے ہی ساتھ رہے اور اس طرح جیسے کہ وہ مہمان نہ ہوں بلکہ ہم لوگ ان کے مہمان ہوں اور مزے کی بات یہ کہ جب وہ محکمہ ٹوٹا اور وہ سرکاری کوٹھی خالی کرنا پڑی تو شوکت صاحب کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ ہم لوگوں کے لیے دوسرے مکان کا کیا بندوبست ہوگا فکر تھی تو یہ کہ ان کے ان دوست کے رہنے کا اب کہاں انتظام ہوگا۔ حاضر جوابی کا یہ حال تھا کہ جس محفل میں پہنچ گئے سب کو لاجواب کر دیا۔ ایک دفعہ میرے چھوٹے لڑکے رشید کے حلق میں کچھ تکلیف تھی ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ غدود بڑھ گئے ہیں اس لیے آپریشن کرا دینا چاہیے۔ شوکت صاحب آپریشن سے بہت گھبراتے تھے سوچا کہ لاؤ یونانی علاج کرا کے دیکھیں لہٰذا رشید کو لے کر حکیم نیر واسطی صاحب کے پاس مشورہ کرنے کے لیے گئے۔ حکیم صاحب نے بہت ہی توجہ سے رشید کو دیکھا اور ایک ایلوپیتھک نسخہ تجویز کر دیا جس میں آپریشن کا ہونا

وہ دیتا تھا۔ حکیم صاحب بہ حیثیت حکیم بہت قابل تھے وہ ذرا بھی نہیں۔ شوکت صاحب کو غالباً اس وقت اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ نسخہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ حکیم صاحب نے مسکرا کر کہا "شوکت صاحب آپ حیران نہ ہوں یہ نسخہ میں نے بہت سوچ کر تجویز کیا ہے۔ شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ میں آدھا تیتر آدھا بٹیر ہوں" شوکت صاحب نے بڑی صاحبت سے جو جواب دیا اس پر قہقہہ پڑا جیسے بم پھٹا کرتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ حکیم صاحب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ وہیں وقت نسخہ پھاڑ کے پانی میں گھول کر پی گیا۔ شوکت صاحب سو خوبیوں کی ایک خوبی ان کی یہ عادت تھی کہ اپنی خامیوں کا اس طرح بے تکلفی سے ذکر کرتے چلے گئے ہیں گویا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اپنی خامیوں کا اس طرح اعتراف کر لینا کردار کی بہت بڑی خوبی ہے۔

جانی مرا آ گیا۔ آپ نے اس ضمن میں بڑی تفصیل باتیں کیں۔ کیا آپ ان معاملات کے ساتھ ان کی کچھ کوتاہیوں کے بارے میں بھی کچھ بتائیں گی یا صرف ان کی تعریف ہی کرتی چلی جائیں گی؟

جی ہاں! ہر انسان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں اور بھلا کون سا انسان ایسا ہے جو برائیوں سے پاک ہو۔ یہ قدرت کا کچھ اصول ہی ایسا ہے کہ ہر بڑے سے بڑے انسان میں کوئی نہ کوئی خرابی ہوتی ہے اور ہر چھوٹے سے چھوٹے انسان میں کوئی نہ کوئی برائی ضرور پائی جاتی ہے اور جب کہ شوکت صاحب اپنی برائیاں خود اپنے قلم سے "بقلم خود" میں بیان کرنے سے نہیں چوکے تو مجھے کیا تکلف ہو سکتا ہے۔ شوکت صاحب کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ جہاں وہ ہر ایک سے ہر طرح کا مذاق کر لیتے تھے وہاں وہ اپنے لیے کسی اور کا مذاق برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ شوکت صاحب اس قدر [illegible] واقع ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی جذباتی کیفیت بھی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، ذرا سی بات ناگوار گزری اور تمام گھر کو سر پر اٹھا لیا اور اس غصہ میں وہ اکثر اپنا بڑے سے بڑا نقصان بھی کر لیا کرتے تھے۔ ماں باپ کے اکلوتے تھے اور بڑے ناز و نعم سے پرورش پائی تھی اور چونکہ وہ بچپن میں اکثر بیمار رہتے تھے اس لیے ان کی ہر جائز و ناجائز ضد پوری کی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ہر ضد منوانا ان کی عادت بن گئی اور بچپن کی خوشامد پسندی کے جیسے کہ وہ عادی سے ہو کر رہ گئے تھے اور بڑے ہو کر بھی ان کی طبیعت میں شامل رہی اور جہاں ان کو یہ چیز نہیں ملتی تھی تو یہ ان کی طبیعت پر ناگوار گزرتا تھا۔ ان کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ جو کام بھی وہ کریں اس کو سب سراہیں اور کسی قسم کا اعتراض نہ کریں۔ اسی طرح ایک دفعہ وہ ایک بہت ہی خوبصورت چائے کا سٹ خرید کر لائے جو مجھے اور میری مرحومہ بہن راحت کو بہت پسند آیا۔ ہم دونوں کی تعریف سے بہت خوش ہوئے لیکن جب انھوں نے اس کی قیمت بتائی تو میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ جتنا اچھا سیٹ ہے اتنی ہی اچھی قیمت بھی تو ہے؟ یہ سننا تھا کہ ہنستا ہوا چہرہ ایک دم سے آگ برسانے لگا اور اس سیٹ کو فٹ بال کی طرح اوپر اچھال دیا اور وہ چکنا چور ہو گیا اس حسین سیٹ کے ٹوٹنے کا مجھے اب بھی افسوس ہے۔

ہاں صاحب، ان کے غصے سے تو مجھے بھی ڈر لگتا تھا۔ مگر میں نے ان کا ایک علاج ڈھونڈھ رکھا تھا کہ جب مرحوم غصے میں ہوتے تھے تو میں ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خود ہی شور و غل کر کے چپ ہو جایا کرتے تھے۔ دوبارہ ملتے تھے تو پچھلی رنجش کا ذکر تک نہ کرتے تھے۔ انہی باتوں سے تو میرا خیال بھی ہے کہ مرحوم بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کا ان کا بڑا لمبا ساتھ رہا۔ آپ دو چار باتیں اس نوع کی بھی سنا دیں۔

فضیلی بھابی: شوکت صاحب کی تمام زندگی دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے اس سے پہلے بھی میں نے جو باتیں بیان کیں۔ ان میں بھی بعض شوکت صاحب کے دلچسپ واقعات ہیں بہرحال پھر بھی اس سوال کے ضمن میں ایک واقعہ اور سن لیجئے یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب شوکت صاحب آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ملازم ہوئے تھے ہم لوگوں کا گھر سرفراز اخبار کے دفتر کے بالکل سامنے تھا وہیں سرفراز اخبار کے دفتر میں ایک ہندو رہتا تھا، نام ٹھیک سے مجھے یاد نہیں۔ پتہ نہیں انھیں کیا سوجھی کہ اس بیچارے کو پہلے تو اس خوش فہمی میں مبتلا کیا کہ تم بہت خوبصورت ہو، بہت حسین ہو، لڑکیاں تم پر جان دیتی ہیں اور پھر اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ میرے گھر پر ایک شمیم نامی لڑکی ہے جو میری بیوی کی سہیلی ہے اور تمھاری ایک جھلک دیکھ کر تم پر سو جان سے فدا ہو چکی ہے اور یہاں سے اب شوکت صاحب کا ڈرامہ شروع ہوا کبھی فرضی لڑکی کے نام سے پرچے لکھے جا رہے ہیں، کبھی اندھیرے میں برآمدے میں پڑی ہوئی چق کے نیچے سے دوپٹہ نکال کر باہر لٹکایا جا رہا ہے جب اس بیچارے کو اچھی طرح مجنوں بنا لیا تو یہ بھانڈا پھوٹا کہ یہ فرضی لڑکی شمیم اور یہ اس کے خطوط یہ سب شوکت صاحب ہی کی کارستانی ہے۔ اس واقعہ سے وہ بیچارا اس قدر شرمندہ ہوا کہ منہ چھپا کر ایسا بھاگا کہ پھر نظر نہیں آیا اور یہی واقعہ پھر شوکت صاحب کی کتاب "خانم خان" کا پلاٹ بن گیا۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ بھابی اپنے خیالوں میں دُور نکل گئیں۔ اس کے بعد میں نے بڑی کوشش کی کہ یہ مجھ سے کچھ باتیں اور کریں مگر میں اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوا۔ ایک چُپ سی لگ گئی۔

"بھابی! ـــ میں آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"میں اس وقت آپ کی کسی بات کا جواب نہ دے سکوں گی۔"

بھابی سعیدہ بھی میرے سامنے ایسے ہی خاموش ہو گئیں، جیسے شوکت تھانوی، بس فرق اتنا تھا کہ ایک میرے سامنے بیٹھی تھیں اور دوسرے کو اپنے کندھوں پہ اٹھا کر دفن کر آیا تھا۔

---

(۲)

ابھی بھابی زہرا کی شادی نہیں ہوئی کہ دو خواتین ہمارے دفتر تشریف لائیں اور انھوں نے شوکت تھانوی کی خود نوشت سوانح "ما بدولت" طلب کی۔

اتفاق کی بات کہ اُس وقت شوکت صاحب کے منجھلے صاحبزادے خورشید عمر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا "ما بدولت پڑھ کر کیا کیجے گا؟"

دلچسپ شوق کیا ہوتے ہیں؟

بس صاحب یہ لوگ دیکھ نہیں سکتے۔ بچے قرآن ہی سن سکتے ہیں:

چھوٹی سی تری مصلا — خوشیاں ہی باتیں کرتی جاتی ہیں:

بعد میں معلوم ہوا کہ شوق خوشی میں بیک رہا تھیں۔ جو بعد میں زہرا شوکت ہوئیں۔ میں نے ان کی تصدیق آرٹ گیلری کی صورت ہوا کیا تو بیگم ان کو ہر کے لی دن پہلے بعد شوکت صاحب نے بڑے پوچھا تھا۔ آپ نے ان کو بہت کیا خوب سی کیا باتیں ہوئی تھیں؟

شوکت صاحب مجھ سے ہونے تھے اس لیے میں نے بات ہنسی مذاق میں ٹال دی۔

جب پہلی بار میری زہرا شوکت سے ملاقات ہوئی تو یہ بڑی پیاری تھیں، خوبصورت سی، سفید سنگ مرمر سا چہرہ، بڑی سب جسم ۔۔۔ مگر اب حالات ویسی نہیں رہیں۔ شوکت صاحب کی زندگی میں بھی ویسی نہ رہیں۔ پہلے "پنجاب دی کڑی" لگتی تھیں۔ اب یو۔پی کے کسی گھرانے کی خاتون لگتی ہیں۔ بدل گئی، ہلکا سا نوہ رنگ، پان سے رنگے دانت ۔۔۔ شوہر نے بھی پہلے آپ کو خوب ڈھالا۔ شوکت صاحب جانی نہ پہچانی مگر یہ لکھنوی بن گئیں۔

شوکت صاحب کے انتقال نے انہیں بجھا دیا ہے۔ وہ ادیب ہے۔ اب یہ مستقبل کے اندھیروں میں اکیلی نہیں۔ تین معصوم بچیوں کا ساتھ بھی ہے۔

زندگی کی ایسی اندھیری رات میں جب کہ بظاہر، زندگی کا آدھا سفر بھی طے ہوا ہو۔ کیا کیا نہ وسوسے ان گھیرتے ہوں گے۔ مگر ان کی زندگی کا سہارا یہی بچیاں تو ہیں۔ جو اڑتی پھرتی، دل کی تسکین کا بہانہ ہیں۔ دل کی جراحتوں کا مداوا ہیں۔ بچوں کی یتیمی کا احساس انہیں خون کے آنسو رلاتا ہوگا۔ مگر بچیوں کے خوشگوار مستقبل کے خواب میں جگنو کی روشنی ہی ڈھارس بندھاتی ہوگی۔

شوہر کے بعد بیوی کی زندگی امید و بیم کے جن وسوسوں سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی تفسیر زہرا شوکت ہیں۔ حال تکلیف دہ، مستقبل مشکوک!

جس نے زندگی بھر ہنسایا ہو، اس کا تذکرہ منہ بسور کے کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہو رہا۔ مگر کیا کریں۔ کس طرح ہنس کے ٹکڑے کر ٹال دیں؟

کوشش کرتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے، ذہن کو جھٹک کر زہرا شوکت سے باتیں کروں۔ بے شک آپ بھی سُن لیں پڑھ لیجیے۔

بھابی! شوکت صاحب بڑے کٹر قسم کے یو۔پی والے تھے۔ پھر انہوں نے آپ سے شادی کیوں کی، جبکہ آپ کا تعلق ایک پنجابی گھرانے سے ہے؟

خلیل صاحب! میں نے شادی کے بعد شوکت صاحب کو کٹر قسم کا یو۔پی والا نہیں پایا۔ دوسرے آج کل تو ایسی بہت سی شادیاں ہو رہی ہیں۔ پنجابی گھرانوں میں یو۔پی کی بہو بیٹیاں آ رہی ہیں اور پنجاب کی بہو بیٹیاں یو۔پی والوں کے ہاں بیاہی جا رہی ہیں۔ پہلے میری غلط فہمی دور ہوئی تھی اب ہمیں علاقائی بنیادوں پر سوچنا نہیں چاہیے۔ اب ہم سب پاکستانی ہیں۔ سب ایک ہیں ۔۔۔ شادی کے وقت آپ کی اور شوکت صاحب کی عمر کیا تھی؟

"جو صرف شریف گھرانوں کی میاں اور بیویوں کی ہوا کرتی ہیں۔"

بھابی! آپ نے تو بڑے خوبصورت انداز میں ٹال دیا۔ عمر بتا دینے میں حرج تو کچھ نہ تھا۔ آپ بے شک اپنی عمر وہ چار سال کم بتا دیں مگر کچھ بتائیں تو!

"میں اُن عورتوں میں نہیں ہوں، جو اپنے آپ کو لڑکپن کے فریب میں مبتلا رکھنے کے خواب دیکھتی ہوں۔"

چلیے آپ ہی منطق کی روشنی میں عمر والی بات گول ہو گئی۔ میں خود ہی اندازہ کروں گا کہ شادی کے وقت آپ کی عمر اکیس بائیس سال ہوگی اور شوکت صاحب کی عمر اکتالیس بیالیس سال ہوگی (حالانکہ حساب کے مطابق اس وقت شوکت صاحب کی عمر ۴۴ سال تھی) — اگر عمر کی طرح یہ معاملہ بھی راز کا نہ ہو تو اتنا ہی بتا دیجیے کہ شادی کے وقت، جو شرائط طے ہوئی تھیں۔ وہ کیا تھیں؟

"طفیل صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آج جو آپ کھرچ کھرچ کے مجھ سے باتیں پوچھ رہے ہیں تو وہ ضرور چھاپنے کے لیے پوچھ رہے ہیں۔"

بھابی! ویسے تو میں یہ باتیں اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ اگر چھپ جائیں تو حرج بھی کیا ہے۔ پھر یہ کہ شوکت صاحب کے بارے میں جتنا کچھ آپ جانتی ہیں اتنا ہر ایک تو نہیں جانتا۔ لہٰذا جو میں پوچھوں، وہ بتاتی چلی جائیں۔ اس لیے کہ ادیب قوم کی امانت ہوتے ہیں، ان کی باتیں قوم کی امانت ہوتی ہیں۔ انھیں عام لوگوں کی طرح خاندان کی ملکیت نہیں سمجھنا چاہیے۔

"یہ بات تو ٹھیک ہے۔ اسی خیال سے اپنی ذاتی گھر راز میں رکھنے والی بات بتائے دیتی ہوں۔ شادی کے وقت شوکت صاحب نے بطور شرائط ہمیں جو کچھ لکھ کے دیا تھا۔ وہ یہ ہے:-

(۱) میرا نام محمد عمر ہے۔ لوگ مجھے شوکت تھانوی کے نام سے جانتے ہیں۔

(۲) میرے والد مرحوم کا نام صدیق احمد صاحب تھا، جو یو۔پی پولیس میں انسپکٹر اور بھوپال میں انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔

(۳) میں شیخ فاروقی ہوں۔ حنفی ہوں۔ میری عمر ۴۵ سال ہے۔

(۴) تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کا رہنے والا ہوں۔

(۵) میری تعلیم انٹرمیڈیٹ تک ہوئی اور بعد میں انٹرمیڈیٹ کا ممتحن بھی رہ چکا ہوں۔

(۶) میری تنخواہ اس وقت ساڑھے چار سو روپے ماہوار ہے۔

(۷) میرا خاص مشغلہ کتابوں کی تصنیف ہے۔ جس سے اوسطاً دو سو روپیہ ماہوار آمدنی ہے۔ اس وقت تک پینتالیس کتابوں کا مصنف ہو چکا ہوں۔

(۸) میں اب تک چھ روزانہ اخباروں کا اور چار ماہناموں کا ایڈیٹر رہ چکا ہوں۔

(۹) . . . .

(۱۰) مجھے اس عقد کے سلسلے میں تمام شرائط منظور ہوں گی اور میں مہر وغیرہ کے لیے ہر قسم کی لکھا پڑھی کے لیے تیار ہوں۔

(۱۱) رہائش کا انتظام الگ کروں گا۔ میری زوجہ ثانیہ کو پہلی بیوی سے کوئی تعلق کسی قسم کا نہ ہوگا۔

سوال: ان باتوں سے بہت سی نئی باتوں کا علم ہوا۔ اس کے [illegible] ہر [illegible] خاص طور [illegible] سب [illegible]
یہ سب [illegible] آپ [illegible] ہیں [illegible] کی [illegible] ہے۔ کیا [illegible]
مقصود نہیں؟

جب شوکت صاحب نے اپنی [illegible] میں ایک بہت ہی [illegible] تو ذکر اس کا بھی ہوا ہے۔ جس بات سے [illegible]
کا اظہار ہے آپ بیان [illegible] نہیں گے۔

سوال: امید ہے آپ [illegible] کا الزام اپنے سر نہ لیں گی۔ میں تو [illegible] کا باعث [illegible] یہی وجہ ہے کہ
میں نے شوکت صاحب کی [illegible] اور [illegible] کے [illegible] بات پوچھی ہے؟

"بڑی احتیاط سے [illegible] ہیں [illegible] کے باوجود خدا آپ کا انجام بخیر کرے!"

سوال: انجام بخیر ہی ہوگا انشاء اللہ! لہٰذا ہمیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں اتنا وقت خرچ نہیں کرنا چاہئے۔ جیسے آپ یہ بتائیں کہ
لکھنے میں شوکت صاحب کی کیا مدد کرتی تھیں، اور وہ لکھتے وقت کس قسم کا ماحول چاہتے تھے؟

"شوکت صاحب سیدھے سادے اور سکون پسند انسان تھے۔ لیکن لکھنے میں [illegible] پُرسکون اور خاموش ماحول چاہتے تھے۔ بڑے خوبصورت انداز پر بہترین لکھتے تھے۔ [illegible] لکھا کرتے تھے۔ اگر کوئی ان کی تحریر دیکھے تو وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ پوری دلچسپی اور اطمینان کے ساتھ لکھا کرتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ بچے شور مچا رہے ہیں اور وہ لکھ رہے ہیں۔ غرض وہ ہر قسم کے حالات میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے لکھنے پر قادر رہتے۔"

شوکت صاحب آپ کو ہر محفل میں لے جاتے تھے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ آپ کا اصرار ہوتا تھا، یا اُن کی خواہش ہوتی تھی؟

"شوکت صاحب مجھے ہر محفل میں نہیں لے جاتے تھے۔ صرف وہیں لے جاتے تھے جہاں میرا جانا مناسب ہوتا تھا۔ ایک بار ایک کاک ٹیل پارٹی میں غلطی سے چلی گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر میری طبیعت خراب ہو گئی۔ اس کے بعد سے ایسی معزز دعوتوں میں کبھی شریک نہیں ہوئی۔ چونکہ شوکت صاحب کو بھی شراب سے نفرت تھی۔ اس لیے وہ بھی ایسی دعوتوں سے بچا کرتے تھے۔ بہرحال میرا دعوتوں میں شریک ہونا نہ میرے اصرار پر منحصر تھا نہ شوکت صاحب کی خواہش پر بلکہ یہ منحصر تھا دعوت کی نوعیت پر یا صاحبِ خانہ سے مراسم پر۔"

"شوکت صاحب کے مذہبی خیالات کیا تھے۔ میرا خیال ہے، انھوں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ نہ روزے رکھے۔ مگر اب شوکت صاحب کے دوست کہہ رہے ہیں کہ وہ بڑے مذہبی آدمی تھے؟"

"شوکت صاحب نے نمازیں بھی پڑھیں۔ روزے بھی رکھے۔ وہ واقعی ذہناً مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ گو روزے نماز کے معاملے میں پابندی تو نہ کرتے تھے مگر اللہ اور رسول کا نام لیتے ہوئے آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے ۔۔۔ بقول سید محمد جعفری کے ۔۔۔ "شوکت صاحب کہا کرتے تھے کہ جب میں اپنے خالق کے حضور میں نماز کے بعد دعا مانگتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حرم کعبہ میں کھڑا ہوں۔ کعبہ کا پردہ اٹھتا ہے اور اس نے میرے سر پر سایہ کیا ہے اور اس سے مجھے سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے" ۔۔۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ اور بھی ہے کہ جب راولپنڈی میں غلافِ کعبہ کی زیارت کرائی گئی تو اُن دنوں شوکت صاحب بڑے بیمار تھے۔ اور وہ اپنی بیماری کی وجہ سے خود سے جا کر غلافِ کعبہ کی زیارت نہیں کر سکتے تھے

اس پر معترض ہوئے تھے۔ میر خلیل الرحمٰن صاحب کو جب شوکت صاحب کی اس آمد کا علم ہوا تو انھوں نے شوکت صاحب سے کہا، جب غلافِ کعبہ کی زیارت ہو چکے گی تو میں رات کو جا کر غلافِ کعبہ یہاں سے لے آؤں گا! ـــ جب یوں ہوا اور میر صاحب غلافِ کعبہ گھر پہ لے آئے تو انھوں نے متعدد بار آنکھوں سے لگایا اور چوما اور اس کا اظہار کیا کہ میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔"

"جہاں مجھے یہ باتیں سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ مگر میرا خیال ایسا نہ تھا اور یہ تغیر بھی ان کی آخری عمر میں آیا۔ اس لیے کہ انھوں نے جب تک جوانی کی حدود کو بڑھاپے کی حدود سے جدا نہ کیا۔ انھوں نے اپنی شوخیوں کو خیرباد نہ کہا۔ شوخیاں مذہب کے معاملے میں بھی روا رکھتے تھے اور زندگی کے باقی معاملات میں بھی۔ میری اس بات کی تائید شوکت صاحب کی پہلی بیگم کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ نماز پڑھا کرتی تھیں تو کبھی شوکت صاحب ان کے گلے میں ہینڈ بیگ لٹکا دیا کرتے تھے اور کبھی انھیں چوکی سمیت اٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا کرتے تھے۔ بہرحال مجھے ان کے موجودہ خیالات سے بےحد خوشی ہوئی۔ جس کا علم مجھے اس سے پہلے نہ تھا۔ چلیے یہ تو بات ہو گئی ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں، اس اچھی بات کے ساتھ ان کی طبیعت میں بےحد غصہ بھی تھا۔ آپ کے خیال میں کیا وہ بلاوجہ غصے ہو جایا کرتے تھے یا با وجہ غصے ہوتے تھے؟"

"یہ وقتی جوش اور عارضی جذبہ ہوا کرتا تھا۔ وہ ایکدم بھڑک کر ایکدم نرم ہو جایا کرتے تھے اور یہ سب کچھ دنیاوی تفکرات اور دنیاوی الجھنوں کی بنا پر ہوا کرتا تھا۔ انسان آخر انسان ہے۔ وہ اچھی باتوں سے خوش ہوتا اور بری باتوں سے کبیدہ خاطر رہتا ہے وہ بھی اس سے متاثر تھے۔ چونکہ بےحد حساس تھے۔ اس لیے برہم بھی ہو جایا کرتے تھے اور جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو جایا کرتا تھا تو بےحد نادم ہوا کرتے تھے۔ پھر وہ بلا تفریقِ مرتبہ اور عمر کے معافی بھی مانگ لیا کرتے تھے۔"

"شوکت صاحب سچ یا جھوٹ بولا کرتے تھے۔ ایسا وہ کیوں کرتے تھے؟"

"آپ کا یہ سوال بڑا چھوٹا سا ہے۔ مگر اس کے جواب کے لیے مجھے سوچنا پڑ گیا ہے۔ اگر آپ کی مراد دروغ مصلحت آمیز سے ہے تو اس کی مرتکب ساری دنیا ہے۔ آپ بھی ہوں گے۔ اس میں اکیلے شوکت صاحب کا کیا قصور ہوا۔ وہ یقیناً ایسی باتوں کے سلسلے میں جھوٹ بولتے تھے۔ جن باتوں کے سچ کہنے سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہو۔ وہ کسی کے خوف یا اپنے لالچ کے لیے جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے۔ بعض اوقات محض تفریحاً بھی جھوٹ بول دیا کرتے تھے۔ تاکہ ذرا لطف رہے ـــ ایک واقعہ بتاتی ہوں ـــ رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ ایک دفعہ شدید زلزلہ آیا تھا۔ حد درجہ گھڑگھڑاہٹ کی وجہ سے بڑا ہیبت ناک سا لگتا تھا۔ شوکت صاحب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ مجھے گھبرائے ہوئے انداز میں آواز دی اور پوچھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا زلزلہ ہے۔ کہنے لگے تو پھر اچھا لا الٰہ الا اللہ۔ ـــ زلزلہ آیا تھا۔ چلا گیا۔ مگر شوکت صاحب کی گھنٹوں سانس پھولی رہی۔ حد درجہ پریشان رہے۔ ممکن ہے یہ سوچتے ہوں کہ پھر زلزلہ نہ آ جائے ـــ اتفاق کی بات کہ ان دنوں میرے دانت میں تکلیف تھی۔ دوسرے دن میں شوکت صاحب کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں گئی۔ وہاں زلزلے والی بوکھلاہٹ کا قصہ میرے نام سے منسوب کر کے ڈاکٹر صاحب کو سنا دیا۔ میں دانت کے درد کی وجہ سے منہ و باندھے بیٹھی تھی۔ بولنے سے مجبور تھی۔ مگر وہ جھوٹ بول کر بھی لطف لے رہے تھے۔"

"شوکت صاحب میں ایسی کیا انسانی برائیاں تھیں۔ جن کی بنا پر وہ اتنے ہر دلعزیز تھے؟"

"اس کا جواب خود آپ کے پاس بھی ہے۔ مگر آپ ہر بات کا جواب مجھ سے چاہتے ہیں۔ یہ اچھی زبردستی ہے۔ شوکت صاحب کی

بلکہ طبیعت بیویوں کی بیو میں بہرحال باعث تھی۔ انھیں وہ دوستوں میں بٹھا دیتے تو وہ انھیں جتا کے رکھتے تھے۔ لوگوں سے بیویوں کے ادب کا ماحول بنا رکھا تھا۔ اس ضمن میں بالکل ان کا حسن "تعزیت" دیکھا جائے تو شوکت صاحب کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ وہ کس طرح تعزیت ایسے نازک معاملے میں بھی دل کی استقامت کے پہلو ڈھونڈ لیتے تھے۔ ہمراہ کے ماحول کی ایک بھی جھلک دیکھا کر دیتی ہوں ـــ وہ پہلے کی بات ہے۔ سید نور جعفری اور ہم اکٹھے ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ وہ ہمارا مکان سڑک کے کنارے تھا۔ گرمیوں کی ایک رات کو کوئی بارہ ایک بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو دیکھی کیا ہوں ہوا پانی کا خیال ہے۔ میں گھبرا کر اٹھی۔ مکان چھان مارا۔ شوکت صاحب نہ ملے۔ دروازہ کھول کے دیکھا تو شوکت صاحب اور جعفری صاحب سڑک کے کنارے زمین پر بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ شوکت صاحب نے جواب دیا گھر میں گھٹن لگ رہی ہے۔ سڑک پر اس لیے آکے بیٹھ گئے ہیں کہ آتے جاتے لوگوں کی وجہ سے ہوا لگتی ہے۔ ایک اور بات یاد آئی ہے ـــ یہ جو میں نے آپ کو تصویر دکھائی ہے۔ جس میں شوکت صاحب صدر سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ اس کا قصہ بھی ایک لطیفہ ہوا تھا۔ صدر نے ازراہ پیار کہا ـــ "شوکت تم بھی اپنے سفید بالوں سے ڈرا رہے ہو" تو شوکت صاحب نے برجستہ کہا تھا ـــ "جی نہیں، حضور تو اب ہے ہیں" ـــ اس پر صدر بھی ہنس دیئے تھے اور باقی سامعین بھی۔ یہ تھیں وہ ساری باتیں جن کی وجہ سے وہ [illegible] ہر دل عزیز رہتے تھے۔"

"بھابی! ساری بیویاں اپنے شوہروں کی تعریفیں ہی کرتی ہیں۔ مگر ہر شوہر میں کچھ نہ کچھ ایسی بھی باتیں ہوتی ہیں۔ اگر آپ تھوڑی سی بہادر اور تھوڑی سی عام عورتوں سے اونچی ہو کر اس ضمن میں بھی روشنی ڈالیں تو اچھا ہو۔"

"طفیل صاحب! کمزوریاں ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ مگر شوکت صاحب کی خوبیاں ان کی کمزوریوں پر غالب تھیں۔"

"بھابی! آپ نے یہ جواب دے کر میرے ہی سوال کو تقویت پہنچا دی۔ جب شوکت صاحب کی خوبیوں کی بات چلی تو آپ نے فرفر چند ایک بڑی اچھی باتیں بتائیں۔ جب کمزوریوں پر کچھ کہنے کے لیے کہا تو یہ کہہ کر گزرنا چاہ رہی ہیں کہ کمزوریوں پر خوبیاں غالب تھیں۔ تو وہ کمزوریاں کیا تھیں جن پر خوبیاں غالب تھیں؟"

"طفیل صاحب میرا یہ خیال نہ تھا کہ آپ بھی شوکت صاحب کے دشمنوں میں سے نکلیں گے۔ ایسی کرید کرید کے برائیاں تو دشمن ہی نکالا کرتے ہیں۔ میں کوئی ان کی دشمن تھوڑی ہوں کہ ان میں کیڑے ڈالنے بیٹھ جاؤں۔ وہ اچھے تھے۔ ہر طرح اچھے تھے۔"

"میں کہتا ہوں۔ وہ برے تھے۔ ہر طرح برے تھے۔ پھر؟"

"توبہ ہے صاحب! سنیے ان کی برائیاں بھی سن کے خوش ہو جائیے۔ ابھی جو میں نے کہا تھا کہ ان کی برائیوں پر خوبیاں غالب تھیں تو وہ بات غلط نہ تھی ـــ شوکت صاحب کو اپنی برتری جتانے میں خاص لطف ملتا تھا۔ ایک بار ہم کسی کے ہاں دعوت پر گئے۔ بیٹھے بیٹھے کسی نے وقت پوچھا۔ کسی نے کہا نو بجے ہیں۔ شوکت صاحب نے کہا نو بج کے دس منٹ ہوئے ہیں۔ وہ صاحب کہیں میری گھڑی ٹھیک ہے۔ یہ کہیں میری گھڑی ٹھیک ہے۔ یہ تکرار کہ میری گھڑی ٹھیک ہے۔ میری گھڑی ٹھیک ہے دیر تک جاری رہی۔ بالآخر شوکت صاحب نے غصے میں آکر کہا۔ اگر میری گھڑی غلط ہوئی تو اسی وقت توڑ دوں گا اور یہ کہتے ہی گھڑی کلائی سے اتار لی۔ ٹیلیفون کر کے وقت پوچھا گیا تو شوکت صاحب کا ٹائم ٹھیک تھا۔ اگر شوکت صاحب کی گھڑی کا وقت غلط

لکھنا ترک ہی وقت سلسلہ آٹھ سو کی گھڑی توڑ دیتے — کسی معاملے میں شوکت صاحب بہت پکے تھے اس کی وجہ سے ان کی نیک رہتا تھا۔ مگر یہ شوق بھی وہ دوستوں کی خوشنودی کے لیے ہی پیدا کیا کرتے تھے۔ تو صاحب تو یہ ہے۔ رہی کیا ہوتی ہے ایک سوال ہوتا تھا۔ وہ دو دن بیٹھیں۔ تین تین دن بیٹھے ہیں۔ زیادہ تر یہ ان دنوں ہوتا تھا جب شوکت صاحب آتے تھے ورنہ کم ہی کرتے۔ یعنی دنیا کو بھول کر رہ جاتے تھے۔ بعد میں انھی نے طریقوں طریقوں سے یہ عادت بھی چھڑا دی تھی۔ اس کے پہلے وہ میرے شکر گزار ہی رہے — عقیل صاحب! شوکت صاحب اپنی زندگی کے آخری پانچ برسوں میں استغفار پڑھ گئے تھے لیکن چونکہ سب وہ ہر طرح سے اچھے ہو گئے تھے تو پھر ان کی برائیوں کا ذکر بھی بھلا معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ان میں ایسی خرابیاں بھی نہ تھیں جن پر بطور خاص زور دیا جائے — اچھا تو بھابی اب یہ بتائیں کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ شوکت صاحب کے تعلقات بڑے لوگوں سے زیادہ تھے اور چھوٹے درجے کے لوگوں سے نہ تھے یا کم تھے؟

"عقیل صاحب آپ پھر پھر کے باتیں تو وہی کرتے ہیں۔ مگر آپ نے اپنے خیال کے مطابق [illegible] کو بدل دیا ہے۔ جیسے کہ تو یہ معلوم ہے کہ وہ گھر کے ملازم اور دفتر کے چپراسی کو بھی اتنا ہی عزیز رکھتے تھے۔ جتنا کہ کسی اور کو۔ بات یہ ہے کہ وہ چھوٹے لوگوں سے ملتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ شرارتیں کرتے تھے تو لوگ کہتے تھے۔ تمسخر بناتے ہیں۔ بڑے لوگوں سے ملتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ شرارتیں کرتے تھے تو لوگ کہتے تھے۔ خوشامد کرتے تھے۔ یہ دنیا عجیب و غریب ہے۔ کیا کیا جائے۔"

"بھابی اس دنیا کے عجیب و غریب ہونے میں تو کوئی شک نہیں۔ اس معاملے میں آپ کا تجزیہ بالکل صحیح ہے۔ دنیا مطمئن کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی — آپ سمجھیں گی کہ میں اُلٹے سیدھے ہی سوال کرتا چلا جا رہا ہوں۔ مگر میں کیا کروں۔ بعض باتیں میرے ذہن میں صاف نہیں ہیں۔ اوروں کے ذہن میں بھی صاف نہیں ہیں۔ اس لیے پوچھنی پڑ رہی ہیں۔ مگر آپ یہ سوچے بیٹھی ہیں کہ آپ کو صرف شوکت صاحب کی مدافعت ہی میں کچھ کہنا چاہیے۔ یہ جذبہ غلط ہے۔"

"جی ہاں آپ کا یہ جذبہ بڑا صحیح ہے کہ شوکت صاحب کے بارے میں آپ نے کوئی ایسا سوال نہیں پوچھا جس سے میری بھی خوشی وابستہ ہو۔"

"عقیل صاحب! حد ہو گئی۔ گویا میں شوکت صاحب کا دشمن ٹھہرا۔ آپ کا یہ خیال ٹھیک ہو گا مگر میں اس کے بارے میں خود سے کیا کہوں۔ بہرحال آپ مجھے شوکت صاحب کا دشمن ٹھہرائیں، لڑیں یا ناخوش ہوں۔ مگر میں چند ایک باتیں ضرور پوچھوں گا۔"

"پوچھیے۔ پوچھیے۔"

"یہ بتائیں کہ شوکت صاحب اپنے سے بہتر لکھنے والا کسی کو نہ سمجھتے تھے۔ جبکہ ان سے بھی بڑے لکھنے والے موجود تھے اور ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"شوکت صاحب نے اس قسم کی کوئی بات میرے سامنے کبھی نہیں کی۔ اس لیے اس کے بارے میں میں کیا بتا سکتی ہوں۔ جبکہ وہ صد درجہ مقبول مصنف تھے۔ ان کی کتابیں خوب بکتی تھیں۔ اس لیے اگر انھوں نے ایسا سوچا ہو تو غلط بھی نہ سوچا ہو گا۔ بہرحال انھوں نے میرے سامنے کبھی نہیں کہا کہ میں سب سے بڑا لکھنے والا ہوں۔"

"جس وقت آپ کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت آپ کی صحت بڑی اچھی تھی۔ بعد میں خراب ہوئی۔ اس کی وجہ کوئی گھریلو پریشانی تھی؟"

"اوّل تو یہ سوال شوکت صاحب کے بارے میں نہیں ہے۔ اگر اسے کسی بھی طریقے سے شوکت صاحب ہی سے متعلق کچھ لیا جائے تو میں

مرحوم [illegible] صحت کا [illegible] پرستاروں اور ادیبوں کا رات [illegible] میری صحت کا [illegible] ہے۔ [illegible] شوکت صاحب [illegible] ہے۔ جب [illegible] کی صحت کے ساتھ [illegible]

— آپ [illegible] میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ حکومت نے آپ کی کس حد تک مدد کی ہے۔ کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

— عقیل صاحب! بات یہ ہے کہ [illegible] شوکت صاحب [illegible] تو ہماری [illegible] سے بڑھ کر [illegible] میری جان کا سوال نہیں ہے۔ تین معصوم بچیوں کا ساتھ ہے۔ ان کے مستقبل کا سوال ہے۔ شوکت صاحب تو انھیں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ میں ان کے [illegible] کی خوشیوں کو پورا [illegible] حکومت نے ہمیں [illegible] وجہ [illegible] ہو گیا ہے؟ — یہ سوال میرے علاوہ [illegible] صاحب [illegible] کا ہے۔

—

میں شوکت صاحب کی بیگمات کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے دکھوں اور [illegible] ہونے کے باوجود میری باتیں سنیں اور ان کے جوابات عنایت فرمائے۔ الفاظ کی حد تک یہ سلسلہ گیا رہ جواب۔ مفہوم کی حد تک، میں نے مرحوم کی بیگمات کا ساتھ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اتنی اہم معلومات کو بھی معتبر نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ مجھے ظن ہے کہ کہیں کہیں میں نے مفہوم کے اخذ کے سلسلے میں کوتاہی کا ثبوت دیا ہو۔ اس لیے اس گفتگو کے سلسلے میں جتنی بھی عجیب سی باتیں آپ کے ذہن میں ابھریں، انھیں بے تکلف میرے کھاتے میں ڈال دیجئے گا۔

اس گفتگو کے سلسلے میں میرے لیے بڑی مشکلیں تھیں۔ بہت سی باتوں کو جانتے بوجھتے ایسے پوچھا تاکہ میرے ذہن میں وہ باتیں زیادہ صاف ہو جائیں اور آپ کے لیے "انکشاف" کا درجہ رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں کئی مواقع ایسے تھے کہ بیگمات میرے سوالوں کو سن کر سٹپٹا گئیں، اور میرے خلوص پر بھی شبہ ہوا۔ مگر میں سر نیوڑائے وہ ساری باتیں کر گزرا، جو میں کرنی چاہتا تھا تاکہ مرحوم کی شخصیت کے وہ پہلو سب کے سامنے آجائیں جو ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ازبس ضروری تھے۔

میں نے اُن باتوں کی بھی وضاحت چاہی۔ جو شوکت صاحب کے کمزور پہلو تھے۔ ہم دور کے تماشائی، جو کسی شخصیت کو پوری طرح نہ جانتے ہوئے، اعتراضات کر بیٹھتے ہیں — اُن کی صراحت بھی تو مطلوب تھی — اور اس کے ساتھ ساتھ، میرا مدعا یہ بھی تھا کہ معلوم کروں کہ بیویاں اپنے شوہر کے بارے میں کس حد تک حسن ظن رکھتی ہیں۔ سو الحمدللہ شوکت صاحب کی بیویاں

سوالات آپ نے پوری تاثیر — جذبے میں معلومات ہیں! — تو بتاتے ہیں، دیکھئے میں نے آپ کی خاطر کتنا طویل لکھ دیا۔
بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ شوکت تھانوی مر گئے۔ ایسے ہی ہوگا، مگر میں تو یہ سن رہا ہوں کہ آج کے دانشور اس امر کی بھی کوشش کر رہے ہیں کہ ہزاروں برس پہلے کی آوازوں کو بھی سنوا دیا جائے۔ جب انسان کسی نہ کسی روپ میں باقی ہے تو ہم اسے مردہ کیوں کہیں!

میں انسان کی حکمت اور اس کی صلاحیتوں پر یقین رکھتا ہوں۔ اس کے باوجود یہ کہنے کی جسارت کروں گا — آدمیوں کے اس بھرے جنگل میں شوکت صاحب ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوں گے۔

میرا بھیا

خاتون ارشد

میرا بھیا بچپن ہی سے ذہین تھا۔ عجیب عجیب حرکتیں سوجھتیں وہ بھی ایسی جس سے دوسرے لوگ جلنے خفا ہونے یا ہنسنا شروع کر دیتے۔ میں جتنا اُسے چاہتی تھی، اتنا ہی وہ مجھے ستاتا اور تنگ کرتا۔ جب بھی اس کی شرارتوں سے عاجز آ جاتی تو چپ ہو رہتی۔ ہماری ایک تائی اماں تھیں۔ بیچاری کانوں سے بہری اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے کچھ کچھ سنکی ہو گئی تھیں۔ سیدھی سادی تو وہ شروع ہی سے تھیں ہمارے ابا جی کے بڑے بھائی جوانی کے وقت ہی ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے اور ۲۵-۳۰ برس سے لندن میں مقیم تھے۔ اس فراق نے تائی اماں کی دماغی حالت خراب کر دی۔ چونکہ وہ ان کی واپسی کی لو لگائے بیٹھی تھیں۔ محمد عمر یعنی شوکت کی عمر کوئی ۱۱ سال کی تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے ابا میاں کے پرانے جوتوں کو پہن کر بند کالر ہو کر تایا ابا آ گئے۔ اور خود سوٹ پہن کر ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ مغرب کا وقت تھا کچھ اندھیرا ہو چلا تھا تائی اماں بیچاری کو یقین آ گیا کہ سچ مچ ان کے میاں آ گئے۔ اور خوش خوش بیٹھ کے بیٹھ گئیں اور سر پر سے دوپٹہ ماتھے پر کھینچ کر گھونگھٹ کی طرح کر لیا۔ کچھ منٹ انتظار کرنے کے بعد گردن موڑ کر کن انکھیوں سے دیکھا۔ تو بھتیجے کو دیکھ کر پیٹھ پر دوہتڑ مار کر کہا مجھے بیوقوف بنانے چلا ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک کاغذ پر کچھ خانے بنائے اور اس میں کچھ ہندسے لکھے اور تعویذ کی طرح موڑ کر ان کے تکیے میں رکھ دیئے۔ جب دوسرے دن دھوبی کو کپڑے دیئے جانے لگے اور تکیے کا غلاف اُتارا گیا تو وہ تعویذ نکلا۔ تائی اماں بیچاری پرانے زمانے کی عورت تھیں تعویذ گنڈوں اور جادو ٹونے کی بہت معتقد تھیں۔ بدحواس ہو کر رونے لگیں۔ کہ کسی نے میرے اوپر سفلی عمل کیا ہے۔ اب مجھ پر کچھ ہو جائے گا۔ میری اماں انکی دیورانی تھیں اور ان کی پوزیشن بہت نازک تھی اس لیے کہ وہی ان کو ساتھ رکھے تھیں۔ اور کفالت کرتی تھیں وہ پریشان ہو گئیں کہ کہیں ان کو یہ بدگمانی نہ ہو جائے کہ میرا بوجھ ٹالنے کے لیے دیورانی نے تعویذ گنڈے کیے ہیں۔ ان کو پریشان دیکھ کر میں نے کہا ہو نہ ہو یہ حرکت محمد عمر کی ہے۔ ماموں زاد بھائی جو ان کے شریک تھے وہ کیوں بتلاتے۔ تائی اماں کو میں نے سمجھایا مگر ان کے پاس تو یہ تعویذ دستاویزی ثبوت موجود تھا۔ میں نے اُسے لے کر دیکھا اور فوراً کہا اسے یہ تعویذ تو سلمان الارشد کے لیے ماموں نے دیئے تھے (سلمان الارشد میرا بڑا لڑکا اس وقت شیر خوار تھا) یہ میں کہیں رکھ کر بھول گئی تھی پھر انہیں کے سامنے کپڑے میں باندھ کر

سلمان کے گلے میں ڈال دیا۔ تب جا کر تائی اماں کو سکون ہوا۔ اب بھیا کی گوشمالی ہو کرتی تھی۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔ میں جتنا چاہتی تھی اتنا ہی ڈانٹتی بھی رہتی تھی۔ علیحدہ لے جا کر خوب پیٹا تھا۔ اور کہا کہ اگر ابا کو خبر ہو گئی تو خوب پٹائی ہو گی۔ ان حضرت کو بچپن ہی سے صاحب بہادر بننے کا بہت شوق تھا۔ اماں ابا سے اور سب ضد پوری کرا لیتا تھا مگر دادا صاحب (منشی صدیق احمد) اس شوق پر کہتے تھے کہ جب تک تم میٹرک نہیں کر لو گے سوٹ نہیں پہن سکتے۔ ۱۵ سال کی عمر تھی یہ میرے پاس اچھاور آئے۔ یہ ریاست بھوپال کا ایک بڑا تھانہ ہے۔ اور میرے شوہر راشد تھانوی جو شوکت کے چچا زاد بڑے بھائی ہیں وہاں سب انسپکٹر تھے۔ شوکت نے ان سے کہا کہ بھائی جان میرے لیے ایک سوٹ سلوا دیجیے۔ راشد صاحب خود ابا سے ڈرتے تھے۔ کہنے لگے چچا جان خفا ہوں گے کہتے تھے شوق قبل از وقت پیدا کرتے ہو۔ لیکن میری سفارش پر انھوں نے سوٹ بھی تیار کرا دیا اور میرے کہنے پر ہیٹ بھی منگا دی۔ بھیا بہت خوش ہوئے۔ ان کے بھائی جان (راشد تھانوی) ان کو گھوڑے کی سواری بھی سکھایا کرتے تھے۔ آدمی لگام پکڑے ساتھ رہتا تھا۔ پھر بھی شوکت اس سے کتراتے تھے۔ مگر سوٹ پہن کر ہیٹ لگانے کے بعد خود ہی سائیس سے جا کر گھوڑا تیار کرایا۔ اور سوار ہو کر قصبہ میں گھومے۔ واپس آئے تو مجھ سے کہا کہ باجی دیہاتی عورتیں مجھے گھوڑے پر آتے دیکھ کر گھبرا گئیں اور ایک دوسرے سے کہنے لگیں ہٹو ہٹو صاحبوا آ رہا ہے۔ میں جانتی تھی۔ یہ بات غلط ہے۔ تمام بھوپال میں صاحبوا کوئی نہیں کہتا یہ پوربی بولی ہے۔ مگر اپنے بھیا کا دل رکھنے کو میں نے کہا۔ تم مجھے بھی تو صاحبوا معلوم ہوتے ہو۔

ایک روز ان کے بھائی جان نے کہا کہ صاحب لوگ شیر کا شکار بھی کرتے ہیں۔ تم صاحب تو ہو گئے ہو مگر بہادر نہیں بنے۔ آؤ تمھیں بندوق چلانا سکھائیں پھر تم صاحب بہادر بن جاؤ گے۔ تھانہ کے پیچھے ایک میدان تھا وہاں لے جا کر اپنے آگے بٹھایا اور بندوق ہاتھ میں لے کر شوکت سے چلوا دی۔ اس کا ایک ہلکا سا جھٹکا کندھے کے قریب چھاتی پر لگا۔ بندوق پھینک کر دوڑ کر گھر میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بھائی جان سے کہہ دیجیے کہ میں صرف صاحب بننا چاہتا ہوں صاحب بہادر بننا نہیں چاہتا۔ پھر کبھی بندوق کی مشق نہیں کی اور گھوڑے پر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے۔

۱۹۲۶ء کا ذکر ہے۔ شوکت میرے پاس سیکلون آئے۔ یہ ریاست بھوپال کی ایک دورافتادہ تحصیل ہے۔ ارشد صاحب وہاں تحصیلدار بھی تھے اور مجسٹریٹ پرگنہ بھی۔ اتفاق سے تحصیل کی عمارت کی مرمت ہو رہی تھی۔ اور راشد صاحب سکونتی مکان کے بیرونی حصے میں اجلاس کیا کرتے تھے شوکت وہاں جا کر بیٹھ جاتے تھے اور مقدمات کی کارروائی دیکھتے۔ ایک دن ایک ہندو عورت کا بیان لیا گیا اس کو سن کر عورت نے ہندی میں تیزی سے دستخط کر دیے۔ شوکت یہ دیکھ کر تیزی سے اندر آئے اور مجھ سے کہنے لگے باجی کمال ہے۔ یہاں کے دیہات کی عورتیں بھی انگریزی جانتی ہیں شوکت نے دور سے یہ دیکھا تھا کہ عورت نے بائیں سے دائیں کو قلم چلایا۔ انگریزی اور ہندی کی تحریر بھی اسی رخ سے ہوتی ہے وہ اس کو انگریزی سمجھا جب رات کو کھانے پر ارشد صاحب سے اس کا ذکر ہوا تو انھوں نے اس غلط فہمی کو باقی رکھا۔ اور شوکت کو جو اسکول میں زیر تعلیم تھے کہا جب تم روانی سے انگریزی لکھنے لگو گے اور فر فر انگریزی بولنے لگو گے تو سیکلون

بسی انگریزی داں لڑکی سے تھانوی شادی کردی گئی۔ اس وقت شوکت کی عمر سولہ کے قریب ہے اور بعد میں ہم ان کو جانتے رہے۔

لکھنؤ میں جب یہ خبر پہنچی تو گھر والوں نے ان کو چھیڑنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ ذرا ذرا سی بات پر ... برداشت نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو ان کے لڑکپن کی باتیں ہیں۔ جوانی میں بھی ان کی شرارتیں پوری دلچسپی کے ساتھ جاری رہیں۔ بھوپال کے مسلمان حلوائیوں کا قلاقند بہت مشہور ہے۔ جب وہ یو پی سے سالک بیلنس آفیسر تھے۔ میں لکھنؤ گئی تو ان کے لیے بھوپال کا قلاقند بھی لیتی گئی۔ میرے خالہ زاد بھائی مولوی محمد عثمان صاحب، ارشد صاحب کی بہت دوستی تھی ان کے لیے بھی قلاقند لیا تھا۔ جب لکھنؤ میں قلاقند کھولا گیا تو بھائی عثمان کا حصہ الگ کرکے باقی ختم کردیا۔ ارشد صاحب نے شوکت سے کہا کہ دیکھو تو بھائی عثمان کے حصہ میں سے نہ چرانا۔ اس پر شوکت نے کہا آپ کو بھروسہ نہیں تو بھائی عثمان کے حصے کے ٹکڑے گن کر رکھ دیجئے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جب دوسرے روز رات کو کھانا کھانے بیٹھے تو شوکت نے کہا دسترخوان پر کچھ میٹھی چیز بھی تو ہونا چاہیئے۔ پھر خود ہی بھائی عثمان والا قلاقند لاکر رکھ دیا۔ ارشد صاحب اسے دیکھ کر کہ گھر کا قلاقند تو ختم ہوچکا تھا سمجھے ضرور بھائی عثمان والا قلاقند چرایا ہے۔ شوکت نے جواب دیا کہ آپ اپنے قلاقند کے ٹکڑے دیکھ کر گن لیجئے۔ الماری کھولی گئی تو ٹکڑے تعداد میں پورے تھے۔ مگر میں سمجھ گئی اور اٹھا کر دیکھا تو اس کی موٹائی کم تھی۔ جناب سالک بیلنس آفیسر صاحب نے رات کو کسی وقت اٹھ کر نیچے سے آدھے آدھے ٹکڑے چاقو سے تراش لیے تھے۔ راز فاش ہونے پر شوکت بولے یہ آج کل کی بہنیں ہیں کہ بھائی کی پردہ پوشی کرنے کے بجائے اس کو مجرم بناتی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ مزیدار بات یہ ہے کہ ارشد صاحب لکھنؤ سے بھوپال سندیلہ کے لڈو لے کر آئے۔ یہ لڈو بطور تحفے کے دور دور کے شہروں تک جاتے ہیں اور کوری ہانڈیوں میں رکھ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ ہانڈیوں کے منہ پر لال کپڑا رکھ کر ڈوری سے باندھ کر گرہ پر لاکھ کی مہر لگادی جاتی ہے۔ بھوپال آکر دو ہانڈیاں ختم ہوچکی تھیں کہ ۳۔۴ دن بعد نواب صاحب کی جشن سالگرہ میں شرکت کی غرض سے شوکت بھی آگئے۔ گھر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ ارشد صاحب نے کہا کہ تیسری ہانڈی بھی کھولو۔ شوکت جلدی سے بولے میں اس میں سے لڈو کھا چکا ہوں۔ میں نے حیران ہوکر کہا کہ یہ تو سربمہر ہے۔ اور لکھنؤ سے جیسی لائی ہوں ویسی ہی رکھی ہے کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ شوکت نے کہا اچھا آپ کو یقین نہیں آتا تو کھول کر گن کر دیکھ لیجئے کہ ان کی تعداد پوری ہے یا کم ہے۔ میں نے مہر دیکھی لگی ہوئی تھی ہانڈی کھولی گئی اور گننے لگے تو مقررہ تعداد سے واقعی دو کم تھے۔ اب سب کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیا جادو کیا ہے۔ آخر ان ہی جادوگر صاحب نے بتایا کہ لکھنؤ میں جب یہ ہانڈیاں خریدی گئی تھیں اور روانگی سے ایک دن پہلے گھر میں رکھدی تھیں۔ تو میں نے آدھی رات کو اٹھ کر ہر ہانڈی میں سے دو دو لڈو نکالے۔ اور پھر دفتر میں سے اپنی مہر لاکھ لا کر لگادی۔ اب آپ کو تو سربمہر ملیں کیسے شبہ ہوتا۔ اس پر ہم لوگ ہنسنے لگے کہ ماشاءاللہ بھیا کو چوری کا سلیقہ خوب آگیا ہے۔ حالانکہ مقصد قلاقند یا لڈو کھانا نہیں ہوتا تھا بلکہ سب کو حیرت میں ڈالنے کے لیے اس قسم کی حرکتیں ہوتی تھیں

بعض دفعہ مجھ کو بھی جوابی حرکتیں کرنا پڑتی تھیں۔ جیسا کہ ایک دفعہ ہوا۔

جب وہ لاہور پنچولی آرٹ پکچرز میں ڈرامہ نویس ہو کر آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی تبادلہ کیا گیا۔ یہ واقعہ [illegible] کا ہے۔ میں کسی ضرورت سے لکھنؤ گئی وہاں میرا لڑکا عمران الارشد پڑھتا تھا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ شوکت کی بھی بھاوج بھی اپنی بیمار بہن کو دیکھنے آئی ہوئی ہیں۔ اور شوکت کی بیوی جلد لاہور واپس جا رہی ہیں۔ میں اس اتفاقیہ ملاقات پر خوش بھی ہوئی اور جب سنا کہ دوسرے سوموار لاہور جا رہی ہیں تو کہنے لگیں ہی کہ میں آئی اور تم جا رہی ہو۔ انھوں نے کہا آپ بھی لاہور چلئے بھائی سے مل کر چلی جائیے گا۔ میں نے کہا صرف ایک ہفتہ کے لیے آئی ہوں بچوں کو چھوڑ کر زیادہ دن کیسے لگا دوں لاہور جاؤں گی تو شوکت جلدی سے واپس نہیں آنے دے گا۔ ان کا اصرار بڑھا دل میرا بھی بھائی کو دیکھنے کو تڑپ رہا تھا۔ عمران الارشد (میرا لڑکا) نے کہا جائیے میں بھوپال آ کر کہے دیتا ہوں کہ ماموں جان کو دیکھنے لاہور چلی گئیں۔ میں تیار ہو گئی اور سعیدہ شوکت دلہن اور بابا میاں (رشید عمر) ہم سب لاہور کے لیے روانہ ہو گئی ریل میں ہم نند بھاوج نے ایک پروگرام بنایا اور بابا کو بھی جو چھوٹا تھا پیار محبت سے سمجھایا کہ ابا کو نہ بتانا کہ پھوپھی اماں آئی ہیں۔ میں نے کہا شوکت بہت تنگ کرتا ہے اب کی اس کو بھی ستانا ہے۔ جب لاہور اسٹیشن قریب آیا تو برقع کی نقاب اچھی طرح ڈالی۔ جب لاہور کا اسٹیشن آ گیا تو شوکت اور منجھلا لڑکا خورشید اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ ڈبے میں سے متعدد خواتین اتریں ان کے ساتھ میں بھی اتری۔ اور چند قدم فاصلے سے دوسری عورتوں کے ساتھ گیٹ تک آئی بس ایک غلطی ہوئی کہ میرا ٹکٹ بھی سعیدہ شوکت دلہن کے ہاتھ میں تھا۔ جب وہ ٹکٹ دے کر گیٹ سے نکلنے لگیں تو شوکت نے کہا یہ دو ٹکٹ کیسے گھبرا تو گئیں کہ راز نہ کھل جائے مگر سنبھل کر کہا ایک بیوی میرے ساتھ آئی ہیں ان کے ساتھ کوئی نہیں ہے یہ ان کا ٹکٹ ہے۔ میں نے جب یہ سن لیا تو پھر ساتھ ساتھ چلنے لگی جب تانگے میں جانے لگا تو بھاوج نے کہا ان کو لو ان کا سامان بھی ہے۔ اور جب سب بیٹھنے لگے تو میں لپک کے بھاوج کے برابر بیٹھ گئی وہاں شوکت خود بیٹھنا چاہتے تھے۔ برا لگا مگر دوسرے تانگہ میں بیٹھ گئے بابا کو بلا کر بٹھانا چاہا تو ہم نے اس ڈر سے کہ یہ ناٹک جو ہو رہا ہے بچہ کہیں گڑبڑ نہ کر دے اپنے پاس ہی بیٹھا رہنے دیا شوکت چیں بہ جبیں ہو رہے تھے کہ بیوی نے ایک غیر عورت کو اپنے پاس بٹھایا، بچہ کو بھی نہ آنے دیا۔ اور میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ بہت دوسروں کو بیوقوف بنا کر خوش ہوتا ہے آج میں بھی خوب تنگ کروں گی حضرت کے تیور بدلے ہوئے تھے اور ہم دونوں کو ہنسی آ رہی تھی۔

شوکت دوسرے تانگہ میں پنچولی کی طرف چل دیئے اور ہم لوگ سیدھے گھر پہنچ گئے اور خورشید نے تانگے سے اترتے ہی کہا۔ امی جان ایک تانگہ واپس نہ کریں میری طرف اشارہ کر کے کہا، آپ کو ماڈل ٹاؤن بھی پہنچانا ہے (سعیدہ نے رستے میں کہا تھا یہ ماڈل ٹاؤن جائیں گی) شوکت دلہن بولیں نہیں بھائی اشارہ سے کہا چائے وغیرہ سے فارغ کر کے پھر لے کر جانا۔ خورشید کو بہت ناگوار گزرا تھا کہ ماں کو تو دیکھو کیا ہو گیا ہے۔ خورشید نے گھر میں جب سب آگے سامان اتروایا تو کہنے لگے میں ماں سے کہا آپ کو معلوم ہے ابا ناخوش ہو رہے ہیں اسی لیے سیدھے گھر نہیں آئے

بے سلے تسعیاں ہو کیا خواب ساتھ لگا لیتی ہیں، وہ پرانی عورت کے چلی گئی تب میں جاتا ہوں جب یہ
تو کہ جائیں جب تو بتا شوکت صاحب نے کہہ دیا بڑی بات ہے۔ اس بیچاری کے ساتھ کوئی نہیں آیا نہ اسٹیشن
بے کر آیا اب کہ کھانا کھا کے چلا آتا۔ میں اس وقت بیٹھ رہ میں چلی گئی تھی۔ اور شوکت کی آمد کی اطلاع
میں بھی اونٹ کی طرح کو کر کرتی دیکھ سے اور جاتا ہوں پھوٹ جائے۔ خورشید نے کہا آپا جان آپ نے غضب کیا
اگر وہاں جائیں گے کپڑے تبدیل کر لیجئے وہاں کہیں بٹھا دیا۔ وہ سے کمرے میں بھیج دیجئے۔ بیمار شدہ مرے
سرک کی آمد کا انتظار تھا جب آدمی جانے لگا تو کہا وہ بلا گئی یا ابھی سے خیر گھر آئے تو بیوی نے کہا آپ رستے پر رک
سے گئے۔ اشارہ سے بیوی سے پوچھا وہ گئی۔

میں نے سوچا کہ کہیں پھر گھرے نہ حضرت چل دیں اب کھیل ختم کرنا چاہتے ہیں نہ جانے سے اگر دونوں آنکھوں
پر ہاتھ رکھ دیئے کہ چشمہ لگا تھا مضبوطی سے آنکھیں بند کر لیں ہی پلٹ کر مجھ کو دیکھا تو دیوانہ وار لپٹ گیا
اے میری باجی تم کہاں سے آ ٹپک گئیں مجھ کو اتنا پریشان کر کے یہ نہ کہا تم۔ بیوی سے کہا اتنی کوفت دی ہے
دل چاہتا تھا اس عورت کا منہ نوچ لوں اور نکال دوں، ہم دونوں نے کہا کیا ہوتا ایسا تو پھر تم کامیاب ہوتے
ہماری اسکیم فیل ہو جاتی۔ بہت پیلوں سب کو ستاتے ہیں آج پتہ چلا دوسروں کو کتنی کوفت ہوتی ہے تم کو مزہ
آتا ہے۔

بیوی سے کہا اتنی کوفت تم نے دی انھوں نے کہا ایک تو آپ کی بہن کو لے آئے اور آپ کو غصہ آ رہا تھا
کہنے لگے پتہ بھی ہو کہ میری باجی آگئی بلکہ میرا تو غصے کے مارے برا حال تھا اچھا ہوا ورنہ اب اور تم لوگ تنگ کرتے
تو بغیر کھانا کھائے چلا جاتا کہ اب اس بلا کو گھر میں رکھے رہو جب چلی جائے گی تب آؤں گا۔ اس پر بہن نے کہا آج
ہی جاتی ہوں مجھ کو سوار کرادو کہنے لگے جی ہاں جتنا مجھ کو تنگ کیا اتنا ہی تنگ کر کے جانے دوں گا۔ میں نے کہا اچھا
اب سنو کہ راستے میں یہ سب پروگرام بنایا ورنہ مجھ سے کہاں ضبط ہو رہا تھا۔ کہنے لگے جی ہاں جیسے تو تنگ کیا ہے۔
ورنہ ہمیشہ منہ کر لپٹ جاتی تھیں۔ اب آسانی سے تھوڑی جانے دوں گا نہ بدلہ لیا ہو تو شوکت نام نہیں اب ایک سال
رہنا پڑے گا۔ میں نے کہا نہ بھیا چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر آئی ہوں کہنے لگے آج ہی بھائی جان کو لکھتا ہوں کہ
ہمارے یہاں جب تک دولہا بھائی نہ آئے لڑکی بھیجی نہیں جاتی ہے کہتا ہوں جب تک لینے نہ آئیں گے نہیں بھیجوں گا۔
اور یہی کیا کہا ارشد صاحب کا جب بلانے کا خط آتا کہ لڑکیاں گھبرا رہی ہیں یہاں سے خط جاتا خود آ کر لے جائیے،
ورنہ نہیں بھیج سکتے۔ ہماری لڑکی کو تکلیف ہے ہم نے میکہ میں بٹھا لیا ہے۔

غرض ارشد صاحب کو آنا پڑا بجائے ۱۰ دن کے ۲۵ روز روک کے رکھا، روز بستر بندھتا، بڑا ناشتہ تیار
ہوتا تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں ناشتہ سب کو کھلایا جا رہا ہے بستر کھولا جا رہا ہے۔ صبح کو جاگنے سے پہلے
ایک صاحب جو لکھنؤ کے تھے اور پچولی میں ستار بجایا کرتے تھے اور داڑھی رکھنے کی وجہ سے شوکت ان کو مولانا
کہتے تھے ان کو پابند کیا تھا کہ روزانہ ستار لاؤ اور بھائی جان کے سرہانے کھڑے ہو کر بجاؤ۔ پہلے روز انھوں نے

پڑھانا شروع کیا تو شوکت نے کہا کہ جھجکتے کیوں ہو چلائے عمر پڑ گئی ہے اور جگانے کا یہی طریقہ ہے ورنہ بھائی جان نہیں جاگیں گے۔ اس بیچارے نے پڑھانا شروع کیا ارشد صاحب آواز سن کر جاگ گئے اور کہا شوکت یہ کیا بدمعاشی ہے شوکت بولے ہمارے یہاں تہذیباً پکارا نہیں جاتا۔ ایسے ہی جگایا جاتا ہے۔ غرض دن رات یوں ہنستے گزرتے تھے۔ وہ دن یاد آتے ہیں۔ اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میرا بھائی اب بھی زندہ ہے۔ اپنے بچپنے سے اس کو جیسے کوسوں پیچھے سے لے کر اب تک اس کی زندگی میری نظروں کے سامنے پھر رہی ہے۔ شوکت کیا مجھے چاہتا تھا اور اس کی ہر چیز ہر بات سے میں کیسا کیسا خوش ہوتی تھی۔

لڑکپن میں سب سے پہلے جب سائیکل چلانا سیکھی تھی تب مجھے پکارا تھا کہ باجی۔ باجی جلدی آئیے دیکھو مجھ کو سائیکل چلانا آ گئی اور۔ باجی اپنے بھیا کی ہر بات سے مارے خوشی کے پھولی نہ سماتی۔ دنیا کی کوئی ایسی بات نہ تھی جس میں باجی سے مشورہ نہ کیا جاتا ہو۔ باجی اور بھائی جان اس کی چیزوں سے جتنا خوش ہوتے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا جتنی داد ہر نئی ذہانت کی اس کو میں اور ارشد صاحب دیتے اور کوئی نہ دے سکتا۔ بڑے ہونے پر بھی وہ ہمارے ساتھ بچہ بن جاتا اور ارشد صاحب بھی اس کے ہم جولی بن جایا کرتے تھے حالانکہ وہ اس سے ۱۰ سال بڑے تھے۔

ایک بار ۲۶ء میں جب لکھنؤ سے میرے پاس آیا تو ہم لوگ ریاست بھوپال کی ایک دور افتادہ تحصیل میں تھے اسی لیے اماں نے لیچیاں اور بہت سے پھل بھیجے تھے اور شوکت اپنے دونوں بھانجوں سلمان اور سلطان کے لیے گیند اور دو بیٹ اور ننھے عمران کے لیے ننھا بڑا سا کھلونا لائے۔ بڑی بھڑیں جن کو تتیا بھی کہتے ہیں۔ پھلوں کے ٹوکرے پر آ جا رہی تھیں ایک بھڑ ادھر آئی جہاں ہم سب بیٹھے تھے۔ ارشد صاحب بیٹ لے کر کھڑے ہو گئے بھڑ کو مارا وہ نیچے گری اور پاؤں بڑھا کر جوتے سے کچل دیا۔ اب بھلا شوکت سے کہاں صبر ہوتا دوسرا بیٹ لے کر وہ بھی کھڑے ہو گئے اور جس طرف بھڑیں آ جا رہی تھیں اس طرف جا کر کہنے لگے آئیے بھائی جان مقابلہ ہو جائے دیکھیں کون زیادہ بھڑوں کو مارتا ہے پھر کیا تھا دونوں بھائی جٹ گئے کچھ نہیں کچھ نہیں تو سو سوا سو بھڑیں مار ڈالیں اگر چائے نہ لگا دی جاتی تو معلوم نہیں کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ لیکن نتیجہ کسی کے حق میں نہ نکلا بغیر ہار جیت کے یہ بازی ختم ہو گئی۔

ایک روز بستی میں گھومنے گئے وہاں کچھ ہندوؤں کو چوسر کھیلتے ہوئے دیکھا گھبرا کر بولے ہم بھی چوسر کھیلیں گے چوسر منگوائی گئی اور کھیلنے والے کو بلا کر اس کے قاعدے سیکھے اور کئی روز تک یہی مشغلہ رہا۔ لکھنؤ جاتے وقت مجھ سے اس کی بساط سلوائی اور کہا کہ کوڑیاں اور گوٹیں لکھنؤ میں خرید لوں گا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کا خط آیا کہ پچیسی کے علاوہ میں نے شطرنج کی بھی مشق کر لی ہے اب کے آپ لکھنؤ آئیں گے تو اس پر بھی میری ذہانت کا اندازہ کیجئے گا۔ اور جب کچھ عرصے کے بعد ہم لوگ لکھنؤ گئے تو شوکت اپنے بھائی جان کے ساتھ پچیسی بھی کھیلتے رہے اور شطرنج بھی پھر جلدی اکتا گئے ادبی ذوق کی تکمیل کا وقت ضائع ہوتا تھا شوکت ادبی مزے مزے کی باتیں کرتے اور پھر وہ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور مضمون لکھتا ہم دونوں میں جو باتیں ہوتیں اسی پر مضمون تیار ہو جاتا تھا بھوپال میں چلی آتی تھی اور جب وہ مضمون چھپ کر آتا تو خاص طور سے مجھ کو بھیجتا۔

اپنے بھائی جان کے اتنے عاشق زار تھے کہ جانے کو ہر وقت تیار رہتے۔ لکھنؤ جاتا جب میرا بچہ ہوا تھا، سلمان اور رشید بھی میرے ساتھ لکھنؤ میں تھی۔ اماں نے کہا اپنے بھائی جان کو اطلاع کا تار دے دو۔ لکھو نواسی ہوئی ہے زچہ تو خیریت سے ہیں۔ آپ کو رشید صاحب کو بھیجنے کا موقع اللہ نے دیا اور تار میں اپنی طرف سے ترمیم کر دی کہ باجی سخت بیمار ہیں فوراً آئیے۔ ارشد صاحب نے گھبرا کر اسپیشل بھی لی لکھنؤ پہنچے۔ معلوم ہوا سب خیریت ہے۔ جب پوچھا ایسا تار کیوں دیا تو شوکت نے کہا آپ کو بلانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس سے ہمدردی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ تینوں لڑکوں میں اس کی خصوصیات الگ موجود ہیں۔ بڑا لڑکا سلمان ماموں کی طرح تمام رات جاگتا ہے دوسرا سلطان خوش گفتار ہے۔ بذلہ سنجی خوش لباسی ہیں بالکل ماموں کی طرح ہے تیسرا عمران اس میں ماموں کی وہ سنجیدگی ہے جو جیل جانے کے بعد وہ اختیار کر لیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شوکت کو بھی ۳ بیٹے دیئے ہیں ان کے نام میرے اور ارشد صاحب کے ملتے جلتے ہیں لیکن شوکت کو لڑکی کی تمنا بہت تھی۔ ایک دفعہ لکھنؤ سے خط میں لکھا لڑکی پیدا ہوئی ہے زچہ بچی بخیریت ہیں مگر کمزور بہت ہے۔ شوکت کو معلوم تھا کہ جب تک سعید عمر نہیں ہوا تھا تو بھائی کی اولاد کی بہن کو کتنی تمنا تھی اور ان شاہدہ کے ہونے کے بعد باجی زچگی ... تھا کہ بھتیجی بھی ہو اسی لیے یہ لکھا تھا کہ میں خوش ہو جاؤں گی سب کے لیا جب لکھنؤ آئیں گی تو لیاں سے لڑکی دکھاؤں گے کہتے تھے دو تین روز میں لکھ دوں گا کہ ختم ہو گئی تو بجا ہے کے منہ سے نکلا خدا نہ کرے کہنے لگے اچھا ہوئی بھی نہیں اور مرا ماتم ہو۔

خدا نے اس کی یہ تمنا بعد کو پوری کر دی لاہور میں جب زہرہ خاتون سے شادی ہوئی تو سب سے پہلے بچی ہوئی جس کا نام برسوں پہلے سے ہی شوکیہ رکھ رکھا تھا۔ اس کے بعد دوسری بچی فوزیہ پیدا ہوئی پھر تیسری شاہدہ۔ اس طرح انسانیت کا حساب برابر رہا یعنی پہلی بیوی کے ۳ لڑکے سعید عمر، خورشید عمر، رشید عمر۔ دوسری بیوی کے ۳ لڑکیاں شوکیہ، فوزیہ، شاہدہ۔ بچیاں بڑی پیاری معصوم ہیں مگر ان پر سے اللہ میاں نے باپ کا سایہ جلد اٹھا لیا۔ ان بچے بچیوں سے اس لیے بلا محبت ہے کہ ان میں بہت چیزیں شوکت کی ہیں۔ اور خود اپنے بچوں میں جب یہ خصوصیات دیکھتی ہوں تو ان کو بھی اس لیے چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کی یہ چیزیں ان میں موجود ہیں۔ شوکت کو اس لیے چاہتی تھی کہ اس میں بہت سی چیزیں ابا کی تھیں ابا جب یاد آتے تھے تو بھائی کو دیکھ کر دل کو تسلی دیتی تھی کہ باپ نہ سہی بھائی تو موجود ہے۔ اب میں کیا کروں کیسے یقین کروں میرا بھیا ہمیشہ کے لیے مجھ سے روٹھ گیا۔ میں بدنصیب اپنی شدید علالت کی وجہ سے دیکھ بھی تو نہ سکی کیسے دل کو سمجھاؤں دل یقین نہیں کرتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا میرے باپ کے گھر کا چراغ گل ہو گیا۔ میرے دل پر قیامت گزر رہی ہے مگر پھر سوچتی ہوں نہیں اس کے لڑکے اس کی لڑکیاں سب اسی چراغ سے چراغ روشن ہوتے ہیں ان کو کلیجے سے لگاؤں دل کو سمجھاؤں ہائے میرے بھیا تو کہاں ہے تیری ماں جائی تڑپتی ہے تو صرف تنہا بھائی تھا بتا کیا کروں تجھ کو کس طرح بھلاؤں ہائے میرا بھائی کہاں چلا گیا۔ ساری رات بھر آنکھوں میں کاٹتی ہوں۔ تجھ کو کسی نے یہ تک نہ بتایا کہ ماں جائی سخت بیمار ہے۔ ہائے سوچا ہو گا کیسی بہن ہے جو نہیں آئی۔ معلوم نہیں کیا کیا سوچتی ہوں روتی ہوں کیا کروں، اللہ تو بتا کیا کروں۔ سعید، خورشید، رشید۔ شوکیہ، فوزیہ، شاہدہ تم نہ روؤ مجھ کو رونے دو اپنی پھوپھی کو دھاڑیں مارنے دو تڑپنے دو۔ میرا تو صرف ایک بھائی تھا اب کچھ نہیں۔ تم بچے ہو تم چھ بھائی بہن ہو اپنی اماں بی کو تسلیاں دو ان کے کلیجے

سے تھک جاؤ ہوش سنبھالنے کی کوشش کرو۔ میرا دل تڑپ رہا ہے اب لکھا نہیں جاتا کیسے یقین کروں کس طرح سے دل کو سمجھاؤں۔ دل چاہتا ہے آنکھ کھل جائے اور یہ سب خواب ہو میرا بھائی زندہ ہو کاش ایسا ہو سکتا۔ کراچی سے جانے کے بعد میں نے دیکھا ہی نہیں بہت دل کو سمجھاتی ہوں کہ وہ تو پنڈی میں ہے نہ یقین کروں ہائے میرے قلم سے آج تک لفظ مرحوم نہیں لایا کیسے لکھوں۔ میں نے تو یہ پروگرام بنایا تھا کہ لڑکیوں کی چھٹیوں میں پنڈی جاؤں گی اب کس کے پاس جاؤں پیارا بھائی اب کبھی دیکھنے کو نہیں مل سکتا۔ کبھی نہیں مل سکتا۔

ہائے شوکت تو کہاں چلا گیا!

شوکت سلمہٗ

(جواب مرحوم منظور ہو گیا)

ارشد تھانوی

طفیل صاحب! شوکت نمبر کے لیے جو کچھ لکھا، یہاں ہے۔ بعض حصے سابقہ مضمون سے ماخوذ ہیں مگر بیشتر حقائق پہلی بار زیرِ قلم آئے ہیں۔

ارشد

لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ بُروں میں بھی کچھ اچھائیاں ہوتی ہیں اور اچھوں میں بھی کچھ برائیاں۔ شوکت میں خوبیاں بہت زیادہ تھیں اور خامیاں بہت کم۔ اگرچہ یہ سالہا سال کے استعمال سے بہت عامیانہ ہو گیا ہے مگر دل گرفتہ شوکت یہ زبان سے نکل ہی جاتا ہے کہ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

وہ ناظم بھی تھا، ناثر بھی۔ شعر بھی کہتا تھا، مضامین بھی لکھتا تھا۔ ریڈیو کی نشریات میں بھی باقاعدہ حصہ لیتا تھا۔ فیچر اس نے لکھے، ڈرامے اس نے لکھے، مختصر افسانے اس نے لکھے، ناول اس نے لکھے، متعدد روزناموں کی ادارت اس نے کی اور طنز و مزاح کا ایسا اسلوب اس نے پیدا کیا جس نے ہندوستان و پاکستان کے ہر صاحبِ ذوق کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ خواص تو خواص عوام بلکہ [illegible] لکھنے والوں کا دل بھی اس نے موہ لیا تھا۔ اس پر خامہ فرسائی کرنا میرے لیے مناسب نہیں ہے۔ یہ دوسرے اہلِ قلم کا موضوع ہے۔ وہ میرا جان سے زیادہ عزیز چھوٹا بھائی تھا لیکن حقیقی نہیں بلکہ عم زاد۔ اگرچہ عام طور پر اس کو میرا حقیقی بھائی سمجھا جاتا ہے اور [illegible] کی نفی کرنے والے اور بعض حضرات اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ میرا بیٹا تھا۔ ساقی نقالی نے اپنے مجموعہ مکتوبات میں اسے میرا سوتیلا بھائی لکھ دیا۔ اس غلط فہمی کے اسباب کی بنیاد ہمارے خاندانی روابط اور معاشرتی ہم آہنگی ہے۔ شوکت بچپن میں میری گود میں کھیلا۔ طفولیت میں میرا ہمراز رہا۔ جو شعور کو پہنچ کر اپنے آپ کو "تھانوی" لکھنے لگا حالانکہ وہ تھانہ بھون میں کبھی نہیں رہا۔ کم سنی میں ایک بار صرف ایک دن کے لیے تھانہ بھون گیا۔ پھر جوانی میں اپنی رفیقۂ حیات سعیدہ خاتون کو وہاں اعزہ سے روشناس کرانے کے لیے صرف دو دن اپنے آبائی وطن میں رہا۔ واقعہ کے طور پر وہ تھانوی نہیں لکھتا تھا۔ چچا جان منشی صدیق احمد صاحب (شوکت تھانوی کے والد) ایک رومانی ناکامی کی وجہ سے نوعمری ہی میں تھانہ بھون سے چلے آئے تھے

عرصہ دراز تک محکمہ پولیس میں ملازمت کر کے لکھنؤ ہی میں رہے اور لکھنؤ ہی کے ایک ممتاز صدیقی خاندان میں شادی کی جس کا سلسلہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی تک پہنچتا ہے۔ ان کی بیگم ہماری چچی جن کو ہم بڑے پیار سے اچھی بی کہتے تھے اور وہ نانہ شاہی کے وزیر اعظم کی پوتی تھیں۔ یوں تو چچا جان یوپی کے مختلف اضلاع میں بسلسلہ تبادلات مقیم رہے لیکن مستقل سکونت لکھنؤ ہی میں اختیار کر لی۔ وہیں ذاتی مکان بنایا جو زرد کوٹھی کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ زرد کوٹھی محلہ آغا باقر میں چھوٹی شہزادی کی حویلی کے سامنے وکٹوریہ سٹریٹ پر تھی جو اب تقسیم ملک کے بعد سے شرنارتھی کے قبضہ میں ہے۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا کہا ہے ۔

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت
رفت منزل بدیگرے پرداخت

۱۹۲۷ء میں میری شادی شوکت کی بڑی بہن ظہورہ فاطمہ بیگم صاحبہ سے اسی زرد کوٹھی میں ہوئی اور مدتوں اسی کے بالائی حصہ میں میرا قیام رہا۔ میرے والد شیخ سلطان احمد بھوپال ایگزیکٹ کے مشہور وکیل فوجداری تھے۔ ماہ فروری ۱۹۰۵ء میں ان کو اپنے چھوٹے بھائی صدیق احمد کا تار ملا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ ان دنوں چچا جان بندرابن ضلع متھرا میں کوتوال تھے۔ میرے والد نے اس کا نام "تنویر احمد" از روئے اعداد ابجد نکالا جس سے ۱۳۲۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ چچا جان، ان کی بیگم اور دوسرے افرادِ خاندان ایک تارک الدنیا بزرگ کے جو بڑے مولانا صاحب کہلاتے تھے، بہت معتقد تھے۔ ان ہی مقدس انسان کے صاحبزادے حضرت مولانا عین القضاۃ بانی مدرسہ فرقانیہ تھے جہاں سے حفاظ و قرآن کی دیندار جماعتیں اب بھی نکلتی رہتی ہیں۔ چچا جان کے یہاں شادی کے بعد عرصہ دراز تک اولاد نہ ہوئی، بڑے مولانا صاحب سے دعا کرائی گئی اور ۱۹۰۱ء میں چچا جان کے یہاں [illegible] ضلع آگرہ میں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ چونکہ یقین یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اولاد بڑے مولانا صاحب کی دعا قبول فرما کر دی ہے، انہی سے نام رکھنے کی استدعا کی گئی، انہوں نے "ظہورا" نام تجویز کیا۔ میرے والد نے بھتیجی کے نام کو سلیقے کا بنا کر تاریخی حیثیت سے دی اور ظہورا کو ظہورہ فاطمہ بیگم بنا دیا جس سے سنہ پیدائش (۱۳۱۸ھ) برآمد ہوتا ہے۔ اس بچہ کا نام بھی بڑے مولانا صاحب کے ارشاد کے مطابق محمد عمر رکھا گیا۔ اس محمد عمر یا تنویر احمد کی پیدائش کے چند ہی روز بعد چچا جان ریاست بھوپال آ کر پہلے میونسپل بورڈ کے سرکاری چیئرمین ہو گئے، پھر منتظم پولیس کے عہدہ پر تقرر ہو گیا۔ یہ عہدہ سپرنٹنڈنٹ ضلع اور انسپکٹر جنرل کے درمیان دوسری ریاست کی زیر نگرانی ہوتا تھا۔ شیر خوار محمد عمر بھی اپنے والدین کے ساتھ وہاں پہنچا۔ میرے والد چار بھائی تھے، سوائے میرے اور کوئی لڑکا ان بھائیوں کے یہاں نہ تھا۔ مجھے یہ دودھ پیتا منا بھیا بہت ہی اچھا لگا۔ میں خود بھی نو عمر یعنی ۱۸، ۱۹ سال کا تھا اور ریاست کے قوانین رٹ رٹ کر امتحان وکالت کی تیاری کر رہا تھا۔ اس مصروفیت سے جتنا وقت ملتا وہ سب اپنی محمد عمر کی ناز برداری میں گزرتا۔ اسے گھٹنوں پر بٹھا کر جھو جھو کرتا، کندھے پر بٹھا کر صحن میں ٹہلتا، دونوں ہاتھوں میں لے کر اچھالتا، جب وہ کھلکھلا کر ہنستا تو میں بھی باغ باغ ہو جاتا۔ کمرہ میں ایک منقش چھت گیری لگی ہوئی تھی، ایک طرف کا بند کھل گیا اور کپڑا نیچے جھک آیا۔ میں نے حسب معمول منے بھیا کو پکڑتے، کھلاتے اوپر اٹھا کر چھت گیری سے لگاتے ہوئے کہا، "تجھے آسمان پر پہنچا دوں"۔ چچی جان جو مزاجاً توہمات سے بالاتر نہ تھیں، گھبرا کر بولیں "ایسی بری فال زبان سے نہ نکالو"۔ میں نے جواب دیا کہ یہ بری نہیں بلکہ فرخندہ فال ہے، شہرت و عزت کی فال! آپ اسے بری فال کیوں کہتی ہیں۔ کاش چچی جان عمر طبعی کی انتہائی حد تک زندہ رہتیں

... چند چاند کر دیہ ہم سمندر نکلا اور سامنے سے دست پر [illegible] اور [illegible] نہیں رہیں ان [illegible] کو تو ل کی [illegible] ہو جاتے۔ اس [illegible] سرماہی سے اس کے آثار نمایاں تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ [illegible] کے [illegible] پڑھنے [illegible] نظر آتے ہیں۔ محمد عمر [illegible] صحافت [illegible] ہے۔ دو سال بعد سی۔ پی گورنمنٹ نے چچا جان کو ریاست سے [illegible] کر دیا۔ چونکہ بھوپال میں ان کو ایک وسیع حلقہ احباب مل گیا تھا اس لیے واپس آکر انگریزی کی نوکری میں ان کا دل نہ لگا اور [illegible] وقت [illegible] لے کر بھوپال آ گئے۔ یہاں [illegible] نے ایک اہم عہدے [illegible] پر [illegible] رکھا۔ [illegible] وہ زمانہ تھا جب پولیس [illegible] سی۔ پی پولیس کے ایک [illegible] عبدالستار خاں بہادر شیخ محمد سرور [illegible] مقرر ہو کر ریاست میں آئے تھے [illegible] نظام پولیس [illegible] سے متعلق [illegible] ان سے نائب [illegible] مقرر ہوئے۔ [illegible] دونوں کے [illegible] تھے [illegible] دونوں میں چشمک ہو جاتی تھی [illegible] بعض [illegible] پر بھی [illegible]۔ افسر اعلیٰ سیاہ [illegible] کے [illegible] تھے [illegible] خضاب لگاتے اور سر کے بال بہت چھوٹے مشین [illegible] سے کترے ہوئے رکھتے [illegible] زیادہ نمایاں [illegible]۔ ایک [illegible] کے بنگلے پہنچے، وہ ننگے سر [illegible] بیٹھے تھے۔ [illegible] افسر اعلیٰ صاحب [illegible] اطلاع [illegible] طرح [illegible]۔ چچا جان نے دیکھتے [illegible] سادہ [illegible]۔ آپ نے [illegible] سامنے سے آنے کی [illegible]۔ افسر اعلیٰ نے [illegible]۔ چچا جان [illegible] سر صاحب کا پسینہ جو [illegible] اس سے میں نے کہا۔ افسر اعلیٰ صاحب نے [illegible] سر پر [illegible] معاف کیجئے گا سفید ہوئے [illegible] پر مجھے صابن کے پسینے کا شبہ ہوا۔ افسر اعلیٰ اس پھبتی کو سمجھ تو گیا مگر [illegible] بغیر جواب [illegible]۔ آپ کی نظر زیادہ کمزور ہو گئی ہے، چشمہ لگوا لیجئے مگر [illegible] نے تو غضب ہی کر دیا۔ [illegible] ہو گئی مگر [illegible]۔ ہوا یہ کہ [illegible] اپنے آقا سے پوچھ کر [illegible] کے ساتھ بازار گئے۔ واپسی پر چچا جان نے پوچھا "کہو بازار ہو آئے؟" محمد عمر نے جواب دیا۔ جی ہاں، [illegible] ایک جگہ آپ کے افسر اعلیٰ پیٹ پر گھڑی باندھے کھڑے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک گھڑی والے کی دوکان پر ایک [illegible] جس کا [illegible] کوٹ پتلون پہنے [illegible] لگائے کھڑا تھا، اس پر گھڑی کا ڈائل بنا تھا۔ یہ پھبتی خاں بہادر محمد سرور پر [illegible] چسپاں ہوئی کہ

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

چچا جان اور عالی مرتبت سر [illegible] نے جو اتفاق سے وہاں بیٹھے تھے، اس [illegible] کو منگوا کر دیکھا اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ریاستوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہوتی جو "با شراب خوردہ [illegible]" پر عمل کرتے ہیں۔ چچا جان کے حاشیہ نشینوں نے جو افسر اعلیٰ کے التفات کے لیے چوریاں رہتے تھے، موصوف کو بھی یہ خبر مزید حاشیہ آرائی کے ساتھ پہنچا دی۔ انہوں نے بہت برا مانا اور دلی کبیدگی اس قدر بڑھی اور باہمی تلخی نے اس قدر شدت اختیار کی کہ چچا جان کو مستعفی ہو کر لکھنؤ چلا آنا پڑا۔ حکیم [illegible] خاں نے فرمانروائے اودھ کے دعویٰ نجابت پر [illegible] کہ کر اپنے حق میں جو کانٹے بوئے تھے ان صاحبزادے نے اپنے والد کے حق میں بوئے لیکن اسی ذہانت اور تیزی طبع سے اپنی زندگی میں خوب پھلے پھولے اور ادب اردو میں وہ شاہکار پیش کئے جو اپنی جگہ اختراع [illegible] کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر اس پکی عمر میں محمد عمر [illegible] لکھنؤ آکر نشو و نما نہ پاتے تو وہ بھوپال میں رہ کر [illegible] شوکت علی نہ بنتے چپکے اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے بن کر رہ [illegible]۔ لکھنؤ کی شہری فضا اور شہری ماحول نے ان کی ذہنی قوتوں کو ابھارنا شروع کر دیا۔ مادری زبان تو لکھنؤ کی یگانگی زبان کے آغوش میں پروان چڑھ رہی تھی، لکھنؤ کی معاشرت بھی پورے طور پر اثر انداز ہونے لگی۔

جس محلے میں گھر تھا وہاں زیادہ تر امامیہ عقیدے کے اصحاب رہتے تھے اور ہم سب کے تعلقات خوشگوار تھے۔ مجلسوں میں شوکت کو بھی اپنی والدہ کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ کسی مجلس میں ایک ذاکرہ نے مرثیہ یا سلام بصورت مسدس پڑھا۔ اس پر غور کرتا ہوا گھر آیا۔ ان کے ابا اس وقت کسی کا ذکر کر رہے تھے کہ "وہ بھری گلی میں گر گئے پھرتے ہی نشہ سے" شوکت نے اسے مسدس جیسا مصرعہ قرار دے کر فوراً اگلا ٹکڑا چسپاں کر دیا "عباس کے آگے" جو بالکل فٹ بیٹھ گیا ؎

وہ بھری گلی میں گر گئے پھرتے ہی نشہ سے
عباس کے آگے

میں نے اس سے پہلے بھی اس کا ایک غیر ارادی شعر فی البدیہہ سن کر کہا تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ضرور شاعر ہوگا اور وقت آنے پر یہ ہونہار بروا شاعر ہی نہیں انشا پرداز بھی ہو گیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ میں نے نقش ظہور ساہو کے نام اخبار پھول جاری کرا دیا تھا۔ پتہ کی چٹ چھپی ہوئی تھی۔ جب چھوٹے بھائی نے اردو پڑھنے لکھنے کی تھوڑی سی استعداد پیدا کر لی تو مجھ سے فرمائش کی کہ جس طرح باجی کا نام چھپا ہوا آتا ہے میرا نام بھی اخبار میں چھپوا دیجئے۔ میری ایک مختلف البطن بہن جو شوکت سے ۹ ماہ بڑی تھی دونوں بھائی بہن آپس میں بہت مانوس تھے۔ اس نے بھی بڑی ضد سے یہی بات کہی۔ یہ اس وقت کا قصہ ہے جب ہم بھوپال ہی میں تھے۔ میں نے دو کہانیاں دونوں کے نام سے لکھ کر بھیج دیں۔ عنوان تھا "بڑھیا کا لڑکا" یہ ننھے میاں کی طرف سے اور دوسری کہانی "سفید بی" افسر بیگم کی طرف سے۔ جب وہ چھپ کر آئیں تو میاں محمد عمر جو اس وقت شوکت کا پیار کا نام تھا، روتے ہوئے اپنی ماں کے پاس گئے اور کہا: "دیکھئے اماں! بھائی جان آپ کو بڑھیا کہتے ہیں اور پھول کے شروع صفحہ کی فہرست مضامین دکھا کر بولے۔ یہ دیکھئے لکھا ہے "بڑھیا کا لڑکا" محمد عمر" اور "سفید بی" افسر بیگم" جب میں باہر سے آیا تو یہی بات مجھ سے کہی کہ ہماری امی زیادہ عمر کی تو نہیں جو آپ نے مجھے "بڑھیا کا لڑکا" لکھ کر چھپوا دیا۔ میں نے کہا، تو بڑے غضب کو اپنی ذہانت سے الفاظ کا مطلب بدل دیتے ہو۔ تم خوب سمجھتے ہو کہ کہانی کا نام "بڑھیا کا لڑکا" ہے اور لکھنے والے کا نام "محمد عمر"! چچی جان یہ سن کر ہنس پڑیں۔ اس دن سے حضرت نے افسر بہن کو "سفید بی" کہنا شروع کر دیا۔ بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال نے شاہی خاندان اور معزز عہدہ داروں کے لئے ایک ابتدائی درس گاہ "نوبل اسکول" کے نام سے قائم کی تھی۔ محمد عمر بھی اس میں داخل تھے۔ دوپہر کا کھانا گھر سے ایک اردلی لے کر جایا کرتا تھا۔ محمد عمر اپنا مزے دار کھانا اپنے ہم جماعت دوستوں کو کھلاتے اور چھٹی ہونے پر بڑے ابا کے یہاں یعنی ہمارے گھر بھوک سے بلبلاتے ہوئے آتے اور آتے ہی کہتے۔ "سفید بی! لہسن کی چٹنی لاؤ!" میری دو حقیقی بہنیں جو دونوں سے بہت بڑی تھیں کہتیں سالن سے کیوں نہیں کھاتے۔ انڈا تلوا لو، کباب منگوا دیں۔ یہ معلوم نہیں سفید بی اور بڑھیا کے لڑکے کو کیا دھن تھی کہ لہسن کی چٹنی مزے سے لے کر کھایا کرتے۔ یہ روز کی بات تو نہیں تھی ہفتہ میں دو ایک بار ایسا ضرور ہوتا۔ ان کی امی کو خبر ہوئی، انہوں نے بھی سمجھایا کہ اول تو ہمارا بھیجا ہوا کھانا دوسروں کو نہ کھلایا کرو اور اگر کبھی کھلا بھی دو تو گھر آ کر یا بڑے ابا کے گھر جا کر دال سالن سے روٹی کھایا کرو لیکن لہسن کی چٹنی کے چٹخارے سے وہ باز نہ آئے۔ میں لہسن کی بو سے بہت چڑتا ہوں۔ میں نے کہا سنو جی میاں تم لہسن کھا کر میرے پاس نہ آیا کرو، تم باتیں کرتے ہو تو مجھے لہسن کی بدبو آتی ہے۔ ایک روز آپ کو مجھ سے کچھ کہنا تھا۔ چٹنی روٹی کھا کر بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر جلدی سے کلی کی اور جلدی الماری سے

چار ماہ چین سے گزرے، [illegible] آتے تھے [illegible] آج [illegible] کے بدلے [illegible] کی [illegible] مجھے بہت [illegible] آتا تھا۔ [illegible] سب کے [illegible] سے [illegible] اترتے تھے۔ یہاں [illegible] کی ایک بات یاد آئی [illegible] اپنے [illegible] کے یہاں [illegible] گئے [illegible] آپ [illegible] سے [illegible] اس زمانے میں ایک [illegible] عام [illegible] میں [illegible] میاں [illegible] جواب [illegible] کی [illegible] گئے۔ [illegible] کا [illegible] آپ [illegible] ہوں۔ [illegible] ایک ہو گئی ہے [illegible] بہت متاثر ہو کر شفقت بھری دعائیں دیں۔ [illegible] کو نماز کر کے [illegible] اور بڑی [illegible] بھی فرمانے لگے۔ میری شادی [illegible] نہیں [illegible] کو [illegible] ہو کر [illegible] کی صورت دیکھی تھی۔ پھر [illegible] وہ تم سے چھوٹی نہیں بلکہ [illegible] بڑی ہے۔ ہماری شادی [illegible] ہونی چاہئے۔ آپ نے جواب [illegible] بہت دن سے [illegible] عشق [illegible] اور کسی کتاب میں پڑھ کر [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت خدیجہ رسول پاک سے ۱۲، ۱۵ سال عمر میں بڑی تھیں۔ [illegible] صاحب سے [illegible] بات ماننے کو کیا عمر [illegible] منظور کریں گے۔ [illegible] بھائی جان [illegible] بہت [illegible] منظور نہ تھا [illegible] اور خود اپنے ابا جو نہیں مانیں گے۔ [illegible] جان [illegible] تو وہ بھی [illegible] ہو جائیں گے یہ بات مجھ تک بھی [illegible] بعض خاندانی [illegible] کی وجہ سے اس تجویز سے متفق نہ ہو سکا [illegible] شوکت [illegible] بہن کے جذبات سے اس خوفناک اپیل پر اتر آئے کہ میں ریل کی پٹری پر لیٹ کر ٹرین سے کٹ جاؤں گا۔ میری بیوی [illegible] انہوں نے دو چار روز پہلے ایسے ہی معاملے میں کسی نوجوان کی خودکشی کی خبر پڑھی تھی۔ انہوں نے [illegible] ہو کر مجھے خبر کی۔ میں نے ایک خط اپنے والد کو لکھا اور دوسرا چچا جان کو، اس میں اپنا [illegible] شوکت کی خودکشی کی [illegible] تفصیل سے لکھ دی [illegible] سے والد صاحب نے تو یہ اطلاع دی کہ [illegible] کے بیٹے سے نسبت طے ہو چکی ہے اور [illegible] عنقریب [illegible] ہے۔ اب اس بات پر توجہ نہیں کی جا سکتی۔ چچا جان کا لکھنؤ سے خط آیا کہ محمد عمر کو فوراً واپس لکھنؤ [illegible] سخت علیل ہیں۔ شوکت لکھنؤ چلے گئے۔ تفصیلات تو معلوم نہیں۔ شاید وہاں بھی خودکشی پر آمادگی ظاہر کی اور جب [illegible] پولیس افسر باپ کے سامنے پیش ہو کر بھی اپنی ضد پر اڑے رہے تو انہوں نے اپنا بھرا ہوا ریوالور نکال کر سامنے رکھ دیا کہ بیٹے اپنے کو گولی مارلو، پھر ریوالور کی نالی ان کی کنپٹی پر چپکا کر کہا۔ اس جگہ گولی لگتے ہی بھیجا پاش پاش ہو جائے گا۔ بہادر بیٹے [illegible] ہو گیا اور جسم تھر تھرانے لگا، چچا جان یہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے ۔

ایں نہ عشق است ایں کہ در مردم بود

ایں فساد از خوردن گندم بود

بعد میں اس بہادر بہن نے از راہ مصلحت اندیشی مجھے اور اپنی بہن کو اس تجویز کا بانی قرار دیا کہ انہوں نے مجھے اس پر

تیار کیا تھا اور اس معصومیت سے بات رکھا کہ سب نے یقین کر لیا اور مدت تک یہ غلط فہمی باقی رہی۔ اسی کے ساتھ یہ سلسلہ بھی تھا۔ گھر والے یہ سوچ کر کہ لڑکا جوان ہو گیا ہے اور بیانات اور تقاضے ہو رہے ہیں جلدی سے شادی کر دینا چاہتے تھے اور کچھ عرصہ بعد دیر سے ہو گیا اور خاندان ہی میں ایک مناسب عزیزہ سے شادی کر دی گئی اور عزیزم شوکت کچھ دنوں تک اس انتظام میں ہچکچاتے رہ کر پھر اپنے بھائی جان کے پیارے بیٹے بن گئے۔ یہ قصہ تو بہت بعد کا ہے ذکر تو اس وقت کا ہے جب پہلے پہل انھوں نے اخبار "پھول" میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھا اور خود سے مزید فرمائشیں کیں۔ علاوہ "پھول" اخبار کے بچوں کے ایک ماہنامہ ... میں بھی ان کی طرف سے ہلکی پھلکی نظمیں چھپوائیں۔ ... ان کی تسکین ہوتی رہی اور ... جذبۂ شہرت پسندی اندر ہی اندر پلتا اور افادۂ طبع کے ساتھ مختلف طریقوں سے اس کا اظہار ہوتا رہا جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں "کچھ یادیں کچھ باتیں" میں انھوں نے خود لکھا ہے۔ وہ میری عزیزہ ... یا تخلص کا ذکر مشاعروں میں پڑھنے سے ہے۔ میں نے جب پہلے پہل ان کا تخلص شوکت سنا تو کہا کہ تم نے اپنی خالہ کا نام کیوں چرایا ... ان کی حقیقی خالہ ... ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ان کا نام شوکت جہاں ہے تو ... المتخلص بہ شوکت نے بتایا کہ ایک تو ارشد کے وزن پر ہے یا آسانی آپ کا منتخب شوکت مقطع بن جاتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ علی برادران کی اصل شخصیت سے نسبت دینا چاہتا تھا۔ مولانا محمد علی کے نام سے تو تخلص بنایا نہیں جا سکتا مولانا شوکت علی کے نام سے مدد ملی ہے۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ کافی عرصے کے بعد ... ابن ... سے رسالوں میں ساتھ ساتھ ... پھیلائی کہ اس کے پیچھے علی برادران کے تتبع میں "تھانوی برادران" کہے جائیں۔ اور رفتہ رفتہ لکھنؤ کے ایک حلقۂ احباب میں یہی تھانوی برادران ہی کہا جانا۔ ... میری شادی ان کی بڑی بہن سے ۱۹۱۰ء میں ہوئی جب یہ ۱۲ برس کے تھے۔ اس جدید رشتے سے برادرِ عزیز نے فائدہ اٹھا کر اپنی فطری شوخی و شرارت کا استعمال مجھ پر بھی شروع کر دیا اور وہ گل کھلائے کہ مجھے کتنا پچھتانا پڑا۔ اسے روشنیِ طبع تو ... بلا شک ... میں ہی ایک گھر کا کوئی فرد ماں، باپ، بہن، بھائی خاندان کے دیگر افراد اس کی دلچسپ اور برمحل فقرہ بازی سے محظوظ ہوتے مگر محفوظ ہوتے تھے۔ ۱۹۰۸ء کا ذکر ہے لکھنؤ میں ایک سکھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سردار مل سنگھ کوتوال شہر تھے۔ ننھے شوکت اپنے ابا کے ساتھ کبھی کبھی ان کے یہاں جاتے اور ... بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ میں بھی لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ عزیزِ گرامی مجھے دیکھتے ہی باغ و بہار ہو گئے کیونکہ ان کی ذہانتوں کی داد گھر بھر میں میں ہی دیا کرتا تھا۔ سب سے پہلے ... کہ موقع ملے تو کوئی کارنامہ دکھا کر داد لیں کیونکہ یہ داد بیشتر فقروں کے ساتھ مادی صورتوں میں بھی ہوتی تھی۔ اتفاق سے میری بیوی باورچی خانے پر جا کر نہانے لگیں۔ جب نہا چکیں تو کسی ضرورت سے گلشن خادمہ کو پکارا۔ بہن کی آواز سن کر بطور سعادت مندی آپ اوپر پہنچ گئے اور وہاں جاتے ہی چیخ چیخ کر مجھے پکارنے لگے۔ بھائی جان! بھائی جان! جلدی آئیے۔ میں گھبرا کر زینہ پر چڑھا کہ نہ معلوم کیا غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا۔ دیکھا تو ان کی باجی نے سر کے بالوں کو نچوڑ کر ماتھے کے اوپر جوڑا سا باندھ لیا ہے۔ چادر اوڑھے چوکی پر بیٹھی تنگ مہری والا سوتی شلوار گھٹنا دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر پہن رہی تھیں۔ شوکت بولے: "دیکھئے بھائی جان! سردار مل سنگھ بن بیٹھی ہیں۔" ان کی باجی ہنس کر سور، پاجی، بدمعاش بنانے لگیں اور حضرت ہنستے ہوئے بھاگ گئے۔ ان ہی دنوں کا ذکر ہے، میرے ایک دوست ابوتراب المتخلص بہ طرب مجھ سے ملنے آئے۔ کہنے لگے اب کے بہت دنوں میں لکھنؤ کی طرف توجہ کی کوئی تازہ غزل سنائیے۔ میں نے بیاض اٹھا کر ایک مطلع پڑھا، وہ کچھ چونک سے پڑے مگر کہا کچھ نہیں۔ میں نے بعد کا شعر پڑھا۔ بولے، ذرا ٹھہریئے یہ غزل آپ نے کب کہی ہے

[illegible] ہوتے۔ کہنے لگے آؤ [illegible] شعر [illegible] ہے [illegible] چپکے چپکے جالی شوکت نے [illegible] سب نے بہت [illegible] وہ شوقین [illegible] کی برائی [illegible] ہوتے [illegible] پھر [illegible] اصل بات بھول گئے۔ اور سے جانے کے بعد میں نے شوکت [illegible] پوری غزل [illegible] کرو اور خود بھی لکھنے کی کوشش کرو۔ [illegible] غزل نہ ہو سکے تو [illegible] کر دوں گا۔ پھر [illegible] ہو [illegible] طبیعت موزوں ہو گئی تو اپنی [illegible] کا ثبوت [illegible] ایک مصرعہ [illegible] پر [illegible] ایک [illegible] کا بیوہ [illegible] اندر [illegible] بڑے [illegible] عاشق [illegible] ہوتے [illegible] ہوتے۔ [illegible] صاحب [illegible] ہوتے [illegible] ہوتے۔ آپ بھی [illegible] شوکت [illegible] کرتے تھے۔ [illegible] باتوں میں اس تھوڑی غزل کا ذکر آیا [illegible] آکر بولے۔ سمجھ نہیں [illegible] بہت [illegible] ہو گئے ہیں۔ [illegible] پر بحث [illegible] کے [illegible] گئے تھے۔ [illegible] پہلے سا اس مطلع تھا ــ

ہم ذوق نظر [illegible] تائید نہیں کرتے
اس درجہ بھی کورانہ تقلید نہیں کرتے

اب وہ اس طرح ہو گیا تھا ــ

ہم روزے تو رکھتے ہیں پر عید نہیں کرتے
اس درجہ بھی کورانہ تقلید نہیں کرتے

دوسرا شعر تھا۔ ــ

ہم اہل وفا کو تم الزام دیے جاؤ
ہے پاس ادب مانع تردید نہیں کرتے

شوکت نے بہت ہی واہیات مگر دلچسپ مصرع لگایا ــ

ہم گھاس تو کھاتے ہیں پر عید نہیں کرتے
ہے پاس ادب مانع تردید نہیں کرتے

اس کے بعد شوکت برائے تخلص نہیں بلکہ کافی حد تک شعر کہنے لگے اور مشاعروں میں دھڑلے سے جانے لگے۔ پھر بھی کبھی کبھی مجھ سے رجوع کرتے رہتے تھے۔ ایک بار جبکہ میں ریاست سیرپور کے ایک بعید علاقہ میں تحصیلدار تھا، لکھنؤ سے آئے۔ کہنے لگے کل فیض آباد کے مشاعرہ میں جا رہا ہوں۔ پیشانی دیکھتا ہوں، لگی ہی دیکھتا ہوں، ردیف و قافیہ ہے مگر عنوان دیکھتا ہوں نہیں بندھا میں نے ذرا تامل کے بعد کہا، یہ شعر کیسا رہے گا ؎

پڑھا ہے میں نے ہر افسانۂ عشق

تمہی کو زیبِ عنواں دیکھتا ہوں

پسند کر کے اپنی بیاض میں ٹانک دیا پھر کہا میری ایک اور غزل ہے ؎

حجابِ حسن کی توہین ہے حجاب نہ کر

"اس میں "خواب نہ کر" بھی ہونا چاہئے"۔ میں نے کہا "تمہارے ڈھنگ سے تو ہوا نہیں ہے، چاہو تو کہہ لو ؎

مجھے اذیتِ بیداریٔ دوام نہ دے

دکھا دکھا کے مجھے اہتمامِ خواب نہ کر"

کہنے لگے "بہرصورت قافیہ تو آگیا"۔ یہ تو شوکت کی ابتدائی مشق کی باتیں ہیں، پھر تو اس نے اتنی غزلیں کہیں کہ چند سال بعد ہی دیوان مکمل کر لیا جو بعد میں "گہرستان" کے نام سے چھپ کر شائع بھی ہو گیا۔ اگرچہ شاعری میں اسے کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں ہے، پھر بھی ایک خاص انداز اس کا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی۔ نواب چھتاری کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ خان بہادر معین الدین کلکٹر یا ڈپٹی کلکٹر اس کے باضابطہ سیکرٹری تھے مگر اس کے تمام فرائض شوکت انجام دے رہے تھے۔ میں بھی مشاعرہ میں بلایا گیا تھا۔ شوکت کی دن رات کی مصروفیت دیکھ کر میں بھی اکتا جانے لگا۔ شوکت نے مجھ سے کہا "غالب کا مصرع ہے ویسے تو ہم کو تقلیدِ تنک ظرفی منصور نہیں۔ مجھے فرصت نہیں مل رہی ہے جو سکون سے بیٹھ کر غزل کہوں آپ ہی میرے لیے غزل کہہ دیجئے۔ میں نے کہا، میری کہی ہوئی غزل کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ شوکت نے کچھ سوچا، پھر کہا "اچھا 'طور' کا قافیہ تو موزوں کیجئے"۔ میں نے کچھ سوچا پھر کہا، سنو ؎

جلوہ یوں عام ہو تیرا مجھے منظور نہیں

میری دنیا میں کہیں برق نہیں طور نہیں

شوکت نے اتنی دیر میں خود بھی مطلع کر لیا تھا۔ کہنے لگا میں نے اس طرح سوچا ہے ؎

بے حجابی ہی تری بزم کا دستور نہیں

ورنہ وہ کونسا ذرہ ہے جو خود طور نہیں

میں نے ہنس کر کہا جس طرح مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب! اسی طرح تھانہ بھون، تھانہ بھون ہے اور لکھنؤ، لکھنؤ! تم اپنی غزل خود کہو اور میں اپنی غزل آپ۔ شوکت نے کہا، ٹھیک ہے اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ! حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو موزوں طبع تو سمجھتا ہوں مگر شاعر نہیں، یہی رائے میری شوکت کے متعلق بھی ہے۔ آخر میں شوکت بھی اسی نتیجہ پر پہنچ گیا تھا اور سنجیدہ بیانی

بہار میں شعر و ادب کی محفلیں [illegible] سے ہے۔ پھر انہوں نے مجھے چند سال پہلے کہا تھا جب میں لکھنؤ
سے اشعار کی بہت سی کتابیں [illegible] کی گئی تھی۔ وہ درحقیقت صاحب ذوق [illegible] اور انہیں سے لکھنؤ [illegible]
جایا جاتا تھا۔ لکھنؤ کے جن مشاعروں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے ساتھ وہ دن کے قریب سے الٰہ آباد اکیڈمی کے اجلاس بھی
منعقد ہوتے۔ شوکت کو اس میں لکھنؤ سے ایک مقرر تھا جو باہر سے آنے والے شعراء کی تعداد کافی ہوتی [illegible]
وقت میں گھر سے جاتے تھے۔ [illegible] مقررہ پہ جلسے کا آغاز ہونے والا تھا میں سوچ رہا تھا ضرورت سے [illegible]
نے پہلا شرکت کر آگا۔ شوکت کی والدہ نے [illegible] باتوں کے جواب ہوئے تھے [illegible] میں جا کر
ہر مقالہ پڑھنا ہے اکیڈمی کا جلسہ شروع ہونے والا ہے جلدی سے اٹھو۔ وہ اشاروں کو [illegible] ساتھ چلنے کو تیار نہ ہوا۔
کہ آپ ناشتہ کر کے چلے جائیے مجھے ابھی شیو کرنا ہے اور مقالہ لکھنا ہے۔ مجھے بڑی حیرانی ہے کہ [illegible] کرتے۔ وہ
وہ بھی دوسری ضروریات کی تکمیل کے بعد۔ بڑی بے چارگی سے شوکت سے جواب دیا۔ آپ نے تو بہت [illegible] مقررہ وقت
جلسہ ہے۔ اتنی فرصت مجھے کہاں ہے اور [illegible] میں [illegible] سے فارغ ہو کر ناشتہ [illegible] گیا [illegible]
وقت مقررہ پر شروع ہو گیا۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ گزرا ہوگا، دوسرے مقرر مولانا عبدالماجد دریابادی کی [illegible] ختم ہو چکی [illegible]
پہلے [illegible] تھا کہ شوکت آتے یا نہیں۔ دل میں مایوس تھا کہ اپنی باری پر وہ آسکیں گے [illegible] وقت آخر کوئی [illegible]
مولانا عبدالماجد جیسے ہی ڈائس سے اترے اور شوکت بڑے اطمینان سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ [illegible] اور شوکت نے پوری
پُر مغز تقریر شروع کی جس میں بیرونی حضرات کے ان تصورات کو [illegible] رنگ [illegible] لکھنؤ کی [illegible]
روایات پر مبنی تھے۔ شوکت کو بہت ہی پسند کیا گیا اور کئی روز تک تعریف ہوتی رہی۔ اگر یہ کہتا کہ اس مقالہ کی [illegible] بھی ہے اور
یہ بھی ایسی روا روی اور کم وقت میں تکمیل کی گئی ہے تو کوئی یقین نہ کرتا۔ میں نے واپس گھر جا کر اس کی مزید تصدیق [illegible] تحقیق کی کہ
پہلے کوئی یادداشت یا ابتدائی حصہ اس کا لکھا ہوا رکھا تھا تو معلوم ہوا مطلق نہیں۔ انشاء اللہ خاں کے قول کو [illegible] تھا جس کو انہوں نے
ذہنی کانوں سے سن کر کہا ہے

کہتا ہے یہ خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

مگر شوکت کا قلم پوری تیزی کے ساتھ اس کے خیالات کا ساتھ دیتا تھا۔ عموماً لوگوں کی زبانِ قلم کچھ اور ہوتی ہے اور زبانِ ذہن کچھ اور مگر شوکت کی دونوں زبانیں ایک تھیں، اس کے قلبی و ذہنی احساسات کی ترجمانی پوری بے ساختگی کے ساتھ اس کی زبان کرتی۔ اسے اپنی نسبت اہل زبان ہونے کا بھی یقین تھا گو وہ اس کا اظہار کبھی صراحتاً نہیں کرتا تھا اور [illegible] سے اس پر اپنی باجی سے [illegible] کیا کرتا رہتا تھا۔ ایک وضع ایک نئے رنگ کی شیروانی بنوائی۔ خوش پوشی کا ذوق ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہا اور ساتھ شوقِ نمائش بھی مگر [illegible] انداز میں نہیں۔ نئی شیروانی پہن کر اپنی چھب دکھانے بڑی بہن کے پاس آئے اور کہا 'باجی دیکھو دھانی شیروانی!' باجی نے گرفت کی 'دھانی چوڑیاں سب کہتے ہیں، دھانی شیروانی تم سے ہی سنا ہے۔' شوکت نے کہا 'باجی! آپ اب زیادہ تر بھوپال میں رہتی ہیں۔ لکھنؤ میں مستقل رہنے والوں کی زبان پر آپ اعتراض نہیں کر سکتیں۔ بھائی جان اہل زبان تو نہیں مگر زبان داں ضرور ہیں ان سے پوچھ لیجئے میں نے دھانی کا صحیح استعمال

کیا بھیا غلط تو نہ تھا۔ ہو چکی تھیں وہ میری اہمیت اپنے مقابلہ میں کیسے مان لیتے۔ کہنے لگے تم تو بھائی ہمارا کرے پہ نمبر ہی کر دیتے ہو، میرا پہچ شہر میرٹھ، آس پاس کے قصبات، مظفر نگر، تھانہ بھون، پھیول اور کہو وہاں لکھا ہے، کیا پیشہ کر شعر درست کر لیا ہے۔ تمہارے شعر و عروض درست کرتے رہے ہیں، تم ہی ان کی دھاک مانو۔ میں اور مجذوب صاحب بھائی کی باتیں سن رہے تھے قوافی کا بدلہ مجھے فوراً پڑھا اور شوکت سے کہا: ملبوسات کو بھی ان کے رنگ کی مناسبت سے دھانی کہا جاتا ہے۔ میری ہری اوڑھنی ہیں! کیا پیاری دھانی لگتی ہے۔ میں نے کہا: نہیں جناب لکھنؤ اور اس لکھنؤ میں جو خالص شاہی لکھنؤ تھا اور امانت نے اندر سبھا لکھی تھی سبز پری کہتی ہے ؎

مخمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں

شوکت نے یہ شعر سن کر اصل بات کا رخ تذکیر کی طرف پھیر دیا اور میرا ماں یہ اتنا پھیر پھیر کر پڑھنا شروع کر دیا ؎

مخمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھرا ہوں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پرا ہوں!

پہلے سے پرا تو شوکت نے فوراً ہی بنایا تھا، ایسی تانیث سے تذکیر کا قیاس فقط ساٹھ برس کی عمر میں بنایا۔ عمر میں ہی شوکت کے نئے گھر میں بیٹھے ہوئے میں نے نوکر لڑکے کو آواز دی "کنٹے اگڑے!" زہرہ بیگم شوکت کی پنجابی دلہن نے کمرہ سے نکل کر پوچھا "بھلا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!" "لڑکے سے چائے بنانے کو کہا تھا!" شوکت سمجھ گئے کہ میری مراد کیا تھی، ہنس کر کہنے لگے "کڑی" پنجابی میں لڑکی کو کہتے ہیں مگر لڑکے کو کڑا نہیں "منڈا" کہتے ہیں۔ شوکت کی ادبی دیانت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ میری نوشتہ کتابوں، غزلوں وغیرہ کے اپنے نام سے شائع ہونے کا اظہار اپنی کتابوں اور مضمونوں میں بارہا کیا ہے۔ اگر وہ اس جرأت اخلاق سے کام نہ لیتا تو میں بھی اس مضمون میں ان کو حذف کر دیتا۔ جب اس کی صلاحیت پورے طور پر ابھر آئی تو بڑے بڑے ادبی لطیفے نظم اور نثر دونوں میں اس سے سرزد ہوئے۔ ایک بار خواجہ عزیز الحسن جو بربنائے نیک نفسی ڈپٹی کلکٹری کرتے کرتے کوشش کر کے انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ پر منتقل ہوئے اور خان بہادر ہونے پر کبھی اس خطاب کا استعمال اپنے نام کے ساتھ جائز نہ رکھا، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ مشاعرہ میں غزل پڑھنے بیٹھے، مجذوب تخلص کرتے تھے اور بڑی وارفتگی کے عالم میں غزل پڑھتے تھے اہل محفل ہمہ تن گوش سنتے۔ مجذوب صاحب نے مطلع پڑھا ؎

کیا سے کیا تو نے یہ اے شوق فراواں کر دیا
پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کر دیا

یہ سن کر شوکت سے ضبط نہ ہو سکا۔ خواجہ صاحب کو روک کر کہنے لگے پہلے میرا مطلع سن لیجئے۔ حاضرینِ مجلس نے بہت کچھ کہا کہ غزل پوری کر لینے دیجئے پھر آپ ارشاد فرمائیے مگر شوکت کہاں ماننے والے تھے، آخر اجازت مل گئی تو پہلے آپ نے خواجہ صاحب کا مطلع دہرایا اور مصرعہ ثانی پہ زور دیا کہ پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں کر دیا اور کہا میں عرض کرتا ہوں ؎

کیا سے کیا بیرم کو اکبر تو نے ہاں ہاں کر دیا
پہلے خاں پھر خانِ خاں، پھر خانِ خاناں کر دیا

یہ کار ہو گئی تھی کہ اتنے میں جناب صاحب سے ملنے والے آ گئے تھے، وہ رخصت ہو گئے۔ شوکت بہاری کے جانے والے تھے تو
بات کرنے کی جرأت کرتے تھے کہ کمرے میں داخل ہوئے۔ جب ان کے سامنے گئے تو وہ بات ختم ہو چکی تھی، جواب دینے سے گریز کرتا گو

جناب جاوید احمد قریشی

جب یہاں رہتے اور پوچھا جاتا کہ شوکت کا حال کیا ہے تو ہنستے ہوئے بتانے سے انکار کر دیتا۔ ان کی عمر ... اور ان کی شخصیت کی جھلک
... خیال ہو چکا تھا۔ وہ خاندان کی ساری چہل پہل سے دور ہونے کے بعد گھر کے زیور ... زور تھا، چلے گئے۔ ... ان کی ... جس ... میں
... کا اہتمام کر رہے تھے۔ وہ کمال حیثیت کے آدمی تھے جو اس وقت پر کسی مشکل سے گئے ... ذوق سوال
... صاحب ... کی بحث کی تھی، بہادر آپ کی ... شوکت نے ... جواب دیا۔ آپ ... تعجب ہو
... یہ لوگ اپنی بیٹیوں اور بچیوں کی شادی ہی کیا کرتے ہیں۔ چھیاں بھیجنے والے حضرت کو جیسے ... کہ ...
تھے۔ ایک صاحب جو بات میں آئے تھے اور ... تھے۔ بار بار شوکت پر جذبے ہوتے تھے ... سب ...
... دور ... چلے آدمی تھے۔ شوکت سننے اور بیٹھے رہے۔ جب وہ ارادہ ... قابل ... کے ... مگر
بیٹھے تو شوکت بڑے صاحب انداز میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور پوچھا ... سے ... گا۔ میری
یہ بہت ہی بڑی بلند درخواست ہے۔ وہ اور بعض دوسرے احباب ... اور ... بارہ ... نہیں لگے
ان سیاہ فام صاحب نے اپنے آپ کو کالا پا کر بڑی خندہ پیشانی سے ... ارشاد ہے؟ شوکت نے ... عاجزانہ انداز
میں کہا: جب آپ وفات پانے لگیں تو مجھے اطلاع دے دیجئے گا۔ میں آپ کی کھال کا شوٹ کیس بنواؤں گا۔ یہ سنتے ہی قہقہوں کی
آوازیں بلند ہوئیں۔ ہر شخص ان کی طرف دیکھتا اور ہنستا تھا۔ ان حضرت پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شوکت کے والد اور والدہ اپنے عقیدے کی
سخت عورتوں کے پردے کے شدید پابند تھے۔ ایسے کہ جب میں خلاف ارشد ان کی صاحبزادی کو لکھنؤ سے لے کر بھوپال جاتا
و ... میں گاڑی تبدیل ہوتی تو چچا جان ریلوے اسٹیشن کے سب انسپکٹر کو تار دے کر ... کے ایک طرف سے دوسری طرف
جانے کے لیے ڈولی کا انتظام کرا دیتے۔ میں نے پھر بھی حضرت گنج لکھنؤ کی انگریزی دکان میں جا کر اپنا ... شوکت کا ... اس کی چھوٹی
بہن کا یکجائی فوٹو گروپ تیار کرایا۔ شوکت تو گھریلو معاملات میں میرے قدم بقدم چلا کرتے تھے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو انہوں نے
بھی یہی جرأت ظاہر کی۔ میرا واقعہ تو کھل چکا تھا مگر انہوں نے فوٹو احتیاط سے رکھے۔ میں لکھنؤ گیا تو مجھے خوش ہو کر دکھائے۔ میں
نے ایک فوٹو لے کر اپنے بکس میں رکھ لیا۔ اس زمانہ میں شوکت میرے ایک دوست کے خلاف مقامی رسائل اور اخبارات میں
مضامین لکھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے شکایت کی۔ میں نے تنہائی میں شوکت کو سمجھایا اور باز رکھنے کی کوشش کی۔ جواب ملا کہ
بھائی جان آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر مگر میری شخصی ذمہ داریاں بھی کچھ ہیں۔ یہ فرض تو بہر صورت مجھے انجام دینا ہی پڑے گا۔ مجھے بھی
ایک ترکیب سوجھی۔ میرے چچا جان ان دنوں بھوپال گئے ہوئے تھے اور لیاقت علی کے یہاں مقیم تھے۔ میں نے شوکت سے پوچھا، چوک کے
ڈاک خانہ میں کتنے بجے تک رجسٹری مل جاتی ہے۔ کہنے لگے وقت ختم ہو گیا۔ کیا آپ کو کوئی رجسٹری کرنا ہے۔ میں نے کہا ہاں! ــــ
لیاقت علی کو تمہارا اور شوکت دلہن کا فوٹو بھیجا ہے کہ مبارک ہو۔ آپ کے آزاد خیال بھتیجے نے اپنی دلہن کے ساتھ فوٹو کھنچوایا ہے
یہ سنتے ہی شوکت گھبرا گیا۔ وہ جب سے خودکشی کی دھمکی کے نتیجہ میں بھرے ہوئے ریوالور کو کنپٹی سے مس کرا چکے تھے، باوجود تنہائی

شنوسیوں کے اپنے آبا سے بہت ڈرنے لگے تھے۔ پہلے تو مذاق سمجھے سب میں نے سنجیدگی برتی تو کہنے لگے۔ حالات جس طرح بدل رہے
سخت حالی ہیں۔ یہ مرد خود وہ اپنا کو دیں گے اور اب مستقل ہو کر یہاں آتے ہی سب کو ل بار دیں گے۔ میں نے کہا مسلمان جہاں ہیں
چچا جان کے احسانات خاندانی اور ایمانِ دینی کی حفاظت کرنا میری بھی شخصی ذمہ داری ہے۔ یہ فرض تو بہر حال ادا کرنا ہی ہے۔ اللہ
ہم گئے میری نافرمانی کا علاقہ ہے۔ پھر ارشاد ہوتے بولے' میں آپ کے دوست کی مخالفت میں کچھ نہ کہوں گا۔ مگر اتنا ہے
پھر تو آپ سرپرست مجھ کو رجسٹری نہ کریں گے۔ چنانچہ معاملہ طے ہو گیا لیکن شوکت نے میرے نیاز کا اہتمام کیا برس پھر اس طرح لیا
کہ ایک بار میں بیوی بچوں کو لکھنؤ بھیج کر بھوپال واپس آ رہا تھا۔ شوکت اور ان کے ماموں زاد بھائی محمد اسلم، محمد اکمل اور میرے بھتیجے
۱۰۶۱ مجھے پہنچانے اسٹیشن آئے۔ قلی نے سامان گاڑی میں رکھا۔ میں پلیٹ فارم پر ان لوگوں سے باتوں میں مشغول تھا۔ شوکت ڈبہ میں
میرا سامان رکھوا رہے تھے۔ وہاں ایک مرد معقول اور بیٹھے تھے۔ شوکت نے ان سے کچھ کھسر پھسر کی اور جب میں ٹرین میں سوار ہوا تو
بستر کھول کر بچھایا کیونکہ رات کے ۱۰ بجے تھے۔ پھر یہ کہہ کر میرے جوتے کے تسمے کھولنے لگے کہ آرام سے لیٹ کر سو جائیے۔
میں نے کہا بھی کہ یہ سعادت مندی کیوں فرمائی جا رہی ہے۔ بڑی معصومیت سے باتیں کرکے رخصت ہو گئے۔ جب ٹرین چلی اور
میں نے پاؤں پھیلانے کو ڈبہ کھولا تو ایک گلوری ان ہم سفر کو بھی پیش کی۔ انہوں نے سر کو پیچھے ہٹاتے ہوئے بسلسلہ نہیں نہیں میں پان
نہیں کھاتا! حالانکہ ان کے سرخ ہونٹ ان کے پان خور ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ میں اس زمانہ میں سگریٹ بھی پیتا تھا
تھوڑی دیر بعد میں نے سگریٹ کیس ان کی طرف بڑھایا کچھ بوکھلاتے ہوئے لہجے میں اس سے بھی انکار کیا۔ وہ اک باتیں کہیں تو کچھ
مختصر سے جواب دے کر اور سرک کر بیٹھ گئے۔ میں یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ وہمی سے آدمی ہیں۔ جب گاڑی کانپور کے قریب گنگا
کے پل پر پہنچی تو میں یہ دیکھنے کو اٹھا کہ چاندنی میں سطح آب پر کیا دلچسپ منظر ہے تو وہ صاحب کھڑکی کے آگے کو بیٹھ گئے اور
کہنے لگے۔ آرام سے لیٹے رہیے جھانکیے نہیں۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ صاحب ضرور کھسکے ہوئے ہیں۔ میں نے ڈانٹ کر
کہا بھی کہ آپ کوئی خدائی فوجدار ہیں مگر وہ مزاحم بنے رہے اور عاجزانہ درخواست کرتے رہے کہ کھڑکی سے سر نہ نکالئے۔ میں یہ
سوچ کر چپ ہو رہا کہ فاترالعقل معلوم ہوتا ہے۔ کہیں الجھ نہ پڑے۔ اور گاڑی کانپور اسٹیشن پر رک کر آگے روانہ ہو گئی۔ میں سو گیا۔
ٹرین لیٹ ہو گئی تھی۔ جھانسی پہنچنے سے پہلے ہی دن نکل آیا۔ ایک صاحب کسی درمیانی اسٹیشن سے سوار ہوئے اور پہلی سیٹ پہ دراز
ہو گئے تھے۔ صبح ہوتے ہی وہ اٹھے، میں بھی بیدار ہو گیا تھا۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ صاحب بڑے تپاک سے بڑھے اور السلام علیکم کہہ کر
بولے' عظیم صاحب آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟ یہ صاحب [illegible] انسپکٹر پولیس اور میرے ملاقاتی تھے۔ میں نے
بتایا کہ بیوی بچوں کو پہنچانے ایک ہفتہ کی رخصت پر لکھنؤ گیا تھا۔ وہ مرد معقول جن کا رویہ مجھ سے بہت نامعقول تھا حیران ہو کر ہماری
باتیں سنتے رہے، پھر معذرت آمیز لہجے میں کہنے لگے، صاحب معلوم ہوتا ہے مجھے بیوقوف بنایا گیا تھا۔ یہ صاحب جو لکھنؤ اسٹیشن پر
بہت ہی ادب و احترام سے پیش آ رہے تھے وہ کون تھے؟ میں نے کہا "شوکت تھانوی!" بے ساختہ کہہ اٹھے' ارے!
کیوں! یہ ہو شوکت تھانوی، شوکت تھانوی جو لکھتے ہیں۔ جناب کا اسم گرامی؟ میں نے کہا، ارشد تھانوی! کہنے لگے وہ تو آپ
کے چھوٹے بھائی ہیں؟ میں نے کہا' جی ہاں! کم زاد' مزید بیان [illegible] بھی سن کر ہنسے اور بتایا کہ آپ کے سوار ہونے سے پہلے
انہوں نے مجھ سے بڑے نیازمندانہ لہجہ میں کہا تھا کہ آپ اگر دور تک جا رہے ہوں تو ان کا خیال رکھیے گا۔ یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔

، مرزا صاحب ادبی و شعری ذوق کے مالک تھے، وہ مسلمان تھے [illegible] تو ہو لیے ہیں مگر
بہت سے موضوع پر بات کرنے کے لیے شوکت تھانوی کے اس [illegible] سے جانا [illegible] کہ وہ بیچارے [illegible] ہو جاتا ہے۔
ایسے ہی آپ کی مخالفت اور تواضع سے [illegible] تھا۔ ان حضرت نے [illegible] کسی [illegible] سے پہچانے نہ دیا۔
سبب ہے کہ [illegible] اگر آپ نے [illegible] میں نے [illegible] شوکت سے
[illegible] آپ کی [illegible] مجھے [illegible] پاگل بنا [illegible]
[illegible] یہ قصہ [illegible]
ہندوستان سے لے کر پاکستان تک اپنے [illegible] احباب میں ایک دلچسپ داستان [illegible] رہتے ہیں تو
[illegible] جاتی ہوں، جان چھڑانے والی [illegible] کی زبان [illegible] سے [illegible] تھی۔ شوکت [illegible] تھا
[illegible] وہ ایک [illegible] خاص [illegible]
[illegible] بچا جان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد [illegible] شوکت [illegible] سے بہت [illegible]
[illegible] اس کو کچھ دو۔ میں نے کہا آپ کس وقت میری [illegible] میں اس کو [illegible]
کی طرح سمجھا دوں گا۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور [illegible] بیٹھ کر [illegible] شوکت سے کہتی
تمہیں بیاہ پر تو تمہارا بھائی نہیں [illegible] ہے [illegible] آئے دیکھ کر شوکت نے [illegible] ہاں! شیخ کو آپ میرا
[illegible] آپ کا [illegible] رشتہ مناسب نہیں۔ [illegible] بیچاری اس کا مفہوم نہیں سمجھیں۔ میں نے کہا [illegible] ہاں سے
تو مذاق سے [illegible] نہیں [illegible] جواب میں ایک پیاری سی مسکراہٹ تھی۔ ایک بار [illegible] کے ریلوے انسٹیٹیوٹ میں ایک مشاعرہ
ہوا۔ بھوپال سے میں اور [illegible] بھی مدعو تھے۔ [illegible] ایک [illegible] صدر تھے
شوکت تو عموماً مشاعروں کے [illegible] طور پر [illegible] ہوا کرتے ہیں وہ سیکرٹری شپ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اگلے
صفوں پر خواتین کی نشست تھی، ان میں شوکت کی دلہن بھی تھیں جو [illegible] اور شوکت کے ساتھ گئی تھیں۔ کافی وقت
گزرنے پر ایک ایک دو دو کر کے سب بیگمات چلی گئیں، شوکت کی دلہن اس لیے بیٹھی رہیں کہ ان کے ساتھ گھر آئیں۔
صدر مشاعرہ نے شوکت سے کہا، یہ ایک بیچاری بہت دیر سے اکیلی بیٹھی ہیں۔ شوکت نے کہا، کہئے تو آپ کے پاس لاکر
بٹھا دوں۔ صدر صاحب نے پوچھا یہ ہیں کون؟ شوکت نے بڑی سادگی سے جواب دیا 'میری بیوی ہیں۔' جناب صدر کچھ جھینپ کر
رہ گئے۔ ان کا نام یاد نہیں، شاید حلیم تھا یا صدیقی، شوکت کی یہ بیوی ایک محترم عزیز عالم [illegible] کی بیٹی ہیں۔ بعض رکاوٹوں کی وجہ سے
میں ان کی شادی کی تقریب میں شریک نہ ہوا تھا، بعد میں لکھنؤ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر شوکت تھانوی مولوی محمد عمر بنے ہوئے ہیں اور
پانچوں وقت کی نماز پوری پابندی سے پڑھتے ہیں۔ سعیدہ خاتون فرائض مذہبی کی پوری پابندی کرتی ہیں۔ سسرال میں آتے ہی اپنے
شوہر کو بھی پکا نمازی بنا لیا۔ میں نے شوکت سے کہا، تم نے بڑا غضب کیا کہ حضرت عمر فاروق کی آنکھیں حضرت صدیق اکبر کے
سامنے نیچی کر دیں۔ حضرت ابوبکر نے عالمِ ارواح میں حضرت عمر سے کہا کہ تمہارے ہم نام پوتے کو ابنِ صدیق نے خدا کے حکم سے
نماز نہ پڑھی، رسول کریم کے ارشاد کی تعمیل میں نماز کی پابندی نہ کی۔ والدین، بزرگوں، استادوں کی ترغیب پیار اسے نمازی پر آمادہ

نہ ہوا! ایسے سخت تارک الصلوٰۃ کو میری پہلی سعیدہ نے نمازی بنا دیا۔ تو کہو چاہیے تھا کہ بیوی کے دباؤ میں آ کر خود تو کیا نماز پڑھتے خود بیوی کو بھی تارک الصلوٰۃ بنا دیتے۔ جب جی چاہے توبہ استغفار کر کے دل کا حال ہی جاتے۔ اس وقت تو یہ بات آئی گئی ہو گئی مگر ۳۱، ۳۲ برس بعد شوکت نے بہت ہی پرلطف طریقہ پر اس کا اعادہ مسز معین الدین کی کوٹھی پر کراچی میں کیا۔ پرلطف نثر اور مشاعرے کے جب سب ہی مراحل طے ہو گئے تو شوکت نے لکھنؤ کی روضہ والی عورتوں کی نقل مجلس کے مجمع میں کی جو گلی تصویروں کی کتاب کے ورق الٹتی ہوئی کہتی جاتی تھیں: "یہ بی بی فاطمہ کا لوٹا ہے جس سے وہ وضو کیا کرتی تھی، یہ اس عورت کی تصویر ہے جس نے اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر فقیر کو دودھ پلایا۔ اب وہ سانپ اس کا دودھ پی رہے ہیں وغیرہ وغیرہ" شوکت نے یہ سب دہراتے ہوئے کہا: "اور یہ سید محمد جعفری کی تصویر ہے جس نے خدا کے حکم سے نماز پڑھی نہ رسولؐ کے حکم سے، نہ ماں باپ کے حکم سے، گھر والی کے حکم سے بلا چوں و چرا نماز پڑھنے لگے۔ قیامت کے روز ایک قوام کے ملتے پر سہولت سے پڑا ہوا اگلے گا، دوسرے جگنو کی دم" اس آخری فقرہ پر ساری محفل کشتِ زعفران ہو گئی۔ مدتوں پہلے کی وہ باتیں جو میں بطور مزاح کہتا تھا شوکت اپنے لطیف اضافوں سے کہیں کا کہیں پہنچا دیتا۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ ریاست بھوپال کے ایک دور افتادہ سب ڈویژن میں بحیثیت تحصیلدار، منصف و مجسٹریٹ پرگنہ میں متعین تھا۔ تو شوکت وہاں گئے۔ میرا مستقر "سیہلون" نام کی بستی میں تھا۔ وہاں سے ریلوے اسٹیشن "باموره" کا فاصلہ دس بارہ میل تھا۔ سڑک خام، بیل گاڑیاں آتے جاتے تھے۔ شوکت نے واپسی کا قصد کیا اور کہا کہ لکھنؤ جانے والی ٹرین شام کو چار بجے جاتی ہے۔ میں ابھی سے باموره چلا جاؤں۔ ان کی باجی نے کہا دوپہر ہو چلی ہے، دھوپ کی تیزی میں نہ جاؤ۔ میں نے کہا: شام کو جانا۔ اسٹیشن ماسٹر میرے ملاقاتی ہیں وہ پلیٹ فارم پر ہی تمہارے پلنگ بچھوا دیں گے۔ رات کو آرام سے سونا سویرے تمہاری گاڑی ملے گی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر چلنے لگنا ناشتہ کے ساتھ تازہ چائے بھی وہی پلا دیں گے۔ چھوٹا اسٹیشن ہے وہاں چائے وغیرہ نہیں ملتی۔ شوکت بولے تو باجی بھی ساتھ چلیں۔ اگر اسٹیشن پر مجھے نیند نہ آئی تو وہ کہانیاں سنا کر مجھے سلا دیں گی۔ میں نے کہا: کاش تمہاری جعفری خانم باموره کی اسٹیشن ماسٹر ہوتیں تو تمہارے بھیا کو بہت آرام ملتا۔ اٹھتے ہی بھیا کو دیر ہوتی تو اپنے محمودے (محمد مر) کے لیے وہ آتی ہوئی ٹرین کو بہت دیر روکے رکھتیں۔ اس پر سب جعفری خانم کی اسٹیشن ماسٹری، ان کے انتظامات پر بہت مضحکہ خیز گفتگو کر کے ہنستے رہے۔ یہ باتیں شوکت کے حافظہ میں مدت تک محفوظ رہیں اور ایک وقت ایسا آیا، لاہور کے ایک رسالہ میں "سودیشی ریل" کے عنوان سے ایک بہت ہی پھڑکتا ہوا مضمون شائع ہوا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ مولوی محمد عثمان صاحب نے جو شوکت کے قریبی رشتہ سے خالہ زاد بھائی اور شوکت دلہن کے چچا تھے، چودھری سر ظفراللہ سے ملایا۔ چودھری صاحب ان دنوں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے۔ انہوں نے شوکت کے اس مضمون کو سرکاری حلقے میں موضوعِ سخن بنایا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اس وقت کی غیر ملکی حکومت کے لیے یہ مضمون بہت کارآمد تھا۔ شوکت کو ایک معقول معاوضہ دیا گیا۔ نظر ثانی اور کچھ اضافے کے بعد کتابی صورت میں اس کی اشاعت ہوئی، انگریزی میں ترجمہ ہو کر لندن میں شائع ہوا۔ یہاں ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔ جعفری خانم ہماری ہی کی مزاج داں اور مردم شناس، امانتی اور بلند نگاہ ان کی مشیر خاص کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ یہاں تک کہ خانگی معاملات میں بھی اس کی رائے کو بہت دخل تھا۔ میں اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا اور شوکت میرے قدم بقدم چلنے کی وجہ سے اس کے [illegible]

[illegible] بہت سی مختلف [illegible] بڑی بیگم کی
[illegible] اس کی خاطر [illegible] بہت سے ہر قسم کے
[illegible] کتاب وغیرہ [illegible] جانی پہچانی
بار کھانا [illegible] بھیج دیا۔ ایسے پُر تکلف کھانے سے خود لکھنؤ میں [illegible] مقدار میں تیار
[illegible] جعفری صاحب [illegible] سب کھا گئے
[illegible] بڑی محروم رہیں۔ [illegible] سننے لگے [illegible]
زندگی میں [illegible] ایسی بڑی بات [illegible]
[illegible] جعفری خاندان کے [illegible] لکھنؤ
[illegible] پُر تکلف [illegible] میں نے شوکت سے کہا آج [illegible] نے بتایا کہ
[illegible]
[illegible]
کا خوان گھر کی [illegible] کوشش سے [illegible] شوکت بھی نیچے نیچے ہو لیے۔ پھر دور جا کر [illegible] دفعہ دو سامنے چند
یتیم بچے سہمے بیٹھے ہیں۔ لاؤ میں ان کو یہ تورہ کھلا دوں۔ تم یہ خوان مجھے مت دو اور گھر جاؤ۔ اس سے دو خوان منت سے کر
کچھ دیر ہم دونوں رکے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلے اور باہر کے کمرہ میں بیٹھ کر اطمینان سے کھاتے رہے۔ جو کچھ بچا
ایک فقیر کو دے دیا۔ سامنے ہی سکرو نامی دھوبن رہتی تھی۔ وہ یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس وقت تو چپ رہی، اگلے دن چچی جان
سے آکر کہہ دیا کہ دولہا میاں (یعنی میں) اور میرے بھتیجے نے تورے کا کھانا باہر بیٹھ کر کھایا تھا۔ ہم نے خالی برتن یہ کہہ کر واپس کیے
تھے کہ یتیموں کو کھلا آئے ہیں۔ چچی جان دھوبن کی رپورٹ سن کر بہت بگڑیں کہ اللہ کے فضل سے جوان ہو، بیوی بچوں والے
ہو، نوکر چاکر ہو، خود بھی بدنیتی کرتے ہو اور چھوٹے بھائی کو بھی بدنیت بناتے ہو، شرم نہیں آتی۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے
میاں تحصیلدار ہیں اور نیت کے ایسے خوار ہیں کہ فقیروں کے حصہ کا کھانا چوری سے کھا گئے۔ میں نے کہا چھوٹے بڑے ہو کر
بھی بزرگوں کے سامنے بچے ہی ہوتے ہیں اور طفلانہ شرارتیں ان میں عود کر آتی ہیں۔ شوکت تو آخر عمر تک خاندان کے بزرگوں کے
ہونہار بچے بنا رہا۔ چچا جان کی وفات کے بعد وہ میرے پاس بھوپال آیا۔ میں ان دنوں ایک تحصیل کا انچارج تھا اور نواب صاحب
کے وزیر خصوصی بسلسلہ دورہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے شوکت کی ملازمت کے لیے عرض کیا اور وہ تحصیلدار مقرر کرنے
پر آمادہ ہو گئے۔ شوکت گھر میں باجی کے پاس جا کر رونے لگے کہ بھائی جان مجھے لکھنؤ چھڑا کر دیہاتی ماحول میں قید کرنا چاہتے ہیں۔
مجھے خبر ہوئی تو سمجھایا کہ بیٹا، تمہاری بیوی ہے، کچھ دنوں میں بچے ہو جائیں گے۔ انگریزی حکومت میں ملازمت کے لیے تمہارے
پاس تعلیمی سہولتیں نہیں تمہارے ابا کی دیرینہ خدمات اور باقیماندہ رسوخ کی وجہ سے تمہیں یہ سنہری موقع مل رہا ہے، کیوں کفرانِ نعمت کرتے
ہو۔ آگے چل کر ترقی پاؤ گے۔ نائب ناظم (ڈپٹی کلکٹر) ہو سکتے ہو، اور قسمت نے یاوری کی تو ناظم ضلع یعنی کلکٹر بھی بن سکتے ہو۔
شوکت بظاہر رضامند ہو گئے اور بڑے ابا یعنی میرے والد سے مشورہ کا بہانہ کر کے بھوپال آئے اور وہاں سے لکھنؤ پہنچ گئے۔ بعد

بنا معذرت آمیز خط کے ذریعے مجھے اطلاع دی کہ میں نے روزنامہ ہمدم کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں ملازمت کر لی ہے۔ میں بھی علمی اور صحافتی کام کر رہا تھا، دونوں کا مستقبل اُس وقت کی ملکی فضا کے اعتبار سے کچھ امید افزا نہ تھا۔ افسوس کر کے رہ گیا۔ اس کی تعلیم صرف ہائی اسکول کے آٹھویں درجے تک تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو دماغی و ذہنی صلاحیتیں اس قدر ارزانی فرمائی تھیں کہ اس نے روز افزوں ترقی کی اور میں ہر اعتبار سے اُس سے پیچھے رہ گیا۔ جب اخباری لائن سے نکل کر ریڈیو سے وابستہ ہوا اور بھوپال کے شاہی مشاہرہ پر آیا تو مسٹر سلام الدین وزیر قانون و انصاف کے نیم سرکاری اخبار "ندیم" کی ادارت بمعہ معقول مشاہرہ کی پیش کش کی۔ شوکت نے لسان الحال رہ کر جو ماہانہ رقم مجھے مل رہی ہے۔ آپ اس سے دگنی قیمت پر مجھے لینا چاہتے ہیں۔ اس کا بہت بہت شکریہ مگر ..... فضا میں صلاحیتوں کا جو خون ہوتا ہے، اُس کی مثال میرے سامنے جانی جان (ارشد تھانوی) موجود ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ تحصیلدار ہو جاتا اور آگے ترقی بھی کرتا۔ تو یہ شہرت یہ ہردلعزیزی اور یہ دقار جو اُسے اپنی خوشگوار ذہنی زندگی میں حاصل ہوا اس کا عشر عشیر بھی میسر نہ آتا۔ اُس کی تمام ذہنی اُمنگیں اور سے فرائض اور ملازمانہ قیود بند میں گھٹ گھٹ کر ختم ہو جاتیں۔ زیادہ برخاست یا سنجیدہ ہونے پر مجبور ہوتا۔ اس کی زبان جب گھر کے بزرگوں اور خاندان کے چھوٹے بڑوں کو نہ بخشتی تھی۔ تو رہا سہی غلامانہ ذہنیت رکھنے والے اصحاب کبار کب اس سے بچ سکتے تھے۔ نتیجہ خطرناک ہوتا۔ اگرچہ اُس کا مذاق اور طنز و مزاح بہت لطیف، بالواقع اور شائستہ ہوتا تھا کہ موضوعِ شخصیت بھی داد دیے بغیر نہ رہتی تھی، اس کے ساتھ حفظِ مراتب کا بھی پورا لحاظ رکھتا تھا۔ مجھ سے انتہائی بے تکلف اور بذلہ سنج ہونے کے باوجود ادب و احترام کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کے ماشاءاللہ تین ہونہار اور سعادت مند بیٹے ہیں۔ پہلے کا نام سعید عمر ہے، جو ماں اور باپ دونوں کے ناموں کا مرکب ہے۔ دوسرے کا نام خورشید عمر، بلحاظ قافیہ ان کی پھوپھی (خاتون ارشد) نے رکھا۔ جب تیسرا بیٹا ہوا اور شوکت نے مجھے تار پر اطلاع دے کر نام رکھنے کی استدعا کی تو میں نے اپنے نام پر اس کا نام رشید عمر تجویز کیا چونکہ میرا نام رشید احمد ہے اور بچی چچا سب مجھے رشید کہتے تھے اس لیے شوکت اور اس کی بیگم نے اپنے بچے کو رشید کہہ کر پکارنا میری بے ادبی سمجھا اور اُسے بابا کہنے لگے۔ اب وہ خدا کے فضل سے جوان ہو گیا ہے۔ مگر سب اُسے بابا ہی کہتے ہیں۔ کیسی رنجیدہ بات ہے کہ ان خصوصیات کے باوجود ۱۹۵۰ء میں وہ اپنی بہن یعنی میری بیوی اور اسی کے ساتھ مجھ سے سخت کشیدہ ہو گیا، اور مرتے دم تک یہ آزردگی رہی۔ حالانکہ اُسی کی اصرار آمیز طلبی پر میں اپنے ارادے سے کچھ پہلے ہی پاکستان آیا تھا۔ اور ہم لوگوں کے یہاں پہنچنے پر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شوکت ان دنوں لاہور میں تھے اور ریڈیو اسٹیشن سے متعلق۔ میرے لیے انھوں نے ایک ادبی دفتر کاروبار اعلیٰ پیمانہ پر چلانے کی تجویز سوچ رکھی تھی۔ مگر بعض خانگی مصلحتوں کی بنا پر شوکت کی مرضی کے خلاف میں کراچی چلا آیا اور ریڈیو سٹیشن سے وابستہ ہو گیا۔ مگر شوکت کی آزردگی کا سبب یہ نہ تھا۔ حقیقت کچھ اور ہے۔ بیگم ایک سلیقہ مند کفایت شعار اور معاشرتی ربط ضبط سے محتاط رہنے والی خاتون ہیں، شوکت حد درجہ فیاض، احباب نواز، عزیزوں رشتہ داروں کی دل کھول کر مدارات کرنے والا سیر چشم بلند نظر انسان تھا۔ اس لیے میاں بیوی کی افتادِ طبیعت میں ذرا بھی ہم آہنگی نہ تھی، شوکت جو ابتدا سے اس شعر سے "با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا" پر عامل تھا۔ اپنی شریکِ زندگی کی خاطر شکنی کیسے گوارا کرتا۔ اُس نے اپنے احباب کی پذیرائی کا جداگانہ انتظام کر لیا۔ اس کی سن گن پر ناگواریاں پیدا ہوئیں۔ دو ایک بار میں نے ان ناگواریوں کو خوشگواریوں میں تبدیل بھی کر دیا۔ لاہور آنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں آخر شوکت نے لاہور کی ایک لکھی پڑھی خاتون سے عقد کر لیا۔ اس سلسلہ میں سعیدہ خاتون سے تلخی پیدا ہوئی اور اس قدر

جب شوکت اپنی کمال بیباکی اور شان داری کی بنا پر گھر چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ ایک عجیب سے نکاح میں تین بیویاں ۔ وہ بیگم کے ساتھ رہے۔ اس وقت سے اب تک کہ پندرہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان میاں بیوی نے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھی۔ یہاں تک کہ جب شوکت مرض الموت میں مبتلا ہو کر سیو اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ غالباً ڈاکٹروں کے مشورہ پر) سعیدہ خاتون ان کو دیکھنے نہیں گئیں۔ گھر پر بیٹھی کسی خلوص کے احساس سے ان کی صحت کے لیے دعائیں مانگتی رہیں۔ پھر وفات ہو جانے پر بھی حسب بیان آخری دیدار بھی نہ کیا۔ زہرہ بیگم دن رات بطور شوہر کی بیوی سے لگی بیٹھی رہیں اور ہسپتال سے انہی کے گھر پر جانے کے دو تین روز بعد تک رہنے والے نے جان شیریں جان آفرین کے سپرد کی۔ اس پندرہ سالہ علیحدگی کے دوران میں میاں بیوی کے درمیان مراسلت بھی نہ جاری رہی اور شوکت ایک رقم اپنی بڑی بیوی کو پوری پابندی سے ماہ بماہ بھیجتے رہے۔ شوکت کی بیوی سے ملنے پر بھی۔ ان کا اصرار تھا کہ اس بے تعلقی کو ختم کر دو اور دونوں کے ساتھ رہنے لگے۔ انصاف کرو، میں بھی اسی بات پر زور دیتا تھا ان کے بیٹے بھی زہرہ بیگم والے گھر پر نہ جا سکتے تھے، ریڈیو اسٹیشن پر ضرورتاً مل لیتے تھے۔ پھر جب وہ روزنامہ جنگ کے ادارہ میں کراچی آ کر شامل ہوئے تب بھی ان کے بیٹے ان کے گھر نہ جا پاتے تھے۔ پھوپھی یا خالہ کے یہاں رہتے اور دفتر روزنامہ جنگ میں جا کر ملتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شوکت کو اپنے بیٹوں سے محبت نہ تھی۔ وہ [illegible] ایسا کرتے تھے اور ان کی بہبود کا پوری شدت سے خیال رکھتے تھے۔ ایک موقع پر تار دے کر سعید عمر کو دہلی سے بلایا۔ اپنے تعلقات سے کام لے کر پی آئی اے کے شعبہ انجینئرنگ میں بھرتی کرایا۔ جہاں اب وہ آٹھ سو روپیہ ماہوار پاتے ہیں۔ دوسرے بیٹے کو ولایت میں ایک معقول جگہ دلوائی۔ دونوں کی شادیوں میں شریک تو نہیں ہوئے۔ مگر مصارف کے لیے بڑی بڑی رقوم بھیجیں۔ ایک سہرے کا شعر ہے

سہرا وزن کا ہے نہ ہے لعل و گہر کا سہرا
ہے سعیدہ کی دعاؤں کے اثر کا سہرا

زہرہ بیگم بقول شوکت "اچھی عورت ہے" اس کا ثبوت یہ ہے کہ شوکت کے جس لڑکے نے ایک بار اپنی سوتیلی ماں کی عزت و تذلیل کی تھی، جب وہ اپنی بیوی کو لے کر شوکت کے دوران علالت میں ہسپتال گیا۔ تو اس کی دلہن کو زہرہ بیگم نے چھاتی سے لگا کر پیار کیا۔ مٹھائی منگا کر ساتھ کی۔ اور کہا دیکھو تم ایسی جگہ ہی ہو کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے متعلق، گرچہ یہ حقیقت نہ تھی۔ شوکت میرے متعلق یہ یقین رکھتے تھے کہ سعیدہ کی طرفداری میں، میں زہرہ بیگم کا سخت مخالف ہوں، اسی لیے جب ان کے بیٹے کسی عدم شفقت کی شکایت دفتر جنگ میں جا کر کرتے تو ان کو یہ بدگمانی ہوتی کہ میں نے ان کو بھڑکایا ہے۔ اور وہ میری شکایات [illegible] میرے پاس نہ ٹھہرنے کی ہدایت کرتے۔ باایں ہمہ میرے احترام و محبت میں کوئی کمی نہ آتی تھی [illegible] جب ملتے۔ میں کراچی میں سخت علیل ہوا اور مایوسی آمیز خط لکھا، یہ چند سال پہلے کی بات ہے شوکت نے جواب میں مجھے لکھا کہ پچیس تیس سال پہلے علی برادران کی تصویریں اخباروں میں چھپا کرتی تھیں تو میری اور آپ کی تصویریں بھی "تھانوی برادران" کے عنوان سے شائع ہوتی تھی۔ آپ اطمینان رکھئے کہ موت کے سلسلہ میں بھی ہم تھانوی برادران، علی برادران ثابت ہوں گے۔ یعنی چھوٹے بھائی مولانا محمد علی کی وفات پہلے ہوئی اور شوکت علی بعد میں فوت ہوئے۔ اسی طرح پہلے میں مروں گا اور بعد میں آپ کا نمبر آئے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں، آپ نہیں مر سکتے۔ شوکت کے شفیق ترین محسن، دوست جناب احمد سلمان صاحب کو یہ خط دکھایا تو وہ بولے بڑی سعادت مندی کی

بلاشبہ علیحدہ اُس نے یہ پیشین گوئی کسی غیبی احساس سے کی تھی جو ۴ مئی ۱۹۶۳ء کو سچی ثابت ہوئی۔ جب ۶۰ برس کا لمبا عرصہ ہو۔ وہ ۵۹ برس کچھ ماہ کی عمر میں داغِ مفارقت دے گیا۔ بعض اخبارات و رسائل میں اس کی عمر ۵۵-۵۶ سال بھی شائع ہوئی ہے۔ دوسرا عقد کرنے کے بعد اُس نے قرار دے لی تھی اور ۱۹۰۴ء کے بجائے ۱۹۰۸ء کے ۲ فروری کو اپنا ماہ پیدائش بنا لیا تھا۔ پہلے اپنی کتاب "ماہدولت" وغیرہ میں خود اپنا تاریخی نام تسخیر احمد اور ۱۳۲۲ھ سنہ ولادت لکھ چکا تھا۔ فرہنگ عامرہ میں جو شعرائے قدیم و جدید کی فہرست شامل ہے، اُس میں شوکت کا سنہ پیدائش صحیح لکھا ہے۔ اسی طرح لکھنؤ اور علیگڑھ میں اس کے زیرِ تعلیم رہنے کی بھی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں تفریحی حصہ لینے کے لیے ضرورتاً بعد میں اضافہ کر لیا تھا۔ اس کی مونچھ پر عمر کی ۴-۵ سال کی کمی بھی زیب دیتی تھی اور اس کی زبان و قلم سے اولڈ بوائے ہونے کی تائید بھی ہوتی تھی۔ جن لوگوں نے ماہِ نیم کو ریڈیو پر سنا ہے کیا وہ کہہ سکتے تھے ۔ کہ یہ آواز محمد عمر کی تھی اور اصلی قاضی کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ لکھنؤ میں تو وہ خاص لکھنوی تھا ہی، بھوپال میں جہاں اکثر الفاظ کے زبر کو زیر کر دیا جاتا ہے۔ بالکل بھوپالی لہجہ میں بولتا تھا اور تھانہ بھون کے کوئی بزرگ جیسے تو آج سے نصف صدی پہلے کی متروک زبان استعمال کرتا تھا اور کسی کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ بقول حافظ ؎

معشوق ما بشیوہ ہر کس برابر است
با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

مرحوم نے خواہ اپنی عمر کسی وجہ سے کم کی ہو، اگر زیادہ بھی ہوتی تو بھی کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ آخر وقت تک سدا جوان تھا۔ اُس کا دل جوان تھا۔ اُس کا دماغ جوان تھا۔ اُس کی زبان جولاں تھی، اس کا قلم جوان تھا اور مجھے تو وہ ہمیشہ ایک چلبلا لڑکا ہی نظر آیا۔ اکثر ان سے باتیں کرتے ہوئے میں اپنی طفولیت کا کوئی واقعہ بیان کرتا تو کہا کرتا تھا۔ شوکت جب میں تمہاری برابر تھا تو وہ ہنس کر کہتا۔ صاحب جان اب بھی لڑکا نہیں رہا اب میں تو لڑکوں کا باپ ہوں، چھوٹی بیوی زہرہ بیگم کے بطن سے اس کی تین لڑکیاں ہیں۔ بڑی بچی کا نام شوکیہ ہے، منجھلی کا فوزیہ اور چھوٹی کا نفیسہ۔ شوکیہ ترکی لفظ ہے، جس کے معنی تابانی اور درخشندگی کے ہیں، اس نام کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔ بھوپال سے کسی زمانہ میں ایک نسوانی رسالہ "الحجاب" کے نام سے نکلتا تھا۔ اس میں ایک ترکی افسانہ کا ترجمہ شائع ہوا۔ شوکیہ اس کا عنوان تھا۔ شوکت کی باجی کو یہ نام بہت پسند آیا۔ کہا کرتی تھیں کاش یہ نام میرا ہوتا تھا۔ جب اُن کے بھتیجے نے اپنا تخلص شوکت رکھا تو انھوں نے کہا، میں اس کی بچی کا نام شوکیہ رکھوں گی۔ شوکت بھی باجی کے اس خیال میں شریک ہو گئے، مگر ان کے متواتر لڑکے ہوتے رہے، لڑکی کوئی نہ ہوئی اور ولادت کا یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ شوکت اور ان کی باجی کی یہ خواہش دل کی دل ہی میں رہی، یہ نام اگر پیش نظر نہ بھی ہوتا تو بھی شوکت کو منی بٹیا کو کھلانے کا بہت شوق تھا۔ میری لڑکی شہر بانو بہت ہی چھوٹی سی تھی، شوکت جشن سالگرہ کے مشاعرے میں بھوپال آئے، جب تک گھر میں رہتے، ننھی بھانجی کو گود میں لیے رہتے۔ ایک روز قاضی محمد کرم تحصیلدار کے یہاں مخصوص مشاعرہ تھا۔ شوکت شہر بانو کو بھی لیے ہوئے چلے گئے اور مشاعرے میں پہنچ کر اپنے گھٹنوں پر شہر بانو کو لٹا لیا۔ جگر صاحب برابر بیٹھے تھے۔ جب جگر صاحب غزل پڑھ چکے تو شوکت نے شہر بانو سے کہا۔ بیٹی تم بھی شعر کہا کرو۔ ننھی بانو نے فوراً پوچھا کیسے؟ شوکت کے ذہن میں ابھی نہ تھا کہ بچی شعر کو شیر سمجھے، ہنس کر جگر صاحب کی طرف اشارہ کر دیا۔ اب شہر بانو ماشاء اللہ بڑی ہو گئی۔ ایم۔ اے ہے بی۔ ایڈ ہے۔ مگر شوکت اس کو ابھی تک شیر والی بانو کہتے رہے۔ مگر اللہ نے ان کی یہ آرزو پوری کر دی، جب انھوں نے دوسرا عقد کیا اور بچی پیدا ہوئی تو بہن کو خط لکھا۔ اللہ کا شکر ہے

ہے۔ تھا کے بعد گھر [illegible] آتی سب سے خوبصورت [illegible] جس کا چاہنے والا اب کبھی کبھی [illegible] ملتی ہے بڑی [illegible] شوکت
[illegible] (خاتون مشرق) کو لکھتے ۔

ہم بیٹھے بیٹھے ابا کو یاد کر کے روتی ہیں اور ہر وقت ابا کی محبت کی باتیں یاد آتی ہیں۔ کئی بار ابا کی قبر پر [illegible]

ہیں کہ ساتھ [illegible] چاہتے ہیں کسی طرح [illegible] ممکن نہیں [illegible]

پھر [illegible] اپنے آپ ہی سامنے آ جاتی ہیں [illegible]

یہ بھی [illegible] صاحب خانہ ہیں [illegible] اور میزبان ان معصوم بیٹیوں کی قسمت پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ان معصوم پھول جیسی بچیوں کی ماں پر کیا گزرتی ہو گی جن کا آدمی [illegible] ان ننھی ننھی کلیوں کی نگہداشت اور پرورش کا بوجھ اس پر آ پڑا۔ [illegible] زہرہ ہر وقت مسکرا کر اس وقت ہمارا خیر مقدم کرتی تھیں جب ہم [illegible] لکھنؤ [illegible] شوکت و زہرہ نے مجھ سے [illegible] آکر کھانے کا پابند کر رکھا تھا خاص طور سے پُر تکلف کھانے بڑے اہتمام سے تیار کرتی، [illegible] اور دستر خوان پر [illegible] ہیں۔ میری عادت ہمیشہ سے چاول میں قورمہ ڈال کر کھانے کی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب میں اس کو گنوار پن سمجھا جاتا ہے۔ پہلے دن جو میں کھانے بیٹھا [illegible] سے پلیٹ میں چاول نکالے۔ زہرہ بیگم نے چمچہ بھر کر قورمہ اس میں انڈیل دیا۔ اس نے تو اپنی تہذیب کے مطابق مجھے زحمت سے بچایا تھا۔ میں سمجھا شوکت نے میری عادت سے واقف کر دیا ہوگا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ شوکت کی پلیٹ میں بھی زہرہ نے قورمہ ڈال دیا تو کہا، جناب شوکت صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، کیا آپ بھی میری طرح گنوار پن اختیار فرمانا پسند کرتے ہیں۔ زہرہ نے حیرانی سے پوچھا، کیا بات ہوئی، میں نے کوئی بدتمیزی کی ہے؟ کہا، تمہارے لکھنؤی الاصل [illegible] شوہر صاحب ہمیشہ قورمے سے سالن کھانے کو [illegible] سمجھا کرتے ہیں۔ زہرہ بولی، [illegible] جواب ہے۔ میں نے شوکت سے کہا، سنو وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ شوکت نے [illegible] کسی فارسی شعر کا مصرعہ [illegible]

حکم زہرہ بیگم از حکم خدا است   [illegible] زہرہ [illegible]

افسوس کہ بعض غلط فہمیوں نے یہ فضا ہی بدل دی۔ آخری مرتبہ جب شوکت راولپنڈی سے کراچی آئے اور یونیورسٹی کے کسی مشاعرہ میں میری لڑکیاں ملیں تو دونوں کو چھاتی سے لگا لیا اور بہت دیر دونوں بچیوں کو ساتھ لیے ہوئے اپنی کار تک گئے اور اقبال صاحب صفی پوری سے جن کے ہاں ٹھہرے تھے آکر کہا مجھے شہر بانو، مہر بانو ملیں تھیں، مگر باجی اور بھائی جان نے مجھے چھوڑ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس کی زندگی کے تیسرے دور نے اس کی باغ و بہار زندگی کو اندرونی طور پر خزاں آلودہ بنا دیا تھا۔ وہ آخری دور حیات میں شدید دماغی کشمکش اور ذہنی اذیت کا شکار رہا۔ جن شخصیتوں سے اس کے دل کی گہرائیوں میں ابھی بھی محبت تھی، زبانی ان سے نفرت کا اظہار کرتی تھی، جن اعزہ کی طرف جذبات کھینچتے تھے، تصورات ان سے روگردانی کرتے تھے، اس کے اندرونی تقاضے کچھ اور تھے اور بیرونی اصرارات کچھ اور۔ اس میں انا بالکل نہیں تھی لیکن اپنی شخصیت کے وقار کا حد درجہ لحاظ اور پاس اس درجہ کہ اس کے لیے جیتے جی قربانی دے دی۔ اسے جگر کے سرطان کا مرض ہو گیا تھا، اگر نہ ہوتا تو اس کے دل کے ناسور اسے زیادہ زندہ نہ رہنے دیتے۔ میرے سامنے تو اس کی گھریلو اور نجی زندگی ابتدا سے رہی، اس لیے سب کچھ جانتا، سب کچھ سمجھتا ہوں لیکن اس کی اندرونی الم پذیری کو اس کے بالغ نظر احباب بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ ماہر الاثر حضرت حفیظ جالندھری نے اپنی تعزیتی ریڈیائی تقریر میں اس کے متعلق دو شعر ایسے بھی پڑھے جن میں اس کی

تھی، دونوں کی طرف اشارے تھے اور جناب قدرت اللہ شہاب نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ "شوکت تھانوی سب سے شاد رہنے والے تھے لیکن اس کے اپنے دُکھ اندر ہی اندر ناسور بنتے گئے۔ یہاں تک کہ اس ناسور نے چپکے چپکے گھن کی طرح اس کی زندگی کو کھا لیا" معلوم ہوتا ہے کہ شوکت کو اپنی موت کے دن کا ادراک ہو گیا تھا۔ ان کا بڑا بیٹا سعید عمر باپ کی علالت کی خبر سن کر لاہور گیا۔ باپ کی حالت دیکھ کر رخصت دو بڑھائی۔ جب وہ بھی ختم ہو گئی اور بظاہر شوکت کی حالت سنبھلی ہوئی معلوم ہوئی تو اس نے باپ سے روانگی کی اجازت چاہی تو شوکت نے کہا، بس بیٹے ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ سعید نے سفر ملتوی کر دیا۔ رات گئے تک باپ کے قریب بیٹھا۔ شوکت نے کہا جاؤ میاں اب سو رہو، شب بخیر۔ خدا حافظ۔ سعید گرمی شاہ سے اپنی والدہ کے گھر پہنچا۔ دوسرے دن سویرے جب زہرہ کے مکان پر آیا۔ اس کے پہنچنے کے چند منٹ بعد خدا حافظ کہنے والے باپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جنازہ اٹھا اور میانی صاحب کے قبرستان میں بیٹے نے باپ کے جسدِ بے روح کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا۔ شاید اسی آخری خدمت کے لیے شفیق باپ نے بیٹے کو روک لیا تھا۔ پھر وہ محلے والے حکیم سعید صاحب دہلوی نے جو کراچی سے عیادت کے لیے لاہور گئے تھے اور شوکت سے اس وقت اپنے سسرالی گھر میں آ چکے تھے۔ ان کے کمرۂ قیام کی حدت محسوس کر کے کہا تھا کہ میں کل اس کو ایئر کنڈیشنڈ کرنے کا انتظام کروں گا۔ لیکن اگلے دن اس کی ضرورت باقی نہ رہی، اور اسی شام کو یہ جسم سپردِ خاک کر دیا گیا۔ مجھلے بیٹے نے اکثر لوگوں کے ساتھ منہ پھیر کر وقت کہا، ابا آپ کی اس آرام گاہ کو ایئر کنڈیشنڈ کرنے کی ضرورت نہیں — بالآخر

ہم نے موت رخصت ہوئی قبر بند — کھلا اب کہ کوئی کسی کا نہیں

مگر شوکت کے لیے یہ کہنا غلط ہے، اس کے سب کوئی ہیں۔ اس کی ماں جائی، اپنے بہن کی تشویشناک بیماری کی خبر پاتے ہی صاحبِ فراش ہو گئی اور بیس دن گزر جانے پر بھی ہنوز مریض ہے، اس کی بڑی بیگم پیکرِ غم ہے، چھوٹی بیگم کی حالت تو ناقابلِ بیان ہے۔ بیٹے، بیٹیاں، بھتیجے، بھانجیاں، سب ہی تو اُسے اپنائے ہوئے ہیں جتنا زندگی میں بھی نہ اپنایا تھا۔ میں انھیں سمجھانے میں لگا رہتا ہوں کہ ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

ہندوستان اور پاکستان میں اس کے دوست، اس کے قدر شناس جن میں عوام و خواص، اعلیٰ و ادنیٰ سب ہی شامل ہیں ہند سے باہر ہیں، سب ہی تو ماتم گسار ہیں اور دعائے مغفرت میں مصروف، کثیر التعداد، دلوں سے نکلی ہوئی یہ دعائیں اللہ تبارک تعالیٰ نے ضرور دل کی ہوں گی، کیونکہ مرنے والے نے مخلوقِ خدا کے دلوں کو مسرت و راحت پہنچا کر حاصل کی ہیں، اور اللہ تعالیٰ جو بڑا رحیم و کریم ہے اُسے ابدی مسرت و شادمانی عطا فرمائے گا۔

ابا

رشید عمر تھانوی

اپنے [illegible] جیسے ہی [illegible] بہت [illegible] سے وہ [illegible] علاوہ [illegible]
شخص کا یہ حال رہا ہر [illegible] شخص [illegible] تو [illegible] تکلیف [illegible]
بھی اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔

زندگی بھر جس کے چہرے [illegible] مسکراہٹ کھیلی [illegible] چھوٹے [illegible] شعروں [illegible] سے
ہوئے چہرے کھل اٹھے۔ [illegible] اپنے رنگ سے اپنے دکھ درد [illegible] کا شیوہ
نہ تھا۔ وہ خود اپنے ہی دکھوں کے بوجھ تلے دبتا گیا۔ اور [illegible] حالات میں بھی انہوں نے اپنی [illegible] تک دوسروں کے لبوں
[illegible] زعفران بنایا۔

سب سے شوکت تھانوی چھن گیا ہے میرا باپ — [illegible] شوکت تھانوی
تو اب بھی زندہ ہے۔ اور مدتوں اپنی تصانیف [illegible] زندہ رہے گا لیکن میرا باپ [illegible] نیند سو رہا ہے۔
[illegible] کی نیند، [illegible] کی نیند، جس میں نہ تو [illegible] سانس [illegible]
زندگی کی تلخیاں [illegible] اب میں کس سے [illegible]
آئے اس موڑ پر — جب میں اپنے پنگوڑے پر لیٹا چسنی یا ہاتھ کا انگوٹھا چوستا [illegible] ابا آتے
اور دھیرے سے "بابا" کہہ کر پکارتے، میں اپنی تمام مصروفیت چھوڑ کر اس مانوس آواز کی طرف دھیان دیتا۔ ابا میرے سینے پر جھک کر
اپنی انگلی میرے ہونٹوں پر رکھ کر کہتے: "میرا بابا ہے [illegible]" ان کو اپنے پر جھکا دیکھ کر میری ننھی منی [illegible] سے کھل جاتی [illegible]
کھلکھلا پڑتا۔ اور [illegible] اپنے ہاتھ پیر چلانے لگتا۔ وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر [illegible] پیار دیتے
اور میں [illegible] آغوش [illegible] جیسے آدمی [illegible]
کتنا چاہتے ہیں۔ کبھی تو اس طرح منہ بنا کر [illegible] "بابا" کہہ کر پکارتے تھے۔ جب وہ مجھے پنگوڑے پر تنہا چھوڑ کر چلے تو
مجھے دکھ ہوتا اور میں اس کا اظہار اپنے منہ کا پورا دہانہ کھول کر مختلف سُروں سے کرتا۔ کبھی کبھی میرے آنسو امڈ آتے اور کبھی
ان آنسوؤں سے پہلے ہی ابا پلٹ آتے۔

امی جان نے اب اپنے [illegible] شروع کر دیا۔ اور اپنی گود میں مجھے بٹھا کر ابا کی طرف اشارہ کر کے کہتیں "ابا"

کہ "بابا" ابا میاں ہیں تمہارے ابا۔" امی جان کی محنت اور اپنی کوششوں سے یہ بھی ہوا کہ رسالہ سے سارا ملک متعارف ہوا کہ ان کا نام آتا ہے۔ اور اب جب مجھے ان کی دوری سے آواز آتی "بابا" تو میں آتا۔ ایک کہ ابا تو پیار سے تک اور اپنے ہاتھ سے معمولی کرتے کو دیکھنے کی کوشش کرتے۔ تو وہ سو بھی میرے قریب آتیں، مجھے "بیٹا" کہہ کر پکارتیں اور پیار بھی کرتیں اور مجھے خوب اچھالیں۔ میں کھلکھلا پڑتا۔ اور جب وہ مجھے چھوڑ دیتیں تو پھر میں اپنا رونا شروع کر دیتا اور میری آواز سے دور ہو کر نانا جو ہوتا با چپ چپاتے ہیں۔

پھر کچھ عرصہ امی کی گود میں رہ کر مجھے معلوم ہوا کہ اصل ان کا نام "بابا" نہیں بلکہ "ابا" میرے ہیں ان کا نام "شوکت تھانوی" ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا نام "عرفت" "بابا" نہیں بلکہ اب جو کوئی میرا نام پوچھتا تو بس ابا کو سکھایا ہوا نام [illegible] "بابا تھانوی" بتاتا۔

ابا لکھنؤ میں ساتھ ہی ریڈیو اسٹیشن کے لئے بھی مقرر ہوئے۔ اوپر کی منزل پر ہم لوگوں کی رہائش تھی اور نیچے دفتر۔ ابا افسر ارشاد ہو۔ وہ دفتر کی ٹھاٹ باٹ دیکھ کر مجھے بھی افسری کا شوق چرایا اور اپنی مستقل عادت کے مطابق کہ ابا کے ساتھ والا کمرہ میری افسری کے لئے خالی گیا۔ جس میں میز سے لے کر گھنٹی، ردی کی ٹوکری سے لے کر پانی کی صراحی غرضیکہ سب کچھ موجود تھا۔ اور وہ اب میز کرسی لے کر بیٹھا رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ افسر ابا کی سیدھی لکیر نہ کھینچا کرتا۔ اور پانچ منٹ بعد چپراسی کو بلا کر کاغذ اسے سیدھے حکم دیا کرتا۔ ابا تو معلوم ہی تھا جو دفتر میں کام کرتا ہے اسے تنخواہ بھی ملتی ہے۔ لہذا پہلی تاریخ پر اکاؤنٹنٹ کے پاس موجود۔ ایک چٹھی ملتی جس میں روپیہ دو روپے ہوتے۔ اس پر دستخط کرکے فوراً گھر جاتا اور ابا کی نقل کرتے ہوئے دور ہی سے امی جان کو پکارتا "بیگم جلدی تنخواہ لے لیجئے مجھے ابھی دفتر کا بہت کام کرنا ہے۔" امی جان اپنے کو رونے سے تنخواہ لے لیتیں اور ہم چپ اپنے کمرے میں آ کر ساتھی سیدھی طرح کھینچنے میں مصروف ہو جاتے۔

دفتر کے نیچے دالان میں ابا اپنی زیر نگرانی مشاعرہ کراتے۔ ذرہ بھی مشاعرہ ہوتا۔ تمام بڑے بڑے شعراء آتے، رات بھر محفل جمی رہتی اور شعر ہی جاتے کے دور چلتے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تمام شعراء اپنا کلام سنائیں اور میں چپ رہوں۔ جونہی مشاعرہ شروع ہوتا میں ابا کی گود میں ٹھنکتے "ابا ہم بھی غزل پڑھیں گے۔" آخر کار میری ضد ابا پوری کرتے اور میں مائیکروفون پر اپنا کلام سناتا۔

ملا چل رہا ہے اور صاحب جا رہے ہیں۔

جب یہ جگہ ختم ہوا۔ تو ابا لاہور آگئے اور یہاں پنچولی آرٹ پکچرس میں ملازم ہو گئے۔ ہم سب کو لاہور آنا پڑا۔ ابا کو یقیناً لکھنؤ چھوٹنے کا غم تھا۔ لیکن فکر معاش پر مجبور تھے اور مجھے جو غم تھا وہ اپنی افسری چھننے کا۔

اب میں کافی قابل ہو چکا تھا۔ اور ابا کی سکھائی سینکڑوں گالیاں ازبر تھیں۔ بڑے بھائی سید عمر تھانوی اور منجھلے بھائی خورشید شوکت کو اکثر بیشتر ابا کا سکھایا سبق سننا پڑتا۔ بھائی جان کے ہاتھ میں گیند دیکھی اور فوراً کہا "بھائی مجھے گیند دو" ان کے انکار پر پہلے تو اپنے سبق سے نوازتا اور پھر خود ہی روتا ہوا، منہ بسورتا ہوا ابا کے پاس پہنچ جاتا اور فی البدیہہ کہانی گھڑ دیتا "بھائی مجھے گیند نہیں دیتے اور بہت مارا ہے" پھر فوراً مجھے گیند مل جاتی۔ میری التجا پر نہیں بلکہ دھونس سے۔ گھر کے تمام افراد کے علاوہ ابا کے

[illegible] بھی میری اسی قابلیت سے [illegible] ہے [illegible] سے چلا گیا [illegible] بھی مجھے یاد ہے جب پہلی دفعہ ابا کے
[illegible] کے گھر گیا [illegible] وقت نہیں۔ مجھے دیکھتے ہی [illegible] گود میں اٹھا لیا اور پوچھا
[illegible] تھا [illegible] بیٹھے کو [illegible] لگے لیکن ایک شرط ہے
[illegible] ڈرائنگ روم میں [illegible] ابا [illegible] بیٹھے ہیں [illegible] پاس جاؤ [illegible] گالیاں دے کر آؤ۔ [illegible]
[illegible] فوراً [illegible] کر دو۔ [illegible] ڈرائنگ روم [illegible] آپ [illegible]
[illegible] شعر [illegible]
[illegible] اور مجھے گود میں اٹھا لیا [illegible] اب بھی یاد ہے — [illegible] آج بھی
[illegible] امی جان کی طرف
اشارہ کر کے پوچھتے یہ کون ہیں؟ [illegible] آہستہ آہستہ [illegible]
بیٹھ جاتا۔ اور [illegible] گالیاں دے [illegible] خبیث
[illegible] مجھے چپ [illegible] حرکت پر [illegible] قہقہے [illegible] ہوتے۔

امی جان کو عطر جمع کرنے کا شوق تھا اور مجھے اس کو تباہ کرنے کی عادت۔ [illegible] امی جان [illegible] میں مصروف [illegible] چپکے سے
[illegible] امی جان نے [illegible]
پانی بھر دیا۔ پھر [illegible] سے تیار کردہ [illegible] پر بھی چھڑک [illegible]
[illegible] جو نہی عطر کی خوشبو اڑ کر امی جان کی ناک تک پہنچتی وہ [illegible] حرکت [illegible] میری [illegible] بجنے اور
پُرخطر حالات میں پناہ بھی ابا ہی کی گود میں ملتی۔ [illegible] امی جان [illegible] میری [illegible] قابلیت [illegible]
ہی نہیں تھیں۔ بلکہ اکثر مجھے خبیث کہہ کر مارنے دوڑتیں اور منہ میں [illegible] مجھے [illegible] اس کے برخلاف ابا میری ہر
حرکت پر خنداں ہوتے۔ میری کسی شرارت پر دھول دھپا کرنے کی بجائے اپنے سینے سے لگا لیتے۔ اسی لیے ابا سے خوب دوستی
تھی۔ اٹھنا، بیٹھنا، سونا سب کچھ ان ہی کے ساتھ ہوتا۔ حالانکہ اکثر [illegible] بھی لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ سلاتے۔ اور یہ
بھی جب تک ان سے چمٹ کر نہ لیٹوں نیند نہیں آتی تھی۔ ابا بھی میرے بغیر نہیں سو سکتے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اب ابا کے اس
خط سے ہوا جو کہ انہوں نے امی جان کو ۵ رجون ۱۹۳۰ء کو لکھا تھا جب کہ وہ تنہا لکھنؤ تھے۔ اور ہم تینوں بھائی اور امی جان بھوپال
رفیق منزل، آئے ہوئے تھے۔

"بابا مجھے اس قدر یاد آتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ اب تک یہ حال ہے کہ رات کو آنکھ کھل جاتی ہے کہ بابا کو
پیشاب کرا لوں۔ اور مجبوراً خود ہی پیشاب کر کے سو رہتا ہوں۔"

جب تک ابا گھر میں رہتے ہیں خیر تھا جو دل چاہا وہ کیا۔ لیکن جونہی وہ دفتر روانہ ہوئے۔ مجھے بپتا پڑ جاتی۔ اور امی جان نے
لا جیسی آٹے سے ہاتھوں، میری لاکھوں دھمکیوں کے باوجود کہ "شام کو ابا سے شکایت کروں گا کہ آپ نماز پڑھ کر ہاتھ اٹھا کر ابا کو
دیر تک گالیاں دیتی رہتی ہیں" پھر بھی مجھے پڑھنا ہی پڑتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس قابل ہو گیا۔ کہ بڑی بڑی گالیاں بکنے کے علاوہ چھوٹی

منگوائیں یا ہمیں بھی پڑھ دیا کریں۔ پھر کیا تھا جب ابا دفتر جاتے تو وہ مجھ سے کتابوں کی فرمائش کرتے۔ میں کہانی کی کتابوں کی۔ وہ پہلی ہی اردو کی پہلی کتاب، سب پڑھ چکی تھیں۔ امی جان ان کے ہاتھ میں تھما جاتیں۔ گرمی ہو چاہے سردی ہو، پنکھا ہاتھ میں رکھنا ضروری تھا۔ مجھے بھی اس کی ڈنڈی سے مار پڑتی۔ اور جب دل چاہے اس سے جھل بھی لیتیں۔ امی جان کی، کھانے کے بعد تھوڑا سا ہی ہے۔ بس تھوڑا سا آرام۔ وہ دو گھڑی لیٹنے کے بعد ابا کے انتظار کی گھڑیاں شروع ہو جاتیں۔ پھر ابا آتے اور میری امید سے زیادہ بہت ساری خوبصورت سرورق والی کہانی کی کتابیں ہوتیں۔ میں ابا سے مارے خوشی کے لپٹ جاتا۔ ابا خوب پیار کرتے، چومتے۔ ان لمحوں میں جھٹ ہو جاتا اور سوچتا کتنے اچھے ہیں ہمارے ابا۔

محمد طفیل صاحب، مالک ادارہ فروغِ اردو، اکثر ابا کے پاس آتے تھے۔ جب ان کو ابا کے مسودات لے جاتے دیکھا تو ایک بار پوچھا کہ ابا یہ آپ کے لکھے ہوئے کاغذ کیوں لے جاتے ہیں؟ ابا سے معلوم ہوا کہ ان کاغذات سے ابا کا ناول چھپ کر آئے گا تو کتاب چھپے گی اور میری تھیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اب میں ہر وقت طفیل صاحب کا انتظار کرتا کہ وہ آئیں اور میں ان کو پکڑنے کے لیے دوڑ کھڑکی دوں۔ طفیل صاحب آتے تو کاغذ کے چند پرزے طفیل صاحب کے حوالے کر دیتا۔ اپنی چھپی ہوئی کتاب کا انتظار شروع ہو جاتا۔ ابا سے برابر اپنی کتاب کی بابت پوچھتا اور ابا پیار سے کہتے "بس جلدی چھپ کر آ جائے گی۔"

جب میری کوئی شرارت، شرارت کے دائرے سے بڑھ کر بدتمیزی بن جاتی تو ابا مجھ سے خفا ہو جاتے لیکن مجھ پر انہوں نے کبھی غصے میں بھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ میرا بستر گول یا ہتھیلی میں اٹھنی رکھتے اور کہتے چپکے گھر سے نکل جائیے۔ پہلے ابا کی طرف رونی صورت بنا کر دیکھتا لیکن ان کے دوبارہ کہنے پر چل دیتا۔ کہاں باہر نکل کر گھر کا ایک چکر کاٹتا پھر کسی چور دروازے سے اندر آ جاتا اور کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد ابا کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان سے معافی مانگ لیتا۔ ابا مجھے نہ صرف معاف کر دیتے چھپا لیتے بلکہ اپنی جیب سے کچھ پیسے نکال کر بھی دیتے اور گھر سے نکالتے وقت کی اٹھنی اس کے علاوہ ہوتی۔ ایک دفعہ جانے کیا بڑی بدتمیزی مجھ سے سرزد ہوئی اور ابا نے ایک اٹھنی میری ہتھیلی پر رکھی اور گھر سے نکل جانے کو کہا۔ مجھ کو مجبوراً نکلنا پڑا۔ کوٹھی کا چکر کاٹا اور کوٹھی کے پیچھے نوکروں کے کوارٹروں میں چھپ گیا۔ کافی دیر جب کمرے میں بیٹھا بیٹھا تھک گیا تو سوچا کہ چلو چور دروازے سے اندر جھانکیں اور دیکھیں کہ ابا دفتر چلے گئے یا نہیں۔ اب جو اندر جھانکا تو کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہاں سے ہٹ کر گیراج کے پیچھے سے کوٹھی کے آگے دیکھا تو ابا کوٹھی سے باہر نالے کے پل پر کھڑے تھے۔ اور امی جان ان کے ساتھ تھیں۔ اتنے میں سعید بھائی، خورشید بھائی اور اقبال ماموں (اقبال صفی پوری) اپنی اپنی سائیکلیں لے کر آئے اور ابا نے ان سب کو مختلف سمتوں پر روانہ کر دیا۔ ابا کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ میں بے خیالی میں اب جھانکنے کی بجائے ان دونوں کے بالکل سامنے تھا کہ اتنے میں امی جان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں پھر چھپ گیا۔ لیکن دوسرے لمحے امی جان مجھ تک پہنچ گئیں اور مجھے گھر لے گئیں۔ جونہی ابا کو دیکھا میں نے رونا شروع کر دیا اور انہوں نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ میری ہچکیاں رک گئیں۔ اور میں پہلے کی طرح شاداب ہو گیا۔

جب میرا بچپن اور جوانی آپس میں گلے مل رہے تھے، میری مسیں بھیگ رہی تھیں تو ابا کی فکرِ معاش انہیں کراچی لے گئی۔ اور وہ روزنامہ جنگ کراچی کے مدیر ہو گئے۔ میری تعلیم نے مجھے لاہور ہی میں رکھا۔ اکثر ابا کی یاد اس شدت سے ستاتی کہ دل چاہتا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر اپنے پیارے ابا تک پہنچ جاؤں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں تو ہم سب کراچی چلے جاتے۔ میں گھنٹوں ابا

کہ وہ جیسے چپ چاپ میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ جب وہ لکھنے میں مصروف ہوتے تو میں پیار بھری نظروں سے ان کو مکمل انہماک کے ساتھ مصروف ہوتا اور دیکھتی رہتی۔

پھر جب وہ ڈاکٹر کی تاکید کے باوجود رات گئے تک لکھتے رہتے تو ... راولپنڈی گئے تب امیدوں کی ... ہونے کی وہ کشش ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن سیماب کراچی ہی میں موجود تھے۔ ان سے ملنے کے ساتھ راولپنڈی جانا تو تھا ہی۔ چنانچہ کراچی جانے سے پہلے ہی کم از کم ایک ہفتہ کے لئے ... حقیقت یہ تھی کہ ... ان پر تعلق ... جانے سے پہلے راولپنڈی میں ایک دن ان کی صحبت میں گزرتا تھا۔ ... جبھی تو ہنسی سے ہنستے اور کبھی صرف خاموش ہو کر مجھے ان آنکھوں سے دیکھتے جن میں بے حد محبت، پیار اور شفقت کی جھلک ہوتی تھی ... ابھی پرسوں ایک دن ایسا ہی گزرتا ... سے ملتے ... جب بھی انہیں بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے ... راولپنڈی سے پہلے ... تو ہم سب کو بہت دکھ ہوا ... وقت ملتا تو مجھے پورا خط لکھتے۔ گذشتہ سال مجھے معلوم ہوا کہ عید الفطر کے موقع پر ... تھے۔ جبھی ... سے ملے نہیں۔ تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ اور میں نے فوراً ان کو شکایت آمیز خط لکھا جس کے جواب میں ... کے علاوہ مجھے یہ لکھا:

"میں عید منانے ... جیسی بد نصیب ... روانہ ہو کر ... رات کے ... بجے ... پنڈی واپس آگیا۔ میں وہاں ... ملنے کا وقت تھا ... کر کے ... پوری نہ ہو سکنے کی کراہتیں ... ابھی دل میں ... ہوں۔"

اور پھر ایک سال کی مدت کے بعد ابا واقعی لاہور آئے۔ ہم کو ... سے ملاقات کرنے کے لئے نہیں بلکہ ... سے گلے ملنے کے لئے ——— اپنے وعدے پورا کرنے کی بجائے وہ خود ہم سے روٹھ گئے۔

۱۳ مئی کو سورج طلوع ہوا اور اپنی کرنوں میں رات کی سیاہی کے ساتھ ساتھ میری ماں کا سہاگ بھی سمیٹ لے گیا۔ ایک جھٹکے سے امی جان کی چوڑیاں ٹوٹیں اور چہرہ ... آپ کی طرح تڑپتی رہیں ——— اور پھر ... شہادت ... اور ابا کی بارات خدا کے گھر چل دی۔ وہ بارات جس میں خوشی کے شادیانے نہ تھے بلکہ ہم سب کے بہتے آنسو، اور ہچکیاں ———

آج کرب ... زبان سے کہنا پڑ رہا ہے: "کتنے اچھے تھے ہمارے ابا، کتنے پیارے تھے ہمارے ابا" ——— کتنے پیارے کہ خدا کو پیارے ہو گئے ——— اپنے کہنے پر یقین نہیں آتا۔ اس وقت بھی ... یقین تھا۔ جب اپنی آنکھوں سے ان کے بے جان چہرے کو دیکھا۔ اپنے کاندھے پر سہارا دے کر ان کو ان کی آخری آرام گاہ تک لے گئے۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی ——— جب سب کہتے ہیں تمہارا باپ مر گیا۔ تم یتیم ہو گئے تو بہتے آنسو ان کی اس بات کی صداقت تسلیم کر لیتے ہیں۔

پیارے ابا شوکت تھانوی

شوکیہ تھانوی

میرے ابا کو بچپنے سے لے کر بڑھاپے تک کون نہیں جانتا ہوگا۔ جو لوگ شوکت تھانوی کو نہیں جانتے وہ قاضی جی کو ضرور جانتے ہوں گے جو کہ جنگ اخبار کے عام پڑھنے والوں کو یاد ہیں کچھ باتیں (ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام "قاضی جی") کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ میں اپنے ابا کے گھر ۱۹۵۱ میں پیدا ہوئی۔ یوں ان کی زندگی کی تمنا پوری ہوئی۔ جن کے لئے انہوں نے بہت سی منتیں مانی ہوئی تھیں۔ شاید کسی لڑکے کے ہونے پر بھی اتنی خوشی نہ مناتے۔ جتنی کہ میرے پیدا ہونے پر منائی گئی تھی۔ دس دن کے بعد مجھے داتا صاحب کی حاضری کے لئے لے جایا گیا۔ امی اور ابا بہت ساری ریزگاری بھی فقیروں میں تقسیم کرنے کے لئے لے گئے تھے۔ دعا مانگنے کے بعد ابا نے ریزگاری بانٹنی شروع کر دی۔ لیکن اس زمانے میں سنا ہے کہ فقیر اتنے تھے کہ خدا کی پناہ کسی نے ابا کا کوٹ پکڑا کسی نے ہاتھ پکڑا جب وہ مجھے دعا دلوانے لگا تو ابا تنگ آ گئے اور شرارت جو سوجھی سو ساری کی ساری ریزگاری ایک طرف زمین پر پھینک کر کہنے لگے کہ جاؤ بھائی آپس میں لڑو مجھ سے کیوں لڑتے ہو۔ اور خود ایک طرف کھڑے ہو کر ان کا تماشہ دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اور کہنے لگے جو امی کو زبردستی کہنے لے جاتے جو لڑتے تھے کتنی اچھی کشتیاں تھیں۔

میری عمر اس وقت بارہ سال ہے۔ آج سے آٹھ سال پہلے کی کچھ باتیں تحریر کرتی ہوں۔ جب میں پانچ برس کی تھی تو مجھے کونوینٹ سکول میں داخل کرایا گیا۔ ابا ریڈیو اسٹیشن پر تھے ہی۔ اسکول ابا کے راستے میں پڑتا تھا۔ اس لئے ان کے ساتھ آنے جانے میں بہت خوشی محسوس کرتی۔ شام کے وقت فرش پر گھوڑا بننا، ہم کو اپنی پیٹھ پر سوار کرنا ابا کا خاص مشغلہ تھا۔ جب پیٹھ پر بیٹھا کر ادھر ادھر ہوتے تو امی کو ہمارے گرنے کی بہت فکر ہوتی۔ لیکن ابا ہنستے ہوئے کہتے کہ میں اس نسل کا گھوڑا ہوں جو کہ مالک کے گرنے پر بسم اللہ پڑھتا ہے اور چوٹ نہیں لگنے دیتا۔ تین سال کی عمر میں ہم نے گھر میں ایک کتا پال رکھا تھا۔ جس کا نام جیکی تھا۔ ایک دن میں نے ابا کی ڈبیا جس میں پان کتھا اور چونا تھا ابا سے چوری اٹھا کر جیکی کے پاس لے گئی اور جا کر کہا "جیکی تو پان کھائے گی"۔ ابا نے مجھے دیکھ لیا اور گود میں اٹھا کر کہنے لگے میری بیٹی بہت مہمان نواز بنے گی۔

ایک مرتبہ جگر صاحب مرحوم ہمارے گھر آئے۔ مجھے بلایا گیا۔ میں جگر صاحب کو دیکھ کر سہم گئی۔ اور ان کی گود میں جانے سے انکار کر دیا۔ تو ابا کہنے لگے یہ تمہارے بڑے ابا ہیں۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ یہ دنیا کے ابا ہیں۔ دنیا ان دنوں بڑے لمبے لمبے بالوں والی ایک گڑیا ہمارے گھر میں تھی۔ ابا اس مشابہت سے سخت تلملائے۔ لیکن جگر صاحب بھانپ گئے اور کہنے لگے شوکت یہ لڑکی بڑی ذہین نکلے گی۔ اور وہی

وقت نکال کر دیا۔

۱۹۵۹ء میں ابا ریڈیو سے چلے گئے اور واپس اخبار جنگ میں ... اور وہ پہلی بار کراچی چلے گئے۔ کراچی میں ہمیں ایک گھر میں رہنا پڑا۔ اس کی اوپر کی منزل میں پھوپھو رہتی تھیں چونکہ ان کے اور ہمارے گھر کے معاملات میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تھا۔ اس لئے وقت بہت اچھی طرح گزرنے لگا۔ لیکن کراچی کی آب و ہوا نے ابا اور امی دونوں کی صحت پر بُرا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد ہی جعفری کی تبدیلی راولپنڈی ہو گئی۔ جس وقت وہ جانے لگے تو دل پر بہت اثر پڑا۔ ابا نے دل سے دعا کی یا اللہ مجھے بھی میرے بچوں کے پاس بھیج دو۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی اتفاق پیدا کر دیا۔ ... روزنامہ جنگ بھی راولپنڈی سے نکلنا شروع ہو گیا، پھر ابا بھی کراچی سے راولپنڈی آ گئے۔

راولپنڈی میں جو ہمیں گھر ملا وہ بہت چھوٹا تھا۔ لیکن پھر بھی ابا بہت خوش تھے اور کہتے تھے کہ یہ گھر مجھے بہت پسند ہے۔ ڈھائی سال کی کوشش کے بعد ہمیں اب بہت اچھا گھر ملا۔ جو کہ دیکھنے میں بہت خوبصورت تھا۔ لیکن ہمارے لئے بہت منحوس ثابت ہوا۔ اور اس میں بدقسمتی سے ہم چھ مہینے ہی رہے۔

پہلے مہینے میں کسی سامان کی وجہ سے بدشگونی ہوئی کہ میرے ساتھ سخت حادثہ پیش آیا۔ میں نہانے کے لئے غسل خانے میں گئی کہ گیس نے اپنا اثر کیا اور میں بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اس حادثہ کا ابا پر بہت اثر ہوا۔ اور ساری رات کرسی پر مجھے ڈر ڈر کر دیکھتے رہتے تھے۔ مارچ میں ابا کو بخار اور کھانسی نے آ گھیرا۔ اگرچہ علاج کرانے سے بخار اور کھانسی کو آرام تو آ گیا۔ لیکن باوجود اس کے آپ بڑے سنجیدہ رہنے لگے تھے۔ پھر چند دن بعد ہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کھانسی بخار ہو جاتا اور کبھی آرام آ جاتا۔ کمزوری دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ ان دنوں غلاف کعبہ کی زیارت پنڈی میں ہو رہی تھی۔ لیکن ابا اپنی کمزوری اور لوگوں کی بے پناہ بھیڑ کی وجہ سے مجبور ہو گئے۔ اور امی سے کہنے لگے میری قسمت میں زیارت نہیں ہے۔ خلیل صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ شوکت صاحب میں حکومت کی طرف سے جلوس کے ختم ہونے پر غلاف آپ کے گھر لا کر آپ کی خواہش پوری کر دوں گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ابا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور سب کمروں میں لے جایا گیا۔ کہنے لگے میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میں نے گھر پر ہی زیارت کر لی اور کہنے لگے۔ شوکیہ دعا کرو میں اور تمہاری امی وہاں جا کر حج کے موقعہ پر بھی زیارت کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔

۲۳ مارچ کو ابا اپنا تمغہ امتیاز حاصل کرنے کے لئے لاہور تشریف لائے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ میں اپنا مکمل علاج لاہور جا کر ہی کراؤں گا۔ ۲۲ مارچ کو جب ابا لاہور ریلوے اسٹیشن پر اترے تو اس وقت ان کو ۱۰۱ بخار تھا۔ اور میرے بھائی ہمیں لینے کے لئے آئے تھے۔ دوسرے دن ابا کو ۱۰۱ بخار تھا اور گورنمنٹ ہاؤس جانا تھا۔ اسی حالت میں آپ وہاں گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات نیاز صاحب سے ہوئی۔ جو کہ ابا کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ نیاز صاحب ان کی حالت دیکھ کر سخت حیران ہوئے اور کہنے لگے۔ کل میں آپ کو اپنے ہاں بلاؤں گا۔ میرے ہاں ڈاکٹر صالح میمن جو کہ پاکستان کے چند ڈاکٹروں میں سے ہیں۔ دکھایا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب معائنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ جگر میں پھوڑا ہے۔ ہسپتال داخل ہو جانا چاہیئے۔ لیکن ابا کا اصرار تھا کہ نیاز صاحب میں ہسپتال میں داخل نہیں ہوں گا۔ البتہ گھر پر ہی علاج کراؤں گا۔ کیونکہ ابا انجکشنوں اور دواؤں سے سخت گھبرائے ہوئے تھے۔

مگر یہیں کرنل یوسف کا علاج شروع ہو گیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے جو اس وقت بطور میو ہسپتال کے انچارج ہیں معائنہ کیا اور کہا آپ فوراً ہسپتال میں داخل ہو جائیں لیکن ابا اب تک اس بات پہ بضد تھے کہ میں کسی قیمت پر ہسپتال نہیں جاؤں گا۔ آخر جب گھر پر کسی قسم کا افاقہ نہ ہوا۔ تو ابا کے چند مخلص دوستوں نے اصرار کیا مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر امی نے کہا کہ شوکت صاحب اگر آپ اپنے لئے نہیں تو کم از کم ان بچوں کے لئے ہی ہسپتال چلے جائیے۔ رضامند ہو گئے۔ لیکن اس شرط پر کہ میرا اپریشن نہ ہو۔ ۶ اپریل کو ابا البرٹ وکٹر وارڈ کمرہ نمبر ۵ میں بستر علالت پر لیٹ گئے۔ اور علاج شروع ہو گیا۔ امی نے بہت محنت کی رات دن تیمارداری کے لئے حاضر رہتی تھیں اور دعا کرتی رہتی تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہسپتال میں ابا کو دیکھنے کے لئے ابا کے دوستوں اور عزیزوں کا ہر وقت جمگھٹا رہتا تھا جس سے نرسیں بہت گھبراتی تھیں۔

۱۹ اپریل کو ڈاکٹروں کا ایک بورڈ بیٹھا۔ ڈاکٹروں نے کینسر ہونے کا اعلان کیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس بیماری کا مکمل علاج تو ہمارے پاس ہے نہیں۔ البتہ جو انجکشن ہم لگا رہے ہیں۔ ان سے شوکت صاحب کچھ عرصے کے لئے اور زندہ رہ سکیں گے۔ جس سے ہم سب مایوس ہو گئے۔ اور ابا کی زبردست خواہش کے مطابق ۲۸ اپریل کو گھر لایا گیا۔ گھر آ کر ابا بہت خوش ہوئے اور ہومیوپیتھک کا علاج شروع کر دیا۔ تقریباً چھ دن یہ علاج ہوا لیکن طبیعت دن بدن گرتی ہی گئی۔ ۳۰ اپریل کی شام کو حالت بہت نازک ہو گئی۔ ۱۵ منٹ تک بیہوشی کے عالم میں پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو امی نے پوچھا کہ آپ کو کیا ہوا تھا۔ تو کہنے لگے شوکیہ میرے سامنے آ کر بیٹھی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دل پر انگارے ہیں۔ اس لئے میں بے بس ہو گیا۔ اور بعد میں مجھے ہوش نہیں تھا کہ کیا ہوا۔

۴ مئی کو صبح پونے نو بجے امی کو ابا نے آواز دی۔ اس وقت امی مسلسل جاگنے کی وجہ سے سو رہی تھیں۔ میں جاگی ہوئی اندر ابا کے کمرے میں گئی۔ ابا کہنے لگے آؤ میری بچی میرے پاس بیٹھو۔ اور بتاؤ کہ اس مرتبہ عید کا کیا پروگرام ہے۔ میں نے کہا کہ اس مرتبہ تو امی نے ہمارے کپڑے نہیں بنائے اور یہ خواہش ہے کہ آپ کے ٹھیک اور تندرست ہونے پر راولپنڈی جائیں گے اور وہیں جا کر میلاد شریف کرائیں گے اور نئے کپڑے پہنیں گے۔ اسی دوران امی بھی جاگ گئیں اور ابا کہنے لگے ہاں بیٹی صرف ایک گھنٹے کا پروگرام ہو گا۔ اس کے بعد امی نے تھرمامیٹر لگایا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کو حرارت بتانا تھا۔ امی نے ناشتہ دینا شروع کیا کہ چچا جعفری کے لڑکے علی جعفری تشریف لے آئے اور کہنے لگے۔ مجھے مکمل حالت بتائی جائے تاکہ میں ابا کو جا کر بیان کر سکوں۔ خالو نے کہا آپ اندر جا کر خود ہی دیکھ لیں۔ کیونکہ ابا اُس وقت بالکل خاموش تھے۔ اور کچھ کانپ رہے تھے۔ خالو نے امی سے کہا کہ باجی دیکھیں یہ کانپ کیوں رہے ہیں۔ اس عرصہ میں گھر کے سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اور امی سے نحیف آواز میں دو مرتبہ کچھ کہا جو سمجھ میں نہ آیا۔ اور لمبی سانسیں لینا شروع کر دیں۔ اسی وقت [illegible] ان کے منہ میں ڈالا اور چھوٹے ماموں ڈاکٹر کی طرف بھاگے۔ لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ابا ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔

پیارے ابا

خورشید شوکت

جولائی ۱۹۶۵ء کا غالباً آخری ہفتہ ہوگا۔ تاریخ ٹھیک سے مجھے یاد نہیں۔ یہ ان ہی دنوں میں ایک روز دفتر سے جلد فرصت پاکر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ کسی نے دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ میں نے بڑی بیزاری کے ساتھ بہت ہی افسرانہ انداز میں کہا "YES COME IN"

دروازہ آہستہ سے کھلا اور دیکھا کہ ابا مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ابا کی اس غیر متوقع آمد نے مجھے کچھ بوکھلا ... اور میری پیچھے جھکی ہوئی کرسی گرتے گرتے بچی۔ ابا کے ساتھ اُن کے لاڈلے نسیم ممتاز سید بھی تھے جن کو ابا بڑے پیار سے کرنل کہا کرتے تھے۔ حالانکہ اُن بیچارے کا بندوق کی گولی سے کہیں دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ میری اور ابا کی آخری ملاقات ہے تو میں کیوں اُن کو اتنی جلدی جانے دیتا۔ میں اُن کو لے کر کہیں ... تنہائی میں چلا جاتا جہاں میرا بچپن پھر لوٹ آتا، میں اُن کی گود میں سر رکھتا، اُن کے بالوں سے کھیلتا، اُن کی گردن میں باہیں ڈال کر جھولا جھولتا، اُن سے اتنی بہت ساری باتیں کرتا، اتنی بہت ساری باتیں کہ جو کبھی نہ ختم ہوتیں۔ لیکن افسوس کہ میں کوئی خاص بات نہ کر سکا۔

میرے ساتھی ابا سے ملنے کے بے حد متمنی تھے اور اس وقت کی غیر متوقع ملاقات سے بہت خوش تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اس تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں کریں اور میں خاموش بیٹھا ہوا بڑی فراخدلی کے ساتھ اُن کو یہ موقع فراہم کر رہا تھا۔ کاش میں جان سکتا کہ یہ لمحے میرے لیے کس قدر قیمتی ہیں۔

میں خاموش تھا لیکن میری آنکھیں ابا پر تھیں اور دماغ زندگی میں پہلی مرتبہ ابا کے جسمانی تغیر پر حیران تھا کہ ایک دم سے کیا ہو گیا۔۔۔ بال سفید۔ آنکھوں میں چمک کی بجائے ایک مستقل سوچ۔ چہرے پر جھرّیوں کے آثار۔ جھکے ہوئے شانے۔ ایکدم سے اتنی ضعیفی پتہ نہیں کیسے اُن پر ٹپک پڑی تھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پوچھ ہی لیا۔

"ابا آپ کو یہ ایک دم سے کیا ہو گیا ہے، آپ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے شاید؟"

ابا نے میرا مطلب سمجھ لیا اور مسکراتے ہوئے بولے "بیٹا صحت کا خیال تو رکھتا ہوں لیکن عمر کی رفتار کیسے روک سکتا ہوں اس کے بھی تو کچھ تقاضے ہیں جو پورے ہو رہے ہیں اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔"

ابّا کے اس جواب سے میں مطمئن نہ ہوا لیکن اس موضوع پر زیادہ بحث کرکے میں ابّا کو کسی دوسری اُلجھن میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے بات یہیں پر ختم ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد جانے کے لیے اُٹھے تو میرے گال پر بڑے پیار سے ایک ہلکی سی چپت لگانے کے بعد بولے: "سعید میاں! اب چند دنوں میں دولہا بن جائے گا۔ تم کب دولہن لا رہے ہو؟"

میں نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

ابّا نے میجر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "دیکھیے جناب! انھوں نے تو ابھی سے شرمانا شروع کر دیا۔"

ابّا واپس گئے تو کچھ دنوں کے بعد ابّا کے خط آنا قطعی بند ہو گئے۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کافی دنوں کے لیے ابّا خط لکھا جانے سے رہتے اور پھر پتہ چلتا تھا کہ کہیں باہر مشاعرے وغیرہ میں گئے ہوئے تھے یا اسی طرح کوئی خاص مصروفیات تھیں کہ جو اتنے عرصے خط نہ لکھ سکے۔ لہٰذا میں بھی خاموشی کے ساتھ اُن کے خط کا انتظار کرتا رہا۔ اسی دوران اتفاقاً میری حمید بٹ صاحب سے ملاقات ہوئی جو ایک دن پہلے پنڈی سے لاہور تشریف لائے تھے۔ حمید بٹ صاحب کی زبانی مجھے اس بات کی اطلاع ملی کہ پچھلے دنوں ابّا کی طبیعت کافی خراب رہی ہے اُن کے پیر کے انگوٹھے میں گاؤٹ ہو گیا ہے۔

خلافِ توقع ابّا کا خط ملا جو انھوں نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو لکھا تھا—

پیارے خورشید جیتے رہو

میاں مجھ کو گاؤٹ ہو گیا ہے۔ پیر کے دونوں انگوٹھوں نے مجھ کو "گاؤدی بدھو" بنا کر رکھ دیا۔ مرض خطرناک ضرور ہے مگر تم مطمئن رہو کہ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ چمڑے کا جوتا تو ابھی نہیں پہن سکتا۔ مگر ربڑ کے جوتے پہن کر رینگ لیتا ہوں۔ پرہیز نہایت شدید ہو رہا ہے صرف اُبلی ہوئی ترکاریاں کھاتا ہوں۔ کوشش یہی ہے کہ یہ مرض دل تک نہ آ سکے اور میں اسے پیر ہی سے ٹھکرا دوں اور پیر کے ٹھینگے ہی پر مار دوں۔ تم نہ خود گھبراؤ نہ کسی کو گھبرانے دو۔

دلہن کو میری بے پناہ دعائیں پہنچا دو۔ بابا کو بھی دعائیں اور اپنی امّی کو نہایت ادب سے آداب۔

خط مختصر اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اس بیماری نے ذرا کام چور بنا دیا ہے۔ بہرحال تم کو میری خیریت کی ضرورت ہے وہ تم کو مل گئی۔ یہ عذرِ لنگ نہیں ہے بلکہ عذرِ لنگ ہی دراصل میرا مرض ہے۔

تمہارا شوکت

امّی جان کو جب سے ابّا کی اس بیماری کی اطلاع ملی تھی وہ بےحد پریشان تھیں اور ہر وقت ابّا کی صحت و تندرستی کی دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ ابّا کے اس خط نے بھی امّی جان کو مطمئن نہ کیا اور انھوں نے پھر ابّا کو خط لکھا کہ اپنی اس بیماری کی پوری تفصیلات لکھیے۔ ابّا نے امّی جان کو جواب میں ایک مفصل خط بھیجا جو ۶ نومبر ۱۹۶۲ء کو لکھا گیا تھا۔

بیگم صاحبہ!

آداب۔ آپ کا خط موصول ہوا۔ آپ میری بیماری کی تفصیلات پوچھنا چاہتی ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ

پر تحقیقات نہ پوچھیں اس لیے کہ یہ بیماری خطرناک ہی ہوتی ہے۔ بارے خدا کا شکر ہے دوسرے کمرے سے تو کوئی بھی نہیں۔ بہر صورت جس طرح بھی ایک طرف سے مطمئن ہوں ... چاہتا ہوں کہ آپ بھی ... لاؤں تو پہلے سمجھیا کہ آپ سے صاف ... جو کچھ ... تھا۔ لیکن یہ سوچنے کی کوشش کیجئے کہ اگر یہ بیماری نہ ہوتی تو ... ہو جاتے۔

در اصل چاولوں نے جسم میں ... ہوتی ہے وہ ... زیادہ بڑھ جاتا تو جسم کے کسی نہ کسی حصے میں جمع ہو جاتی ہے اور ہڈیوں کے ... میں خفت پیدا کر دیتی ہے اور اس کے ذرات خون میں شامل ہو کر دوران خون کے ساتھ دوسرے حصوں میں بھی ... اگر اس کا کوئی ذرہ دل سے نہ گزرے ... تو موت بھی ہو سکتی ہے۔

مگر مجھے شبہ ہے کہ یہ ... سے مجھے تکلیف ہے۔ پہلے تو یہ حال تھا کہ چت پڑا ... تو اس نے ... میری جان پر بن جاتی تھی پھر بمشکل تمام غسل خانہ تک جانے لگا اور رفتہ رفتہ اس قابل ہوا کہ ... تھوڑا بہت چل پھر سکوں۔ اب میں چل پھر سکتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے دفتر بھی آ جاتا ہوں ... ایک آدھ پارٹی میں بھی شرکت کر لیتا ہوں مگر اب تک اس قابل نہیں ہوا ہوں کہ جوتا پہن سکوں۔ پیر کے دونوں انگوٹھوں میں ابھی درد موجود ہے۔ ... کا گوشت ... دال، گوبھی، آلو، اروی، گرم مسالہ اور اسی قسم کی دوسری چیزیں مع چاول کے زندگی بھر کے لیے حرام کر دی گئی ہیں اور آج کل تو پرہیز اتنا سخت ہے کہ ڈیڑھ مہینے سے صرف ابلی ہوئی بے مسالہ چیزیں کھا رہا ہوں۔ حد یہ ہے کہ ... ساگ کا بدمزہ سوپ تک پینا پڑتا ہے جب تک یہ درد موجود ہے یہی کرنا پڑے گا اور اس درد کے جانے کے بعد بھی شدید احتیاطیں کرنا پڑیں گی اس لیے کہ یہ کمبخت تو اب لگ ہی چکا ہے۔

دفتر والوں نے فی الحال یہ اجازت دے رکھی ہے کہ میں کم سے کم کام کروں اور جتنا کام چاہوں گھر پر کروں اور جتنا چاہے دفتر میں کر دوں بہر صورت اُمید ہے کہ انہی احتیاطوں کے سہارے چلتا رہوں گا۔

یہ میری بہو کے مبارک قدم ہیں کہ میں اس سخت حملے سے بچ گیا اور خورشید اس سخت حادثے کے باوجود محفوظ رہا۔ خدا کرے خورشید اب بخیریت ہو میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

بچوں کو میری طرف سے متفکر نہ ہونے دیجئے گا اور یہ واقعہ بھی ہے کہ خطرہ بڑی حد تک ٹل چکا ہے بس اب دعا کیجئے کہ دوسرا حملہ نہ ہو۔

معلوم نہیں دلہن لاہور میں ہیں یا کراچی روانہ ہو گئیں۔ سعید کو چاہئے کہ جب تک کوئی معقول طور

---

۱ سعید بھائی جان کی بیوی ۲ اُسی دوران میرا اسکوٹر ACCIDENT ہوا تھا۔

مستقل انتظام نہ کریں دلہن کو نہ بلائیں بہرحال وہ خود سمجھداری سے کام لیں گے۔
دلہن۔ خورشید اور بابا کو بہت بہت دعائیں۔

خیر اندیش شوکت

اچانک میری شادی کا پروگرام بنا، ابا کو تار کے ذریعے مطلع کیا گیا۔ گھر میں شادی کی چہل پہل تھی اور ہر شخص بڑی بے چینی سے ابا[1] کا منتظر تھا کہ شام کی ڈاک سے ایک خط ابا کا بھائی جان[2] کے نام پہنچا اور گھر کی ساری چہل پہل جیسے سو گئی۔ خط کا مضمون تو مجھے یاد نہیں کیونکہ وہ خط بھائی جان کے نام تھا اور انہی کے پاس محفوظ ہے البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ شادی کے دوسرے روز ولیمہ میں ضرور شریک ہوں گے اور میرے سہرے کے کچھ شعر لکھ کر بھیجے تھے جو میری زندگی کا ایک عظیم سرمایہ ہیں۔

[illegible] میرے تارِ نظر کا سہرا
میرے بیٹے میرے خورشید قمر کا سہرا

یہ تو زر کا ہے نہ ہے لعل و گہر کا سہرا
ہے سعیدہ کی دعاؤں کے اثر کا سہرا

گوندھے ہیں دل بھی مرا سہرے کی لڑیوں میں کئی
کیوں نہ ہو یہ ہے میرے لختِ جگر کا سہرا

ہنستے دیتے ہیں سعیدؔ اور کھلے جاتے ہیں سعیدؔ
دیکھ کر بھائی کے سر پر گلِ تر کا سہرا

چاندنی ایک دلہن اور ہے دولہا خورشید
کیوں نہ پھر اس کو کہیں شمس و قمر کا سہرا

ہو گئے دختر کے فرائض سے سبکدوش رشیدؔ
شاد ہیں دیکھ کے اب بیٹے کے سر کا سہرا

حاصلِ زیست ہے یہ دن کہ ہے دیکھا شوکتؔ
شبِ امید کی تابندہ سحر کا سہرا

شادی کے روز یہ سہرا میرے چھوٹے بھائی بابا[3] نے پڑھا اور جس نے بھی سنا اسے اس قدر پسند آیا کہ اس نے بار بار پڑھنے کی فرمائش کی۔ میرے خسر جناب ایم اے رشید صاحب[4] سہرے کو سن کر بے ساختہ کہا "یہ سہرا کوئی بڑے سے بڑا شاعر نہیں کہہ سکتا صرف باپ ہی کہہ سکتا ہے" پتہ نہیں اس سہرے میں کیا بات تھی — شاید جذبات کی اس قدر فراوانی تھی کہ جس نے بھی سنا آنکھ میں آنسو بھر لایا۔

میں بھی دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کہ ابا کیوں نہیں آئے کہ دوسرے روز ابا کا ایک مختصر سا خط پہنچا کہ "بیٹا! میرے نہ آ سکنے پر اپنا دل میلا نہ کرنا۔ بخدا میں آنے کے لیے بالکل تیار تھا کہ ایکدم بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا کہ ڈاکٹروں نے سفر کی قطعی ممانعت کر دی اور میں آنے سے مجبور ہو گیا — بہرصورت میں اپنی بہو کا خیر مقدم انشاء اللہ جلد ہی کسی اور موقع پر کروں گا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیروں گا۔ فی الحال تم مجھ کو روحانی طور پر وہاں موجود سمجھو"!

۱۴ جنوری ۱۹۶۳ء کو مجھے خوب تیز بخار چڑھا اور میں پسلیوں میں شدید درد سے کر بستر پر لیٹ گیا پہلے تو ڈاکٹر نے نمونیہ تشخیص کیا لیکن جب مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی تو ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنی رائے بدلی۔ خون ٹسٹ ہوا، ایکسرے کرایا گیا اور آخر مجھے شدید قسم

---

[1] میری والدہ محترمہ [2] میرے بڑے بھائی جان [3] میرا چھوٹا بھائی (بابا) [4] میرے خسر کا نام

یوں بنا دی گئی۔ ایک بار پھیپھڑا پانی میں منجمد ہوا تھا۔ سارا گھر پریشان تھا۔ ڈاکٹر پہرے دیتے تھے۔ میں وہ کمبخت ہی بستر پر تھا۔ یہ درست کی طرف سے بے حد فکر مند تھا اور رو رو کر اپنی جان ہلکان کئے جا رہا تھا کہ "ابا یاد آ رہے ہیں" امی جان نے میری یہ تمام حالت ابا کو لکھ کر بھیج دی تھی جس کے جواب میں ابا نے ۲۶ر جنوری ۱۹۶۲ء کو راولپنڈی سے مجھے یہ خط لکھا۔

پیارے بیٹے خورشید۔ جیتے رہو

تم نہایت بیوقوف آدمی ہو کہ ہماری اور بیماری کے سلسلے میں ملازمت سے پریشان ہو گئے ہو۔ تم اطمینان رکھو کہ تمہارا باپ تم سے دور سہی مگر تم سب اس کی دعاؤں سے بہت قریب ہو۔ میں اللہ تعالیٰ سے تم سب کی صحت اور زندگی کی بھیک مانگتا رہتا ہوں اور مجھے پورا اعتقاد ہے کہ میری یہ دعائیں وہ بے نیاز قبول بھی کرتا ہے۔ میں نے ابھی حکیم نیر واسطی کو خط لکھ دیا ہے وہ ضرور تم کو آ کر دیکھیں گے۔ میں نے صفدر میر صاحب کو بھی خط لکھ دیا ہے وہ بھی تمہاری رخصتوں میں تم کو نقصان نہ پہنچنے دیں گے۔ اور ہر اعتبار سے اللہ کا فضل رہے گا۔ تم ہرگز نہ گھبراؤ اور پوری طرح اطمینان رکھو کہ تم کو انشاءاللہ میری زندگی میں کوئی نقصان نہ پہنچ سکے گا۔

میں نے سنا ہے کہ تم روتے رہتے ہو۔ نہایت احمق ہو۔ تمہاری دلہن بھی کیا کہتی ہوگی کہ کیسا رونا میاں ملا ہے۔ اپنے دل کو مضبوط کرو۔ علاج اور پرہیز کا خیال رکھو۔ ملازمت کی فکر نہ کرو۔ اللہ مالک ہے۔ یہ فکر تمہاری نہیں میری ہے۔ اچھا بس آج سے تم یہ یقین کر لو کہ تم اچھے ہو رہے ہو اور انشاءاللہ بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔

میں عنقریب لاہور آ کر اپنے بیٹے سے ضرور ملوں گا اور تندرست بیٹے سے ملوں گا۔ بابا کو حکیم صاحب کے پاس بھیج دو، وہ ان کو لے آئے اور ٹیلیفون پر ان سے وقت مقرر کرے۔ اپنی امی کو تسلی دو۔ خود بھی اطمینان رکھو اور اپنی دلہن سے نخرے بھی نہ کرو۔ اس کے آنسو پونچھو۔ دلدار کرو اس کا اور ٹھیک ہو جاؤ۔

سعید دلہن کو اور خورشید دلہن کو دعائیں کہو۔ بابا کو پیار کرو۔ اپنی امی کو آداب کہو۔

تمہارا دعا گو ابا

شوکت

ابا کے اس خط نے مجھے بہت بڑا سہارا دیا اور میں نے جلدی جلدی سنبھلنا شروع کر دیا۔ حکیم نیر واسطی صاحب مجھے آ کر دیکھ گئے تھے اور بھائی جان بھی میری بیماری کی اطلاع پا کر کراچی سے چھٹی لے کر لاہور آ گئے تھے۔ علاج پورے زور شور کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز میری خیریت معلوم کرنے کے لیے ابا کا خط امی جان کے پاس آتا تھا۔

۸ر فروری ۱۹۶۲ء کو ابا کا ایک اور خط میرے نام پہنچا۔

میری جان۔ میری عمر تجھے لگے۔

خورشید خدا کے لیے یقین کر لو کہ میں راولپنڈی میں ہوں مگر میری روح تمہارے پاس ہے کہ تم جلد میرے لیے تندرست ہو جاؤ گے۔ دیکھو میں تم کو بتا دوں۔ تم کو یاد ہوگا لکھنؤ میں میرے ایک دوست تھے بر...

ماں کو شدید پلوریسی تھی خدا کے فضل سے اب تک ڈنڈے بجاتے پھرتے ہیں۔ ہماری جان سے عزیز باجی قمر صاحبہ کو شدید پلوریسی تھی مگر انتقال قلب کی وجہ سے ہوا اور نہ جانے پلوریسی کے کتنے مریض ہنستے کھیلتے تندرست ہو چکے ہیں۔ میرا چاند بھی اسی طرح ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ۔ حکیم نیر واسطی صاحب کا اطمینان بخش خط مجھ کو مل چکا ہے۔ سعیدہ کا خط بھی مل گیا ہے مگر میں جس قدر بھی جلد ہو سکا اپنے بیٹے کی دیدہ جوئی کے لیے آؤں گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ تم جلد سے تندرست ہو۔

اچھا اب ایک کام فوراً کرو کہ بابا کو بلا کر حکم دو کہ وہ میری کتابوں اور تصویروں وغیرہ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر خواہ گروپ میں ہوں یا علیحدہ علیحدہ مندرجہ ذیل لوگوں کی جتنی تصویریں بھی مل سکیں فوراً رجسٹری کے ذریعہ مجھے بھیج دے ایک کتاب کے لیے شدید ضرورت ہے۔ بیٹے! یہ کام میں تم سے لیتا مگر تم بیمار ہو تو اپنی نگرانی میں بابا سے یہ کام کرا دو۔ جن لوگوں کی تصویریں درکار ہیں، وہ یہ ہیں: (۱) مولانا آسی (۲) سید جالب دہلوی (۳) [illegible] (۴) ابن سونوی (۵) نسیم انہونوی (۶) سراج (۷) قدیر (۸) رفیع احمد خاں (۹) ظریف لکھنوی

ان میں سے سب نہ سہی جن جن کی تصویریں ملیں اور میری اگر پرانی تصویریں ہوں تو بھیج دو۔ خصوصاً داڑھی والی تصویر بہت ضروری ہے۔ میں یہ سب تصویریں بلاک یا فلم بنوا کر واپس کر دوں گا۔ میری کچھ دن پہلے کی تصویریں بہت ضروری ہیں۔

اچھا اب تم تندرست ہو جاؤ اور میری بقیہ عمر کا تحفہ قبول کرو۔ اپنی امی کو تسلیم کہو سعدیوں کو دعا۔ بابا کو پیار

تمہارا ابا شوکت

میری طبیعت بستر ہو رہی تھی اس کے باوجود ابا کی غیر موجودگی کی وجہ سے میں نے آزاد ہو کر میں نے خط لکھا جس کا جواب ابا نے ۱۸ سنہ ۱۹۶۳ء کو مجھے دیا۔ جو کہ میرے نام ابا کی زندگی کا آخری خط ہے۔ بلکہ میرے نام کیا غالباً اس خط کے بعد انہوں نے کسی کو خط نہیں لکھا اور یہ ان کے خطوط کی آخری تحریر ہے اگر پھر اس کے بعد کسی اور کو خط لکھا ہو تو میرے علم میں نہیں ہے۔

۱۸ مارچ سنہ ۱۹۶۳ء

پیارے خورشید سلامت رہو!

تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا خط میرے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ تم کو صحت عطا فرمائے۔

میں نے بھی حامد جلال صاحب کو خط لکھ دیا ہے۔ تم کوئی فکر ملازمت وغیرہ کی نہ پالو جان ہے تو جہان ہے۔

میاں کاش میں تم کو لکھ سکتا کہ میں صحت کے سلسلہ میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ صحت بگڑتے بگڑتے اس حالت پر آ پہنچی ہے کہ اب پندرہ دن سے بالکل صاحب فراش ہیں۔ بخار تو نہ جانے کب سے شام کو ہو جایا کرتا تھا اور اندر ہی اندر مجھ کو گھلا رہا تھا مگر میں نے اس کی پروا نہ کی۔ لاہور کے مشاعرے میں گیا تو بابا اور رشیدہ کو خود دکھا دیا تھا کہ لو دیکھ لو بخار اس وقت بھی ہے۔ بہرحال اس بخار کے بعد کھانسی اور کھانسی کے بعد بلغم کے معائنے اور نہ جانے کیا کیا شروع ہوا اور مجھ کو بالکل لٹا دیا گیا۔ مجھ سے اب تک کہا تو یہی جا رہا ہے کہ کوئی

نامی بات نہیں کوئی خلاف بات نہیں مگر بہت سی باتیں شاید اپنے عزیزوں اور بچوں سے چھپا رہا ہوں کہ سب کو خواہ مخواہ پریشان کیوں کروں۔

میں انشاءاللہ ضرور بہت جلد صرف اس سلسلے کو ختم کر کے آنے کا ارادہ رکھتا ہوں تم ہرگز فکر نہ کرنا۔ ۲۲ تاریخ کو نئے گورنر صاحب چارج لیں گے لہٰذا میں ۲۲ تاریخ تک کسی نہ کسی طرح وہ جو ریزرو ہیں ہوں گا۔ پھر لاہور کے ڈاکٹروں سے اپنا معائنہ بھی کراؤں گا۔ اس دوران تم سے بھی انشاءاللہ ضرور ملوں گا۔ سب کو سلام دعا کہہ دو۔ بابا کو پیار۔ اپنی والدہ کو سب دعائیں ہوں

تمہارا — شوکت

آپ کے اس خط نے سارے گھر کو بدحواس کر دیا۔ امی جان نے خیریت معلوم کرنے کے لیے فوراً ایک خط راولپنڈی روانہ کیا جس کا کوئی جواب نہیں ملا سوایا تین دن بعد ۲۳ مارچ بھی آ گئی کہ جب ابا کو لاہور آنا تھا۔ ہم کو ۲۳ مارچ کی صبح اخبار سے یہ اطلاع ملی کہ کل ابا نے گورنر ہاؤس میں گورنر صاحب سے تعلقہ اختیار کیا ہے۔ اس خبر سے قدرے اطمینان ہوا اب ہم کو ابا کا انتظار تھا۔ جب تین چار دن گزر گئے تو ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ ابا واپس پنڈی چلے گئے کیونکہ جتنے دن پنڈی سے غیر حاضر رہنا ابا کے لیے مشکل تھا۔ میں اس خیال سے کہ ابا پھر ہم لوگوں سے ملے بغیر واپس چلے گئے بہت غمگین تھا۔ اس دوران میں نے ایک خط ابا کو لکھنا شروع کیا لیکن پتہ نہیں کیوں وہ نامکمل رہ گیا اور آخر وہ منحوس گھڑی بھی آ گئی جب مجھے ابا کی تشویشناک حالت کی اطلاع ملی۔ یہ یکم اپریل ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ میرا چھوٹا بھائی بابا اپنی بھابی فریدہ کے ساتھ مل کر اپنے دوستوں کو فرسٹ اپریل فول بنا رہا تھا کسی کو نمکین کھیر کھلائی جاتی اور کسی کو پان میں پسی ہوئی سرخ مرچ ڈال کر کھلائی جاتی اور کھانے والا "ہو ہو" کر کے بھاگتا۔ رات کے ۹ بجے ہوں گے کہ مجھے اطلاع ملی کہ ابوالحسن نقی صاحب تشریف لائے ہیں۔ نقی صاحب میرے پاس کمرے میں آ گئے اور بابا، فریدہ نے جلدی جلدی نمکین کھیر تیار کی لیکن اس سے پہلے کہ نقی صاحب وہ نمکین کھیر کھاتے انہوں نے یہ کہہ کر ہم لوگوں کے حلق میں تیزاب انڈیل دیا کہ "شوکت صاحب کی حالت بہت تشویشناک ہے۔ ان کے جگر پر کینسر ہو گیا ہے اور وہ اس وقت کراچی میں اپنی چھوٹی بیگم کے گھر پر زیر علاج ہیں" مجھے نہیں یاد کہ پھر اس کے بعد میں نے نقی صاحب سے کیا باتیں کیں یا انہوں نے کیا کچھ کہا۔ جب میرے ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو نقی صاحب جا چکے تھے اور بابا بیٹھا ہوا مجھ کو سمجھا رہا تھا "بھائی جان اپنے آپ کو سنبھالیے، دیکھیے آپ کی طبیعت خود ٹھیک نہیں ہے اگر آپ نے اتنا اثر لیا اور خدانخواستہ آپ کی طبیعت پھر گڑبڑ ہو گئی تو کیا ہوگا۔ اللہ پر بھروسہ رکھیے انشاءاللہ یہ خبر غلط ہو گی۔"

امی جان کو جب ابا کی بیماری کی خبر ہوئی تو وہ ایکدم سے اپنے حواس کھو بیٹھیں اور ہر وقت جھولی پھیلائے اللہ کے آگے گڑگڑاتی رہتیں۔ ان کی حالت بھی نہیں دیکھی جاتی تھی رات دن جائے نماز بچھائے بیٹھی رو رہی ہیں اور ابا کی صحت و تندرستی کی دعا مانگ رہی ہیں۔

بھائی جان کو بھی بابا نے اطلاع دے دی تھی اور وہ لاہور آنے کے لیے چھٹی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ابھی تک مجھ کو چلنے پھرنے کی اجازت بالکل نہیں دی تھی اور میں ابا کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

۲ اپریل ۱۹۶۳ء کو ابا میو ہسپتال لاہور کے [illegible] میں داخل ہو گئے۔ میں ابا کی بیماری اور امی جان کی بدحواسی سے سخت گھبرا گیا۔ [illegible] تاریخ کو بھائی جان بھی لاہور پہنچ گئے اور آتے ہی ابا کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ بھائی جان صبح ہسپتال جاتے اور رات گئے گھر واپس آتے۔ بابا اور رشیدہ آپا بھی زیادہ وقت ہسپتال ہی میں گزارتیں۔ یہاں گھر پر امی جان، فریدہ اور میں ہر وقت اللہ سے دعائیں مانگتے رہتے۔ میری زبان پر تو جیسے یہ کلمہ ورد ہو گیا تھا کہ "خدا میرے ابا کو اچھا کر دے۔ خدا میرے ابا کو اچھا کر دے۔" سوتے جاگتے ہر وقت یہی کلمہ زبان پر ہوتا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور ایک روز میں ڈاکٹر سے زبردستی اجازت لے کر بھائی جان کے ساتھ ابا کو دیکھنے ہسپتال پہنچ گیا۔ اب میں کیا بتاؤں وہاں جا کر میں نے کیا دیکھا۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ اگر بھائی جان میرے ساتھ نہ ہوتے اور مجھے نہ بتاتے تو میں ابا کے پاس سے گزر جاتا اور انھیں نہ پہچان سکتا۔ ابا کو اس حال میں دیکھنے کے لیے میں تیار نہ تھا اور مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

ابا نے مجھ کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے "بیٹا تم کیوں آئے؟"

بھائی جان نے جلدی سے آگے بڑھ کر ابا کو تسلی دی کہ میں ڈاکٹر کی اجازت لے کر ہسپتال آیا ہوں اور اب مجھے ڈاکٹر نے اجازت دے دی ہے کہ میں تھوڑا بہت چل سکتا ہوں۔

ابا نے آنکھ کے اشارے سے مجھے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا اور پھر ان پر غشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے آنکھ کھول کر اشارے سے بھائی جان کو بلایا اور بہت ہی آہستہ بولے "بیٹا تمھاری دلہن کراچی میں ہے؟ خورشید کی دلہن کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔"

بھائی جان نے ابا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا "خورشید تو آج ہی فریدہ کو ساتھ لا رہے تھے لیکن میں نے روک دیا کیونکہ ہسپتال کے ڈاکٹر زیادہ آنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ بہرحال کل فریدہ بھی آ جائیں گی۔"

میری تینوں بہنیں شوکیہ، فوزیہ اور فیضیہ بھی اپنی بھابی سے ملنے کے لیے بے تاب تھیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور فریدہ کو لے کر آؤں گا۔ اتنے میں میجر صاحب (نسیم ممتاز سید) بھی آ گئے۔ ان بیچاروں نے تو ابا کی محبت میں اپنے کو بالکل وقف کر لیا تھا۔ ابا نے میجر صاحب کو دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بڑی محبت سے بولے "سید اپنے ہاتھ سے ایک پان تو کھلا دو۔ شاید سید کے ہاتھ کا پان کھا کر شفا ہو جائے۔"

ادھر امی جان کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ کسی بات کا ان کو ہوش نہیں تھا، نہ کھانے پینے کا اور نہ کپڑوں کا۔ دن میں دو تین بار اختلاج کا دورہ پڑتا تھا اور بلڈ پریشر ایکدم خطرے کی حدوں میں پہنچ گیا تھا اور وہ مچل رہی تھیں کہ کسی طرح مجھ کو اپنے ابا کے پاس ہسپتال پہنچا دو جبکہ ڈاکٹر اور ابا کے دوستوں کی قطعی رائے نہیں تھی کہ اس عالم میں امی جان ہسپتال آئیں۔ قطعی ممکن تھا کہ اس حال میں ابا کو دیکھ کر وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال پائیں اور پھر اس کا اثر مریض پر کتنا خراب پڑے گا۔ اس لیے ہم لوگ ہر طرح سے امی جان کو ٹال رہے تھے کہ ابھی ابا سے ملنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ ہم لوگ بھی باہر ہی باہر سے خیریت معلوم کر کے آ جاتے ہیں۔ ذرا ان کی طبیعت سنبھل جائے پھر جا کر دیکھ لیجیے گا۔

دوسرے دن جب میں ہسپتال گیا تو فریدہ بھی میرے ساتھ تھی۔ شوکیہ، فوزیہ اور فیضیہ بڑی دیر سے ہسپتال میں اپنی بھابی کی منتظر تھیں۔ جیسے ہی ہم دونوں کو آتا دیکھا تینوں دوڑ کر اپنی بھابی سے لپٹ گئیں۔ ابا نے فریدہ کو دیکھا تو مارے محبت کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے

[illegible] بات سوچ سلام کیا تو بہت [illegible] اور پھر [illegible] بھائی جان کو مخاطب کر کے بولے: [illegible] رشید [illegible]

پھر [illegible] ہو کر بولے: [illegible]

[illegible] جس طرح تمہاری [illegible]

۲۸ [illegible] بھائی جان کی [illegible] پر [illegible] گھبرانے کی کیا بات ہے؟

بہت ہی نقاہت سے بولے: گھبرا نہیں رہا ہوں بیٹا [illegible] کاش سعید کل اور رک جاتا!

میں نے پوچھا: کل کیا کوئی خاص بات ہے؟

کہنے لگے: ہاں بیٹا کل [illegible] دیکھنا [illegible] ایرکنڈیشنڈ کر دیا جائے گا اور میری یہ مسہری بدل دی جائے گی۔

اس بات کا مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس دن صبح [illegible] مرغ [illegible] کے تحت آئے تھے اور انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ یہ کمرہ بہت چھوٹا اور [illegible] ایرکنڈیشنڈ ہونا چاہئے [illegible] تو انھوں نے حکم صادر کر دیا تھا کہ کل شوکت صاحب کا کمرہ ایرکنڈیشنڈ کر دیا جائے اور ان کی یہ مسہری بدل دی جائے۔

اب سوچتا ہوں کہ ابا کا یہ کہنا کہ کل یہ کمرہ ایرکنڈیشنڈ کر دیا جائے گا اور میری مسہری بدل دی جائے گی۔ ایک طنز نگار کا ایک آخری طنز تھی۔ ان لوگوں پر جو ان کا پروگرام بنا رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کل کیا ہونے والا ہے تب ہی تو وہ کہہ رہے تھے کہ کاش سعید کل اور رک جاتا!

ابا کی طبیعت اب کافی سنبھل گئی تھی اور بڑے مزے میں باتیں کر رہے تھے رات کے گیارہ بجے خود ہی بولے: بیٹا اب تم لوگ جاؤ، میرا سونے کا پروگرام ہے۔

ہم لوگ رخصت ہونے لگے تو بابا نے کہا: ابا وعلیکم السلام۔

مسکرا کر بولے: دیکھو کتنا شریر ہو گیا ہے۔

میں بابا کو لے کر گھر واپس آگیا۔ تھوڑی دیر بعد بھائی جان بھی آ گئے اور اپنی صبح کی روانگی کی تیاری کرنے لگے۔

صبح ناشتہ سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے: رات ابا سے کہہ تو آیا ہوں لیکن پھر سوچتا ہوں جا کر سلام کر لوں اور دیکھ آؤں۔

امی جان نے کہا: ہاں ہو آؤ لیکن جلدی واپس آجانا۔

اور واقعی بھائی جان بہت جلدی یتیم ہو کر گھر واپس آ گئے۔ ہم لوگ لٹ گئے، ہمارا گھر تباہ ہو گیا تھا۔ بھائی جان پچھاڑیں کھا رہے

تھیں۔ سینہ کوٹ رہی تھیں۔ بال نوچ رہی تھیں اور ہر ایک سے لپٹ لپٹ کر پوچھ رہی تھیں۔ بتاؤ یہ کیا ہوا۔ کہہ دو کہ بخیر طلعت جو میکا ان کی یہ حالت دیکھتا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ رشید بھیا، فرحہ اور فریدہ کی حالت ردی ہی رہی تھیں اماں جان کو بھی سنبھال رہی تھیں۔ بابا بیچارہ ایک طرف چپ۔ ہانا۔ سانی جان مجھے سینے سے لگائے کھڑے خود رو رہے تھے اور میرے آنسو پونچھ رہے تھے جب میں زیادہ نڈھال ہونے لگا تو سانی جان مجھے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لا کر سمجھانے لگے "خورشید تم لوگ تو خوش قسمت ہو۔ ایسے شخص کے بیٹے ہو کہ جس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور جب تک شوکت تھانوی کا نام زندہ ہے تمہارا باپ زندہ ہے۔ اور تم اس طرح رو دو گے تو بابا کی روح کو کس قدر تکلیف ہوگی۔ تمہیں یاد ہے ایک خط میں انہوں نے تم کو لکھا تھا کہ میری بقیہ عمر کا عذر نہ کرو گے۔ انہوں نے اپنا تحفہ دے دیا۔ انشاء اللہ میں بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرو۔"

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو اوپر اٹھایا اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا "خدا میرے ابا کو [illegible] کرے۔"

•

جو نہ مرتا کوئی دن اور ـــــ

عادل رشید

شوکت تھانوی: ابھی اس دنیا میں ۔۔۔ یہ جملہ [illegible] نے غزلوں [illegible] سب سے پہلے جانا تھا [illegible] میں شوکت صاحب غزل کہتے تھے، وہ ابھی شوکت تھانوی نہیں بنے تھے۔ اس وقت وہ [illegible] سکول میں نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ [illegible] وقت ابھی ماں کی گود میں [illegible] پرورش [illegible] اس وقت میری [illegible]۔

۱۹۲۶ء میں محمد عمر صاحب لکھنؤ سے ہمدم اخبار میں [illegible] جناب [illegible] صاحب [illegible] رہتے تھے، [illegible] وہ جناب [illegible] صاحب سے اپنے مضامین پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ وہ [illegible] جناب [illegible] صاحب سے اصلاح لیتے تھے۔ میں اپنے گاؤں رشید [illegible] میں کاشتکاروں، کسانوں اور [illegible] کے لڑکوں کے ساتھ کھیلوں [illegible] کھیتوں اور باغوں میں کھیل رہا تھا۔ اور جب یہ محمد عمر صاحب [illegible] "ہمدم" [illegible] "شوکت تھانوی" کے نام سے باقاعدہ طور پر مشہور ہونے لگے۔ تو میں اپنی حویلی کے باہر مردانے میں مرزا صاحب کے پاس بسم اللہ شروع کرنے کے لئے [illegible] دیا گیا۔ میری بسم اللہ [illegible] دھوم دھام سے ہوئی تھی شوکت تھانوی صاحب کا مزاحیہ کالم اس سے کہیں زیادہ دھوم دھام سے پڑھا جانے لگا۔ ان کے مزاحیہ فقرے، ادبی [illegible] یں زبانوں کو مزا دینے لگے۔

میں اپنے مرزا صاحب سے جب الف دو زبر ان اور بے دو زبر بن پڑھ رہا تھا اس وقت شوکت تھانوی صاحب کی شہرت دن دونی رات چوگنی کے حساب سے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب میں [illegible] ہائی سکول، گنج، الٰہ آباد میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا تو شوکت تھانوی صاحب "سرپنچ" لکھنؤ کے مدیر محترم ہو کر اپنے مزاح سے لڑکوں کو پاگل اور دیوانہ بنا رہے تھے۔ ہر ہفتہ "سرپنچ" لکھنؤ کی آمد کا انتہائی بے صبری کے ساتھ انتظار کیا جاتا۔ اور جب نئے ہفتہ کا "سرپنچ" آ جاتا تو لوگ ہنس ہنس کر اور قہقہہ لگا لگا کر پاگل ہو جاتے۔

ایک [illegible] شوکت صاحب کی اس مزاح نگاری نے ہم سب پر بڑا احسان کیا۔ ہمارے حساب اور اردو کے ماسٹر صاحب انتہائی بدمزاج، روکھے پھیکے اور [illegible] قسم کے انسان تھے۔ وہ کلاس میں آتے تو ہم سب کا ڈر کے مارے خون خشک ہو جاتا۔ وہ کسی نہ کسی بات پر ہم لڑکوں کو گدھے کی طرح پیٹنے لگتے تھے۔ حساب کا گھنٹہ آیا اور وہ [illegible] ہاتھ [illegible] کی شکل میں ہماری کلاس پر حملہ آور ہوتے

ہم سب اپنے اپنے چہروں پر پریشانیاں لئے اور دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا وظیفہ پڑھتے ہوئے الٹا کر کھڑے ہوگئے۔ ہم سب سوچ رہے تھے دیکھیں آج سب سے پہلے کس کمبخت کی موت آتی ہے۔ اور وہ پیر کی کلاس میں آتے ہی اپنی کرسی کے پاس کھڑے مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے۔ اُن کے ہاتھ میں کوئی اخبار تھا۔ وہ ہنسے ہم سب کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

"جانتے ہو یہ کیا ہے۔ ؟"

پھر خود ہی بتانے لگے

"یہ سرخاب ہے، لکھنؤ کا ہفت روزہ مزاحیہ اخبار"

ہم سب دم بخود کھڑے تھے، حیرت اور تعجب سے سرخاب کے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اس۔؟ یہ آج وہ کون سی دیوار پھاندی ہے۔ جسے دیکھ دیکھ کر ماسٹر خاں صاحب، جو سدا کی خونخوار اور قہری صورت پہ مسکراہٹیں سجائے کھڑے ہیں۔ کہ وہ یکایک کرسی پر بیٹھ گئے مسکرا کر ہم سب سے بڑی شفقت کے ساتھ بولے۔

"بیٹھ جاؤ—"

ہم سب بیٹھ گئے۔ حیرت و تعجب میں غرق ہو رہے۔

"شوکت کا نام سنا ہے کبھی۔ !"

"جی ہاں — میں نے ہی ڈرتے ڈرتے ادب سے اور نہایت مری مری آواز سے بولا۔ "شوکت آج اسکول نہیں آیا۔ ماسٹر صاحب اس کی درخواست آئی ہے۔ وہ بیمار ہے۔"

"ابے چپ۔" وہ مسکراتے ہنستے ہوئے بولے "میں اس گدھے شوکت کی بات نہیں کر رہا۔ میں ہندوستان کے مزاح نگار شوکت تھانوی کی بات کر رہا ہوں۔"

میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جانتے ہو تم شوکت تھانوی کو —؟"

"جی نہیں —" میں ڈرتے ڈرتے ادب سے بولا۔

"گدھے ہو۔" انہوں نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "سنو تم لوگ، میں شوکت تھانوی صاحب کا ایک مضمون تم لوگوں کو سناتا ہوں"

مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس وقت یہ یاد نہیں آ رہا کہ وہ شوکت تھانوی صاحب کا کونسا مضمون تھا۔ لیکن اتنا یاد ہے مجھے کہ وہ مضمون اتنا دلچسپ تھا کہ ہم لوگ جو کہ ان ماسٹر صاحب کو شیر ببر اور بھیڑیا سمجھتے ہوئے ہمیشہ اُن کے سامنے چہروں پر ہوائیاں لئے ڈر سے ڈبکے رہتے تھے۔ یکدم سے مسکرانے لگے۔ اور پھر ہم سب ان شیر ببر اور بھیڑیئے صاحب کے سامنے اُن کی موجودگی میں شوکت تھانوی صاحب کی مزاح نگاری کے جادو سے مسحور ہو کر زور زور سے ہنسنے اور قہقہے لگانے لگے اور یہ گھنٹہ، یہ پیریڈ یونہی ہنستے ہنستے ختم ہو گیا۔

جب چپراسی نے دفتر کے پاس ٹنگے ہوئے گول گھنٹے پر ایک زور کی ضرب لگائی اور گھنٹہ کے ختم ہونے کا اعلان کیا تو ماسٹر صاحب جو کہ خود بھی ہنستے ہنستے پاگل ہو گئے تھے جن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اپنے رومال سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے بولے۔

"تھانیدار چودھری شوکت تھانوی صاحب [illegible] کر رہے تھے"

وہ اٹھ کر چلے گئے۔ ہم سب نے شوکت تھانوی [illegible]

[illegible] دیکھ کر مجھے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا

شوکت تھانوی صاحب زندہ [illegible]

شوکت تھانوی جیسے اپنے محبوب [illegible] آخری صحبت [illegible] محسوس ہو گئی۔

شوکت تھانوی صاحب کا نام اور [illegible] اسلامیہ ہائی اسکول [illegible] پڑھتا تھا [illegible] لائبریری پہنچتا تھا۔ اس وقت جب شوکت تھانوی کی [illegible] شخصیت [illegible] ہندوستان کا مقبول ترین مزاحیہ اخبار تھا اور شوکت تھانوی صاحب کے مضامین [illegible] نام سے شائع ہو چکے تھے۔ [illegible] لائبریرین صاحب سے شوکت تھانوی صاحب کے [illegible] اپنے نام لکھوا کر لے جاتا اور وہیں بیٹھ کر پڑھنے لگتا۔ پڑھتے پڑھتے بے اختیار [illegible] ہنس پڑتا [illegible] ہی جاتا۔ مگر لائبریری کا خیال [illegible] اپنے قہقہوں کو [illegible] میرے دوست سید حامد حسن صاحب [illegible] شوکت تھانوی کے دیوانے [illegible] ساتھ لائبریری جانے لگے۔ ہم دونوں شوکت کے دیوانے [illegible] قہقہوں [illegible] ایک دوسرے [illegible] ایک ایک فقرہ [illegible] جاتے۔ اور [illegible] کھی کھی کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ لائبریری میں [illegible] دوسرے [illegible] والے ہم دونوں کو [illegible] سے چڑ گئے۔ اور ہمیں لائبریری میں [illegible] نظروں سے دیکھا جانے لگا۔

ایک دن لائبریرین صاحب کی طرف سے حکم ہوا [illegible] شرافت سے کتابیں پڑھو [illegible] ورنہ تم لوگوں کا داخلہ لائبریری میں بند کر دیا جائے گا۔"

پھر ایک دن وہ آیا کہ ہمیں شوکت تھانوی کی مزاح نگاری پر کھی کھی کھی کرنے کے جرم میں لائبریری سے بے عزت کر کے نکال دیا گیا۔

ہمارے اپنے محلے میں الہ آباد میں ہمارے عزیزوں کا پورا ایک محلہ دائرہ شاہ رفیع الزماں کے نام سے آباد ہے [illegible] رفیع الزماں کے نام سے ہی ایک لائبریری تھی۔ میں وقت کا زیادہ حصہ اسی لائبریری میں گزارتا تھا۔ شوکت تھانوی صاحب کا [illegible] آیا کرتا تھا۔ اسی کی ورق گردانی کیا کرتا۔ پڑھتا تھا تو شوکت تھانوی کو۔ باتیں کرتا تو شوکت تھانوی کی۔ اور اگر کسی ادیب کا احترام کرتا تھا تو شوکت تھانوی کا۔ پھر [illegible] کے ادارہ سے شوکت تھانوی صاحب کا ایک ادبی رسالہ شباب آنے لگا۔ شوکت تھانوی، نسیم انہونوی، ابن سلونوی، اویس احمد ادیب، ایم۔ اے (پی۔ اے۔ آنرز) اور خان محبوب طرزی (مرحوم) کے نام بار بار نظروں کے سامنے آنے لگے۔ اور میں ان ناموں میں کھویا رہنے لگا۔ لیکن ان سب ناموں میں شوکت تھانوی کا نام ایسا تھا جو دل و دماغ پر کبھی نہ مٹنے والا نقش بن کر رہ گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ایک کہانی لکھ کر اس زمانہ میں شوکت تھانوی کے پاس اصلاح کے لئے بھیجی۔ خط میں لکھا تھا کہ آپ اس کہانی پر اصلاح فرما دیں گے تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ اور اگر آپ اسے اپنے "سرپنچ" میں شائع فرما دیں گے تو دوہرا احسان مند رہوں گا۔ لفافہ میں کہانی رکھ دی۔ جس کے لئے میں نے ٹکٹ بھی رکھے تھے۔ یہ کہانی رجسٹری سے پوسٹ کرنے کے بعد میں ہر روز شوکت تھانوی صاحب کے جواب اور کہانی کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن وہ اصلاح ہو کر نہ آئی اور نہ اس کا کوئی خط ہی آیا۔ کوئی دو ہفتہ کے بعد سرپنچ میں ایک خط پڑھا جس میں کسی نے شوکت صاحب سے کہانی پر اصلاح کی فرمائش کی تھی۔ جواب تھا۔ "ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہم اصلاح کرتے پھریں وغیرہ وغیرہ۔" ظاہر ہے کہ یہ میرے ہی خط اور میری ہی حماقت کا جواب تھا۔ یہ بات اور ہے کہ وہ خط کسی اور کے نام سے چھپا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ اور پھر نہ شوکت صاحب کی طرف سے کوئی خط آیا نہ کہانی ہی واپس کی۔ ظاہر ہے کہ وہ ٹکٹ ضبط ہو گئے اور کہانی ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ سے شوکت صاحب کی وقعت اور ان کی اہمیت میرے دل سے کم نہیں ہوئی۔

۱۹۳۶ء میں "شاہد" ماہنامہ بریلی کا ایڈیٹر ہو کر جب میں بریلی پہنچا تو جاتے ہی میں نے دس یا پندرہ روپیہ معاوضہ دے کر "شاہد" کے لئے شوکت صاحب سے ایک کہانی منگوائی۔ کہانی کا عنوان تھا "میناریں گنبد"۔ یہ کہانی کچھ اچھی تو نہیں تھی۔ لیکن چونکہ میرے محبوب ادیب کی کہانی تھی۔ لہٰذا "شاہد" میں بصد شوق اسے شائع کر دیا۔

اس کے بعد کسی کام سے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ تو اب مجھے یاد نہیں رہا کہ کہاں اور کس مقام پر شوکت صاحب سے ملاقات ہوئی لیکن میں اپنے پسندیدہ ادیب سے ملا۔ شوکت تھانوی میرے سامنے موجود تھے۔ لیکن بات چیت نہ ہونے کے برابر اس لئے ہوئی کہ وہ ملک کے مانے ہوئے مزاح نگار تھے۔ اور میں بزعم خود "شاہد" ماہنامہ کا ایڈیٹر تھا۔ دونوں ہی کچھ کھنچے کھنچے سے رہے۔ وہ اپنی جگہ شاید درست اور میں اپنی جگہ پر خود غلط۔

شوکت صاحب کے کسی دوست کی طرف سے انہیں کے ایما پر دبے چھپے انداز میں اس بات کی بھی خواہش ظاہر کی گئی کہ میں اپنے رسالہ "شاہد" کے لئے ان سے مضمون مانگ لوں۔ لیکن میں نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ شاید اس لئے کہ شوکت تھانوی صاحب کا "میناریں گنبد" مجھے دل سے پسند نہ آیا تھا۔ یا شاید اس لئے کہ انہوں نے مجھے کوئی خاص لفٹ نہیں دی تھی۔ البتہ شوکت صاحب کی حالت سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ ہندوستان کا یہ عظیم مزاح نگار مالی اعتبار سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہے۔

پھر اس کے بعد کوئی ملاقات برسوں نہ ہو سکی۔ ان کے مضامین البتہ میں پڑھتا رہا۔ ان کے وہ مضامین جو اچھے بھی تھے اور بہت اچھے بھی اور برے بھی تھے۔

۱۹۴۲ء میں شوکت تھانوی صاحب کی چچا زاد بہن کی بیٹی عذرا سے میرے رشتہ کی بات چیت اتفاقیہ طور پر شروع ہوئی۔ شوکت تھانوی صاحب کے بھانجے سلمان الارشد صاحب میرے دوست تھے۔ عذرا ان کی سگی پھوپھی زاد بہن تھی۔ عذرا کے ماں باپ کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ اس کی پرورش اس کے ماموں ارشد تھانوی صاحب نے اپنی سگی اولاد ہی کی طرح کی تھی۔ جب یہ بات چیت شروع ہوئی تو میں شادی کے حق میں دل سے نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا چارم ضرور تھا کہ عذرا شوکت تھانوی کی بھانجی ہے۔

بہرحال میری شادی ۱۹۴۲ء میں عذرا کے ساتھ ہو گئی۔ ارشد تھانوی صاحب بھوپال میں رہا کرتے تھے۔ وہ وہاں کے مشہور وکیل تھے۔ عذرا کی شادی پر نہ جانے کس وجہ سے شوکت تھانوی صاحب شریک نہ ہو سکے۔ وہ اپنی بھانجی کی شادی پر لکھنؤ سے بھوپال نہیں آئے

ہے۔ میں ادارے کے حوالے ان کا ایک مضمون درج کرتا ہوں۔ شوکت صاحب نے بغرض اشاعت مجھے ارسال کیا ہے۔ وہ میں ایک خط میں جس کا نام خاص میں شوکت تھانوی نے ادبی مضامین لکھے ہیں۔ مجھے بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے دیکھنا نہ ہو سکا۔ وہ ہمارے حقیقی نہیں، میں نے سمجھا کہ بھیجیں تاکہ شمارہ مکمل ہو جائے گا۔ ایک مضمون میں بھیج رہا ہوں۔ تم شوکت نے شادی نمبر میں اسے شامل کر دو۔ یہ میں ضرور بھیج رہے ہیں یہ افسانہ بہتر ہے۔"

یہ مضمون اتنا پُرکشش، اتنا دلچسپ اور قیمتی تھا کہ شاید ہی پڑھنے کے بعد کوئی بھلا سکے۔ اردو کے ادیبوں نے اب تو صاحب نے یہ ایک کتاب میں شوکت تھانوی کے مضامین ادبی یادگار کی حیثیت سے شامل کیے۔

اس کے بعد کبھی شوکت تھانوی صاحب کا دورہ ہی تھا یا ان سے خود کبھی مجھ سے میرے پاس آتے رہتے تھے لیکن کبھی بھی ہم آگے نہ وہ بچھڑے اور نہ ہی بڑھے۔

۱۹۴۲ء میں "میر صاحب" میری ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ یہ میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ تھا۔ میری خواہش ہوئی کہ اپنی اس پہلی کتاب پر میں شوکت تھانوی صاحب سے دیباچہ لکھواؤں۔ چنانچہ اس غرض سے میں نے شوکت تھانوی صاحب کو لکھا۔ جواب آیا کہ میں کتاب کا مسودہ انہیں بھیج دوں۔ وہ اس پر بڑی خوشی کے ساتھ دیباچہ لکھ دیں گے۔

میں نے وہ مسودہ شوکت صاحب کو لکھنؤ بھجوا دیا۔ مسودہ کی رسید تو آ گئی۔ لیکن دیباچہ کافی دن گزر جانے کے باوجود جب نہ آیا تو میں نے انہیں اصرار کے ساتھ لکھا کہ وہ مجھے بغیر دیباچے کے مسودہ واپس کر دیں۔ بڑی کشمکش کے بعد مسودہ مجھے لکھنؤ سے بھیج دیا گیا۔ ساتھ میں شوکت صاحب کا یہ خط بھی تھا کہ وہ اس پر دیباچہ لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن میری جلد بازی کی وجہ سے بغیر دیباچے کے مسودہ بھیجا جا رہا ہے۔ انہوں نے مسودہ بھجوا دیا ہے۔ خط میں انہوں نے تاخیر کی معذرت اس بنا پر کی تھی کہ وہ سانگ پیشی کے سلسلے میں بہت مصروف رہے۔ اور اس تمام عرصہ میں وہ لکھنؤ سے تقریباً باہر رہے ہیں۔ لہٰذا تاخیر ہوئی ——

میں نے ان کے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ یہ کتاب "میر صاحب" بمبئی سے مکتبہ سلطانی بمبئی کی طرف سے سید ابراہیم کے دیباچے کے ساتھ چھپ گئی —— قصہ ختم ہو گیا۔

"میر صاحب" چھپنے کے کچھ دن بعد جب میں بھوپال گیا تو مجھے کسی کی زبانی معلوم ہوا کہ شوکت صاحب نے اس کتاب پر دیباچہ اس لئے نہیں لکھا کہ وہ ایک کمزور کتاب تھی۔ کہنے والے نے کہا کہ یہ خود شوکت صاحب نے اس سے کہا تھا۔

مجھے یہ سن کر ملال ہوا۔ غصہ آیا۔ اس لئے نہیں کہ شوکت صاحب نے میری اس کمزور کتاب پر دیباچہ کیوں نہیں لکھا یا یہ کہ انہوں نے میری اس کتاب کو کمزور کیوں بتایا۔ بلکہ اس لئے کہ اگر واقعی "میر صاحب" کے مضامین میں کمی تھی یا کمزوری تھی تو انہوں نے مجھے اپنا سمجھتے ہوئے اس طرف میری توجہ مبذول کیوں نہ کرائی۔ غیروں کی طرح وہ گول کیوں ہو گئے۔

کہنے والے نے یہ بات کہہ تو دی لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پایا کہ اس کی اس بات سے کتنی بڑی بات پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے شوکت صاحب کی اس بات پر غصہ آیا ہوا تو تھا ہی، جب میں بمبئی واپس آیا تو میں نے ان کے ناول "کہرام" پر ترش اور ایک انتہائی سخت قسم کی تنقید لکھی۔ تنقید بہت کڑوی تھی۔ بے حد ترش۔ لیکن میں شوکت صاحب کو آئینہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ خود کیا ہیں۔ لہٰذا یہ تنقید چھپ بھی گئی لیکن چونکہ میں اپنا نام لکھ کر شوکت صاحب کو بہت زیادہ افسردہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا یہ تنقید عادل رشید کے نام سے نہیں بلکہ اے آر ریگر

کے نام سے بیسی ہفتہ وار اخبار "نظام" میں شائع ہوئی۔ "نظام" کے ایڈیٹر فردوس جمال صاحب تھے۔ جو بھوپال ہی کے رہنے والے تھے۔ اور ہم سب کے جاننے والوں میں سے تھے۔ میں نے اُن سے اس راز کی رازداری کا وعدہ لے کر یہ تفصیلات "نظام" میں بغرض اشاعت دی تھی۔ لیکن انہوں نے شکریہ کے ساتھ یہ چھاپ دیا۔ انہوں نے شوکت صاحب کو بھجوایا تو ساتھ میں ایک خط بھی کہ دیکھئے یہ آپ کے داماد صاحب کا تازہ تحفہ ہے جو انہوں نے آپ پر کی ہے۔

ظاہر ہے کہ شوکت صاحب کو اس سے ملال ہوا اور انہیں بے حد صدمہ پہنچا۔ اس بات سے کہ میں نے اُن کی کتاب کے بارے میں کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن انہوں نے مجھے اس سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا اور میں ان تمام باتوں کی طرف سے انجان ہی رہا۔

۱۹۶۸ء میں میں دہلی میں تھا۔ شوکت صاحب بھی اسی سالگرہ کے سلسلہ میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ اور حفیظ جالندھری صاحب کے پاس ٹھہرے تھے۔ انہیں اپنے عزیز عمران الرشید سے معلوم ہوا کہ میں دہلی میں ہوں۔ انہوں نے عمران کی معرفت مجھے دہلی میں موجودگی کی اطلاع دی اور مجھے ڈھونڈنے لگے ہیں۔

بڑھ کر جب عمران نے مجھے بتایا کہ ماموں جان دہلی میں ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ تو عمران کے ساتھ ان سے ملنے کے لئے شام کے وقت حفیظ صاحب کے بنگلے پر پہنچا کیونکہ میری اور شوکت صاحب کی بات چیت فون پہ ہو چکی تھی۔ اور وہ میرے منتظر تھے۔

شوکت صاحب نے مجھے گلے لگایا۔ اور میں نے انتہائی سعادت مندی کے ساتھ انہیں اپنا بڑا سمجھ کر اُن سے گفتگو کی۔ ہم سب یعنی میں، عمران، حفیظ جالندھری صاحب اور شوکت صاحب بنگلہ کے لان پر کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

شوکت صاحب مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ اور بار بار میرے لباس کو اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے کہ وہ میرے لباس سے مجھے پرکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ لکھنؤ کی پہلی ملاقات کے بعد یہ میری ان کی دوسری ملاقات تھی۔ میں اس وقت انتہائی شاندار اور قیمتی گرم سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

مجھے شوکت صاحب کی یہ پرکھ کچھ اچھی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن میں خاموش رہا۔ اور اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ البتہ میں نے دل ہی دل میں یہ ضرور سوچا کہ وہ آج اپنی بھانجی کی شادی کے پورے ساڑھے چار سال بعد اپنے داماد کی مالی حیثیت کا اندازہ اس کے لباس سے لگا رہے ہیں۔ اب یا بقول شخصے۔

اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

باتوں کے درمیان شوکت صاحب نے مجھ سے کہا۔

”میاں! کتنے سال ہو چکے کہ تم ہمارے داماد بنے ہو اور اب تک تمہاری سسرال والوں نے تمہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ لکھنؤ میں بھی تمہاری بہت بڑی سسرال ہے۔ میرے ساتھ لکھنؤ چلو۔“

پھر مسکرا کر بولے۔

”وہاں تمہاری حسین حسین سالیاں بھی تمہیں ملیں گی۔ سالیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا اور اُن کے ناز اُٹھانا۔ سب سے سلامی وصول کرنا اب تمہارا حق بھی ہے ——“ میں نے اُن کی اس بذلہ سنجی پر دل ہی دل میں اُن کی شگفتہ مزاجی کا اعتراف کرتے ہوئے سعادت مندی سے

[illegible] کہہ چکا تھا۔ لیکن جب شوکت [illegible] لکھنؤ [illegible]

تو آپ بہت [illegible]

اور ابھی [illegible] لکھنؤ اپنے ساتھ [illegible]

[illegible]

[illegible] شوکت [illegible] لکھنؤ [illegible]

سب [illegible] شوکت صاحب نے [illegible]

تو ارشد میاں [illegible] ساتھ لکھنؤ چلیں [illegible]

اور یہ اسی وقت [illegible]

کہا: تم ابھی [illegible] لکھنؤ [illegible]

دوسرے دن [illegible] شوکت صاحب سے [illegible] شوکت صاحب [illegible] ارشد صاحب [illegible] شوکت صاحب نے شاہد [illegible] آپ کا داماد ہوں۔

لکھنؤ جب ہم پہنچے تو [illegible] ارشد صاحب [illegible] لکھنؤ سے ہوئے تھے۔ اور یہ بات شوکت صاحب نے مجھے دہلی میں نہیں بتائی تھی [illegible] دونوں کو [illegible] بہت خوش ہوا۔ ارشد صاحب [illegible] شوکت صاحب [illegible] بات پر خوش [illegible] اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے۔

شوکت صاحب ان دنوں بڑی خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ یو۔پی کے وہ [illegible] آرٹسٹ تھے اور اس حیثیت سے وہ بے نیاز تھے کہ اخبارات و رسائل پر لکھو یا پبلشر کے لیے سر کھپاؤ تو روکھی سوکھی ملے۔ وہ ایک شاندار کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ نوکر چاکر تھے اور ہر طرح کا ذہنی سکون انہیں میسر تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ کوٹھی کے نچلے حصے میں اپنے خاص الخاص شاندار ڈرائنگ روم میں شوکت صاحب بیٹھے تھے۔ میں بھی بیٹھا تھا۔ میرے خسر صاحب یعنی ارشد صاحب اور میرا ایک دوست بھی بیٹھا تھا جو کہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میرے رشتے کے ایک بھائی بھی تھے جو لکھنؤ ہی میں پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب اور بھی بیٹھے تھے۔ شوکت صاحب کے دوست تھے۔ اس ڈرائنگ روم میں سید اور خورشید (شوکت صاحب کے بیٹے) بھی کھیل رہے تھے۔ یہ دونوں ابھی چھوٹے تھے۔ کہ یکایک شوکت صاحب نے اپنے بیٹوں سے کہا "بیٹا! تم لوگ اوپر جاؤ۔ یہاں نہ آنا تم لوگ۔ ہم اس وقت ذرا شعر و شاعری کے موڈ میں ہیں۔" میں سوچنے لگا کہ آخر یہ کس قسم کا شعر و شاعری کا موڈ ہے

کہ سعید اور خورشید تک جا پہنچے ہیں
سعید اور خورشید کو اپنے پاس بلا کر دونوں سے مخاطب ہوئے۔
"شعر سنو گے میاں۔"
"جی۔ ارشاد فرمائیں کوئی ادب سے بولا۔" "جی ہاں۔"
پہلے بہ دلہان ہوگئی یہ بات ثابت ہی تھی کہ شوکت صاحب رفیع احمد خاں مرحوم کے مزید اشعار سنانے شروع کریں گے۔ "
سنیے پہلا شعر سنایا۔ پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ اب میں ہوں کہ سب سے نظریں چرا رہا ہوں۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں کہ وہ میری طرف
غور سے دیکھ کر بولے۔
"ہاں یہ بدمزاقی —— خدارا داد تو دو۔ تم تو چوٹی کی دلہن کی طرح گھٹنوں میں سر دیے رہے ہو"
اور میری حالت اس لئے اور بھی زیادہ خراب ہو رہی تھی کہ ارشد تھانوی صاحب پہلے باہر بیٹھے تھے۔ اس گھر سے
رشتہ کے بھائی بھی تھے اور دوست بھی۔ میری پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی کہ انہوں نے رفیع احمد خاں کا مشہور شعر قدم قدم پہ بجے گی
پاسبانی کی —— سنا دیا اور بولے۔
"یہ شعر یقیناً تمہیں پسند آیا ہوگا۔ کیوں ہے نا قابل داد شعر۔"
"جی ہاں۔ مجبوراً مجھے بھی بولنا پڑا۔ وہ بے ساختہ بولے۔ "دراصل میں تمہارے جمالیاتی ذوق کو پرکھنا چاہتا ہوں۔"
پھر فوراً ہی ارشد صاحب کی طرف مخاطب ہوئے۔
"کیوں ہے نا جانی ہوا —— ؟"
"بے شک صاحب ——" ارشد صاحب پان چباتے ہوئے بولے۔ "اس رنگ میں رفیع احمد خاں کا جواب نہیں تھا۔" انہوں نے
گویا کر تشریح کی۔
"صاحب! بہت بڑی قیمتی چیز، بہت بڑی بات ظالم نے کہی ہے۔ حقیقت ہے ——"
اور پھر نتیجہ اگر شرم اور لحاظ کو کسی حد تک بالائے طاق رکھ کر مجھے بھی اس شعر و شاعری میں دلچسپی لینی پڑی۔ شوکت صاحب
نے میری اس قدر بے تکلفی کو غنیمت جانا۔ بیحد خوش ہوئے اور پھر بہت سے شعر بھی سنا ڈالے۔ اپنے بھی شعر سنائے اور رفیع احمد
خاں کے بھی پھر مجھ سے فرمائش ہوئی۔
"تم بھی تو اس رنگ میں شعر کہتے ہو گے۔ سنا دو میاں اپنے بھی شعر سنا دو۔ جہالت کی باتیں چھوڑو۔ ہم سب آپس میں دوستانہ
رہ بیٹھے ہیں" اور میں معذرت کرتا رہا۔ لاکھ بے تکلف بننے کی کوشش پر بھی میں ارشد صاحب کی موجودگی میں جاہل کا جاہل
بنا رہا۔ میری جہالت رہ گئی۔
ایک دن دسترخوان پر انہوں نے اسی قسم کا ایک لطیفہ اور سنا ڈالا۔ دسترخوان لگ چکا تھا۔ بیٹیں گھر میں تھیں اور کھانا آنا
تھا کہ انہوں نے ان نواب صاحب کا ایک لطیفہ سنا ڈالا جو دسترخوان پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ اور جن کی میانی کھل گئی تھی۔ اپنی بیگم کے
بہن بھائیوں کے اشارے پر انہوں نے گردن جھکا کر نیچے دیکھا۔ بڑی ادا کے ساتھ بولے۔ "کلام چور رزا لے حاضر ہے"

چائے ہو چکنے کے بعد [illegible] شوکت صاحب [illegible] مجھے [illegible] تھے۔ اور دسترخوان پر سب بیٹھے
تھے۔ میں، رشید صاحب، میری خالہ جان، ماموں صاحب اور [illegible]۔ سعیدہ، خورشید، [illegible] اور میاں شوکت
صاحب کا سب سے [illegible] سب سے چھوٹا [illegible] بھی بیٹھا تھا۔
خالہ جان (مسز شوکت) نے شوکت صاحب کو گھور کر [illegible] سب کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ کبھی تو شرم کیا
کیجئے۔ [illegible] ہی خیال کیجئے۔
خالہ جان جب ان کی تحریریں پڑھتی تھیں [illegible] نہایت ہی حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔
سعیدہ بیگم: ہماری شادی کی بات [illegible] خالہ جان [illegible] رہتے تھے۔ خالہ جان [illegible] سعیدہ سے اور وہ شوکت صاحب
سے [illegible]"
[illegible] رشید [illegible] شوکت صاحب [illegible] رہے تھے۔ اور میں شوکت صاحب [illegible] دل ہی دل میں
[illegible] کر رہا تھا۔
"[illegible]"
"آپ [illegible] تھے۔۔۔"
"[illegible] صاحب [illegible]"
"جی [illegible] کئی ہیں۔
[illegible] دیکھا [illegible] انگلی پکڑے [illegible] جا رہی تھیں۔
انہوں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔
"جانتے ہو۔ میرے دل پر کتنے زور کا گھونسہ پڑا تھا۔"
میری جان میں جان آ چکی تھی۔ اور اب میں مسکرا رہا تھا۔ [illegible] کر لیجئے۔
"ہاں میاں مسکراؤ۔ خوب ہنسو۔ اپنی فتح اور دوسروں کی شکست پر لوگ اسی طرح مسکراتے ہیں۔"
[illegible] میرے لکھنؤ کے دن اور میری لکھنؤ [illegible] شوکت صاحب کی بزم [illegible] اور شگفتہ [illegible] سے [illegible] ہوئی تھیں۔
مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ دن ہو چکے تھے۔ [illegible] صبح کا وقت تھا۔ میں میز کے سامنے بیٹھا [illegible] رہا تھا شوکت
صاحب اسی کمرے میں تھے۔ اور تخت پر بیٹھے اپنی کتابوں پر [illegible] آٹوگراف کر رہے تھے۔ کہ میں نے خورشید سے کہا۔
"خورشید میاں [illegible] دیکھیں ہمارے ماموں جان نے ہمارے لئے کیا لکھا ہے۔"
خورشید نے ایک کتاب لا کر مجھے دی۔ یہ شوکت صاحب کی کتاب "بیوی" تھی۔ لکھا تھا: "اس جرم میں کہ عادل جانی کے شوہر ہیں۔"
کتاب کے پہلے صفحہ پر یعنی "بیوی" کے نیچے انہوں نے یہ فقرہ لکھا تھا۔ میں مسکرانے لگا۔ دوسری کتاب [illegible] تھی۔ لکھا تھا۔ "عزیزی
عادل رشید کے لئے تاکہ وہ بھی اس کی قسم کا ایک تبصرہ اس پر بھی کریں۔"

اس کے بعد سے شوکت صاحب کی میری ملاقات برسوں تک نہیں ہوئی۔ خط و کتابت بھی نہیں ہوئی۔ ان کو جب میں دہلی واپس جا رہا تھا تو وہ مجھے سی۔ آف کرنے کے لئے اسٹیشن آئے تھے۔ اور بہت سے میرے مداح اور دوست تھے جو مجھے الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ارشد صاحب راقم بھی تھے اور سعید خورشید بھی تھے۔

میں بہت پریشان اور گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ میری برتھ ریزرو نہیں تھی۔ صرف سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ میرے پاس تھا۔ اور مجھے یہ فکر دامن گیر ہو رہی تھی کہ اگر کوئی برتھ خالی نہ ملی تو رات میں کس طرح گزاروں گا۔ بہرصورت میں نے سامان سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا تھا اور میں اس کمپارٹمنٹ کے سامنے ان سب کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور ابھی رہا تھا کہ شوکت صاحب میری الجھن اور ذہنی کوفت کا اندازہ لگاتے ہوئے بول کر بولے۔

"اماں تم عجیب ہو عادل میاں۔ اگر مجھے کوئی کہے تو میں سر کے بل کھڑا رہ کر پوری طرح اس کوچ میں سفر کر دوں۔ مجھے تو تمہاری خوش قسمتی پر رشک آ رہا ہے اور تم ہو کہ منہ بنا رہے ہو۔"

بات دراصل یہ تھی کہ سیکنڈ کلاس کے اس کوچے میں انتہائی حسین قسم کی کئی عورتیں بیٹھی تھیں۔ بے حد خوبصورت، دلکش دل نشین اور بڑے گھر کی تندرست عورتیں۔ وہ پھر فرمانے لگے۔

"یہ تم نے یوں سمجھو کہ دہلی کا نہیں بلکہ جنت کا ٹکٹ لے رکھا ہے۔ اور حوریں تمہاری منتظر ہیں۔"

پھر وہ ارشد صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کیوں بھائی جان! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔۔۔؟"

"ہاں صاحب۔ !" ارشد تھانوی صاحب مسکرائے: "ایک سے ایک مہ لقا ہیں یہ۔ خود میری رال اس عمر میں ٹپکی پڑ رہی ہے دیکھو نا ایک سے ایک پٹاخہ موجود ہے۔"

"اور یہ حضرت ہیں کہ کفرانِ حسن فرما رہے ہیں۔" شوکت صاحب خورشید کی طرف مخاطب ہوئے: "میاں تم اپنی امی جان سے جا کر کہہ دینا کہ آبا دہلی چلے گئے۔ میں تو دہلی جا رہا ہوں۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ شوکت صاحب بولے۔

"میاں دہلی پہنچ کر اپنی خیریت کا خط ہم لوگوں کو ضرور لکھ دینا۔ ورنہ ہمارا جی لگا رہے گا۔ کیا پتہ کوئی حسینہ تمہیں اپنے حسن کے جادو سے مینڈھا بنا کر اپنے پیچھے پیچھے بھاگنے پر مجبور کر دے۔ آخر ہمیں اپنی عذرا کی بھی تو فکر ہے۔"

پھر گاڑی چھوٹ گئی اور میں اپنے ماموں جان شوکت تھانوی سے جدا ہو گیا تھا۔ راستہ بھر ان کی باتیں مجھے یاد آتی رہیں اور میں اس بکواس والے ناخوشگوار حادثہ پر افسوس کرتا رہا۔ کاش اے۔ آر۔ راہ گیر پر مجھے غصہ آ رہا تھا جس نے اتنے پیارے پیارے انسان، ہنسا ہنسا کر لٹا دینے والے ادیب پر تنقید لکھی تھی۔ سخت قسم کی تنقید جس سے دوسروں کو ہنسانے والا خود کبیدہ خاطر اور غمگین ہو گیا تھا جیسے ایسا محسوس ہوا تھا۔ کہ اچانک اس کا ہاتھ کرنٹ پر پڑ گیا ہو۔

میں نے اس واقعہ کے بعد سے اے۔ آر۔ راہ گیر کے نام سے پھر کبھی کچھ نہیں لکھا۔ کوئی مضمون نہیں۔ کوئی تنقید نہیں۔ میں نے اس اے۔ آر۔ راہ گیر کو زندہ زمین میں دفن کر دیا ہے۔ جس نے ہنسا ہنسا کر لٹا دینے والے شوکت تھانوی کو افسردہ اور غمگین کیا تھا۔ جس نے

لکھنؤ کے قیام کے دوران میں مجھ سے ایک دن کہا تھا۔

"تمہیں اس بات کا افسوس ہو رہا ہوگا کہ تم نے شادی میں جلدی کی۔"

"وہ کیوں ماموں جان —" میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔ جواب دیا گیا۔

"اس لئے کہ تمہیں شاید یہ نہیں معلوم تھا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

"جی —؟"

"ارے بھئی، تم کچے محلے روز جاتے ہو نا۔ گھنٹوں وہاں بیٹھے رہتے ہو۔"

میں سٹ پٹا گیا۔ کچے محلے میں ماموں جان کے سسرال والے رہتے تھے۔ وہ سب کے سب اُن کے عزیز تھے۔ اور دو تین خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں۔ جوان اور حسین لکھنوی لڑکیاں۔

بات کچھ ایسی نہیں تھی۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ مجھ سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ جیسے بڑبڑائے۔ "لیکن چھوڑو، وہ بھی لاکھوں میں ایک ہے۔"

بلّی کی بات پہ ایک بات اور یاد آگئی۔

ایک روز ہم لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ کھڑکی سے ایک بڑا سا بلا باہر سے کود کر آیا۔ شوکت صاحب نے اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے گھر میں ایک عدد اور ہے۔"

شوکت صاحب کے گھر میں ایک بلی پلی ہوئی تھی —

بمبئی کے ایک گجراتی فلم پروڈیوسر دلسکھ ایم پنچولی تقسیم ہند سے پہلے لاہور کے سرکردہ اور مانے ہوئے فلم ساز تھے۔ پنچولی آرٹ پکچرز ان کا تھا۔ یہ لاہور کے بڑے اثر و رسوخ والے فلم ساز تھے۔ "خزانچی" اور "خاندان" ان کی مقبول ترین اور بہت بڑا بزنس کرنے والی فلمیں تھیں۔ شوکت صاحب ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر اُن کے پاس اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ "پونجی" اور "شاہدہ" مشہور ہے ان کی لکھی ہوئی فلمیں تھیں۔ انہوں نے اُن کی کاسٹیوم پکچر "شیریں فرہاد" لکھی تھی۔ اور یہ فلم بمبئی میں جب ریلیز ہونے لگی تو پنچولی صاحب خود بمبئی آئے۔ شوکت صاحب نے مجھے ایک خط لکھا کہ تم سیٹھ صاحب سے جا کر ملو۔ اور اُن سے کہو کہ لاہور سے ماموں جان کا خط آیا ہے۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ یہ اُن کا حکم ہے میرے لئے۔ اسی لفافے میں شوکت صاحب نے پنچولی صاحب کے نام بھی انگریزی میں ایک خط لکھ کر رکھ دیا تھا۔ کہ یہ خط میں اُنہیں پہنچا کر دے دوں۔ اُس میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ عادل رشید میرا داماد ہے۔ بمبئی میں اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ ایک رسالہ "شاہد" نکالتا ہے۔ پبلسٹی میں ماہر ہے۔ اس سے آپ جو کام چاہے لیجئے۔ اِس خط میں شوکت صاحب نے پنچولی کو سیٹھ جی لکھا تھا۔

مجھے شوکت صاحب کی اس ذہنیت پر بڑا غصہ آیا — میں نے وہ دونوں خطوط پھاڑ ڈالے۔ شوکت صاحب کو میں نے لکھا۔

ماموں جان! تسلیم

آپ کا خط مجھے مل گیا۔ میں غلامی، جی حضوری اور "سیٹھ جی" کی دنیا سے

بہت دور ہوں۔ جس دن یہ ذہنیت مجھ میں پیدا ہو گئی میں اسی روز خودکشی کر لوں گا۔

میں بہرصورت والی طبیعت سے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ انسان کو اگر روٹی نہ ملے تو وہ زہر کھا کر مر جائے۔ میں بچوں جیسے انسان کی بے ضرری کو اعلیٰ سمجھتا ہوں۔

میں نے آج تک کسی کو تحفہ نہیں دیا۔ حالانکہ بمبئی میں رہتا ہوں۔ جہاں کا ٹکٹ لکھا ہی بیٹھا ہے۔ میں آپ کی نوازشات سے معذور ہوں۔

اس خط کے بعد پھر شوکت صاحب کا کوئی خط مجھے کبھی نہیں ملا۔ اور ہمارے مراسم اندرونی طور پر کچھ خراب ہو گئے اور پھر شوکت صاحب کو شاید میرے دور دور رہنے اور میرے نام سے بھی چڑ ہو گئی ہو گی۔

غالباً ۱۹۶۳ء میں دہلی میں ایشین رائٹرز کانفرنس تھی۔ اور پھر اس کے بعد ہی ہند و پاک بچوں کی کانفرنس بھی تھی۔ میں ان دونوں کانفرنسوں میں دعوت پر بمبئی سے دہلی گیا تھا۔ ہند و پاک بچوں کی کانفرنس کے سلسلہ میں پاکستان سے شوکت صاحب بھی آئے تھے۔ ایک روز جہاں یہ کانفرنس ہو رہی تھی، ہماری آپس کی ملاقات ہوئی۔ صرف علیک سلیک کی حد تک اور بس۔

کانفرنس کے خاتمہ والے دن، شام کے پانچ بجے تقریباً ڈھائی تین سو ادیب کمیٹی روم میں مدعو تھے۔ میں بھی تھا۔ شوکت صاحب بھی تھے۔ اتفاق تھا ہم دونوں باتھ روم سے نکل رہے تھے کہ ہمارا آمنا سامنا ہو گیا۔

"مجھے تم سے ایک بڑی شکایت یہ ہے کہ تم ۱۹۶۰ء میں پاکستان آئے۔ تمہارا پورا خاندان تمہارے ساتھ تھا۔ حتیٰ کہ تمہارے بچے۔ تم لاہور دس دن رہے۔ لیکن تم مجھ سے ملنے کے لئے راولپنڈی نہیں آئے۔"

"میں بُری طرح پھنس گیا تھا" — میں نے کہا۔

"وہ بات دراصل یہ تھی دعوں جان کہ میری چھوٹی بچی شاہینہ تقریباً بیمار ہو گئی تھی۔ اور ———"

انہوں نے میری بات اُچک لی۔

"بیہودہ باتیں ہیں یہ۔ وہ تندی سے ملال کے ساتھ بولے: تم اور وہ مذ... بات یہ ہے کہ تم ہم لوگوں سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔"

اور یہ کہہ کر وہ باتھ روم سے باہر آ گئے۔ میں بھی آ گیا۔ اس کے بعد پھر ہماری کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ حالانکہ ہم لوگ وہاں اس کے بعد بھی کافی دیر تک رہے۔ اور یہی میری اور شوکت صاحب کی آخری ملاقات تھی۔

دوسرے دن یونس دہلوی مدیر "شمع" کی کوٹھی پر پاکستانی ادیبوں کا ایک ڈنر تھا۔ اور اس ڈنر میں ہندوستان کے اردو کے چیدہ ادیب بھی مدعو تھے۔ میں بھی مدعو تھا۔ یونس نے مجھ سے کہا تھا کہ "اگر تم نہ آئے تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" الیاس نے زور دیتے ہوئے کہا: "عادل جان، دیکھئے آئیے گا ضرور۔ ورنہ ہماری آپ کی کُٹی۔"

لیکن اس ڈنر پر میں جان بوجھ کر اس لئے نہیں گیا کہ میں اسی رات ایک دوسری جگہ پر مدعو تھا۔ اور یہ ڈنر بطور خاص میرے لئے اہتمام کیا گیا تھا۔ اور ڈنر دینے والا مالکانِ "شمع" کی طرح بڑا آدمی نہیں تھا۔

تو میرا یہ قیاس الاساس غلط ثابت ہوا کہ شاید آپ نہیں آئے اور شوکت نے آپ کو ... سمجھا ... وہ
ہر آپ کی کمی کو ... محسوس کرتے تھے۔

اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب کہ شوکت صاحب کی وفات ہو گئی۔ مجھے ایسا ... تھے شاید ... ہم ایک ساتھ بیٹھے۔ اس کے بعد ... بھی نہیں ... سے ... ہو گئی تھی۔

شوکت تھانوی صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ... اُن کی زندگی کا ... ختم ... ہو چکا ہے۔

شوکت تھانوی صاحب بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ سب سے بڑی خوبی اُن میں یہ تھی کہ وہ ہر جگہ ... ہر شخص سے محبت کرتے تھے۔ ... وہ ... پہنچ جاتا تو وہ محفل پر ... چھا جاتے تھے۔ اور ہر محفل کو ... بنا دیا کرتے تھے ... کے لحاظ سے ... زیادہ ... تھے۔ ... انہوں نے ادیب ... ادب ... کمال ... بڑے بڑے ... معلوم ہوتے تھے۔

اپنے سے چھوٹوں کی عزت ... ہر ... سے ملتے تھے۔ ... اُن کا احترام کرتے تھے۔ ... اُن کی قدر کرتے تھے۔ ...

بڑے ہی بذلہ سنج اور حاضر جواب ... ایک واقعہ گوش گزار کرتا ہوں۔ ایک محفل میں ایک صاحب جو اپنے آپ کو بہت ... سمجھتے تھے۔ شوکت صاحب سے ... فرمانے لگے۔ "صاحب آپ کا خاندان کہاں ہے جہاں آپ بیٹھتے ہیں؟" انہوں نے تھانوی کی رعایت سے ... شوکت صاحب نے پہلے تو اُن کی اس بات کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے پھر یہی بات اسی انداز میں دہرائی جیسے کہ انہوں نے شوکت صاحب کو لاجواب کر دیا ہو تو شوکت صاحب نے کمال سنجیدگی سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"جب میں آپ کی ہمشیرہ محترمہ یا آپ کی دختر نیک اختر کے لئے پیام دوں گا تو اس وقت اپنا خاندان اپنی حیثیت اور اپنا اتہ پتہ سب آپ کو بتا دوں گا۔"

اس پر ایک پُرزور قسم کا فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور وہ خان صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ میرے محترم ارشد تھانوی صاحب کے ساتھ بھی پیش آچکا تھا۔ انہوں نے بھی ایک محفل میں ایک صاحب کو اسی قسم کا جواب دیا تھا۔ اور وہ صاحب بھی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تھے۔

شوکت تھانوی صاحب کی ایک عزیزہ کی شادی تھی۔ ایک صاحب نے شوکت صاحب سے لڑکی والے ہونے کی حیثیت سے اس ڈھنگ سے مذاق فرمایا جیسے کہ ان کی کوئی ... ہی ہو۔ شوکت صاحب نے اُن کے اس بیہودہ مذاق پر فرمایا۔

"جناب ہمارے یہاں کا اور ہر شریف آدمی کے یہاں کا یہی دستور ہوتا ہے کہ جب لڑکیاں شادی کے قابل ہو جاتی ہیں تو اُن کی ہم لوگ شادی کر دیا کرتے ہیں۔ شاید آپ کے یہاں ایسا نہ ہوتا ہو گا۔ آپ لوگ لڑکیوں کی شادی کے بجائے انہیں کوٹھوں پر بٹھا دیا کرتے ہوں گے۔" وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

شوکت صاحب ایک صاحب طرز ادیب ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک مانے ہوئے صحافی بھی تھے۔ "سرپنچ" ہفت روزہ "شباب" ماہنامہ، روزنامہ "جنگ" اور "ہنڈولا" ان کے بُتدا یا ایڈیٹر ہو کر صحافی ہونے کی روشن مثالیں ہیں۔

شوکت صاحب نے بہت لکھا ہے۔ ایک ہی انداز کا ذخیرہ کر ڈالا ہے۔ انہوں نے اچھا بھی لکھا ہے۔ اور بہت اچھا بھی۔ برا بھی لکھا ہے انہوں نے۔ لیکن دُنیا کا کون ایسا ادیب یا شاعر ہے جو ہر چیز اچھی ہی لکھے ہر دُنیا کے بڑے سے بڑے ادیب کو اس کسوٹی پر پرکھئے۔ آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا۔ شوکت صاحب نے جتنا کچھ لکھا ہے اگر ہم اس میں سے اُن کی شاہکار چیزیں چھانٹ شروع کر دیں تو وہ بھی اتنی ہوں گی کہ اُس سے بیک وقت کئی مجموعے بڑی آسانی کے ساتھ ترتیب دئے جا سکیں۔ اُن میں یہ کئی مجموعے ایسے ہوں گے جن پر ہر ادیب کو بجا طور پر ناز ہو گا۔ جنہیں ہم بڑی آسانی کے ساتھ دُنیا کے بڑے سے بڑے ادب کے مقابلہ میں فخر یہ رکھ سکیں گے۔

ادیب کو بُتدا اور صاحب طرز بنانے کے لئے تو ایک کتاب کافی ہوتی ہے۔ یوں تو شوکت تھانوی نے ایسی ایسی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو شاہکار کہلاتی ہیں۔

شوکت صاحب کا طرز نگارش اپنا تھا۔ اس پر کسی دوسرے ادیب کی چھاپ ہرگز نہیں تھی۔ شوکت صاحب کے نا شے ہوتے جملے، اُن کے مزاح کا بے ساختہ پن، ان کے جملوں کا لوچ، اُن کا نکھار، اُن کی روانگی، ان کی بندشیں ایسی نہیں کہ جن سے پڑھنے والا آسانی کے ساتھ گزر جائے۔

اُن کے فقرے ایسے ہوتے ہیں جو پڑھنے والے کو بے ساختگی کے ساتھ ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اپنے مضمون "تعزیت" میں لکھتے ہیں۔

"مرحوم کو بیماری کیا تھی؟" انہوں نے پوچھا۔ جواب دیا گیا۔ "بڑھاپا خود ایک مستقل مرض تھا" فوراً بولے۔

"جی ہاں، جی ہاں۔ یہ مرض کمبخت اب عام ہوتا جا رہا ہے۔ ابھی کل ہی میرے دوست کا تین سالہ بچہ اسی مرض کا شکار ہو کر مرا ہے۔"

"شوروشی ریل" میں لکھتے ہیں۔

"مسافرین سر پر کوئلے سے بھرا ہوا ٹوکرا لئے چلا آ رہا تھا۔ آتے ہی ہانپتے ہوئے بولا۔ "یہ لو" اس نے انجن ڈرائیور سے کہا "کوئلہ کا انتظام پہلے سے رکھا کرو۔ نخاس سے کوئلے کر آ رہا ہوں۔ میرے گھٹنے بھی چھل گئے۔" یا ٹکٹ دینے والے بابو نے کہا۔ "اچھا لاؤ دو روپیہ چار آنے ہی نکالو۔ برہنی کا وقت ہے۔"

جواب ہے اس برہنی کے وقت کا۔ یا اس کا کہ انجن کے لئے ٹوکرا بھر کوئلہ نخاس کی ایک دوکان سے لایا گیا ہے لانے والے کا زینہ کے گر پڑنے کی وجہ سے گھٹنے بھی چھل گئے ہیں۔ یا اس کا کہ میرے دوست کا تین سالہ بچہ اسی بڑھاپے کے مرض میں مبتلا ہو کر مرا ہے۔ یا اس بات کا کہ باپ کے مرنے کا پرسہ جوان بیٹے کو اس طرح دیا جا رہا ہے کہ "اللہ تمہیں اس کا نعم البدل جلد دے۔"

مجھے ٹھیک سے تو یاد ہے اور نہ اس وقت یہ مضامین ہی میرے پاس کہ انہیں میں صحیح طور پر نقل کر سکوں۔ لیکن باتیں کچھ اسی قسم کی تھیں۔ کوزے میں دریا بند ہوتے تو سنا ہے۔ لیکن شوکت صاحب کے یہاں اُن کے ایک ایک فقرے میں کئی کئی سمندر ایک

وقت جملے جیسے مزاح کے ایسے حصے جو پڑھنا ہنسا کر پاگل بنا دیں۔ اور پڑھنے والے اُن میں بہہ جاتے ہیں۔
شوکت صاحب کے جملوں میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ بناوٹ نہیں۔ سب سے بڑا فرق انہیں دوسرے مزاح نگاروں سے ممتاز بناتا تھا۔

آپ بڑے شاعر بھی تھے۔ سنجیدہ شاعری کی بات تو میں اس سے نہیں کروں گا، جو ان کی وہ شاعری بڑی شاعری سے بہت کم تر ہے۔ البتہ اُن کی ایک نظم کراچی کی بسوں کا ذکر سن لیجئے۔ بمبئی میں انڈو پاک مشاعرہ تھا آپ بھی یاد ہے اس مشاعرے میں شوکت کی شرکت سے تشریف لائے تھے۔ اس وقت مسٹر چودھری وزیر اعظم گورنمنٹ کے چیف منسٹر تھے (وہ آجکل پنجاب کے منسٹر ہیں) چودھری صاحب ایک بار ہی دوسرے صوفے پر بیٹھے تھے۔ وہ دونوں شاعروں کی آپس کی بات ہے۔ لیکن وہ بھی شوکت صاحب کے ایک شعر پر اتنا ہنسے کہ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اور آپ نے مقررہ سامعین ارشاد کا نعرہ بھی لگایا۔

شوکت صاحب نے اپنی نظم کراچی کی بسوں میں کراچی کی بسوں میں سب سے زیادہ جس شعر پر داد لی تھی وہ یہ تھا۔ فرماتے ہیں۔
"اتنی بیدردی کہ جب ہمارے جسم میں کچھ ہوتی، ورنہ ہم نے کچھ سمجھا چاہا تو سوار ہو کر دوسرے لٹکا رہے ہیں۔"
اس مفہوم کا یہ شعر تھا ہزاروں سننے والے شوکت صاحب کے اس شعر پر دیوانے ہو گئے۔ چودھری جیسے اُردو سے ناواقف شخصیت نے اس شعر کی اتنی داد دی کہ ہنستے ہنستے دیوانے ہو گئے۔

شوکت تھانوی کی موت یقینی طور پر اُردو ادب کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے۔ یہ موت شوکت تھانوی کی اپنی ہی موت نہیں ہے۔ بلکہ یہ موت اُردو ادب کے اُن ہزاروں لاکھوں پڑھنے والوں کی مسرتوں، شادمانیوں اور قہقہوں کی موت بھی ہے۔ جو شوکت تھانوی کی موشگافیوں سے جنم لیتے رہے تھے۔

وہ محفلیں اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سونی ہو گئیں جو شوکت تھانوی کی وجہ سے کشت زعفران بنی رہتی تھیں۔ جہاں وہ شمع محفل بنے ہوئے ہر خاص و عام کی توجہ کا مرکز بنے رہتے تھے۔ اُن کے قہقہوں سے دُنیا خالی ہو گئی۔ اور اُن کے اٹھ جانے سے اب بہت دنوں تک ایسا محسوس ہوتا رہے گا۔ جیسے کہ ماحول ہولناک سناٹوں اور ویرانیوں سے دوچار ہو گیا ہے۔ جیسے —— "ایک مکوکب مشعل گاڑی گذر جانے کے بعد۔"

میرا دل بار بار پوچھتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ میں شوکت صاحب سے کسی طرح بڑے پیار کے ساتھ پوچھوں۔

"کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور"

شوکت بھائی

اقبال سفی پوری

شوکت بھائی جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے نہ صرف دل پارہ پارہ ہوا جاتا ہے بلکہ روحانی اذیت بھی محسوس ہوتی ہے مرحوم نثر نگاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے ان کی نثر نگاری کا صحیح اندازہ انہی حضرات کو ہو سکتا ہے جنہوں نے انہیں نثر لکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کا قلم صفحۂ قرطاس پر اس روانی سے دوڑتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہو جاتی تھی۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے بلا تکلف صفحے کے صفحے لکھتے چلے جاتے تھے اور انکی مہارت اور قدرت کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک نشست میں بیس صفحات لکھنے کے بعد بھی کوئی لفظ نہ کاٹتے تھے نہ ہی کوئی فقرہ تبدیل کرتے تھے۔ انہیں اپنی صلاحیتوں پر کامل اعتماد تھا۔ اور جو موضوع ان کے سامنے آتا تھا وہ اپنی اعلیٰ ذہانتوں کے بل پر اسے تشنۂ تکمیل نہ چھوڑتے تھے لیکن جس چیز نے انہیں برصغیر ہند و پاک میں غیر معمولی شہرت و عظمت عطا کی وہ ان کا منفرد طرز نگارش اور مخصوص انداز طنز و مزاح تھا۔

شوکت تھانوی بسیار نویس تھے۔ یہ بات مشہور ہے کہ بسیار نویس اچھا ناثر اور بسیار گو اچھا شاعر نہیں ہوتا لیکن شوکت صاحب کی تصانیف۔ ادارئیے۔ ادبی مضامین۔ مقالے۔ خاکے۔ فکاہی کالم اور ریڈیائی فیچر غرضیکہ تمام نثری کائنات پر نظر ڈالنے کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انکی نثر میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ بلکہ ایک ایک لفظ اپنی جگہ نگینے کا کام دیتا ہے۔

شوکت بھائی ایک کامیاب اور صاحب طرز نثر نگار ہی نہیں تھے۔ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی غزلیات کا اولین مجموعہ "گہرستان" پڑھنے کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ذہن رسا اور قلب سلیم عطا کیا تھا ان کی غزلوں میں سوز و گداز۔ کیف و اثر۔ لطف زبان و بیان۔ مختصر یہ کہ وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو لازمۂ غزل ہیں بایں ہمہ یہ بات یقیناً باعث حیرت و استعجاب ہے کہ وہ ایک کامیاب مزاح نگار بھی تھے اور ایک سنجیدہ غزل گو بھی۔ چند سال سے انہوں نے اپنی سنجیدہ غزل گوئی کا رخ مزاحیہ شاعری کی طرف موڑ دیا تھا۔ اسکا سبب غالباً شوکت بھائی کے عزیز ترین دوست اور ملک کے مشہور اور معتبر مزاح و طنز نگار شاعر سید محمد جعفری کی رفاقت اور دوستی تھی۔ لیکن اس میدان میں بھی انہوں نے اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا کر چھوڑا۔ پاکستان و ہندوستان میں ایک دو نہیں نہ جانے کتنے مشاعرے پڑھے اور عوام و خواص سے داد و تحسین حاصل کی ان کی ہمہ گیر طبیعت اور خوبیوں کا اندازہ صحیح طور پر انہیں کو ہو سکتا ہے جو ان کے بے تکلف رفیق خلوت رہے ہیں اور جنہوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے۔

آج سے تقریباً [illegible] سال پہلے غالباً [illegible] کی بات ہے جب پہلی بار شوکت صاحب سے تعارف [illegible] ملاقات
[illegible] ہوئی یہ وہ زمانہ تھا جب کہ میں [illegible] اور اپنی [illegible] تھا۔ شوکت بھائی [illegible] سے مشہور
[illegible] میں شاعر ہو چکے تھے۔ میری شعر گوئی کا آغاز ہو چکا تھا لیکن شعر گوئی و شعر فہمی [illegible]
[illegible] مجھے اللہ تعالیٰ نے ترنم کی دولت سے بھی نوازا ہے۔ [illegible]
[illegible] کامیابی سے ہمکنار ہو [illegible]
[illegible] ترقی کر [illegible] بھی ملک سے [illegible]
[illegible] تھا اور تمام بڑے مشاعرے [illegible] انتظام منعقد ہوا کرتے تھے۔ شوکت بھائی [illegible]
[illegible] میں لکھنؤ میں ایک آل انڈیا [illegible] مشاعرے کے
سکریٹری جناب صبیح الدین صاحب [illegible] شوکت بھائی [illegible]
[illegible] صاحب جیسے [illegible] شوکت [illegible] مصحفی [illegible]
[illegible] مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی [illegible]
[illegible] آتش [illegible] لکھنوی [illegible]
جیسی عظیم شخصیتیں موجود تھیں [illegible]
شاعر [illegible] نشستوں پر مشتمل [illegible]
[illegible] شوکت
[illegible]
[illegible]
[illegible] شعرا کی فہرست میں شامل [illegible]
شرکت سے حاصل ہوئی [illegible] صاحب [illegible]
فہرست شعرا کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے [illegible]
ہونے کی حیثیت سے [illegible] شوکت بھائی میری کامیابی پر خوش [illegible] اپنے حسن انتخاب [illegible]
یہ کامیابی میری ادبی زندگی کا پہلا موڑ تھا جس کے لئے شوکت بھائی کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ اس لئے کہ میں نے اپنی نو مشقی اور سن و
سال کے اعتبار سے اس عظیم اور تاریخی مشاعرے میں شرکت کا اہل نہ تھا۔ اس مشاعرے میں کامیابی کے بعد میرے لئے مقامی و بیرونی
مشاعروں میں شرکت کی راہیں از خود ہموار ہو گئیں۔ اس سے شوکت صاحب کی وسیع النظری [illegible] کا
اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر شعرا اور ادبا میں حسد و رقابت کا جذبہ پایا جاتا ہے لیکن شوکت بھائی اس سطح سے بلند تھے۔
انہوں نے دوسروں کے کمال کا اعتراف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اور کامیاب [illegible] کی ہمت افزائی
کی۔ برسبیل تذکرہ یہ لکھنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ شوکت صاحب نے ادبی دنیا میں جو منفرد مقام حاصل کیا اس کے اسباب و محرکات
کیا تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے روزنامہ "جنگ" میں ان کے حالیہ کالم بعنوان "کچھ یادیں کچھ باتیں" (افسوس کہ جنہیں وہ پایۂ تکمیل
تک نہ پہنچا سکے) پڑھے ہیں وہ بخوبی جان گئے ہیں کہ شوکت صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی میں تحصیل علم و فن کے لئے کس قدر

دماغ سوزی، عرق ریزی، اور شبانہ روز محنت کی ہے۔ اور یہ اسی کوشش، کاوش اور پرخلوص مشق کا نتیجہ تھا کہ وہ ملک کے صاحب طرز اہل قلم تسلیم کئے گئے اور ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر جلوہ گر ہوا۔

شوکت بھائی رونق انجمن۔ حاضر جوابی اور طنز و مزاح کے رنگ میں ڈوبے ہوئے چست و برمحل جملوں سے تھوڑی دیر میں ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ وہ ہر شاعر کے انداز میں اس کی کامیاب نقل اتار سکتے تھے۔ آواز و لہجہ ہی نہیں بلکہ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے وہ نقل کو زعفران زار بنا دیتے تھے لیکن چند مخصوص احباب اور عزیزوں کے علاوہ شاید ہی کسی کو اس کا علم ہو کہ وہ شخص جو دوسروں کو ہنسانے اور محفلوں کو زعفران زار بنانے کا ملکہ رکھتا تھا، وہ خود اندرونی طور پر کس قدر دکھی تھا۔ ان کی زندگی پریشانیوں، الجھنوں اور آلام و مصائب کا مجموعہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوت برداشت مزید عطا فرمائی تھی۔ وہ اپنی اندرونی کشمکش اور ذہنی الجھنوں کو چھپانے میں عزیزوں کی محفلوں میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ اس لئے بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں۔ چونکہ شوکت بھائی سے مجھے نسبت قرابت داری بھی ہے۔ وہ یوں کہ ان کی پہلی بیگم سعیدہ خاتون میری رشتہ کی بہن ہوتی ہیں اس بنا پر مجھے ان کی نجی زندگی کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا رہا۔

شوکت بھائی قیام پاکستان سے قبل ہی لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر لاہور آ چکے تھے اور پنچولی آرٹس سے وابستہ ہوگئے تھے۔ مجھے اس مفارقت کا بےحد قلق تھا۔ اسے اتفاق ہی سے تعبیر کیجئے یا میری خوش قسمتی سے کہ جون ۱۹۴۸ء میں جناب ایس۔ ایم توفیق صاحب مرحوم سابق چیف آفیسر کراچی میونسپل کارپوریشن کے برادر خورد مسٹر ایس۔ ایم۔ عتیق جو میرے عزیز دوست ہیں اور آج کل کانپور میں مقیم ہیں۔ ان کی بارات میں مجھے لاہور آنا پڑا۔ باراتیوں میں مولانا حسرت موہانی صاحب مرحوم اور مولانا کوثر علی صاحب بھی شامل تھے۔ شوکت بھائی لاہور سے بارات میں شریک ہوگئے۔ مجھ سے ملکر بےحد خوش ہوئے اور کہنے لگے اب تمہیں یہیں واپس نہیں جانے دیا جائے گا۔ بات اسی گھر ہو گئی۔ اب میں نکاح کے وقت لڑکی والوں کی طرف سے شرکت کے لئے جناب سید سعید جعفری سی۔ ایس۔ پی جو اسوقت لاہور میں ڈائرکٹر فوڈ ڈیپارٹمنٹ کے عہدے پر فائز تھے تشریف لائے۔ جعفری صاحب نے بھی مجھ سے اصرار کیا کہ میں مستقلاً پاکستان آجاؤں۔ شوکت بھائی بولے انہیں واپس ہی کیوں جانے دیا جائے۔ جس سے موصوف نے اتفاق کیا چنانچہ دونوں حضرات کے اصرار پر مجھے یہ اعادہ ہونا پڑا۔ بارات دوسرے روز واپس گئی اور میں شوکت بھائی کے مکان نمبر ۸ الکینال پارک میں منتقل ہو گیا۔ میرے بارات کے ساتھ واپس نہ جانے کی وجہ سے عتیق صاحب کو ایک مدت تک شکایت رہی۔

جعفری صاحب نے چند ہی دنوں میں میرا تقرر فوڈ پر چیف انسپکٹر کی حیثیت سے کر دیا اور فرمایا کہ اب جا کر بیوی بچوں کو لے آؤ۔ چنانچہ میں ہندوستان گیا اور سب کو ہمراہ لے کر ۲ ہفتے میں لاہور واپس آ گیا۔ لاہور آنے کے بعد میں، میری بیوی اور میرا ایک بیٹا شوکت بھائی کے اسوقت تک مہمان رہے جب تک کہ اسی کوٹھی کا نصف حصہ مجھے الاٹ نہیں ہو گیا۔ میرے اور میری شریک زندگی کے مسلسل اصرار کے باوجود شوکت بھائی اس بات پر رضامند نہ ہوئے کہ ہم لوگ اس مختصر مدت کے لئے اپنے خورد و نوش کا علیحدہ انتظام کر لیں۔ یہ ان کی محبت، خلوص اور فراخدلی کا ایک روشن ثبوت ہے چونکہ کوٹھی کا نصف حصہ مجھے الاٹ ہو گیا اس لئے ہم لوگ اکٹھے رہنے لگے اب وہ ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہو چکے تھے۔ ہم دونوں اپنی ملازمت کے فرائض انجام دینے کے بعد کس لطف سے وقت گزارتے تھے آج بھی اسے یاد کرکے دل بے چین ہو جاتا ہے۔ یوں تو ان کی زندگی کے نہ جانے کتنے دلچسپ واقعات ذہن میں محفوظ ہیں اور کچھ بھی

چاہتا ہے کہ انھیں یادگار کے طور پر جانب تحریر کر دیا جائے۔ کاش مجھے کبھی اتنی فرصت میسر آ جائے کہ میں یہ فرض بحسن طریق احسن ادا کر سکوں۔ ایک اہم واقعہ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت دلچسپ بھی ہے۔ قائد اعظم کی علالت کے تذکرہ سے ہوا اس واقعہ کا مطلب یہی ہے کہ ایک دوست نے جنہیں جھوٹ بولنے کی شاید کوئی عادت تھی۔ آغا شوکت بھائی سے پہلی ملاقات پر ایک بات ایسی بیان کی جس کا انہیں یقین آ گیا۔ لیکن جب انہیں اس بات کے جھوٹ ہونے کا علم ہوا تو نہ صرف انہیں ندامت ہوئی بلکہ افسوس بھی کہ ایک شخص نے ان سے یہ دروغ گوئی کیوں روا رکھی۔ چنانچہ انہوں نے اس کا جو انتقام لیا وہ نہ صرف ان کی ذہانت، ظرافت اور روشنی کا عکاس ہے۔ بلکہ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان صاحب سے مطالبہ زندگی بھر کیلئے جھوٹ نہ بولنے کا عہد کر لیا۔ جھوٹ کی کئی قسمیں ہیں۔ کوئی مسلسل جھوٹ بولتا ہے تو کوئی مجبوراً۔ [illegible] جھوٹ بولتے ہیں ان کا [illegible] بہت جلد [illegible] جھوٹ بولنے لگتے ہیں [illegible] رفتہ عادی ہو جاتے ہیں جن صاحب سے متعلق یہ واقعہ ہے وہ جھوٹ کی اس قسم میں آتے ہیں۔

واقعہ یوں ہے کہ ہمیں ابھی یہاں پہنچے ہوئے کچھ عرصہ ہی گزرا ہوگا کہ ایک روز میرے ہندوستان کے ایک عہد رفتہ کے ساتھی اور عزیز دوست کا کراچی سے تار پہنچا کہ وہ کل صبح [illegible] پہنچ رہے ہیں۔ [illegible] میں خوشی سے اچھل پڑا اور میں نے شوکت بھائی سے اپنی مسرت کا اظہار کیا ساتھ ہی آنے والے دوست کا غائبانہ تعارف بھی کرا دیا۔ یہ ہندوستان کے ایک باعزت اور بلند خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بڑے بھائی صاحب [illegible] قائد اعظم مرحوم [illegible] اس وقت بسلسلہ علالت زیارت میں قیام پذیر تھے [illegible] خصوصی [illegible] بلوچستان میں کسی ذمہ دار عہدے پر فائز تھے۔ اس بات کا بھی تذکرہ میں نے شوکت بھائی سے کر دیا۔ ظاہر ہے شوکت بھائی نے آنے والے مہمان کے متعلق ایک اچھی رائے قائم کی ہوگی۔ وہ ان سے ملنے کے مشتاق ہو گئے۔ قائد اعظم کی علالت کی وجہ سے ہم سب رنجیدہ تھے اور ہر ایک کو ان کی صحت اور حالات کی صحیح کیفیت معلوم کرنے کی فکر رہتی تھی اور ہر شخص ان کی صحت کیلئے دست بدعا تھا۔

میں اور شوکت بھائی اپنے دوست کو دوسرے روز اسٹیشن پر خوش آمدید کہنے گئے۔ ان سے تعارف کے بعد شوکت بھائی نے پہلا سوال یہ کیا "میاں قائد اعظم کا صحیح حال کچھ معلوم ہے ان کا مزاج کیسا ہے؟" میرے دوست بلا تامل بولے "میں تو بھائی جان کے پاس ہی تھا۔ زیارت سے پرسوں کراچی پہنچا اور دوسرے روز یہاں کے لئے چل دیا۔ زیارت سے چلنے کے ایک روز قبل قائد اعظم کی صحت کی خوشی میں بھائی جان نے انہیں ڈنر پہ مدعو کیا تھا جہاں میری ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ بحمداللہ وہ اب روبہ صحت ہیں معمولی کمزوری رہ گئی ہے۔ وہ بھی رفتہ رفتہ جاتی رہے گی۔" یہ سن کر شوکت بھائی کو بیحد مسرت ہوئی اسلئے کہ اسوقت اخبارات میں قائد اعظم سے متعلق واضح طور پر کوئی خبر نہ آئی تھی میں اس بیان کی صداقت سے کما حقہ واقف تھا لیکن میں نے شوکت بھائی سے فوری طور پر اس دوست کی کمزوری کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا جس سے ابھی ابھی تعارف ہوا تھا۔ لیکن اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ یہ بات کہاں تک پہنچے گی تو اس کا فوری اظہار بھی نامناسب نہ ہوتا۔

ہم دونوں اپنے مکان پر آ گئے اور شوکت بھائی ریڈیو اسٹیشن چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اس خوش خبری کا اعلان آن واحد میں پوری تفصیل کے ساتھ نشر کر دیا۔ لوگ مسرت سے ناچنے گانے لگے۔ مٹھائیاں تک تقسیم ہو گئیں۔ اپنے

محبوب قائداعظم کی صحت کی خوشی کوئی معمولی خوشی تو نہ تھی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ بلکہ شومئی قسمت تو دیکھئے کہ تھوڑے دنوں بعد قائداعظم کے انتقال پُرملال کی خبر آگ کی طرح ہر طرف ایک کہرام مچ گیا۔ ریڈیو سٹیشن لاہور میں بھی اطلاع پہلے ہی ہو جایا کرتی ہے چنانچہ خبر آتے ہی ساتھی ریڈیو اسٹیشن لاہور کے چھوٹے بڑے افسران نے شوکت بھائی کے کمرے پر دھاوا بول دیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے بھائی یہ کس قسم کی صحت مندی کی خبر لائے تھے آپ؟ کوئی بولا "آپ مٹھائی ہی کھانا مقصود تھی تو ویسے ہی کھائی جا سکتی تھی ایسی بڑی شخصیت کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت تھی" وغیرہ وغیرہ۔ شوکت بھائی اپنا سا منہ لئے سکتے میں بیٹھے ایسے لگے پر خفا اور شرمندہ تھے لیکن ہمارے دوست کے خلاف ان کا جذبۂ انتقام بھڑکتا چلا جا رہا تھا۔

میرے دوست کا تقرر حکومت پاکستان کے ایک محکمہ میں ہوا تھا اور وہ اس سلسلے میں لاہور آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے عہدے کا چارج ایک روز قبل لے چکے تھے۔ جب شوکت بھائی ریڈیو اسٹیشن سے گھر واپس آئے تو ان کا چہرہ ان کے جذبات و احساسات کی پوری ترجمانی کر رہا تھا۔ آتے ہی انہوں نے میرے دوست سے پوچھا کہ بھائی عجیب بات ہے ابھی چند روز قبل حضرت قائداعظم ماشاءاللہ اتنے تندرست تھے کہ آپ کے بھائی صاحب کی طرف سے دی ہوئی دعوت میں شریک تھے اور آج اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ میرے دوست نے حاضر جوابی سے کام لیتے ہوئے کہا شوکت بھائی زندگی اور موت کا کیا بھروسہ اچھا خاصا تندرست انسان چلتے چلتے ٹھوکر لگنے سے گر جاتا ہے۔ اور وہیں دم توڑ دیتا ہے۔ قائداعظم تو ضعیف اور کمزور ہو چکے تھے "ٹھیک کہتے ہو میاں" شوکت بھائی نے ان کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ مجھے علیحدہ لے جا کر شوکت بھائی ذرا سنجیدہ طور پر بولے "یہ حضرت پہنچے ہوئے درویش معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں وہ مزہ چکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ اور آئندہ جھوٹ بولنے کی ہمت نہ کریں گے!" دوسرے روز شام کو میں اور میرے دوست مکان کے سامنے نہر کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے کہ ناگاہ شوکت بھائی ریڈیو اسٹیشن سے واپس آتے ہوئے دکھائی پڑے۔ ہم لوگ بھی ان کی طرف بڑھے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ قریب پہنچ کر انہوں نے مجھ سے کہا "اقبال میں نے تمہارے دوست کو آسمان پر پہنچا دیا ہے لیکن قبل اس کے کہ میں اس بات کو بتلاؤں انہیں مٹھائی کھلانے کا وعدہ کرنا ہو گا" میرے دوست نے کہا "شوکت بھائی آپ کیلئے مٹھائی ہر وقت حاضر ہے" "نہیں صاحب پہلے مٹھائی کے لئے دس روپیہ کا نوٹ اقبال کے پاس رکھ دو تب بات بتاؤں گا اور شرط یہ ہے کہ اگر اس غیر متوقع اعزاز سے تم کو مسرت نہ ہو تو بیشک روپئے کی مٹھائی میرے ذمہ رہی" میرے دوست نے بالآخر دس روپے کا نوٹ اپنی جیب سے اور شوکت بھائی نے ایک لفافہ اپنے بیگ سے نکال کر بیک وقت میرے ہاتھ میں رکھے۔ لفافہ کھول کر میں نے ٹائپ شدہ خط نکالا اور پڑھ کر اس کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اور اپنے دوست کی جانب بظاہر رشک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے خط بڑھا دیا۔ شوکت بھائی بولے آج سے ان کا شمار پاکستان کی چند مخصوص اور بلند ترین شخصیتوں میں ہو گیا ہے۔ جس کے لئے یہ تاعمر میرے شکرگزار رہیں گے۔

وہ خط ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹیشن ڈائرکٹر کی جانب سے ان کے چھپے ہوئے لیٹر پیڈ پر تھا اور اس میں تحریر تھا "جناب والا ہمیں شوکت تھانوی صاحب کے ذریعہ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو حضرت قائداعظم سے ان کی وفات سے چند روز پہلے اپنے بڑے بھائی کے یہاں دئے ہوئے عشائیہ پر شرف ملاقات کا حاصل ہوا۔ ہم ممنون ہوں گے اگر آپ فلاں فلاں تاریخ ۹ بجے شب ایک تقریر ہمارے ریڈیو اسٹیشن سے نشر فرمائیں۔ اور قائداعظم سے آخری ملاقات

[illegible] تاثرات کا اظہار فرمائیں۔ آپ پاکستان کی ان چند خوش نصیب ہستیوں میں سے ہیں جنہیں مرحوم سے [illegible]
[illegible] میں ملاقات کا شرف حاصل ہو۔ مرحوم ان دنوں کراچی ریڈیو سٹیشن پر [illegible] تھے۔ مجھے بھائی صاحب کی
خدمت میں اس پروگرام کی تقریر کے لیے گزارش کرنی تھی۔
محمد کو پڑھنا تھا کہ ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ چہرہ فق ہوگیا۔ [illegible] مولانا
[illegible] ...... مطلب
میدان گویا ہوئے ہ شوکت بھائی ...... جی ......
ہے کہ ...... یہ اچھا نہیں ہوئے

اچھا کیوں نہیں ہوا شوکت بھائی [illegible] میاں مٹھائی [illegible] مجھے [illegible]
باتوں سے بیوقوف بنانے کی کوشش [illegible] مجھ سے [illegible] [illegible]
[illegible] میں نے اس [illegible] [illegible] جب تک [illegible]
چل کر چائے منگواتا ہوں ۔۔۔

شوکت بھائی مٹھائی کی بات ہے [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] دوست نے [illegible] [illegible]
[illegible] سمجھ گیا [illegible] [illegible]
ذرا ایسی لکھوں گا کہ [illegible] تقریر پر تمہاری [illegible] [illegible]
پرچے پر لکھ دو باقی میری ذمہ داری ہے۔ [illegible] [illegible] جلد
جائیے اور مٹھائی لے کر آئیے۔

چنانچہ میں چل دیا اور تقریباً ایک گھنٹے میں مٹھائی لے کر واپس آگیا۔ ہمارے اصرار کے باوجود وہ مٹھائی میں
شریک نہیں ہوئے۔ اتنے میں میری بیگم جن کو اس ڈرامے کا علم ہو چکا تھا [illegible] اور ہم [illegible]
مجھ سے بولیں "آپ دونوں نے انہیں کس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔ منہ پر ہوائیاں
اڑ رہی ہیں۔ ایسے مذاق سے کیا فائدہ۔ انہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"
میں نے کہا ابھی عجلت کیا ہے۔ ذرا صبر کرو اور تماشہ دیکھو۔ چائے کے بعد شوکت بھائی نے ہمارے دوست کی
طرف کاغذ کا ایک شیٹ بڑھاتے ہوئے فرمایا "آپ اس پر اس دعوت کی نمایاں باتیں مثلاً قائداعظم مرحوم کس لباس میں
ملبوس تھے۔ ان کے دائیں بائیں کون بیٹھا تھا۔ کھانے کے وقت کس قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ اس دعوت میں دیگر کون شخصیتیں
موجود تھیں وغیرہ وغیرہ یادداشت کے طور پر نوٹ کر دیں تاکہ میں تقریر ابھی لکھ دوں اور آپ دو روز میں اسے
کئی بار پڑھ کر رواں کر لیں۔"
ہمارے دوست نے وہ کاغذ تو لے لیا لیکن پھر شوکت بھائی کی منت و سماجت کرنے لگے "اگر آپ نے یہ
پروگرام منسوخ نہ کرایا تو مصیبت آجائے گی۔ میرے اور بھائی جان کے تعلقات خراب ہو جائیں گے اس لئے کہ
[illegible] کہا تھا کہ اس دعوت کا کہیں تذکرہ نہ کرنا۔ میں نے آپ کو اپنا سمجھ کر بتلا دیا۔"

شوکت بھائی نے پوچھا کہ آخر اس کو صیغۂ راز میں رکھنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ؟

ہمارے دوست برجستہ بولے اصل بات یہ ہے کہ آج کل بھائی جان کے تعلقات وزیر اعلیٰ سے کچھ بہتر نہیں ہیں اور موصوف کو اس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی اب اگر اس کا چرچا ہوتا ہے۔ اور ان کے علم میں یہ دعوت آجاتی ہے تو بھائی جان کی پوزیشن اور خراب ہو جائے گی "

"سبحان اللہ کیا استدلال ہے" ہاں یہ دعوت ہوئی بھی تھی کہ تم نے یوں ہی اڑا دیا" شوکت بھائی نے پوچھا۔

میرے شیر نے سینہ تان کر جواب دیا "نہیں صاحب دعوت تو ضرور ہوئی تھی۔ اور محترمہ فاطمہ جناح بھی شریک تھیں"

"تو پھر تقریر بھی مزہ رہے گی میں مجبور ہوں اس لئے کہ ریڈیو کے پروگرام میں تنسیخ میرے بس کی بات نہیں" شوکت بھائی نے ذرا لہجہ بدل کر کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں حال کا دورہ پڑتے پڑتے رہ گیا۔ ان کی عدم موجودگی میں میری بیگم اور میں نے شوکت بھائی سے درخواست کی کہ اب اس کی خطا معاف کر دیجئے ورنہ صبح تک اس کا برا حال ہو جائے گا لیکن وہ ابھی کہاں معاف کرنے والے تھے۔ انہوں نے کہا کہ خاموشی سے تماشہ دیکھتے جاؤ۔ وہ واپس آئے تو شوکت بھائی نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی جو کچھ اس قسم کے تھے ؛

"قائد اعظم کے داہنے۔ بائیں کون بیٹھا تھا؟"

"ان کے داہنی طرف محترمہ فاطمہ جناح تشریف فرما تھیں اور بائیں جانب بھائی جان"

"قائد اعظم کس لباس میں ملبوس تھے؟"

"ڈنر سوٹ پہنے ہوئے تھے"

"محترمہ فاطمہ جناح کون سا اور کس رنگ کا لباس زیب تن فرمائے تھیں؟"

"سیاہ رنگ کی ساڑھی پہنے تھیں"

"تو یوں کہئے کہ انہوں نے اپنے بھائی کے سوگ میں ۴-۶ یوم پہلے ہی سے ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ ورنہ یوں تو بالعموم وہ سفید لباس پسند فرماتی ہیں۔ اچھا میں اب سمجھ گیا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں مضمون لکھ لوں گا"

میرے دوست بولے "شوکت بھائی وقت گزرتا جا رہا ہے آپ خدا کے لئے کسی صورت سے کراچی ٹیلیفون کریں اور انہیں روکیں ورنہ اگر کہیں بھائی جان کے پاس اس تقریر کے لئے خط چلا گیا تو غضب ہو جائے گا اور میں کہیں کا نہ رہوں گا" اب کوئی نتیجے کا عمل ہوگا۔ میرے دوست کی حالت غیر تھی اور ہر لحظہ بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ بار بار پانی پیتے تھے پھر بھی ہونٹ اور زبان خشک نظر آ رہے تھے بالآخر میرے دوست مجھے علیحدہ لے گئے اور کہا کہ اگر بھائی جان کی تقریر کو ملتوی نہ کرایا گیا تو قیامت آ جائے گی۔ میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ ریڈیو پاکستان کا خط فرضی اور جعلی ہو شوکت بھائی نے مذاقاً ایسا کیا ہو تو فرمانے لگے "تم پاگل ہو گئے ہو، خط پر اسٹیشن ڈائرکٹر کے دستخط موجود ہیں۔ (جیسے وہ دستخط پہچانتے ہوں) بات یہ ہے کہ جب انسان بوکھلایا ہوا ہوتا ہے تو اس کی ساری دماغی صلاحیتیں جواب دے دیتی ہیں۔ اس وقت یہ اسی منزل میں تھے۔ میں نے پوچھا۔ اچھا مجھے تو صحیح بتا دو ڈنر کی بات غلط ہے نا۔ اس ڈھٹائی سے بولے غلط کون کہتا ہے ڈنر ہوا اور میں بھی موجود تھا۔ تو پھر تقریر کرنے میں کیا قباحت ہے۔ جب کہ شوکت

ریڈیو پر یہ تقریر نشر کروا رہے ہیں؟ لہٰذا مجھے بھائی کی تقریر سے زیادہ یہ بات پریشان کئے ہوئے ہے۔ کہ بہت ممکن ہے بھائی جان کو اس موضوع پر تقریر کرنے کے لئے دعوت دی ہو گئی۔ میں مصلحتاً اپنا حوالہ مناسب نہیں سمجھتا ہوں اگر ریڈیو والے چاہیں تو دعوت دیں لیکن میرا نام کسی صورت سے درمیان میں نہ آنا چاہیے۔

میرے دوست کی حالت لمحہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ ہم سب نے ایک زبان ہو کر ان سے کہا کہ شوکت بھائی اس بات پر ہم لوگوں نے رضامند کر لیا ہے کہ وہ نہ صرف جی۔ پی۔ او۔ جا کر ٹرنک کال کریں گے اور بھائی جان کی تقریر منسوخ کرا دیں گے بلکہ تمہاری بھی تقریر منسوخ کرانے کی کوشش کریں گے بشرطیکہ تم اس بات کا اقرار کرو کہ تم جھوٹ بول رہے تھے دوست کچھ منمنائے مگر وکیل صاحب تو پہلے ہی سے بس یونہی تو نہیں بیٹھے تھے کسی طرح الجھ کر بولے بات تو اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ میں بلاوجہ جھوٹ کیوں بولتا۔ اب اگر زبردستی آپ لوگ یہ کہلوانا چاہتے ہیں کہ دعوت نہیں ہوئی تو بات دیگر ہے۔
اب میں سمجھ چکا تھا کہ ان میں اقرار جرم کا حوصلہ نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی مناسب نہ تھی کہ یہی بات اس کی ضد بن کر رہ جاتی چنانچہ میں نے کوشش کر کے شوکت بھائی سے سب کی موجودگی میں کہا کہ صاحب یہ مانا کہ جھوٹ بول دیا کرتے ہیں۔ نہ قائد اعظم کی دعوت ہوئی اور نہ ہی یہ وہاں موجود تھے۔ چونکہ یہ کہہ چکے ہیں اسلئے اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے بھی ان کی تقریر کو نہ رکوایا تو ان کے بھائی صاحب سے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ اور ان کی ملازمت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

یہ سن کر شوکت بھائی ان کی طرف مخاطب ہو کر بولے "کیوں بھائی، اقبال جو کچھ کہہ رہے ہیں درست ہے؟" اس بار دوست نے لجاجت سے انہوں نے جواب دیا "اب آپ جو کچھ سمجھیں ٹھیک ہے۔ لیکن خدا کے لئے اب مہلت کیجئے میں تانگہ لینے جاتا ہوں۔ دس بج چکے ہیں۔ جی۔ پی۔ او۔ چل کر ٹیلی فون کرنا ہے۔" اب شوکت بھائی کو بھی اس بے چارے پر ترس آ گیا تھا اور وہ چلنے کیلئے تیار ہو گئے۔ تانگہ آ گیا ہم تینوں جب مکان سے نکلنے لگے تو شوکت صاحب کی بیگم صاحبہ نے کہا کہ آپ ادھر جا رہے ہیں تو انارکلی سے موتی چور کے لڈو ضرور لیتے آئیے گا۔ شوکت صاحب نے ان سے پیسے مانگے تو میرے دوست نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا کہ پیسے میرے پاس ہیں آپ خدا کے لئے جلد چلیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب ہمارا تانگہ جی۔ پی۔ او کے قریب پہنچا تو وہ خود ہی بولے کہ شوکت بھائی یہ پندرہ روپے ٹرنک کال کے لئے آپ لیجئے۔ ارجنٹ بک کیجئے گا۔ میں اور اقبال اتنی دیر میں اسی تانگہ پر جا کر انارکلی سے لڈو لے کر آتے ہیں۔ دو سیر لڈو ہم خرید کر کوئی بیس منٹ میں واپس آئے تو شوکت بھائی جی۔ پی۔ او کے باہر دروازے پر کھڑے ہم دونوں کا انتظار کر رہے تھے فرمانے لگے کہ میں نے ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل سے گفتگو کر لی ہے۔ تار انہیں مل گیا تھا۔ کل صبح تمہارے بھائی جان کو خط لکھ دیا جاتا لیکن میں نے ان سے کہہ دیا کہ یہ تار کسی غلط اطلاع پر روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس پر کوئی کارروائی نہ کی جائے اور اسے کالعدم تصور کیا جائے وہ میری بات مان گئے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ میرا دوست خوشی سے اچھل پڑا چہرے پر رنگ آ گیا۔ شوکت بھائی نے کہا ٹیلی فون کرنے میں تین روپے دس آنے مزید خرچ ہونے تھے جو میں نے دے دئے ہیں۔ یہ سنتے ہی انہوں نے پانچ روپے کا ایک نوٹ زبردستی شوکت بھائی جیب میں ڈال دیا۔ حالانکہ وہ نکلتا نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہتے رہے۔

ہم لوگ ساڑھے گیارہ کے قریب مکان واپس پہنچے۔ اس وقت تھوڑی بہت مشغولیت کی گنجائش بقیہ صبح ناشتے کے لئے رکھ دی گئی۔ اب شوکت بھائی نے ہمارے دوست سے کہا کہ آپ کے بھائی صاحب کی تقریر کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کیلئے کیا صورت ہونی چاہئے۔ تھوڑے توقف کے بعد فرمایا کہ اپنے دفتر سے دو یوم کی رخصت طلب کرو۔ ریڈیو کے تمام پروگرام سنو۔ وقت کی پابندی کے ساتھ ہوتے ہیں تمہاری تقریر پرسوں شب میں ہونی ہے۔ میں وہاں کہہ دوں گا کہ وہ اتفاقی طور پر سخت علیل ہو گئے ہیں اور تقریر کرنے کے قابل نہیں ہیں لیکن اس بات کا لحاظ رکھیں۔ ان دو دنوں میں آپ مکان کے باہر نہ نکلیں اور نہ ہی کوٹھی کے لان پر کھلی فضا میں بیٹھیں اس لئے کہ ریڈیو کے افسران کبھی کبھی میرے پاس آجاتے ہیں اگر کسی نے آپ کو دیکھ لیا تو میں جھوٹا پڑوں گا۔ باوجودیکہ ان کی شکل سے لگتا کوئی نہ بھی آشنا نہ تھا لیکن بے سوچے سمجھے بغیر وہ غریب اس عارضی قید کے لئے بھی رضامند ہو گئے اور اس صورت سے ہمارے دوست دو روز مکمل قید میں رہے۔

تیسرے روز یعنی جس تاریخ کو تقریر ہونی تھی شوکت صاحب نے دفتر سے واپسی پر ہم سب کو اپنے ڈرائنگ روم میں جمع کیا میں، میری بیگم، شوکت صاحب کی بیگم، ان کے بچے اور میرے دوست سب ہی موجود تھے۔ شوکت صاحب ہمارے دوست سے یوں مخاطب ہوئے "میاں اب تو ساری بات ختم ہو گئی"

اب اپنی زبان سے بھی کہہ دو کہ وہ دعوت کی بات غلط تھی۔ ہمارے دوست نے شرم سے آنکھیں تو جھکا لیں لیکن زبان سے اقرارِ جرم نہ کیا۔ اس کے بعد شوکت صاحب نے فرمایا "جھوٹ بولنے کے لئے بھی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے وقوف جھوٹ بول کر طرح طرح کے عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے اور عقلمند جھوٹ بولتا ہے تو مٹھائی بھی کھاتا ہے اور لطف بھی لیتا ہے۔ تم جھوٹ بولے تو تمہارے کم و بیش پچاس روپے خرچ ہوئے دو روز قید محض میں رہے اور جو تمہارے دل و دماغ پر گزری وہ تم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ اور میں نے جھوٹ بولا تو تم سے روپے بھی لئے اور مٹھائی بھی کھائی۔" اسکے بعد مبلغ اٹھارہ روپے (یعنی ٹیلیفون کا خرچ) ان کو واپس کئے اور ان سے آئندہ جھوٹ نہ بولنے کا عہد لے کر اس ڈرامے کو ختم کیا۔

اسی ضمن کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ قائداعظم کی وفات کے ساتھ ہی بھارتی گورنمنٹ نے ریاست حیدرآباد دکن پر قبضہ کرنے کے لئے فوج کشی کر دی تھی۔ قاسم رضوی صاحب کی انجمن اتحاد المسلمین کے رضاکاروں نے دلیرانہ انداز میں ایک مسلح فوج کا کئی روز تک مقابلہ کیا اس کا علم کس کو نہیں۔ ہر پاکستانی اپنے محبوب رہنما کی بے وقت وفات سے یوں ہی کیا کم رنجیدہ تھا اس پر ستم بالائے ستم۔ اچانک حادثے سے لوگوں پر جو قیامت گزری اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ گنتی کے نہتے جانباز ایک منظم فوج کا کب تک مقابلہ کرتے نتیجہ بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جس وقت سقوطِ حیدرآباد کی خبر نشر ہوئی میں اپنے دفتر ہی میں تھا اس خبر سے ہر کس و ناکس کو دلی صدمہ پہنچا اور سارے ملک میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ میں دفتر سے سیدھا ریڈیو اسٹیشن شوکت بھائی کے پاس پہنچا۔ وہ بھی بہت رنجیدہ تھے اور اپنے دلی صدمے کا کئی بار اظہار بھی کیا۔ بالآخر ہم دونوں گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ کوٹھی کے اندر ابھی داخل نہ ہونے پائے تھے کہ شوکت بھائی کو اس عالم میں بھی ایک مذاق سوجھا۔ مجھ سے کہنے لگے "دیکھو میں پاگل بنا جاتا

... بلکہ قہقہے لگا کر [illegible] دیا۔ شاید [illegible] تھا۔ انہوں نے [illegible] مجھے [illegible] ہاتھ میں
[illegible] کر [illegible] لگے۔ [illegible] آنکھیں [illegible] ہو گئی [illegible] مجھ سے [illegible]
[illegible] چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ [illegible] آنکھیں بتا [illegible] نہیں۔

مجھے تو آج تک ان کی دماغی [illegible] کوئی شک [illegible] ہے۔ [illegible] ہوتے ہی [illegible] ان کے بھائی شوکت بھائی کو اس عالم میں دیکھنے [illegible] حال پوچھنے۔ میں نے شوکت بھائی کی ہدایت کے مطابق انہیں بتایا کہ میں وقت سے [illegible] حیدرآباد [illegible] ابھی [illegible] پاگلوں جیسا حال بنا رکھا ہے۔ [illegible] انہوں نے مجھے [illegible] نہیں اپنے ہمراہ لایا ہوں۔ شوکت صاحب کی [illegible] صاحبہ [illegible] سے میں مجھے [illegible] سب سے پہلا حملہ انہوں نے اپنی بیگم پر کیا [illegible] لگے۔ نہ صرف وہ بلکہ ہم سب چیخ [illegible] تھے [illegible] آخر [illegible] شوکت بھائی کی [illegible] سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ [illegible] مجھے پکڑ [illegible] چیخ پکار سے خدا کے لئے [illegible] اس وقت شوکت بھائی کے [illegible] مجھے [illegible] محبت کا اندازہ لگانے کا موقع ملا۔ [illegible] شوکت بھائی کی [illegible] میری بیوی کی چیخ پکار کی وجہ سے سب نے [illegible] شوکت بھائی پر جھپٹ [illegible] الگ [illegible] کے عالم میں یہی کہتے رہتے۔

"کس نے میری بیوی کو مجھ سے چھین لیا۔ یہ کون ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ" [illegible] میں نے [illegible] غلطی کا [illegible] کیا اور ان سے معافی مانگی تب کہیں جا کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ [illegible] حیدرآباد کی فتح یا شکست سے آپ کا کیا تعلق؟ آپ نے خواہ مخواہ اپنے دل پر اس بات کا اتنا اثر کیوں لیا؟ آپ اپنی جان کیوں ہلکان کر رہے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ" لیکن شوکت بھائی کا جواب بھی خوب تھا بولے "مجھ سے کوئی تعلق نہیں؟ ایک ادیب۔ ایک فن کار کا کس چیز سے تعلق نہیں ہوتا۔ قائد اعظم اگر موجود ہوتے تو کوئی فکر کی بات نہ تھی لیکن ان کی وفات کے بعد ہماری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ .... اگر ہندوستان نے پاکستان کو یوں ہی ہڑپ کر جانا چاہا تو بھی آپ یہی فرمائیں گی کہ تم سے کیا مطلب؟ ...... کیا خوب بات کہی آپ نے .... میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ اللہ میاں کے ہاں جب قائد اعظم مجھ سے محاسبہ کریں گے [illegible] کہیں گے کہ دنیا سے میرے چلے آنے کے ایک ہفتہ بعد ہی ہندوستان نے حیدرآباد پر قبضہ کر لیا تو میں کیا جواب دوں گا" یہ کہہ کر رونے لگے۔ گھر کے ہر فرد کو اب ان کے مکمل پاگل ہونے کا یقین ہو چکا تھا۔ عرق بید مشک وغیرہ انہیں زبردستی پلایا گیا لیکن بے سود۔ ان کے نیچے [illegible] رہے تھے اور نہ صرف ان کی بیگم بلکہ میری بیوی بھی بدحواس تھیں۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا گرمیوں کا زمانہ تھا۔ صحن میں پلنگ پر بستر بچھا کر انہیں زبردستی لٹا دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ آپ باتیں نہ کریں۔ اس واہمہ کو دل سے نکالیں اور ذرا دیر آرام کریں اس وقت تک نہ جانے کتنے ایسے نازک مقامات آچکے

تھے جہاں مجھے اپنی زبان کو دانتوں سے کاٹ کر ہنسی کو برداشت کرنا پڑا۔ ایکٹ آخری تھا کہ شوکت بھائی پلنگ پر بیٹھے تھے۔ ہم سب ان کے ارد گرد جمع تھے کوئی پنکھا جھل رہا تھا تو کوئی انہیں تسلی دے رہا تھا لیکن وہ جس کی طرف نظر بھر کر دیکھ لیتے تھے وہ اپنی جگہ سہم کر رہ جاتا تھا۔ ہر شخص چوکنا تھا کہ نہ جانے ان کی توجہ کا مرکز کون بنے۔ اب چاند پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہو چکا تھا بھائی لیٹے لیٹے چاند کو کچھ دیر غور سے دیکھتے رہے۔ اچانک پلنگ پر ہی کھڑے ہو کر چاند سے پہلے شعروں میں باتیں کیں۔ اُس کے بعد اپنا ہاتھ کمر پہ رکھ کر کسی مشہور فلمی گانے کا ٹکڑا جس میں چاند کا ذکر تھا ایسی دھن میں مٹک مٹک کر یوں گانے لگے کہ نہ صرف میں بلکہ ان کی بیوی اور بچے بھی ان کی اس حرکت پر اپنی بے تحاشہ ہنسی کو روک نہ سکے لیکن اس کے فوراً بعد ہی ان کی بیگم نے اپنے بڑے بیٹے سعید عمر سے کہا کہ کیا دیکھ رہے ہو فوراً جا کر ڈاکٹر کو بلا لاؤ دیکھتے ہو ان کا کیا حال ہو رہا ہے۔ سعید نے قریب کی کسی کوٹھی سے غالباً شوکت صاحب کے خاندانی معالج ڈاکٹر ممتاز حسین کو ٹیلی فون کیا اور وہ نصف گھنٹے کے اندر آ گئے۔ افسوس کہ وہ بیچارے بھی ان حضرت کو نہ پہچان سکے۔ انہیں بھی شوکت صاحب کو اس حالت میں دیکھ کر صدمہ پہنچا۔ وہ تا دیر شوکت صاحب کو سمجھاتے بجھاتے رہے۔ تفصیلی حال سننے اور پورے معائنے کے بعد نسخہ لکھ کر وہ انجکشن لگانے کی فکر اور کوشش میں تھے کہ شوکت بھائی نے انہیں ایسی بھرپور نظروں سے دیکھا کہ وہ بغیر انجکشن لگائے اور بغیر فیس لئے شوکت صاحب کو آرام کرنے کی تلقین فرماتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اب سعید عمر دوا لینے کے لئے جانے والے ہی تھے کہ شوکت بھائی نے دوسروں کی نظریں بچا کر مجھے اشارہ کیا کہ انہیں روکو۔ چنانچہ میں نے کہا کہ آپا نو بجنے والے ہیں۔ مال روڈ اور انارکلی کی دوکانیں بند ہو گئی ہوں گی اس وقت اس مقصد کے لئے سعید کو بھیجنا فضول ہے رات گزرنے دیجئے اگر خدانخواستہ صبح تک ان کی حالت نہ سنبھلی تو دیکھا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کھانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن اس پریشانی کے عالم میں کوئی کھانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ میری بھی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا میں نے شوکت بھائی سے کہا کہ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ اب مجھ میں ضبط کا یارا نہیں رہا۔ خدا کے لئے یہ ڈھونگ ختم کیجئے دیکھئے تو سب کا کیا حال ہو رہا ہے۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ سب سمجھ گئے کہ یہ حضرت بنے ہوئے ہیں۔"

"انکی بیگم بہت خفا ہوئیں کہ ایسا مذاق بھی کیا۔ اختلاج کے مارے میرا نہ جانے کیا حال ہو گیا ہے۔ بالآخر شوکت بھائی اپنی اصلی حالت اور قدرتی شکل میں واپس آ گئے اور سب سے اپنی مہارت کی داد چاہنے لگے۔ سب نے یک زبان ہو کر ان کی اہلیت کو تسلیم کر لیا اور ان کے فن کی داد دیتے ہوئے کہا کہ اصلی پاگل بھی آپ سے آ کر آداب پاگلی سیکھے۔ رات کے دس بجے جب یہ ڈرامہ ختم ہوا تو سب کو کھانا نصیب ہوا۔ اس مذاق سے یہ ضرور ہوا کہ حیدرآباد کی خبر سے دل جس قدر رنجیدہ تھے اس کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔"

شوکت بھائی کے ساتھ رہ کر مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ انکی نجی زندگی حرف بحرف اس شعر کے مصداق رہی ؎

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

میں ان کی نجی زندگی کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ تاہم یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جس شخص کی زندگی میں تلخیاں ہی تلخیاں ہوں اور قدم قدم پر ناخوشگواری کے کانٹے ہوں اس کے ہونٹوں پر ہمہ وقت شگفتہ تبسم کیوں کر رقصاں ہو سکتا ہے یہ اعلیٰ ظرف اور بڑے حوصلہ کی بات ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں جو مصیبتوں، الجھنوں، رنجشوں اور تلخیوں کا مقابلہ نہایت صبر و ضبط سے کرتے ہیں اور ان کی زبان پر حرفِ شکایت بھی نہیں آتا۔ شوکت بھائی جن کے متعلق میں اپنی صحیح معلومات کی بنا پر اگر یہ لکھوں کہ ؎

دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم؟ تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ سینہ دل میں نہ جانے کتنے زخم چھپائے ہوئے تھے جن میں سے شاید کوئی زخم سرطان کی شکل میں ظاہر ہو کر ان کے معالجین کے علم میں آیا اور بالآخر ان کے حق میں ابدی سکون اور مداوائے کامل ثابت ہوا اور وہ اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے لیکن نہ جانے کتنے دوستوں، عزیزوں اور ساتھیوں کو سوگوار و شکستہ چھوڑ گئے۔ غالباً ان کی نجی زندگی کی یہ تلخیاں ہی تھیں جنہوں نے انہیں دوسری شادی پر مجبور کیا۔ لیکن ان کے دکھ کا یہ بھی مداوا نہ بن سکی اس لئے کہ اب انہیں ہر دو طرف کی ذمہ داریوں نے اپنی گرفت میں لے لیا اور یہ امر واقعہ ہے کہ دو شادیاں کرنے کے بعد امن و سکون کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی پہلی بیوی اور بچوں کی ذمہ داریوں سے بے خبر ہو جاتے تو شاید ان کے مصائب و افکار میں کچھ کمی ہو جاتی لیکن وہ فطرتاً ایک ذمہ دار شریف النفس انسان تھے اس لئے وہ دوسری شادی کے باوجود اپنی پہلی بیوی اور بچوں کی طرف سے غافل نہ رہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ان کی کفالت کے لئے جو معقول رقم مقرر کر دی تھی وہ دو لڑکوں کے برسر روزگار ہو جانے کے باوجود تا دمِ واپسیں باقاعدگی سے دیتے رہے۔ یہ بات بظاہر بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دو گھروں کے چلانے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور اپنے آرام و سکون کا لحاظ کئے بغیر شبانہ روز جس محنت و جانفشانی سے کام کرنا پڑا وہ ان کی صحت کے لئے کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ غالباً یہ اسی بے پناہ محنت اور دماغی کاوش کا نتیجہ تھا کہ وہ بیک وقت دو مہلک امراض میں ایسے مبتلا ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے۔ شوکت صاحب کی پہلی بیگم کے بطن سے تین لڑکے ہیں۔ جن میں سے دو الحمد للہ برسر روزگار ہیں اور تیسرے نے اس سال ایف ایس سی کا امتحان دیا ہے۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ دوسری بیوی سے تین کم عمر بچیاں ہیں جو ابھی تعلیم کے ابتدائی مراحل میں ہیں۔

میں [illegible] میں کراچی آ گیا۔ مجھے شوکت بھائی کی جدائی کا ایک مرتبہ پھر غم برداشت کرنا پڑا لیکن میری خوش قسمتی کہ کچھ عرصے بعد وہ بھی ادارہ جنگ سے منسلک ہو کر کراچی آ گئے میری خواہش کے مطابق ناظم آباد میں میرے قریب ہی کرایہ پر مکان لے لیا۔ اس مکان کی بالائی منزل میں ان کے دوست جناب سید محمد جعفری اور نچلی منزل میں شوکت صاحب رہنے لگے۔ اب ہم لوگ ایک بار پھر اکٹھے ہو گئے اور کافی وقت ساتھ گزرنے لگا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب دفتر جاتے ہوئے ان کو بھی ساتھ لے لیتا۔ انہیں جنگ کے دفتر پر چھوڑ کر میں اپنے دفتر چلا جاتا۔ ایک دن صبح میری آنکھوں نے جو واقعہ دیکھا اسے اگر کوئی دوسرا بیان کرتا تو شاید مجھے مشکل ہی سے یقین آتا۔

شوکت صاحب کا معمول تھا کہ صبح ضروریات سے فارغ ہو کر دفتر جانے کے لئے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ناشتے کی میز پر آ جاتے اور ناشتہ کرنے کے بعد اپنا ہینڈ بیگ (جس میں ضروری کاغذات کے علاوہ پان کی ڈبیہ مختلف اقسام کے

تھا کہ وہ رقوم کا ہونا ضروری تھا) لے کر دفتر روانہ ہو جاتے۔ ایک دن صبح میں اپنے گھر سے نکل کر ان کے پاس پہنچا تو انہیں ناشتہ کرتے ہوئے پایا۔ ایک چائے کی پیالی زبردستی میری طرف بڑھا کر کہنے لگے کہ بس میں چل رہا ہوں یہ کہہ کر وہ اپنے بیڈ روم میں چلے گئے میں بھی چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے یونہی ان کے پیچھے چلا گیا۔ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی مسہری کے سرہانے پر آویزاں ایک طغرے کو عقیدت کے ساتھ دیوانہ وار چوم رہے ہیں اور آنکھوں سے مس کر رہے ہیں ان کا چشمہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ جوں ہی ان کو میری موجودگی کا علم ہوا وہ ٹھٹک گئے۔ میری حیرت و دہشت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ طغرہ جس کو وہ دیوانہ وار بوسے دے رہے تھے اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی شبیہ مبارک تھی یہ وہ روضۂ اطہر ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے ؎

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید این جا

شوکت بھائی کی دنیوی زندگی سے کما حقہٗ واقف ہونے کے بعد یہ واقعہ اپنی نوعیت کا نہایت عجیب و غریب واقعہ تھا۔ مجھے اس کے بعد شوکت بھائی کے اس دل پر رشک آنے لگا جس میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح جلوہ افروز تھی جس کا اظہار بھی شاید ان کی نظروں میں ریاکاری کے مترادف تھا کون جانے کہ رسول عربی کی ذات گرامی سے والہانہ محبت اور عقیدت کا صلہ انہیں وہ ملے جس کا ملنا تمام عمر کی عبادت و ریاضت کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا تو کہنے لگے "تم کو حیرت کس بات پر ہے۔ میں گنہگار سہی لیکن ہوں تو انہیں کا نام لیوا" مجھے اس بات کو اپنے دل میں محفوظ رکھنے کے لئے تلقین کی اور کہا کہ ایک بات اور تم کو بتلاتا ہوں جو میرے معمول میں ہے اور تم بھی اسے اپنا معمول بنا لو۔ وہ یہ کہ صبح اٹھتے ہی اپنے داہنے ہاتھ کی چھنگلی کو یوں موڑ کہ بائے ہوز نظر آئے اور باقی انگلیوں کو اس طرح کشادہ رکھو کہ "اللہ" بن جائے۔ مجھے وہ شکل بنا کر بھی دکھائی۔ بولے کہ اس ہاتھ کو صبح اٹھتے ہی چوم کر اپنے چہرے پر مل لیا کرو اس عمل سے بہت برکت حاصل ہوگی اور تمام دن اللہ کا کرم شامل حال رہے گا۔ اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرحوم کو اللہ اور اس کے رسول سے کس درجہ گہرا تعلق تھا۔ خوش نصیب ہیں وہ جنہیں خدا اور اس کے رسول کی محبت کی دولت لازوال میسر ہے۔

ہم لوگ خوش خوش دن گزار رہے تھے کہ ایک روز شوکت بھائی نے میرے گھر آ کر اپنے راولپنڈی تبادلے کی خبر سنائی۔ میر خلیل الرحمن صاحب نے راولپنڈی سے "جنگ" کے اجرا پر موصوف کو ادارتی ذمہ داریاں سونپ کر وہاں بھجوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ شوکت بھائی کو بادل ناخواستہ و با چشم نم خدا حافظ کہا لیکن کون جانتا تھا کہ یہ عارضی جدائی کچھ مدت کے بعد دائمی اور یقینی مفارقت میں بدل جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی دونوں کی پُرخلوص اور بے لوث محبت کا نتیجہ تھا کہ ان کی علالت کے دوران آخری بار ملنے کی صورت خود بخود نکل آئی۔ میں دہلی کے مشاعرے میں شریک ہونے کے بعد ۲۸ اپریل ۱۹۶۳ء کو لاہور واپس آیا۔ دہلی کے مشاعرے میں وہ بھی مدعو تھے ان کا وہاں بے حد انتظار رہا لیکن شوکت تھانوی نہ پہنچے اور نہ ہی عدم شرکت کا کوئی سبب معلوم ہو سکا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ راولپنڈی میں ہوں گے۔ میرا پروگرام دوسرے روز اپنے بھائی کے پاس پشاور جانے کا تھا۔ میرے ساتھ میری اہلیہ بھی تھیں اور ہم دونوں

نے لکھا تھا کہ شوکت بھائی سے ملنے کے لئے بار بار چند گھنٹوں کا ہی موقعہ ملا ہیں۔ پہلی ہی شام کو ہم لوگ ریل سے پشاور روانہ ہونے کو تیار تھے کہ اسی روز ۲ بجے دن کو گاڑی میں اتفاقاً فرحت بھائی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ٹیلیک سیٹ کے بعد سب سے پہلے شوکت بھائی کی تشویشناک حالت کا تذکرہ اس انداز میں کیا کہ میرا جی دھک سے رہ گیا۔ ہم اسی وقت اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ان کی سسرال، جہاں وہ ان دنوں مقیم تھے، جہاں وہ مقیم تھے۔ جوں ہی ہم لوگ ان کے کمرے میں داخل ہوئے اور ہماری نگاہیں ملیں آنکھوں میں آنسو آگئے اور صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا عجیب عالم تھا۔ خود شوکت بھائی ان کی دونوں بیگمیں اور میری بیوی چاروں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اور رونے کی عجب کیفیت تھی۔ شوکت بھائی کو پہلی بار اس عالم میں دیکھ کر دل پر جو گزری وہ ناقابل بیان ہے۔ ان کی بیگم ان کے ہاتھ اور منہ دھلا رہی تھیں۔ اس لئے کہ ۵ بجے شام شوکت بھائی کو میو ہسپتال لے جایا جا رہا تھا جس کے لئے معلوم ہوا کہ وہ بالکل رضامند ہو گئے تھے۔ مجھ سے بولے "اوہ بابا تم جانتے ہو۔ میں نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے زندگی میں اس طرح کا کوئی کام نہیں لیا۔

اب یہ بے چاری رات دن جس صورت سے میری تیمارداری اور خدمت کر رہی ہیں اس سے میرے دل کو بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ میں اس کا بدلہ ان کو اس سے زیادہ کیا دے سکتا ہوں کہ آخری دم تک اسے بچانے کی کوشش کروں۔ لیکن بے تحاشہ رونے لگے اور ہم لوگ بھی پھوٹ پڑے۔ میں نے کہا کہ شوکت بھائی آپ پریشان نہ ہوں خدا نے چاہا تو آپ جلد ہی ہسپتال سے صحت یاب ہو کر گھر واپس آ جائیں گے اور ہم لوگ انشاء اللہ آپ کے غسل صحت کا شاندار جشن منائیں گے۔ اور وہ اس کا وقت نہ آیا۔ اس کے بعد اپنی بیگم سے کہا کہ تم میری فکر چھوڑ دو۔ بلکہ تمہاری دولہن بیٹی اور تمہارے بھائی آئی ہیں انکی خاطر و مدارات کرو۔ ہم دونوں یک زبان ہو کر بولے کہ شوکت بھائی ہم تو آپ کی عیادت کے لئے آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ آپ کو شفائے کامل عطا فرمائے اس وقت کسی قسم کی خاطر و مدارات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تاہم انہوں نے اپنی قسم دے کر مجھے اور میری بیوی کو کچھ پھل کھانے پر مجبور کر ہی دیا۔ میں نے پوچھا کہ ابھی ۲۰ مارچ ۱۹۶۳ء کو آپ سے لاہور کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی اس وقت تک آپ بالکل تندرست نظر آ رہے تھے۔ یہ ایک ماہ میں آپ کا کیا حال ہو گیا ہے۔ مسکراتے ہوئے بولے بھائی بحمد اللہ میں وسیع القلب ہو گیا ہوں لیکن ڈاکٹر اسے دل بڑھ جانے کی بیماری بتلاتے ہیں اگر وسیع القلبی بھی کوئی عارضہ ہے تو اس عارضہ کو میں بخوشی قبول کرتا ہوں اب شوکت بھائی کو میو ہسپتال لے جانے کی تیاری ہونے لگی چنانچہ ہم دونوں بھی ان سے باچشم نم رخصت ہو کر شام کی ٹرین سے پشاور چلے گئے۔ یہ ہماری ان کی آخری اور بالکل آخری ملاقات تھی۔

شوکت بھائی کے قہقہے۔ چست و برمحل جملے اور بے مثل لطیفے آج بھی سرمایہ گوش و دماغ ہیں۔ ان کی بے پایاں محبت۔ ان کا اخلاص۔ ان کی شرافت نفس۔ ان کی بے غرضی اور بے لوثی کس کس بات کا ذکر کیا جائے اور کس کس وصف کو قلم بند کیا جائے۔ شوکت بھائی ایک نہایت اچھے مخلص دوست۔ ایک صاحب الرائے شفیق اور ایک سچے محب وطن تھے جب تک اردو زبان زندہ ہے شوکت زندہ رہیں گے۔ اور جب تک ان کے احباب اور ان کے مداح باقی ہیں ان کا تذکرہ ہوتا رہے گا لیکن ہر محفل میں اور ہر بزم سخن میں ان کی کمی

محسوس کی جاتی رہے گی۔

یہ ایک ایسا خلا ہے جسے گردش ماہ و سال کبھی پُر نہ کر سکے گی۔ یہ ایک ایسی جدائی ہے جس کے بعد اس دنیا میں امکان وصل ہی نہیں رہتا۔ یہ ایک ایسی مفارقت ہے جس کے بعد تصور قرب ایک واہمہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود محبت کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہے جو جسم و روح کی قیود ٹوٹ جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ شوکت بھائی آج بھی مجھے چلتے پھرتے۔ ہنستے۔ بولتے۔ اور لکھتے پڑھتے نظر آتے ہیں اور میں اکثر اپنا یہ شعر گنگنانے لگتا ہوں ؂

اگرچہ تو درمیاں نہیں ہے کہ تری یہ دوستی ہے اب بھی
ضیائیں پھیلی ہیں انجمن میں چراغ پردے میں جل رہا ہے

———

شوکت تھانوی

سید امتیاز علی تاج

۱۹۲۹ء میں جب شوکت تھانوی سے پہلی بار ملنے کا اتفاق ہوا تو مجھے گمان بھی نہ گزرا کہ یہ وہی ہیں جو اپنے لڑکپن میں اخبار پھول کے بیسیوں مضمون ... تھانوی کی نظموں کے لفافے میں ڈال کر بھیجا کرتے تھے۔ مجھے پھول کے مضامین کی ڈاک کھول کر پڑھنے کی اجازت تھی۔ ان میں جو مضمون نکلتا وہ ان کے مضامین میں ... عقب سے غیر معمولی معلوم ہوتے۔ وہ مجھے یاد رہ جاتے۔ چنانچہ شوکت صاحب اگر اپنی ابتدائی مضمون نگاری کا تذکرہ کرتے تو کیا عجب ہے مجھے خوشی ہوتی مگر تعلقات زیادہ بڑھ جانے کے بعد بھی وہ نہ بتا سکے کہ انھیں کیوں نہیں ... اس ملاقات میں مجھ سے منافقین مصلحت معلوم ہوا۔ اس ملاقات میں میرے متعلق وہ جو رائے قائم کر کے گئے اس کا تذکرہ انھوں نے اپنی کتاب شیش محل میں کیا ہے۔ بعد میں ایک بار خود ہی مجھ سے کہا کہ اُن کی وہ رائے صحیح نہ تھی۔

کئی سال بعد شوکت صاحب سے ایک دو ملاقاتیں اُس وقت ہوئیں جب ۱۹۴۳ء میں وہ لاہور میں پنچولی آرٹ پکچرز میں بحیثیت مصنف کے آئے۔ افسوس کہ اُن کے آنے سے پیشتر میں پنچولی آرٹ پکچرز میں تین سکرین پلے لکھنے کا معاہدہ ختم کر چکا تھا اور پرچات فلم کمپنی کے لیے ایک فلمی کہانی لکھ کر ڈائرکٹ کرنے کی غرض سے پونا بلایا جا رہا تھا۔ اس لیے اس موقع پر شوکت صاحب سے ایک دو سے زیادہ ملاقاتیں نہ ہو سکیں۔ وہ بھی بہت مختصر اور رسمی قسم کی۔ پھر جب بعض مجبوریاں پیش آ جانے سے میرا لاہور چھوڑنا ممکن نہ رہا اور پونا جانے کا خیال مجھے قطعی طور پر ترک کرنا پڑا تو اُس وقت تک شوکت پنچولی آرٹ پکچرز کی ملازمت ترک کر کے سونگ پبلسٹی کا کام کرنے یو۔پی جا چکے تھے۔

آخر ۱۹۴۶ء میں شوکت صاحب سے تعلقات زیادہ بڑھنے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ سونگ پبلسٹی کا کام چھوڑ کر وہ دوبارہ پنچولی آرٹ پکچرز میں آئے تو اُس زمانے میں میں بھی اِس کمپنی کے لیے کام کر رہا تھا۔ کمپنی کے مالک نے مجھ سے ایک فلمی ڈراما لکھنے کی فرمائش کر رکھی تھی جسے میں کمپنی ہی کے دفتر میں اِس خیال سے جا کر لکھا کرتا تھا کہ کوئی بات مالک کمپنی سے پوچھنے کی ہو تو وہیں کے وہیں تبادلۂ خیال کر لوں۔ وہاں میرے کمرے کے برابر کے کمرے میں شوکت بیٹھتے تھے۔ وہ اپنے کام سے اُکتاتے تو میرے کمرے میں آ جاتے۔ کسی شگفتہ طبع ادیب سے گفتگو کر کے جس قسم کی فرحت ملتی ہے وہ تو اِن ملاقاتوں سے ضرور حاصل ہوتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں ہم نہ ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہو سکے اور نہ اُن کے کمالات مجھ پر کھل

بیٹے۔ میرے فلمی ڈرامے کے لیے گانے لکھنے کا سوال پیدا ہوا تو یہ کام شوکت صاحب کے سپرد کیا گیا۔ [illegible] اور انداز کے متعلق مل کر غور کیا کرتے۔ دو ایک گانے شوکت صاحب نے لکھ کر مجھے دیئے بھی جو میرے پہلے کاغذوں میں کہیں دبے پڑے ہوں گے۔ اسی زمانے میں ملک کے سیاسی حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ یہ فلم [illegible] پڑ گیا۔ تھا کھٹائی گیا۔ مگر تقسیم ملک کے بعد پنچولی آرٹ پکچرز کا کاروبار ختم ہو گیا اور اس فلم کے بننے کی نوبت نہ آئی۔ شوکت [illegible] ملازمت سے فراغت پا کر ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ اتفاق کی بات کہ اس زمانے میں مجھے بھی ریڈیو پاکستان لاہور میں ایک ایسا کام نکل آیا جس کے لیے مجھے کئی مہینے روزانہ وہاں صبح سے [illegible] صرف کرنا پڑا۔

ہوا یوں کہ تقسیم ملک سے تھوڑے ہی عرصے بعد ظفر الاحسن صاحب نے جو اس زمانے میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر تھے ایک موقع پر مجھ سے ذکر کیا کہ جو طرح طرح کی مصیبتیں سہہ کر کے برے حالوں پاکستان پہنچ رہے ہیں اور ان کا [illegible] مجھے کچھ اور بھی نظر نہیں آتا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ روزانہ اخباروں کے پہلے صفحے پر کچھ جگہ اس غرض کے لیے مخصوص کرانے کی کوشش کروں کہ ان بے گھر لوگوں کا حوصلہ [illegible] کرنے کے لیے آپ روزانہ مناسب مضامین لکھنے کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ میں نے اس تجویز پر چند روز غور کرنے کے بعد ان کی خدمت میں عرض کیا کہ کئی کئی اخباروں کے لیے یہ خدمت روزانہ سر انجام دینا نہ صرف بہت محنت طلب کام ہے بلکہ اس طرح بعض پیچیدگیاں پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لیے میری دانست میں مناسب رہے گا کہ یہ خدمت ریڈیو پاکستان کے ذریعے سر انجام دینے کی کوشش کی جائے۔ احسن صاحب نے میری اس تجویز سے اتفاق فرمایا چنانچہ میں نے ریڈیو پاکستان لاہور سے روزانہ نشر کرنے کے لیے ایک مرکب پروگرام کا منصوبہ تیار کر لیا اور ریڈیو کے متعلقہ افسروں سے اس پر تفصیلی بحث کی۔ انھوں نے میری اس تجویز کو پسند کیا اور یہ کام میرے سپرد کر دیا۔ پروگرام کا نام "پاکستان ہمارا" تجویز ہوا۔ ریڈیو پاکستان نے اس کام میں میری امداد کے لیے شوکت تھانوی کو مقرر کیا۔ شوکت صاحب نے بعد میں مجھے بتایا کہ شروع شروع میں انھیں اندیشہ تھا کہ روزانہ اکٹھے کام کرنے میں اختلاف رائے سے کہیں بدمزگی نہ پیدا ہو جائے لیکن جب کام شروع ہوا تو ایسی خوش اسلوبی سے سر انجام پاتا رہا کہ ہر دن ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر کرتا گیا۔

ہم دونوں ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ کام کرنے کا طریق یہ تھا کہ صبح کو دفتر پہنچتے ہی طے کرتے کہ اس دن کے پروگرام کا موضوع کیا ہوگا۔ موضوع کے انتخاب میں اخباروں کی خبریں اور رپورٹروں کی رپورٹیں ہماری رہنمائی کرتیں۔ ان دونوں ذریعوں سے امداد نہ ملتی تو عام حالات کا خیال کر کے ایک دوسرے کے مشورے سے کوئی مناسب موضوع خود طے کر لیتے۔ جو موضوع بھی طے ہوتا اس پہ کلام پاک، حدیث اور تاریخ میں سے ایسی چیزیں نکالتے جن سے اسلامی نقطۂ نظر واضح ہوتا۔ اس کے بعد ہنگامی حالات پر توجہ کی جاتی۔ کیمپوں کے واقعات پر مکالمے، اسکٹ، نظمیں وغیرہ لکھنا تجویز ہوتا۔ یوں بہت سی اہم اور مفید مطلب چیزوں کی ایک فہرست دوپہر سے پہلے تیار ہو جاتی۔ اس کے بعد ہم کام تقسیم کرتے کہ فہرست کی کون کون سی چیزیں شوکت لکھیں گے اور کون کون

دن میں۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ دوسرے ہفتے تک ہم اپنے اپنے حصے کی تحریریں تیار کر لیتے اور ایک دوسرے کو سناتے۔ دونوں ایک دوسرے کی چیزوں پر بے تکلفی سے اعتراض کیا کرتے اور جو قائل ہو جاتا وہ اپنی چیز دوبارہ لکھتا یا اسی میں مناسب ترمیم کر دیتا۔ غرض جب پورے اسکرپٹ کے مسودے کی درستی ہو جاتی تو نقلیں تیار ہو کر آتیں تو جلدی جلدی ہم انھیں پڑھتے اور کتابت کی غلطیاں درست کرنے کے بعد مختلف حصے مختلف آرٹسٹوں کے سپرد کر کے ان کی ریہرسل کراتے۔ اتنے میں براڈکاسٹ کا وقت ہو جاتا۔ اس میں حسب ضرورت حصہ لیتے۔ ریڈیو کے ڈراموں میں رہتا۔ شوکت عموماً کسی اسکٹ میں حصہ نہ لیتے۔

اسی زمانے میں ہم نے سب سے پہلے علامہ کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ سبب یہ تھا کہ جب ہم آمنے سامنے بیٹھ کر لکھتے تھے تب کبھی مجھے کسی لفظ یا محاورے کے متعلق کچھ شبہ ہوتا تو آپ سے رجوع کرتا اور شوکت سے استفسار کرتا۔ اس سے جو آپ بتاتے کتاب اور لغت دیکھنے سے اس کی تصدیق کر لی۔ خاص موقع پر اب مجھے یاد نہیں وہ کیا بات تھی جس سے مجھے کوئی اہم معلومات حاصل ہونے پر بے اختیار میرے منہ سے نکلا "یار آپ کو تو علامہ کا لقب ملنا چاہیے۔" بولے "لقب ؟" مدح و ذم دونوں پر دلالت کرتا ہے اس لیے علامہ کے لیے خصوصیت سے موزوں ہے۔" اس کے بعد میں نے انھیں علامہ کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ چند روز وہ اس لقب سے بے چین سے رہے۔ بعد میں اس کے عادی ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ شوکت میں اتنا علم نہ تھا۔ پہلی ملاقات میں وہ کسی طرح "ٹھوس" آدمی معلوم نہ ہوتے تھے۔ لیکن اگر ان سے کچھ پوچھا جاتا تو پتہ چلتا کہ ان کی معلومات غیر معمولی ہیں۔

"پاکستان ہمارا" کے سلسلے میں شوکت کے قاضی جی کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہم اکثر سوچا کرتے تھے کہ اس میں ظرافت کی چاشنی پیدا کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔ سوچ سوچ کر شوکت نے آخر قاضی جی کا کردار تجویز کیا۔ ایک بزرگ جو پاکستان کے سلسلے میں ہر بات پر نامعقول قسم کی نکتہ چینی کیا کریں۔ جو ہر ایک کو مضحکہ خیز معلوم ہو۔ شوکت نے ان کا ایک اسکٹ لکھا اور قاضی جی کا بولنے کا انداز اس زمانے کی ایک مزاحی شخصیت سے لیا۔ یہ ایک حکیم صاحب تھے جن سے کئی سال پیشتر میری ملاقات آبو پہاڑ پر ہوئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد وہ لاہور آئے تو حسن اتفاق سے مسلم ٹاؤن میں شوکت صاحب کے ہمسائے بنے۔ میں ان سے اپنی ملاقات اور آبو میں ان کا میزبان بننے کی داستان شوکت کو سنا چکا تھا۔ لاہور میں وارد ہونے کے بعد شوکت سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھیں بہت دلچسپ شخص معلوم ہوئے۔ فراغت کے وقت ان کے تازہ کارنامے مجھے سناتے رہتے۔ کبھی ان کی گفتگو بیان کرتے تو بات کو زیادہ پرلطف بنانے کے لیے بڑے کمال سے ان کے بولنے کی نقل اتارتے۔ چنانچہ قاضی جی کا خیال آتے ہی شوکت نے فی الفور انھیں حکیم جی کے قالب میں ڈھال لیا۔ قاضی جی کا یہ پروگرام ریڈیو پر بہت مقبول ہوا اور اس نے "پاکستان ہمارا" میں ظرافت کی مطلوبہ چاشنی پیدا کر دی۔

ہمارے یہ پروگرام حیرت انگیز حد تک پسند کیے گئے۔ ریڈیو اسٹیشن کے اندر باہر کے لوگ اکثر ہم سے کہتے کہ اس پروگرام کی ایسی غیر معمولی مقبولیت ریڈیو کی تاریخ کا ایک اہم اور بے مثال واقعہ قرار دی جا سکتی ہے میں سلطان

پروگراموں کو بعد میں پڑھا تو اُن میں بعض خامیاں نظر آئیں لیکن ہمارا خلوص اور جوش شاید اُن کے ہر عیب کو ڈھانپ لیتا تھا۔ بہرحال حالت یہ تھی کہ اس پروگرام کو سننے کے شوق میں کئی لوگوں نے شام کے وقت سینما کا جانا چھوڑ دیا۔ جب گاندھی نے اپنی اُس زمانے کی شام کی تقریروں میں میرا اور شوکت کا نام لے کر اس پروگرام کو سراہا تو اس کی تعریف میں جو خطوط اور دن بھر جو فون ریڈیو اسٹیشن کو موصول ہوتے تھے ان کا تو شمار ہی نہ تھا۔

مجھے یاد ہے ایک روز صبح صبح ہمیں اطلاع ملی کہ کئی مہاجر جو ٹھکانا، بستر نہ آنے کے باعث کہیں ریلوے لائن کے قریب سردیوں کے آسمان تلے پڑے تھے رات میں ٹھٹھر کر جاں بحق ہو گئے۔ یہ اطلاع پا کر ہم بے حد متاثر ہوئے چنانچہ اُس روز کا پروگرام ہم نے شدید احساسِ درد کے ساتھ لکھا۔ اس پروگرام کے لیے شوکت نے ایک نظم "بعد از وقت" کہی جس کا مضمون یہ تھا کہ کوئی سوشل ورکر کسی مہاجر عورت کی بچی کے لیے کمبل لے کر پہنچتا ہے تو بچی سردی سے ٹھٹھر کر ختم ہو چکی ہے۔ نظم مؤثر تھی اور بہت خوبی سے پڑھی گئی۔ سارا پروگرام ہی ایسا تھا کہ سننے والوں پر اس کا بے حد اثر ہوا چنانچہ اگلے روز بیت المال سے اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کے نام فون آیا۔ کہ پچھلی شام کا پروگرام سن کر لوگ گرم کپڑے اور لحاف اور توشکیں لے لے کر اتنی زیادہ تعداد میں بیت المال پہنچ رہے ہیں کہ اُن سب کی لائی ہوئی چیزوں کو سنبھالنا ہمارے سٹاف کے لیے ناممکن ہو رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل اس بات سے پیدا ہو رہی ہے کہ عورتیں اپنی طلائی چوڑیاں اور انگوٹھیاں اور بالیاں لے لے کر آ رہی ہیں۔ ان زیوروں کو وصول کرنے میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ زیوروں کو تولنے یا اُن کی صحیح قیمت جانچنے کا ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں اور اس کے بغیر انھیں وصول کر لیا جائے تو ممکن ہے کل کو کوئی شخص بددیانتی سے وزنی زیور دے کر اُن کی جگہ ہلکے زیور رکھ دے، اس لیے براہِ کرم ریڈیو کے ذریعے خواتین کو ہدایت دیجئے کہ وہ بیت المال کو اپنے زیور فی الحال نہ دیں۔

مہاتما گاندھی پر گولی چلی تو اُس روز ایک پورا پروگرام اُن پر کیا گیا۔ اس میں شوکت نے مہاتما گاندھی کی آواز کی نقل ایسی خوبی سے اُتاری کہ کئی سننے والوں کو شبہ ہوا۔ کہ ریڈیو اسٹیشن کے پاس مہاتما گاندھی کا کوئی ریکارڈ موجود ہے۔ یہ پروگرام برصغیر میں بے حد پسند کیا گیا۔ بعض ہندو خواتین نے پروگرام لکھنے والوں کے لیے چیک بھیجے جو شکریے کے ساتھ انھیں واپس کر دیئے گئے۔ راجہ غضنفر علی مرحوم اُس وقت مرکز کے وزیر بحالیات تھے۔ ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر مسٹر کے۔ ایل پنجابی خاص طور سے راجہ صاحب سے ملے اور کہا کہ میری طرف سے اس پروگرام کی داد لکھنے والوں کو پہنچا دیجئے۔ کئی روز بعد مسٹر پنجابی نے راجہ صاحب کی معرفت لنچ پر ہمیں مدعو کیا اور اُس موقعے پر کہا۔ کہ آل انڈیا ریڈیو سے روزانہ مہاتما گاندھی پر پروگرام نشر کئے جا رہے ہیں لیکن اُن میں کے ایک پروگرام میں بھی وہ اثر و تاثیر نہیں جو "پاکستان ہمارا" کے پروگرام میں تھی۔ میں نے عرض کیا "اس کی وجہ تو عیاں ہے۔ آپ ریڈیو پر ایک ایسی مصنوعی زبان استعمال میں لاتے ہیں جو نہ دل سے اُٹھتی ہے اور نہ دل پر گرتی ہے۔ ایسی صورت میں اثر و تاثیر کہاں سے آئے؟"

کوئی ایک سو پروگرام لکھنے اور پیش کرنے کے بعد تھک کر میں نے تو ریڈیو پاکستان سے رخصت کی اجازت چاہی۔ شوکت کا تعلق چونکہ اس محکمے سے مستقل تھا، وہ اس کام میں برابر مصروف رہے۔

تین چار مہینے کی اس یکجائی سے میرے اور شوکت کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ پاکستان ہمارا چھوڑنے کے بعد بھی جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا، جب اختصار کی چاہتا، تو حتی الامکان شوکت بھی میرے شریک ہوتے۔ ایک بار کوشش کی کہ ہم دونوں مل کر آنند ڈرامہ اسکرپٹ کا سلسلہ کریں۔ شوکت کو اس پر آمادہ کر لیا، فرصت کے چند دوپہر اُن شش و پنج میں گزرے لیکن کام چلا نہیں۔ آپ جانتے ہیں اردو کے زیادہ ڈرامے بہت پھسپھسے ہیں۔ اُن میں ایسی گرفت نہ تھی کہ ہمیں کام میں مصروف رکھ سکتی۔ شوکت کی باتوں میں لذت زیادہ تھی چنانچہ باتیں زیادہ ہوتیں اور کام کم۔ رفتہ رفتہ باتیں ہی باتیں ہونے لگیں۔ ڈرامے کا مسودہ کھٹائی میں بند ہو گیا۔ یہ صورت دیکھ کر میں نے یہ کام خود ہی لپیٹ دیا۔ گپ البتہ چلتی رہی۔ میری رہائش سے میرا گھر قریب ہے۔ وہاں سے اٹھ کر شوکت اکثر میرے ہاں آ جاتے۔ بعض اوقات میں خود انھیں بلوا لیتا۔ گھنٹوں گپ چلتی۔ شوکت سے محفل آرا جہاں موجود ہو، ناممکن ہے کہ وہاں سے قہقہے نہ سنائی دیں۔ قہقہوں کی آواز سن کر گھر والے اور ہمسائے بھی آ جاتے۔ شوکت فی البدیہہ ایسی باتیں شروع کر دیتے جن سے وہ دونوں بھی محظوظ ہوتے۔ اس طرح وہ ہمارے فیملی ممبر سے بن گئے بلکہ اس دوران یہ بھی دریافت ہوا کہ میرا اُن سے واقعی دور کا کچھ رشتہ بھی ہے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی سید سجاد حسین مرحوم کی اہلیہ محترمہ مرحومہ بجوں کی اور شوکت کے عزیزوں میں سے تھیں۔

کچھ عرصہ بعد ایک فلم کمپنی نے مجھ سے اسکرین پلے لکھنے اور ڈائرکٹ کرنے کی فرمائش کی تو اس کی مکالمہ نویسی میں نے شوکت کے سپرد کر دی۔ شوکت ریڈیو کے بہت مشاق مکالمہ نویس تھے لیکن ریڈیو اور فلم کے مکالموں میں بہت فرق ہے۔ ریڈیو کے مکالموں میں ہر عمل کا اظہار لفظوں میں کیا جاتا ہے، فلم کے مکالموں میں کوشش کی جاتی ہے کہ الفاظ کی بجائے حتی الامکان عمل سے کام لیا جائے۔ دونوں مکالمے سوچنے کا طریق ہی مختلف ہے۔ اس سلسلے میں ہماری دلچسپ بحثیں ہوتیں۔ شوکت کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ کج بحثی کبھی نہ کرتے تھے۔ ذہین بے حد تھے۔ بات سمجھ میں آ گئی تو فوراً نئے ڈھب پر پڑ گئے اور کئی مناظر کے مکالمے بہت لذیذ لکھ کر لے آئے۔ میں نے کسی جگہ تبدیلی کی فرمائش کی تو کبھی اُس سے برا نہ مانتے اور فی الفور میری مرضی کے مطابق مکالمے میں تبدیلی کر دی۔

یہ فلم بننا تو شروع ہوا مگر تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ایک اور فلم کمپنی نے میری ایک پرانی کہانی ”گلنار“ کو فلم بنانے کے لیے پسند کیا اور فرمائش کی کہ اس کہانی کو میں لکھنؤ کی معاشرت میں ڈھال دوں۔ اس کام میں شوکت سے مجھے قابلِ قدر امداد ملی۔ ”گلنار“ میں انھوں نے نہ صرف مکالمے لکھے بلکہ میرے اصرار پر اس میں نواب دلشاد کا پارٹ کرنے پر بھی رضامند ہو گئے۔ شوکت اسکرین پر پہلی بار آ رہے تھے۔ بعض پرانے ایکٹر شوکت کو مروج روش سے ہٹ کر مکالمے بولتے سنتے تو لہجے کی تازگی اور اچھوتے پن پر جلتے اور انھیں ڈرانے کے لیے کہتے۔ کمرے میں بیٹھ کر مکالمے بول لینا کچھ مشکل نہیں۔ آزمائش کا مقام اسٹوڈیو کا فلور ہے۔ جب ایک طرف روشنیاں گھیر کر چکاچوند کا عالم پیدا کر دیں اور دوسری طرف کیمرہ گھڑ گھڑ کر کے چلنا شروع ہو جائے تو اس وقت لہجے کی سب جدتیں اور نفاستیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ شوکت خاموشی اور بہت بے پروائی سے یہ باتیں سنتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود

مجھے بھی اندیشہ تھا کہ کیمرے کے سامنے شوکت کہیں جھینپ نہ جائیں۔

سیٹ پر شوکت کا پہلا شاٹ مجھے بخوبی یاد ہے۔ نہ جانے کہاں سے وہ کسی لکھنوی نواب کی تصویر ہتھیا لائے تھے۔ [illegible] اپنا میک اپ اس کے مطابق کرایا، مناسب کپڑے کا انگرکھا اپنی نگرانی میں سلوایا، اس کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور وصلی کی جوتی پہن کر اور سر پر دوپلی ٹوپی رکھ کر سیٹ پر آئے تو جس نے دیکھا یہی کہا کہ یہیں لکھنؤ کے نواب معلوم ہوتے ہیں۔ سین یہ تھا کہ نواب دلشاد صولت کے ہاں سے مصاحبوں سمیت مشاعرے میں آتے ہیں۔ سیڑھیوں پر صولت ان کا استقبال کرتا ہے اور پھر سب ٹہلتے ہوئے وہاں جاتے ہیں جہاں محفلِ مشاعرہ کا اہتمام ہے۔ شوکت بڑے احترام سے سیٹ پر آتے۔ روشنیاں ٹھیک جانچ لی گئیں۔ ایک دو ریہرسلیں بھی خاطر خواہ ہو گئیں اور اس کے بعد ٹیک کا مرحلہ آیا۔ ریہرسل میں شوکت کی خود اعتمادی دیکھ کر ایک بڑے ایکٹر نے ان کا پہلا شاٹ خراب کرنے کے لیے ایک نامناسب حرکت کی۔ شاٹ لینے کے لیے جب میں بلند آواز سے "خاموش" کہہ چکا تھا اور شوکت سناٹے کے لیے موڈ میں تیار کھڑے تھے تو وہ صاحب لپک کر ان کے قریب پہنچے اور ان کا دھیان ہٹانے کے لیے ان کے انگرکھے کا دامن ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگے "خوب کپڑا ہے۔ کے روپے گز کا ہے؟" لیکن ان حضرت کی اس کوشش کے باوجود شوکت نے اپنے پہلے شاٹ میں ایسی ساختہ بے ساختگی سے کام کیا اور تمام تفصیل کو ایسے مکمل طور پر سچ ادا کیا کہ شاٹ ختم ہونے پر "کٹ" کی آواز کے ساتھ ہر طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے شوکت سے مصافحہ کیا۔ شوکت اپنی کامیابی سے بے حد خوش ہوئے۔ پھر تو انھوں نے ایسے ایسے بے دھڑک طریقے سے شاٹ دیے گویا انھیں احساس ہی نہ تھا کہ سیٹ پر کیمرہ بھی کام کر رہا ہے۔ نواب دلشاد کا کردار انھوں نے ایسے کمال سے پیش کیا کہ لکھنوی نوابوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ چال ڈھال، نشست و برخاست، حرکات سکنات ہر اعتبار سے وہ لکھنوی نواب تھے۔ افسوس اس فلم کی ایڈیٹنگ میری مرضی کے مطابق نہ کی گئی۔ کئی اہم حصے بے دردی سے کاٹ دیے گئے اور ایڈٹ ہونے کے بعد فلم سنسر ہونے سے پہلے مجھے دیکھنے کا موقع بھی نہ دیا گیا۔ ورنہ اس کی صورت بہت مختلف ہوتی۔

گلنار کے شوٹنگ کے دوران میں شوکت کے ساتھ وقت بہت لطف میں گزرا۔ وہ سیٹ کے کسی کونے میں اپنے پسندیدہ آرٹسٹوں کے ساتھ بیٹھے گفتگو کی آتش بازی چھوڑتے رہتے۔ میں تھک ہار کر دم لینے کو ذرا سی دیر اس محفل میں شریک ہوتا تو شوکت ہنسا ہنسا کر تازہ دم کر دیتے تھے۔ اس زمانے کی ساری باتیں مجھے یاد نہیں۔ اس خیال سے حافظے پر زور دینے کو جی بھی نہیں چاہتا کہ پڑھنے والوں کو شاید ان سے دلچسپی نہ ہو۔

گلنار کے بعد کوئی کام مل کر کرنے کا موقع ہی نہ ملا لیکن تعلقات ہموار انداز میں برابر جاری رہے۔ یہاں تک کہ وہ ہور چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ خط میں ضرورت کے سوا لکھتا نہیں چنانچہ شوکت سے خط و کتابت نہ رہ سکی۔ البتہ ایک خط ھیں اسی مضمون کا لکھنا یاد ہے کہ میں مہدی حسن احسن کے ڈرامے ایڈٹ کر چکا ہوں۔ اُن کے حالاتِ زندگی کی تلاش ہے۔ ٹی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی۔ آپ احسن سے مل چکے ہیں۔ اُن کی ایک قلمی تصویر لکھ کر بھیج دیجیے جسے میں آپ ہی کے نام

علیحدہ مقصد میں شامل کر لوں گا۔ چونکہ ان دنوں میں خدا کا جواب ... آتش کی نظم تصویر رکھی۔ یہ تصویر ابھی میرے پاس محفوظ ہے۔ ایک بار میں کراچی گیا تو وہاں قیام کا بندوبست شوکت نے ... کر لیا اور جب میں ... سے جب کبھی وہ لاہور آتے تو انھوں نے ملنے کا وقت ضرور نکال لیا۔

شوکت کثیر الاحباب شخص تھے۔ مجھے یقین ہے اُن کے کئی دوستوں نے اُن کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہوگا۔ بعض چھوٹی چھوٹی ایسی باتیں ہیں جو کہ مختصر سی ... جو ... ہوں کی وجہ حاصل نہ کر سکی ہوں مختصراً میں لکھ دیتا ہوں۔

اپنے لباس میں شوکت خاص اہتمام سے کام لیتے تھے۔ شیروانی پہنتے یا سوٹ، کپڑے کے رنگ اور ڈیزائن سے ہمیشہ اُن کی خوش مذاقی کا ثبوت ملتا۔ سگریٹ یا ... پیتے تو اُس کی چھوٹی ... میں سلیقہ نظر آتا۔ کروں کی آستینیں تنگ ہوتی ہیں۔ شیروانی کی تراش ایسی شستہ ہوتی کہ دیکھ کر فرحت ہوتی تھی۔ سوٹ پہنتے تو قمیص کا رنگ سوٹ پر اور ٹائی کا رنگ قمیص پر پھبتا۔ ٹائی اور رومال اور موزے ہمیشہ بہت اعلیٰ استعمال کرتے۔ شو جھنے پاس سے دمکتے ہوئے۔

شوکت کھانا بڑی نفاست و شائستگی سے کھاتے تھے۔ چاول اور چپاتی دونوں کا نوالہ ایسی نفاست خوبصورتی و احتیاط سے بناتے کہ نظر پڑتی تو اُن کی انگلیوں کے سروں کی کارگزاری دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔

تقریر و تحریر میں شوکت کی ظرافت پر غالباً اُن کے کئی احباب اظہار خیال کریں گے لیکن یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ شوکت نے طبیعت کی شوخی ورثے میں پائی تھی۔ ایک بار اپنے والد ماجد محمد صدیق صاحب کی ... کے کئی واقعات انھوں نے مجھے سنائے، اُن میں کا ایک مجھے یاد ہے۔ اُن کے والد ایک زمانے میں جوانی پوسٹ میں ملازم تھے۔ وہاں کے کسی رئیس کے ہاں سری پائے بہت اچھے پکتے تھے۔ صدیق صاحب نے ایک بار اُن سے سری پائے کھانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے کسی تعطیل کے روز دوپہر کے کھانے پر انھیں مدعو کر لیا۔ یہ کھانے کے وقت پہنچے تو اتفاق سے اُن رئیس کے ایک ہندو دوست نازل ہو گئے۔ ایسے جم کر بیٹھے کہ کھانے کا وقت آ کر گزر بھی گیا مگر انھوں نے سرکنے کا نام نہ لیا۔ رئیس اِن ہندو دوست کی بوجوہ کھانے میں شریک نہ کرنا چاہتے تھے۔ مروت کے مارے یہ بھی مناسب نہ سمجھتے تھے کہ انھیں رخصت کرنے کی کوئی کوشش عمل میں لائیں۔ اُدھر کھانے میں تاخیر ہونے کے سبب مہمان سے ندامت ہو رہی تھی۔ اور کچھ تو سوجھا نہیں کاغذ کے پرزے پر یہ فقرہ لکھا "کہ کیا کروں۔ یہ حضرت سریش بن کر چپک گئے ہیں۔ کہیے تو چھوڑیں تو دسترخوان بچھواؤں"۔ یہ رقعہ لکھ کر اُنھوں نے خاموشی سے صدیق صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ آپ نے رقعہ پڑھا تو مسکرا دیئے۔ پھر یہ رقعہ بڑے ادب سے اُن ہندو دوست کی خدمت میں پیش کر دیا۔ میزبان لاحول ولا قوۃ کہہ کر زنان خانے کی طرف بھاگے اور ہندو دوست ندامت سے پسینہ پسینہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

شوکت کی ایک بات مجھے اکثر حیران کرتی کہ بے تکلف احباب کی صحبت میں بھی اُن کا دماغ فراغت سے کبھی راحت اندوز نہ ہوتا تھا بلکہ ہر وقت اور ہر پل کسی نہ کسی بات کا ظریفانہ پہلو دیکھنے میں منہمک رہتا تھا۔ ناممکن تھا کہ موقع ملے اور شوکت ظرافت کی پھلجھڑی چھوڑنے سے چوک جاتے۔ جہاں موقع نہیں ہوتا تھا، وہاں بھی اُنھیں یکایک ہنسی کی

کوئی ایسی بات سوجھ جاتی تھی کہ بعض اوقات ہیں وہ دیر تک اُن کے ذہنی عمل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔

قائداعظم کی رحلت کے بعد پاکستان کے نئے صدر کا اعلان ابھی نہ ہوا تھا۔ شوکت بہت ہم کچھ لوگ دیر یا سلیقہ پر عزیز ملک سوچ رہے تھے کہ پاکستان کا آئندہ صدر کون بنے گا۔ ایک صاحب بولے سر آغا خان مناسب صدر ہوں گے دلکش شخصیت ۔ کھلے ہیں اور بھرپور اثر اور بین الاقوامی شہرت کے مالک بھی ہیں۔ شوکت فی البدیہہ بولے سب تو ٹھیک ہے لیکن سر آغا خان صدر بنے تو قائد ملت کو شاید وزیر اعظم نہ رہنے دیں۔ پوچھا گیا کہ کیوں وہ کسے وزیر اعظم بنائیں گے؟ شوکت بولے "ہیں کسی جوکی ڈوکی کو۔"

میں دیکھتا تھا کہ ظرافت کی کوئی بات کرنے سے پیشتر شوکت کی آنکھیں ذرا تنگ ہو جاتیں اور ان میں ایک عجیب سی چمک آجاتی تھی۔ اُن کی بات پر سب ہنستے تو وہ خود بھی ہنسی میں دل کھول کر شریک ہوتے البتہ اُن کی ہنسی ذرا کم ہوتی تھی۔

شوکت کی ظرافت پر نقاد حضرات مجھ سے بہتر اظہار خیال کر سکتے ہیں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ محفل آرائی میں وہ اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اُن کی باتیں اُن کی تحریروں سے زیادہ دلچسپ اور ظریفانہ ہوتی تھیں مگر اُن کی تحریروں کے متعلق یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ کاروباری مصنف تھے اور اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے انھیں چار و ناچار تصنیف کا کام کرنا پڑتا تھا۔ لکھنے قلم برداشتہ تھے اور ایک ہی نشست میں فل سکیپ سائز کے ایسے کئی کئی صفحے خوشخط لکھ جاتے جن میں ایک سطر بلکہ ایک لفظ بھی کٹا ہوا نہ ہوتا تھا۔

شوکت بہت باکمال نقال بھی تھے۔ کسی سے پہلی بار ملتے تو باتیں کم کرتے تمام وقت اُس شخص کی ایک ایک حرکت اور لہجے کی ایک ایک خصوصیت کا مطالعہ بہت غور سے کرتے رہتے۔ بے تکلف احباب کے ساتھ تنہائی کا موقع ملتا تو بے حد اعتماد سے اُس کی ایسی مکمل نقل اُتارتے یا اس خوبی سے اُس کی پیروڈی کرتے کہ اُن کی قوتِ مشاہدہ کا قائل ہونا پڑتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بڑے کمال کی بات اُن میں یہ تھی کہ جب کبھی اُن سے درخواست کی جاتی کہ فلاں دفعہ یا فلاں صاحب کی نقل سنا دیجیے تو انکار کبھی نہ کرتے۔ انھیں یہ خیال بھی نہ آتا کہ جس شخص کی جہات جلد کے لیے ان سے یہ فرمائش کی جا رہی ہے، وہ اس قابل ہے بھی کہ اس کی خاطر یہ زحمت برداشت کی جائے۔ وہ صرف فرمائش کرنے والے سے اپنے تعلقات کا خیال کرتے اور بلا تامل اُس کی فرمائش پوری کر دیتے تھے۔

گمان تک نہ گزرا تھا کہ اس ہنسنے اور ہنسانے والے شوکت کا چہرہ ایک روز کفن میں لپٹا ہوا دیکھنا پڑے گا۔ دل کندھوں کی ناتوانی پر کڑھے گا کہ اپنے عزیز دوست کو اُس کی آخری منزل تک پہنچانے سے معذور رہے۔ آنکھیں اُسے مٹی میں ملتا ہوا دیکھیں گی اور بے بسی کے آنسو بہاتی رہ جائیں گی۔

شوکت تھانوی کے آخری ایام

فضل احمد کریم فضلی *

میں ڈھاکہ میں تھا کہ خبر وحشت اثر سنی کہ شوکت تھانوی بہت سخت بیمار ہیں۔ ویسے تو ان کو بیمار نہیں پڑنا۔ شوکت کی شخصیت کا ذہن میں تصور کچھ ایسا صحت بخش تھا کہ اس شخصیت سے کوئی بیماری منسوب کرنا عجیب سا لگتا۔ دو دن بعد میں ڈھاکہ سے سیدھا لاہور گیا۔ وہاں نیاز احمد صاحب (مسٹر ایس۔ پی۔ پبلیکیشنز) نے بتایا کہ شوکت صاحب ۲۲ مارچ ۱۹۶۳ء کو لاہور آئے تو سینے میں درد ہو رہا تھا اور انہیں بخار تھا۔ دوسرے دن ایک ادبی محفل میں بھی وہ بخار کی حالت میں شریک ہوئے تھے۔ ان کو کمزوری بھی تھی۔ نیاز صاحب نے انہیں ڈاکٹر ... کو دکھایا کیا تو اتفاق سے وہ ... ہوتے تھے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کے جگر میں سرطان ہے یا پھوڑا۔ ورم جگر اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کا دباؤ دل اور پھیپھڑوں پر پڑ رہا ہے۔ فوراً سرطان یا پھوڑے کی تشخیص ہونی چاہیئے۔ اور اس کے مطابق علاج۔ یہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ مگر جن ڈاکٹروں کو بعد میں دکھایا گیا انہوں نے ڈاکٹر ... کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ بلکہ دل کی شکایت تجویز کی جس کا علاج وہ کرتے رہے۔ اور شوکت صاحب کی حالت تیزی سے خراب ہوتی گئی۔ اور اب وہ نقل و حرکت بھی نہیں کر سکتے۔

میں ۱۰ اپریل کی صبح کو انہیں دیکھنے گیا۔ کمرہ میں دبے پاؤں داخل ہوا تو مجھے پلنگ پر ایک باغ و بہار آدمی کی جگہ ایک لاش سی پڑا ہوا نظر آیا۔ شوکت نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے مجھے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں کہ یہ شخص کہاں سے آگیا۔ پھر انہوں نے بڑے پیار سے میرا نام لیا۔ اور بار بار ایسے انداز میں جیسے پوچھ رہے ہوں کہ آیا میں وہی ہوں جو وہ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں ہاں میں فضلی ہی ہوں۔ انہوں نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ دبایا۔ پھر کہنے لگے مجھے بات کرنا منع ہے۔ اور کہتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ شخص جو پھول برسایا کرتا تھا اب آنسو برسانے پر مجبور تھا۔ یہ منظر دیکھ کے دل ہل گیا۔ اور یہ حقیقت شوکت کے انکسار چہرے کی صورت میں سامنے آگئی کہ ہم کیا اور ہماری حقیقت کیا۔ تندرستی کی حالت میں ہم اپنے آپ کو جو چاہیں سمجھیں لیکن کوئی موذی مرض آدبوچے تو پھر ہماری حیثیت اس کبوتر سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ جسے بلی نے اس طرح منہ میں بھر لیا ہو کہ پھڑک بھی نہ سکے۔
میں نے جی کڑا کر کے کہا کہ "بھائی یہ شعر کہا تو آپ نے ہے تھا۔ لیکن یہ صادق آپ کے حال پر زیادہ آیا ہے کہ۔

غمِ دوراں کے آگے سر جھکا دیں!
اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہم

عمر یوں ہنستے ہنستے گزاری۔ سبھی پہنچتے رہے۔ اب اس مرض کی حالت میں جنس جنس کے آرائے پر شعر اور باتیں سن کر وہ خفیف مسکراتے۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ مسکراہٹ نہیں طنز ہے اور مجھ سے کہہ رہی ہو ساحل پر کھڑے ہونے والے منجدھار میں ڈوبنے والے کی حالت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ان کی بیوی نے مجھے پان دینا چاہا۔ میں نے کہا رہنے دیجئے۔ انہوں نے کہا کیوں۔ کیا پان کھانا چھوڑ دیا۔ میں نے کہا: "جب یہ صاحب بیماری کے زمانے میں نہیں چھوڑ رہا تو اب کیا چھوڑوں گا۔ لیکن اس وقت اچھا نہیں لگتا۔" انہوں نے کہا طبیعت نہیں چاہتی۔ شوکت صاحب کی زبان بھی مجھ سے یہی کہنے لگی۔ میں نے ایک آخری عذر جو حقیقت پر مبنی تھا اور پیش کیا کہ قوام کی شیشی ہوتی تو... وہ قوام یہاں تھا نہیں۔ بغیر قوام کے پان کیا کھاؤں تو چپ ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد شوکت صاحب نے اُن سے کہا میرا وہ بیگ دینا۔ انہوں نے پوچھا کس لئے۔ شوکت صاحب نے جواب دیا وہ تو دو۔ بیگم نے کہا اب دفتر والے بیگ کا کیا کیجئے گا۔ آپ کو آرام کرنا ہے۔ شوکت صاحب نے قدرے زور دار آواز میں کہا وہ۔ میں نے کہا اس میں قوام ہے۔ وہ بیگ کھول کر دیکھو۔ غلاف کی تہہ میں قوام کی شیشی رکھی تھی۔ بیگم نے کہا دیکھئے چھپائے رکھتے تھے۔ آنجہانی شوکت صاحب نے شیشی اپنے ہاتھ میں لے لی اور کچھ دیر انگلیوں میں گھماتے رہے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر میرے ہاتھوں میں دی اور دیتے ہی رو پڑے۔ ان کی بیوی نے کہا ارے رونا کاہے کا۔ اللہ اچھے ہو جاؤ تو خوب کھانا۔ میں نے کہا یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ انہیں یہ احساس ستا رہا ہے کہ ایسی حالت میں مجھے تحفہ بھی دے رہے ہیں تو کیا۔ پھر میں نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا "حضور یہ معمولی تحفہ اس وقت میرے لئے بڑا بیش قیمت ہے۔" یہ سن کے اُن کے آنسو تھم گئے۔ اور خفیف مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر آ گئی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس حال میں بھی یہ تک یاد ہے کہ ایک قوام کی شیشی فلاں جگہ رکھی ہے۔ میں نے پھر ان سے کہا: "ایک دفعہ میں بھی اسی طرح اسپتال میں داخل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ بات کرنا تو درکنار میں لیٹے لیٹے کروٹ تک بھی نہ بدلوں اور نہ پڑھا لکھا کروں۔ میں نے دل میں کہا خوب! یہ سب نہ کروں تو کیا پڑے پڑے یہی سوچا کروں کہ اب ملک الموت صاحب تشریف لاتے ہیں۔ اب انہوں نے گلا دبایا۔ اب دم نکلا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اللہ نے مجھے شعر کہنے کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ میں کیوں نہ شعر کہوں۔ بڑے اطمینان سے شعر کہنے لگا اور وقت اچھی طرح گزرنے لگا۔ بلکہ جب کوئی اچھا شعر ہو جاتا تو درد میں بالیدگی اور توانائی کا احساس بڑھ جاتا۔ یہ آزمودہ نسخہ آپ بھی آزما کے دیکھئے۔" "یہ آزمودہ نسخہ آپ بھی آزما کے دیکھئے۔" شوکت صاحب نے اس طرح مسکرا کے سر ہلایا جیسے انہیں یہ تجویز پسند آئی ہو۔

بیگم نے بتایا کہ اور تو سب ٹھیک ہے مگر کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ اور روز بروز کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پانی بھی بمشکل پیتے ہیں ——— اسی وقت ڈاکٹر آ گئے۔ میں نے پوچھا "انار کا تازہ رس دینے میں کوئی حرج ہے؟" ڈاکٹر نے کہا کہ اگر یہ پئیں تو بڑے شوق سے پلائیے۔ ہمیں تو فکر ہی یہی ہے کہ انہوں نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ میرے پاس اعلیٰ قسم کا جواہر مہرہ تھا۔ میں نے سوچا اس سے بہتر اس کا استعمال کیا ہو سکتا ہے کہ شوکت کے کام آئے۔

دوسرے دن میں جواہر مہرہ لے کے اسپتال گیا۔ وہ انار کا رس ایک گلاس میں آیا۔ ایک چمچے میں جواہر مہرہ اس میں گھسا گیا۔ سید امتیاز علی تاج صاحب کے بھتیجے نے گھسا۔ میں نے شوکت صاحب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا یہ بہترین جواہر مہرہ ہے۔ اسے

پاتے۔ انہوں نے پی پلا چوہدری محمد حسین صاحب سے یہ سمجھ نہیں پایا۔ شوکت اور وہ چپ ہو گئے یا بات ذرا ختم ہو گئی کہنے لگے کہ بیٹے لگے ایک منٹ چپ۔ شوکت صاحب کے دوستوں سے بڑی شوکت سے ملا ہے یہ ہو ہو خوش ہوئے ہو۔ پہلے انہوں نے اپنی منقولات میں سے فیصلہ کیا کہ اپنے ہاتھ سے ان چاولوں کو میں نے پوچھا آپ نے یہ کیا شاید۔ شوکت صاحب نے جواب دیا کہ ناریل اس ہوٹل کا ہے یہ ہو رہے ہیں گا۔ یہ بات بہت ہو گئی تھی نہیں۔ تو وہ ذات اور اس کی آمد کی مثل پر ہوا اثر ہوا۔ اور میں نے یہ شعر کہا۔

میں تو بندہ ہوں میں بندگی سے بے نیاز
تو خدا ہے اور خدا ہو کر بھی غافل نہیں

اس دن ڈاکٹر صاحب انہیں بھی دیکھنے آئے تھے۔ تشخیص ایک نرس انجکشن لگانے آئی پوچھا کیا حال ہے۔ شوکت صاحب نے بڑی حسرت سے کہا: کہیں بھی ٹھیک ہوں۔ اب کیا فرق پڑتا ہے۔ جب کہا گیا ہم یہ سے ان کی موجودگی میں جسم صحت کرانے کی غرض سے کیا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پہلے کہا یہ وہ تو یہ ہو گی۔ میں سپتال میں تھا۔ دو دن کی شکل و صورت کی نرس آئی نبض دیکھنے کے لئے میں نے ہاتھ بڑھایا۔ عجیب بات ہے ذرا سوچا۔ میں نے کہا تیرے ہاتھ سے شکل بڑھ رہی۔ اس نے کہا یہ کیا۔ میں نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جس کی تم انگلی رکھو گی وہی نبض چلنے لگے گی۔ وہ ہنس پڑی۔ اور اس نے ایک عجیب سنم ظریف مریض کا قصہ سنایا۔ سامنے چھپتال میں بیٹھے شوکت صاحب مسکرائے پھر بھی سنجیدگی سے سنتے تھے۔ یہ بات شفیق صاحب نے اس وقت کہی ہوگی۔ جب بیگم صاحبہ نے کہا ہو دل میں اگر یہی بات ہوتی تو بڑی بڑی جرأت سے کہ اگر میرا اپریشن ہو جائے۔ سارا جسم پھیلا کر دے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اچھا ہے —— ہو جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب جب معائنہ کر چکے تو شوکت صاحب نے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: ڈاکٹر صاحب پھاڑیے گا تو نہیں؟ انہوں نے جواب دیا: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شوکت صاحب نے کہا دیکھئے ڈاکٹر صاحب! اگر آپ نے پیٹ پھاڑا۔ اگر خدانخواستہ میں مر گیا تو میرے شیدا دوست اس شعر سے کسی نہ کسی طرح میرے مرنے کی تاریخ نکال لیں گے۔

ہر عمر کا ایک ہی انجام ہے۔
پیٹ شوکت کا بھی پھاڑا ہی گیا۔

(اپنے نام عمر عمری طرف اشارہ قابل داد ہے) ایسا لگتا تھا کہ یہ شعر انہوں نے یا تو اسی وقت یا اسی دن کہا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ اللہ نے اس شخص کو کیا دماغ دیا ہے موت کا خونی پنجہ اسے ہر طرف سے اپنی گرفت میں لے رہا ہے لیکن اس کی حاضر دماغی اور حس مزاح ختم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب باہر نکلے تو انہوں نے بتایا کہ حالت بہت خطرناک ہے۔ انہیں جگر کا سرطان ہے۔ اور بظاہر یہ چند دنوں کے مہمان ہیں پوری تشخیص امروز فردا میں ہو جائے گی۔ جب میں کمرے میں واپس آیا تو شوکت صاحب نے مجھ سے پوچھا: ڈاکٹر نے کیا کہا؟ میں نے جواب دیا آپ کو کیا بتاؤں اور میرے اور آپ کے جگری دوست کا نام بیچ میں آتا ہے۔ مگر ساری خرابی انہی حضرت جگر کی ہے۔ اس پر وہ پھوٹ کر ہنسنے اور کہنے لگے۔ آپ نے کبھی سنا ہے کہ ڈاکٹروں کے پاس ـــــــ جگر کا علاج ہے۔ ہرگز نہیں۔ دیکھیے وہ ڈرائیں گے آپ مجھے یہاں سے نکلوا لے چلئے اور یونانی علاج کرائیے۔ میں نے پوچھا آپ کو اس علاج پر اعتقاد ہے؟ کہنے لگے سو فیصدی۔ میں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایک نئی دوا آزمانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے اس سے افاقہ ہو۔ اور اگر

طاقت آجائے کہ انہیں بیرونی ممالک میں لے جا کر آپریشن کرایا جائے۔ اس کے بعد میں نے اور اسد صاحب نے باتیں کیں اور یہ طے پایا کہ ڈاکٹروں کو موقع دینا چاہیئے۔ اس کے بعد پھر معمولی ہو گیا کہ میں روز جاتا اور انہیں ان کا رس نما جوا ہر بھرے کے پاتا۔ اور وہ پورا پا لیتے۔ پیری ایک دن شب خواب تھی تو میں نے بیگم شوکت کو فون کیا کہ آج میں حسب معمول دن کو نہ آسکوں گا وہ رکہیں۔ بعد دین شام کو اگرچہ نے اجازت دی تو حاضر ہوں گا شام کو گیا تو معلوم ہوا کہ جب ان کی بیوی رس پلانے گئیں تو انہوں نے میرے بارے میں دریافت کیا۔ بتلانے پر خاموش ہو گئے اور مشکل سے ایک دو گھونٹ پئے۔

ایک دن میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں میں نے لے جانا بذاکٹروں نے بے جانے کو کہا ہے بیگم شوکت اور لڑکوں نے کہا ڈاکٹروں نے تو اجازت نہیں دی لیکن یہ کسی طرح مانتے ہی نہیں۔ آپ کے کہنے پر شاید راضی ہو جائیں۔ حسن اتفاق سے اس دن میجر جمیل الرحمٰن صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کی یہ رائے ہوئی کہ ابھی دو، آنے کا موقع نہیں ہے۔ ورنہ اس طرح گھر سے جانا تو موت کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں اور ہمارے ساتھ میجر ریاض صاحب نے انہیں بہت سمجھایا، بات کرنے سے معلوم ہوا کہ شوکت صاحب کو اندیشہ تھا کہ شاید ڈاکٹر ان کا آپریشن کر دیں گے۔ جب یہ اندیشہ دور کیا تو انہوں نے اپنے بڑے بیٹے میاں سعید کا سہارا لینا چاہا۔ انہوں نے بھی جا رہی تا بہتری تو کہنے لگے۔ اچھا لیکن اگر میرا آپریشن ہوا تو میرے بچوں کا خون آپ لوگوں کی گردن پر ہو گا کہنے لگے کہ بس اتنی طاقت آجائے کہ میں بیٹھ کر کچھ لکھ سکوں۔ دوسرے دن انہیں سون دیا گیا۔ اور پھر نئی دوا استعمال شروع ہوئی بظاہر ان کی حالت بہتر معلوم ہوئی رات کو نیند بھی آنے لگی اور انہوں نے ناشتہ بھی دلیہ بھی کھایا۔ اس سے کچھ اطمینان سا ہونے لگا۔ مجھے ۲۴ تاریخ کو کراچی واپس آنا تھا۔ اس دن جب ان سے ملنے گیا تو حسب معمول رس پلانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ وہ چپ ہیں بغیر اس کے کوئی اہمیت دیتے ہوئے اپنے جانے کا ذکر کیا انہوں نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ دبایا، اور میرے مصرعے "فضلی، فضلی، میرے فضلی، میرے پیارے فضلی" سے مجھے مخاطب کیا۔ یعنی ۲۴ تاریخ تک ان کا حافظہ اتنا اچھا اور ذہن اتنا صاف تھا کہ یہ مصرعہ وہ بلا تکلف سنا سکے۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا تھا کہ اگر نئی دوا نے اثر کیا تو چند ہفتے شاید چل جائیں ورنہ چند دنوں کی بات ہے اس لیے مجھے اندیشہ تھا کہ شاید میں ان کا آخری دیدار کر رہا ہوں۔ لیکن ان کے حافظے کی حالت دیکھتے ہوئے یہ امید بھی تھی کہ جب میں ۷ مئی کو لاہور واپس آؤں گا تو انہیں اس وقت بھی مرض اور موت سے نبرد آزما پاؤں گا۔ بیگم شوکت نے یہ بھی بتایا کہ میر خلیل الرحمٰن صاحب نے ٹیلیفون پر کہا ہے کہ وہ شوکت صاحب کو ولایت لے جا کر ان کا علاج کا پورا خرچ خوشی سے برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ اس خبر سے شوکت صاحب کے اعزا اور احباب میر صاحب کے بیحد ممنون ہوئے۔

کراچی واپس آنے پر میں ایک سے شوکت صاحب کی خیریت دریافت کرتا رہتا۔ جمعہ ۱۰ مئی کو معلوم ہوا کہ انہیں ہسپتال منتقل کیا جا چکا ہے۔ اس خبر سے بڑی تشویش پیدا ہوئی۔ کیونکہ اس کے یہ معنی تھے کہ نئی دوا ناکام رہی۔ اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔

جمعہ کی شام کو میرے ہاں جگر کی ماہانہ نشست تھی اس میں شوکت صاحب کی علالت کا ذکر مذکورہ بالا حال میں نے حاضرین کو تفصیل سے بتایا اور دیر تک شوکت ہی کی گوناگوں صفات کا ذکر ہوتا رہا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس غیر معمولی انسان کو کتنی غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ اور آج یہ خبر پڑھنے سنائی کہ یہ بلبل ہزار داستان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس وقت صفی صاحب کا وہ شعر بے اختیار یاد آرہا ہے جو انہوں نے دوپٹہ پاور بزم ظریف لکھنوی کی موت پر کہا تھا۔"

جو اٹھنہ سکتا تھا بے سہارے وہ شور محشر اٹھا کے اٹھا ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رلا کے اٹھا"

۱۱ مئی ۱۹۶۳ء جنگ کراچی

شوکت تھانوی

(چند یادیں؎)

عشرت رحمانی

"شاعراں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے" اس مقولے کا اطلاق صرف شاعری پر نہیں بلکہ ہر فنکار ادیب پر بھی ہوتا ہے۔ اور یہ مقولہ جس حد تک شوکت تھانوی پر صادق آتا ہے شاید اردو ادب میں گنتی کی ایسی ہستیاں ملیں گی۔ شوکت کا شعری و نثری ادب جس طرز اور انداز کا بھی ہے سب کا سب تخلیقی ہے۔ اس کی زبان اور قلم میں ذرا بھی فرق نہیں۔ جس انداز میں باتیں کرتا تھا وہی پرواز پر لکھتا بھی تھا۔ ہر موقع محل پر چست فقرہ بات میں بات پیدا کرنا اور فقرے چست کرنا اس کی فطری خصوصیت تھی۔ وہی کیفیت تحریر میں بھی تھی جس روانی اور تسلسل سے گفتگو کرتا تھا اسی طرح بے تکلف مسلسل لکھتا چلا جاتا تھا حتیٰ کہ اس کا قلم اس کے تخیل کی روانی کا ساتھ نہ دے سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پیدائشی طور پر ایک صاحب طرز، حاضر جواب، حاضر دماغ، ظریف، مزاح نویس شاعر و ادیب تھا۔ قدرت نے زبان و بیان کی جو قدرت عطا کی تھی، اس کا اندازہ شاید خود شوکت کو بھی نہ تھا۔ زبان کے معاملہ میں اس کا مکتب اس کی آغوش ہی تھا جہاں کمسنی ہی میں اس کی آنکھ کھلی اور شعور کے سن کو پہنچنے پر لکھنؤ دبستانِ شعر و ادب اس کا پہلا اور آخری مدارِ علم تھا جس کے دامن نے اس کی زبان کو نکھار اور بیان کو رعنائی دی۔ اور یہی پہلی اور آخری سند تھی جس نے محمد عمر کو شوکت کی شان بخشی اور رفتہ رفتہ یہ نوبت ہوئی کہ لوگ عام طور پر اصل نام سے واقف ہی نہ رہے۔ اور یہی سمجھنے لگے کہ جیسے نام کا نام، تخلص کا تخلص شوکت،

شوکت کے تخیل کی آمد اور سلاست روی ایک ایسی امتیازی خصوصیت تھی جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ کسی قدر مبالغہ کے ساتھ یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ شوکت کا تخیل اس تیزی اور روانی سے کام کرتا تھا کہ فقرے آگے آگے ہوتے اور سوچ پیچھے۔ یعنی ہر موقع محل کے مطابق فقرہ برجستہ ہونٹوں پر چست و برجستہ فقرے شوکت کی سوچ کی پیشوائی کرتے۔ جن حضرات نے شوکت کو بھی اس سے گفتگو کرتے یا لکھتے دیکھا ہو وہ اس حقیقت کی شہادت دے سکتے ہیں اور انہیں پورا پورا اندازہ ہوگا کہ شوکت کی قوتِ متخیلہ کتنی حساس اور نمود رس تھی اور بیان کی صفائی اور صلاحیت کس درجہ رواں دواں —— اس کے دل و دماغ میں بہت کم فرق تھا۔ اس حقیقت کا ثبوت شوکت کی ہر تحریر ہے۔ جس کی نسبت بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب وہ لکھنے بیٹھتا تو بس بے سوچے مسلسل بلا تکان لکھے جاتا۔ اور ہزاروں سطور لکھتے ہوئے ایک سطر

؎ : زیر طبع کتاب سے چند اوراق

میں ایک لفظ بھی کبھی کم و بیش نہ کرتا۔ یہ اس فطری و طباع انسان کی صاف گوئی اور صاف بیانی کی دلیل تھی۔ شوکت صاحب نے طویل داستانیں لکھیں۔ طنز مضمون، افسانے یا ڈرامے لکھے لیکن کبھی ان میں سے کسی مسودے کی نظر ثانی نہیں کی۔ وہ جو پہلے لکھ دیتے وہی حرفِ آخر ہوتا تھا۔ جس وقت لکھنے بیٹھتے سب کچھ سوچ کر اپنے دماغ میں محفوظ کر لیتا ہو۔ اور پھر اسے اگل دیتا ہو۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اشارہ [illegible] دیکھا ہے لکھنے کی فرمائش کی گئی اور لکھنا شروع کیا جتنی دیر میں ایک مسودہ نقل کیا جاتا ہے اتنی ہی مدت میں طبع زاد چیز مخصوص طرز بیان کی [illegible] موجود ہوتی۔ مشہور ادیبوں میں سے اب تک کسی صاحبِ طرز ادیب کے بارے میں ایسی مثال دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ البتہ مشہور مغربی مصنف ڈی ایچ لارنس نے خود اپنی نسبت یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ وہ مسلسل لکھے جاتا تھا اپنی تحریر میں کتر بیونت یا کانٹ چھانٹ ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ اس کی پہلی تحریر ہی آخری مسودے کی حیثیت رکھتی اگرچہ ان دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں لیکن سوچنے اور لکھنے کا انداز یکساں نظر آتا ہے۔

لکھنؤ۔ رنگ و بو کا شہر، شعر و ادب کا گہوارہ، آل انڈیا ریڈیو کا اسٹیشن وہاں قائم ہوا تو جا بجا چرچا رہا۔ اس اسٹیشن کے کارکن مقرر ہوئے۔ لکھنؤ ریڈیو اچھا خاصا اہلِ ادب کا مرکز ہو گیا۔ ملک حسیب احمد پروگرام ڈائریکٹر تھے اور غلام قادر فرید، مستحسن انصار ناصری، میاں لطیف الرحمٰن، فیروز نظامی، کرشن چندر اور یہ خاکسار پروگراموں کے مختلف شعبہ جات کے ناظم یعنی پروگرام اسسٹنٹ تھے۔ شوکت تھانوی مصنف اور صداکار مقرر ہوئے۔ ہر وقت محفل فکر و فن آراستہ رہتی۔ نئی نئی تجویزیں، نئے پروگرام۔ رات دن سب کو فکر رہتی کہ کچھ کر کے کوئی ایسی جدت پیش کی جائے جو سامعین کو حیرت میں ڈال دے۔ اور ان کی دلچسپیوں میں اضافہ ہو۔ سرکاری فرائض کی ادائیگی کا تو ہر ایک کو احساس تھا ہی لیکن اس سے زیادہ ہر ایک کو اپنے ذوق کے مطابق ایک ہی دھن تھی جس میں سب مگن نظر آتے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن کیا تھا ایک خاندان تھا اور یہ سب اراکین ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ چونکہ آپس میں سب ایک دوسرے سے پیشتر ہی سے بخوبی آشنا تھے اور ملک کے تمام نامور ادیبوں شاعروں سے مخلصانہ تعلقات بھی قائم ہو رہے تھے اور سب مل جل کر اسی دھن میں رہتے کہ ان تعلقات سے جس جس طرح بن پڑے کام لیں اور پروگراموں میں نت نئے تجربے، دلچسپیاں اور مفید حرکتیں پیدا کر کے سامعین کو اپنی طرف مخاطب رکھیں۔ اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی اس کے شاہد برصغیر پاکستان و ہند کے وہ بے شمار باخبر سامعین ہیں جو لکھنؤ ریڈیو کی طرف ہمہ تن گوش رہتے۔ یہ مقبولیت نشری عملے کے لیے عذابِ جان بھی بن گئی تھی کیونکہ دوسرے اسٹیشنوں سے صحت مند معاصرانہ چشمک اور مقابلے شروع ہو گئے۔ چنانچہ لکھنؤ کے اراکین نے ہر ممکن سعی کی کہ اس کا ہر قدم جدت آمیز ترقی کے ساتھ آگے بڑھتا رہے۔ لکھنے والوں میں یوں تو سارے ملک کے مشاہیر (شاعروں اور ادیبوں) کا تعاون ہمیں حاصل تھا۔ اور ان کی اعانت ہی نے ہمارے اسٹیشن کو صاحبِ حیثیت، استناد و اقتدار بنایا ہوا تھا۔ لیکن بعض پروگراموں کی نوعیت کچھ ایسی تھی جو "خود ساختہ" کی مہر لگائے بغیر قابو میں آنے والے نہ تھے۔ اس سلسلے میں شوکت تھانوی کی فطری ذہانت اور زود نویسی ہر ہر قدم پر ہمارے آڑے آئی۔ نیز ان کی فنی صلاحیتیں ایک کامیاب صداکار کی حیثیت سے بھی غیر معمولی تھیں۔ بچوں کے پروگرام میں جو "ایک تھا راجہ" کے عنوان سے ہفتہ ہفتہ میں تین روز نشر کیا جاتا تھا۔ شوکت صاحب "چاچا" کا مخصوص کردار ادا کرتے تھے۔ وہی اس خاص پروگرام کے خالق تھے۔ خود ہی مسودہ لکھتے اور "چاچا" کا کردار ادا کرتے۔ بچوں کے پروگرام کی حیرت انگیز شہرت اور مقبولیت کے مالک بنے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ میں "چھوٹے چاچا" (چاچا کا بھائی) تھا اور غلام قادر فرید "ٹھمو میاں" کا توتلا کردار ادا کرتے۔ اس کے علاوہ مختلف ڈراموں، فیچروں اور خاکوں کے لاجواب مسودات شوکت صاحب نے لکھے اور اپنی طبعی

سالوں سے ان کی ملاقات تھی جس جلد ہی ایک ادبی نشست "موہ شاہی" تشکیل پا گئی "آہنگ کلام" کا خاصا حصہ اس پروگرام میں قدیم قصیدہ
ادا کرنا "پیروڈی" کے عنوان سے پیش کیا جاتا تھا جس کے مصنف شوکت تھے۔ ہر ہفتہ ایک دلچسپ مشاعرہ جس میں کچھ اس طرح سے اعلان ہوتا:

"سنو شائقین! موہ شاہی کی ہم آہنگی آج شب آپ کی خدمت میں اپنا شہد و معہ نغمگی
حل کرتا "حرف سفید کمتر" پیش کر رہی ہے جس میں لکھنؤ کے نامی گرامی ریڈیو میں اپنے فن کی رقاص ہیں۔
میں آپ کے سامنے آئیں گی اور اپنی حیرت انگیز اداکاری کے جوہر دکھائیں گی"

اور اس کے بعد قدیم لکھنؤ کی تاریخ، بیگمیوں اور قہقہوں کی گونج اور پنجابی کی آواز کے بعد بیگمیوں کا کلاسیکی رقص شروع
ہوتا اور دقیانوسی قسم کے شوخی چھیڑ چھاڑ، پرانا منطقی و مسجع مکالمہ، موشد و بالغوں کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ یہ پروگرام لکھنؤ
اسٹیشن کی خصوصیت خاص تھا اور ان دنوں ملک گیر شہرت و مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ یہ شوکت کی تخلیقی ظرافت اور ذہانت ادبی
نمونہ تھا۔ اس کے علاوہ ان کے ہفتہ وار خاکوں کا سلسلہ "منشی جی" تھا، جو روزمرہ کی عام معاشرتی زندگی پر نہایت دلکش، فنکارانہ
لطیف طنز تھا۔ اس میں "منشی جی" کا کردار قدیم تہذیب کا ایک مزاحیہ اداکار، رونق علی مرحوم ادا کرتا تھا اور روشن منیران کی بیگم کا رول
نئے روپ میں اپنی لاجواب فطری صداکاری کے جوہر دکھاتی۔ شوکت صاحب اس سلسلے کے مصنف بھی تھے اور ہدایت کار بھی۔ اس
پروگرام کی کامیاب مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ رونق علی کو "منشی جی" کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ دراصل لاہور ریڈیو کا سلسلہ "قاضی جی"
مرحوم "منشی جی" ہی کی پیروی پر تھا جس نے شوکت صاحب کو پاکستان کی نشری دنیا میں شہرتِ دوام بخشی اور جس کی بدولت انہوں
نے اپنی اصلاحی ظرافت و طنز نگاری کا لوہا منوایا۔ غرضیکہ لکھنؤ اسٹیشن کی رونق زیادہ تر شوکت کے ہنگاموں پر موقوف تھی۔ گویا وہی
ہمارے دست راست تھے اور وہی دست چپ۔ ہم تقاضے کرتے تھے کہ اور کوئی نئی حرکت ہو جائے۔ وہ کہتے تھے جو کچھ
سب مل کر سوچتے۔ کبھی کوئی شو سوجھ جاتی تو فوراً اس پر بحث ہونے لگتی۔ بات سے بات نکلتی اور اچھا خاصا ایک دلچسپ سلسلہ نئے پروگرام
کا شروع ہو جاتا۔ شوکت صاحب لکھتے۔ ہم میں سے کوئی اس کی ہدایت کاری اور پیش کش کا ذمہ لیتا یا وہ خود ہی پیشکار بن جاتے اور
اداکار بھی۔ غرض یہ تین لکھنے والے، شوکت صاحب، سید انصار ناصری اور میں رات دن اس فکر میں رہتے کہ کوئی تازہ واردات،
ہم تینوں نے مل کر ایک مرتبہ پروگرام بنایا کہ ایک پندرہ واڑہ ڈراموں کا منایا جائے۔ بات یہیں تک نہ رہی بلکہ آگے بڑھ کر پورے مہینہ
تک پہنچ گئی۔ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ملک حبیب احمد کا تو پہلے ہی یہ حال تھا کہ جب تک وہ خود یہ نہ سوچ لیں یا کسی سے نہ سن لیں کہ کل
سے کوئی نیا پروگرام شروع ہو رہا ہے، کھانا ہضم نہ ہوتا اور نہ رات کو چین سے نیند آتی۔ جب انہیں یہ خبر ملی تو مارے خوشی کے ایک ایک

سے گلے ملنے لگے۔ گویا پیشگی مبارکباد شروع ہو گئی۔ مجلس مشاورت ہوئی، کئی گھنٹے بحث مباحثے میں گزرے۔ چائے کی متعدد کیتلیاں ختم ہو
گئیں۔ سینکڑوں سگرٹ پھونک ڈالے۔ ہنسی۔ قہقہے۔ گرماگرمی۔ شوکت کی فقرہ بازی۔ لطیفے اور دوسرے کا چست فقرہ سن کر ہنسنے کا بھی
کا اظہار غرض ایک پُرلطف معرکہ گرم رہا۔ اور گرمی محفل کا باعث محض شوکت کی ذات۔
تجویز ہوا کہ پروگرام نشرات کا ہر اسٹیشن ادبی رکن ایک ڈرامائی پروگرام ضرور لکھے۔ بحث کا سوال نہ تھا۔ طے پا گیا۔ جو لکھنے والے

نہ تھے وہ بھی خوشی سے آمادہ تھے کہ اس طرح ہم
"بنگال کے شہیدوں میں نام کر لیں گے"

اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب پروگرام کی تنسیخ کی لہر پڑی تو کل کا پورا چالیس قائم کرنا باہر کے ادیبوں سے بھی لکھوانا تھا اور پھر صرف تیس کا بندوبست کر لیا گیا۔ جاسکے کسی کا یہ ارادہ نہ تھا کہ اس پروگرام کو دوبارہ نشر کریں اور پچھلے کی ریڈیو سے صرف تیس رکھیں۔ صاحب نے کہا " ڈراموں کی اہمیت کے بعد چالیسواں کیوں نہ ہو؟" میں نے کہا " چالیسویں کی نوبت کیوں آئی۔ بلکہ تھوڑی سی زیادتی کی جائے کہ جینے نہ ہو جائیں۔ سب نے کہا وہ کیسے؟ میں نے کہا " چالیس پروگرام تک تو نوبت پہنچ ہی گئی ہے صرف بیس کی کمی ہے ساٹھ پیسے کرکے۔ دن میں دو ڈرامے یعنی صبح اور شام ایک ایک

میری بات مکمل ہی تھی اور دونوں تالیوں کی گونج شروع ہو گئی۔ اور متفقہ طور پر ایک ہفتے میں ساٹھ ڈرامائی پروگرام نشر کیا جانا طے پایا گیا۔ جس کی فہرست مرتب ہو گئی۔ ان میں سے تمام مزاحیہ ڈرامے اور خاکے شوکت صاحب کے ذمے تھے جب اس پروگرام کا آغاز ہوا تو عجیب طور پر ایک ہنگامہ تھا۔ عام طور پر ایک ریڈیو اسٹیشن سے ہفتے میں ایک دو ڈرامے یا فیچر پروگرام نشر ہوا کرتے ہیں۔ اور یہاں ایک دن میں دو کا اوسط تھا۔ ہدایت کار مختلف تھے۔ مگر صداکاروں کی تعداد محدود۔ نقل نویسوں کے ہاتھ پاؤں اور مسودات کی نقلیں کرتے کرتے شل ہو گئے تھے۔ ہر ہدایت کار کی کوشش تھی تو یہی کہ اسے بہتر صداکار ملیں۔ زیادہ سے زیادہ ریہرسل کا وقت ملے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ہر پروگرام کی ریہرسل کو بمشکل چند گھنٹے میسر آ سکتے تھے۔ شوکت صاحب کا ڈرامہ صبح نو بجے نشر ہونا ہے۔ گزشتہ شب ان کا ایک اور نشر ہو چکا ہے اب وہ کچھ حصہ گھر سے لکھ لاتے ہیں۔ سات بجے پہلی مجلس کے پروگرام حسب معمول نشر ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ ڈرامے کے صداکار۔ ہدایت کار متفقہ کے ساتھ ادھر ادھر گھومتے پھر رہے ہیں اور شوکت صاحب کا انتظار ہے۔ سامنے سے شوکت کو دیکھتے ہیں ان کے گرد جمع ہو گئے کہ ڈرامے کا مسودہ دیجئے تو جلدی سے ریہرسل کیجئے جا بجا نشر کا وقت آ رہا ہے۔ ہدایت کار سخت پریشان ہے۔ شوکت صاحب حسب معمول نہایت اطمینان سے تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں " لیجئے ابھی دیتا ہوں" اور ڈیوٹی روم میں جا کر میز پر اپنا بیگ رکھ کر دل سے چائے کہتے اور چونا تمباکو نکال کر چبانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہدایت کار پر چڑچڑا پن طاری ہے۔ شوکت مسکراتے ہیں اور آرام سے بیگ میں سے چند کاغذات نکال کر انہیں الٹ پلٹ کے دیکھتے اور بلا تکلف لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہدایت کار اب یہ دیکھتا ہے کہ جو ڈرامہ نو بجے نشر ہونا ہے اس کے مسودے کا چوتھا صفحہ اب شروع ہوا ہے۔ ڈرامے کی نشری مدت نصف گھنٹہ ہے۔ شوکت صاحب کی تحریر گنجان ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کو ابھی مسودہ مکمل کرنے کے لئے چھ سات صفحات اور لکھنے ہیں۔ آٹھ بجے کا عمل ہے۔ ہدایت کار اور صداکاروں پر عجیب غشی طاری ہونے لگتی ہے کہ اب ہوگا کیا۔ کب مسودہ ختم ہوگا، کب نقل ہوگا اور ریہرسل کس طرح ہوگی۔ اس ڈرامے میں کل چار کردار ہیں۔ ہدایت کار مسلسل شوکت سے اپنی پریشانی اور وقت کی تنگی کا اظہار کر رہا ہے۔ آخر وہ اس پر ترس کھا کر چار مکمل ورق اس کے ہاتھ میں دیتے ہیں مطمئن انداز میں کہتے ہیں " میری جان۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ لو۔ تم ریہرسل شروع کرو۔ اور میں ایک ایک ورق اس دوران میں تمہیں دیتا جاتا ہوں" اور پھر یہ دیکھ کر سب کی کچھ تسلی ہو جاتی ہے کہ ان چار ورقوں کی پانچ پانچ کاربن نقلیں کی ہوئی ہیں۔ جو شوکت نے اصل مسودہ لکھتے وقت کاربن کاغذ رکھ کر کر لی ہیں۔ سب خوشی خوشی جلدی سے اسٹوڈیو میں داخل ہو کر اپنے اپنے پارٹ پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

چار صفحے ختم ہوتے تھے کہ ایک ایک ورق اندر پہنچ جاتا ہے۔ ڈرامہ آغاز ہونے سے پہلے کل مسودہ ہدایت کار اور صداکاروں کے پاس موجود ہو تا چاہئے لیکن ریڈیو میں ـــ ایسا نہ ہو سکا ان میں بڑی بے کیفی [illegible] اور وقت پر چل رہے ہوتے ـــ بہر خیر یہ ہوا کہ ڈرامہ نشر ہو گیا۔

لیکن صداکاروں پر مسودہ پڑھنے کا مرحلہ بھی کچھ کم نہ ہوتا تھا کیونکہ جب بعض اوقات ہدایت کار کسی لفظ کی تصحیح کرا دیتا یا کسی جملے میں تبدیلی کر دیتا تو پڑھتے وقت الجھن ہو جاتی اور پڑھنے والا اٹک جاتا۔ ان تبدیلیوں میں کبھی کبھار مسودہ بھی گم ہو جاتا۔ [illegible] شوکت صاحب کے مخصوص طرز تحریر کے مطابق نہیں ہوتا اور سسٹاف کے ساتھیوں کے لئے اکثر پڑھنے والوں کے مسودے اسی طرح گم ہوتے۔ [illegible] جب صاحب سبھی نشر کے وقت سے کچھ دیر پہلے ہی کچھ لکھتے تھے اور دوسرے متعلقہ فرائض کی ادائیگی میں جو مصروفیت ہوتی اس سے زیادہ وقت لیتی۔ میں اور شوکت صاحب کے ان ہنگامی نشری مسودات کی وقت نشر کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ مشہور ہو گیا تھا جس کا تعلق یہ ہے اتفاق سے حقیقت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ یعنی اگر شوکت صاحب کسی ڈرامے کی وقت ۴۵ منٹ نشر ہونے کے لئے مقرر ہے تو وہ جس نشر کے وقت صرف ۲۰ منٹ کا ہوگا اور سہ پہر ۴ بجے سے جو ڈرامہ شروع ہے اس کے لئے ۵ منٹ یا ایک گھنٹہ درکار ہو [illegible] دونوں سب عجلت میں لکھے لکھے مسودہ مکمل کرتے تو وقت کا اندازہ کئے بغیر کمی بیشی کا لحاظ نہ رکھتے۔

ڈراموں کے سلسلہ میں کئی مواقع ایسے آتے کہ شوکت صاحب و لطیف الفاروقی صاحب کو کوئی نیا ڈرامہ لکھنا ہے۔ عین وقت تک مسودہ نامکمل ہے۔ صداکار پہنچ گئے۔ ابتدائی حصہ صداکاروں کے حوالے اور ہدایت کے وقت ریہرسل شروع۔ مصنف اسٹوڈیو کے باہر ایک طرف گیلری میں بیٹھا بقیہ حصہ لکھ رہا ہے جس کے سامنے نقل نویس پارٹ نقل کر رہے ہیں۔ ایک چپڑاسی جلدی جلدی ورق ورق اسٹوڈیو کے اندر پہنچا رہا ہے۔ اور ڈرامہ مسلسل نشر ہو رہا ہے۔

دراصل اس میں صداکاروں کی پختگی اور حاضر دماغی کا بھی بڑا ہاتھ تھا جو اس عجلت کے دوران بیشتر مسودہ پڑھے بغیر اپنے اپنے پارٹ کس طرح ادا کرتے تھے کہ سامعین کو بھی اس حقیقت کا احساس نہ ہونے پاتا کیونکہ کسی سے کوئی غلطی یا سہو کا امکان ہی نہ تھا۔ صداکاروں میں مقررہ اسٹاف آرٹسٹوں کے علاوہ زیادہ تر مستقل اسٹاف کے اراکین شوکت تھانوی۔ لطف حبیب [illegible] ناصری، مرغلام فرید، یہ خاکسار شریک ہوتے۔ اور سب کو اپنے کام پر کامل عبور و اعتماد تھا۔

پھر اس نوع کے پروگراموں کی کثرت رہتی تھی کہ اس عجلت اور روا روی کے بغیر چارہ کار ہی نہ تھا۔ ان میں دو ڈراموں کا پروگرام تو سال میں کئی بار ہونا معمول ہو گیا تھا اور پھر سب مسودات نئے ہوتے۔ لیکن اس کے علاوہ مختلف النوع پروگراموں کا تقرر و تسلسل جاری رہتا۔ اب ریڈیو پاکستان کے ڈرامائی پروگرام کی حالت زار دیکھ کر جب اس دور کا خیال کرتے ہیں تو شرم و ندامت سے سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ کیا ہمارے ان خوابوں کی یہ تعبیر مقدر تھی!

اس وقت ہر ریڈیو اسٹیشن کی ایک خصوصیت خاصہ ہوتی تھی۔ مثلاً لاہور اسٹیشن خالص طور پر ڈراموں کے لئے مشہور تھا۔ یہاں لکھنے والے، ہدایت کاروں اور صداکاروں میں تجربہ کار حضرات کی خاصی تعداد موجود تھی۔ سید امتیاز علی تاج۔ رفیع پیرزادہ۔ آغا بشیر احمد۔ وغیرہ

اصحاب سے نئے ڈرامے لکھنے اور پیش کرنے میں مصروف رہتے۔ ان میں زیادہ تعداد تراجم کی تھی۔ دہلی اسٹیشن تقریروں کے لحاظ سے مشہور تھا۔ بمبئی میں کلاسیکی موسیقی کے اعلیٰ فن کار اور موسیقار مشاہیر جمع تھے اس لئے وہاں موسیقی کے پروگرام نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کا مجمع تھا۔ خاص لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر چونکہ اتفاق سے چند اہل ذوق آ موجود ہوئے تھے جو ہر طرح سے ہر قسم کے فنکار زیادہ تھے اور سب کے سب فن کے میدان میں جانباز زندگی گزار رہے تھے اس لئے یہاں یہ جدوجہد جاری تھی کہ ہر پروگرام میں خاص جدت و خصوصیت شامل ہو۔ لیکن دوسرے اسٹیشنوں کی طرح اس کی خصوصیت خاصہ غنائیہ نظم اور اوپیرا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نشری اوپیرا اس برصغیر میں سب سے پہلے لکھنؤ ریڈیو سے شروع کیا گیا کیونکہ سرزمین اودھ میں ماہر غزل گو، موسیقار اور صداکار معقول تعداد میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ انہیں نشری ضروریات کے لئے آسانی سے تربیت دی جا سکتی تھی۔

اس قسم کے پروگراموں کا آغاز اوپیرا منظوم ناٹک "اندر سبھا" سے کیا گیا اور اسی کے انداز میں مشہور اردو مثنویاں مثلاً "بے نظیر بدر منیر" "زہر عشق" "گلزار نسیم" "ترانۂ شوق" وغیرہ کو نشری اوپیرا کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا۔ ان پروگراموں کی ترتیب کی ذمہ داری شوکت صاحب اور میں نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ اور سب ہی مل کر پیش کرتے۔ سلطان واجد علی شاہ کا منظوم ناٹک "رہس" "رادھا کنہیا" بھی اسی ذیل میں نشر کیا گیا۔ جب تمام مشہور مثنویات تمام ہو چکیں تو سوچا گیا کہ اب کوئی نئی چیز ہونی چاہئے سے پایا کہ ایک جدید مثنوی تصنیف کرائی جائے جس سے ویسے ہی تشکیل ہو سکے۔

چنانچہ اس مقصد کے لئے کہانی کا خلاصہ دے کر حضرت جگر مراد آبادی مرحوم کی خدمت میں عرضداشت پیش کی گئی اور اصرار و تقاضے کے بعد میں اور شوکت جگر صاحب سے مثنوی لکھوانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن جگر صاحب نے جو مثنوی لکھی وہ خالص طور پر پڑھ کر لطف اٹھانے کے قابل تو تھی جس کے شاعرانہ محاسن لاکلام لائق داد تھے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس کی یہ تھی کہ جگر صاحب نے مثنوی کے انداز میں اپنے مخصوص تغزل کی دلکش و رنگین کیفیت پیدا کی تھی۔ لیکن اس کو نشری ڈرامہ بنانا ممکن نہ تھا کیونکہ اس میں ڈرامائی لازم عنصر حاصل حرکت سرے سے مفقود تھی۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ شوکت صاحب اور میں اسی کہانی پر ایک مثنوی لکھیں اور جگر صاحب کے منتخب اشعار مناسب موقعوں پر شامل کریں جو ڈرامائی شکل میں ترتیب پا سکے۔ سید انصار ناصری اس پروگرام کی پیشکش کے ذمہ دار تھے کیونکہ وہ ڈرامے کے انچارج تھے۔ یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت لکھنؤ کے اسٹیشن ڈائریکٹر مسٹر کنڈن سروپ ملک تھے جو کے بی ایس ملک کے نام سے مشہور تھے اور ایک باذوق فنکار ہونے کے ساتھ لکھنے کا شوق بھی رکھتے تھے۔ اور "پرویز" کے نام سے نشری ڈرامے اور خاکے لکھا کرتے تھے۔ ملک صاحب، انصار صاحب، شوکت صاحب اور میں چاروں اصحاب ایک ساعت سعید میں ملک صاحب کے کمرے میں بیٹھ گئے اور یہ مثنوی (جس کا نام اس کے خاص کردار (ہیروئن) دُردانہ کے نام پر "دردانہ" رکھا گیا) کی مہورت کی گئی۔ تین چار گھنٹے ہم سب سر جوڑ کر وہاں بیٹھے۔ میں اور شوکت شعر پر شعر کہتے جاتے انصار ناصری لکھتے جاتے اور ملک صاحب اظہار رائے کرتے۔ چائے کیک پیڑی سگریٹ۔ یعنی غرض شاندار تواضع جاری رہتی۔ ملک صاحب کی حالت یہ تھی کہ جہاں کہیں انہیں کوئی مصرع یا شعر پسند نہ آتا تو صاف گوئی سے کام لینے کے بدلے صرف آہستہ سے اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ "اسے کسی اور طرح کہہ کر دیکھئے" یا شوکت کو یا مجھے مخاطب کر کے کہہ دیتے کہ

"کیا خیال ہے آپ کا یہ یوں ٹھیک رہے گا؟" کئی بار اس دوران میں شوکت کی تنک مزاجی ہنگامہ خیز ثابت ہونے لگتی۔ کسی موقع پر ہم میں سے

ریڈیو میں کسی مصرعہ پر اتفاق نہ کرتا اسلئے بات کی بات کر کے تشبیہ سے الجھتے رہتے۔ میرے اور شوکت کے بیان جب اوقات کا وقت ہو جاتی۔ کبھی شوکت میرے کسی مصرعہ یا مصرعے پر اعتراض کر کے اسے بدلنے لگتے۔ پاکستان میں ان کے شعری اسٹائل سے اختلاف رہتا ہے معذرت ہوتا۔ آخر یہ سب صاحب کی سرپرستی اور انصار صاحب کی صحت کو اچھی ہونے میں تمام گزشتہ مہینے میں ساتھ ہوتی۔ یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا جلسے کا اعلان ہو گیا تھا، تیسرے دن ہم لوگ چلے دفتری کاموں میں لگ گئے جب سے کہ ریڈیو کی جانب سے نکلے تو شام کو تک تو دفتری سرگرمیوں سے فرصت کب ملتی تھی۔ ہماری منزل کا فاصلہ اسٹوڈیوز سے ہو گئی۔ اُدھر شوکت صاحب کے ذمہ روزمرہ کے کام تھے۔ وہ کسی وقت بھی مدد پیش کریں اور اس کام پر گفتگو کیا کریں ان کی نشست پر فرصت ہو۔ وہ دفتر کے اوقات کے بعد شام کو جلسے سلسلہ جاری رکھتے۔ اس مقصد کے لئے پہلے انصار صاحب کے مکان پر محفل آراستہ ہوتی رہی۔ بعد ازاں میرے مکان پر۔ شوکت صاحب سہ پہر شام کے بعد کاموں سے فارغ ہو کر رات کو آٹھ نو بجے آجاتے اور ہم تینوں ایک ساتھ بیٹھ کر شب تک اس کام میں مصروف رہتے۔ کیا وقت تھا۔ موسم سرما کی لمبی اور طویل راتیں۔ تین جوشیلے دیوانے مل بیٹھے۔ کام کا ایک ساتھ۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ سگرٹ، حقے کے کش جاری ہیں۔ پانوں پر پان چبائے جا رہے ہیں۔ مصرعہ پر مصرعہ اور شعر پر شعر کہے جا رہے ہیں۔ انصار صاحب لکھ رہے ہیں کبھی اپنے شعر پر تینوں خود ہی جھومنے لگے ہیں گانے لگے۔ پھر اس خیال سے کہ گھر والوں کی نیند خراب نہ ہو جلدی سے آہستہ آہستہ گانے لگے۔ کڑی تنقید جاری ہے۔ نوک جھونک ہو رہی ہے۔ شوکت صاحب بگڑ گئے۔ روٹھ کر جا رہے ہیں کہ میرا شعر اچھا نہیں تو خود ہی سب کہہ ڈالو۔ میرے جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ انصار صاحب منا رہے ہیں۔ میں ہنس رہا ہوں۔ شوکت چڑھ کر پھر بیٹھ گئے خود ہی مسکرانے لگے اور بڑے پیار سے کہا۔ میں نے یونہی چڑانے کے لئے کہہ دیا۔ اب میں نہیں کہتا تم ہی جھک مارو۔ شوکت نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔

"میرا بھیا کہہ دے، کہہ دے۔ شاباش۔ چل یہ ہے مصرع۔ اس پر مصرع لگاؤ" اور سلسلہ جاری ہو گیا۔ اس بگاڑ میں گرہ کدورت کا شائبہ بھی نہ تھا، مقصد سب کا ایک تھا۔ سادگی اور خلوص کی جھلک تھی لطف تھا۔ ایک خاص کیفیت تھی بیان میں آنے کے قابل نہیں۔ جوش و خروش کے عالم میں حقہ زمین پر الٹ جاتا۔ اُگالدان قالین پر چل پڑتے بنا دیتا۔ بگڑنا۔ روٹھنا، اور منانا سب کچھ اخلاص و محبت اور سجاوٹ کے لئے تھا۔ غرض ایک یہی تھی کہ پروگرام شاندار ہو۔ چنانچہ پندرہ بیس [illegible]۔ اور بزم شعر گوئی کے نتیجہ میں ہم نے مل جل کر نہایت دلکش اور کامیاب مسودہ تیار کر لیا۔ جگر صاحب کے اشعار استعمال کرنے کی اجازت بھی ان سے حاصل ہو گئی۔ انصار صاحب کے ذمہ اس پروگرام کی ہدایت کاری تھی۔ فنکاروں میں کلکتہ سے فلم اور تھیٹر کی مشہور و مقبول اداکارہ جہاں آرا کجن مرحومہ ہیروئن کے لئے بلائی گئیں اور لکھنؤ سے آجکل کے مقبول گلوکار طلعت محمود ہیرو کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ دوسرے فنکاروں میں مشتاق بائی مرحومہ (الہ آبادی)، اختری بائی فیض آبادی (جو اب اختر اشتیاق ہیں)، ستارہ بائی کانپوری اور دو درجن دوسرے اعلیٰ فنکار جمع کئے گئے۔ تقریباً دو ہفتے دن دن بھر ریہرسلیں ہوتی رہیں۔ اسٹیشن بھر کا عملہ تمام فنکار اور دیگر اہلکار افسران وغیرہ سب ہی کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔

آخر یہ جدید انداز کا اوپیرا بڑی دھوم دھام سے مقررہ تاریخ کو نشر ہوا اور اپنی دلکشی و جاذبیت کے لحاظ سے سامعین

کے کانوں میں اس کی طرزیں گونجتی رہیں۔

غرض لکھنؤ ریڈیو کا وہ زمانہ اسی قسم کے ادبی فنی ہنگاموں میں گزرتا اور شوکت ہماری مجلس نشاط کے ایک نمایاں رکن تھے لیکن کچھ عرصہ بعد لاہور کی پنچولی آرٹ پکچرز نے شوکت کو فلم نگار کی حیثیت سے بلا لیا۔ اور وہ وہاں سے منسلک ہو گئے۔ پھر جنگ شروع ہونے کے چند سال بعد سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن کے نام سے حکومت نے ایک محکمہ قائم کیا جس کے سربراہ مسٹر حفیظ جالندھری (ابو الاثر) مقرر ہوئے۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں ادیب و شاعر احباب کو پبلسٹی آفیسر مقرر کیا۔ لکھنؤ میں شوکت تھانوی نے یہ عہدہ سنبھالا۔ اور سانگ پبلسٹی کا دفتر امین آباد کے متصل ایک محل میں قائم ہو گیا۔ شوکت لاہور سے لکھنؤ آ گئے۔ اور جنگی ترانوں کے گیت لکھوانے اور ان کی طرزیں تیار کرانے میں مشغول ہو گئے۔ یہ کام بظاہر شوکت کے لیے نیا تھا لیکن انہوں نے اپنی فطری ذہانت اور طباعی سے تمام دشواریوں پر جلد عبور حاصل کر لیا۔ اور اس خوبی و خوش اسلوبی سے ان ذمہ داریوں کو نبھایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مزاحیہ ادیب نہیں بلکہ بنیادی طور پر تعمیری موسیقی کے ماہر تھے۔ شعبہ اور مرکز دونوں پر اپنی اہلیت کا سکہ جما دیا۔ نشریات کی جانب سے لکھنؤ میں رہنے کے باوجود ان کی دلچسپی کچھ کم نہ رہی۔ کیونکہ اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں ان کو گاؤں گاؤں منڈیاں لے کر گھومنا پھرنا پڑتا تھا۔ شوکت ہر رنگ اور ہر صورت میں ایک فطری فنکار تھے۔ اور انہیں اپنی فنی صلاحیتوں کو ہر جگہ نمایاں کرنے کا خاص ملکہ اور بہر حال وہ ایک ممتاز نشری شخصیت کے مالک بن چکے تھے۔ علاوہ ازیں محکمہ نشریات میں ان کے مخصوص احباب موجود تھے اس لیے وہ جہاں بھی رہے۔ ریڈیو سے الگ نہ ہو سکے۔

شوکت کی دوسری ادبی مصروفیات اس محکمہ میں رہ کر بھی کم نہ ہوئیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ایک مقبول ترین ناول "بیوی" اسی زمانہ میں لکھا جس کی تصنیفی مدت صرف ایک رات ہے۔ اس ناول کے ناشر برادرم محمد طفیل (مدیر نقوش و مالک ادارہ فروغ اردو لاہور) اس کے شاہد ہیں جنہیں رات بھر شوکت کے ساتھ بیٹھ کر یہ ناول لکھنا اور لکھانا پڑا۔ شوکت صاحب بے تکان واقعات بیان کرتے جاتے اور کہیں سے ربط و تسلسل میں فرق نہ آنے پایا۔ جب طفیل صاحب لکھتے لکھتے تھک جاتے تو سانگ پبلسٹی کے ایک منشی لکھنا شروع کرتے۔ لکھنے والے تھک گئے مگر شوکت کی روانی اور واقعات کے جوڑ توڑ میں کہیں تذبذب پیدا نہ ہونے پایا۔ سب کی حالت یہ تھی کہ

انگلیاں فگار اپنی ، خامہ خوں چکاں اپنا

رات کو نو بجے کھانے سے فراغت کر کے ناول شروع کیا گیا تھا اور صبح سات بجے ناشتہ کے وقت مکمل ہو چکا تھا۔ قدیم شاہی عہد میں داستان سرائی کا یہی انداز ہوا کرتا تھا کہ بادشاہ سلامت رات بھر قصہ کہانی سنتے اور داستان گو ساری رات ایک طویل داستان فی البدیہہ تصنیف کر کے سناتے جاتے۔ شوکت صاحب کی ابتدائی تربیت بلکہ جوانی کا زمانہ بھی لکھنؤ کی الف لیلوی فضا میں بسر ہوا اور انہوں نے بھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز اسی انداز سے کیا۔ شوکت کی تصنیفی قوت واقعی حیرت انگیز اور تخلیقی مادہ بے پناہ تھا۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ صلاحیت خداداد اہلیت اور مطالعہ سے بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی۔ قدرت نے شوکت کو طنز و مزاح کا جو قدرتی ملکہ عطا کیا تھا خصوصاً طنز و مزاح کی جو دولت ان کے حصہ میں آئی اور جس فیاضی سے انہوں نے وہ دو صورتوں میں تحریری اور زبانی ہر طرح تقسیم کی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ شوکت کو مجسم ظرافت بلکہ متکلم ظرافت کہنا بجا تھا۔ اس کی بذلہ سنجی میں تکلف کو دخل نہ تھا۔ بدیہہ گوئی میں تصنع کو —— چونکہ لکھنؤ میں رہ کر سن شعور کو پہنچا۔ زبان کھولی تو کوثر کی دھلی ہوئی زبان بولنا شروع

ان کی تحریر میں جہاں بے پناہ فصاحت و سلاست موجود تھی۔ وہ عام زندگی میں بھی تکلفات پسند نہ تھے۔ نشست و برخاست میں وہ انداز اچھا تھا۔ فصاحت و نفاست بھی قدرت کا تحفہ تھا۔ خوش وضع، خوش قطع، خوش خلق، خوش پوش، خوش مزاج انسان ... بھی جانا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دوسروں پر فقرے پر فقرے کستے تھے اور خوش طبعی ... نہیں جواب میں کسی لطیفے ... کو کبھی برا نہیں مانا۔ ... مگر ... زندگی میں بھی بعض اوقات شوکت کی ازدواجی زندگی ... بیگم کے ساتھ ... شہر کی حیثیت اختیار کر لیتی۔ ... شوکت نے ۱۹۲۹ء میں ... شادی کی۔ ... سعیدہ ... تینوں لڑکوں کی ... کی۔ ... ہر قسم کی شکایات رہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ شوکت نے ان سے نباہ کی وہی صورت اختیار کی جو ایک معقول شریف شوہر اختیار کرتا ہے ... بچوں کے ساتھ شفقت ... تعلیم و تربیت، شادی بیاہ ... لڑکوں کی شادی ہو چکی ہے ... ۔ دوسری بیگم زہرہ شوکت نے فطری جذبہ ... خدمت گزاری و اطاعت میں ... کیا۔ بعض ... اس سلسلے میں عجیب و غریب انداز اختیار کیا اور ... شوکت کو ... کی سعی لاحاصل کی۔ اور افسوس یہ ہے کہ ان میں سے ... شوکت ... زہرہ شوکت نے ... احسانات کے عوض ان لوگوں نے شوکت کی وفات کے بعد اس کے حق میں ... بہرحال یہ دنیا ہے۔

صد حیف کہ یہ جیتی جاگتی ہزار داستان جس نے زندگی بھر ہنسنے اور ہنسانے ... موت کے چنگل نے اسے بے بسی کے عالم میں ایسا رُلایا کہ دوستوں کے دل شق ہو گئے۔ چند نام نہاد اپنوں نے وفات کے بعد ہر ممکن طریقے پر اس کے لیے جگ ہنسائی کے اسباب پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یقیناً انہیں اپنی موت یاد نہیں ؎

ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

اور حقیقت تو یہ ہے کہ شوکت کی موت تو اس کی زندگی سے زیادہ شان و شوکت کا نمونہ ہو۔ کیونکہ ؎

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

دراصل شوکت کی موت طب انگریزی پر ایک ایسا شدید طنز ہے کہ اس پر جتنا ہنسا جائے کم ہے۔ کس قدر عبرت ناک ہے یہ حالت کہ نامی گرامی حاذق ماہرین نے ایک عرصے تک اس کے مرض کی تشخیص میں شک و شبہ کا اظہار کیا۔ اور حتمی طور پر اس وقت صحیح مرض کا اعلان کر سکے جب وہ داعی اجل کو لبیک کہنے کے لیے تیار آخری سانسیں لے رہا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ شوکت صاحب اپنی بے احتیاطی کا شکار ہوئے۔ وہ صاحب مزاج و ظرافت ہر بات میں لطیفہ پیدا کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ چند ماہ پیشتر جب وہ علیل ہوئے اور ڈاکٹروں نے انہیں احتیاط و علاج کی تاکید بھی کی تو انہوں نے دوا اور معالج سب کا مذاق اڑایا اور معالجوں کی مطلق پروا نہ کی۔ آخر مرض رفتہ رفتہ شدائد کی صورت اختیار کرتا رہا۔ وہ بیگم سے بھی چھپاتے رہے لیکن تابکے۔ جب تکیے سے سر لگایا تو اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

علالت کے دوران ہی میں شوکت صاحب لاہور آئے۔ اور ۲۲ مارچ ۱۹۶۳ء کو جشن اعزاز میں شریک ہو کر تمغۂ امتیاز حاصل کیا۔

۲۴ مارچ سے ان کی حالت بدتر ہونا شروع ہو گئی۔ جب ڈاکٹر وسیت ماہر امراض قلب نے تجزیہ کیا کہ انھیں قلب کے بند ہو جانے کی بیماری ہے جسے انجائنا پکٹورس کہتے ہیں تو دوستوں کو اپنے مخصوص انداز میں خوش وقت کر کے یوں دل کی تسکین کرتے رہے کہ بدقسمتی سے ڈاکٹروں نے طے کیا ہے کہ میری بیماری میں تمام خرابی حضرت جگر مراد آبادی کی بدولت ہے ... نہایت کمینے اور ناقابل برداشت ہوگیا ہوں۔ حالانکہ ڈاکٹروں کی ابتدائی تشخیص سے انھیں اپنے بارے میں مایوسی ہو چکی تھی۔ اور عزیزوں، دوستوں اور بچوں کو کسی کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے مگر طبیعت بدستور کی یہی اور لطیفہ گوئی کا وہی عالم تھا۔ ملنے والوں سے بھی کوئی شگوفہ ایسا چھوڑ دیتے کہ ملنے والوں کو ہنسی آجاتی۔ اور لطیفہ کہنے کے مذاق میں اڑا دیتے۔

شوکت جتنا نرم دل واقع ہوئے تھے۔ ان کی صورت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کے سامنے شیر کھڑا ہے۔ کالج کے زمانہ سے بیماری کے بہت کچے تھے۔ معمولی بخار آجاتا تو معلوم ہوتا کہ نہایت شدید بیماری میں مبتلا ہیں۔ یہ سبب بھی ان کی علالت کو خطرناک حد تک پہنچانے کا باعث ہوا۔ کیونکہ ابتدا میں محض بیماری کے خوف سے علاج کی طرف توجہ نہ کی۔

لاہور میں قیام کے دوران میں جب ڈاکٹروں نے باقاعدہ تشخیص اور حقیقی معائنہ کی غرض سے ہسپتال میں داخل ہونے کی تجویز کی۔ تو انھوں نے بچوں کی طرح مچلنا اور رونا شروع کر دیا۔ ہمارے گرد گرد آکر کہنے لگے۔ بس مجھ پر ایک احسان کرو کہ ہسپتال سے بچالو۔ میں ہسپتال میں جا کر مر جاؤں گا۔ میں نے تسلی دی اور منت سماجت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہسپتال میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہر قسم کی آسانی میسر آ سکے گی وغیرہ وغیرہ۔ اس پر ایک روز کہنے لگے "دیکھو میں ایک راز کی بات بتادوں، میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں ہسپتال داخل ہوں اور کفن میں لپٹا ہوا گھر لایا جا رہا ہوں۔ اس لئے مجھے اس عذاب سے بچانا ہے تو ہسپتال سے دور رکھو۔ میں یہاں یونانی علاج کراؤں گا۔ اور تندرست ہو جاؤں گا۔"

میں نے کہا "اس خواب کی مکمل تعبیر یہ ہے۔ کہ ان شاء اللہ تم صحت مند ہو کر وہاں سے آؤ گے۔ کیونکہ ایک تو ہسپتال میں کوئی مر جائے تو وہاں سے کفن پہنا کر نہیں لایا جاتا دوسرے کسی بیمار کا اپنے کو مردہ دیکھنا صحت اور زندگی کی علامت ہے" کہنے لگے "اچھا ایک دن ٹھہر جاؤ۔ ذرا طبیعت کو آمادہ کر لوں، پھر لے چلنا" اور ہم آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ خواب کی بات محض افسانہ طرازی ہے۔ جو ہسپتال سے بچنے کے لئے بنائی ہے۔ گمان بھی نہ تھا کہ شوکت کا افسانہ حقیقت بن جائے گا اور اس خواب کی تعبیر زندہ دلی کی موت ثابت ہو گی۔ بہرحال چند قریبی عزیزوں اور دوستوں کے اصرار و منت سے شوکت ہسپتال میں داخل ہونے کے لئے رضامند ہو گئے۔ جہاں ہم نے ان کے ساتھ ۶۔ اپریل سے ۲۶۔ اپریل کے دوران اس دنیا کی عبرت ناک سیر کی۔ حقیقت میں یہ ایک نیا اور عجیب جہان ہے جس کے حالات اپنی بے بسی کے آپ ہی شاہد ہیں۔

شوکت جس روز ہسپتال گئے تو خود بیٹھ اٹھ بلکہ تھوڑا چل پھر سکتے تھے لیکن اس کے بعد سے ان کی حالت روز بروز اور پھر لمحہ بہ لمحہ ابتر ہونے لگی۔ تیمار دار تو بیچارے بے بس ہی تھے۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ معالجین کے بس میں بھی کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اعلیٰ ماہرین دن رات کامل توجہ سے تشخیص و علاج میں مصروف تھے لیکن کسی کے کئے کچھ نہ بن رہا تھا۔ بالآخر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

بیگم زہرہ شوکت ہسپتال میں شوکت کے ساتھ تھیں، اور ان کی تیمارداری و خدمت گزاری میں شب و روز مصروف۔ رات دن

سے پوچھیں گھنٹوں میں سے بعض دو گھنٹے نہیں لگا آدمی کے بستر آتے ہیں گے۔ مذہبات، بیداری پہ ہی گلا ... بیمی اور فدا دیں
سے لے کسی کام سے ملازمت سے الگ ہم تھے تو شوکت کی خفیف آواز انہیں پہلی سی نہ دیتی۔

چند ہی روز بعد شوکت نے گھر جانے کا اصرار شروع کیا۔ ابھی کئی دن سے ہسپتال میں رہنے کی بات نہ تھا۔ لیے سعید اسی بات پر جھگڑا ہوتا۔ پھر وہ خوش ہو کر کہتے کہ اب گھر لے چلو۔ اور جب میں ڈاکٹر صاحبان کی رائے ظاہر کرتے بتاتا کہ ابھی ان کی اجازت نہیں۔ انشاء اللہ چند دنوں میں صحت ہو جانے کی تو لے چلیں گے۔ تو خفا ہوتے اور جھگڑا شروع ہو جاتا۔ عزیزوں اور دوستوں سے میری عدم موجودگی میں شکایت کرتے کہ حضرت کو سمجھاؤ۔ اگر رضامند کر لیں تو یہاں سے لے چلیں۔

چونکہ ڈاکٹروں نے شوکت صاحب کے پاس لوگوں کو زیادہ آنے جانے سے منع کیا تھا اس لئے اخبارات میں ان کی علالت کی خبر چھپنے پر ہم نے پابندی لگا دی تھی۔ تاہم تو بھی عزیزوں اور دوستوں کو اطلاع پہنچ ہی گئی اور وہ آتے رہے یہ کہہ کر رکتے نہ تھے۔ چنانچہ ممانعت کے باوجود صبح سے شام تک اچھا خاصہ مجمع لگا رہتا۔ اکثر احباب کو کمرے کے باہر ہی بٹھا دیا جاتا اور چند مخصوص ہی ان کے پاس جاتے، جنہیں وہ دور سے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کی نگاہیں بیتے خواب کی گلیوں میں تیر رہی ہیں۔ لیکن دنیا اُمید پر قائم ہے۔ باوجودیکہ بیماری خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ حالت بد سے بدتر نظر آتی تھی۔ اور ڈاکٹروں کے بیان امید افزا معلوم نہ ہوتے تھے مگر یہ تو گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ شوکت کو موت آ سکتی ہے لیکن ع

موت سے کس کو رستگاری ہے

شوکت کی آئی کیسے ٹل سکتی تھی۔ اور ۴ مئی ۱۹۶۳ء کو وقت کی گھڑی آ پہنچی کہ شوکت نے خواب کی تعبیر لی اور کرب و اذیت کے عالم میں اس پیرانِ ظرافت زندہ دل انسان نے صحیح معنوں میں یہ ثابت کر دیا کہ ع

مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

شوکت نے ہسپتال سے گھر آ کر دم لیا۔ اور چند روز بعد نہایت سکون و اطمینان کی حالت میں زہرہ اور بچوں سے باتیں کرتے ہوئے دم توڑ دیا۔ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی کی اذیتیں تمام ہوئیں۔ دل لگی ہی دل لگی میں زندگی کا کھیل ختم ہو گیا۔ شوکت کو ابدی سکون مل گیا۔ بیوی اور بچوں کو ناقابلِ تلافی صدمہ اور بے اندازہ غم، عزیزوں اور دوستوں کو جدائی کے رنج و الم اور ستم ظریف احباب کو افسانہ طرازی کے مواقع نصیب ہوئے۔ شاید بعض احباب جو شوکت سے زندگی میں قربت کا دعویٰ رکھتے تھے وضعداری کو عین ایمان سمجھے ہوئے اس کے مرنے کے بعد بھی اس لئے ہنستے رہے کہ جس نے ہمیں زندگی بھر ہنسایا ہے اب رو کر اس کی روح کو صدمہ کیوں پہنچائیں اور اخلاص کیشیوں کا ثبوت اپنی مضمون نگاری کے انداز دکھا کر دیتے رہے۔ کسی نے اس کی نجی زندگی کے پہلو غلط اور انوکھے انداز میں نمایاں کر کے اپنی خصوصیت جتائی۔ تو کسی نے چند ایسے خطوط جو شوکت نے بصیغۂ راز لکھے تھے شائع کر کے بددیانتی کا اظہار کیا۔

شوکت کی علالت کے زمانہ کی کہانیاں تو اکثر حضرات نے عجیب و غریب طریقے سے بیان کیں۔ ایک صاحب نے جو شوکت کی بیماری کے زمانہ میں شاید ہی کبھی اس کے پاس آئے ہوں۔ ایک مضمون میں مضحکہ خیز واقعہ لکھ کر خدا جانے کیا ثابت کرنا چاہا۔ فرماتے ہیں کہ ہسپتال میں جب شوکت صاحب گھر چلنے کے لیے ضد کر رہے تھے اس وقت ایک شیعہ دوست نے انہیں کچھ کہا۔ اس پر شوکت صاحب نے برجستہ ایک شعر کہا جس کا مطلب تھا کہ تم چاہتے ہو میرے جگر میں خنجر پیوست ہو۔ میرا نام محمد عمر ہے اور اس طرح تمہارے تعصب

اور انتقام کی آگ بجھ گئی۔

اس کے علاوہ اور بہت سی لغو اور مہمل کہانیاں تراشی گئیں۔ یہ وہ حضرات تھے جو شوکت کے سامنے اس کی بذلہ سنجی کا جواب دینے کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ اور اس خاموش موقع کے منتظر تھے۔ حالانکہ شوکت نے ہر ایک سے انتقام لے لیا ہوگا۔ ہر انسان جو سہو و خطا کا مرکب ہے شوکت کی ذات میں بھی تھوڑی کچھ خامیاں اور کمزوریاں تھیں۔ سہواً یا عادتاً کبھی موقع پا کر اس نے کسی سے زیادتی کی ہوگی۔ ایک سب سے بڑی کمزوری شوکت کی بدگمانی تھی۔ وہ بعض اوقات بے سبب محض شک و شبہ کی بنا پر کسی عزیز یا دوست سے خفا ہو جاتا اور اسی غصہ میں اس سے انتقام لینے کی بھی ٹھان لیتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس کی ذات میں انتقام لینے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ شوکت کی بہت سی کمزوریوں پر اس کے مزاح و ظرافت نے پردہ ڈال دیا تھا۔ اور اس کی شخصیت اس کی فطرت کی لطافتوں میں اس قدر گم تھی کہ اس کی خامیاں بھی پیاری معلوم ہوتی تھیں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں!



مرحوم

نادم سیتاپوری

۱۰ مئی ۱۹۶۳ء کی سہ پہر کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر میں مولانا ضیاء الدین ہاشمی حیدرآبادی کا تعزیتی جلسہ تھا۔ وہیں جناب شان الحق حقی نے شوکت کے انتقال کی خبر سنائی ——— حالت کئی دن سے تشویشناک تھی اور اخبارات اور ریڈیو کی خبروں سے ہم مطلع ہو رہے تھے ——— مگر جانے کیوں یہی جی چاہتا تھا کہ شوکت ابھی نہ مرتے

کوئی تیرہ چودہ سال سے شوکت کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید ایک بار وہ لکھنؤ سے آئے تھے لیکن میں لکھنؤ سے باہر تھا۔ بمبئی یا جبل پور گیا ہوا تھا۔ ملاقات نہ ہو سکی ——— گذشتہ جنوری کے آخری ہفتے میں پتہ چلا کہ شوکت ہی جانے کا ارادہ ہو۔ لاہور پہنچا تو بیمار ہو گیا۔ جاڑے بھی بیمار کر کے تقریباً صاحب فراش۔ شوکت راولپنڈی میں تھے اور میرے پاس پنڈی کا ویزا نہیں تھا۔ میں نے شوکت کو لکھا کہ میں لاہور آ گیا ہوں اگر تم ادھر آ سکو تو مجھے اطلاع کر دینا۔ اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا ——— انہیں خط کا جواب دینا ہمیشہ نقصان کرتا تھا۔ اور غیر ضروری خط و کتابت سے وہ ہمیشہ دور ہی رہتے۔ بہت ہی کم ایسا ہوا ہے کہ شوکت نے بلا ضرورت کسی کو خط لکھا ہو۔ پھر مجھ جیسے انسان کی ہر توقع تو فضول ہی تھی جو ہمیشہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد برسوں کے لیے احباب سے جدا ہو جاتا ہے۔ لیکن شوکت کی اس بد اخلاقی پر اب کی طے کر لیا تھا کہ ملاقات ہوتے ہی دو ٹوک فیصلہ ہو جائے گا۔ اور صاف کہہ دوں گا کہ میاں! ———

چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

مگر اس ملاقات کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ موت نے ہم دونوں کے درمیان ایک قطعی فیصلہ کر دیا۔ دو ٹوک فیصلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ———

شوکت تھانوی تو برائے نام ہی تھے، ان کا اصل وطن تو لکھنؤ ہی تھا جہاں انہوں نے شعور کی آنکھ کھولی تھی۔ چھوٹے چھوٹے نام تو دو تھے ——— تسنیم احمد ——— محمد عمر، لیکن مشہور ہوئے "شوکت تھانوی" کے نام سے۔ اور وہ بھی اس شان و شوکت سے [illegible] کہ ان کی جیسی مقبولیت ان کے ساتھیوں میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ شوکت سے میرا پہلا تعارف کچھ عجیب و دلچسپ طریقہ پر ہوا، کوئی تیس پینتیس سال ادھر کی بات ہے جب میں نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مضامین لکھنا شروع کیے تھے۔ کوئی سیاسی رسالہ تو ان مضامین کو خاک چھاپتا یہی سوجھی کہ آ کر ہاتھ صاف کرنے کے لیے روزنامہ "ہمدم" ہی پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ شوکت اس زمانے میں "ہمدم"

کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہو چکے تھے اور "ہمدم" کا ادبیہ کالم "دو دو باتیں" انہیں کے قلم سے ہوتا تھا۔ یہی نہیں شوکت کے مزاحیہ مضامین، افسانے اور غزلیں وغیرہ بھی شائع ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ "دو دو باتیں" کے کالم پر تو شوکت کا نام ہی نہیں ہوتا تھا۔ مگر دوسرے مضامین اور افسانوں میں وہ باقاعدگی کے ساتھ "مولانا شوکت تھانوی" ضرور ہو چکے تھے۔

مولانا، مرحوم، علامہ، ابو الفضل، ابو الشعرا، صاحبزادے کیا کیا کچھ ——— اسی زمانے میں ہر زمانے کے سب مشاعرے منعقد ہوتا تھا۔ ضلع کے نام کے ساتھ مولانا لکھا گیا تو اسے اس قسم کی باتوں سے ہمیشہ الجھن سی ہوتی۔ اسی لئے جب شوکت نے ایک مشاعرے کے جلسے میں شکریے کے طور پر "جب مولانا آزاد صاحب" کہا تو ... مجھے بے اختیار غصہ آگیا میں نے انہیں خط لکھا کہ براہ کرم آئندہ سے آپ مجھے "مولانا" ہرگز نہ لکھئے گا۔

اس وقت تک شوکت سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی اور میں مولانا شوکت تھانوی کو بہت ہی مرعوب کن شخصیت سمجھتا تھا۔ بڑی کالی بھیم و ضخیم داڑھی ہوگی۔ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ اور دیسی جوتا پہنتے ہوں گے۔ گلے میں شاید کسی قسم کا ہار بھی ہوگا۔ اور ——— اور جانے کیا کیا کچھ ———!

مگر چند ہی دن بعد لکھنؤ میں جب ملاقات ہوئی تو ان میں "مولانا" کا نام و نشان تک نظر نہ آیا ——— اور مولانا یا مرحوم ہوتے بھی کیسے! ایک با وضع خوش رو نوجوان کے بارے میں یہ تصور ہی غلط تھا۔ دراصل پہلی ملاقات بہت ہی "اصحاب با صفا" قسم کی تھی۔ کیونکہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو سنجیدہ ادیب ظاہر کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس دن کے اخبارات پر سنجیدہ گفتگو رہی۔ روزنامہ "ہمدم" کی پالیسی کچھ سیاسی حالات پر نقد و تبصرہ غرضیکہ ایک گھنٹے کے اندر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کے لئے جلدی جلدی بہت سی باتیں کر ڈالیں جن کا سلسلہ اور بے جوڑ سی ——— مگر میں جب شوکت کے پاس سے اٹھا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ شوکت پر شاید برابر میری کوئی علمی و ادبی دھونس نہیں جمی تھی۔ جس طرح میرا تیر خطا ہو چکا تھا اسی طرح شوکت کے پلے بھی کچھ نہیں پڑا تھا۔ البتہ میں جب شوکت کے پاس سے اٹھا تو شوکت کی من موہنی شخصیت مجھے کافی متاثر کر چکی تھی۔

اس کے بعد شوکت سے مختصر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جب لکھنؤ جاتا شوکت سے ضرور ملتا۔ شوکت اس زمانے میں چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی کے قریب اپنے ذاتی مکان "زندہ کوٹھی" میں رہا کرتے تھے۔ آغا باقر کا امام باڑہ بھی زندہ کوٹھی کے پاس ہی تھا جس میں مرزا رفیع سودا کی قبر بتائی جاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب نخاس اور چوک کی رونق میں کمی ہو چلی تھی اور امین آباد کی چہل پہل دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ "پیام یار" والے منشی نثار حسین کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اب اس علاقہ (چوک) میں صرف خواجہ عبد الرؤف عشرت ہی باقی رہ گئے تھے جن کی چھوٹی سی کتابوں کی دکان میں لکھنؤ ہی نہیں ہندوستان بھر کے ادیب اور شعرا کا جمگھٹا رہتا تھا۔ شبلی، سرشار، شرر، منشی سجاد حسین وغیرہ تو باقی نہیں رہے تھے البتہ عزیز، محشر، ریاض اور لکھنؤ کے بہت سے ارباب کمال اب بھی کبھی نہ کبھی وقت یہاں ضرور پہنچتے تھے۔ امین آباد کی طرف نیاز فتح پوری کے آجانے کے بعد ایک نیا ادبی مرکز نظیر آباد میں قائم ہو گیا تھا۔ مولوی صدیق احمد کے "صدیق بک ڈپو" نے جو اشاعتی پروگرام شروع کیا تھا اس نے لکھنؤ کی ادبی فضا میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اسی نظیر آباد میں ایک صاحب نے "شبلی بک ڈپو" بھی قائم کر دیا تھا۔ لیکن لکھنؤ کی اس نئی "ادبی پود" نے "انعامی بسکٹ فیکٹری" کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔ بسکٹوں کی یہ چھوٹی سی دکان اس زمانے میں لکھنؤ کے فن بسکٹ سازی کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ لکھنؤ بھر کی ادبی سرگرمیاں

[illegible] کے بنگلے [illegible] پہنچ [illegible] تھے [illegible] کے [illegible] دونوں [illegible] رضوان [illegible]
دونوں پہلوؤں کے انتظار میں کھڑی [illegible] بیٹھا [illegible] سے [illegible] شوکت سے خوب
[illegible] جال سید الہام حسین اور نسیم [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
سعی تضیع اوقات ہے چنانچہ [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible]
[illegible] نسیم [illegible] ساتھ [illegible] الہام [illegible] بکتے [illegible] جھٹے۔

نسیم [illegible] کہ [illegible] ہی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] لیکن آپ دونوں بیاہیوں کی بیوی [illegible] نہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
نسیم [illegible] ایک [illegible] تھے۔ [illegible] [illegible] صاحب [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] کی شکل میں سامنے آگیا [illegible] [illegible] نسیم [illegible] عیب [illegible] لیکن [illegible] بیچارہ
بالکل بے قصور تھا۔ شوکت نسیم کی [illegible] [illegible] خوش نصیب [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] پیچھے [illegible] بشیر [illegible] شوکت [illegible] جب [illegible] حیثیت سے [illegible] نسیم [illegible]
نشانے پر ٹھیک ہی بیٹھا۔ شوکت نسیم کی [illegible] کا [illegible] [illegible] [illegible] پہنچ [illegible]
[illegible] ایک [illegible] [illegible] نہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] پڑھنے [illegible] سامنے پیش [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible]
سنجیدگی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

ماہنامہ کہکشاں نسیم انہونوی کی ادارت میں پابندی کے ساتھ [illegible] [illegible] شوکت کی خداداد صلاحیتوں نے قلیل مدت
میں کہکشاں کے لیے لکھنے والوں کا ایک اچھا خاصا حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ مرزا [illegible] بیگ [illegible] [illegible] [illegible] بسملانی
محشر عابدی اور ظریف لکھنوی وغیرہ تو کم و بیش طنز نگار اور طنز گو کے زمرے میں آتے ہی تھے۔ شوکت کی کوششوں نے [illegible] فتح [illegible]
کاظمی۔ قدر کا کسروی۔ امین سلونوی جیسا [illegible] استاد [illegible] [illegible] کھڑا کر دیا اور —— جن کا میدان عمل
طنز و مزاح یقیناً نہیں تھا چنانچہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نظر آتا ہے۔ مزاح نگار کی حیثیت سے نہ وہ
کبھی سنجیدگی کے ساتھ سامنے [illegible] نہ اس دنیا میں انہیں شہرت و ناموری حاصل ہوئی۔ یہی حال [illegible] کاظمی مرحوم کا تھا۔ فطرت نے انہیں تخلیقی
صلاحیتوں سے مالامال کیا تھا اسی پر ان کا انجام بخیر ہوا —— امین سلونوی نے دنیا میں جہنم جیسی شاہکار تخلیق ضرور کی مگر قسمت کا فیصلہ
ان کے حق میں یہی ہے کہ وہ ایک کامیاب صحافی کی حیثیت سے زندہ رہیں۔

کہکشاں دراصل شوکت کی پہلی اڑان تھا۔ ہمدم کی وہ واہیات [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
مولانا ظفر علی خاں نے پنجاب میں کر رکھا تھا۔ لیکن شوکت تنہا اپنی صلاحیتوں کے سہارے [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے دور سے بہت کچھ بدل [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] بدل چکا تھا نثر کے اسلوب بدل چکے تھے حتیٰ کہ [illegible] [illegible] [illegible] ترقی میں تھا۔ پھر طنز و مزاح کی

تھیں کیوں دلچسپیں ——— شوکت نے مسلسل چند سالوں میں لکھنؤ کی روایتی زندہ دلی اور روایتی طنز نگاری کی تہذیب کو جنہیں منشی سجاد حسین اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے لکھنؤ کا ادبی ورثہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

غالباً ۱۹۳۳ء کے اوائل میں "انکشافات" کا "ظریف نمبر" نکلا جو کئی اعتبار سے پہلا اہم خاص نمبر تھا۔ اس کی تمام تر ادارتی ذمہ داری نسیم کی خوش سلیقگی اور نفاست کا مظہر تھا اور ترتیب و تہذیب و سجاوٹ کے لئے صرف شوکت کو سے دینا ہی کافی ہے۔ ادبی رسائل کے خاص نمبروں کا سلسلہ اس وقت تک نیا نیا تھا اور غالباً اس اولیت کا سہرا حکیم یوسف حسن کے "نیرنگ خیال" اور "عالمگیر" سے زیادہ کسی اور رسالے کے سر نہیں۔ اس زمانے میں کوئی دوسرا ادبی رسالہ شائع نہیں کر سکا ——— اور یوپی میں یہ اتفاق شاید پہلی بار ہوا کہ کسی رسالے کا خاص نمبر اس شان سے نکلا جو نسیم انہونوی کی غیر معمولی صلاحیت کی رہین منت تھی۔ اس خاص نمبر کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ تھی کہ پہلی بار اس سالنامہ میں شوکت نے یہ قرار کیا یا دھرا نہیں کہ نسیم کی ادارتی صلاحیت کے لئے اس کا اعتراف کچھ اس طرح کیا تھا ——— "کس کی بری اور کون ڈالے گھاس"۔

یہ وہی دور تھا جب "سودیشی ریل" کی مقبولیت نے شوکت کی شہرت و ناموری کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اب ان پر اپنے کاروباری کے علاوہ ادبی رسائل کے لئے مزاحیہ مضامین لکھنے کی ذمہ داریاں بھی آ پڑی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اب وہ "انکشافات" کو اتنا وقت نہیں دے سکتے تھے چنانچہ سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی "انکشافات" بند ہو گیا۔

طنز و مزاح نسیم کے بس کی بات نہ تھی اب ان کے سامنے یہی ایک صورت تھی کہ اپنی ادارتی پیاس بجھانے کے لئے کوئی زنانہ ماہنامہ نکالیں چنانچہ "حریم" جاری ہو گیا اور جیسے تیسے نکلتا رہا۔

۱۹۳۶ء میں روزنامہ "ہمدم" کے بانی و سرپرست مہاراجہ محمد علی محمد خان (آف محمود آباد) کا انتقال ہوا اور "ہمدم" کی نیا ڈوبنے لگی۔ خان بہادر سید احمد حسن نے اپنے امکان بھر اسے زندہ رکھنے کی کوشش کی لیکن زیادہ عرصے تک ان کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں اور "ہمدم" نواب عبداللہ خان کی ملکیت میں چلا گیا۔ سید جالب دہلوی نے "ہمت" کے نام سے ایک دوسرا روزنامہ جاری کر دیا اور شوکت "اودھ اخبار" میں چلے گئے۔

یہ دور شوکت کی پریشانیوں کا دور تھا۔ نسیم اس نادر موقع کو بھلا ہاتھ سے کب جانے دیتے۔ "سرپنچ" کا اجراء ہوا اور شوکت باقاعدہ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ "سرپنچ" جو "نسیم" کی ملکیت تھا جس کی طرف سے "سرپنچ" کے علاوہ "حریم" بھی نکلتا تھا۔

"سرپنچ" کا دور ادارت شوکت کی زندگی کا سب سے زیادہ اندوہناک دور تھا۔ نسیم کا کاروباری برتاؤ اور شوکت کا عظیم پاس وضع!

"سرپنچ" کے دفتر میں ایک چھوٹی سی میز پر گھنٹوں سر جھکائے وہ لکھا کرتے تھے جانے کیا کیا کچھ۔ "سرپنچ" اور "حریم" تو ان کے لئے زیادہ سے زیادہ دو تین دن کا کام تھا۔ لیکن نوکر جو تھے، خالی تو نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ دوسروں کے لئے ناول لکھ کر ڈیوٹی کے اوقات پورے کرتے رہتے۔

چاہے آپ اسے شوکت کی کمزوری کہئے چاہے حماقت ——— اس نے اپنے ہر قدیم و نزدیک دوست کو ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ نبھانے کی کوشش کی۔ یا مروت اور وضعداری ایسا کہ اگر کوئی دوست "سرقہ بالجبر" کی واردات میں انہیں نامزد کر دیتا تو یہ نہایت ہی سعادت مندی کے ساتھ اقبال جرم کر لیتے ——— یہی وجہ تھی کہ ان کے کئی قریبی دوست ان کے ساتھ "بیرحمانہ" سلوک کرتے رہے۔ اور یہ نہایت ہی صبر و شکر کے ساتھ اسے برداشت کرتے رہے۔ برداشت ہی نہیں کیا بلکہ انہیں فراخ دلی کے ساتھ تمام عمر اس طرح نباہ دیا جیسے وہ اسی لئے پیدا کئے گئے تھے کہ دوستوں کا ظلم و ستم ہنس ہنس کر جھیلتے رہیں۔ "سرپنچ" کا دور ادارت المناک تو ضرور تھا لیکن شوکت نے جس

خود پیانو کے علاوہ اسے پیانو ادب بھی نہیں کا نام تھا، ایسی [illegible] بھری فضا میں جہاں [illegible] شوکت کا قلم برابر نہایت اور مسلسل چلتا رہا کرتا تھا۔

" سرپنچ " سے شوکت کی محبت کو [illegible] بہت ہی [illegible] ہمیشہ قائم رہی [illegible] ـــ جب انہوں نے خود بھی [illegible] نہیں کیا تو ان کا " [illegible] " [illegible] " سرپنچ " سے ایک [illegible] اپنی مدت زمانہ جانے تک ان کا [illegible] جو ان کی محبت کا ثبوت ہے۔

" سیار نویسی " شوکت کو ورثے میں ملی تھی [illegible] زندگی [illegible] نہیں چھوڑا [illegible] ـــ ! زندہ [illegible] ایک [illegible] اشاعت [illegible] ایک کرسی پر بیٹھے [illegible] لکھنے میں مصروف تھے، میں چپکے سے آ کر بیٹھ گیا ـــ آنکھوں پر عینک [illegible] انگلیوں کی گرفت میں [illegible] رہا تھا۔

کب تک ارادہ ہے ؟

میں نے پوچھا۔

کیا ارادہ ـــ ؟

شوکت کا ذہن شاید کہیں اور گیا تھا جیسے ـ ـ

ارے بھئی ـــ یہی "انتقال" فرمانے کا !

میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

فی الحال تو تم لوگوں کے تعزیت نامے لکھنے کا انتظار کر رہا ہوں ـــ مزاحیہ تعزیت نامے لکھنے کے لیے !

شوکت نے جواب دیا۔

ماشاءاللہ ـــ چشم بد دور !

میں نے ہنستے ہوئے کہا ـــ

اور بات کہیں سے کہیں جا نکلی ـــ اپنی بے پناہ مصروفیت کا ذکر کرنے لگے اور بڑی دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے۔ شوکت تھانوی ہونے کے باوجود لکھنؤ کی زندہ دلی اور طنز و مزاح کے احیاء کا ایک خاص پروگرام رکھتے تھے " اودھ پنچ " کے زمانے کا طنز و مزاح ان کے نزدیک صرف تاریخی اہمیت کا حامل رہ گیا تھا وہ چاہتے تھے کہ " سرپنچ " کے ذریعہ مزاح نگاروں کی ایک ایسی نسل پیدا ہو جائے جو مرحوم لکھنؤ کی روایات [illegible] کر کے اسلوب و انداز میں زندہ رکھ سکے لیکن شعر و ادب کی طرح " مزاح " بھی جبراً کسی پر طاری و مسلط نہیں کیا جا سکتا چنانچہ نتیجہ ظاہر " سرپنچ " کی فائلوں پر درجنوں نئے مزاح نگار ابھرے اور فطری صلاحیتوں کے فقدان نے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ دُور کیوں جائیے یاروں نے خود مجھ کو غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ مزاح نگاری " میں میں ایک خاص مقام پیدا کرتا چلا جا رہا ہوں۔

غالباً ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۲ء میں " سرپنچ " کے سالنامے کا اعلان ہوا۔ شوکت بضد ہو گئے کہ تمہیں بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ہے۔ چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے کردار " مرزا ظاہر دار بیگ " کو میں نے قالب میں [illegible] کا خاکہ بنایا اور اس سے ایک مضمون لکھ کر بھیج دیا۔ اس مضمون کو طنز و مزاح

میں کوئی تشنج حائل ہوا؟ اس پر وہ رائے ہرگز نہیں دے سکیں گے مضمون پڑھنے والے جیسے بھی ہیں۔ مجھے بھی جیتی جاگتی زندگی سے نفرت نہیں
میری اس بد مذاقی پر ہنسی آئی ہو گی کہ مجھے بھی مزاح نگاری کا خبط ہو گیا ہے۔ شوکت نے ازراہِ کرم اس مضمون کی طرف بھی نگاہ کی تھی اور اس
میں بھلے والوں کو جو صفحات دیئے تھے ان میں میرے نام کے ساتھ۔ بحسن اور بہتر کام چلتا رہا تھا۔

شوکت بہت ہی بڑا آدمی تھا ———

اتنا بڑا کہ زندگی بھر سنجیدگی کے ساتھ کبھی اپنے کام نہیں آیا۔ زندگی کا بیشتر حصہ "یار باشی" اور دوست نوازی میں گزارا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان دوستوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ دوستوں کے کام آنا شوکت کا شعار و خمیر تھا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے موقعے تلاش کیا کرتے تھے کہ اپنے احباب کے کچھ کام آئیں۔

دوسری جنگِ عظیم چھڑ چکی ہے اور شوکت یو پی کے "سانگ پبلسٹی آفیسر" وغیرہ (Song Publicity Officer) مقرر ہو چکے ہیں۔ غالباً ندو کرشن بھٹ کی سی کوٹھی نواب کے باغ میں رہتے تھے۔ سانگ پبلسٹی آفس کے لیے بھی ایک بڑا سا ہال اور چند کمرے بھی الاٹ کرا لئے تھے ——— ایک دن امین آباد میں مل گئے کئی مہینے کے بعد ——— سلام علیک کے بعد کہنے لگے

اب اتنا بھی نادم نہ ہو ——— لکھنؤ چپکے سے آتے ہو اور چھپ کر نکل جاتے ہو ——— کبھی ملتے بھی نہیں

معاف کیجئے گا ——— میں نے جواب دیا "میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ بیکار ضائع کروں ——— اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو ستیا پور کیوں نہیں آتے۔

جی سبحان اللہ ——— شوکت بولے "گویا میں تمہاری طرح بیکار رہتا ہوں ——— خیر! چھوڑو آؤ میرے ساتھ!
زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے ——— چائے منگوائی۔ کہنے لگے ... ———

اب تمہاری "منڈلی" کا کیا حال ہے

"منڈلی" ——— میں ذرا سا چکرا سا گیا مگر جلدی ان کی بات سمجھ میں آ گئی ——— جب سے تم نے سرکاری نوکری کر لی، مجھے منڈلی توڑ دینا پڑی ——— اب اس کام کو طرزی کر رہا ہے۔

شوکت ہنسنے لگے۔ کچھ دیر تک خان محبوب خاں طرزی کی سانگ پارٹی کا ذکر ہوتا رہا۔ ——— چائے اب ختم ہو چکی تھی
کہنے لگے! ———

یہ کاغذ لو ——— ذرا دو چار گیت لکھ ڈالو جلدی سے۔

گیت ——— کیسے گیت؟

میں نے پوچھا ———

کہنے لگے ———

اماں ایسے ہی فضول سے "نرجی کم پڑن" کو سنانے والے، جنہیں سن کر وہ جھومنے لگیں۔
میں "فضول سے گیت" لکھنے لگا اور شوکت اپنے کام میں لگ گئے۔
کوئی بیس پچیس منٹ میں میں نے تین چار "فضول سے گیت" لکھ کر شوکت کی طرف بڑھا دیئے۔

شوکت نے غلیظ دیکھا اور سب پکار کر کھڑی ہوئی چیز ہی تو ہے یہ دوات دے رکھا۔
بس صاحب دھمنی سکھ پر شاد بھل ہتا باری لادے تو۔
پھر بس چلا۔ شوکت پھر باتیں کرنے لگے ۔ وہی جو میں نے چپڑاسی نے لفافہ اور شوکت کی میز پر رکھ دیا
شوکت نے بس چپ پر دستخط کئے اور جواب لکھ دیا۔

یہ چپ میرے نام تھا ——

میں نے کہا —— تو میں واقعی متحیر ہو گیا ۔ — معاف کیجئے گا میں خود بھی شاد سے نہیں ملا
آپ شوکت —— ہی شوکت ہیں ہستے رہے۔ کھڑے ہوئے ۔ معذرت چاہی ہاں ہاں۔

اس وقت تک میں نے "دیہاتی" کے علاوہ کسی سے بھی یہ نام نہیں سنا تھا۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی اور شوکت نے مجھے
بڑی ہمت بندھائی میرے دل سے ملال دور ہوا اور میں بیٹھا رہا۔

"دیہی دہلوی" سے شوکت کا یہ قلمی نام اس طرح وجود میں آیا کہ پاکستان بننے کے بعد ہی سے "دیہی دہلوی" کے نام سے ہندوستانی کتابیں چھپا کر فروخت
ہوتی تھیں۔ حکومت ہند و پاک نے ہندوستان سے اخلاق سوز لٹریچر کو ممنوع قرار دیا۔ وجہ یہ تھی کہ دونوں ملکوں سے یہاں چھپ چھپ کر ایسے مقامات
چلے آتے تھے مگر شاید اب تک یہ پتہ نہیں چلا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ "دیہی" ہی کیوں صاحب! دیہاتی بھی تو تھے۔ اس قسم کا کوئی نام
نہیں ایک واہیات نام بھی نہیں ہے جس کا ہی پتا ہو۔ "دیہی دہلوی" بن گیا۔

لیکن شاید یہ دیہی کی کرامت کو معلوم ہے کہ دیہی دہلوی کا قلمی نام دراصل شوکت کی ہی تراشیدہ ایجاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی سلسلے
میں شوکت نے کئی برس پہلے ایک شعر بھی کہا تھا۔

ہم آپ سے دیہی ہیں ہمیں جان جائیے
پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے

ہوا یہ ——!

نسیم انہونوی نے جب جنسیاتی افسانوں اور ناولوں کی اشاعت کا دھندا شروع کیا تو نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے "شبستان کی خلوتیں"
"جنون اور وصال" قسم کی کئی کتابیں لکھوائیں جو جنسیاتی ہونے کے باوجود اتنی گندی، فحش اور اخلاق سوز نہیں جیسی آج کل "دیہی دہلوی" کے نام
سے شائع کی جا رہی ہیں۔ پھر بھی ہندوستانی ماحول اور اردو زبان کے لیے یہ نیا تجربہ ضرور تھا۔ اسی لیے ان کے لکھنے والوں نے اپنا نام شائع
کرنے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ یہ مسئلہ جب شوکت کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے ان فرضی مصنفین پر "دیہی دہلوی" کا نقاب ڈال
دینے کا مشورہ دیا اور یہ فرضی نام کچھ ایسا مقبول ہوا کہ درجنوں "دیہی دہلوی" پیدا ہو گئے۔

شوکت محض مزاح نگار ہی نہیں تھے بلکہ قدرت نے ان میں ایک اچھے اداکار کی تمام صلاحیتیں بھی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھیں۔
ان کے دو تین معرکۃ الآرا مضامین میں "تعزیت" بھی ایک خاص مقام رکھتا ہے جو ان کی انتہائی سنجیدہ اداکاری کا آئینہ دار ہے۔ "مرقع"
کے ایڈیٹر سید مقبول حسین وصل بلگرامی مرحوم بھی اسی قسم کی سنجیدہ ایکٹنگ کے ماہر سمجھے جاتے تھے لیکن انہوں نے اگر کسی سے مات کھائی ہے
تو وہ شوکت اور صرف شوکت تھے۔

وصل بلگرامی بڑے ہی باوضع انسان تھے۔ ان کی بارعب گھنی داڑھی سے پیچھے ہمیشہ ایک خانقاہی جاہ وجلال موجود رہتا تھا اور وصل میں سے کوئی باور کر سکتا تھا کہ یہ بزرگ صاحب کشف وکرامات نہیں ہیں۔

شوکت بھی دونوں "زرد کوٹھی" میں رہا کرتے تھے انہیں آئے دن اللہ کے ایسے نیک بندوں سے سابقہ پڑا کرتا تھا جو خدا رسیدہ اور حق شناس اربابِ طریقت کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اسی قسم کے ایک صاحب اکثر شوکت کے پاس آیا کرتے تھے اور نجانے کیوں انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہی مردِ حق آگاہ انہیں منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

شوکت نے پیچھا چھڑانے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کی "طلبِ حق" نے ہمت نہ ہاری۔ شوکت ان سے عاجز ہی تھے کہ ایک پلان بنا ڈالا۔ ان سے کہا ——— دیکھئے صاحب، آپ کہئے تو چلتا ہوں ایک بزرگ کے پاس ——— لیکن اس کی ذمہ داری قطعاً نہیں لیتا کہ وہ آپ کو بیعت کی اجازت دیدیں، وہ بزرگ اس پایہ کے ساتھ ہیں کہ کسی قیمت پر کسی کا پانی بھی نہیں پیتے۔ یہ بات آپ کو بتائے دیتا ہوں پھر نہ کہئے گا کہ مجھے دھوکا دیا ——— وہ آپکے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس کا انحصار محض آپ کی طلب پر ہے ——— اگر آپ میں سچی طلب ہو گی تو ان کے ٹھکرانے کے باوجود آپ کا سر ان کے قدموں پر پہنچ جائیگا۔

ان صاحب نے نہایت پُرجوش الفاظ میں اپنی طلبِ صادق کا یقین دلاتے ہوئے کہا ——— ———

شوکت صاحب ——— بس آپ تو ایک مرتبہ ان بزرگ سے ملوا دیجئے پھر میں خود نپٹ لوں گا۔

یہی تو مشکل ہے بڑی جناب، بعض وقت وہ اتنا جلال میں آجاتے ہیں کہ جو سامنے پڑ گیا ہے اس کی مرمت کر دیتے ہیں۔ شوکت نے بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ نہیں سمجھایا ——— مگر انہوں نے ایک نہ سُنی اور شوکت نے اقرار کر لیا ——— ———

آپ کو ان تک پہنچا دوں گا ——— آگے آپ خود جانیں۔

سوچے ہوئے پلان کے مطابق دوسرے دن شوکت وصل کے یہاں پہنچے اور نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ منہ لٹکا کر ان صاحب کا تذکرہ کیا ——— ان سے کہا کہ ...... صاحب میرے پاس آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آپ نے کس بہروپ سے ان کا عقدۂ ثانی کرانے کا وعدہ کیا تھا، وہ بیچارے بہت پریشان ہیں کہتے تھے کہ کئی مرتبہ وصل صاحب کے پاس گیا، مگر وہ برابر ٹال رہے ہیں۔ وصل نے جیسا کہنا چاہئے اس بات سے قطعاً انکار کیا ——— اور کہا کہ میں کسی ایسے آدمی سے واقف نہیں ہوں اور نہ میں نے کسی سے اس قسم کا وعدہ کیا ہے اور .... اور .... !

لیکن شوکت نے کچھ اس انداز میں وصل سے گفتگو کی کہ وہ برہم ہو گئے۔ شوکت چاہتے ہی یہی تھے بڑی متانت کے ساتھ یہ کہہ کر وصل کے یہاں سے خفا ہو آئے۔

خیر ——— میں ان کا اور آپ کا سامنا کرا دوں گا، آپ جانیں اور وہ ——— !

اور یہی ہوا "ان حضرت" کو لے کر شوکت عین اس وقت "بھوز وارہ ہاؤس" (قیصر باغ) پہنچے، جب وصل نماز پڑھ رہے تھے۔ شوکت نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ آپ کے بارے میں میں نے ان بزرگ سے کہہ تو دیا ہے مگر وہ "رجوع" ہوتے نظر نہیں آتے میں آپکو وہاں پہنچا تو دوں گا مگر مجھے ایک بہت ضروری کام ہے اس لئے ٹھہر نہ سکوں گا۔ آپ ان سے صرف اتنا کہہ دیجئے گا کہ شوکت تھانوی نے بھیجا ہے ——— اور اگر وہ "رجوع" نہ ہوں تو آپ بلا تکلف ان کے قدموں پر سر رکھ دیجئے گا۔ اگر خدا کو منظور ہے تو انشاء اللہ

[illegible]

شوکت [illegible]

[illegible]

شوکت تھانوی صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

شوکت کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سے بہت کچھ قریب نظر آتا ہے

[illegible]

[illegible]

مردِ خوش گفتار

نسیم ممتاز سیّد

چند شخصیتیں ایسی ہیں۔ جن سے لیے آسودہ ... ذہن واقعی ... عقیدت ہے۔ ... بھی ہے۔ مگر ذہن ... دستور بھی ہے ... بھی ہے۔ وہ بھی ہوتا رہے گا۔ کئی شخصیتیں مر کر بڑی ہو جاتی ہیں۔ اور بہت سی شخصیتوں کو تو ان کی زندگی میں پرکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ لیکن کسی کی زندگی ہی میں اسے سمجھ لیا، اور اس میں ڈوب کر اس شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا موزوں ترین طریقہ ہے۔ اور شوکت صاحب مرحوم کے ساتھ میرے تعلق کی یہی نوعیت ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تو تعلقات کے یہ نقوش زیادہ گہرے ہوتے گئے اور آخر وہ مقام آ گیا۔ جہاں دوئی مٹ جاتی ہے۔ ان چھوٹی سی سطری باتوں میں جہاں کہیں آپ مجھے پائیں گے۔ تو اس میں میرا قصور نہیں۔ بلکہ اس کی تمام تر ذمہ داری مرحوم پر آتی ہے۔ جن کے خلوص اور جن کی شفقت نے بتدریج مجھے ان سے بہت قریب کر دیا تھا۔

۲ مارچ ... کو ... ایک دوست نے پیغام دیا کہ شوکت صاحب ... کے جا... سے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے لاہور پہنچ رہے ہیں۔ چونکہ اگلی ہی صبح وہ واپس چلے جائیں گے۔ اس لیے ان کی خواہش ہے کہ میں ان سے رات کو اوپن ایئر تھیٹر میں ضرور ملوں۔ ... وہ مشاعرے میں جانے کا ... تھا۔ لیکن شوکت صاحب کا پیغام ملنے کے بعد شرکت ضروری معلوم ہوئی۔ خصوصاً اس خیال سے کہ ان سے آخری ملاقات کوئی ۶ ماہ پہلے ہوئی تھی۔ اور ان کا لاہور آنا کچھ ایسا آسان بھی نہ تھا۔

مشاعرے کا وقت غالباً شام کے سات بجے دیا گیا تھا۔ میں کوئی آٹھ بجے پہنچا۔ لیکن مشاعرے کی کارروائی نو بجے تک بھی شروع نہ ہوئی۔ شعرا اسٹیج پر بیٹھے نظر آئے۔ لیکن ان میں شوکت صاحب کہیں دکھائی نہ دیئے۔ سو وقت گزارنے کے خیال سے میں چند احباب کے ساتھ ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ نہ جانے شوکت صاحب کس وقت پہنچ گئے۔ میں نے جب دیکھا تو یہ صدرِ مشاعرہ محترم عبدالوحید خاں صاحب کے ساتھ بیٹھے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

مشاعرہ کوئی رات کے بارہ ... بجے ختم ہوا۔ تو میں ان سے ملنے اسٹیج پہ پہنچا۔ ان سے جولائی سنہ ۶۲ء کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت کے شوکت تھانوی اور موجودہ شوکت تھانوی میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوا۔ نحیف و نزار شاید بدہضمی میں مبتلا اور بجھے بجھے۔ یوں محسوس ہوا۔ گویا یہ شوکت تھانوی نہیں۔ بلکہ وہ پتلا ہیں جسے کسان کھیتوں میں

ان بیماری کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ کہ پرانے عارضے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ شوکت صاحب لاغر اندام تو شروع سے تھے اور کسرتی جسم کے مالک وہ کبھی نہ تھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کی صحت عام آدمیوں سے ہمیشہ بہتر ہی دیکھنے میں آئی تھی۔ جگر کی کمزوری تو علاوہ ہوگا کہ اپنی صحت اور اپنے جسم کے اعتبار سے وہ اپنی اصل عمر سے کم عمر ہی دکھائی دیتے۔ ان کی صحت کو اس درجہ انحطاط میں دیکھ کر دل کو دھچکا سا لگا۔ [illegible] دکھی اور دلفگار ہو گئے۔ شوکت صاحب بلا کے ذہین انسان تھے۔ [illegible] کہنے لگے " یاد رکھو ہم بیماری میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ لیکن پریشان نہ ہو۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ اور تمھاری شادی میں شرکت کروں گا سہرا پڑھوں گا اس کے چند شعر لکھ بھی چکا ہوں "

ہوگا، حالانکہ اس وقت تک شادی میں [illegible] کر دیں۔ شوکت صاحب نے میرے والد محترم اور چچا جان کی خیریت پوچھی۔ میں نے کہا وہ دونوں تو خود مجھ سے اکثر آپ کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں کہ آپ کب واپس آ رہے ہیں۔ لہٰذا راولپنڈی جانے سے پہلے کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔ اس پر انھوں نے اپنی مجبوری بیان کی اور بتایا کہ اگلی ہی صبح وہ [illegible] اس لیے میں نے کہا کہ صبح جا کر کیا کیجئے گا شام کے جہاز سے چلے جائیے گا۔ اتنی دیر میں محترم سید محمد جعفری صاحب بھی پہنچ گئے۔ بمشکل شوکت صاحب اس بات پر رضامند ہوئے کہ اگر جعفری صاحب کو بھی ساتھ لے چلیں تو وہ دونوں ہمارے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا کر تین بجے روانہ ہو جائیں گے۔ رات کے ایک بجے کے قریب ہم تینوں [illegible] کی پہاڑی سے نیچے اترے۔ پلازا سینما کے چوک تک پیدل پہنچے ہوں گے کہ ایک موٹر رکشا مل گئی۔ میں نے ان دونوں کو اس میں روانہ کیا اور اگلی صبح دس بجے ان سے ملنے کا پروگرام بنایا۔

شوکت صاحب اور جعفری صاحب کو رخصت کر کے میں چہل قدمی کرتا اپنے گھر روانہ ہوا۔ گھر پہنچنے تک میری آنکھوں کے سامنے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک کا وہ طویل عرصہ بجلی کی سی سرعت سے گھوم گیا۔ جب میرا بیشتر وقت شوکت صاحب کی پُرلطف صحبت میں گزرتا تھا۔ یاد نہیں آ رہا۔ ان سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ غالباً تقسیم ہند سے ذرا پہلے یہ پنچولی آرٹ پکچرز میں کچھ عرصہ ملازم رہے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ چند ہم جماعتوں نے فلم ”شیریں فرہاد“ کی شوٹنگ دیکھنے کی فرمائش کی۔ اور میں انھیں مسلم ٹاؤن والے اسٹوڈیو لے گیا۔ اتفاق سے اُسی دن سٹ پر کمپنی کے مالک سیٹھ دلسکھ۔ ایم پنچولی (آنجہانی) بھی موجود تھے۔ انھوں نے میرا تعارف شوکت صاحب سے کرایا۔ جو اس فلم کے مکالمے اور گانے لکھ رہے تھے۔ بحیثیت مزاح نگار میں ان کا نام بچپن سے سنتا چلا آیا تھا۔ اور ان کا مداح تھا۔ لہٰذا ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تعارف ہو جانے کے بعد شوکت صاحب نے میرے متعلق فرمایا۔ کہ میری ان کی کچھ عزیزداری بھی ہوتی ہے اسی طرح چند اور مختصر ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔ جن کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔

۱۹۴۷ء کے نومبر میں جب ریڈیو پاکستان لاہور سے قومی تعمیر کا ایک پروگرام ”پاکستان ہمارا ہے“ نہایت پابندی اور باقاعدگی سے روزانہ نشر ہونا شروع ہوا۔ تو بحیثیت مصنف اور ”ریڈیو وائس“ مجھے ان پروگراموں میں اکثر

حصہ لینے کا موقع ملا۔ شوکت صاحب بھی اس پروگرام سے منسلک تھے۔ لہٰذا ہر دوسرے تیسرے ہفتے ملاقات ہوتی رہی۔ ان ملاقاتوں میں بزرگی اور خوردی کی حد فاصل قائم رہی۔

شوکت صاحب نہایت جامہ زیب انسان تھے۔ عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کا خیال آتے ہی ذہن میں جاتا ہے کسی ایسے شخص کی طرف جس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہو۔ شیو نہ بنایا ہو۔ کپڑوں کی طرف سے انتہائی لاپرواہی برتی جا رہی ہو۔ مگر شوکت صاحب اس اعتبار سے نہ ادیب تھے نہ شاعر۔ کپڑے کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہن لی تو وہ ان پر سج گئی۔ سوٹ پہنا تو وہ ان پر کھل گیا۔ اپنے لباس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کا خیال رکھتے تھے۔ سوٹ پہن کر جانا ہو۔ تیار ہو کر بیٹھے۔ لیکن جس وقت یہ خیال آیا کہ موزے یا ٹائی کا رنگ سوٹ کے لیے موزوں نہیں۔ اسی وقت جلسے چھوڑ گئے مال روڈ۔ کرشن بلڈنگ یا انارکلی پہنچے۔ اور جب تک مرضی کی ٹائی یا موزہ حسب منشا نہ لے لیا۔ کھانے پر نہ گئے۔

شوکت صاحب جس قدر محفل باز تھے بہت کم ہوں گے۔ ان کی شوخیاں زیادہ رنگینی لیے اور نفاست کے ساتھ محدود ہوتی تھیں۔ "قاضی جی" کا پروگرام ریڈیو پر جب سے شروع ہوا تھا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سننے والے اسے غیر معمولی دلچسپی سے سنتے اور قاضی جی کا رول ادا کرنے والے شوکت تھانوی کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے خواہشمند رہتے۔ سردیوں کی ایک شام تھی۔ ہم لوگ ریہرسل سے فارغ ہو کر ایک نمبر اسٹوڈیو میں آ گئے۔ پروگرام شروع ہونے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے کہ شوکت صاحب کے ایک بہت قدیم اور عزیز دوست اسٹوڈیو میں تین خواتین کو لے کر آن پہنچے۔ فرمانے لگے: "جناب شوکت! تم نے تو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ قاضی جی کا پروگرام کیا شروع کیا۔ ہم عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ جسے میرے تمہارے تعلقات کا علم ہے۔ وہ بس یہی فرمائش کرتا ہے کہ ہمیں "قاضی جی" سے ملوا دو۔" یہ کہہ کر چپ ہوئے تو انہوں نے شوکت صاحب کا تعارف ان خواتین سے کرایا۔ اس کے بعد فرداً فرداً ان خواتین کو ان سے متعارف کراتے ہوئے بولے: "ان سے ملو۔ یہ ہیں ممتاز۔ اور یہ ہیں ان کی صاحبزادی اعجاز۔" ابھی تیسری خاتون کا نام نہ لینے پائے تھے کہ شوکت صاحب جھٹ بول اٹھے: "ان کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ بس میں سمجھ گیا۔ ان کا نام ہو گا۔ "دارالاشاعت"۔ (اشارہ میرے دادا جان مرحوم و مغفور شمس العلماء مولانا سید ممتاز علی صاحب۔ ان کے صاحبزادے یعنی میرے چچا سید امتیاز علی صاحب تاج اور ہمارے ادارے "دارالاشاعت پنجاب" کی طرف تھا) وہ خواتین تو غالباً اس نکتے کو سمجھ نہ سکیں۔ لیکن جو صاحب تعارف کرانے آئے تھے۔ وہ چونکہ اس لطیفے کے پس منظر سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا بے انتہا محظوظ ہوئے۔

شوکت صاحب نے بلبل کا سا دل پایا تھا۔ دوسروں کی تکلیف سے بہت متاثر ہو جاتے۔ سنہ ۵۸ء کی گرمیوں میں خدا بخشے میری والدہ ماجدہ موذی مرض الموت میں گرفتار ہوئیں۔ اس تعلقِ خاطر کے پیش نظر جو شوکت صاحب کو ہمارے خاندان بھر سے تھا۔ یہ اکثر ان کی مزاج پرسی کے لیے آتے۔ وہ کینسر کی مریضہ تھیں۔ ڈاکٹر، حکیم، ہومیو پیتھس جواب دے چکے تھے۔ لیکن شوکت صاحب آتے گھنٹوں بیٹھتے۔ لطیفے سناتے۔ باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے۔ نتیجہ یہ کہ چارہ گروں کی دوائیں

در اصل چند دوستوں کی محفلیں جہاں بیٹھ کر [illegible] ہوتی تھیں۔ وہاں شوکت صاحب کی [illegible] ہوتی۔ [illegible]
کے [illegible] اور [illegible] ہو جاتی۔

[illegible] شوکت صاحب
[illegible] تھے۔ [illegible] شوکت صاحب [illegible]
پروگرام [illegible]
پروگرام [illegible] کر سکے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] رہیں۔

[illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible]
میں ایک [illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible]
دیکھا کیا ہوں کہ ابا جان [illegible] تشریف لا رہے ہیں۔ شوکت صاحب [illegible] بھائی جان [illegible]
انھیں [illegible] دیکھا۔ [illegible] بیگم کو [illegible] شریف
لائے ہیں۔ جلدی سے [illegible] بنا کر لاؤ۔ [illegible] ابا جان نے جو مجھے بیٹھے دیکھا۔ [illegible]
جناب بھی آئے ہوئے ہیں۔" ادھر شوکت صاحب [illegible] کہے جا رہے ہیں۔ کہنے لگے: "جانی جان۔ کچھ نہ پوچھئے آج آپ
کے آنے سے کس قدر خوشی ہوئی ہے۔" اس پر ابا جان بولے "جی۔ میرے آنے سے تم کب خوش نہیں ہوتے۔ جو آج کی
خوشی کو کوئی خاص اہمیت دو۔" شوکت صاحب بولنے لگے "اس میں تو کوئی شبہ نہیں بھائی جان۔ آپ کے تشریف
لانے سے ہمیشہ دلی خوشی ہوتی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ آج جو خاص خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی۔"
ابا جان نے اس "خاص خوشی" کی وجہ پوچھی۔ تو وہ بولے "خوشی اس بات کی ہے بھائی جان کہ میں شوکت تھانوی ہوں۔
کوئی طوائف نہیں۔ ورنہ باپ بیٹے آج ایک ہی "کوٹھے" پر پکڑے جاتے۔ شوکت صاحب کا یہ کہنا تھا کہ محفل زعفران
زار بن گئی۔ جگر صاحب اور خود ابا جان نے انھیں بہت داد دی۔

شوکت صاحب کو جب کوئی بات سوجھتی۔ کوئی فقرہ چست کرنا چاہتے۔ کوئی پھبتی کسنا چاہتے۔ تو پھر چھوٹے

ذات کی مہر ... کرے۔ ان کی بات کرنے کا [illegible] ... جو ہمیشہ تعریفی ہوتا۔ قصداً کسی کی دلآزاری نہ کرتے تھے۔ [illegible]
مگر کبھی ان کی فطرت [illegible] کو احساس نہ [illegible]

شوکت [illegible] بات [illegible] کہ [illegible] نہ کرتے [illegible] بھی نگاہ [illegible] کر جاتے۔ شوکت [illegible] کا انداز [illegible] کرتے تھے۔ [illegible] ان کی شخصیت کا ایک [illegible] پہلو [illegible] تھا۔ [illegible] جب [illegible] ہو گئے۔ [illegible] گھر [illegible] تھا [illegible] میں [illegible] کی [illegible] صاحب [illegible] ہوتے ہیں۔ لیکن جب [illegible] کی [illegible] شروع ہوئی [illegible] گھر [illegible] مجھے [illegible] فرمایا۔ کہ [illegible] کچھ [illegible] میں [illegible] لیکن [illegible] بات [illegible] مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے [illegible] پوچھا: [illegible] بات [illegible] ان کی [illegible] بہن [illegible] کی [illegible] ہے [illegible] دوران [illegible] میں نے [illegible] لگے: "آپ بھی [illegible] ہیں [illegible] آپ نے [illegible] کی [illegible] رنگ کی [illegible] ہے [illegible] کے رنگ [illegible] ہو [illegible] دو [illegible] جو [illegible] رنگ کے [illegible] ہو [illegible] گئے [illegible] نہ [illegible]

احمد حسن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان۔ سابق [illegible] نے کراچی میں نئی کوٹھی [illegible] لی تھی۔ انھوں نے وہ ایک بار [illegible] کی۔ کہ کسی [illegible] ہے [illegible] پھولوں [illegible] کراچی [illegible] ہوں۔ [illegible] کہ کوئی جان پہچان والا کراچی جا رہا ہے۔ تو ان کے ہاتھ پودے روانہ کر دوں۔ کہ ایک دن [illegible] کی صاحبزادی [illegible] میری عزیزہ ہیں [illegible] کا خط [illegible] وقت مجھے [illegible] شوکت صاحب کو ملا۔ [illegible] گلاب کی جس قدر [illegible] اچھی [illegible] مل سکیں۔ ان کے [illegible] ہم دونوں [illegible] خصوصاً کالے گلاب کے [illegible] واپس کراچی جاتے ہوئے [illegible] لاہور [illegible] ٹھہریں گے۔ واپسی کی تاریخ اور [illegible] ہمیں مطلع کر دیں گی۔ [illegible] انھیں لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیئے جائیں۔ [illegible] خط [illegible] ہم دونوں کو ملا۔ خط پہنچتے ہی شوکت صاحب کا فون آیا کہ میں ان سے [illegible] ہوں۔ تاکہ لاہور کے [illegible] اور نرسریوں کو کھنگالا جائے۔ اور اچھے سے اچھے گلاب کے جو پودے دستیاب ہو سکیں۔ وہ فراہم کئے جائیں۔ سارا دن ہم دونوں [illegible] مارے مارے پھرے۔ جس نرسری پر جا کر کالے گلاب کے پودے طلب کرتے۔ نرسری والے ہمارا منہ دیکھتے۔ گویا اس سے کوئی ایسی چیز طلب کی جا رہی ہے جس کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ کالے کے علاوہ باقی جس قدر قسمیں ممکن ہو سکیں انھیں ہم نے حاصل کر لیں۔

سلمان صاحب قبلہ تو میرے بے انتہا شفیق بزرگ تھے۔ انھیں سمجھایا جا سکتا تھا۔ لیکن زرینہ سے نمٹنا آسان نہ تھا۔ ایک طرف وہ میری عزیزہ بہن تھیں تو دوسری طرف شوکت صاحب کی لاڈلی بھتیجی۔ میں نے شوکت صاحب سے کہا۔ کہ آپ کی اور میری دن بھر کی دوڑ دھوپ رائگاں گئی۔ زرینہ بڑی نٹ کھٹ ہیں۔ اچھے سے اچھے جس قدر پودے

[illegible] حاصل کر لیے۔ [illegible] کی نہیں [illegible] آخر کی [illegible] شوکت صاحب [illegible]

ایک بار شوکت صاحب [illegible] شوکت صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible] ان کی شکایت رفع ہو گئی۔

شوکت صاحب کی [illegible] وہ ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لوگوں کی سفارشیں کرتے رہتے ہیں۔ [illegible] ان کی ذات سے لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ بہت سے ضرورت مند انہیں [illegible] شوکت صاحب [illegible] اپنا کام نکال لیے۔ لیکن خود اپنی ذات کے لیے انھوں نے کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کیا۔ [illegible] ملازمت چھوڑنے اور اخبار [illegible] جنگ [illegible] ہونے کے بعد [illegible] ایک بہت اچھی [illegible] سرکاری ملازمت حکومت کے [illegible] آنے کا مرحلہ [illegible] انھوں نے فوراً شوکت صاحب کو بتایا۔ [illegible] متعلقہ منسٹر [illegible] حکام سے مل کر زبانی بات چیت کریں۔ شوکت صاحب ان سے [illegible] کہہ کر رخصت ہوئے۔ کہ وہ فوراً منسٹر صاحب سے ملتے ہیں۔ لیکن ان سے ملنے کے بجائے سیدھے ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔ اور [illegible]

۱۹۵۲ء کی [illegible] میں محمود نظامی صاحب مرحوم لاہور ریڈیو اسٹیشن کے ریجنل ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی طبیعت میں بھی بلا کی شوخی تھی۔ پھبتی کسنے اور فقرہ چست کرنے میں کسی سے کم نہ تھے۔ ہم دونوں کے حلقے میں نظامی صاحب بھی شامل ہو گئے۔ اور ہمارا یہ اتحاد ثلاثہ اگست ۱۹۵۳ء تک قائم رہا۔ شوکت صاحب اور نظامی صاحب کھانے کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ادھر شام ہوئی۔ ادھر ہم تینوں اور ان دونوں کی بیگمات کام و دہن کی سیرابی کے لیے مل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بتایا۔ کہ چونے منڈی کی کسی دکان پر کباب بہت اچھے بنتے ہیں۔ تو ہم سب بلا سوچے سمجھے ادھر روانہ ہو گئے۔ دہلی دروازے کے اندر داخل ہو کر معلوم ہوا۔ کہ بازار میں کار نہیں جا سکتی۔ تو اسے کسی مناسب جگہ پارک کر کے ہم تینوں پیدل چل کھڑے ہوئے۔ دکان پر پہنچ کر گرم گرم کباب پلیٹوں میں رکھواتے اور کار کا رخ کرتے کباب [illegible] تو اسے رفع کرنے کو کسی مشہور حلوائی کی دکان کا سہارا لیتے۔

اس زمانے میں رمضان بھری گرمیوں کے مہینے میں آیا۔ ہم تینوں نہایت پابندی سے روزہ رکھتے۔ دو چار دنوں کے بعد گرمی کی شدت میں کمی ہو گئی۔ مگر ہم تینوں برابر [illegible] ۔ کسی روز بدلی [illegible] میں بارش کا پہلا قطرہ کوئی اور [illegible] ۔ [illegible] کی [illegible] کریں۔ مگر تینوں ہی ہٹ کے پکے ثابت ہوئے کہ روزہ رکھتے رہے پورا رمضان شریف گزر گیا۔ گرمیوں کے دنوں میں صبح سے بارہ ایک بجے کا وقت تو جوں توں دفتری مصروفیات میں گزر جاتا۔ لیکن دو پہر سے شام تک کا وقت [illegible] کے مترادف ہوتا۔ جانے ہم میں سے کس نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ روزانہ سہ پہر کا [illegible] شو دیکھا جائے۔ تجویز کا یہ [illegible] ہونا تھا۔ کہ وہ منظور ہو گئی۔ اور [illegible] نہایت پابندی اور باقاعدگی سے اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔ ادھر گھڑی نے تین بجائے ادھر ہم تینوں اور ان دونوں کی بیگمات نے سینما کا رخ کیا۔ [illegible] سے غرض فقط اتنی تھی۔ مقصد یہ وقت گزر رہا تھا۔ [illegible] نصف [illegible] ہو گئے۔ مزا آیا تو دیکھ کر، ورنہ [illegible] کر رہا۔ گھر آتے آتے افطاری کا وقت ہو جاتا تھا۔

[illegible] کے بعد [illegible] اور [illegible] سے [illegible] کرنے کو ہی ڈرائیو اور [illegible] آئس کریم کا سہارا لیا۔ نظامی صاحب نے [illegible] کر۔ جانے کیسے ڈھونڈ نکالا کہ وہاں سنگھ کالج کے دروازے کے پاس [illegible] دل محمد روڈ [illegible] نکڑ پر ایک آئس کریم بنانے والا اپنی دوکان ایک ریڑھی پر ہر شام سجاتا ہے۔ بقول نظامی صاحب [illegible] آئس کریم سب سے اچھی اور سب سے سستی تھی۔ یہ معلوم ہونے کی دیر تھی۔ کہ ہم پانچوں نے ہر شام وہاں دھاوا بولنا شروع کر دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ آئس کریم اچھی بھی تھی اور سستی بھی۔ لیکن نہ جانے وہ اس میں ہر روز ایک ہی ایسنس ڈالا کرتا تھا کہ مزا روزانہ یکساں ہوتا۔ شوکت صاحب کہتے تھے یہی بات گورنمنٹ یونیورسٹی کے ہوسٹل کے کھانے میں تھی۔ مرغی سے لیکر ہر موسمی سبزی تک گوشت میں پکتی تھی۔ لیکن کھانے میں مطلق فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔

جب روزانہ ایک ہی طرح کی آئس کریم کھا کھا کر تنگ آ گئے۔ تو ہم نے آئس کریم والے سے کہا۔ کہ "بھئی آم کی آئس کریم کیوں نہیں بناتے" لیکن وہ ٹالتا رہا۔ غالباً اس لیے کہ آموں کا سیزن شروع نہ ہوا تھا۔ اور وہ خاصے مہنگے تھے۔ ایک دن جو ہم پہنچے۔ تو آئس کریم کھا کر واقعی بہت لطف آیا۔ ایسے داد دی اور اس سے پوچھا: "اس میں خاص بات کیا ہے؟" وہ بولا "صاحب آج ہم نے اس میں بہت سے آم "گیرے" ہیں" شوکت صاحب برجستہ بولے "نظامی صاحب۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام کی مثل کا مفہوم در اصل آج سمجھ میں آیا" شوکت صاحب کو اس کے "گیرے" کہنا بہت پسند آیا اور جب پہنچے تو آئس کریم سے زیادہ وہ اس اصطلاح سے لطف اندوز ہوتے۔ عرصے تک ہم [illegible] ملانے یا ڈالنے کے مفہوم کو "گیرے" ہی کہتے رہے۔

ہم تینوں کی دوستی اور قربت لوگوں کے لیے حیرت کا موجب تھی۔ خصوصاً ان دونوں سے میری قربت۔ کہ میں نہ ان کا ہم سن۔ نہ ان دونوں کی طرح علم و ادب کی دنیا میں میرا نام۔ بہرحال دوستی تھی۔ اور دونوں کے آخری دم تک قائم رہی۔ اب آپ انہیں میرے بزرگ نما دوست یا دوست نما بزرگ کچھ ہی سمجھ لیجئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں۔ ان کی بیگمات۔ ان کے بچے۔ ان کے بزرگ سب کے سب مجھے "بھائی" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میں جگت بھائی کیوں کر ہو گیا

[illegible] میں نہ ہوتا۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شوکت صاحب [illegible] بے حد تکلیف
[illegible] بات پر مجھے بڑا اگر [illegible]
[illegible] مجھے معلوم
[illegible]
[illegible] مجھے بہت اچھا موقع [illegible]
مجھے بخشش [illegible] شوکت صاحب [illegible] شوکت صاحب
[illegible]
[illegible] بھی مجھے یاد کرتے [illegible]

شوکت صاحب کی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کی تصویر بنا [illegible] میری تصویر [illegible]
شوکت صاحب [illegible] دوسرے
جو لوگ صفائی کا خیال نہیں رکھتے انہیں وہ کس کر عبرت دلاتے تھے [illegible] ان کی [illegible] یہ بات
بالکل درست تھی۔ لٹوں کی صورت میں بکھرے ہوئے بال۔ علی المسیب ترشی ہوئی داڑھی۔ چہرہ اور بال گرد سے اٹے ہوئے۔ نہایت لحیم شحیم۔ اس پر ایک نہایت موٹا کمبل اوڑھے ہوئے۔ جڑا ماتے کے بہانے وہ صاحب خود بھی بے اختیار ہنس پڑے۔ اور سامعین کی ہنسی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

شوکت صاحب نے ڈریس سوٹ بھی بنوا رکھا تھا۔ لیکن بیچاروں کو اس کے استعمال کا موقع بہت کم ملتا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ایسے پرتکلف ڈنر بہت کم ہونے۔ جہاں ڈنر جیکٹ کی پابندی ہوتی۔ لہٰذا شوکت صاحب نے سال میں ایک مرتبہ پہننے کا موقع ضرور نکال لیتے۔ دو تین سال ہمارا یہ معمول رہا۔ کہ ۳۱ دسمبر کی رات کو شوکت صاحب ڈریس سوٹ زیب تن کرتے۔ اور ہم دونوں ریلوے کے برٹ انسٹی ٹیوٹ جاتے اور وہاں نئے سال کی آمد مناتے۔ ان کی تفریحات بہت معصوم قسم کی تھیں۔ دو تین گھنٹے کے لیے ڈنر سوٹ پہنتے۔ بو باندھتے۔ رات کے ساڑھے بارہ ایک بجے تک برٹ کے ہال میں دوسروں کو ناچتے۔ شراب پیتے۔ ادھم مچاتے اور گرتے پڑتے دیکھ کر خوش ہو جاتے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں ایک دن میں شوکت صاحب سے ملنے گیا کہ ان سے چند رسالے چھپوانے کے
سلسلے میں مفید مشورے لوں۔ شوکت صاحب نہ صرف بہت اچھی طرح پیش آئے بلکہ اس کے ساتھ ہی
مضمون لکھنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ سائز کی کتابت اور طباعت کا پروگرام پوچھا کہ کس دن تک مضمون پہنچ جائے
کہ رسالہ عین بروقت چھپ سکے۔ مشورہ دیا کہ ملک کے خیر میں آمادہ تھا۔ کہ ان سے جو قابلِ قدر
مجھے ضرور دام میں لاؤں گا۔ لیکن تب انھوں نے مضمون لکھنے کی پیش کش کی۔ وہ صاف بات ہے کہ میں خوابِ پریشان
ان کے متعلق دوسروں کا جاننا اثر پیدا ہے۔ کہ لکھنے لکھانے کے معاملے میں وہ "کاروباری" اور جب تک اور
لیے اپنے عزیز ترین دوستوں کے لیے بھی نہیں لکھتے۔ "پھول" بچوں کا رسالہ تھا۔ اس کے محدود وسائل میں معقول معاوضہ
چھپا دینے کے بعد ان کے شایانِ شان معاوضہ کی ادائیگی میرے لیے ممکن نہ تھی۔ اس سے پہلے کسی بچوں کے سالگرہ نمبر
کسی خاص نمبر کے لیے میں نے ان سے فرمائش کی تھی۔ تو انھوں نے ازراہِ کرم بلا معاوضہ مضمون میرے حوالے کر دیا۔
اب جو انھوں نے باقاعدگی سے لکھنے کی حامی بھری۔ تو مجھے اور بھی مناسب یہی معلوم ہوا۔ کہ انھیں یاد دہانی کراؤں۔
خود اس درجہ مصروف انسان ہیں۔ کہ خود ان کی طرف سے یاد رکھنے کی توقع ہو نہیں سکتی۔

میں نے مضمون کے لیے جو آخری دن انھیں بتایا تھا۔ اس دن دوپہر کو ریڈیو سٹیشن سے ان کا فون آیا۔
کہاں غائب ہو تمھاری امانت رکھی ہے۔ آکر لے جاؤ۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ کہ اس امانت سے ان کی مراد مضمون
ہے۔ میں کچھ مصروف تھا۔ ان سے کہا۔ اگلے دن حاضر ہوں گا۔ لیکن انھوں نے تاکید فرمائی۔ کہ شام کو ضرور گھر آؤ۔ لہٰذا میں
شام کو ان کے گھر پہنچ گیا۔ جاتے ہی انھوں نے اپنے بیگ (جو ان کے سوٹ کیس کی حیثیت رکھتا تھا اور ہر وقت ان کے
ساتھ رہتا تھا) میں سے "پھول" کے چند صفحوں کا مضمون نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے ان کا شکریہ
ادا کیا۔

اگلے دن خوشنویس کو کتابت کے لیے دیتے وقت جو دیکھتا ہوں تو آخر میں "باقی پھر" لکھا ہے۔ اگلے ہفتے اسی
مخصوص دن پھر میں نے ان سے ملنا چاہا لیکن ان کا فون آیا۔ اور انھوں نے پھر بلایا۔ اور مضمون کی دوسری قسط
میرے حوالے کی۔ جب اسی طرح چار قسطیں شائع ہو گئیں۔ تو ایک دن ہمت کر کے میں نے معاوضے کی بات چھیڑی۔ آپ
کو یقین ہے کہ وہ ایکدم برافروختہ ہو گئے کہ "اگر معاوضے کے لیے مضمون لکھاتا ہے۔ تو لاہور میں بے شمار لکھنے والے پڑے
ہیں۔ ان سے لکھواؤ۔ صاحبزادے۔ کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے پیسے کی بات کی تو میں مضمون لکھنا بند کر دوں گا۔"
اور ۱۹۵۳ء اگست سے ۱۹۵۴ء تک شوکت صاحب بہت پابندی اور باقاعدگی سے "پھول" کے لیے ہر مہینے
مضمون لکھتے رہے۔ بلکہ ایسا ہوا کہ مصروفیت کے سبب دن میں انھیں لکھنے کا موقع نہ ملا۔ اور آخری دن سر پر آ گیا۔
چونکہ تکلف تو درمیان سے اٹھ چکا تھا۔ لہٰذا میں انھیں مضمون لکھنا یاد دلاتا۔ ریڈیو اسٹیشن سے "قاضی جی" کا پروگرام
ختم ہونے کے بعد مجھے شام کو اپنے ساتھ گھر لے جاتے۔ وہاں جا کر مجھے اپنی بیگم اور بچیوں کے پاس بٹھا دیتے اور خود
دوسرے کمرے میں چلے جاتے۔ میں سمجھتا ممکن ہے کپڑے تبدیل کرنے گئے ہوں۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر یہ تازہ تازہ

[illegible] بھیجتے تھے۔ اس [illegible] میں مجھے [illegible] لکھ بھیجتے۔

ان کا مضمون ایک ہی نشست میں [illegible]
[illegible] کے رگوں کا خون اس بلا کا تھا [illegible]
[illegible] پانچ سے ڈائری لکھنا شروع کر دیتے [illegible] مجھے بھی ڈائری
لکھنے [illegible] کوئی ڈیڑھ سال تک [illegible]
[illegible] مشتری کے نام سے [illegible] شوکت صاحب
[illegible] ریڈیو پاکستان [illegible]

اگر شوکت صاحب [illegible] بیٹھ جاتے تھے۔ مگر
[illegible] موضوع طور پر انھیں [illegible]
[illegible] مضمون لکھنے نہ پاتے تھے [illegible] مجھے [illegible]
[illegible] کوئی [illegible] ان کے مضمون [illegible]

[illegible] ان سے قربت میں چھوٹی [illegible]
کی مضمون نویسی کی ابتدا [illegible]
دونوں کو اگر کہیں باہر جانا [illegible]
[illegible] نظامی صاحب مرحوم کو ایک دن بیٹھے بیٹھے جانے کیا سوجھی [illegible] ایک [illegible] رسالے کا [illegible] مجھے
فون کر کے فوراً دفتر پہنچنے کو کہا۔ اور میرے سامنے ایک اسکیم پیش کی۔ کہ تمام ریڈیو سٹیشنوں کی چیدہ چیدہ تقریروں اور
[illegible] مضامین سے مرتب ایک رسالہ نکالا جائے۔ شوکت صاحب اس کے ایڈیٹر ہوں [illegible] ناشر [illegible] نظامی
صاحب اس رسالے اور ریڈیو پاکستان کے درمیان رابطہ افسر ہوں۔ شوکت صاحب نے [illegible] اس کا نام [illegible] تجویز
کر دیا۔ اسی دن محترم ذوالفقار بخاری صاحب کو تمام روئداد لکھی گئی۔ چند دنوں بعد بخاری صاحب کا جواب آیا کہ
خیال اچھا ہے۔ عنقریب لاہور آ رہا ہوں۔ مزید مشورہ اسی وقت ہو گا۔ لیکن بخاری صاحب لاہور جلد نہ پہنچ سکے
اور اس طرح یہ اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔

راولپنڈی میں میرے اور شوکت صاحب کے ایک مشترکہ دوست عطاء اللہ ملک ہیں [illegible] ان کا عہدہ میجر
کا ہے۔ لیکن علم و ادب کے میدان میں اگر فیلڈ مارشل نہیں تو کم از کم انھیں میجر جنرل ضرور کہا جا سکتا ہے۔ خود مضمون نہیں لکھتے
لیکن اچھے مضمون کی دل سے قدر کرتے اور داد دیتے ہیں۔ خود شعر نہیں کہتے لیکن اچھے شعر سن کر پھڑک اٹھتے ہیں۔ ۵۳ء
سے [illegible] تک انھیں ہر سال دورہ پڑتا۔ اور یہ راولپنڈی میں مشاعرہ کرتے۔ مشاعرہ کیا [illegible] ہوتا تھا۔ کئی
نشستوں پر مشتمل۔ ایک غزل کی محفل ہے۔ تو دوسری نشست نظم کی۔ پھر ایک محفل مزاحیہ شاعری کی۔ ایک نشست افسانے
کی۔ اور آخر میں ایک تنقیدی محفل۔

ملتان صاحب لاہور ہی سے [illegible] مقرر کر رکھا تھا۔ جب تاریخ قریب آئی۔ تو ہم [illegible] اور ہم ان کی طرف سے شعر سے ربط [illegible] اکھیڑ کر [illegible] سے جاتا۔ [illegible] گزرے۔ [illegible] رات [illegible] ساری بات [illegible] گزر جاتی۔

[illegible] میں [illegible] جگر صاحب مرحوم بھی لاہور آئے ہوئے تھے۔ ملتان صاحب ان کی [illegible] اور ان کی محفل میں [illegible] جگر صاحب۔ شوکت صاحب [illegible] محفل سے فارغ ہو [illegible] ملتان صاحب [illegible] کیا۔ بیگم شوکت بھی ساتھ تھیں۔ [illegible] کا فاصلہ کر [illegible] ہوا۔ [illegible] بہت [illegible] خرابی ہو گئی۔ [illegible] پیچھے [illegible] گئے۔ [illegible] سب کی سب [illegible] ایک [illegible] درست کر لی۔ [illegible] ہوئے۔ لیکن وہ درستی وقتی ثابت ہوئی۔ [illegible] پیدا ہوئی۔ [illegible] راستہ آیا۔ [illegible] اور کار اس وقت تک [illegible] پانی ٹھنڈا [illegible] ہو جاتا۔ [illegible] منظر۔ [illegible] عبادت صاحب [illegible] شوکت صاحب۔ بیگم شوکت اور بچیوں کا خیال آتا۔ [illegible] کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ [illegible] صاحب۔ جگر صاحب سے معذرت کرتے۔ [illegible] اس سفر سے وہ ہم دونوں سے زیادہ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

[illegible] رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے پیچھے سے کسی کار کی روشنی دکھائی دی۔ ہم نے اسے ٹھہرایا۔ شکر ہے کار بالکل خالی تھی۔ ڈرائیور کی منت سماجت کی۔ کہ وہ جگر صاحب، شوکت صاحب اور بچیوں کو راولپنڈی تک ساتھ لے جائے۔ [illegible] پیچھے رہ گئے ہیں۔ عبادت صاحب اور [illegible]۔ گھنٹے بھر بعد کار کا انجن ٹھنڈا ہوا۔ تو ہم نے پھر سفر شروع کیا۔

ادھر شوکت صاحب نے راولپنڈی پہنچ کر جو ملتان صاحب کو بتایا۔ کہ ہم اس پریشانی میں گھرے راستے میں ہیں۔ تو وہ بیچارے رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے کسی دوست کی کار مانگ کر ہمیں لینے جہلم کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم گوجر خان سے ذرا آگے پہنچے ہوں گے کہ سامنے سے ایک کار آتی نظر آئی۔ کہ اس کہنے کے خیال سے جو دونوں کاریں آہستہ کی گئیں تو دیکھا ملتان صاحب بیٹھے ہیں۔ گویا گھنٹے بھر میں ہم لوگ بخیریت راولپنڈی پہنچ گئے۔

اگلے روز دن میں محفل جمی۔ نہ جانے اس محفل میں کیا بات شوکت صاحب کو ناگوار گزری۔ کہ ایک دم ان کا موڈ بگڑ گیا۔ مغرب کے قریب ایک مخصوص نشست ہوئی۔ لیکن شوکت صاحب اس میں شریک نہ ہوئے۔ رات کو ملتان صاحب

[illegible] ایک بہت شاندار [illegible] شوکت صاحب کی [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] شوکت صاحب
[illegible] پہنچا ہوں [illegible]
[illegible] سرکاری [illegible]
[illegible] کسی طرح [illegible]
[illegible] ہو گئے

لیکن شوکت صاحب [illegible] واپس ہو جاتے ہیں [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] ان کے [illegible]
شوکت صاحب کی [illegible] صاحب [illegible] شوکت صاحب
[illegible] ایک [illegible] صاحب [illegible] گئے [illegible]
ہے۔

انھیں چار دن بعد ہی راولپنڈی سے واپس آنا تھا۔ شوکت صاحب سے ملنے گیا تو [illegible]
[illegible] پوچھنے لگے کب آئے [illegible] واپسی میں [illegible] تنگ نہیں [illegible] جانے [illegible] کا موڈ [illegible]
[illegible] نے پریشان کیا۔ واپسی پر آپ کا موڈ بگڑ گیا [illegible] بالکل [illegible] آئی [illegible] بہت خوش ہوئے۔
[illegible] یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شوکت صاحب کی [illegible]
[illegible] مرحوم نے میرے نام کی مناسبت سے ایک مسلسل [illegible] شروع کیا۔ یہ پروگرام [illegible]
[illegible] اور اس سلسلے کی کوئی پچاس قسطیں باقاعدگی سے ہر ہفتے نشر ہوئیں۔ شوکت صاحب نے اس کے مرکزی کردار
کے لیے مجھے منتخب فرمایا۔ پروگرام کے نشر ہونے سے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہم ریہرسل کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ ایک
دن جو ہم پہنچے تو معلوم ہوا وہ ایک آرٹسٹ موجود نہیں۔ اگر کوئی آرٹسٹ وقت کی پابندی نہ کرتا تو شوکت صاحب
جھنجھلا جاتے تھے اور ان کا موڈ بگڑ جاتا۔ جب [illegible] ان کی اپنی اصلی حالت پر واپس لانے کو باقی آرٹسٹ باتوں کا سلسلہ شروع
کر دیتے۔ تاکہ ان کا دھیان ادھر سے ہٹ جائے۔ میری جو شامت آئی تو میں نے یوں ہی برسبیل تذکرہ ایک خاتون کا
ذکر چھیڑ دیا۔ اور بتایا کہ عجیب اتفاق ہے کہ مختلف اوقات میں ان کے جن مختلف اصحاب سے تعلقات رہے۔ وہ سب کے
سب "محمد" نام کے تھے۔ میری اس "تحقیق" پر آرٹسٹ حیران ہوئے۔ کہ واقعی ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا خیال
تک نہ آیا تھا۔ شوکت صاحب پروگرام کی طرف سے فکر مند تھے۔ آرٹسٹ پہنچے نہ تھے۔ لہذا انھوں نے میری بات پر کوئی
دھیان نہ دیا۔ ایک ڈرامہ آرٹسٹ نے ان کی توجہ جو میرے اس "انکشاف" کی طرف دلائی۔ تو ان کا موڈ ایکدم درست
ہو گیا۔ مجھے داد دی۔ اور باقی لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا "اس انکشاف کا حق انھیں نہیں۔ تو اور کسے پہنچتا۔ بات یہ
ہے کہ بھائی جان یعنی ان کے والد محترم کا نام بھی تو محمد علی ہے۔ صاحبزادے کو فکر یہ لاحق ہوئی ہوگی کہ نگاہ انتخاب کہیں ان

پھر پڑھے لکھوں کا یہ کتنا تقاضا کر کے مقتدیوں سے گریز اٹھے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ شوکت صاحب زیادہ تر زبانی ہنسی مذاق کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مذاق کیے ہوئے زیادہ عرصہ گزر جاتا۔ تو انھیں ایک عجیب سرور سا ملتا اور بے کلی سی ہونے لگتی۔ ایک دو صاحب کو عملی مذاق کرنے کا موقع مل گیا۔ اور وہ یوں کہ میرٹھ کی مسجد کے ایک قاری صاحب۔ بدقسمتی سے کہیں ان سے ملنے ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔ شوکت صاحب نے انھیں اندر بلا لیا۔ کہنے لگے "حضرت! بڑی عمر ہے آپ کی۔ خدا آپ کو یاد کر رہا تھا۔ بلکہ سوچ رہا تھا کہ میرا کسی طرح آپ سے ملنا ہو۔" مولانا بچارے بہت سادہ لوح انسان۔ پوچھنے لگے: "حضرت! آپ نے شوکت صاحب مجھے کیسے یاد فرمایا؟" شوکت صاحب بولے: "ہوا یہ کہ رات ایک کھانے پر ریلوے کے جنرل منیجر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ صاحب پاکستان اسلامی ملک ہے۔ روزے نماز کا خیال یہاں بھی نہ رکھا گیا۔ تو کہاں رکھا جائے گا۔" جنرل منیجر صاحب بولے "بات تو ٹھیک ہے۔ کوئی عملی اسکیم آپ کے ذہن میں ہو تو بتایئے۔" میں نے اسی وقت جواب دیا کہ صاحب ریلوے سے متعلق مساجد کی ایک کمیٹی بنائیے۔ کم از کم ایک ہیڈ امام اور دس بارہ امام رکھے جائیں۔ جنرل منیجر صاحب کے دل کو یہ بات لگی۔ اور انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد یہ اسکیم تیار کر کے منظوری کے لیے مرکزی حکومت کو بھیج دیں گے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں ہیڈ امام اور نائب اماموں کے نام تجویز کر دوں۔ ظاہر ہے آپ جیسے عالم اور جوان قاری کے ہوتے ہوئے میں کسی اور کا نام کیسے تجویز کر سکتا تھا۔ مولانا اب یوں کیجیے کہ فوراً ریلوے کے ہیڈ کوارٹر آفس چلے جایئے اور جنرل منیجر صاحب سے مل لیجیے۔ بالکل تازہ معاملہ ہے۔ بڑے افسر ہیں۔ زیادہ عرصہ گزر گیا تو انھیں شاید یاد نہ رہے گا۔" مولانا بہت خوش ہوئے۔ فرمانے لگے: "جنرل منیجر صاحب کو فون کر دیجیے۔ وہ اجازت دیں تو میں فوراً چلا جاتا ہوں۔" شوکت صاحب نے یوں ہی ٹیلیفون کا کوئی فرضی نمبر ملایا۔ دیر تک گھنٹی بجی۔ کسی نے فون کا ریسیور نہ اٹھایا تو شوکت صاحب نے پریشان ہو کے ریسیور رکھ دیا اور کہنے لگے: "مولانا! وقت بہت کم ہے۔ ذرا دیر میں دفتر بند ہو جائے گا۔ یہ میرا کارڈ۔ اس پر لکھے دیتا ہوں کہ میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ بس تشریف لے جایئے۔ دیر نہ کیجیے۔ روانہ ہو جائیں۔"

چلچلاتی دھوپ۔ شدید گرمی کا زمانہ۔ دوپہر کا بارہ ساڑھے بارہ کا عمل۔ قاری صاحب نے اپنی سائیکل اٹھائی اور سیدھے ریلوے ہیڈ کوارٹر آفس پہنچ گئے۔ جنرل منیجر صاحب کو کارڈ بھیجا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ شوکت صاحب کی طرف سے کوئی صاحب آئے ہیں۔ انھوں نے فوراً مولانا کو اندر بلا لیا۔ بہت تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ پوچھنے لگے "فرمایئے قاری صاحب۔ کیسے آنا ہوا۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" قاری صاحب نے چھوٹتے ہی ان جیسے دردمند اور فرض شناس افسر کی تعریف شروع کر دی۔ فرمانے لگے: "صاحب! اب اسلام کہاں رہ گیا۔ آپ جیسے پرانی قدروں کو سمجھنے والے چند حضرات اس ملک میں ہیں۔ جن کے دم قدم سے اسلام باقی ہے۔ ورنہ یہاں تو بیشتر افسر وہ مسلمان ہیں جنھیں نہ نماز پڑھنی آتی ہے نہ روزہ رکھیں۔" جنرل منیجر صاحب ذرا چکرائے۔ کہ ان سب باتوں کا بھلا یہ کیا موقع۔ فرمانے لگے: "مولانا دفتر بند ہونے کو ہے۔ ابھی مجھے چند ضروری فائلیں دیکھنی ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو

[illegible] آغا صاحب [illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible] بات ہوئی تھی [illegible]
[illegible] فرمایا [illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible] آغا صاحب [illegible]
[illegible] صاحب [illegible]

[illegible] مختار بیگم [illegible]
[illegible] ہر سال ان کی برسی [illegible]
[illegible] کھانے کے بعد [illegible]
[illegible] نے مجھ سے فرمایا [illegible]
[illegible] شوکت صاحب مختار بیگم [illegible]
[illegible]
[illegible] پسند نہ کیا گیا [illegible]
رضامند ہو گئیں۔ [illegible]
دیتے ہیں۔ [illegible]

کھانے سے فارغ ہو کر [illegible]
ان کا کلام [illegible] رضامند ہو گئیں۔
حشر کا کلام۔ اس پر مختار بیگم نے غزل [illegible] آغا صاحب
کی غزل کا مطلع تھا ؎

میں بدگمان نہیں ہوں [illegible]
[illegible] نہیں [illegible]

جب یہ غزل ختم کر چکیں تو شوکت صاحب جو اُن کے بالکل قریب بیٹھے تھے بولے: "مختار بیگم۔ غزل کا ایک مصرع تو آپ بھول ہی گئیں"۔ وہ بہت حیران ہوئیں۔ اور پوچھنے لگیں: "کون سا مصرع؟" شوکت صاحب نے بالبدیہہ فرمایا ؎

"پہلے دوا گلے کی تو لے لو طبیب سے"

آغا صاحب کی غزل کی زمین میں یہ مصرع یوں محسوس ہوا۔ گویا انگشتری میں نگینہ۔ شوکت صاحب سے ذرا فاصلے پر میں بیٹھا تھا۔ میں نے عمر بھر کبھی شعر نہ کہا تھا۔ نہ جانے اُس وقت ایک مصرع کیسے سوجھ گیا۔ میں نے کہا: "شوکت صاحب یہ تو پورا شعر تھا۔ مصرعِ ثانی تو آپ نے یاد دلا دیا۔ مصرعِ اولیٰ غالباً آپ بھی بھول گئے"۔ شوکت صاحب حیرانی

سے پوچھا: "میں وہ کون سا مصرع ہے۔ ذرا میں بھی تو سنوں"۔ میں نے فوراً عرض کیا کہ ؎

شوکت نے شعر سے وہی بات کہی ہے۔ وہی بات

یہ سننا تھا کہ شوکت صاحب ایک دم اچھل پڑے۔ بہت داد دی اور فرمانے لگے: "آپ کی یہ جوانی اور ایسے شعر بھی کہتے ہیں"۔ پھر اس شعر کو خود پڑھنے لگے ؎

شوکت نے نئے دی ہے مجھے داد بہت
پہلے دو اسکے کی تو بے وطنیت

محفل میں جو حضرات بیٹھے تھے ان سب نے بھی دل کھول کر داد دی۔ شوکت صاحب داد دینے میں بخل سے کام نہ لیتے تھے۔ دوسرے شعرا سے کوئی اچھا جملہ مل جاتا۔ کوئی اچھا شعر سنتے۔ تو پھڑک اٹھتے۔ فرمانے لگے۔ "صاحب، آپ کی طبیعت شعر کہنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ شعر کہا کیجیے"۔ لیکن وہ دن اور آج کا دن۔ پھر شعر نہ کہہ سکا۔ یہ دوسری بات ہے کہ شعر سے دلچسپی ضرور ہے۔ شوکت جیسے شعر میں تمیز کر لیتا ہوں۔ وہی مضمون کہ ؎

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

خلاصہ یہ ان احباب کی صحبت کا فیض تھا۔ کہ میرا دماغ بھی شعر و شاعری کی طرف چل نکلا تھا۔

مشاعروں کا ایک خاص موسم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں لاہور۔ لائل پور۔ راولپنڈی اور ملتان میں مشاعرے باقاعدہ صورت میں منعقد ہوتے۔ ہر طرف سے شعرا ان میں حصہ لینے آتے۔ ایسے موقعوں پر شوکت صاحب کے یہاں بھی محفلیں ہوتیں۔ جگر صاحب۔ سید محمد جعفری۔ ظریف جبلپوری۔ صابر دہلوی۔ ادیب سہارنپوری۔ سحاب قزلباش۔ زہرہ نگاہ۔ خمار بارہ بنکوی سبھی شوکت صاحب کے یہاں جمع ہوتے۔ ان میں سے بعض حضرات سے مجھے یوں تو نیاز حاصل تھا۔ لیکن قربت شوکت صاحب ہی کی وجہ سے ہوئی۔ شام کو ان کے یہاں چلا جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام کے دھندلکے رات کی تاریکی میں ڈھل جاتے۔

مجھ سے زیادہ لوگوں کے لیے اور لوگوں سے زیادہ خود میرے لیے یہ بات حیرت کا موجب بنی رہی۔ کہ میری اور شوکت صاحب کی دوستی اور قربت میں کیا قدر مشترک ہے۔ دوسروں کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایک تو جب بھی میں ان سے ملا۔ میں نے حفظ مراتب کا خیال رکھا۔ دوسری بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ انھیں مجھ سے کسی قسم کی ہمچشمی و رقابت کا اندیشہ کبھی نہ ہوا۔ اپنے ہم عصر ادیب اور شاعر دوستوں سے وہ بظاہر ہنس بول کر ملتے۔ لیکن نفسیاتی طور پر ان کے تحت الشعور میں یہ بات ضرور رہتی۔ خدا نہ کرے اس سے میری مراد یہ نہیں۔ کہ وہ منافقانہ طور پر اپنے دوستوں سے ملتے تھے۔ میں نے انھیں اس عالم میں بھی دیکھا ہے۔ کہ اپنے ہم عصروں میں سے کسی بہت کم عمر شاعر نے کوئی اچھا شعر کہہ دیا تو دل کھول کے داد دی۔ بار بار وہ شعر سنا۔ اگر فی الواقعی کسی سے متاثر ہوئے تو خلوت و جلوت میں اور ان صاحب کی عدم موجودگی میں بھی ان کی ذہانت کو سراہا۔ ان کے شعروں کی تعریف کی۔ لیکن بعض ایسے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ جن سے ان کے مراسم تھے۔ بہت قربت بھی تھی۔ لیکن ان کی تحریروں سے

[illegible]

[illegible]

میں نے انھیں سلام تو کر دیا۔ لیکن کچھ [illegible] [illegible] پیٹ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ [illegible]

[illegible] نے نہایت صفائی سے جواب دیا: "جب دلوں میں [illegible] [illegible] بالکل صحیح ہو گیا ہے۔ وقت اور واقعات نے بتا دیا کہ وہ آگ کس کی لگائی ہوئی تھی۔"

ادھر ادھر کی مختصر باتیں کرنے کے بعد پوچھنے لگے۔ "اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے جواب دیا: "سہ پہر ہندوستان کی روانگی ہے۔" انھوں نے دریافت کیا: "کیسے جا رہے ہو۔ یا اور بھی کوئی ساتھ جا رہا ہے؟" میں نے بتایا کہ "ایک خیرسگالی وفد کے ساتھ جا رہا ہوں۔ چند شاعر حضرات بھی ہمراہ ہوں گے۔" انھوں نے شاعروں کے نام پوچھے۔ میں نے جب سید محمد جعفری صاحب کا نام لیا تو کہنے لگے: "خیر وہ تو آپ کے ساتھ نہیں جا رہے۔" اس پر میں نے عرض کیا: "پروگرام بن چکا ہے۔ وہ وعدہ کر چکے ہیں۔ کیسے نہیں جائیں گے۔" شوکت صاحب بولے: "وہ اور میں ہر جگہ اکٹھے جاتے ہیں۔"

چونکہ آپ نے مجھے [illegible] صرف [illegible] ہے۔ [illegible] معلوم کیا۔ اگر [illegible]
والسلام آپ کی [illegible] شوکت صاحب [illegible] رہا ہے [illegible]
میں کیسے چل دوں ؟

شوکت تھانوی [illegible] دو [illegible] میرے [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] شوکت صاحب [illegible]
ہے [illegible] شوکت صاحب [illegible] لاہور [illegible] گئے۔ [illegible] صاحب
[illegible] کہنے لگے [illegible]
[illegible] جب [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] ہو گئے [illegible] خبر [illegible] سنائی۔ [illegible]
صاحب کو [illegible] لانے [illegible] کہ شوکت صاحب [illegible]
جب انھوں نے [illegible]
[illegible] ہو گئے۔ ہم لوگ [illegible] تک [illegible] کے [illegible]
رخصت کر دیں۔

جب وعدہ [illegible] دونوں [illegible]
اسٹیشن پر پہنچے تھے۔ [illegible] کی پابندی کی وجہ سے باہر نکل سکے تھے۔ [illegible] شفائی صاحب کا کمرہ [illegible]
سے [illegible] انھوں نے آکر مجھے اطلاع دی۔ [illegible] ان دونوں کو اپنے میزبان کی کار میں جا کر لے آیا۔ [illegible] رات کے
ایک دو بجے تک ساتھ رہا۔ [illegible] فارغ ہو کر [illegible] دونوں [illegible] دہلی روانہ ہو گئے۔

اس سفر [illegible] ملاقات [illegible] چند گھنٹوں نے [illegible] بھلا دیں۔ [illegible] محبت [illegible] تھا۔ اور
[illegible] ہو گئے [illegible] پہلے سے بھی [illegible] ہو گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ گویا دو
مریض کسی بیماری خصوصاً [illegible] سے صحت یاب ہونے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ صحت مند ہو گئے ہیں۔

مارچ ۱۹۶۳ء سے مارچ ۱۹۶۳ء تک شوکت صاحب راولپنڈی سے اکثر ایک دن کو آتے تو اور اگر کئی دن کیلیے
آتے تو۔ انھوں نے مجھے کبھی فراموش نہ کیا۔ اکثر آنے سے پہلے مارشے دیتے۔ خط لکھ دیتے۔ اور میں انھیں لینے ریلوے
اسٹیشن جا پہنچتا۔ غالباً ۲۵ جولائی ۱۹۶۲ء کو شوکت صاحب کا تار ملا۔ کہ وہ [illegible] کار سے لاہور پہنچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے
جو [illegible] سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ تو انھوں نے وعدہ فرمایا تھا کہ آئندہ جب لاہور آئیں گے تو قیام میرے ساتھ کریں گے
اس تار کے آنے کے بعد مجھے اس بات کا یقین ہو گیا۔ لہٰذا میں ان کے ٹھہرنے اور کھانے کا انتظام کر کے انھیں لینے کیلیے
ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ٹرین آئی۔ تو نہ صرف یہ بلکہ ان کی بیگم صاحبہ اور بچیاں بھی ہمراہ تھیں۔ ظاہر ہے وہ لوگ ساتھ تھے
تو ان کے اپنی سسرال کے علاوہ کہیں ٹھہرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ تاہم میں نے اصرار کیا۔ اور بتایا۔ کہ میں تو کھانا بھی پکوا

[illegible] لیے [illegible] کا [illegible]
[illegible] وہاں سب انتظار کرتے ہوں گے۔

[illegible] سے [illegible] پوچھا [illegible]
[illegible] تھا۔ [illegible] کچھ [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] گئے۔

[illegible] شوکت صاحب [illegible] صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible] ہوں اور [illegible] صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] کا [illegible]

شوکت صاحب [illegible] محفل [illegible]
[illegible] ایک نظر [illegible] سے کون شخص۔ کون کون سا شخص [illegible]
[illegible] کر چکا ہوں کہ مرحوم جو [illegible] کہنے میں [illegible] لیکن دوسرے کے [illegible]
[illegible] کے چند [illegible] خواتین و حضرات پر نظر ڈالتے [illegible] صاحب [illegible] دکھائی دیتے
[illegible] کی طرف سے انھیں اندیشہ ہوا۔ [illegible] ان کا کلام سننے کے بعد کہیں [illegible]
[illegible] رہیں۔ یا اور کوئی اوٹ پٹانگ حرکت نہ کر بیٹھیں۔ [illegible] شوکت صاحب کے [illegible] کا [illegible]
دو چار جملے ان پر کر دیئے۔ کچھ پھبتیاں کس دیں۔ وہ بیچارے کچھ ایسے بوکھلا جاتے۔ کہ پھر منہ [illegible] کے منہ سے کوئی
بات ہی نہ نکلتی۔

ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ ان صاحب کی پتلون کے پائنچوں میں سے ان کے موزوں کی جھلک نظر آگئی۔ اب
اسے محض اتفاق کہیئے یا ان صاحب کی شامتِ اعمال۔ کہ ان کے موزوں کا ڈیزائن اور رنگ بالکل اس قالین سے مشابہ
تھا جو اس کمرے میں بچھا ہوا تھا۔ ممکن ہے اوروں نے بھی یہ محسوس کیا ہو۔ لیکن کسی نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی
ہیں شوکت صاحب درخواست کر رہا تھا کہ پچھلی رات کے مشاعرے میں انھوں نے غالب کی "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے"

غزل کا جو بندی پر مشتمل تھا۔ وہ شعر میں [illegible] کی طرف کوئی توجہ [illegible] باندھتے۔ [illegible] لگے ہوئے [illegible] رکھ رہے تھے۔ [illegible] صاحب نے [illegible] صاحب بھی حضرت [illegible] آپ سے مزے سے بھی رکھتے ہیں [illegible] مطلب تو وہ [illegible] ہوئے پھر بیٹھے۔ [illegible] کہ شوکت صاحب بالکل ساتھ ہی ساتھی ہیں۔ دوسرا [illegible] بولے صاحب [illegible] تو آپ کے [illegible] پڑھنا ہوگا۔ ممکن ہے وہاں آپ سے قائل [illegible] مزے سے [illegible] ہوں [illegible] زمانہ شعبے میں گزرتے۔ لطف [illegible] ہے کہ [illegible] ان صاحب کا [illegible] لیکن ان کے ساتھ ہی ضعف [illegible] کہ باقی [illegible] ان کی زبان کو جنبش تک رہتی۔

[illegible] صاحب۔ شوکت صاحب اور [illegible] صاحب کو ٹرین پر سوار کرانے [illegible] اسٹیشن چلے گئے۔ گھر سے اسٹیشن تک میں نے شوکت صاحب [illegible] بالکل جھکے [illegible] لاہور آ کر پہلے آپ کو میرے کھانے [illegible] ان کے علاج کی طرف توجہ دوں۔ شوکت صاحب [illegible] کا [illegible] ساتھ ہی [illegible] وعدہ کیا کہ جلدی جلدی لاہور آنے کی کوشش کروں گا۔ [illegible]

شوکت صاحب بات سے بات کاٹتے [illegible] کرتے [illegible] لاہور [illegible] دوم خیر ہا ہے۔ [illegible] آغا حشر، حکیم فقیر محمد چشتی [illegible] مولانا حسرت اور محمود نظامی جیسے حضرات [illegible] اس فن کے ماہر [illegible] کے اٹھ جانے کے بعد محفلیں سونی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایک شوکت صاحب ہی تھے [illegible] فن کے علمبردار بنے رہے۔ بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ ان سب حضرات [illegible] کا مقام [illegible] وہ لوگ مسلسل گھنٹوں تک چلے [illegible] نہ کہہ سکتے ہیں۔ ایک [illegible] کس دی۔ اور چند دوسری [illegible] رہ گئے۔ کچھ دیر بعد موقع ملا تو چھوٹی تیز جملے کا نشتر لگا دیا۔ لیکن شوکت صاحب کے یہاں صورت ہی دوسری تھی۔ وہ مسلسل گھنٹوں اور پہروں یہ عمل جاری رکھتے تھے۔ دوسرا موقع دیے بغیر ان کے جملوں کی مبادی اور چٹکلوں کے جملے مسلسل اور متواتر جاری رہتے۔ عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ پڑھنے والا ان کے طلسم میں پھنس کے رہ جاتا ہے۔ اور ان سے ذاتی طور پر ملیے تو وہ طلسم ٹوٹ کے رہ جاتا ہے۔ لیکن شوکت صاحب کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ان کی مزاح نگاری سے کہیں زیادہ ان کی صحبت متاثر کرتی۔ جن لوگوں کو ان سے قرب حاصل رہا۔ ممکن ہے وہ میری اس رائے سے اتفاق کریں۔

شوکت صاحب اور ایک عام ادیب میں کیا فرق تھا۔ اس کی ایک مثال پیش کر دوں۔ پورے ایک مہینے بعد یعنی ۲۰ اپریل کو پھر میرے یہاں چند احباب کھانے پر جمع ہوئے۔ شامتِ اعمال وہ "مزے والے" صاحب بھی اتفاق سے لاہور میں موجود تھے۔ اور میرے یہاں تشریف رکھتے تھے۔ شوکت صاحب شدید طور پر علیل تھے وہ تو آ نہ سکتے تھے۔

[illegible]

[illegible] داستان انتہائی [illegible] پہلو آپ کے سامنے جو کچھ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

میرے تاثرات

ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری

خزاں کی تعطیلات گزارنے کے سلسلے میں علی گڑھ پہنچی تو علی گڑھ یونیورسٹی سے آتے ہوئے ایک فون سے مجھے اطلاع ملی کہ شوکت تھانوی بیمار ہیں اور ان کے احباب انہیں دیکھنے لاہور جا رہے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔ یہ شوکت تھانوی استقلال سے سخت علیل ہو گئے ہیں۔ پنڈی چھوڑ کر لاہور جا چکے ہیں۔ لیکن وہ تو تقریباً تیار بیٹھے ہوئے تھے یہ نکلنے ہوئے بچے ہیں۔ بات کیا ہی ان کی حاصل کرنے کے بعد وہ واپس پنڈی نہ آسکے علالت نے دن بدن شدت اختیار کی۔ ڈاکٹروں نے لیٹنے تجویز کیا ہے۔ وہ دنیا کہ یہ ادیب اس علالت کا تحمل نہ ہو سکا۔ ایسا دھکا لگا کہ لاکھوں کی جو محبت برسوں میں جا کر ہوئی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ہم کرے۔

واپسی پر ان لوگوں نے بتایا کہ حالت گرتی جا رہی ہے لیکن ابھی تک معالجین پر امید ہیں۔ کچھ اطمینان اور بے اطمینانی کی کشمکش تھی۔ دل چاہتا تھا کہ عیادت کے لیے جاؤں۔ لیکن گھر کی مصروفیات نے اس کا موقع نہ دیا۔ پھر بھی یہ معلوم نہ تھا کہ یہ سب کچھ ہو جانے کا ایسے جلد مرحلہ آنے والا ہے۔ صفحے اپنے ساتھ اس ظریف کی موت کی خبر لے کر آئے گی۔ افسوس کس قدر بے کیف دن تھا۔ اردو کا یہ انجمن بہ دامن ادیب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ادیب و شاعر کی حیثیت سے شوکت تھانوی کی کیا فتوحات ہیں۔ میرا یہ موضوع نہیں۔ میں نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس ہنگامی دور میں اس سراسیمگی و انتشار کے زمانہ میں انہوں نے اپنے انداز کو کس طرح نبھایا۔ ایک خاص زاویہ نظر سے کام لینا اور اس میں کمال حاصل کرنا کسی کسی کا کام ہوتا ہے۔ وہ پرانے ادیب تھے اور ہمیشہ کے زود نویس۔ تقسیم سے پہلے ہی کئی درجن کتابوں کے مصنف تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں بڑے پتے کی بات کہہ دینے کے عادی۔ سودیشی ریل ان کے اس دور کا شاہکار رہے۔ وہ ان چند ادیبوں میں ہیں کہ اس زمانہ میں ان پر جمود و سکوت طاری نہ ہوا بلکہ اس آشوب میں برپا ہونے والا ہر واقعہ ان کی سمند طبع پر تازیانہ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ تازیانے انہوں نے "قاضی جی" کی شکل میں مجتمع کر دیئے ہیں۔ اس دوران میں انہوں نے جو کتابیں لکھیں وہ ہمارے قومی کردار کی تحلیل پر تنقید ہی نہیں بلکہ تعمیر میں بڑی معاون ہیں۔ ان تصانیف میں ظرافت و مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے نشتر بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ان آئینوں میں ہم قہقہے لگاتے ہوئے اپنے خط و خال بھی دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن قہقہے کی ایک نئی لہر اس طرح آتی ہے کہ طبیعت کے تمام تکدر کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ یہی ان کا فن ہے اور یہی اسلوب۔

[illegible] شوکت تھانوی مرحوم [illegible] تھے۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] شوکت تھانوی [illegible]
[illegible]
[illegible] گئے ہیں۔

[illegible] شوکت تھانوی [illegible] سید محمد جعفری [illegible]
[illegible] دونوں [illegible] صاحب [illegible] شوکت تھانوی [illegible]
[illegible]
[illegible] شوکت تھانوی [illegible] سید محمد جعفری [illegible]
[illegible] شوکت [illegible]
[illegible]
[illegible] شوکت صاحب [illegible]
[illegible]

شوکت تھانوی [illegible] سید محمد جعفری [illegible]
[illegible] ۲ مارچ ۱۹۶۳ء [illegible] راولپنڈی میں ایک تاریخی مشاعرہ [illegible] نشست [illegible]
انتظام و اہتمام [illegible] نشست کا [illegible]
جائے۔ [illegible] راولپنڈی میں [illegible]
[illegible] شوکت [illegible]
[illegible] شوکت تھانوی [illegible]
[illegible] لیکن مجلس استقبالیہ کے [illegible] نے مجھے بتایا کہ [illegible] شوکت صاحب [illegible] اسی وقت مجھے شوکت صاحب [illegible] بیگم صاحبہ
اور تینوں صاحبزادیوں کے [illegible] اترتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ہمراہ سید محمد جعفری [illegible] بعد ازاں میں نے
محسوس کی کہ شوکت صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ [illegible] محفل میں تاخیر سے آتے اور مہمانوں کے جانے کے بعد [illegible] کرتے۔

شوکت صاحب کے آتے ہی مشاعرہ شروع ہوا اس کی صدارت ڈاکٹر [illegible] حسین صاحب نے کی جو ان دنوں [illegible]
[illegible] تھے۔ [illegible] کی تقریب میں شرکت کی غرض سے پنڈی آئے تھے۔ شوکت صاحب کی اطلاع کے بغیر ہم نے یہ فیصلہ کر لیا
[illegible] سیکرٹری کے فرائض شوکت صاحب انجام دیں گے۔ چنانچہ صدر کے تعارف کے بعد مرحوم سے درخواست کی کہ وہ مشاعرہ کی
[illegible] انجام دیں ان کے لئے یہ اعلان خلاف توقع تھا۔ لیکن بغیر کسی عذر معذرت کے انہوں نے درخواست قبول کر لی۔ اس مشاعرے
[illegible] ۱۹۶۳ء کی عید سے ایک دن قبل [illegible] شوکت صاحب کا انتقال ہوا۔

یں مقامی شعراء کے علاوہ، جو شعراء آتے تھے بھی اپنا کلام پڑھا جو حسن اتفاق سے بیشتر مرحوم دوست تھے اور رسالہ عبدہ پاک شعبہ سے
مشاعرہ جتنا سنتا۔ تعداد اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو خود وہاں موجود تھے۔ اس مشاعرے کی صدارت کا سہرا مشتعلیں کے سر ہے۔
شوکت تھانوی مرحوم کی ذرہ نوازی کے سر۔ یہ جنہوں نے پہلے ہی سے رابستہ و ظریفانہ انداز میں صدارت کرا کر داد وصول کی تھی۔
گئی۔ اس وقت تو ایسی کوئی بات محسوس نہ ہوا۔ اور خود شوکت کی اس نشست نے تو یادگار بن کر ذہن پر ایک نقش کھینچا۔ اس دور کا حال یہ ہے
مرحوم شاعروں کے پہچانے سے پہلے شاعر کے آنے سے قبل اور دیکھنے سے آپ کی رخصت کے وقت لوگ ملتے ہیں۔ یادداشت ان مشاعروں کے
جو اس کے بارے میں شوکت تھانوی مرحوم کی زبانی وابستہ ہوتے تھے۔ گفتگو پر سلسلہ جاری رہا۔ صاحبین تھے وہ دیکھ موجود ہے
وہ بھی اور شرافت کے ساتھ جو آپ نے کوئی بات کی۔ یہ اپنے سامعین میں بہت قدر ہو سکی۔
شاعروں میں نیر اکبر آبادی صاحب بھی تھے شوکت تھانوی نے اعلان کیا
اب میں غزل پڑھنے کے لیے نیر اکبر آبادی کو بلاتا ہوں۔
شاعروں نے معاف پڑھ کر اور کر یہ جو انہوں نے کلام سنایا ان کے لئے اعلان کیجئے۔
معاف سے بعد میرے درخواست ہے کہ وہ اپنا کلام سنائیں
وہ نیر اکبر آبادی سے جو کہ کسی کے قریب وہاں بیٹھے تھے۔ دوسری مرتبہ کلام کی درخواست اس طرح کی۔
جناب نیر اکبر آبادی کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ نظم یا غزل پڑھ لیتے ہیں کہ جی وہ جا رہا ہوں۔ اور جب ان کو محسوس ہو
جائے کہ ان کی نظم یا غزل کو سب نے بہت پسند کیا تو وہ اپنی دوسری غزل بھی سنا دیا کرتے ہیں۔ تو میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی طبع کے
مطابق دوسری غزل بھی سنا دیں۔
علامہ حسین میر صاحب تشریف لائے، ریڈیو پاکستان حیدرآباد، ثقافت انسانی میں شامل ہوئے ہیں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ ان کو کرسی پر بٹھایا جائے۔
چنانچہ میر صاحب بیٹھے رہے بہت سے لوگوں سے پیچھے ہی رہتے ہیں۔ ان کی تشریف آوری پر مرحوم نے اعلان کیا۔
مجھے مسرت ہے بہت بڑی بات کرنے والا ہوں۔ اب میں علامہ حسین میر سے درخواست کرتا ہوں وہ تشریف لائیں۔
محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔ اسی میں میر صاحب کرسی پر رونق افروز ہو گئے۔ شوکت صاحب نے پھر کھڑے ہو کر وضاحت کی۔
آپ لوگوں کو یہ بھی شکایت ہو گی کہ سب سے میں نے بچا کر بٹھا دیا ہے، اور کلیم صاحب کو اس سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ لیکن حضرات
یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔
سید محمد جعفری نے اپنی نظم سنائی "سفر نامہ" جس کی تمام لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ دوبارہ سنائیں۔ اور شوکت تھانوی سے اصرار کیا
جا رہا تھا کہ فیصلہ چونکہ وہ نظم سنا چکے، شوکت صاحب نے سید محمد جعفری سے دوسری نظم سنانے کی درخواست کی اور کہا۔
خواتین و حضرات! یہ فرمائش ہے خواتین کی اور جعفری صاحب بہت با اخلاق آدمی ہیں۔ یہ خواتین کی فرمائش رد نہیں کرتے۔ . .
سامعین میں سے کچھ نے کہا آپ سے بھی خواتین کی فرمائش ہے۔
کہنے لگے اس میں بھی کافی با اخلاق ہوں، ان کی فرمائش رد نہیں کرتا۔
حضرت نیر اکبر آبادی سے جب دوسری مرتبہ پڑھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے کہا شوکت صاحب مجھے تو معاف کریں آپ

[illegible]

[illegible] اگر آپ [illegible] [illegible]

[illegible] ہے ۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] مشکور [illegible] ہوا ۔

[illegible] نشست [illegible]

[illegible] حصہ [illegible] شوکت صاحب [illegible] نشست بڑی کامیاب [illegible]

[illegible] صاحب کا خطبہ صدارت [illegible] شوکت تھانوی کی تخلیق غالب ویکم غالب

صورت حال کو پڑھتے وقت شوکت صاحب کا انداز بیان ۔

سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا ہے ۔ وہ مرحوم کی انکساری تھی۔ بزم میں کام کرنے کے دوران میں میں نے اکثر محسوس کیا اور مجھے خوشی ہوتی ہے کہ رفقائے بزم اور ان فن کاروں کے ساتھ کام کرنے کے نتیجہ پر آمد ہوتا ہے کہ اگر خواتین اپنے مردوں کی پابندی کے ساتھ کوئی سماجی کام کرنا چاہیں تو ہمارے مردوں میں آج بھی یہ صلاحیت ہے کہ ان سے قرار واقعی احترام ملنے کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ شوکت صاحب سے راولپنڈی میں اکثر و بیشتر ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہر موقع پر مجھے ان کی انسانیت، شرافت، انکساری، بذلہ سنجی اور حاضر دماغی کا معترف ہونا پڑا۔ جس محفل میں وہ ہوتے بوریت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک دفعہ سنسر بورڈ کی ایک نشست تھی فلم چراغ جلتا رہا دکھایا جا رہا تھا۔ سنسر بورڈ کے ممبران جن میں اعلیٰ افسران وغیرہ کے علاوہ وزارتوں کے چند سیکرٹری بھی تھے۔ فضلی صاحب

ہوتی تھی۔ دفتر بھی چل گیا۔ شوکت صاحب اس ادارے کی حیثیت سے موجود تھے۔ ظفر صاحب کا اضطراب دیکھنے والا تھا۔ جب شوکت تھانوی اس مرتبہ کرسی پر سے جانے دیتے تھے جنہیں نکلے۔ کل تقریباً آدھ گھنٹہ غائب رہنے کے بعد بھی ان لطیفوں کو۔ یہ معلوم نہیں۔ سب لوگ ہنسے بیٹھے رہے۔

آخری زمانہ میں انہوں نے مرثیہ گوئی کی صلاحیت کا جو اظہار کیا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ انہوں نے عمر رفتہ میں تقریباً ایک سال سے ایک طویل مرثیہ زیر قلم کر رکھا تھا جو بڑا کامیاب ہے اور تاریخ مرثیہ گوئی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اور جو شب مرور کا ایک مرثیہ ہے۔ احباب کی چھوٹی موٹی نشستوں کے علاوہ انہوں نے اسے دبستان انیس۔ راولپنڈی کے بزم افتتاح کے موقع پر بھی سنا کر لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اس مرثیہ میں نہ صرف ان کا منفرد انداز بلکہ ان کی اہل بیت سے جو عقیدت تھی وہ بھی نمایاں ہے۔

شوکت تھانوی ڈراموں میں بڑے مشہور تھے۔ اس سلسلہ میں ان کو وہ درجہ حاصل تھا جو بہت کم لوگوں کو ان کی زندگی میں حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ اردو کے ادیب اتنے خوش قسمت کہاں۔ ان کا پروگرام "قاضی جی" اردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس پروگرام سے جہاں ان کی طبیعت کی ہمہ گیری اور ان کی فطری ظرافت پر روشنی پڑتی ہے وہاں ان کی تحریری صلاحیتیں بھی اجاگر ہوتی ہیں۔ انہوں نے اس عنوان کے تحت ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ یہ پروگرام پاکستان کی پہلی ... جاری ہے اور کمال یہ ہے کہ چار سننے والوں کو سولہ سترہ سالوں میں کبھی تکرار کی شکایت نہیں ہوئی۔ آخری دم تک یہ پروگرام ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتا رہا۔ اس دوران میں وہ مختلف حضرات کی نظروں سے گزرے۔ لیکن قبول عام کا سیلاب ان کے ساتھ رہا۔ گراں کو حسن و ناطق کی طرح بجا کر لے گیا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی دوسری تصانیف سے زیادہ اس پروگرام کے ذریعہ لوگوں میں مقبول ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ شوکت تھانوی کی وفات سے ریڈیو پاکستان کی ... پاکستان کی دلکشی میں فرق آگیا ہے۔ ان کے پروگراموں پر ایک بے کیفی طاری ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے۔ ع

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔

———— ■ ————

میں اور شوکت بھائی

بیگم خورشید حفیظ جالندھری

۱۹۴۷ء میں پارٹیشن کے بعد — آٹھ روز دلی میں رہ کر — بڑی مشکل سے نکلے تھے۔ اور جب لاہور کے اسٹیشن پر اُتری تو عشرت کے بیان سے کچھ کم نہیں آتا تھا — خدا وہ منظر کبھی دشمن کو بھی نہ دکھائے — زخمیوں کی چیخ و پکار، ہر ایک کے جسم خون میں لت پت تھے جو ریل میں سفر کے دوران ظالموں کے ہاتھوں کٹ کر مرگئے تھے اور کچھ ادھ موئے باقی رہ گئے تھے۔ ان کے عزیز و اقارب ان کو اس بُری حالت میں دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے — بہت سی عورتیں بیہوش تھیں۔ ریل سے آدمی جا رہا تھا اس طرح کہ ہم میں سب تڑپ رہے تھے — کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا — کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی — چاروں طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی — ریلوے اسٹیشن پر جو ریل پہلے جا چکی تھی دوسرے ناموں کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی کہ فلاں نام کا مرد - یا عورت موجود ہو تو وہ جلد سے جلد ویٹنگ روم میں آجائے — اس کے رشتہ دار اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں — میں نے اپنے کانوں سے اپنے نام کی اناؤنسمنٹ ہوتے سنا مگر کانوں پر یقین نہیں کیا۔ جب کئی بار یہ آواز سنی کہ اگر خورشید بیگم ڈرامہ آرٹسٹ یہاں موجود ہوں تو وہ فوراً اپنی خیریت کی اطلاع ہمارے ریڈیو اسٹیشن پر ٹیلیفون کے ذریعے دیں۔ لاہور میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ جس ریل کے سفر کے دوران قتل کر دیا گیا ہے — اس خبر سے میرے ساتھ کام کرنے والوں کو بہت دکھ ہوا — میرے ڈرامہ ڈائریکٹر سلیم شاہد صاحب کے ساتھیوں کے کہنے پر متواتر کئی روز تک میرے نام کی اناؤنسمنٹ کرائی — یہ آواز سننے کے بعد بھی میرے حواس مستقل طور پر درست نہیں ہوئے تھے — آٹھ روز کی بھوکی پیاسی اتنے دہشت ناک حادثے ان آنکھوں سے دیکھتی ہوئی ریل سے اتری تو یہاں بھی کہرام مچا ہوا دیکھا — ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے عزیزوں کا ماتم کرنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے — میں نے بمشکل اپنے حواس درست کیے اور ریلوے اسٹیشن سے ہی ریڈیو اسٹیشن ٹیلیفون کیا — ٹیلیفون پر شوکت صاحب بولے — میرا نام سن کر انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا — اور فرمایا اسٹاف کے سب فرد آپ کی خیریت چاہتے تھے — خدا کا شکر ہے آپ اور آپ کے سب احباب خیریت سے پہنچ گئے — میں آپ کی خیریت کا پیغام آپ کے سیکشن میں ابھی پہنچائے دیتا ہوں۔

دہلی میں شوکت صاحب اور امتیاز علی تاج صاحب کے بہت سے ڈراموں میں میں نے حصہ لیا ہے — شوکت صاحب کا ڈرامہ "میر صاحب کی بقرعید" اور ان کی کتاب "سودیشی ریل" یہ دونوں مجھے بہت پسند تھے — اکثر امتیاز صاحب اور شوکت صاحب سے ملنے کو دل چاہتا — مگر خدا نے کن ہنگاموں کے بعد ان دونوں ادیبوں کی شکلیں دکھائیں۔ — دہلی سے واپس لاہور آنے میں

جن حالات سے دوچار ہونا پڑا — اُن کا دل پر کافی گہرا اثر پڑا — میں اپنے گھر اور چند دوستوں کی محفلوں میں [illegible]
بہت بددل سی ہو گئی تھی — نہ جانے کیوں — مجھے شروع سے یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ [illegible]
گھر سے باہر آنے کے کوئی پندرہ دن بعد مجھے یہ پیغام ملا کہ بخاری صاحب سب آرٹسٹوں کو بلا کر ملنا چاہتے ہیں۔
روز مجھے بھی بلایا گیا — چنانچہ میں بخاری صاحب کا نام سن کر اُن کی میٹنگ میں شامل ہو گئی — بخاری صاحب نے ہم سب
آرٹسٹوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا — بہت سی تسلی تشفی کے بعد ہم سب آرٹسٹوں کو دوبارہ ملازم رکھ لیا گیا۔
حکومت پاکستان میں بھی ہم سب آرٹسٹوں کی بڑی اہمیت تھی — یہاں بھی ہم کو اُنس سمجھا گیا — اس ملازمت کے ایک سال کے
ایک چھوٹا سا لطیفہ یاد آ گیا — جب مجھے لاہور ریڈیو پر ملازم رکھ لیا گیا تو بخاری صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ ہم سب نے
حفیظ ہوشیار پوری کے پاس ہیں۔ وہ اوپر کی منزل کے کمرے میں بیٹھتے ہیں ان سے جا کر دستخط کرا لیں — اُن دنوں [illegible]
کا عالم بھی کچھ کم نہ تھا — میں اوپر کی منزل میں گئی کمرے میں شوکت تھانوی اور حفیظ ہوشیار پوری دونوں آمنے سامنے بیٹھے
تھے — میری اُن دونوں سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوئی اور حفیظ ہوشیار پوری سے مخاطب ہو کر [illegible]
جی حفیظ ہوشیار پوری کون سے کمرے میں بیٹھتے ہیں مجھے کنٹریکٹ پر دستخط کرنے ہیں۔ حفیظ صاحب نے بہت خشک منہ بنا کر [illegible]
[illegible] آجائیے — اُدھر شوکت تھانوی کی بے ساختہ ہنسی نکل پڑی — مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے — کرسی پر بٹھا کر [illegible]
[illegible] فرمایا۔ آپ نے اپنی تعریف سن لی اور مجھ سے [illegible] تھے تو یہ ہوشیار پوری مگر [illegible] شاعر ہو گئے ہیں — مجھے اپنی
غلطی پر شرم آئی مگر شوکت تھانوی نے اُس شرمندگی کو بھی اپنی چند اور باتوں سے مٹا دیا — ملازمت کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ آج
ڈراموں کا دور خزاں ہے۔ ڈراموں کے بدلے ایک اور فیچر پروگرام روزانہ پیش ہو رہا ہے — جس کا عنوان ہے "پاکستان ہمارا ہے"
یہ پروگرام شوکت تھانوی، میاں لطیف الرحمن اور خود امتیاز علی تاج صاحب لکھتے [illegible] پیش کرتے — اس پروگرام میں میں خود [illegible]
اور ان کے بیٹے نسیم تھا: اور کبھی کبھی موہنی داس بھی حصہ لیتی۔ یہ پروگرام رات آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک نشر ہوتا تھا۔ اس کے
علاوہ ایک اور پروگرام براڈ کاسٹ ہوتا — لوگوں کے نام پیغام ریڈیو کے ذریعے دوسرے ملکوں میں ان کے عزیزوں کو پہنچانا — ان کی
خیریت کی اطلاع دینا اور یہ بتانا کون کہاں ہے — مجھے اس پروگرام میں بھی حصہ لینا پڑتا تھا۔ آخر کار خدا خدا کر کے یہ مصیبت کے دن بھی
ٹل گئے تو لاہور ریڈیو میں بھی روشنی کی کرن نظر آنے لگی — وہ کرن تھے شوکت تھانوی — شوکت تھانوی نے ایک فیچر پروگرام خود لکھنا
اور پیش کرنا شروع کیا — جس کا عنوان تھا "قاضی جی" — عوام نے شوکت تھانوی کے قاضی جی کو بہت ہی پسند کیا۔ گھر گھر قاضی جی
کی شہرت کا چرچا تھا غرض قاضی جی بہت مقبول ہوا — شوکت تھانوی قاضی جی کا رول خود کرتے تھے اور ان کی لاڈلی اکلوتی زہرہ بیگم کا
کردار میں ادا کرتی۔ اُن کی بیوی موہنی داس تھی — اور بیوی کے بھائی کا پارٹ عقیل احمد ادا کرتے — لاہور سے قاضی جی [illegible]
سال تک ہر اتوار ہر پیر کی شام سوا آٹھ سے ساڑھے آٹھ بجے رات تک نشر ہوتا رہا۔

اُن ہی دنوں شوکت تھانوی نے عورتوں کے پروگرام میں خالہ جان کے نام سے ایک فیچر پروگرام لکھنا اور پیش کرنا شروع کیا۔
جس میں فلم ایکٹریس بیگم [illegible] خالہ جان بنتی تھیں اور ان کی بھانجی کا کردار میں کرتی اور خود شوکت تھانوی ایک بیکار نااہل امیدوار لڑکے کا
رول کرتے تھے جو خالہ جان کی چہیتی بھانجی سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا — لڑکا جب بر دکھاوے کے لیے پیش کیا گیا تو اُس کی

[illegible] بیان [illegible] تھا۔ وہ ان سے [illegible] بہت
[illegible] شادی [illegible] کی [illegible] شادی کے بعد
[illegible] بہت ہی دلچسپ تھا۔ [illegible] شوکت جانی کی [illegible]
[illegible] کام کرتی تھی۔ وہ بھی شوکت جانی سے [illegible]
[illegible] کو [illegible] جانی [illegible] بہت [illegible]

مجھے یاد ہے شادی کے بعد [illegible] عادت چھوڑنی پڑی۔ میری عادت چھوڑنے کا سبب شوکت جانی ہی [illegible] ہو گیا۔ کیونکہ شوکت جانی کو [illegible] دوسرے شعبوں [illegible] میری [illegible] کچھ دن بعد شوکت جانی اور میں کراچی چلے گئے۔ کراچی سے ہی قاضی جی کافی مدت تک [illegible] کر وہاں قاضی جی کی کاشت [illegible] کیونکہ شادی کے بعد میں گھریلو الجھنوں میں کچھ اس بری طرح [illegible] جس ماحول میں [illegible] وقت بسر ہوئی تھی وہ سب خواب خیال ہو کر رہ گیا۔ [illegible] اپنے [illegible] بات [illegible] یاد [illegible] شوکت جانی کی [illegible] شوکت جانی [illegible] اخبار [illegible] ریڈیو [illegible] کراچی [illegible] سے قاضی جی [illegible] میری آنکھوں کے سامنے اس وقت بھی شوکت جانی ہیں ـــ وہ بہت سی [illegible] کے مالک تھے۔ وہ اعلیٰ درجے کے ادیب، بلند پایہ شاعر، کمال نویس [illegible] ظرافت [illegible] تھے اور وہ حاضر جواب بھی تھے۔ غرض شوکت جانی میں بہت سی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز تھے۔ وہ ہمیشہ سب سے بہت خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ شوکت جانی اپنی خوبیوں کی وجہ سے زیادہ عزیز تھے۔ شوکت جانی زیادہ [illegible] کے قائل نہیں تھے۔ صرف الفاظ درست کرانے کے لیے ایک ریڈنگ ضرور کراتے۔ انھیں ہم سب پر اعتماد تھا، تو ہم سب کو ان پر ناز تھا۔ وہ پروگرام کے بعد بھی اگر کسی سے میرا تعارف کراتے تو یہی کہہ کر کراتے یہ میری زبیدہ بہن ہیں اور میں بھی ان کی [illegible] لینے پر بڑا فخر محسوس کرتی ـــ پیارے شوکت جانی اپنی مسکراہٹیں بکھیرتے ہر کی شام اسٹوڈیو میں داخل ہوتے۔ ہر وقت ان کی آنکھوں سے شرارت ٹپکتی تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں کسی نہ کسی کو اپنی شرارت کا نشانہ بنا لیتے۔ ان کا مذاق بھی بہت پرلطف ہوتا تھا۔ پل بھر میں اپنے دماغ سے گھڑ کر ایسے لطیفے سناتے کہ ہنستے ہنستے ہم سب لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ شوکت جانی جینئس کا تو [illegible] تھے۔ ان کے دماغ کی روانی سے انجان تو کبھی نہیں [illegible] تھا کہ یہ سارے لطیفے خود ہی گھڑ کر سنا دیتے ہیں۔ [illegible] تو [illegible] کہاں سے کہاں بہہ جاتے۔ ان کے دماغ میں ذہانت کا کبھی نہ ختم ہونے والا سیلاب بھرا ہوا تھا۔ ـــ شوکت جانی نفاست پسند بہت تھے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے ـــ کبھی ان کے کپڑوں پر میں نے شکن تک نہیں دیکھی۔ وہ جو بھی لباس پہنتے ان پر بھلا معلوم ہوتا ـــ میری شادی کے بعد وہ مجھے کئی بار مختلف جگہوں پر ملے۔ پہلی مرتبہ وہ مجھے کراچی میں کسی کے گھر ملے۔ یہ ڈنر کسی اخبار والے کے گھر پر تھا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ اس میں شامل ہوئی تھی۔ شوکت جانی سے شادی کے بعد میری یہ پہلی ملاقات

تھے۔ وہ اسے سن کر بہت خوش ہوئے۔ خوشی سے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اسی وقت [illegible]
چاہا [illegible] شوکت بھائی نے چند باتیں لکھ دی تھیں۔ تم نے [illegible]
وقت [illegible] سال تھی اس کو بہت پیار کیا اور کہا یہ اپنے ابا کی طرح [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] کے بعد [illegible] دل پھینک شاعر ہیں ہے۔ حفیظ صاحب نے اگر کسی مشاعرے میں [illegible]
[illegible] میں بھی ان کے ساتھ جا کر ان کی زبانی ان کا کلام سنوں ۔۔۔ لاہور کے مشاعرہ کا ایک [illegible] جب
میاں بیوی [illegible] ہو گئے تو بچی بھی میرے ساتھ تھی۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً تین سال کی تھی۔ اتنی سی بچی کا رات کے [illegible]
جاگنا بھی مشکل تھا مگر بچی اپنے ابا جان کا کلام سننے کے شوق میں جاگتی رہی۔ شوکت بھائی مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے
جب ان کی باری آئی پڑھنے کی تو انھوں نے سب سے پہلے اپنی مشہور نظم " اے میرے بچے تو پیمانہ ہو" پڑھی۔ بچی یہ نظم
سن کر بہت خوش ہوئی ۔۔۔ خیر رات تو بچی سو گئی۔ صبح رضا کے ابا جان نے کہا " تم اور تمہاری امی یہاں آنے کی بہت ضد
کر رہی تھیں۔ رات بھر تم جاگتی رہیں تمہیں تکلیف ہی ہوئی ہوگی۔ اب تم یہ بتاؤ کہ رات تم نے کیا سنا اور تمہیں کیا پسند آیا۔ [illegible]
نے کہا ابا جان مجھے تو سب سے زیادہ وہ شاعر پسند آیا جو مشاعرے میں بچہ پیدا کرتا تھا۔ بچی کی اس بات پر ہم [illegible]
[illegible] اتفاق سے کچھ دیر بعد ہی ہمارے کمرے میں شوکت بھائی، ظریف جبلپوری اور سید جعفری یہ تینوں حفیظ صاحب کے پاس
آئے۔ حفیظ صاحب نے بچی کی پسند شوکت بھائی کو بتائی۔ اور کہا ہم تو تم کو پسند کرتے ہی ہیں۔ ہماری بچی کے تمہارے بچے
اس سے بھی زیادہ اچھے ہیں۔ شوکت بھائی بھی بچی کی بات سن کر بہت خوش ہوئے وہ زندہ دل اور شگفتہ طبیعت کے انسان تھے چند
[illegible] لطیفے اسی قسم کے اور سنائے اور بچی کو بہت پیار کیا۔ اس کی ذہانت کی تعریف کی۔

جن دنوں شوکت بھائی کو حکومت سے پہلی بار اعزاز ملا۔ یہ خبر پڑھ کر مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔ حفیظ صاحب ان دنوں
کراچی تھے اور میں لاہور ۔۔۔ کسی کام سے میں نے کراچی حفیظ صاحب کو ٹیلیفون کیا اور ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ حکومت
کی طرف سے شوکت بھائی کو بھی اعزاز ملا ہے۔ اس اعزاز کے ملنے کے کچھ دن بعد ہم پھر لائل پور مشاعرے میں گئے۔ حفیظ صاحب
نے شوکت بھائی کو یہ کہہ کر [illegible] دی کہ یہ خبر مجھے سب سے پہلے میری بیوی نے سنائی تھی کہ شوکت بھائی کو بھی [illegible] اعزاز ملا
ہے۔ شوکت بھائی یہ سن کر بے انتہا خوش ہوئے اور فرمایا بہن کا رشتہ بہت بلند ہے انھیں زیادہ خوشی ہوئی ہوگی۔ آپ بہنوئی ہیں آپ
کو بھی اس رشتے کی وجہ سے خوش ہونا لازمی ہی تھا۔ یہ کہہ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھ شرارت سوجھی۔ حفیظ صاحب
سے فرمانے لگے۔ آج بھی میں ہی صدارت کر رہا ہوں۔ میں آپ کے نام کے ساتھ اناؤنس کروں گا کہ اب میرے بہنوئی حفیظ جالندھری
آپ کو اپنا کلام سنائیں گے۔ کیونکہ آپ اس رشتے سے کسی صورت بھی منکر نہیں ہو سکتے۔ حفیظ صاحب نے فوراً جواب دیا میں
بھی کہوں گا یہ میرے سالے ہیں۔ اس بات پر ایک دم سب کے قہقہے بلند ہوئے۔ جتنی دیر شوکت بھائی ہمارے کمرے میں بیٹھے
رہے کمرے کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ ہر ایک خوش۔ بشاش بشاش نظر آتا تھا۔ روتوں کو ہنسانے والے شوکت بھائی۔ مردہ دلوں میں جان
پیدا کرنے والے شوکت بھائی۔ آخری بار جب وہ لاہور کے مشاعرے میں شریک ہوئے تو ان کی آمد کی اطلاع مجھے اخبار کے ذریعے
ملی۔ میں نے سید محمد جعفری کے والد کے مکان پر شوکت بھائی کو فون کیا اور گھر آنے کی دعوت دی مگر شوکت بھائی نے اس وقت

[illegible] بڑی بات تھا۔ زیادہ [illegible] [illegible] شوکت [illegible] [illegible] ادا کرتے۔ [illegible] کے ساتھ محبت کی داد پائی ہوئی وابستہ تھے۔

مجھے اس بیماری کی حد تک [illegible] معلوم ہوا کہ شوکت صاحب بہت سخت بیمار ہیں۔ میں چونکہ ان دنوں [illegible] یہ خبر سن کر [illegible] شام کے وقت میں ہسپتال میں شوکت بھائی کو دیکھنے گئی [illegible] صاحب [illegible] شوکت [illegible] آہستہ شوکت بھائی کے پلنگ کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر جا بیٹھی۔ [illegible] بڑی بڑی آنکھیں [illegible] کے قریب بیٹھے۔ جب [illegible] تو آنکھوں سے [illegible] آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی۔ شوکت بھائی بیماری کی وجہ سے [illegible] ہو گئے تھے۔ [illegible] زرد پڑ گیا تھا۔ [illegible] اس حالت میں بھی خوش [illegible]۔ میری [illegible] سے قریب [illegible]۔ [illegible] سر پر [illegible] آہستہ سے کہا یہ بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اس کا علاج کرو۔ میں نے جواب میں [illegible] کر رہی ہوں اس کا [illegible] خراب ہو گیا ہے۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اداس اور پریشان رہی۔ پھر [illegible] گھر آ گئی۔ شوکت بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر دل پر غم کا بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ کئی مرتبہ میں نے ڈاکٹروں اور نسیم [illegible] صاحب سے ٹیلیفون پر شوکت بھائی کا حال معلوم کیا۔ شوکت بھائی کو جلدی سے دیکھنے کی پھر ہمت نہ ہوئی۔ [illegible] خود دل کے عارضے میں کئی سال سے مبتلا ہوں۔ [illegible] ان کا برا اثر پڑا۔ میں سولہ اپریل کو کسی ضروری کام سے اپنے شوہر کے پاس کراچی چلی گئی۔ مگر دل پر ہر وقت شوکت بھائی کی بیماری کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ کراچی میں روز "جنگ" منگاتے تھے میں اور حنیف صاحب۔ ہم دونوں اخبار پڑھنے سے پہلے یہ دعا کرتے یا اللہ خیر ہو شوکت بھائی کی خیریت کی خبر ہے۔ مگر اخبار میں سوائے ان کی علالت کی خبر کے کوئی ایسی خبر نظر نہ آئی۔ [illegible] کی صبح میں [illegible] بچی کا منہ دھلا رہی تھی کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور حنیف صاحب نے فون پر [illegible] آواز میں دہرایا "آج صبح آٹھ بجے فوت ہو گئے ہیں" یہ آواز سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے دل نے خود بخود کہا۔ [illegible] شوکت بھائی فوت ہو گئے [illegible] حنیف صاحب کے پاس آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے پوچھا یہ کس کا فون تھا۔ کیا شوکت بھائی فوت ہو گئے؟ حنیف صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ یہ احمد سلمان کا فون تھا۔ ان کو اطلاع ملی ہے کہ شوکت ابھی صبح فوت ہو گئے ہیں۔ اس دردناک خبر سے جو کچھ دل پر گزری وہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ ہم دونوں میاں بیوی شوکت بھائی کی اس بے وقت کی اچانک موت کے غم میں روتے اور آنسوؤں سے منہ دھوتے رہے۔ مگر تقدیر کے سامنے صبر کرنے کے سوا کچھ نہ نکلا۔ شوکت بھائی ہم سب کو روتا اپنی یاد میں تڑپتا چھوڑ کر اس فانی دنیا سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شوکت تھانوی

جب قاضی جی ہوتے

(ریڈیو کی ایک نشست سے متاثر)

اختر جہاں

جب میں کتابوں کی دنیا سے آشنا ہوئی شوکت تھانوی کا نام میرے شعور میں ایک سدا بہار پھول کی طرح لہلہاتا رہا۔ ان کی تصانیف کے کرداروں کے عادی پیکر میرے درمیان ایک خوش باش کنبے کی طرح بستے۔ ان کی کتابیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میری رگوں میں تازہ خون کے ننھے ذرے دوڑ رہے ہیں ان کی تحریر کی شگفتگی اور شوخی کی میں شیدا رہی۔ وہ چند تحریروں میں مجھے اتنے قریب ہوتے تھے۔ کہ ان سے کبھی ملاقات نہ ملنے کا شدت سے اشتیاق نہیں ہوا۔ لاہور، کراچی اور آخر میں راولپنڈی سے شوکت تھانوی کا نہایت مقبول پروگرام قاضی جی سنتی رہی۔ پروگرام کے اختتام پر اناؤنسر کی یہ آواز سن کر "یہ فیچر شوکت تھانوی نے لکھا اور وہی پیش کر رہے تھے"۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہ ایک عظیم فن کار کی آواز ہمارے کانوں کو چھو کر گئی ہے۔ کبھی گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ کہ آخر میں بھی اس پروگرام میں حصہ لیا کروں گی۔ اوائل نومبر ۱۹۶۱ء میں۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے میرے نام خط آیا: "قاضی جی" کے لیے نسوانی آواز کی ضرورت تھی میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ قدرت نے بالکل اتفاقیہ شوکت تھانوی سے بنفس نفیس ملنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا شوکت صاحب دوسرے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں دوسری خواتین کے ساتھ جو آواز کے AUDITION کے لیے آئی تھیں۔ میں بھی اسی کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی مجھے یاد ہے شوکت صاحب نے سامنے سے میرے سلام کا جواب دیا میں نے پہلی بار، قمیص چوڑی دار پاجامہ اور سرمئی رنگ کی شیروانی میں دیکھا۔ اس وقت مجھے وہ بہت سنجیدہ باوقار اور ضرورت سے زیادہ بردبار نظر آ رہے تھے۔ مجھے تھوڑی مایوسی ہوئی کیونکہ میرے ذہن میں ان کی تصویر اس سے مختلف تھی۔ بہرحال دو چار روز بعد جب مجھے اس پروگرام کے لیے انتخاب کی خبر ملی۔ تو میں پھولی نہ سماتی تھی۔ شوکت تھانوی جیسے ادیب و شاعر اور فن کار کے ساتھ ہر ہفتے بولنا میرے لیے ایک مژدہ جانفزا تھا۔ پہلے پروگرام میں۔ میں گھبرا گئی مارے رعب کے زبان لڑکھڑا لڑکھڑا جاتی تھی دوسرے ہفتے مسودہ کی ریڈنگ کے بعد شوکت صاحب نے خود ہی کہا "پہلی مرتبہ آپ کی آواز میں تکلف تھا گھبرا گئیے

میں نہیں اگر کبھی بھولتی تو میں مشغول ہو گیا اور اٹھ کر بولے شوکت صاحب کا یہ فقرہ بھی اس مزہ دار ہے وقت تک بھی یاد ہیں، چٹکلوں سے ان کی آواز تیز ہو گئی۔ وہ مزاحیہ انداز سے بھی بڑا۔ شوکت صاحب کا انداز بیان بہت ہی عجیب اور دلچسپ تھا۔ رفتہ رفتہ ہوتا گیا جب کبھی پروگرام کے دوران شوکت صاحب نے خود بھی گانا ساتھ میں لکھ دیا تھا۔ یہ فقرہ انسان دوست تھا، یہی احساس ہو۔ اور وہ [illegible]۔ بہرحال یہ روز جب شوکت صاحب آ جاتے [illegible] میرے خیال میں [illegible] وقت جیسے [illegible] سے [illegible] ہیں [illegible] کی [illegible] بھی [illegible]۔ [illegible] سال مسلسل ہر ہفتے قاضی جی [illegible] بیٹھے رہتے [illegible] گھنٹہ [illegible] ساتھ [illegible] چلتی رہتی کے بارے میں [illegible] صرف ایک [illegible] کسی شخص کی بات پر [illegible] ہو [illegible]۔ اب [illegible] کے ہر شکوے [illegible] ختم [illegible] کرتا تھا۔ وہ [illegible] ہی لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ جس وقت سے [illegible] شوکت صاحب کی ہر بات [illegible] کا مظہر ہے۔ لہجہ اور آواز کا تو کہنا ہی کیا [illegible] سب کچھ [illegible] کے سامنے ہے۔ [illegible] سرشت میں کسی دن [illegible] میں [illegible] کرتا [illegible] ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے [illegible] سب کا سلام لیتے ہوئے میز پر [illegible] رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے تھے اور لوگ آ جاتے تو اگر پروگرام کے پہلے [illegible] موجود ہوتے تو پہلے ریڈنگ کر لیتے [illegible] ہوتے۔ میرے علم میں ہے شوکت صاحب پہلے ہی ریڈیو سٹیشن پہنچ جاتے تھے۔ وقت کی پابندی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ذرا دیر ہو گئی تو شوکت صاحب کو ڈیوٹی روم میں بیٹھے دیکھ کر مجھے دیر کا احساس ہوا۔ بہرحال میں نے اندر داخل ہو کر جیسے ہی کہا "معاف کیجئے آج مجھے ذرا دیر ہو گئی" شوکت صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں جلدی سے جواب دیا "صاحب معاف کیجئے ہم آج جلد آ گیا تھا۔" یہ فقرہ سیدھا سادہ ہے لیکن ان کے کہنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ سب بے ساختہ ہنس پڑے۔ اسی طرح ایک مرتبہ میرے سامنے ایک شخص نے اپنے مکان کی پریشانی بیان کی۔ صحیح طرح یاد نہیں کہ قصہ کیا تھا۔ شاید کسی نے اس کو مکان خالی کرنے کا نوٹس وغیرہ دیا تھا۔ شوکت صاحب نے اس سلسلے میں اس کی مدد کا وعدہ کیا۔ اس شخص کے جانے کے بعد آہستہ سے بولے "لوگ میرے علم کے ساتھ [illegible] کرتے تھے [illegible] نہیں سمجھتے۔"

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ پروگرام شروع ہونے میں دیر ہے۔ ریڈنگ سے فارغ ہوئے تو پھر گپ شپ۔ سیاسیات۔ کتابیات۔ ادب و ذاتیات کی باتیں ہوتے ہوتے چھوٹے موٹے قصے اور چٹکلے شروع ہو گئے۔ شوکت صاحب کا طرز بیان طنز و مزاح اور بذلہ سنجی معمولی لطیفوں کا لطف دوبالا کر دیتی تھی۔ ان کی باتوں میں ہم لوگ ایسے کھو جاتے تھے کہ شام کا بھی خیال نہیں رہتا تھا۔ کئی بار عین پروگرام کے وقت ہم لوگ چونکے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ عید کے موقع پر پروگرام ہو رہا تھا۔ اسی دوران اچانک اسٹوڈیو کا دروازہ زور سے کھلا شاید کوئی شخص غلطی سے ادھر آ گیا تھا۔ [illegible] شوکت صاحب سامنے ہی کھڑے تھے فوراً قاضی جی کی آواز میں بولے "امجد میاں!

دیکھنے کو کوئی بھی جو اندر بیٹھ گیا ہوگا۔ نکال باہر کرو۔ اندر ساز بند کرو وہیں ... کو خوشامدی کے شبہ میں نہیں ہوا کہ کوئی اجنبی ان کی طرف چلا آیا تھا۔

ایک دن ایک صاحب کہنے لگے "میں اکثر آپ کا پریشان چہرہ دیکھ کر ... اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ یہ حالت دو صورتوں میں ہوتی ہے یا ... یا کسی کا عارضہ لاحق ہو۔ اللہ جانے دونوں کیفیتوں میں سے آپ پر کونسی کیفیت گزر رہی ہے" ... بڑے شگفتہ لہجے میں کہہ کر فوراً طرز بدل کر بولے "ارے میاں پریشانیاں کسے نہیں ہوتیں ہر ذی حیات ... کرتے ہیں میں بھی انسان ہوں۔ مجھے بھی پریشانیاں اور بیماریاں ہیں لیکن تم نے مجھے پریشان نہیں دیکھا ہوگا۔" چند دن ... آمیز گفتگو کا ذکر ہے شوکت صاحب کے پیر کے انگوٹھے میں سخت درد ہو رہا تھا کے تھے زمین پر پیر رکھنا قیامت سے کم نہ تھا اور یہ قیامت وہ کس قدر خندہ پیشانی سے جھیل رہے تھے اتنی تکلیف میں بھی چہرے کے ساتھ ... ہوئے کرسی تک پہنچتے مگر مجال ہے جو چہرے پر کرب کی ایک بھی شکن ہو۔ بات جیت میں وہی شگفتگی اور ہر بار مجھ سے سب سے پہلا یہ سوال ہوتا تھا "بچہ کیسا ہے؟" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ شوکت صاحب کے ہمراہ ان کے چند بے تکلف دوست بھی تھے۔ چند خواتین تھیں جو شوکت صاحب کی پُر مذاق باتوں پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں پروگرام شروع ہونے والا تھا۔ شوکت صاحب نے ان سے ... سنجیدہ بننے کو کہا ایک خاتون بولیں "آج تو ہم یہیں کھڑے ہو کر سنیں گے۔" شوکت صاحب ... "آپ پروگرام کے دوران بھی ہنستی ہنستی رہیں تو سننے والے سمجھیں گے آج قاضی جی کا پیٹ خراب ہے۔" ان صاحبہ پر ہنسی کا وہ زبردست دورہ پڑا کہ خدا کی پناہ۔

سوا سال میں تقریباً ساٹھ ہفتے ہوتے ہیں۔ ساٹھ ہفتوں کا یہ خیالی البم جس میں شوکت صاحب کی ہنستی چہکتی مسکراتی تصویریں ہیں۔ زندگی سے بھرپور، زندگی کی الجھنوں کا مضحکہ اڑاتی ہوئی۔ اس البم کی آخری تصویر ... مارچ کی ہے۔ اس روز شوکت صاحب مضمحل اور خاموش سے تھے میں نے مزاج پرسی کی، بہت مختصر سا جواب دیا۔ میں ڈر گئی۔ کبھی کبھی شوکت صاحب کراہ کر پہلو بدلتے تھے اور بار بار کھانستے تھے۔ لیکن پیشانی پر کوئی ناگواری کے آثار نہیں تھے۔ پروگرام اکٹھے ریکارڈ کئے گئے۔ ۱۶ مارچ کو ریڈیو اسٹیشن سے شوکت صاحب کے آخری قدم گئے اس کے بعد میں شوکت صاحب کو نہ دیکھ سکی۔ گھریلو الجھنوں کی وجہ سے وہاں بھی نہ جا سکی۔ "ساٹھ ہفتوں کا یہ البم شوکت کی جیتی جاگتی تصویروں کا ہے ——— میں نے انہیں بستر علالت پر نہیں دیکھا ——— میرے ذہن میں ان کی بیماری یا موت کا کوئی تصور نہیں۔

۴ مئی ہفتے کا دن تھا۔ یعنی قاضی جی کے پروگرام کا دن میں ریڈیو اسٹیشن کے ڈرامہ سیکشن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک جعفری صاحب کمرے میں آئے میز پر مسودہ رکھا آہستہ سے بولے "شوکت صاحب کا انتقال ہو گیا" جیسے کسی نے بے خبری میں زناٹے کا طمانچہ کھینچ مارا۔ میرا سر چکرا گیا۔ شوکت صاحب چل بسے کسی اور کی بھی آواز

[illegible] شوکت صاحب اپنے آخری سفر پر جانے کے لیے تیار ہیں۔ [illegible]
[illegible] حقیقت کو تسلیم [illegible]
[illegible] زندگی کی آخری [illegible] شوکت صاحب
[illegible]
[illegible] یاد کریں گے۔
[illegible]

خطوط

بنام ــــ بڑی بیگم

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

۱۰ اگست [illegible]

ڈارلنگ ــــ تمہارا شکریہ تمہاری صحت اور زندگی کا حال سن کر جاری ہے تمہارا خط ملا اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے روپیہ طلب کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جہاں تم ہو وہاں تمہارے پاس کافی روپیہ ہونا چاہئے مگر کیا کروں کہ میں کافی روپیہ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ بہرحال جو کچھ ہو سکا ہے بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے پہنچ جائے اس طریقہ پر بھیجنا خطرناک ضرور ہے مگر اس کے علاوہ صورت ہی کیا ہے۔ منی آرڈر بھیجنا مناسب نہیں ہے اور نہ رجسٹری بھیجنا۔ بہرحال اللہ مالک ہے انشاء اللہ پہنچ جائے گا۔ تم نے کپڑا خرید بہت اچھا کیا۔ تنخواہ ملنے پر کچھ اور بھیجوں گا تم خرچ کی فکر نہ کرنا البتہ اپنا دل کسی بات میں نہ مانا۔ خداوند کریم میری بہو کو پہننا اوڑھنا نصیب کرے اور وہ بہت بڑی عمر ساتھ تندرستی کے پاکر خوب اوڑھے اور پہنے۔

میں بالکل اچھا ہوں اب کھانسی بالکل نہیں ہے اور نہ حرارت ہے مگر گولیاں جو ڈاکٹر صاحب نے دی ہیں وہ برابر استعمال کر رہا ہوں تم میری طرف سے بالکل اطمینان رکھو۔ البتہ اپنا حال لکھو کہ اب کیا حال ہے ہاتھ کے زخم کیسے ہیں۔ یہ تم نے ٹھیک لکھا ہے آج کل ٹمپریچر کا کوئی اعتبار نہیں اس تکلیف کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ اس تکلیف کے ساتھ ہی ساتھ کم بھی ہو گا۔

اچھا جناب اب یہ فرمائیے کہ تشریف آوری کب ہو رہی ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں بلا رہا ہوں بلکہ اس خیال سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ جو کچھ کہیں اسی کے اعتبار سے پیارے لال کو لکھ دیا جائے وہ اپنی بیوی کو بھیجنے شاید پہلی ہی تاریخ کو جانے والے تھے میں نے ان سے کہا ہے کہ میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں اس کا انتظار کر لیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کو پہلے سے لکھ کر پوچھ لوں۔ اس لیے لکھ رہا ہوں۔

سعید اور خورشید دونوں خدا کے فضل و کرم سے اچھے ہیں اس وقت سو رہے ہیں اگر جاگتے ہوتے تو آپ کو خط لکھتے مگر میں ان کو جگانا نہیں چاہتا بہرحال ان کی طرف سے اطمینان رکھئے۔ خورشید کے دانے پہلے سے کم ہیں۔

ایک ملازم مل تو گیا ہے اور کام بھی کر رہا ہے مگر مرضی کے مطابق نہیں اوّل تو بدصورت ہے۔ دوسرے کم شست معلوم ہوتا ہے؟ کھانا پکانا جانتا ہے۔ میں نے فی الحال اسے رکھ لیا ہے۔ اگر کوئی اور اچھا آدمی مل گیا تو اسے رکھ لوں گا۔





خط ———— ۵۷۱ ———— نمبر

سوتے جاگتے ہر لمحہ یاد کرتی ہوں اور تمہارے خط کا جواب لکھ رہی ہوں۔
اچھا بس رخصت چاہتی ہوں۔

تمہارا پرستار
شوکت

آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ
۵ ستمبر ۴۶ء

سعدو ڈارلنگ ——— کل تمہارا خط میری بہت بے چینی اور تمہاری تکلیف سے انتہائی پریشانی کی حالت میں ملا۔ خدا کرے جو تکلیف تم کو اب باقی ہو وہ بھی دور ہو جائے اور میرا یہ خط پہنچنے تک تم بالکل میری طرح میری جان سے زیادہ عزیز میری جورو میری بالکل تندرست ہو۔ آمین

تمہارے گھبرانے یا پریشان ہونے کی آخر کونسی بات ہے۔ اس کو تو گھبرانا ہی نہ چاہیے جس کا کوئی چاہنے والا موجود ہو تم بحمد اللہ شوکت تمہارا اور اللہ تعالیٰ تمہارا پرستار ہے۔ بالکل نہ گھبراؤ میں انشاء اللہ ۸ ستمبر کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر گھر پہنچ جاؤں گا تو ۹ ستمبر کو تمہارے پاس موجود ہوں گا اور ۱۰ ستمبر کو وہاں سے بمبئی کی روانگی ہو گی۔ میرا ارادہ تھا کہ ۷ ستمبر کو لکھنؤ سے روانہ ہو جاؤں مگر ریڈیو سے ۸ کا پروگرام ہے اس لئے مقصود ۸ ستمبر کو جا سکتے ہیں لہٰذا ۹ ہی کو روانگی ہو گی۔

آج عاصم کے والد کا خط مراد آباد سے آیا تھا۔ عاصم غریب کی حالت اچھی نہیں ہے۔ انہوں نے ارادہ کیا ہے کہ عاصم کو بھوالی سینی ٹوریم میں داخل کر دیا جائے۔ بھائی زبیر کے نام بھی انہوں نے خط بھیج دیا ہے۔ اگر عاصم بھوالی جائیں تو آپ چونکہ نہ جا سکیں تو بھائی زبیر سے کہہ دیں دیکھنے کا کہ ان کو ہر ممکن صورت سے پہنچائی جائے۔

معلوم نہیں آپ کو روپیہ جو اس سے پہلے خط میں بھیجے ہیں ملے یا نہیں اس کا اندازہ تو اب آپ کے کل والے خط میں معلوم ہو گا۔ مدراس سے دو روپے پہنچ گئے ہیں۔

تمہارے بچے بفضلہ تعالیٰ بالکل اچھے ہیں اور جوانی جانے کے لیے ایک ایک دن گن رہے ہیں۔

تم ہر طرح اطمینان رکھو میں انشاء اللہ کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ ایک مسلمان ہے نوکری کے لیے راستے سے کر رکھ لیا ہے۔ اگر کوئی بہتر نوکر مل گیا تو اسے رکھ لوں گا بہرحال تم اطمینان رکھو۔

میرا یہ خط تم کو ۶ ستمبر تک ملے گا تم اب اس کا جواب کیا کرو گی دے کر۔ میں خود ہی انشاء اللہ ۹ ستمبر کو پہنچ جاؤں گا۔

تمہارا ——— شوکت

پنچولی آرٹ پکچرس، مسلم ٹاؤن، لاہور
۱۰ مارچ ۴۷ء

ڈارلنگ سعدو! خدا خدا کر کے آج ڈاک اور تار کھلے ہیں ورنہ ایک طرف تو انڈیا کے ہنگامے سے جیت

پریشانی دوسرے مضمون آپ کا ارادہ دل اعتبار میں آپ لندن ہی ملاقات ہو سکتی تھی [illegible] اطلاع [illegible]
شکر ہے کسی اخبار میں پڑھ کر آپ روانہ نہ ہو جائیں۔ ساڑھے پانچ دن پہلے خط آج ہی ملا ہے آپ کا [illegible]
ذکر ہی مگر ضرورت تھی تار بھیجنے کی اور تار وغیرہ یہاں ایک ہفتے سے بند کر دیے گئے [illegible] کی اجازت [illegible]
دو تین دن سے کھل گیا ہوا۔ دوسرے دن تمہارا تار بھیجا مگر تار نہ دیا گیا۔ وہ قیامت تھی کہ [illegible]
گھر میں یہ حال تھا کہ تین رات تک کوئی سو نہ سکا تمام محلہ والے ہندوؤں اور سکھوں سے [illegible] شہر [illegible]
بہت خراب ہو گئی تو نجل صاحب اپنی بیوی اور بچی کو لے کر یہاں آ گئے اور بخاری صاحب [illegible]
حالات ذرا اطمینان بخش ہونے پر یہ لوگ واپس گئے۔ اب خدا کا فضل ہے کہ کوئی خاص تشویش کی بات نہیں [illegible] تار [illegible]
تار ملا اور ساتھ ہی ساتھ دو خط بھی جن میں سے ایک [illegible] کا لکھا ہوا تھا اور دوسرا [illegible] کا۔ معلوم نہیں [illegible]
ہوں گے اور خدا جانے میرے خط کس طرح پہنچے ہوں گے اور نہ جانے پریشانی کی وجہ سے آپ کا کیا حال ہو۔ بہر حال آج [illegible]
کا تار بھی بھیج دیا ہے اور یہ خط بھی فوراً لکھ رہا ہوں کہ آپ کو اطمینان ہو جائے ہمارے یہاں سب خیریت ہے اور خدا کا فضل ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ اب آپ تنہا نہ آئیں۔ جب آپ کا آنے کا ارادہ ہو مجھ کو لکھ دیجئے گا تاکہ مولانا کو بھیج دوں یا [illegible]
اگر کوئی آ سکتا ہو تو ساتھ لیتی آئیں۔ یوں تو اللہ مالک ہے وہی سب سے بڑا نگہبان ہے مگر انسان کو خود بھی احتیاط کرنا چاہئے۔

دلہن کی حالت معلوم ہو کر تشویشوں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ خداوند کریم اس پر اپنا فضل کرے [illegible] ہم لوگوں کی پریشانیوں [illegible]
بی بی اور بچوں کی خیریت سے جلد جلد اطلاع دیتی رہئے۔ آج کل دل بہت پریشان ہے۔ کل کا حادثہ سنئے کہ [illegible] ایک [illegible]
چل بسے، وہی [illegible] تھا جو مجھ کو ہوا کرتا تھا یعنی وہی آنت بڑھ جانے سے جو درد ہوتا ہے اپنڈے سائٹس۔ اچھا آدمی
تھا غریب۔

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ بابا کو پیار۔ سعید کو بھی پیار۔ سعید کا مکمل انتظام کر دیجئے گا اور مکان کے متعلق خدا کرے یہ
کچھ لکھئے۔

آپ کا شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"
ایڈورڈز روڈ۔ راولپنڈی
۲۴ اگست [illegible]

بیگم صاحبہ۔ آداب ۔۔۔ آپ کا خط ملا۔ میں نے اس پر غور کیا اور غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر
پہنچا ہوں کہ آپ کو مبارکباد دوں۔

یہ خاندان ہر اعتبار سے اچھا ہے۔ میں اس کے اکثر حضرات سے واقف ہوں اور ان کی شرافت نسل اور ذاتی شرافت کا
قائل ہوں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سعید کی مرضی کو میں سب سے مقدم سمجھتا ہوں اور سعید اور عطیہ سلمہا کی راہ میں ناعاقبت اندیشی یا پہلی

[illegible]

احقر۔ شوکت

دفتر روزنامہ جنگ۔

راولپنڈی۔ ۱۲ مارچ [illegible]

سعیدہ،

تمغۂ امتیاز کے خطاب پر آپ کی خوشی قدرتی ہے۔ یہ [illegible] صرف میرا نہیں میرے تمام متعلقین کا ہے۔ خدا سب کو مبارک کرے۔

میں آپ کو تفصیلی خط انشاءاللہ فراغت سے لکھوں گا۔ اس وقت ذرا مشغول [illegible] رہا ہوں۔

خورشید بہت خفا ہے اس کو پیار کرکے منا لیجئے۔ میں نے [illegible] اور [illegible] ڈائری حاصل کر [illegible] ناراض ہوں یا [illegible] دوسرا [illegible] دیجئے۔ اس کا خط آیا ہے، اس کا جواب [illegible]۔

آپ کا۔ شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"۔

راولپنڈی۔ ۱۰ اگست [illegible]

بیگم السلام۔

کمال کر دیا آپ سب نے کہ دیر دون کو بھابی جان مل گئیں اور ساس کو بہو مل گئی لہٰذا اب اس بڈھے کو گھاس ڈالنے کی کوئی ضرورت ہی نہ رہی۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں جب انعام الحق اور اقبال [illegible] کو خط لکھا تو معلوم ہوا کہ جناب مع دلہن بیٹی کے [illegible] پہنچ چکی ہیں۔

آج سڈنی سے سعید کا خط بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے سلامتی خیریت کے ساتھ واپس لائے۔ اس پیارے بھیا سے اس نے لکھا ہے کہ ابا اپنے سوٹ کی پیمائش بھیج دیجئے میں آپ کے سوٹ لاؤں گا۔ میں نے اس کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ خبردار جو سوٹ لائے اس لیے کہ وہ جب تک سڈنی میں نوکری باندھ کر نہ پھرے، میرے لیے سوٹ لانے کی گنجائش نہیں نکال سکتا۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ جو کچھ لانا ہے وہ میری بیٹی یعنی اپنی دلہن کے لیے لانا ہے اس کی زیادہ خوشی ہوگی اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اپنی امی جان کے لیے

ایک گزارش کا جواب درکار تھا۔

بھئی خدا کے لیے اس بات پر بیکار ہی خود کو تباہ کر اور کسی اصول پر مضبوطی ہو کر اس طرح گھٹ کر مت بیٹھو
کہ منیر کیا کہ میں نے ساحر جمال صاحب کو اُن کے متعلق جو خط لکھا ہے اُس کا کیا نتیجہ ہوا۔ میں نے صاحب کو
معاملہ میں لکھ دیا ہے کہ خورشید اور ساحر کے شعبہ میں سے ہیں۔ ساحر جمال صاحب نے ابھی تک جواب نہیں دیا ہے لہٰذا
کوثر و ساحر جمال صاحب کو یاد دلانے کہ میرے خط کا جواب اُن کے ذمہ ہے۔

بابا بیچارہ تو امتحان کی تیاریاں کر رہا ہوگا۔ لہٰذا اگر خط لکھ تو مت لکھ۔ تیج ہو گا تو کوئی بھائی مبارک کے بعد
میرا ہوتا مجھے خط لکھا کرے گا۔

ان دونوں بدمعاشوں کو خیر دعا تو کہہ دیجئے مگر اس شفقت آمیز دعائیں بصرف دُشمن ہی کو دی جائیں گی۔

مجھے پچھلے دنوں جو بخار آیا تھا وہ کافی شدید تھا لہٰذا وہ اپنی کمزوری چھوڑ گیا ہے۔ ویسے بھی اب یہ کوئی سوال کا ...
کہ کمزوری میں اضافہ نہ ہو مگر میں پورا کھوئے بغیر ہرگز مرنا نہیں چاہتا۔

آپکا ... شوکت

بھوپال

۱۴۔ فروری

میری اپنی ستّو — واقعی تم نے میرا خط پہنچنے سے پہلے ہی مجھ کو خط لکھ دیا۔ کیسا پیار بھرا خط۔ ایک ایک
لفظ کا وہ لکھو یا ہوا اعتماد، وہ بھولی ہوتی محبت وہ بچھڑی ہوئی خوبصورتی ملیاں، جس کے لیے تمہارا شوکت ترس رہا تھا۔ اسے علاوہ یہ
ہے کہ جیسے تم نے پیاسے کی پیاس بجھا دی۔ خدا میری چاہنے والی کو ہمیشہ میرے دل کی ملکہ بنائے رکھے۔ میری ستّو شاد و آباد رہے
اس کا شوکت اس کا پروانہ بنا رہے۔ — آمین

تم ناحق گھبراتی ہو۔ میں دُور سہی مگر تصور تو دُور نہیں ہے۔ ہم دونوں پھر مل جائیں گے۔ ستّو تم بالکل نہ گھبراؤ میری صحت
بالکل اچھی ہے۔ درد میں کوئی زیادتی نہیں بلکہ مجھے اس دوا سے واقعی کچھ کچھ فائدہ محسوس ہو رہا ہے۔ اب ہر وقت کی کھٹک میں کمی ہے
البتہ کھانے کے بعد کچھ تکلیف ہو جاتی ہے انشاءاللہ وہ بھی جاتی رہے گی۔ میرا پہلا خط جب تک تم کو نہ ملا ہوگا تم پریشان رہی
ہوگی حالانکہ میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ تم کو خط لکھا۔

اچھا اب سنو یہاں سے کسی طرح ۱۹ فروری کی رات سے پہلے نجات نہیں مل سکتی۔ ۱۹ فروری کو ہز ہائنس کی طرف سے خاص
تقریب ہے بغیر اس تقریب میں شرکت کیے میں آزاد نہیں کیا جا سکتا لہٰذا میں ۲۰ فروری کی صبح ڈاک گاڑی سے چل کر رات کو لکھنؤ
جاؤں گا۔ اسٹیشن سے ٹیلیفون کر کے وقت پوچھ لینا کہ جی۔ آئی۔ پی میل رات میں کس وقت پہنچتی ہے۔ غالباً اس کے پہنچنے کا وقت شام
کو سات بجکر چھیالیس منٹ پر ہے۔ میں نے بے حد کوشش کی کہ جلد کو نجات مل جائے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

کل رات کو مشاعرہ تو سُنا ہوگا تم نے تو میری آواز سن لی ہو گی مگر میرے کان ستّو کی آواز کے لیے ترس رہے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شوکت

[illegible]

[illegible]

سدو، سلام۔

ہم تو کب سے تیرے ہی تھے جانِ تمنا ہو کے
نہ جیتے [illegible] سے [illegible] ہو کے

آپ کا یہ شعر اس وقت یاد آگیا، یہ صرف [illegible] آپ [illegible] کی طرح باتیں کرتی ہیں۔ [illegible] کیونکہ آپ کا خط ابھی آج ملا ہے [illegible] آپ کی [illegible] اس طرح ہوتی ہیں۔ [illegible] شروع سے [illegible] اب [illegible] ہیں [illegible] دل میں [illegible] اس [illegible] ہے [illegible] بہت [illegible] آپ کا [illegible] دیا گیا۔

آپ میری صحت کی طرف سے بالکل مطمئن رہیئے میں قطعاً اچھا ہوں۔ ورنہ آج ضرور بہت پریشان ہوتا۔ آپ کی محبت [illegible] سے مجھ میں ایک [illegible] روح پھونک دیتی ہے [illegible] خوش رکھے۔ آمین۔

خدا بخش آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ آج رات کو [illegible] عثمان کے یہاں آئیں گے۔ [illegible] باغ جانا چاہتی تھیں۔ میں نے ٹال دیا اس [illegible] کو آخر وہ دیکھ کر [illegible] پریشان ہونے کے [illegible] رہی ہیں۔

سدو! تم اس خط کا جواب مت دینا اس لیے کہ میں دفتر سے باہر ہوں گا۔ اب تو مجھے [illegible] خط لکھنا ہے [illegible] آپ بالکل تیار رہئے میرا خیال ہے کہ میں ۴-۵ تک آپ کو لینے آسکوں گا۔ مگر صرف ایک رات قیام کر سکوں گا اس سے زیادہ [illegible] ممکن [illegible] پہنچوں گا اور دوسرے دن صبح صبح آپ کے [illegible] واپس ہو جاؤں گا۔

معلوم نہیں بجو بھوپال سے واپس آئے یا نہیں۔ بہرحال اب تو اس کا جواب بھی آپ دوسری تاریخ کو دیجئے گا۔ اب میں آپ کو [illegible] خط لکھوں گا اگر موقع ملا تو کل ہی شاید خط لکھوں۔

آج کل میں اس خیال سے بہت خوش ہوں کہ میں آپ کی ایک خواہش کے پورا کرنے میں بفضلِ تعالیٰ کامیاب ہو گیا۔ یعنی آپ خدا کے فضل سے اپنی مرضی کے مطابق دو مہینے [illegible] پوری میں گزار چکیں۔

سدو! اب ہم [illegible] کا بچہ نہ پائیں گے اب تو ہم سدو کا بچہ پائیں گے جلدی سے ایک بچہ دو۔ شرماتی کیوں ہو؟ اچھا یہ خط شروع سے آخر تک تنا کو ضرور دکھا دینا۔

تمہارا اور صرف تمہارا
تمہارے علاوہ کسی کا نہیں
شوکت

مقام ہوم [illegible]
۱۸ اگست ۱۹۴۸ء

مخدوم و مربی، اپنے غلام پرستار کی پرستش قبول کیجئے۔ کل [illegible] اور یاد نہیں یہ کیفیت ابھی طاری ہے بہرحال میری تمام رعنائیاں، تمام شگفتگیاں، تمام [illegible]
اس فضا کی وہ کیفیت جو چھائی ہے جو بجا ابھی تک نہیں ہوئی تھی [illegible] بہتر [illegible]
اشتعال اور ندامت نہ ہو لیکن فی الحال جو کیفیت طاری ہے اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں میرے [illegible]
والی ہیں سخت سکون کی برداشت کرنے والی میری جیسی [illegible]! شاید مجھ کو معاف کر دیجئے [illegible]
نہ رہے جو اب تک اپنے ناروا طعنوں سے بنا ہوا تھا بلکہ شاید اب تو خود اپنے غلام [illegible]
مجھ پر کل سے ایک سکوت کا عالم طاری ہے اور کسی سے بولنے کو دل نہیں چاہتا۔ رات بھر جاگتی رہی۔ کاش کوئی دیکھتا اور دیکھا نہ جاتا۔

آج ایک رسالہ "ثریا" بیگم [illegible] ایک پرچہ وہ بھی دیکھ لیجئے میں آپ کو بھیجتی ہوں — "ہوم" رسالہ ہے یا نہیں۔ "ہوم" میں آپ "دو دو باتیں" ضرور پڑھ لیجئے یہ میں لکھتا ہوں اور جب "دو دو باتیں" نکلیں مجھے [illegible] ہے آج کے "ہوم" میں جنس کے فلسفہ پر دو دو باتوں میں بحث کی ہے۔ تنقید کیجئے۔

سجاد حسین صاحب کی لڑکی زہرہ کل چھ بجے شام کو مر گئی۔

[illegible] تنخواہ اس مہینہ میں ابھی تک نہیں ملی ہے ورنہ آپ کو ضرور اطلاع دیتا۔ پرسوں ترسوں ملے گی۔ تنخواہ تو کیم کو میں خاص طور پر حاصل کروں گا اس لیے کہ [illegible] ہو جاتا ہے۔

اور اب کیا لکھوں مگر شاباش ہے آپ کو کہ آپ اس طرح ہر بات برداشت کرتی ہیں۔ مجھ سے اپنی یہ بات خود ہی برداشت نہیں ہو رہی ہے کہ آپ نے برداشت کر لی۔

شرمسار، گنہگار، سعیدہ کا غلام
شوکت

بنام — چھوٹی بیگم

لندن ۱۷ جولائی

میری جو!

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔ میں نظامی صاحب کے ہمراہ آج دن کے ڈیڑھ بجے لندن پہنچ گیا۔ کل شام کے ۵ بجے کراچی سے چلا تھا۔ اب ارادہ ہے کہ ۴ کو یہاں سے چل کر ۵ کو کراچی اور ۶ کو لاہور پہنچوں۔ مگر آج معلوم ہوا ہے کہ جو جہاز [illegible] جانے والا تھا وہ ۵ کو جائے گا۔ لہٰذا ۷ کو لاہور پہنچوں گا بہرحال کراچی پہنچ کر تار دوں گا۔

جو! تم اس ملازمت کے سلسلہ میں بالکل رنجیدہ نہ ہو جو تم چاہو گی وہی ہو گا۔ میری زندگی کا مقصد تمہاری خوشی ہے۔ اگر تم ہی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فقط

شوکت

ROOM NO-759

۲۲ جولائی ۱۹۵۸ء

میری جان! میری جان! [illegible] یہ تمہارا خط ہے۔ اس سے پہلے [illegible] [illegible] انشاءاللہ [illegible] [illegible] جو میں نے [illegible] نہایت خوبصورت [illegible] بچوں [illegible] انشاءاللہ کوشش کروں گا۔ بس اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے تم تک پہنچ جاؤں۔ بہت دن ہو گئے اب۔ [illegible] ہے۔ قصہ دراصل یہ ہوا ہے کہ [illegible] خدا [illegible] خیریت معلوم ہو سکی۔ بہرحال تم سب کو خدا کے سپرد کیا ہے۔ [illegible] سب کو خیریت [illegible] معلوم ہے کہ تم [illegible] اداس ہو گی۔ بہرحال اب یہ جدائی کا زمانہ ختم ہونے والا ہے اور ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔ میرا سب سے سلام کہنا۔ بھائی جان۔ بھابی۔ خالہ نانی جی کو آداب

شوکیہ۔ فوزیہ۔ طاہرہ کو پیار

سیما باجی۔ [illegible]۔ نعیمہ کو پیار۔ مشتری۔ تاجی۔ شریف اور زرینہ کو دعائیں

تمہارا اور تمہارے بچوں کا اداس

شوکت

۱۰۔ فروری

یعنی فراق کا پہلا دن

میری جان!

ڈھاکہ پہنچتے ہی تم کو ارجنٹ تار دیا ہے اور تار دینے کے بعد ہی تم کو یہ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

یہ تمہاری دعائیں تھیں کہ زندہ سلامت ڈھاکہ پہنچ گیا ورنہ آج جو کیفیت گزری ہے وہ خدا کبھی نہ گزارے۔ جس وقت ہوائی جہاز

کے لکھنے سے ہم سب کی پیشانیاں بھر دیں۔ ہوائی جہاز کے مسافروں میں کچھ مری قسم کے لوگ ہی تھے۔ [illegible]
دیر بعد تشویش ہوئی کہ بعد کو یہ حال ہو گیا کہ خود ہوائی جہاز کے لکھنے سے بھر ا اسی طرح [illegible]
ہو گیا کہ آخر ہوائی جہاز کا راستہ بدل پڑا۔ بہر حال بالکل تمام ہو گئے کے بعد یہ کیفیت ختم ہوئی اور جہاز [illegible]
کے ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ اور میں نے بہت شکر ادا کیا۔ یہاں آکر یہ پروگرام معلوم ہوا ہے کہ اس وقت ہم لوگ [illegible]
جا رہے ہیں۔ کل صبح ڈھاکہ کے تاریخی مقامات دیکھیں گے۔ سہ پہر کو گورنمنٹ ہاؤس میں ہم [illegible] اور اس کے بعد [illegible]
میں وائس چانسلر سے ملاقات ہو گی۔ سہ پہر کی چائے گورنر کے ساتھ ہے اور رات کو ہوٹل میں [illegible] کہ اسی وقت [illegible] سے
سلہٹ روانہ ہو جائیں گے۔ جس ہوٹل میں اس وقت میں ہوں وہ ڈھاکہ کا مشہور ہوٹل ہے۔ بہر حال [illegible] زندہ رہ
تھا۔ چنانچہ میں اپنی معصوم بچیوں کے لیے اور اپنی پیاری بیوی کے لیے زندہ ہوں۔

شوکیہ اور فوزیہ کے اسکول جانے اور آنے میں پوری احتیاط برتنا۔ شمسہ بابا کو بالکل [illegible] اماں کو تسلیم اور سب
کو دعائیں۔

تمہارا

شوکت

دفتر روزنامہ "جنگ"

کراچی۔ ۱۱ اگست [illegible]

میری روح۔ میری جو!

تم سے رخصت ہو کر میں اس طرح کراچی پہنچا ہوں کہ جیسے روح لاہور میں چھوڑ آیا ہوں۔ یہاں اسٹیشن پر [illegible]
ع پاور جی اور [illegible] وغیرہ کے موجود تھے۔ ان کے ساتھ گھر آ گیا۔ [illegible] صاحب نے گھر بدل دیا ہے۔ یہ گھر [illegible] روڈ پر [illegible]
میں ہے اور نہایت کشادہ ہے۔

مسز نظامی نے یہاں پہنچتے ہی [illegible] صاحب [illegible] میری غیر موجودگی میں سب کچھ کہہ دیا کہ میرے یہاں آنے میں کیا کیا رکاوٹیں تھیں
اور آپ کی ساری پریشانی کا ذکر کیا۔ چنانچہ وہ مجھ کو میرے سر سے پکڑ کر رہ گئے اور کہنے لگے کہ تم زہرہ کو فوراً بلا لو ساتھ لو کہ
وہ رہنے کے خیال سے نہیں بلکہ عارضی طور پر آ جائے اور یہاں آکر خود اندازہ کرے کہ حالات کیا ہیں اور ہم لوگ اس کا ساتھ کس طرح
دیتے ہیں۔ باورجی نے کہا ہے کہ میں زہرہ کو اسی مکان میں فی الحال رکھوں گی اور اوپر کا کمرہ مع غسل خانہ وغیرہ کے ٹھیک کرائے دیتی
ہوں تاکہ وہ یہاں رہ کر یہ فیصلہ کرے کہ اس کو لاہور میں رہنا ہے یا یہاں۔ یہ کتنا پیارا رہے کہ طبیعت سخت ویران ہو رہی ہے۔
طبیعت اچاٹ ہے اور دل سخت گھبرا رہا ہے کہ نہ جانے لاہور میں کیا ہو رہا ہو گا۔ خدا کرے آپ سب اور میری تینوں گڑیاں خوش
ہوں ۔۔۔ آمین

اماں کو تسلیم کہئے۔ بھائی جان۔ بھابی۔ خالہ وغیرہ کو آداب۔ شوکیہ۔ فوزیہ اور شمسہ بابا کو پیار۔ جمال۔ [illegible] اور [illegible] کو
دعائیں۔ ناہید اور [illegible] اور [illegible] کو دعائیں۔

[illegible] — ۵۷۹ — [illegible]

[illegible]

[illegible]
شوکت

—

[illegible]
راولپنڈی
[illegible]

میری آپا!

خط ملا۔ آپ بخیریت تمام راولپنڈی پہنچ گئی ہیں اور میری بچیاں بھی سلامت۔ بخیریت تمام ہوں۔

اب یہ ہے حالت [illegible]۔ میرے پہلے جس مکان کا میں نے انتظام کیا تھا۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس میں رہا جا سکے۔ اس میں کل تین کمرے ہیں۔ سب سے بڑا کمرہ اتنا ہی ہے جتنا [illegible] کے گھر میں وہ کمرہ جس میں چارپائی رہتی ہیں۔ جس مکان کا ایک کمرہ۔ دوسرا کمرہ اس سے تھوڑا سا چھوٹا ہے۔ تیسرا بس اتنا ہی کمرہ جیسی آپ کی یہاں کے گھر میں بیٹھک۔ ایک چھوٹا سا صحن ہے جس سے [illegible] ہے۔ ڈیوڑھی میں ایک غسل خانہ ہے۔ جس میں نل ہے اور اس میں کچھ ملا کر پاخانہ بن سکتا ہے [illegible]۔ میں نے اس مکان کی [illegible] ہے تاکہ سامان آ جائے تو اس میں رکھ دوں اور کسی اور مکان کی تلاش میں رہوں۔ مل گیا تو اچھا ہے ورنہ اسی گھر میں رہنا پڑے گا اور اس کو درست کیا جائے گا [illegible] دفتر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ بس اتنا ہی [illegible]۔ علاقہ اچھا ہے اور مکان لب سڑک ہے۔ البتہ اگر اسی مکان میں رہنا پڑا تو [illegible] کرا لیں گے اور بجلی کا [illegible] درست کرانا پڑے گا جو نہایت خستہ حالت میں ہے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ کیا کروں۔ اگر آپ کے ساتھ [illegible] کوئی ملازم آ جائے اور زہرہ کی ماں کچھ دن کے لیے آ جائے تو بہت اچھا ہے۔ راولپنڈی میں گرانی بہت ہے جس کا اندازہ اخبار سے آپ کو ہو جائے گا [illegible] بھائی جان کے نام [illegible] کر دیا ہے۔ امید ہے کہ [illegible]۔ میری عجیب حالت ہے۔ نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا۔ کسی وقت کھانا مل گیا تو کھا لیا ورنہ [illegible] کر لی۔ کبھی ایک [illegible] گوشت اور ایک آدھ انڈا کھا لیا [illegible] آج ہی [illegible]۔ [illegible] چائے پی اور دو [illegible] رات [illegible] کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

اب آپ بہ تفصیل خط لکھئے اور یہ بھی لکھئے کہ نزلہ وغیرہ کیسا ہے۔ خدا کرے کہ آپ بالکل ٹھیک ہوں۔ اور میری بچیاں بھی ٹھیک ہوں۔

کتنا اچھا ہو کہ اگر آپ کے ساتھ اماں بھی کچھ دن کے لیے آ جائیں اور آپ کا گھر ٹھیک کرا دیں۔ سامان کی بلٹی کہاں ہے؟ وہ سامان کب تک پہنچے گا؟ شریف سے پوچھ کر لکھئے۔

آپ کا پردیسی میاں
شوکت

شوکت تھانوی — ایک صحافی

احمد جمال پاشا

شوکت تھانوی پیدائشی صحافی تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کی عمر بمشکل ۱۵، ۱۶ برس کی ہوگی۔ انھوں نے اسکولی دوستوں کے لیے ایک قلمی رسالہ نکالا تھا اس کے بارے میں مابدولت میں لکھتے ہیں کہ:-

قلمی رسالہ

"اس زمانے میں ہم نے اپنے اسکولی دوستوں کے لیے ایک قلمی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ اس رسالے کو خود نہایت خوشخط لکھتے تھے۔ اس میں کارٹون بھی ہوتے تھے، نقلیں ہوا کرتی تھیں اور احباب پر چوٹیں ہوتی تھیں۔ یہ قلمی رسالہ حلقۂ احباب میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ہر نمبر صرف ایک ہی ہوتا تھا۔ احباب کے یہاں ایک ایک دن مہمان رہتا تھا اور گشت ختم کرکے پھر ہمارے پاس آجاتا تھا۔ پندرہ دن بعد دوسرا نمبر نکلتا تھا۔ مگر اس کے غالباً چار ہی پانچ نمبر نکل سکے۔"

رسالہ حسن ادب لکھنؤ کی ادارت اس کے ۵ سال بعد ۱۹۲۵ء میں کی۔ یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ منشی واحد علی لطف لکھنوی اس رسالے کے چیف ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، منیجر، مصحح، سنگ ساز اور خوشنویس، غرض سبھی کچھ تھے۔ پاٹے نالے لکھنؤ میں ان کا دستی پریس اور رسالے کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ منشی صاحب موجودہ ایڈیٹر سے مطمئن نہ تھے۔ شوکت تھانوی رسالے میں اشاعت کے لیے مضمون دینے گئے۔ انھوں نے مضمون اتنا پسند کیا کہ ان کو رسالے کا ایڈیٹر بنا دیا۔ شوکت تھانوی اس سے قبل کسی رسالے کے سرورق پر ایڈیٹر کے بجائے "رئیس التحریر" لکھا دیکھ چکے تھے لہٰذا رسالہ "حسن ادب" کے تازہ شمارے کے سرورق پر ایڈیٹر کی جگہ "ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی" لکھا گیا۔ چونکہ اس رسالے کا سرمایہ نہ تھا اور منشی صاحب اس پر اس قدر حاوی تھے کہ جہاں سے چاہتے رسالہ شروع کر دیتے اور جہاں چاہتے ختم کر دیتے۔ پھر ان کے جیسے سیلانی آدمی کے لیے منشی صاحب کی ناز برداریاں ممکن نہ تھیں لہٰذا چار پانچ اشاعتوں کے بعد یہ رسالے سے علیحدہ ہو گئے اور رسالہ "حسن ادب" بند ہو گیا۔

[illegible] شوکت تھانوی [illegible] ہمدم کی ملازمت [illegible]
[illegible] شوکت تھانوی [illegible]
[illegible] شوکت تھانوی کا یہ فقرہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ

۔ [illegible] شوکت [illegible] :

ذیل کی سطور [illegible] شوکت تھانوی [illegible] ۔
سے شوکت تھانوی ۱۹۲۳ء میں [illegible] ہمدم کی ملازمت کے
روزنامہ ہمدم لکھنؤ (پہلا دور) [illegible] لکھتے ہیں کہ :-

> ۔ والد کے انتقال کے بعد فکر معاش دامنگیر ہوئی۔ میرے ماموں مجھے ہمدم کے مینیجنگ ڈائریکٹر خان بہادر سید محمد حسین رضوی کے پاس لے گئے جو ہمارے عزیز بھی تھے۔ اور سید صاحب نے اسی وقت پروانۂ تقرری دے دیا اور چالیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ (مابدولت)

> ۔ استاذی میر بشارت علی جالب دہلوی روزنامہ ہمدم کے ایڈیٹر تھے اور ہمدم کے ڈائریکٹر خان بہادر سید محمد حسین رضوی ایم ایل سی نے مجھے ہمدم کے دفتر میں بھیجا تھا کہ میں مترجم کی حیثیت سے کام کروں۔ (شیش محل۔ جالب دہلوی ص ۹)

> ۔ قاضی محمد حامد صاحب حسرت ہمدم کے منیجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی۔ انھوں نے اپنے ہی کمرے میں ہمارے لیے ایک علیحدہ میز لگوا دی۔ اور سب سے پہلے ہم کو یہ کام بتایا کہ آپ ہمدم کے دو مہینے کے فائل لے کر تمام مقالات افتتاحیہ و شذرات پڑھ ڈالیے تاکہ آپ کو حالاتِ حاضرہ کے علاوہ ہمدم کی پالیسی کا اندازہ ہو جائے اس کے بعد آپ سے کوئی تحریری کام لیا جا سکے۔ ... ہم نے ۳ دن میں ۲ مہینے کے فائل پڑھ ڈالے اور مزاحیہ کالم "دو دو باتیں" بھی پڑھ ڈالیں۔ اب قاضی صاحب نے ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کیے، کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا۔ خبروں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات نہ تھی مگر شذرات سید جالب صاحب کے پاس بھیج دیے جاتے تھے۔ (مابدولت ص ۹۶، ص ۹۷)

ہمدم میں ملازمت اور کالم نگاری کے بارے میں شوکت تھانوی کے معاصر فرقت کاکوروی لکھتے ہیں کہ :-

۔ جب ۱۹۲۶ء میں میں وسوپ جماعت میں تھا تو معلوم ہوا کہ وہ روزنامہ ہمدم

لکھنؤ میں، جو سید جالب دہلوی صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا، نائب مدیر ہو گئے تھے
چونکہ وہ ایک فطری انشا پرداز اور مزاح نگار تھے اس لیے نائب مدیر کی حیثیت کے
ساتھ ساتھ مزاحیہ مضمون بھی لکھ کر سید جالب کو دکھاتے تھے۔ شروع شروع میں سید
صاحب اُن کی ساری عبارت کو سرخ روشنائی سے قلم زد کر کے فرما دیتے تھے کہ
"جائیں آپ نائب کیجئے، یہیں کام آپ کے بس کا نہیں ہے۔" لیکن شوکت تھانوی
نے اُن کی اس ڈانٹ ڈپٹ کی پروا نہ کی اور برابر اُن کی ڈانٹ ڈپٹ کھاتے رہے اور
اُن سے اصلاح لیتے رہے۔" (شوکت تھانوی کے لطائف)

نسیم امروہوی مدیر سیارہ کے نام چودھری رحم علی الہاشمی سابق مدیر روزنامہ ہمدم لکھنؤ کے ایک حالیہ خط کا نقش بھی
اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمایئے۔

مکتوب بنام نسیم امروہوی

احاطہ کالے صاحب، قاسم جان اسٹریٹ دلی ۶
۲۳ مئی ۶۳ء

مکرمی نسیم صاحب

سلام علیک۔ "محرم" میں آپکے سفر دہلی کا حال پڑھکر
حیرت ہوئی کہ آپ دلی تشریف لائے اور میرے پڑوس میں قیام فرمایا اور مجھے اطلاع
تک نہ ہوئی پھر شوکت مرحوم کی تعزیت جو آپ نے کی ہے اُس میں تمام حالات سے واقف
ہونے کے باوجود آپنے وہ حصہ حذف کر دیا جس میں میرا کچھ ذکر آ جاتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ جب جالب صاحب مرحوم کے بعد میں نے "ہمدم" کا چارج لیا
ہے اس وقت شوکت صاحب شعبہ اشتہارات کے کلرک تھے میں نے سات کلرک سے
مختلف کام لے کر شوکت صاحب کو صرف دو دو باتیں کا کام لکھنے پر مامور کیا۔ اور اسی
میں سب سے پہلے "سودیشی ریل" چھپی جس پر میری اصلاحیں بھی تھیں بعد میں پھر اسے اور
بڑھا کر شائع کیا گیا۔ اس قدر جلد آپنے مجھے بالکل ہی اپنی یاد داشت سے خارج کر دیا۔

باقی بہر حال اللہ کا شکر ہے۔

نیاز مند

رحم علی الہاشمی

ان متضاد بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۰ اپریل ۱۹۲۹ء (شوکت تھانوی کے والد کے انتقال کی تاریخ)

۱؎ سید جالب دہلوی افیون کھاتے تھے اس لیے ان کی ساری گفتگو نون غنہ میں ہوا کرتی تھی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ [illegible] ترجمہ میں ہمیشہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کام [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اصلاحیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] چکے ہیں۔

"پہلے [illegible] حروف کی صحت پر ان کی توجہ تھی۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سہو کتابت [illegible] ہو جاتی تھی [illegible] میر صاحب کی [illegible] مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ کوئی چیز بغیر اصلاح کے رہ گئی ہو۔ [illegible] [illegible] ہر جگہ اصلاح موجود۔ اکثر تو اصلاح پر غصہ بھی آتا تھا۔ [illegible] [illegible] کے رہ گئے۔ ہم نے لکھا تھا ایک جگہ "نقطۂ نگاہ" آپ نے اس کو کاٹ کر "زاویۂ نگاہ" [illegible] ہوئے وہ اصلاح لے کر میر صاحب کے پاس پہنچے۔

"آپ نے "نقطۂ نگاہ" کاٹ کر "زاویۂ نگاہ" بنا دیا۔ اس میں کیا فرق پیدا ہو گیا۔؟"

سر جھکائے ہوئے بولے ـــ "بہت بڑا فرق ہے دونوں میں۔ "نقطۂ نگاہ" تجزیے کے موقع پر استعمال ہوتا ہے گویا آپ کی نظر پورے وثوق کے ساتھ ایک خاص نقطہ پر ہے اور "زاویۂ نگاہ" میں شک کا احتمال باقی رہ جاتا ہے۔ گویا نگاہ نے نقطہ تک پہنچنے کا ایک زاویہ تو بنا لیا ہے مگر ابھی وہ نقطہ نہیں دریافت کیا ہے جس موقع پر آپ نے لکھا ہے وہاں "زاویۂ نگاہ" زیادہ بہتر ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ "سائمن کمیشن" کے متعلق ہمارا "نقطۂ نگاہ" یہ ہے کہ حکومت نے اپنے تدبر کے فقدان کا ایک اور ثبوت دیا ہے۔ اگر یہاں "زاویۂ نگاہ" لکھ دیجیے تو آپ پر نتیجے کی ذمہ داری نہیں رہتی اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ سائمن کمیشن کا مقصد نتیجے پر پہنچ کر عین تدبر ثابت ہو۔ اس وقت اگر "زاویۂ نگاہ" غلط بھی ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں مگر "نقطۂ نگاہ" کا غلط ہونا ایک صحافی کی موت ہے" ـــ اپنا سا منہ لے کر چلے آئے۔
مختصر یہ کہ اس قسم کی اصلاحوں کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔"

غرض "ہمدم" میں دفتری امور، ترجمہ اور شذرات کے ساتھ ساتھ اخبار کا مزاحیہ کالم "ہدہد" [illegible] بھی لکھنا شروع

کہ سید جالب نے ان کے کالم کو سراہا اور حوصلہ افزائی کی۔ رفتہ رفتہ یہ کالم مقبول ہونا شروع ہوا اور بہت سے اخباروں نے بحث سے "دو دو باتیں" لکھنے والے کو اپنے کالموں میں۔ واقعہ یہ ہے کہ [illegible] ہو کر ان کا شمار اس زمانے کے مزاحیہ کالموں میں شوکت تھانوی صرف مرزا عبدالمجید سالک کے "افکار و حوادث" ہی کی مستعمل [illegible] سے متاثر ہوئے ہیں کہ انھوں نے جگہ جگہ اپنی تحریروں میں اعتراف بھی کیا ہے "دو دو باتیں" کی مقبولیت دوسرے اخبار اس کالم کو نقل کرنے لگے اور اس کالم کے فقرے لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔ "دو دو باتیں" نمونہ ملاحظہ ہو:

دو دو باتیں (روزنامہ ہمدم لکھنؤ پہلا دور)

"قرطاس ابیض کے متعلق ہم تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ آپ کوئی نہایت ہی عالم فاضل باشرع بزرگ ہوں گے۔ بڑی سی داڑھی ہوگی۔ ہاتھ میں تسبیح رکھتے ہوں گے بڑا سا عمامہ باندھے عبا وغیرہ پہنے ہوئے بالکل رمضان شریف کی طرح اونٹ پر سوار تشریف لائیں گے اور خود اپنے السلام علیکم سے اپنی آمد کی اطلاع دیں گے لیکن جب ہر طرف اس کا شور بلند ہوا کہ "قرطاس ابیض آگیا۔ قرطاس ابیض آگیا" تو خاکسار بار بار سر پر شتر سوار کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا مگر جناب مولانا قرطاس ابیض کا کہیں پتہ نہ تھا کہ وہ کس راستے سے تشریف لائے اور کہاں گئے، مجبوراً لوگوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ آپ اخبار پاینیر میں تشریف رکھتے ہیں۔ اب جو پاینیر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

بہرحال ہم نے شروع سے آخر تک اس قرطاس کو دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو ایک معمولی سی سمجھ کے انسان کے ذہن میں نہ آجاتی چہ جائیکہ ہم۔ مختصر یہ کہ ہم نے اس کو ایک مرتبہ پڑھا اور دوسری دفعہ مع مضمون کے پڑھ کر بخوبی سمجھ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اب چپ رہو ذرا دیکھو تو دوسری بڑی بڑی کھوپڑیوں والے کیا فرماتے ہیں بلکہ اس مسئلے کے اس کے بعد میاں بافو تم بھی اکثریت کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دینا یہی تمھاری رائے ہوگی اور در اصل یہی محفوظ ترین رائے ہے بلکہ موجودہ زمانے کے تدبر کا راز اسی ایک نکتہ میں پنہاں ہے کہ انسان اقلیت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے بس چپکے سے اکثریت کے ساتھ ہو جائے ورنہ نتیجہ یہی ہوگا کہ تمام دنیا انگشت نمائی کرے گی اور اس انگشت نمائی کی تاب ظاہر ہے کہ صرف وہی لوگ لاسکتے ہیں جو کچھ پڑھے لکھے ہوں اور بہرحال اپنے لیے امن اسی میں ہے کہ جو سب کی رائے وہی ہماری ورنہ اختلاف

[illegible]

[illegible]

سکتا ہے۔۔۔!

بہرحال ہر گز اس [illegible] سے کوئی سروکار نہیں یہ بہرحال سنجیدہ ہیں، ہماری رائے بہرحال سنجیدہ ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ یہ آئینی دستاویز گورنر [illegible] خوشنویسوں کو گورنری یا گورنر جنرلی کا مستحق نہیں بنا سکتی ہے، [illegible] اس ایک خامی کے ہر طرح مکمل ہندوستان کی موسمی حالات کے عین مطابق ہے یعنی نہ یہ مئی اور جون کی گرمی میں ناگوار ہوگی اور نہ دسمبر جنوری کی سردی میں۔

اسی زمانے میں رسالہ "پیمانہ" میں "امرود" اور "پان" وغیرہ کے عنوان سے ساغر نظامی کی کچھ شوخ نظمیں شائع ہوئیں جن کی تیزی اور بے حجابی پر دوسرے بزرگوں کے علاوہ سید جالب نے بھی شدید اعتراض کیا۔ سید صاحب نے "ہمدم" میں "ادب کے نام پر فحاشی" کے عنوان سے ایک بہت سخت اداریہ لکھ دیا جس پر سید صاحب اور علامہ سیماب اکبرآبادی میں ان بن ہوگئی، اور وجہ یہ تھی کہ لکھنؤ میں سیماب اور ساغر کے پیچھے پیچھے جھاڑ کر پڑا ہوا تھا۔ اور دونوں کے کلام کی سخت پیروڈی کر رہا تھا۔ سید صاحب نے لکھا تھا کہ علامہ سیماب ذاتیات پر اتر آئے اور اپنے پرچے "تاج" آگرہ میں ان کی افیون نوشی پر کھرا مارا کہ "یہ افیونی اپنی پینک سے اس وقت چونکا ہے جب زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے اور اب یہ اعتبارات کی لکیر پیٹ رہا ہے" اس پر سید جالب نے برافروختہ ہوکر اس معرکہ کی کمان شوکت تھانوی کے سپرد کر دی اور "دو دو باتیں" کا کالم علامہ سیماب کے لیے وقف ہوگیا۔ جس کا تذکرہ ہمدم کے دوسرے دور کے ذیل میں آئے گا۔ اسی دوران منتظمین "ہمدم" اور سید جالب سے پالیسی کے سلسلہ میں ان بن ہوگئی۔ انھوں نے "ہمدم" سے

انتقال ہو گیا اور ہمدم کے بعد ہمت کرکے خود اپنا ذاتی اخبار "ہمت" نکالا۔

سید جالب نے "ہمدم" سے علیحدہ ہونے کے بعد ۱۹۳۶ء میں جاری کیا اور اس میں

روزنامہ ہمت لکھنؤ کا مزاحیہ کالم شوکت تھانوی کے سپرد کیا۔ کچھ عرصہ بعد سید جالب کا انتقال ہو گیا

"ہمت" اخبار بند ہو گیا۔ "ہمت" میں شوکت تھانوی کی "دو دو باتیں" کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

دو دو باتیں (روزنامہ ہمت لکھنؤ)

یہ ٹھیک ہے کہ جس گھر میں بیری ہوتی ہے اس میں ڈھیلے آتے ہی ہیں۔ ایک لڑکی کی شادی کے لیے خدا جانے کتنے پیغامات آتے ہیں اور کس قدر امیدوار کوشش کرتے ہیں لیکن نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ صرف ایک ہی کامیاب ہوتا ہے باقی سب ناکام رہ جاتے ہیں۔ اس قسم کے اتفاقات شاذ و نادر ہوتے ہیں کہ بیک وقت ایک سے زیادہ امیدوار کو اس قسم کے معاملات میں کامیابی حاصل ہو لیکن یہ تو دنیا ہے یہاں کم واقعات بھی بکثرت ہوتے ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کے اتفاقات ہوتے ہی نہیں البتہ کم و بیش کا فرق ہے چنانچہ جو قصہ ہم سنانے والے ہیں وہ اسی قسم کے واقعات میں سے ایک ایسا واقعہ ہے جو اگر اپنی نوعیت کا پہلا نہیں تو کم از کم عجیب و غریب ضرور ہے اور آپ یقیناً اس کو سن کر دنگ رہ جائیں گے۔

اسی مارچ کے مہینے کا واقعہ ہے کہ جون پور میں ایک دلہن کو بیاہنے کے لیے دو مختلف دولہا اپنی اپنی براتیں لے کر دلہن کے یہاں آ موجود ہوئے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ ایک بیوہ پٹھانی نے اپنی حسین و جمیل اکلوتی بیٹی کی شادی ایک جگہ طے کی اور یہ سودا ساڑھے دو ہزار روپے پر طے ہوا لیکن اس اثنا میں ایک دیہاتی گاہک بھی پیدا ہو گیا اور اس نے اس جنس لطیف کو حاصل کرنے کے لیے چار ہزار روپیہ لگا دیا۔ ٹھیک ہے کہ ع

مال اچھا ہے تو دنیا میں خریدار بہت

دلہن کی تجارتی دماغ رکھنے والی والدہ ماجدہ نے دونوں گاہکوں کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنی ایک عدد بیٹی کے لیے دو عدد براتیں ایک ہی وقت میں اپنے یہاں طلب کر لیں تاکہ دونوں امیدوار ایک دوسرے کے سامنے بولی بولیں اور جو زیادہ دام لگائے اسی کے نام نیلام ختم کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اس طرح قیمت چار ہزار سے بھی بڑھ جائے اور ایک دوسرے کی ضد پر دونوں خریدار قیمتوں میں اضافہ کر دیں۔

خیر صاحب دونوں براتیں بیک وقت دلہن کے گھر پہنچ گئیں اور ہر ایک امیدوار نے اپنے دوسرے رقیب کو دیدۂ حبیب پر دیکھ لیا۔ لیکن یہ قصہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا اب ذرا ٹیپ کا بند

[illegible]

ناکامی کے بعد [illegible] ہو جاتا ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] دولہا [illegible] نے پولیس میں رپورٹ کر دی [illegible]

[illegible]

جس نے ایک لڑکی کے بعد [illegible] دولہا تیار کئے [illegible]

دولہا کہنا چاہیئے ۔

روزنامہ ہمدم لکھنؤ (دوسرا دور)

سید جالب کی "ہمدم" اخبار سے علیحدگی کے بعد اخبار کی ادارت ایک ہفتہ تک سابق مدیر "مدینہ" بجنور ملک نصراللہ خاں عزیز نے کی ان کے بعد قاضی محمد حامد صاحب حسرت قائم مقامی کرتے رہے اور دو دن کے لیے شوکت تھانوی بھی ہمدم کے ایڈیٹر رہے پھر چودھری رحم علی الہاشمی نے باضابطہ ادارت سنبھال لی۔ ہاشمی صاحب آتے ہی "دو دو باتیں" کا مزاحیہ کالم شوکت تھانوی کے سپرد کر دیا۔ علامہ سیماب سے "دو دو باتیں" میں ہمدم کی معاصرانہ نوک جھونک جاری تھی اور اب اس ناخوشگوار بحث نے باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی علامہ نے اپنے اخبار کے علاوہ اپنے ایک شاگرد خواجہ ستار الحسن جمیل مدیر "فرشتہ" ہفت روزہ سے بھی ہمدم کے خلاف آتش فشانی شروع کروا دی "فرشتہ" کی ایک تحریر کا جواب دیتے ہوئے ہاتفی نے لکھ دیا کہ "فرشتہ تو فرشتہ اس عالم الملکوت تک کے فرشتوں کو کیا اس کی خبر

چونکہ "ہمدم" روزانہ اخبار ہے اور یہ گزشتہ دو (ہفتے) والے ہفتہ وار اخبار ہیں کہ معاملہ [illegible] بار بار جواب لکھنے سکیں نہ ہی ہفتہ کے بارہ دو سالانے کو، جو ادا کریں گے کہ ہمیں آپ سے "ادبی معرکہ" کا جواب دیا کرے

ادب باقی ہے اور نہ شعر اور باقی ہے
فقط طاغوتیوں کی فکر ملعون زادہ باقی ہے
کوئی ہمدم کے بازار سے ملکہ خریدے
کہ شعطار مرگیا اس کی گھر دو باقی ہے

چند قسم کے بزرگ اس ناخوشگوار بحث کو ختم کرانا چاہتے تھے چنانچہ چودھری رحم علی الہاشمی مدیر ہمدم نے اس جنگ کو ختم کرنے کے لیے شوکت تھانوی سے اصرار کیا۔ شوکت تھانوی نے رسالہ "پیام" میں یگانہ کی تازہ غزل پر سخت تنقید کرتے ہوئے اور ایک مضمون کو چٹکیوں میں اڑاتے ہوئے (علامہ یگانہ کا مقلد ہو چکا تھا۔ جو [illegible] جس فطرت کا مسخرہ ہے) لکھ دیا کہ "اب جبکہ مولانا نے خود اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اب ہم کو مولانا کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے اور آج سے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔"

رسالہ انکشاف "لکھنؤ ظریف نمبر"

اسی دوران چودھری رحم علی الہاشمی نے ایک آنہ فنڈ لکھنؤ کا ہفتہ "انکشاف" کے ایڈیٹر نسیم انہونوی کو شوکت تھانوی سے ملوایا۔ نسیم انہونوی "انکشاف" کے لیے مضمون لینے گئے تھے اس ملاقات کے بعد دونوں میں چٹکیں چلنا شروع ہو گئیں یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے ہمیشہ کے لیے جگری دوست ہو گئے۔ شوکت تھانوی کے مشورے پر نسیم انہونوی نے "انکشاف" کا سالنامہ "ظریف نمبر" کی صورت میں فروری ۱۹۳۳ء میں بڑے دھوم دھام سے نکالا۔ اس نمبر کو شوکت تھانوی نے مرتب کیا تھا اس نمبر میں ہندوستان کے تمام طنز و مزاح نگار شریک تھے۔ اس زعفران زار نمبر کا اداریہ شوکت تھانوی نے "بیگار" کے عنوان سے لکھا تھا جس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:-

"کس کی نوکری اور کون ڈالے گھاس، یعنی رسالہ ایک آنہ فنڈ کا، ایڈیٹر اس کے میاں نسیم صاحب اور شذرات لکھیں مولانا شوکت تھانوی، گویا مولانا شوکت تھانوی نہ ہوئے کرایہ کے بلکہ بیگار کے ٹٹو ہو گئے۔ کہ چاہے جس میں جوت دیا، چاہے تانگہ میں لگا دیا، ہم کو تو کچھ چلنے سے کام، یہ رمضان شریف کا زمانہ دیکھئے، یہ عید کی آمد اور اس سلسلہ میں ہندوستان کے رسائل کے عید نمبروں میں ہمارے مضامین کا شریک ہونا ملاحظہ فرمائیے اور پھر سرے پر سوتے یہ شذرات لکھنا دیکھئے، شذرات کیا لکھ رہے ہیں حق دوستی بھگت رہے ہیں۔"

انکشاف کا ظریف نمبر بے حد مقبول ہوا مگر اس کے ساتھ پالیسی سے اختلاف کی بنا پر نسیم انہونوی "انکشاف" سے کنارہ کش ہو گئے اور اسی کے سال بھر بعد شوکت تھانوی کے مشورے سے "سرپنچ" ہفتہ وار نکالا اور اس کی

عنوان: سرگزشت نقوش کے سلسلے میں:
سرگزشت [illegible] ۔ بمطابق [illegible] ۔ بیگم خاں ۔ ۱۹۶۰ء [illegible] لاہور میں شائع ہوا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

دو دو باتیں (روزنامہ ہمدم لکھنؤ ۱۹۲۰ء)

ہم تو اب تک صرف یہی سمجھتے تھے کہ ڈارون ہی ایسے مسلمان گزرے ہیں جن کے مورث اعلیٰ بندر تھے اور جنہوں نے اپنے مطبوعہ علم و ہنر کے اسرار پر کر بندر کی نسل کا بتایا ہے لیکن دنیا کی ترقی کے ساتھ روز بروز حضرت انسان کی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور یہ راز افشا ہوا جاتا ہے کہ وہ انسان جو اشرف المخلوقات ہونے کے زعم میں مبتلا ہے دراصل کیا ہے اور کیا تھا ہے۔ واللہ بعض اوقات ان ہی تحقیقاتوں کے نتائج معلوم کر کے اپنے انسان ہونے پر بےساختہ آتا ہے اور یہ غصہ حق بجانب ہے۔ آپ ہی انصاف کیجئے کہ وہ انسان جو بندر کی اولاد ہو، اگر انسان ہی ہے تو پھر کس کام کا، جس کے آباؤ اجداد تو وہ درختوں پر اُون اُون کرنے والے جانور تھے جن کو آج ہم اور آپ کھانے کی تلقین کرنے کے [illegible] کر کر بھگاتے ہیں اور جو درختوں پر ٹہنیوں ٹہنیوں چھلانگیں مارتے پھرتے ہیں۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ کسی بندر کو اپنا بندر گھر کر دیکھا جائے اور یہ طے کر لیا جائے کہ ہم اسی کی اولاد میں سے ہیں پھر دیکھئے کہ خود انسان اپنی نظروں میں کس قدر ذلیل ہو جاتا ہے اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا غرور کس بری طرح شکستہ ہوتا ہے۔

خیر یہ تو بندر ہی کو آباؤ اجداد بنانے کا قصہ تھا اب ملاحظہ فرمائیے کہ جزائر نکوبار کے باشندے اپنے کو کتے کی نسل سے کہتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں یعنی ڈارون صاحب نے تو انسان کو بندر کی اولاد کہا تھا لیکن نکوبار کے باشندے کتے کو اپنا جد اعلیٰ سمجھتے ہیں ان کا بیان ہے کہ سب سے پہلا انسان جو نکوبار میں آیا وہ مرد تھا اور اس کے ساتھ ایک کتیا تھی۔ اس اللہ کے بندے نے نکوبار میں سکونت اختیار کر کے اسی کتیا کو اپنی اہلیہ محترمہ بنا لیا اور اس کتیا سے تھوڑے دنوں کے بعد ایک صاحبزادے تولد ہوئے ان پر صلوات آ گئے

یہ حرکت کی کہ جب نام خدا جوان ہوئے تو اپنی والدہ ماجدہ کو کہیں [illegible] بزرگوار یعنی کتیا کے معزز شوہر کو مار ڈالا اور اپنی والدہ کے بلا شرکت غیرے شوہر بن گئے چنانچہ اب جتنے بھی نکو بار کے اصل باشندے ہیں وہ اسی نسل سے ہیں [illegible] ابھی تک نہیں بھولے ہیں اور کتوں، کتیوں کو نہایت عزت و احترام سے [illegible] کرتے ہیں اور وہی سلوک اس جانور کے ساتھ برتتے ہیں جو کوئی سعادت مند فرزند [illegible] کے ساتھ کر سکتا ہے ان کے یہاں کتے کو مارنا جرم گنا گیا ہے اور واقعی گستاخی ہے۔

ملاحظہ فرمایئے کہ ابھی تک حضرت ڈارون صاحب نے بندر ہی کو باپ کہا تھا لیکن یہاں کتیا کو بھی اماں کہنے والے موجود ہیں لیکن باوجود اس کے افسوس ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے گھمنڈ میں اکڑا ہی جاتا ہے وہ تو کہیے کہ نکو بار کے باشندوں نے صرف اپنے کو کتیا کا جنا کہا ہے ڈارون کی طرح تمام دنیا کو بندر کی اولاد نہیں کہا ورنہ ہم ان کو بھی کیا بنا لیتے اگر وہ اپنے ساتھ ساتھ تمام دنیا والوں کو کتیا کے بطن سے پیدا ثابت کرتے اس لیے ہم نے تو ڈارون کی اس گالی کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ سنا جب اس نے ہم سب کو ایک سرے سے بندر کا بچہ کہہ دیا اور ہم اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکے نہ اس پر کسی ہتک عزت کا مقدمہ دائر کیا اور نہ کوئی شرافت اور نجابت کا دعویدار اس پر آمادہ ہوا کہ ڈارون کی اور اپنی جان ایک کر دے تو جناب ہماری شرافت سے یہ کب بعید تھا کہ ہم کو نکو باری کتے کی نسل سے کہتے اور ہم خاموش ہو جاتے مگر یہ اہل نکو بار کی شرافت تھی کہ انہوں نے اس شجرۂ نسب کو اپنے ہی تک محدود رکھا اور باقی تمام دنیا پر یہ عنایت فرمائی کہ ان کا شجرہ کتوں اور کتیوں سے نہیں ملایا۔

انسان کے متعلق یہ دو روایتیں تو خیر ہو ہی چکیں لیکن ہم کو اندیشہ ہے کہ ؏

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

اور ہر وقت ہم ڈرتے رہتے ہیں کہ خدا جانے یہ محققین ہم کو کیا ثابت کر دکھائیں اس سے آپ اطمینان رکھیے کہ ان چھان بین کرنے والوں سے کوئی بات بعید نہیں ہے جب چاہیں گے انسان کو بندر کا بچہ ثابت کر دیں گے اور جب چاہیں گے یہ کہہ دیں گے کہ صرف نکو بار ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسان کتیا کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں بس ہم کو تو یہ دعا کرنا چاہیے کہ خدا ان محققین سے ہم کو نجات دلائے اور عزت آبرو کے ساتھ جیسا انسان ابن انسان ابن انسان بلکہ ابن انسان پیدا کیا ہے اسی طرح انسان ابن انسان ثم انسان ابن انسان اس دنیا سے اٹھا لے ورنہ خدا جانے انسان پیدا ہو کر کس جانور کی اولاد بن کر ہم کو دنیا سے اٹھنا پڑے۔

[illegible] شوکت تھانوی کی [illegible] جو سنگم میں [illegible] سرگزشت

سرپنچ ہفت روزہ لکھنؤ سے [illegible] جس کے نام کی ضمانت پیش [illegible]

عوامی ہونا [illegible] سرپنچ کی صحت [illegible] [illegible]

سرپنچ کو [illegible] اشاعت [illegible] اور اس کے

[illegible] سے اعتراف کرنا پڑے گا۔

سرپنچ اور اودھ پنچ کے اثرات

اودھ پنچ کا [illegible] سال [illegible] سرپنچ [illegible] [illegible] سرپنچ کے صفحات [illegible] حقیقت ہے کہ سرپنچ نے اودھ پنچ کی سمت [illegible] سرپنچ کے موجود [illegible] تہذیب و ترتیب [illegible] اودھ پنچ کے [illegible] دونوں کے [illegible] حال میں [illegible] ظرافت [illegible] ایک [illegible] فرق [illegible] ہیں کہ دونوں [illegible] زمین اور آسمان کا فرق ہے شوکت تھانوی [illegible] محمد حسین [illegible] حسین [illegible] [illegible] مرشد [illegible] ملا رموزی [illegible] احمد علی شوق [illegible] حسین [illegible] کے بجائے [illegible] کو [illegible] سے سرپنچ کے [illegible] کے بجائے [illegible] سنجیدگی اور خوش مزاجی [illegible] کے بجائے [illegible] ہیں اور [illegible] کر لیتے ہیں اور خود ہنس کر دوسروں کو ہنسنے پر مجبور کرتے ہیں مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ [illegible] مسائل کی سوجھ بوجھ یا حالات و واقعات کا ادراک نہیں ہے [illegible] ہوتے ہوئے بھی ان کا دل محض ایک عاشق کا [illegible] ہے ان کی صحافت میں گرمی بھی ہے مگر یہ گرمی اودھ پنچ کے آتش فشاں کے لاوے کی صورت میں نہیں نکلتی بلکہ [illegible] بزم کے [illegible] سے نکلتی ہے۔ اس گرمی کا قوام تجسس، سنسنی خیزی اور دلچسپی سے [illegible] کرتا ہے۔

اس میں [illegible] نہیں کہ اودھ پنچ کے بعد اردو ادب میں طنز و ظرافت کا سب سے بڑا خزانہ ہمیں سرپنچ ہی کا ملتا ہے۔ سرپنچ، اودھ پنچ کی طرح محض اپنے لکھنے والوں ہی پر قناعت نہ کرتا تھا بلکہ ظرافت نگاروں کا ایک وسیع حلقہ [illegible] درآمد کر لیتا تھا۔

علاوہ دوسرے رسائل و اخبارات کی ظرافت کو بھی سرپنچ میں [illegible] سرپنچ کے [illegible] اس کے [illegible] اور برادری کی صحافت، ان کے [illegible] باغ و بہار کالم، خاص [illegible] انتخابات [illegible] تبصرے اور خطوط ایک انمول اور انمٹ خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اودھ پنچ کے بعد سرپنچ کا ہمارے مزاحیہ ادب میں سب سے اہم مقام ہے۔ سرپنچ نے مزاح نگاروں کی ایک پوری نسل کو جنم دیا، شائستہ ظرافت اور مزاح کے لیے فضا پیدا کی اور کاروان طنز و ظرافت کو ایک نئی منزل عطا کی۔ سرپنچ کے خس و خاشاک [illegible] آمیزش اور خوشبو ہے۔ غرض سرپنچ شوکت تھانوی کا ایک ایسا محترم کارنامہ ہے جو ہمیشہ ان کے نام کو زندہ اور

[illegible] رہے تھے۔

سرپنچ کی [illegible]

بہت جلد سرپنچ میں شوکت تھانوی کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ [illegible] جاننے کو معلوم نہیں کب کس کی خبر لی جائے۔ سرپنچ میں [illegible] شوکت تھانوی نے مزاح کے ساتھ ساتھ سنسنی خیزی، گرمی اور تجسس کا عنصر بھی شامل کر دیا تھا۔ [illegible] نقلیں، خطوں اور خبروں کے ساتھ ساتھ معاصرین سے معرکے اور نوک جھونک رہتی۔ وہ ہلکا پھلکا طنز تبصرے کے انداز میں [illegible] کے ساتھ ایک بانکپن کی بھی شان تھی، وہ ان کی پالیسی تھی۔ اسی وجہ سے کبھی سرپنچ کا اداریہ ہوتا مگر ایک شگفتہ مزاح بھی ضرور نمایاں ہو گیا۔

سرپنچ پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دینے کے لیے کبھی یہ خبر چھپتی کہ ایڈیٹر سرپنچ کو ملک بھر سے دھمکی آمیز خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ کبھی ان فرضی خطوط کی نقلیں شائع کی جاتیں جن سے پڑھنے والوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ کبھی [illegible] کہ دھمکی دینے والے نے دفتر سرپنچ کی فائلوں میں آگ لگانے کی ناکام کوشش کی ؎

سرپنچ کو جلانے کی کوشش میں تھک نہ جاؤ
چنگاریوں سے اس کو جلایا نہ جائے گا

پھر ہزاروں روپے کی اور بندوقوں کے سائے میں دفتر کا دروازہ دھمکی دینے والے کو پکڑنے کے لیے کھول دیا جاتا تو اندر سے کراہ کراہ کرتا ہوا ایک خارشی کتا برآمد ہوتا۔ اور کبھی ملاقاتی حامد ڈاکر کی جگہ حامد شاہ جہانپوری نکلتا۔ کبھی [illegible] پارک میں مرحلے جلسے کی خبر چھپتی، کبھی مس کجی دفتر سرپنچ میں رونق افروز ہوتیں، شائقین اور طلباء ان سے ملنے کے لیے جا کر بیٹھ جاتے کہ ابھی جلوہ گر ہوں گی۔ پھر خاص اعلان پیش کیا جاتا جس کے کمرے میں جانے پر پانی کی جگہ ایک پیالی [illegible] بشارت تھی اور ملاقاتی کھسیا کر خاموشی کے ساتھ دوسرے دروازے سے نکل جاتا۔

وہمی وہانوی کا کردار

اسی ہنسی، دل لگی بازی اور سنسنی خیزی کے بنیادی جذبہ نے سرپنچ کے صفحات پر وہمی وہانوی کے رسوائے زمانہ کردار کو جنم دیا۔ شروع میں شوکت تھانوی کے وہمی وہانوی غالب پر مصرعے لگاتے اور تک بندی کرتے تھے ؎

تقدیر کا لکھا وہی کچھ بھی نہ پڑھ سکے
گویا کہ جو کچھ لکھا ہے بخط شکست ہے

محبت میں کیا جانے کیا کر رہے ہیں
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں

مئے گلرنگ ابھی انگور کی دوشیزہ بیٹی ہے
آزمائے جو کوئی انگور کا داماد ہو جائے

اس کے بعد وہمی وہانوی کا چلن بگڑا۔ "تکلم"، "بھنور" اور "تکلہ" کی "دلدل" میں ایسے پھنسے کہ الامان الحفیظ،

[illegible] ——— شوکت نمبر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شوکت تھانوی [illegible] سرپنچ کے [illegible]

[illegible]

[illegible] شوکت تھانوی کے اداریے بڑے ہنگامہ خیز ہوتے تھے۔ لکھنؤ میں حامد ذاکر [illegible] پولیس [illegible] کے سامنے [illegible] ایک معاملہ میں حامد ذاکر کو پولیس نے گھیرا مگر وہ صاف نکل گیا۔ اس پر سرپنچ میں "منتقم اور مظلوم پولیس" اور "ظالم حامد ذاکر" کے عنوان سے بہت سخت اداریہ لکھ دیا۔ جس پر یہ شعر بھی چھاپا گیا تھا کہ

نامکمل ہے ابھی وردی پولیس کی حضور
چوڑیوں کا بھی اضافہ اس میں ہونا چاہیے

پولیس کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے یہ شعر بھی چست کیا گیا تھا کہ

حامد کا ہر ایک جانب ہوتا نظر آتا ہے
معصوم پولیس کو اب کیا کیا نظر آتا ہے

[illegible] معرکے کے اداریہ کی دھوم مچ گئی اور پرچہ کی اتنی زیادہ مانگ ہوئی کہ سرپنچ کے اسی شمارہ کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ پولیس نے سرپنچ پر مقدمہ چلانے کی بہت کوشش کی مگر اس میں اسے کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ پرچہ کی مقبولیت میں سرپنچ اور چرخہ کے قیامت خیز معرکے نے بھی بہت اضافہ کیا تھا۔ چرخہ کجن بائی کا حمایتی تھا اور سرپنچ پیچھے ہاتھ دھو کر کجن بائی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ شوکت تھانوی کی ناول "بڑھیس" جب سرپنچ میں قسطوں میں شائع ہونا شروع ہوئی تھی تو اس کی قسطوں کا پڑھنے والوں کو بے قراری کے ساتھ انتظار رہتا تھا۔ اس میں ان کی قلمی تصویروں کا سلسلہ بھی بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دیوان غالب کی مزاحیہ شرح کی قسطیں، ہنڈی کاٹے، سودیشی مضامین، موج تبسم،

بحرِ تبسم، سیلابِ تبسم اور طوفانِ تبسم کے مضامین بھی پہلے سرپنچ ہی میں شائع ہوئے تھے۔ ہر دو کا چربہ تین کلام، چائے عشق کا، دوست، سسرال، اگر میں تھانیدار ہوتا، کچھ، یہ لوگ ان ہی میں سے ہیں۔ اگر میں بادشاہ ہوتا، خدا حافظ، شاعر، شامت، سودیشی مشاعرہ، عاشق ہونے کے لیے کسی ... چوری اور سینہ زوری وغیرہ بے شمار مضامین، افسانے، ناول اور ان کی مزاحیہ شاعری کے نمونے اسی میں ... ہوتے رہے۔

نسیم انہونوی سرپنچ کے پروپرائٹر ہونے کے علاوہ شوکت تھانوی کے جانے کے بعد اس کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہر حال میں سرپنچ کو ہمیشہ جاری رکھا اور شوکت تھانوی کے علاوہ ایک مسعود، حسن صدیقی، جلال ملیح آبادی، جمال رضوی، ... محبوب ... کو بھی سرپنچ کا ممبر (؟) کیا۔

سرپنچ کے نورتنوں میں نسیم انہونوی کی ہمیشہ بڑی اہمیت رہے گی۔ سرپنچ میں ۱۹۳۲ء میں ان کا افسانہ ... شائع ہوا تھا اسی کی بنا پر بعد میں شوکت تھانوی نے ۱۹۳۳ء میں خدانخواستہ کے عنوان سے پہلے مضمون لکھا اور پھر اسے بڑھا کر ناول بنا دیا۔ "آتشِ دنیا" سے متاثر ہو کر مرزا ... نے ... "الٹی گنگا" ...۔ سرپنچ کے صفحات پر ... بے شمار مضامین اور افسانے بکھرے ہوئے ہیں جن کی شیرازہ بندی کی ضرورت ہے۔ ان میں گھوڑوں کی کاشت، ... حلاوت، لاری کا سفر، حواصل، ہما خانم، تانگہ خریدا، شلغم، بدمزگی، چھا چھکی نے کرشن پکارا، ڈپلیکٹ شادی، ہیروں کا سینیچر، اور شریر بیوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے مضامین، افسانے، ناول کی قسطیں، شاعری کے نمونے اور "دم چھلے" کے مضامین برابر سرپنچ میں چھپتے رہتے تھے۔ "دم چھلے" سے مراد یہ ہے کہ جیسے مضمون شوکت تھانوی نے شروع کیا جہاں سے انھوں نے ختم کیا وہاں سے عظیم بیگ چغتائی لکھ کر چلے۔ غرض اسی طرح سلسلہ جاری رہا۔

فرحت اللہ بیگ کی چٹخارے دار نثر اور گدگدانے والی نظم سے سرپنچ کا صفحہ صفحہ نظر آتا ہے۔ ان کے بیشتر اہم مضامین اسی میں شائع ہوئے۔

مُلّا رموزی کی گلابی اردو کے گل بوٹے اور ان کی چلبلی نثر سرپنچ کے حسن میں اضافہ ہے۔ یہ اس کے انتہائی مستعد قلم کاروں میں سے ہیں۔

چودھری محمد علی ردولوی اودھ پنچ سے ہجرت کرنے کے بعد سب سے آگے سرپنچ میں نظر آتے ہیں۔ ہجری دور میں اودھ پنچ برائے نام رہ گیا تھا اور کوئی دوسرا مزاحیہ پرچہ اس کی ٹکر کا نہ تھا۔ ان کے خاصے کے مضامین اودھ پنچ کے بعد سرپنچ میں ملتے ہیں۔

ظریف لکھنوی اودھ پنچ کی طرح سرپنچ کے بھی سب سے خاص لکھنے والے تھے۔ سرپنچ میں ان کی شرکت ایک بزرگ کی شرکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا بیشتر نمائندہ کلام سرپنچ کی جلدوں میں محفوظ ہے۔ مثلاً سرپنچ کا ایک مشورہ سنیے —

[illegible]

[illegible]

[illegible] چھوڑ دی [illegible]

[illegible] شعرا شہباز جند پرواز [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے [illegible]

[illegible] علامہ عبدالباری آسی [illegible]

[illegible]

[illegible]

لغات الظرفا

فیشن	بھیڑ چال
فادر	انگریزی داں کا باپ
ضدی	امیدوار ملازمت
مذہب	جذبۂ جنگ
مشاعرہ	دنگل
مروّت	دل کی کمزوری
مریضِ ہجر	شاعر
نجدی	دنیا سے باخبر اپنے سے بے خبر
دیوان	شاعر کا اعمال نامہ
بدیہہ	قاضی الحاجات
شذرات	[illegible]

امین سلونوی رسالہ ترجمان نظر، نظر، اور دوسرے اخبارات اور یونائیٹڈ نیوز سروس کے ادارہ تحریر سے وابستہ رہ چکے مدیر اور ہیڈ شعبہ اشتہارات بھی تھے۔ ان کی ادارت کی ابتدا "شب تاب" کے عنوان سے ہوئی تھی اور بمبئی کے "بیکر" فرزند اردو ہو وسنہ "دنیا میں جنم" کے نام سے چھپا تھا۔ سرپنچ کے عنوان سے بھی ان کے بے شمار مزاحیہ مضامین چھپتے رہتے ہیں۔

منور آغا مجنوں لکھنوی سرپنچ کے تقریباً ہر شمارے میں آپ کے نظر آتے تھے۔ "بیاض مجنوں" کے عنوان سے مستقل شائع ہوتے تھے ہر لحاظ سے یہ ایک اہم شاعر ہیں اور سرپنچ کا ذکر بھی مرزا مجنوں کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔

احتشام حاملی سرپنچ کے سلسلے میں یہ انکشاف بھی خاصا دلچسپ ہوگا کہ سید احتشام حسین افسانہ نگاری سے قبل سرپنچ کے باقاعدہ مزاح نگار اور اس کے ممبروں میں سے تھے۔ اور مزاحیہ شاعری میں حیران تخلص کرتے تھے۔ ان کے رنگارنگ مضامین مثلاً ہاسٹل کا شیطان، سیاہ بیچ، مشاعرے، فاؤنٹین پن، ہنگامۂ دار و گیر، ایڈیٹر، ہمدردی، وصال ہوگیا اور معشوقہ بیوی وغیرہ اب بھی سرپنچ کی جلدوں میں محفوظ ہیں۔

عبداللہ ناصر بھی اودھ پنچ ہی تھا۔ جو سرپنچ میں پہلے پہلے یہ سرپنچ کے ہر ہنگامہ میں آگے آگے نظر آتے ہیں۔

سرپنچ برادری میں خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری، حکیم ممتاز حسین عثمانی، مولانا عبدالمجید سالک، پطرس، رشید احمد صدیقی، علامہ جمیل مظہری، سلطان حیدر جوش، ایم اسلم، دیوانہ گورکھپوری، فلک پیما، نازش بدایونی، سید بہادر ترنم، ارشد تھانوی، آوارہ حیدرآبادی، حامد شاہجہانپوری، ماچس لکھنوی، علامہ مضحک دہلوی، فرقت کاکوروی، حافظ غازی پوری، باسط بسوانی، فخر نظامی، دیوانہ بریلوی، اشتیاق احمد علوی، مضطر مکرامی، رسوا بسوانی، درد کاکوروی، عنایت دہلوی، ملا حضوری، نظر بریلوی، شمیم بیلوری، ہیم ندوروی، خان محبوب طرزی، علامہ ہنٹر، محب دریابادی، بوم پاپڑی، سحر عابدی، مظفر احسانی، شوخ لکھنوی، اشرف لکھنوی، ناکارہ حیدرآبادی، اور غضنفر محمد خاں وغیرہ اس کی برادری یا "پنچایت" میں شامل تھے۔

سرپنچ کے اداریے بڑے نوکیلے تیز اور دھار دار ہوتے تھے۔ ان میں بلا کا طنز اور گرمی ہوتی تھی۔ کہیں کہیں مزاح کے چھینٹوں کی وجہ سے ان میں دھواں آتشبازی نظر آتا ہے جس سے ایک خوشگوار سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھیے شوکت تھانوی سرپنچ کے اداریہ میں "انگارے" کے بارے میں کیا لکھتے ہیں:۔

انگارے

۔ یہ انگارے وہ نہیں ہیں جو آگ لگانے کے بعد . . . . کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں،
بلکہ ہمارا مقصد "انگارے" سے وہ کتاب ہے جو آجکل اخبارات کا دلچسپ ترین اور مسلم اخبارات

کا ہم تذکرہ ہی بے معنی ہے ...... اس کا فیصلہ کرنا ہے کہ دل تک سب جل بجھی رہ گیا ہے، اور ہم مشغول ہیں کہ ہم نے بستر ہی دیکھے ہوئے بستر آراستہ ہی کیوں تھا — یہ کتاب دراصل دو مکمل اور پچیس افسانوں کا ایک ذخیرہ ہے جس کو ٹیپ ... جو مصنف کی ادبی کاوشوں سے مرتب کیا ہے ... یہ افسانے ... لکھے گئے ہیں، دو افسانے احمد علی صاحب کی ادبی بدتمیزی کا مجموعہ ہیں، دو افسانے رشید جہاں صاحبہ کی انشاپردازی کا نمونہ ہیں اور ایک افسانہ محمود الظفر صاحب کا لکھا ہوا ہے ... ان دسوں افسانوں کو پڑھ کر اگر کوئی شخص اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے اور پڑھنے والے نے کیا پڑھا ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بریلی یا آگرے کے پاگل خانے کا ممبر بننے کا اہل ترین شخص ہوگا ...... اور ... ان افسانوں کو کوئی شخص بار بار پڑھے تو وہ جیسا ہمارا خیال ہے صرف ... اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ کتاب صرف ایک صنعت کے تحت لکھی گئی ہے جس کو "صنعت بے معنی" کہہ سکتے ہیں یعنی لکھنے والے نے صرف یہ کیا ہے کہ قلم اٹھا کر کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا اور بغیر یہ سوچے سمجھے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں لکھتے ہی چلے گئے ہیں، جہاں رک گئے تو رک گئے، کان سے نکل گئی تو نکل گئی۔ مختصر یہ کہ "یاوہ گوئی" کی طرح گویا ان حضرات نے "یاوہ نگاری" کے کمالات ان افسانوں میں دکھائے ہیں ... ہم نے اس کتاب کو جس کو ادبی، اخلاقی، معاشرتی اور دیگر حیثیتوں سے بالکل معمل پایا ہے اس میں بعض شرفا اور ایک شریف راوی نے جو جو حیا سوز مناظر پیش کئے ہیں ان کو دیکھ کر آبرو باختہ سے آبرو باختہ جنسی بھی انتہائی نفرت سے لاحول پڑھنے پر مجبور ہو جائے گی خداوند کریم اور رسول صلعم کی جو توہین ہوئی اس کا سوال تو اس وقت پیدا ہوگا جب ان مصنفین کی بیگ الدماغی تسلیم کر لی جائے گی لیکن ہمارے خیال میں تو یہ مجموعہ خرافات سوائے اس کے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ واقعی ان انگاروں کو خاکستر کر دیا جائے۔"

(سرپنچ ۲۳ فروری ۱۹۳۳ء)

سرپنچ کے شذرات

لکھتے وقت شوکت تھانوی کھل کر اپنے اصلی رنگ میں آجاتے تھے۔ دیکھئے شذرات میں "انگارے پر پانی" کیسے پھیرتے ہیں اور بھی نمونے دیکھئے۔

انگارے پر پانی

جس اودھ پنچ ...... تصنیف کے متعلق گذشتہ کسی پرچہ میں ہم تفصیل کے ساتھ عرض کر چکے ہیں اس کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ خان بہادر حافظ ہدایت حسین صاحب ایم ایل سی نے کونسل میں نہ صرف سوالات کئے بلکہ آنریبل ہوم ممبر صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اس کتاب کے پرنٹر پبلشر کو سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ

نے طلب بھی کیا تھا مگر جن حضرات نے یہ شعر فشانی فرمائی ہے وہ تو آجکل شملہ میں پڑے ہوئے ہیں بہر حال ڈال دو مصیبتیں اور ایک مستقل صاحب ہندوستان کے اندر ہی خراب ہے کے مستقر تو حکومت خود کچھ نہ کچھ کرے گی البتہ اندیشہ ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ ۱۰ ... کے پہلے کے بعد یہ انگلستان ... سے زیادہ کچھ نہ رہ جائیں گے۔

تلاش گمشدہ

عزیزہ محترمہ جناب جمعیتہ اقوام صاحبہ نہ معلوم کہاں تشریف لے گئی ہیں کہیں پتہ ہی نہیں چلتا نہ چین و جاپان کی معرکہ آرائی میں ان کا نشان ملا نہ یورپ کی ان جنگی تیاریوں میں سامنے آئیں اگر کسی اللہ کے بندے کو ان محترمہ کا پتہ معلوم ہو تو ہم کو مطلع فرمائیں تاکہ ان سے دریافت تو کیا جائے کہ آخر وہ ہیں کس مرض کی دوا؟

وائٹ پیپر واقعی سادہ کاغذ ہے

وائٹ پیپر کی مدتوں سے ہندوستان میں دھوم مچ رہی تھی، ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر "سائمن گو بیک" کے بعد اگر کوئی نیا نعرہ چڑھا تھا تو وہ یہی "وائٹ پیپر" جس طرف دیکھئے اسی کا چرچا تھا اور جس کو دیکھئے اسی کا منتظر تھا۔ آخر وہ صبر آزما دستاویز سب کے سامنے آئی جس کے یہ دن گنے جاتے تھے لیکن اب حال یہ ہے کہ سب لوگ آنکھیں لال پیلی کئے تکا تکا کر خوردبین کی مدد سے اس مسودہ کو دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ان کو کچھ نظر نہیں آتا اس کا نام وائٹ پیپر ضرور تھا مگر یہ تو واقعی سادہ کاغذ نکلا۔ اس آئینی دستاویز میں سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ گھما پھرا کر ہندوستان کو وہیں رکھا ہے جہاں وہ غریب اب تک بیٹھا ہوا منہ بسور رہا تھا۔ لیکن اس سیاسی چال کا جواب زبانی احتجاج نہیں بلکہ اس اینٹ کا جواب یقیناً پتھر سے دینا چاہیئے ——"

ہندوستان میں بحرِ ہند کی آمد

ہندوستان کے گوشے گوشے سے آجکل سیلاب سیلاب کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں بعض مقامات پر تو طوفان نوح کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں اگر خدانخواستہ یہی حال کچھ روز اور رہ گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ ملک بحرِ ہند میں شامل ہو جائے گا اور کوہ ہمالیہ نام کا کوئی جزیرہ اس ملک کی یادگار کے طور پر باقی رہ جائے گا۔ اڑیسہ، آسام، بنگال اور پنجاب وغیرہ ہر طرف معلوم ہوتا ہے کہ بادلوں نے سمندر انڈیل دیا ہے۔ اڑیسہ کے تین کروڑ باشندے خانماں برباد ہو چکے ہیں اور یہی حال دیگر سیلاب زدہ مقامات کا ہے اس کے معنی یہ سمجھئے کہ آجکل ہندوستان میں بحرِ ہند مہمان آیا ہوا ہے حالانکہ مہمان کو کچھ نہ کہنا چاہیئے لیکن مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ

جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو

سرپنچ کے مزاحیہ کالم شوکت تھانوی کا سرپنچ ۱۹۵۰ء کا پہلا مزاحیہ اخبار ہے جس میں سب سے زیادہ مزاحیہ کالم تھے۔ سرپنچ کے ان زعفران زار کالموں کی وجہ سے کالم نویسی کی تاریخ میں بیحد خاص اہمیت حاصل ہے۔ سرپنچ کے خاص اور قابل ذکر کالم درج ذیل تھے: قلمزار، چٹکیاں، تیر بہدف، گلستانِ دیار، معمہ بہ کالم، مقصد دل، سب پر کی، گپ شپ، ٹیلی فون، بکٹ ہیں، حضرتِ عشق، ادھم، جنتریاں، تذکرے، ادھر اُدھر کی، پنواڑی کی ڈائری، اندھیر کی رام کہانی، پڑھنے کی شرط نہیں اور قوالی مولانا سرپنچ تھے۔

دو دو باتیں کالم شوکت تھانوی بہ ہمت، اودھ اخبار اور چند ہیکلے تھے ان میں سے یہ سرپنچ میں نقل ہوتا۔

قلمزار بہ معنویت سرپنچ کا مزاحیہ کالم تھا۔ اس کا ایک نمونہ دیکھئے۔

قلمزار

ہم ایک گذشتہ اشاعت میں زبانِ اُردو کی مختلف قسمیں بیان کرتے ہوئے سرکاری اُردو کی نئی پیداوار کا ذکرِ خیر بھی کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ہمیں اس "ادبِ لطیف" کے چند تہہ چیز شاہکار دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے جن میں سب سے پہلے ہم ایک پمفلٹ پیش کشِ ناظرین کرتے ہیں جس کا نام "رہبرِ حاجیانِ حجاز" ہے جس سے فصاحت و بلاغت ساون بھادوں کے مینہ کی طرح برس رہی ہے۔

پچھلے دنوں حکومتِ ہند کے شعبۂ تعلیم و صحتِ عامہ نے زائرینِ حرم کی سہولت کے لیے زبان انگریزی میں ایک مفید پمفلٹ شائع کیا تھا۔ "رہبرِ حاجیانِ حجاز" میرے سرکاری اُردو میں اس پمفلٹ کا ترجمہ ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اس عظیم الشان ادبی خزینہ کا کون سا جواہر ریزہ پبلک کے سامنے پیش کریں۔ کون سا پیش نہ کریں۔ کیونکہ جس طرح پنجاب میں چغتائی کا ہر "جمن" اقبال کا ہر شعر "شاہکار" ہے اسی طرح اس پمفلٹ کا ہر لفظ شاہکارِ ادب اور غالب و مومن کی روحوں کو تڑپا دینے والا نشتر ہے۔

ممکن مصنف قلمزار بابت اعتراض جڑ دینے پہلے اوپر کتاب "رہبرِ حاجیانِ حجاز" کے اس لیے باز رہ سکتا ہے کہ سرکاری اُردو میں قانونی پہلوؤں کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اور حکومت نے اس خیال سے کہ لوگوں کو کہیں یہ شبہ نہ ہو یا سرکاری اُردو کے الفاظ میں "یہ شبہ نہ کیا جا سکتا ہو یا یہ شبہ آئندہ نہ کیا جائے گا" مسلمانوں کا فریضۂ حج سوائے سرزمینِ حجاز کسی اور مقام پر بھی ادا کیا جا سکتا ہے" اسی کتاب کے نام میں "حاجیاں" کے ساتھ لفظ "حجاز" کا دُم چھلا لگانا ضروری سمجھا۔

سرورق اُلٹنے کے بعد "ہمیں" بابت "دلا پانے" کی "ہم لفظ" زبان میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں سب سے زیادہ دھکا دینے والا یہ فقرہ ہے جس کو انگریزی سے ترجمہ کرتے وقت حکومت ہند کے فاضل مترجم نے اپنا قلم توڑ دیا ہوگا: "رسالہ مذکورہ کی نظرِ ثانی اس وقت تک ملتوی رہے گی جب تک کہ قانون جس کا انحصار کمیٹی کی سفارشات پر موقوف ہے پاس نہ ہو جائے"۔

سبحان اللہ کیا روانی ہے جس کے پانی میں ڈوب جانا عین زندگی ہے۔ اکس خوبی کے ساتھ قانون کے انحصار کو کمیٹی کی سفارشات پر موقوف کیا ہے! قابلِ ستائش ہے حکومت ہند کہ ایسے ایسے باکمال مترجموں کی قدر شناسی کر رہی ہے ورنہ یہ مترجم صاحب اگر کہیں جائے روزگار میں ہوتے تو دو مہینے دن کان پکڑا کر موقوف کر دیے جاتے۔

ایک مقام پر حکومت ہند کا یہ فاضل مترجم سرکاری اردو کے جواہر ریزے اس طرح بکھیرتا ہے۔

"ہر طرح مسلمانوں کی زیرِ نگرانی میں حاجیوں کے لیے کھانا تیار کرتے ہیں"

لال شاہی اردو میں "لیلۃ القدر کی رات" اور "یوم قیامت کا دن" تو شاہی تھا لیکن اب سرکاری اردو کے تصدق میں "ہمیں زیرِ نگرانی میں" کی نئی ترکیب معلوم ہو گئی۔

اس سرکاری اردو پمفلٹ کے سرکاری مترجم پر غیرت سے یہ مثل صادق آتی ہے کہ "گھر پیدی، مجھے کوئی کہے تندوری" آپ خدا کے فضل سے زبانِ عربی کے بھی نہ صرف زبردست ماہر بلکہ فنِ وضعِ اصطلاحات کے دستار بند۔ اسی تربیت بیش پرور علم میں جناب آپ نے انگریزی سے اردو ترجمہ کرتے وقت اپنی علمیت و ہمہ دانی کے جوش میں "من" کو "منا" "عرفات" کو "عرافات" "عبدہ" کو "یدہ" "علیم" کو "علم" "نعمت" کو "نیامت" "جبیں" کو "جال" "ذہب" کو "زہاب" اور اسی کے وزن پر "وہاب" کو "وحب" بنا دیا۔

مترجم صاحب کو اپنے فضل و کمال کی نمائش اور زیادہ منظور ہوئی تو "رمضانی" کے اچھے خاصے مردِ مسلمان سرکاری اردو کے جھگڑے سے شدھ کر کے "رام جانی" بنا ڈالا۔ خوب مطلع فین کعبہ کو ان کے دورِ قلم سے دُور کر، "مطرا لفان" بننا پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ "میم" کا پردہ مسلمانوں کے آڑے آیا ورنہ سرکاری مترجم نے تو حجاز کی مقدس سرزمین کو دہلی کا چاوڑی بازار، لکھنؤ کا چوک یا کانپور کا مول گنج بنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا تھا۔

قابلِ ستائش ہے وہ قدر شناس حکومت جس کو اپنی مطبوعات کے لیے ایسے ایسے قابل انشا پردازوں کی خدمات حاصل ہوں۔

پھلکیاں بعد میں یہ کالم "تیر بہدف" کے عنوان سے مقبول ہوا۔ اس میں خبروں کی سرخیوں پر حاشیہ آرائی کی جاتی تھی۔

چٹکیاں (ترجمہ)

ایک چیز ایسی ہے ——— جو دو پاؤں پر کھڑی ہے ؟
——— وہ میں کا یہ بار بار زمین پر پاؤں سے کھٹکنے والا ہے ۔
ایک چیز ایسی ہے ——— جو دوسروں کی پیشانی پر کرتی ہے ؟
——— وہ بہت بولی ہے ہر بات کی ہاں کہتی ہے ۔
ایک چیز ایسی ہے ——— جو دوسروں کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ ساتھ چلتی ہے ؟
——— وہ بڑا مطلب ؟

گلکلستان دیکھ کر جیسے ڈر لگتا ہے نہیں ہو اور دیوار قہقہہ میں ہونا ہو تھا جس کے حق اور فاف اور اور ان کا انتخاب چھپا تھا ۔

گلکلستان دیکھنے کی شرط نہیں دیوار قہقہہ

ایک عورت واجب ساز میں ترچھے ہوئے لگا ہوا اس نے ہوئے بچے پوچھا ۔ تم نے کس پر چھوڑے جاتے ہو ؟

—— اخبار میں شوہر ہے ۔

اسکاٹ لینڈ کے باشندے اپنی کنجوسی کے لیے مشہور ہیں۔ ایک اخبار میں اسکاٹ لینڈ کے خلاف مضامین شائع ہو رہے تھے۔ ایک اسکاٹ شخص نے اس اخبار کے ایڈیٹر کو لکھا کہ "اگر تم اپنے اخبار میں اسکاٹ لینڈ والوں کے خلاف مضامین لکھنا بند نہ کرو گے تو میں تمہارا اخبار مانگ کر پڑھنا بند کر دوں گا۔"

———

شوہر : میری ٹوپی کہاں ہے ؟
بیوی : ٹوپی ہوتی کہاں ؟ تمہارے سر پر ہے !
شوہر : اچھا ہوا تم نے بتا دیا ، ورنہ میں ننگے سر دفتر چلا جاتا ۔
بیوی : (پیانو بجاتے ہوئے) پیارے اب تم کیا چیز سننا چاہتے ہو ؟
شوہر : (نیند اچاٹ ہونے اور بے سرے نغموں سے بیزار ہو کر) پیانو کے بند ہونے کی لطیف آواز !

———

ایک رحمدل بڈھے نے ایک لڑکے سے پوچھا "تم مدرسے کیوں نہیں جاتے ہو ؟" لڑکے نے جواب دیا "میرے باپ نے ایک نیا صابن ایجاد کیا ہے جسے ہر گاہک کو دکھلانے کے لیے وہ ہر وقت مجھے دھوتا رہتا ہے !"

گرما گرم کے عنوان سے حالاتِ حاضرہ پر چٹ پٹا تبصرہ کیا جاتا تھا۔

گرما گرم

ریاست کشن گڑھ کے راجہ صاحب کی صاحبزادی کا عقد ہونے والا ہے اس کا خرچا کے لیے رعایا سے چندہ لیا جا رہا ہے ——— راجہ صاحب کی صاحبزادی نہ ہوئیں چندے قسم کا ٹیکس ہو گئیں۔

لاہور میں ایک نوجوان نے اپنے پڑوسی کی چند چارپائیاں چرا لیں ——— چارپائی کا صرفہ عبث ہے اس لیے کہ اب پتہ سے پتہ سے مکانات چوری ہو جایا کریں گے۔

اطلاع موصول ہوئی ہے کہ خدا نخواستہ ملک معظم پر سردی کا خفیف سا حملہ ہو گیا ہے ... اس ضعیفی میں انگلستان جیسے ٹھنڈے ملک میں آخر کیوں رہتے ہیں؟

سنتے ہیں کہ چین اور جاپان میں مجھوتہ ہو گیا ہے ——— ایشیائی اقوام کو پردہ سے باہر آ جانا چاہیئے۔

عقلمندیاں کے تحت اشتہارات، واقعات اور سرکاری احکامات وغیرہ کے مضحک پہلوؤں پر چند جملے درج کیے جاتے۔

عقلمندیاں

ایک برقی کھمبے پر حسبِ ذیل اشتہار چسپاں کیا گیا ہے کہ ——— "خطرہ ——— کھمبہ چھونے سے فوراً موت واقع ہو جاتی ہے خلاف ورزی کرنے والا گرفتار کیا جائے گا۔"

بے پر کی اور بعد میں گپ شپ کے عنوان سے ادبی ہوائیاں اڑائی جاتی تھیں۔

بے پر کی (گپ شپ)

ایک تازہ بے تار برقی پیغام مظہر ہے کہ حضرت خواجہ حسن نظامی اور آغا حشر صاحب کاشمیری میں کوئی ایسا معاہدہ ہو گیا ہے جس کے تحت آغا حشر صاحب اپنے تمام ڈراموں کا حق تصنیف خواجہ صاحب کو دے دیں گے اور خواجہ صاحب اپنے تمام مرید آغا صاحب کے سپرد کر دیں گے۔ واضح ہو کہ یہ ایک قسم کا معاملہ تبادلہ سمجھا جائے گا۔

معلوم ہوا ہے کہ جناب مشیر احمد علوی کے یکایک داڑھی نکلنا شروع ہو گئی ہے اس مرض کی وجہ خود ان کو بھی نہیں معلوم، ان کا بیان ہے کہ "میں کچھ عرصہ سے امراضِ چشم میں مبتلا تھا لیکن داڑھی کی خود روئی پر خود مجھ کو بھی تعجب ہے۔"

ایک صاحب کا خیال ہے کہ حضرت مولانا [illegible] صاحب ہندوستان سے روس کو تشریف لے گئے ہیں
ملازم ہو گئے ہیں مشرق [illegible] صاحب آئینہ [illegible] افغانستان کی حکومت کو [illegible] بھیجا ہے۔
ایک خاص ملاقات ہے کہ [illegible] کی صاحب [illegible] امریکہ کے [illegible] پر [illegible]
چند منٹ میں جن کا ذکر [illegible] انسان بیزاری اور [illegible] کی نقل ہے :
ٹیلیفون کے ذریعہ جو [illegible] ملاقات پر اخبار جہاں ہو جاتی ہے۔

ٹیلیفون

ٹن — ٹن — ٹن — ہلو — وائسرائے ہاؤس [illegible] — ٹن ٹن — ہلو — [illegible] پرائیویٹ سکریٹری — آداب عرض — میری [illegible] — جی ہاں میں [illegible] میری طرف سے ہز ایکسیلنسی سے عرض کیجئے کہ [illegible] ہوں اور ہز ایکسیلنسی کی خدمت [illegible] سے کہیے ہز ایکسیلنسی نے مولانا شوکت علی [illegible] مولانا شوکت [illegible] پبلک کی ہمدردیاں [illegible] وابستہ کر دی ہیں [illegible] ہز ایکسیلنسی گاندھی جی سے ملاقات کی صورت [illegible] حکومت کے ساتھ [illegible] ہز ایکسیلنسی اس نکتہ پر اب بھی غور کریں باقی بحمد اللہ سب خیریت ہے۔ ٹن ٹن

ٹن — ٹن — ٹن — ٹن — نمبر [illegible] ڈاؤننگ اسٹریٹ لندن — ہلو — ٹن — ٹن — ہلو — [illegible] صاحب ہیں؟ — ہاں ہاں آپ ذرا وزیر اعظم بہادر سے میرا سلام کہیے اور یہ کہیے کہ ہندوستان میں اس خبر نے آپ سے خاص عقیدت پیدا کر دی ہے کہ آپ گاندھی جی کی رہائی کے لیے کوشاں ہیں۔ خدا کرے یہ خبر سچ ہو لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آپ کوشش کریں اور وہ کوشش رائیگاں جائے۔ اگر ایسا ممکن ہے تو آپ کے وزیر اعظم کے اختیارات سے دلی ہمدردی ہے۔ ٹن ٹن ٹن۔

ٹن — ٹن — ٹن — صدر جمہوریہ امریکہ کے دولت خانہ میں پلیز — ٹن — ٹن — ہلو — کون — مسٹر ہوور — جی آداب عرض یعنی خود آپ ہی فون پر آ گئے میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ آپ کی زندگی پر جو قاتلانہ حملہ ٹرین کو تباہ کرنے کی صورت میں ناکام طور پر کیا گیا وہ ہماری نظروں میں حد درجہ کمینہ پن تھا۔ مگر آپ کا اس سے بچ جانا نہایت خوشی کا موجب ہے۔ واللہ آپ خوب بچے۔ جی ہاں زندگی تھی ورنہ ختم تو کر ہی دیا تھا ظالموں نے — سچ کہا آپ نے کہ موت کا ایک دن معین ہے —" اچھا مبارک ہو — آداب عرض — ٹن ٹن —

کٹ پیس کے عنوان سے دوسرے رسائل و اخبارات کی زبان و بیان کی اغلاط کا پوسٹ مارٹم ہوتا تھا۔

کٹ پیس

عصر کے ایک معاصر اخبار کے ایک مضمون کی سرخی ہے: "بکار آمد نظمیں" ــــ

سبحان اللہ! غالباً بعض قابل اندیشہ کے یہ جملے بھی ہوں گے جو عام طور پر مشہور ہیں۔

ــ لب دریا کے کنارے کی لکڑیاں ــــ برگ شرینہ کی بتی " اور لینے کے بعد کا عجز و عجز ۔

معاصر پرتاب کی ایک خبر کا عنوان ہے ــــ "عید کے پٹاخوں نے جان لے لی" ــــ اس میں کتاب کی کچھ معلومات ورہے ــــ یا تو شب برات کے پٹاخے ہوں گے ورنہ عید کی سویاں۔

حضرتِ عشق کے کالم کے تحت عشق کے مضحک پہلوؤں کو لطائف کی صورت میں اجاگر کیا جاتا تھا۔

حضرتِ عشق

پیٹر ــــ تمہارے محبوب کے عشق و محبت کا اب کیا حال ہے ــــ ؟

پال ــــ محبت کا معاملہ تو ختم ہو چکا۔ اب ہم دونوں کی شادی ہو گئی ــــ !

الم غلم کے عنوان کے تحت معاصرین سے مختلف مسائل پر چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی۔

الم غلم

ــ اردو سے دھرم ملیش رکھنے والوں کی سیوا میں پرارتھنا ہے کہ وہ مسٹر بروز امریکی پر مقدمہ چلائیں۔ ان حضرت نے ایک دلچسپ افسانے میں بیان کیا ہے کہ ایک باشندۂ امریکہ جب مریخ میں پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہاں کے رہنے والے ہماری دنیا کے عالموں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوشیار ہیں، مریخ والوں نے طرح طرح کے عجیب و غریب آلات ایجاد کئے ہیں ان حالات کی مدد سے ان کو پتہ چل گیا ہے کہ باشندگانِ ارض جتنی زبانیں بولتے ہیں ان میں سب سے اہم صرف چار زبانیں ہیں اُردو، چینی، انگریزی اور روسی، جن مہاپرشوں اور مہاپہ تابیوں کی طرف ہمارا روئے سخن ہے اُن کو چاہیے کہ مسٹر بروز کی خبر اچھے پیرائے سے لیں تاکہ صاحب بہادر اپنے دونوں کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کریں اور مانیں کہ کیول ہندی بھاشا کل بھارت ورش کی ماتر بھاشا ہے اگر مقدمہ چلانے کی ہمت نہ ہوتی کم از کم ایک پتر لکھ کر ان کو قائل معقول کریں ہمارے مترون کو بھلی بھانت یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ سمئے چپ رہنے کا نہیں ہے اگر ہمارے متر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور یہ اوسر نکل گیا تو پھر امریکہ والوں کی طرح اور جاتیاں بھی اُردو کا پکش لینے لگیں گی آشا ہے کہ ہماری پرارتھنا پر کل مہاپرش دھیان دیں گے۔

ٹوٹ بٹوٹ میں بعض بعض چٹکیاں بھی [illegible] کے عنوان کے تحت شوکت تھانوی [illegible] جواب بھی دیا کرتے تھے۔

ٹوٹ بٹوٹ میں پھبتیاں

[illegible] آپ کے [illegible] نصف [illegible] ۔ [illegible] [illegible]
[illegible] منزل مقرر [illegible] [illegible] جواب ایک [illegible] [illegible]
[illegible] صاحب [illegible] [illegible] لگا [illegible] ۔

شہر [illegible] کی ایک [illegible] [illegible] حامد [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] خصوصی [illegible]
[illegible]

ادھر اُدھر کی کے نام سے [illegible] [illegible] رنگ میں [illegible] ۔

ادھر اُدھر کی

وہی ہے جیسے تو گدھوں کے کان ہیں

یہ تو [illegible] ایک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے جب کسی [illegible]
تو اب [illegible] [illegible] کہ تمام [illegible] [illegible] کے [illegible] لیے لکھنؤ ـــ [illegible]
لکھنؤ ـــ فیض آباد کے درمیان متعدد واقعات ہو چکے ہیں ۔ جس کا یہ نتیجہ ہو گیا ہے کہ کار [illegible]
اوقات ہی خلل پڑنے لگا ہے ہم پوچھتے ہیں کہ بھلا یہ کون سی بات ہے اور اس کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

ایڈیٹر کی ڈائری اس عنوان سے شوکت تھانوی سرخ ڈائری لکھتے تھے بعد میں اس کا عنوان بدل کر ایڈیٹر کی رام کہانی بھی ہو گیا تھا۔

ایڈیٹر کی ڈائری (ایڈیٹر کی رام کہانی)

۲۳ ستمبر ۔ غیر دلچسپ واقعات لکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم بھی گویا اپنے وقت کے خواجہ حسن نظامی صاحب [illegible] بن جائیں ۔ جبکہ دلچسپ واقعات ہر وقت اور ہر روز پیش نہیں آتے ۔
۲۶ ستمبر ۔ آج بحمد اللہ سب خیریت رہی لہذا کوئی خاص بات قابل تحریر پیش نہیں آئی ۔
۲۹ ستمبر ۔ غیر دلچسپ واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں مگر آج کوئی دلچسپ واقعہ بھی پیش نہیں آیا ۔

۹۔ اکتوبر۔ اتوار کا دن ملاحظہ فرمایئے اور آج ہی بجا بھی لگا۔ نماز کے بعد اور کیا دلچسپ بات آپ سننا چاہتے ہیں۔

اقوال مولانا سرپنچ اس کالم کے تحت مولانا شوکت تھانوی اپنے تیار کرتے تھے۔

اقوال مولانا سرپنچ

- شادی کے بعد سسرال جاتے رہیے تاکہ گھر سے بے تکلفی کی قدر ہو سکے۔
- دوسروں کی بیویوں کو اپنی والدہ سمجھیے تاکہ آپ کی بیوی کو بھی لوگ والدہ سمجھیں۔
- چاولوں دہ سے کم پر شکر ادا نہ کیجئے ورنہ اللہ میاں سمجھیں گے کہ یہ بندہ دال اور روهی ہی میں خوش ہے اس سے بہتر کھانے کیوں دیئے جائیں۔
- وقت کا پابند ہونا حبسِ دوام کی سزا بھگتنے کے برابر ہے۔
- کھانا خوب چبا کر نہ کھایئے۔ اس سے دانت کمزور ہو جانے کا اندیشہ ہے۔
- آج کا کام کل پر ٹالیئے اس لیے کہ ممکن ہے کل کا کام پرسوں پر ٹل جائے۔

سرپنچ کے خاص نمبر۔ سرپنچ اپنے خاص نمبر بڑی دھوم دھام سے نکالتا تھا۔ سرپنچ کے عام ایڈیشن کے علاوہ اپریل فول نمبر، سالِ نو نمبر (سرپنچ گزٹ) اور عید نمبر وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "سویاں مبارک" کے عنوان سے "عید نمبر" کا اداریہ لکھا جاتا اور اس پر یہ شعر اپنی بہار دکھاتا ہے

سرپنچ پڑھنے والوں کی ہر روز عید ہے

سرپنچ: عید، اصل میں بس تیری دید ہے

سرپنچ گزٹ۔ سالِ نو کے موقع پر مزاح نگاروں کو باقاعدہ خطابات تقسیم کرتا اور ان کے دلچسپ گزٹ شائع کرتا۔

سرپنچ گزٹ

(فہرست خطابات سالِ نو)

منجانب ادارۂ سرپنچ

بتقریب سالگرہ اعلیٰ حضرت حضور پرنور ہز ہائینس عالی جناب سرپنچ بہادر دام اقبالہٗ وظرافتہٗ

تبسم نواز جنگ۔ شوکت تھانوی

جہنم نواز جنگ۔ امین سلونوی

ظرافت الملک۔ فرحت اللہ بیگ

تمکنت جنگ۔ تمکین کاظمی

جلیل القلم۔ رشید احمد صدیقی

قلیل القلم۔ پطرس بخاری

لیڈر القلم۔ ملا رموزی

المہیب الدہر، مرزا فرحت اللہ بیگ حیدر آباد، مسٹر رشید احمد صدیقی علی گڑھ، حکیم ممتاز حسین عثمانی لکھنو،

مسٹر سلطان حیدر جوش فتح گڑھ، مسٹر امتیاز علی تاج لاہور، مسٹر [illegible] ۔

[illegible]ن باربنک - مسٹر پطرس بخاری لاہور، ملا رموزی بھوپال، مسٹر عظیم بیگ چغتائی جودھپور، مسٹر فرحت اللہ بیگ [illegible]، مولانا عبدالمجید سالک لاہور، علامہ عبدالباری آسی لکھنؤ، مسٹر محمد عارف دیوانہ گورکھپور، مولانا [illegible] چودھری [illegible] ۔

[illegible]ح الملک - مسٹر حامد شاہ [illegible]، مسٹر ابو السلم [illegible]، مسٹر [illegible] حیدرآباد، علامہ [illegible] دہلی، مسٹر حافظ [illegible]، مسٹر [illegible] نظامی۔

[illegible]ح الدولہ - [illegible] قدرت اللہ خاں [illegible]، مسٹر [illegible] حیدرآبادی، مسٹر [illegible]، قاری [illegible] گورکھپور۔

ظریف بہادر - مسٹر [illegible] احمد علوی لکھنؤ، مولوی [illegible] ٹریننگ کالج، ملا حضوری [illegible]، مسٹر [illegible] لکھنؤ، مسٹر [illegible] لکھنؤ، مسٹر عبداللہ ناصر [illegible] ۔

ملک الشعراء - سید مقبول حسین ظریف لکھنوی، مسٹر مشیر آغا مجنوں لکھنوی۔

امام الشعراء - مسٹر محب دریابادی، سید حسن جعفر شوخ لکھنوی، مسٹر بوم میرٹھی، سید [illegible] لکھنوی، ڈاکٹر چودھری نذیر احمد [illegible] لکھنؤ۔

سرپنچ اپریل فول نمبر کی سرخیاں دیکھئے:-

سرپنچ اپریل فول نمبر

قطب مینار گر پڑا

دہلی میں قیامت خیز آندھی

تاج محل سیاہ ہو رہا ہے

سنگِ مرمر نقلی ثابت ہوا

[illegible]

کوہ ہمالہ کی مہم

ہوائی جہاز سے کوہ ایورسٹ منہدم

مہاتما گاندھی کی شادی

ہری جنوں سے تعلقات بڑھانے کی ترکیب

اچھوت لڑکی سے نسبت ہو رہی ہے

[illegible]

زنانہ پارک میں جلسہ، مردوں کو دعوت عام

ہندوستان کا دارالسلطنت بدل گیا

بجائے دہلی کے اٹاوہ

قرطاس ابیض آسٹریلیا کے متعلق ہے

ڈاک کی غلطی سے ہندوستان آگیا

ہندوستان کا قرطاس ابیض آسٹریلیا گیا

مہاتما گاندھی کی تازہ غیر مطبوعہ غزل خاص بھنے سرپنچ

اک ہاتھ میں پانی ہے اک ہاتھ میں چرخا ہے — پہلو مرا تھمتا ہے چرخا مری دنیا ہے
میں جیل کے اندر ہوں گھر گھر مرا چرچا ہے — جو نام ترا ہے اور جو جب ہے وہ اچھا ہے
لے جاؤ کچھ اور تم سوت کے ہاتھ ہو — سنسار کی حقیقت کیا دل اپنا شوالا ہے
پھیلاتے رہو چھپلاؤ، ہر جنس بڑی چادر — کھدر ہی ہو جائی گھر دیس زمانہ ہے
میں جیل کے اندر ہوں اور جیل سے کٹتی ہے — میں ہوں مری کٹیا ہے اک کنگھا بروا ہے

گاندھی کو نہ چھیڑو اور گاندھی کو نہ چھیڑو تم
مرنے ہو تو مر جاؤ، وہ جینے سے لیٹا ہے

سرپنچ کے انتخابات (پنچایت) "حلوائی کی دکان"

سرپنچ میں دوسرے رسائل و اخبارات سے ادب منتخب کرنے کے لیے ایک مستقل کالم "پنچایت" کے عنوان سے تھا جو بعد میں "حلوائی کی دکان" ہو گیا تھا۔ سید امتیاز علی تاج، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور مولانا عبدالمجید سالک وغیرہ کی تخلیقات خاص طور پر اس عنوان کے تحت منتخب کی جاتی تھی پطرس لکھے بہت کم تھے اور رشید احمد صدیقی، سید امتیاز علی تاج کے مضامین سرپنچ تک پہنچ نہیں پاتے تھے لیکن سرپنچ ان کے مضامین اس کالم کے تحت اپنے یہاں نقل کرنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ اس کالم کے اوپر جلی حروف میں لکھا رہتا تھا کہ "اس باب کے ماتحت تمام برادری سے بے تکلفی برتی جائے گی کہ جہاں سے جو چاہیں اپنی چیز سمجھ کر لے لیں"۔

سرپنچ کے کارٹون

اودھ پنچ کے بعد ہمیں کارٹونوں کا سب سے بڑا خزانہ شوکت تھانوی کے سرپنچ ہی میں ملتا ہے۔ سرپنچ کے کارٹون بہت نکیلے، تیکھے، جاندار، ہنستے ہوئے اور ولولہ انگیز تھے۔ کامل تھمتھوی اور یمین فرنگی محلی اپنے فن میں یکتا تھے یہ سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی، مذہبی اور معاشرتی موضوعات کو ہدف بناتے تھے۔ خاص نمبروں میں فراح نگاروں کے کارٹون بھی ہوتے تھے "چوڑیاں پہنے ہوئے پولیس"، "حامد کا ہوّا"، مولانا شوکت علی، اکبر مرادآبادی، عنایت دہلوی، مدیر ریاست اور بیگ اقوام کے کارٹون اس میں بے حد مقبول ہوئے تھے۔ سرپنچ اکثر انگریزی رسائل و اخبارات کے کارٹون بھی نقل کرتا تھا۔

[illegible]

سرپنچ کے معرکے

[illegible]

[illegible]

پہنچ کلکتہ سے [illegible] انھوں نے [illegible]
غزل سرقہ کرلی جو شوکت تھانوی کا تھا [illegible] سرپنچ نے کلکتہ کے نام سے [illegible]
اور متواتر [illegible] اس قدر جلد اُسے [illegible] جب تک سرپنچ کا خط [illegible]
قیامت بن کر ان حضرات پر ٹوٹ رہا اس وقت تک تو آپ خدا جانے ... کہاں پناہ لیتے تھے۔ ہم کو ہر طرف سے
سمجھایا گیا اور ہر ایک نے ہم کو خاموش کرنے کی کوشش کی اور ہم نے اپنے کو [illegible] یہ کہنا مناسب سمجھا
اور ان ذات شریف کے سر سے یہ بلا ٹال دی" ابھی یہ قیامت خیز معرکہ جاری تھا کہ [illegible] حکیم محمد یوسف حسن
نے کلکتہ جاکر سرپنچ والوں کو ٹھنڈا کیا اور لکھنؤ آکر سرپنچ والوں کو مجبور کیا۔ غرض سرپنچ [illegible] اس معرکہ کو فرو کیا۔
سرپنچ کے خطوط (ڈاک خانہ) کے عنوان سے سرپنچ کی خط و کتابت شائع کی جاتی تھی۔ یہ خط اصلی بھی ہوتے
تھے اور فرضی بھی۔ ان خطوں میں اودھ پنچ کی چمک ملتی ہے ان میں والیان ریاست کو ریاستی معاملات سے [illegible]
متوجہ کیا جاتا تھا جو فقرہ بازی، تخاطب اور پیشین گوئیوں کے علاوہ پھلجھڑیاں چھوڑی جاتی تھیں۔ ریاستی سربراہوں

اور قومی رہنماؤں پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ نواب رامپور کے نام اسی کالم میں "مراسلات" کے عنوان سے بہت ہی دلچسپ خط شائع ہوتا تھا۔ سرپنچ میں شائع ہونے والے خطوط کا ایک نمونہ دیکھئے۔

ڈاک خانہ (سرپنچ ڈاک)

ایڈیٹر شوکت صاحب!

للہ آپ چوہے کی جان چھوڑ دو۔

یہیں جو چیز اب رہ جاتی ہے، بے زبان جانور کو ستانا اچھا نہیں ہوتا۔

رفیق احمد نگر

رفیق احمد صاحب نگینہ تسلیم

"چوہے کو چھوڑ دوں" بہت اچھا مگر وہ تو بھینس یا سنگل کے روز سے ذکر کرکے چھوڑا جا سکتا ہے۔ بہر حال آپ کے علاوہ دو سو احباب کی یہی رائے ہے کہ سرپنچ کو چوہے کے پیچھے مارا مارا نہ پھرنا چاہیئے اور ہم خود بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ اب پنجرہ کی کھڑکی کھول دی جائے۔

سرپنچ

اودھ اخبار لکھنؤ ۱۹۳۳ء میں ہمدم اخبار بند ہونے کے بعد سرپنچ کے ساتھ ساتھ منشی نولکشور کے اودھ اخبار سے بھی وابستہ ہو گئے۔ اس میں بھی انہوں نے اپنے "دو دو باتیں" کے کالم کو جاری رکھا۔ اودھ اخبار مائل بہ زوال تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید نور الحسن کے جانے کے بعد شوکت تھانوی اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر کئے گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد اخبار سے علیحدہ ہو گئے۔ اور کچھ دن بعد اودھ اخبار کورٹ آف وارڈ کی تحویل میں چلا گیا۔ اودھ اخبار میں ان کی ظرافت کا نمونہ دیکھئے۔

دو دو باتیں (روزنامہ اودھ اخبار لکھنؤ)

"چائے پینے والی دنیا لپٹن کمپنی کے نام سے ناواقف نہ ہوگی۔ اس لیے اسی کمپنی کو چائے نوش دنیا کے پیر مغاں کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس کمپنی نے جو ادبی خدمات انجام دی ہیں اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے حالانکہ وہ خدمات پردۂ راز میں نہیں بلکہ یہ غیر فانی حیثیت سے علم و ادب کی دنیا میں جگمگا رہی ہیں۔ لپٹن کی چائے نے دوسری زبانوں کے لٹریچر پر جو احسانات کئے ہیں ان سے ہم کو کوئی سروکار نہیں البتہ اب اردو ادب میں اس ادب نواز کمپنی نے جو معتدبہ اضافے کئے ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا ہماری انتہائی بے ادبی ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ لپٹن کمپنی نے اردو کی وہ خدمات انجام دی ہیں کہ اردو زبان اور اردو زبان کو اپنی مادری زبان کہنے والا طبقہ اس کمپنی کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔"

[illegible] کمپنی کی [illegible] خدمات [illegible] ہوں گے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہے [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔

[illegible] کمپنی کی [illegible] [illegible] معلوم ہو کر حیرت اور حیرت کے بعد مسرت ہو گی کہ [illegible] [illegible] ہے مگر اس [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کمپنی کا رنگ شاعری بہت کچھ [illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] زیادہ کامیاب ہے [illegible] [illegible] بہت جلد لوگ فراموش کر دیں گے۔

حال ہی میں لپٹن چائے کا ایک اشتہار شائع ہوا ہے اس میں شعر کے جو نادر الوجود نمونے موجود ہیں ان کو فی الحال چھوڑئیے لیکن لپٹن کمپنی کا [illegible] نتیجہ فکر ملاحظہ فرمائیے کیا خوب فرمایا ہے ـــ

سب شخص اور ان کے بھائی
پیتے ہیں لپٹن چائی

اس شعر کی معنوی خوبیوں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی بد مذاق "چائی" پر غور کرنے لگے تو اس کی [illegible] کمپنی پر نہیں بلکہ خود اس شخص کی محدود استعداد پر ہے یہ ٹھیک ہے کہ صحیح لفظ "چائے" ہے لیکن اول تو جب قافیہ [illegible] نہیں بلکہ "جائی" تھا دوسرے اگر شاعر چائے کو ردیف رکھتا تو بالائی یا [illegible] وغیرہ [illegible] یا براہ راست چائے سے تعلق ہے نظم نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا اس قدر اندیش شاعر کمپنی نے [illegible] کے لیے چائے ایسی جنس لطیف کی بھی تانیث چائی کی صورت میں بنائی بہر حال اس فنی مسئلہ پر بحث نہ کیجئے بلکہ یہ دیکھئے کہ اس کمپنی نے کس قدر اچھوتے اور کیف آور خیال کو نظم کیا ہے مگر افسوس ہے کہ صرف یہی مطلع شائع ہوا ہے امید ہے کہ پوری غزل لپٹن کمپنی لمیٹڈ کی کلیات میں ملے گی اگر کسی صاحب

کرشن کمپنی کی کلیات کے ملنے کا پتہ اور قیمت معلوم ہو تو براہ کرم مطلع فرمائیں۔

روزنامہ ہند لکھنؤ ۔ روزنامہ ہند دہلی کے ایڈیٹر شفیع الدین ... نے ... سے علیحدہ ہو کر لکھنؤ میں ... کے تحت ہند کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا اور ... کے ذریعہ اس اخبار سے ... شوکت تھانوی کو اخبار کا نائب ایڈیٹر مقرر کیا مگر ... ماہ کے بعد ... یہ اخبار ... کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ہند اخبار میں بھی شوکت تھانوی نے دو دو باتیں کے مزاحیہ کالم کو جاری رکھا۔ اس کا ایک نمونہ:

دو دو باتیں (روزنامہ ہند لکھنؤ)

کلکتہ سے ایک ہفتہ وار چھٹا اخبار "چرخ" کے نام سے نکلتا ہے اور خدا جانے کیوں جاری ہے معلوم نہیں وہ کون لوگ ہیں جو اس اخبار کے مطالعہ کی زحمت برداشت کرتے ہیں۔ واللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ہم تو اس اخبار کا مذاق پسند ہے کہ ... یہ ایک مزاحیہ اخبار ہے لیکن اس کا مزاح دراصل مزاح نہیں ہے بلکہ ... اور ... مذاق اور منہ چڑانے والی ظرافت اس نام نہاد ظریف اخبار کی خصوصیات ہیں۔ ... اخبار کو دنیا میں ... وہ درجہ حاصل ہے جو ہندوستان میں اچھوت قوم کو حاصل ہے۔ حال ہی میں ہمارے معاصر سرپنچ نے اس اخبار کا جو ... جوڑا ہے اور جس بری طرح اس کا ... وہ واقعی ایک عبرتناک سبق ہے۔

قصہ اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے مایہ ناز ظریف شاعر اور ... سید محمد ... حسین صاحب ظریف لکھنوی نے ایک ... غزل کہی ... جو بہت پہلے کسی مشاعرے کے لیے زبانی ... پڑھنے کے بعد لکھنؤ کے بچہ بچہ کی زبان پر آ گئی اور ہندوستان کے بیشتر اخبارات نے اس غزل کو نقل کیا۔ لیکن اب وہی غزل اخبار چرخ میں مدیر چرخ جناب عنایت دہلوی کے نام نامی اسم گرامی کے ساتھ چھپی نظر آ رہی ہے۔ اور بقول معاصر سرپنچ کے ہم خود حیران ہیں کہ اس غزل کے حقوق ملکیت کس طرح یکایک ظریف صاحب سے عنایت صاحب کی طرف منتقل ہو گئے۔ ہم نے تو آج تک ایسا عظیم الشان توارد دیکھا ہے کہ پوری کی پوری غزل لڑ جائے نہ ہم نے ایسا بے نظیر سرقہ دیکھا ہے کہ کسی زندہ مشہور شاعر کا کلام چرا کر شائع کر دیا جائے اور نہ یہ دیدہ دلیری ہماری نظروں سے گزری ہے کہ چوری کی غزل جلی حروف کے ساتھ اپنے ہی اخبار کے سرورق پر اس طرح چھاپی جائے کہ گویا آپ ہی کی تو ہے۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ظریف صاحب کی مذکورہ بالا غزل کے کچھ شعر ہم کو بھی یاد ہیں جو حال ہی میں چوری کی گئی اور جس کا چور معاصر سرپنچ نے لکھنؤ بیٹھے ہی بیٹھے کلکتہ میں گرفتار کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے وہ اشعار ــ

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے — مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

[illegible]

ماہنامہ شباب لکھنؤ۔ روزنامہ ہمدم بند ہونے کے بعد شوکت تھانوی [illegible] آگئے اور اسی دوران [illegible] نے "شباب" کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ کا اجرا کیا اور اس کا ایڈیٹر شوکت تھانوی کو مقرر کیا۔ "شباب" میں اردو کے ممتاز لکھنے والوں کی نگارشات چھپیں جس شوکت تھانوی نے [illegible] ادب میں دھوم مچا دی مگر ایک سال چل کر یہ رسالہ بند ہو گیا۔

روزنامہ حق لکھنؤ جب ۱۹۳۵ء میں ہفتہ وار سے روزانہ اخبار ہوا تو شوکت تھانوی کو اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ دفتری امور، ترجمہ اور شذرات کے علاوہ حق و باطل کے عنوان سے حق کا مزاحیہ کالم اور شاعر حق کے نام سے روزانہ ایک مزاحیہ قطعہ یا رباعی بھی لکھتے تھے —— دونوں کے نمونے دیکھیے۔

رباعی —— شاعر حق

ہر راہ گزر پہ ہے قدم پر شاعر
آفاق ہی نہیں گھر کا ہے نوکر شاعر
اللہ رے شعر و شاعری کی [illegible]
بیوی شاعر ہیں اور شوہر شاعر

حق و باطل (روزنامہ حق لکھنؤ)

"مجھے اور سنیے کہ یہاں کے ایک ڈاکٹر صاحب نے یہ جدید تحقیقات فرمائی ہے کہ اکثر بیماریوں کا علاج گانے کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور بہت سے ایسے امراض ہیں جو بجائے دوا کے استعمال کرنے کے سیدھے سے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مستقبل قریب میں لوگ دوا کا استعمال بالکل ترک کر دیں گے اور موسیقی کے ذریعہ بیماریوں کا تدارک کریں گے اسی طریقہ کو تمام اطبا اختیار کریں گے۔ موسیقی سے نہ صرف ذہنی اور دماغی بلکہ جسمانی علاج بھی ہوگا۔

مگر ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق اگر ہے تو سب سے پہلے ان کو اپنی اور اپنے ہم پیشہ اطبا کی خبر لینا چاہیے اور حصولِ معاش کا کوئی اور ذریعہ تلاش کر لینا چاہیے۔ اس لیے کہ موسیقی سے بیماریوں کا علاج عام ہو جانے کے بعد یہ تمام ڈاکٹر، حکیم، وید سب بیروزگار رہ جائیں گے۔ البتہ ان کی جگہ پر مس زہرہ بائی، مس اللہ رکھی، مس جن جان، مس گوہر جان، مس بے نظیر، مس گوہر بائی اور ماسٹر نثار وغیرہ کی پریکٹس خوب چلے گی اور ہر شہر کے چکلوں میں ہر کمرے پر مطب کھل جائیں گے۔ یہی کم ظرف بالانشین گانے والیاں سول سرجن بھی ہوا کریں گی اور اسسٹنٹ سرجن بھی اور یہی تمام آلات موسیقی آلاتِ طب کا کام دیں گے۔

جب یہ طریقۂ علاج جاری ہو گا تو غالباً یہ ہوا کرے گا کہ غریب آدمی بیمار ہو کر ڈولیوں میں دو یا زیادہ گانے والوں اور گانے والیوں کے مکانات اور کوٹھوں پر جایا کریں گے اور وہ مریضوں کو دیکھ کر نسخہ تجویز کریں گی کہ اس کو ٹھمری سے فائدہ ہو سکتا ہے یا بھیرویں سے، غزل اس کے لیے مفید ہو گی یا دادرا، اور جیسی بھی مرض کی نوعیت ہو گی ویسا ہی علاج کر دیا جائے گا۔ اسی طرح امرا ان مغنی طبیبوں کو فیس دے کر اپنے گھر پر بلایا کریں گے اور وہ بجائے تھرمامیٹر اور دوسرے آلات کے طبلہ اور سارنگی وغیرہ لے کر موٹر پر نہایت ٹھاٹھ سے ان کے یہاں جایا کریں گے۔ ان کی نبض دیکھیں گے کہ کون سا راگ چھیڑا ہی ہے پھر اسی کے مطابق کوئی چیز ان کو سنا کر اپنی فیس لے لیں گے اور کسی دوسرے مریض کے یہاں چلے جائیں گے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جب یہ طریقۂ علاج رائج ہو جائے گا تو لیڈی ڈاکٹروں کی کثرت ہو جائے گی اور مرد زیادہ تر لیڈی ڈاکٹروں ہی کا علاج کریں گے۔

اگر اس وقت جو نسخہ لکھنے کا طریقہ رائج رہا تو یہ ہوا کرے گا کہ ڈاکٹرنی صاحبہ مع اپنے سازندوں کے جو اس وقت کمپونڈر کہلائیں گے مریض کے یہاں جائیں گے اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد پہلے تو یہ طے کریں گی کہ کون سا مرض ہے یعنی دق ہے یا ہیضہ، اور اس کے بعد پھر اس طرح نسخہ لکھیں گی:

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ماہنامہ کائنات لکھنؤ۔ [illegible] شوکت تھانوی [illegible] ۱۹۳۲ء [illegible]
بعض [illegible] [illegible]
[illegible] شوکت تھانوی [illegible]
[illegible]
[illegible]
کائنات میں شائع ہوتی تھی [illegible]
[illegible]

روزنامہ طوفان لکھنؤ۔ روزنامہ [illegible] شوکت تھانوی [illegible]
[illegible]
سر محمد [illegible] اللہ خاں، خان بہادر سید [illegible] الدین، خان بہادر سید [illegible] علوی، شیخ احمد علی اور [illegible]
وغیرہ کی مدد سے یکم جون ۱۹۳۶ء کو شوکت تھانوی نے ایک نیا اخبار "طوفان" کے نام سے جاری کیا۔
طوفان "کانگریس کے مقابلے میں زمیندارہ کانفرنس" اور تعلقہ داروں کی [illegible] پارٹی کا ترجمان تھا
شوکت تھانوی تحریر کے بادشاہ تھے مگر منتظم نہ تھے جب مولانا محمد علی جیسے عدیم المثال انسان کا اخبار محض تحریر کی خوبی سے
نہ چل سکا تو بھلا طوفان کیا چلتا۔ آزادی جمہور کے چند جھونکے اس پارٹی اور اخبار دونوں کو اڑا لے گئے۔ اخبار ایک
سال چل کر بند ہو گیا اور طوفان گزر گیا۔ طوفان کی پالیسی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی طوفانی ظرافت کا مختصر نمونہ
دیکھیے:۔

روزنامہ طوفان کی ظرافت

"سنا ہے کہ کانگریس کا اجلاس منعقد کرنے کے لیے کئی صوبے [illegible] رہے ہیں۔ کیا کانگریس بھی بعید جابت ہے؟"
"انڈیا ہاؤس کی نمائش میں شاہ ٹیپو سلطان کی پگڑی اور بیگم اودھ کا دوشالہ رکھا گیا ہے۔ کچھ دنوں
کے بعد گاندھی جی کی لنگوٹی بھی ان تاریخی چیزوں میں شامل ہو جائے گی بشرطیکہ مجنوں کے گریبان کی

[illegible] کر دی گئی۔
روزنامہ جنگ کراچی - [illegible] کراچی جلے گئے [illegible] اور شمارہ میں روزنامہ جنگ کراچی کے [illegible] کراچی چلے گئے [illegible] کے عنوان سے اس اخبار [illegible] وغیرہ وغیرہ لکھنا شروع کیا۔ [illegible] کرلی - ان کے اس صحافی مزاح کا ایک نمونہ دیکھئے۔

وغیرہ وغیرہ (روزنامہ جنگ کراچی)

آج میرے ایک شخص [illegible] سامان سے [illegible] تھے اور بعض جگہ [illegible] کوئی چیز جھانکنے کے لیے بھی نہیں [illegible] سامان [illegible] عزیز [illegible] سکتے [illegible] سامان ہی [illegible] وہ چیزیں [illegible] تھی کہ وہ بھی [illegible] لگے کرتے [illegible] بکھرے [illegible] ہجرت کی [illegible]

اسی [illegible] عالم یہ ہے کہ یا تو ہم خود رہیں یا سامان کو رکھیں [illegible] ہے تو [illegible] سامان میں [illegible] محسوس [illegible] اور اس حقیقت کو بھی [illegible] خالی [illegible] ہے اگر ہم سو برس کے سامان [illegible] کل کی [illegible] نہیں [illegible] چنانچہ ہم [illegible] کہ خدا کے [illegible] اسباب [illegible] پورا سامان رکھتے ہوئے، اسباب جمع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور اگر اسباب جمع بھی کرتے تو نتیجہ [illegible] کبھی [illegible] کہ یا تو اسباب باہر [illegible] اور ہم گھر میں یا اسباب گھر میں اور ہم باہر مگر ہم نے یہ صورت ہی پیدا نہ ہونے دی، اور ہم اور ہمارا اسباب نہایت [illegible] طریقے پر اسی گھر میں مدت سے رہتے چلے آ رہے ہیں اور [illegible] کے بندے ہیں لہذا اس سے [illegible] کی شکایت بھی نہیں کر سکتے۔

صاحب ہمارے مکان میں دو قلمدان کی نسل کے کمرے ہیں ایک کمرے میں ایک طرف باورچی خانہ ہے دوسری طرف ایندھن رکھنے کی جگہ، دو دیواروں پر بڑی بڑی کیلیں گاڑ کر کچھ تختے بیوی نے نہایت سلیقے سے لگائے ہیں - جن پر برتن رکھے جاتے ہیں . . .

دوسرے کمرے میں دو پلنگ بچھے ہوئے ہیں اور ان دو پلنگوں کے بعد جو جگہ بچی ہے اس میں نیچے اوپر کپڑوں کے بکس رکھے ہوئے ہیں دو الماریاں بھی اس کمرے میں ہیں . . . جن میں سے ایک الماری کے تختے پر . . . کہتے ہیں کہ کبھی ایک کنگھا بھی پایا جاتا تھا مگر امتدادِ زمانہ کے ماتحت اب اس کے چند دانے باقی رہ گئے ہیں۔

الماری کے تیسرے تختے کے متعلق مورخ حیران ہے کہ اس کو کتب خانہ کہے یا نعمت خانہ، اس پر کبھی کتابیں بھی دیکھی گئی ہیں اور بسا اوقات اِن ہی میں . . . میلاد شریف کے آئے ہوئے بتاشے،

[illegible]

روزنامہ جنگ راولپنڈی۔ [illegible] سوکت تھانوی کو اس کا ایڈیٹر بنا کر بھیجا گیا۔ انھوں نے اس میں "پہاڑ تلے" کے عنوان سے جنگ کا مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا۔ اس کا ایک نمونہ دیکھیے۔

پہاڑ تلے (روزنامہ جنگ راولپنڈی)

ہمارے اسکول کے بچوں سے خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں اگر آپ یہ سوال کریں کہ تم کو کہانیوں میں سب سے زیادہ کیا بات پسند آئی "تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ" ہم کو تو کہانیوں میں سب سے زیادہ پسند یہ لگتا آتا ہے کہ۔۔۔ "مرے راجہ کا جنگل میں راج ہے"

ان سے اگر پوچھیں کہ اکبر اعظم کے عہد کا کوئی ناقابل فراموش کارنامہ بتائیں تو وہ فوراً کہیں گے کہ ہم کو صرف ایک ہی کارنامہ یاد ہے کہ اکبر کا دربار سجا ہے۔ شاہزادہ سلیم ایک کرسی پر بیٹھا ہے خود اکبر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہیں تمام اہلِ دربار نہایت ادب سے بیٹھے ہیں کہ حضور والا کا جو انارکلی بنی ہوئی ہے ناچ شروع ہو جاتا ہے اور وہ شہزادہ سلیم کی طرف اشارہ کر کے گاتی ہے۔

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

ان سے اگر آپ دریافت کریں گے کہ "مرزا غالب کون تھے" تو وہ فوراً جواب دیں گے "مرزا غالب وہ تھے جن سے ملنے کو ثریا بیگم نے اپنی بیٹی نور جہاں کو سختی سے منع کیا تھا۔"

ہمارے یہ طالب علم فلموں کے منہ کا مزہ اور ادائیں جو تمام نصاب سے نہیں بلکہ فلموں سے لیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کو جو عبور فلموں پر حاصل ہے وہ اپنی درسی کتابوں پر ہرگز نہیں حاصل ہے ان کو اپنے مضمون کے کسی شاعر کا کلام تو خیر یاد نہیں ہے البتہ وہ اس موقع پر جہاں بھی ساتھ ملے فلمی گانوں کے اشعار پڑھے یا لکھے جاتے ہیں تب بھی فلمی گانوں سے کام لیتے ہیں امتحان کے پرچوں میں مثلاً ایک صاحبزادے نے والد محترم کو خط لکھا کہ آپ نے مجھ سے خط نہ لکھنے کی شکایت کی ہے ادھر میری طرف سے یہ شکایت کی جاتی ہے کہ میں آپ کو بھول گیا ہوں، کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ میں آپ کو کس قدر یاد کرتا ہوں میرا تو یہ حال ہے کہ

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے جب تیرا کسی نے نام لیا

میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ جلدی سے چھٹی ہو اور میں آپ کی خدمت میں یہ کہتا ہوا حاضر ہو جاؤں کہ

تو جگ جگ جیو ہے جو ہم تیری نگریا آئے

اسکولوں کے ان بچوں کا کیا قصور ہے جب ان کے گھر کا ماحول ہی یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ والدہ محترمہ کو دیکھتے ہیں کہ درزی کپڑے سی کر لایا اور وہ اس کو ڈانٹ رہی ہیں کہ "تم نے غارت کر کے رکھ دی یہ قمیص، میں نے تم سے کہہ بھی دیا تھا کہ یہ بالکل اس وضع کی ہونا چاہیے جیسی لیلیٰ نے اس وقت پہن رکھی تھی جب وہ گا رہی ہے کہ

تو بین بجا میں ناچوں گی

یہ تو تم نے ڈھیلی ڈھالی بالکل ایسی ہی بنا دی جیسی فلم گلنار میں نور جہاں نے پہن رکھی ہے تم سے یہ کس نے کہا تھا کہ میرے لیے رخشی کی پشواز سی لاؤ، میں نے تم کو ٹکٹ کے دام بھی دیے تھے کہ پہلے جا کر فلم سیبرن دیکھو۔ اس کے بعد لیلیٰ کی نمونے کی قمیص سی کر لاؤ تم نے مجھے بھی کوئی سٹنٹ ایکٹرس سمجھ رکھا ہے کہ میرے لیے یہ ڈھیلی ڈھالی بدقطع قمیص سی لائے ہو۔"

دوسری طرف سے ہمشیرہ محترمہ دوڑتی ہوئی آئیں کہ "دیکھیے امی مجھے دھوبی نے حوض میں دھکیل دیا ہے میرے سارے کپڑے بھیگ گئے معلوم ہوتا ہے جیسے ...

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

——— ———

[illegible]

تصانیف شوکت تھانوی

● اردو کے ایسے منفرد مزاح نگار ہیں جن کا ایک ایک لفظ [illegible] اور خوبصورت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شوکت تھانوی سب کا محبوب مصنف ہے

بھائی (ناول): جتنے سو سال کی کی ہو جائیں — یہ کہاوت تو زبان زد ہے [illegible] مگر ناول بھائی کے پڑھنے اس واقعہ کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان سے ملئے یہ آپ کے بھائی ہیں۔ جیتا جاگتا کردار اور شوکت تھانوی کا انداز بیان۔

غزالہ: اس ناول میں مزاح تو ہے ہی اس لیے کہ اس کا مصنف شوکت ہے۔ مگر مزاح کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کچھ کشش، کچھ جدوجہد، کچھ سرفروشی اور کچھ حقائق سے عبرت و استعجاب۔

نیلوفر: نیلوفر کا انداز تو غزالہ والا ہی ہے۔ مگر یہ اپنی دلچسپی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ وہی عشق و محبت کی حکایت ہے وہی سرفروشی کے نمونے ہیں۔ وہی دلچسپ چھیڑ چھاڑ ہے جو دل میں اترتی جاتی ہے۔

خدانخواستہ (ناول): ذرا تصور تو کیجئے، اگر آپ وہ ہو جائیں جو آپ کی بیگم صاحبہ ہیں اور بیگم صاحبہ وہ ہو جائیں جو آپ ہیں تو کیا ہو؟ اس کا جواب شوکت تھانوی سے سنئے۔

مولانا (ناول): وہ صد سکے والے ہیں۔ جن کے قلم نے کبھی بھی اپنے معیار سے نیچے اترنا گوارا نہیں کیا۔ اس ناول میں شوکت تھانوی نے ہم اور آپ جیسے ایک صاحب کو خواہ مخواہ مولانا بنا کر جو اس کی گت بنائی ہے وہ خدا کسی کی نہ بنائے۔

کُتیا (ناول): کُتیا پالتو ہو یا جنگلی جونتی ضرور ہے۔ اور اگر کاٹ لے تو دماغ پر خاص اثر پیدا کرتی ہے۔ اس کُتیا نے ہمارے دماغ پر یہ اثر کیا کہ ہم مسلسل ہنس رہے ہیں۔ اس لیے کہ نہ یہ پالتو کتیا ہے نہ جنگلی۔ بلکہ یہ دراصل شوکت تھانوی کے ایک مزاحیہ ناول کا نام ہے۔

سانچ کو آنچ: یہ ناول ان مہاجرین پر ہے جو ہندوستان میں روٹی تک کو عاجز تھے اور پاکستان پہنچ کر اپنے آپ کو نواب کہنے اور کہلوانے لگے۔ یہ ناول ایسی ہی دلفریب حکایتوں پر اس انداز میں لکھا گیا ہے کہ پڑھ کر مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں۔

سسرال: اس ناول کا کچھ حصہ ماہنامہ نقوش لاہور میں چھپ چکا ہے۔ جسے سب نے اتنا پسند کیا تھا کہ ہم اسے جلد سے جلد مکمل طور پر کتابی صورت میں شائع کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ ناول اتنا دلچسپ و لطیف ہے کہ اسے پڑھ کر ذہن جھوم جھوم اٹھتا ہے۔

کارٹون (ناول): شوکت تھانوی کارٹونسٹ ہیں؟ اس لیے کہ ان کے ایک لاجواب مزاحیہ ناول کا نام کارٹون ہے۔ اس ناول میں شوکت کا قلم کہیں بھی آورد کا شکار نہیں ہوا ہے، وہی روانی اور سبک، وہی بے ساختہ اور بے تکلف مزاح ہے۔

[illegible] شوکت تھانوی کی [illegible]

[illegible]

بقراط (ناول) [illegible] شوکت تھانوی نے [illegible]
[illegible] ہے۔

جوڑ توڑ (ناول) [illegible] شوکت تھانوی [illegible]
[illegible]

غالب کے ڈرامے [illegible] شوکت تھانوی [illegible]

بار خاطر شوکت تھانوی [illegible]
[illegible]

نمک مرچ شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ [illegible] ایسے مضامین آپ نے نہ پڑھے ہوں گے۔

سودیشی ریل شوکت تھانوی نے اپنی تمام مزاحیہ کائنات کا نچوڑ اس مجموعہ میں [illegible] مضامین سے بے شمار خود منتخب کئے ہیں اور نئے مضامین بھی اپنے ہی انتخاب سے شریک کئے ہیں۔ مصنف کا خود اپنا انتخاب کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ کتاب ہے۔

مابدولت شوکت کی زد پر شوکت — شوکت تھانوی نے اپنے کو بھی نہیں بخشا۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنا کچا چٹھا پیش کر دیا ہے۔ "مابدولت" میں ایک نہایت نازک مرحلہ پر خود اپنے متعلق لکھتے ہیں — "ادھر سے یہ [illegible] نظریہ۔ ادھر سے ان کی بدبرائی۔ آخر شیطان نے دونوں کو کھینچا کہ ہم دونوں ایک ہو گئے۔"

قاضی جی (تین حصے) مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج کی رائے یہ ہے کہ: "قاضی جی پاکستان کا پہلا مزاحیہ کردار ہے۔ جسے شوکت تھانوی نے پیش کیا ہے۔ ریڈیو سننے والے قاضی جی سے بخوبی واقف ہیں۔" شوکت تھانوی سے قاضی جی کی تقریروں کا پہلا مجموعہ مرتب ہوا تو تقاضا شروع ہوا کہ دوسرا مجموعہ کہاں ہے۔ اب ہم نے دوسرا تیسرا مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے تاکہ اس مقبول عام کردار کے کارنامے دستاویزی صورت میں محفوظ رہیں۔

وغیرہ وغیرہ سودیشی ریل کے مصنف شوکت تھانوی نے پھر اس صنف ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ جو اب سے برسوں پہلے اس کی بے مثال اور غیر فانی شہرت کا سبب بنی۔ "وغیرہ وغیرہ" ان کے تازہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مزاح پاروں میں شوکت تھانوی کا فن نکھرا ہوا ہے اور انھوں نے جاندیدگی اور گہرے مشاہدے سے کام لے کر ہنسی کی ایسی پھلجڑیاں چھوڑی ہیں جن سے قہقہوں کی پچکاریاں [illegible] دنیا تک برستی اور انسانی ذہن [illegible] رہیں گی۔



نقوش

اپنا ۱۰۰ واں شمارہ

ایک کارنامہ کی صورت میں پیش کرے گا

اور وہ کارنامہ

آپ بیتی نمبر

کی صورت میں سامنے آئے گا

اُن تمام بڑے ادیبوں کی آپ بیتیوں کا جامع تذکرہ، انہی کے الفاظ میں ہوگا جو آج سے پہلے لکھی گئیں اور جن سے ملک و قوم کی سیاست، ادب اور تاریخ متاثر ہوئی

اور موجودہ دور کے تمام بڑے ادیبوں کی غیر مطبوعہ خود نوشت سوانح عمریاں ہوں گی جو آج ہی نہیں کل بھی دستاویزی حیثیت رکھیں گی اور جو خود اپنی جگہ اتنی دلچسپ ہوں گی کہ افسانوی کردار ان کے سامنے گرد نظر آئیں گے

آئندہ شمارہ **آپ بیتی نمبر** ہی ہوگا

یہ کتاب اُس تاریخ کو جو سب سے آخیر میں ڈالی گئی ہے
واپس کرنی ہے، ورنہ پانچ پیسے روزانہ کے حساب سے
ہرجانہ ادا کرنا ہوگا

۳۸۰۱ .... ۴۹۷ ش ۲۲۳۹

توخش ... میر محمّد جمیل ...

شوکت نمبر